اپریل ۱۹۹۳ء

نئی دہلی

یوجنا

جلد ۱۳ — شمارہ ۱ — ۲

یکم تا ۳۰ اپریل ۱۹۹۳ء — ۱۱ چیت تا ۱۰ بیساکھ سک ۱۹۱۵

[illegible] ۳ روپے — شمارے نمبر ۱۰، ۱۱ [illegible]

چیف ایڈیٹر: ڈی۔ کے۔ بھاردواج

سینئر ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر: توحید خان

[illegible]: وسیم حیدر

[illegible]: سجاد علی خان

شرح چندہ: سالانہ ۳۰ روپے، دو سالہ ۵۰ روپے، سہ سالہ ۷۰ روپے، فی کاپی ۳ روپے

طالب علموں، اساتذہ اور لائبریریوں کے لئے [illegible] فیصد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۶۶ ۱۱

پروڈکشن آفیسر: سدرشن موہن [illegible]

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱ ۱۱

یوجنا منصوبہ بندی و ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، کہ اس کے مضامین محض سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس شمارے میں

ڈاکٹر سید شرافت حسین

ہندوستانی معیشت کے حالیہ دور میں توانائی کی اہمیت اور اس کی پیداوار میں پیش رفت کے تقاضے

ہندوستانی معیشت کو اس کے ترقیاتی دور میں ... جس میں ہم وسیع کی معاشی ترقی کے لئے اضافی توانائی درآمد سے کی حاجت ہے، توانائی زمرہ میں نو ساختی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، لگاتار اضافہ کا رجحان ہے مزید براں ملک میں معاشی وسیع الخیالی کے موجودہ عمل کو قرار واقعی تقویت نہیں پہنچائی جا سکتی جب تک ایک قومی توانائی پالیسی مرتب نہیں کی جاتی ہے۔ عالمی بینک سے متعلق بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن کے ایک تازہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ترقی پذیر ممالک میں بجلی کی طلب میں اوسطاً ۶ء۶ فیصدی سالانہ کے اضافہ کا اندازہ کیا گیا ہے افریقی ممالک میں تو یہ اضافہ محض ۲ فیصدی رہے گا، لیکن ایشیائی ممالک میں طلب ۱۲ فیصدی سالانہ کی در سے بڑھے گی۔ اس اضافی طلب کی سیری کی غرض سے ۱۹۹۰ء کے عشرے میں بجلی کی پیداواری صلاحیت میں مجموعی طور پر ۹۲ فیصدی کا اضافہ لازمی ہوگا۔ اس متزائد طلب کو زیادہ تر کوئلہ سے بجلی پیدا کرنے والے حرارتی بجلی گھروں سے پورا کیا جائے گا، لیکن ماقوائی بجلی (ہائیڈرو الیکٹرک) اور گیس سے چلنے والے بجلی گھروں کی شرکت بھی نہایت ہی اہم ہوگی۔ بجلی کی اس قدر زیادہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے تقریباً ۱۰۳ ارب روپئے درکار ہوں گے جس میں سے ۳۸ ارب ڈالر کے بقدر زر مبادلہ کی ضرورت پڑے گی۔ عالمی بینک تقریباً ۱۲ ارب ڈالر کی امداد دے رہا ہے اور بقیہ ان ممالک کو اپنے وسائل سے ہی فراہم کرنا پڑیں گے۔ بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن کے تخمینہ کے رو سے قیمتوں میں اضافہ کو نظرانداز کرتے ہوئے بھی ترقی پذیر ممالک کو اپنی متذکرہ بالا بجلی کی طلب کی تکمیل کے لیے جو بھی بجلی گھر قائم کرنا ہوں گے، اُن کی لاگت ۱۹۹۰ء کی قیمتوں پر بھی ان ممالک کی مجموعی حقیقی قومی پیداوار (جی ڈی پی) ۲/۳ ۲ فیصدی کے بقدر ہوگی۔

اگرچہ بجلی پیدا کرنے کی غرض سے نئی وحدتیں (بجلی گھر) قائم کرنے کا بار بہت زبردست ہوگا، تاہم اگر یہ وحدتیں نہ قائم کی جائیں تو اس سے بھی زائد بار نقصان کی شکل میں برداشت کرنا پڑے گا۔ بین الاقوامی ترقی کی امریکی ایجنسی کے ایک جائزے کا حوالہ دیتے ہوئے، بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن نے بتایا ہے کہ بجلی کی قلت سے محض ہندوستان کو تقریباً سالانہ نقصان ہوتا ہے، وہ ملک کی مجموعی حقیقی قومی پیداوار کے ایک سے تین فیصد کے مساوی ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن کے جائزے کے نتائج کی تصدیق مرکزی وزیر توانائی کے لوک سبھا میں دیے گئے اُس بیان سے بھی ہوجاتی ہے کہ جس کے مطابق منظور شدہ یا تعمیر پذیر ۱۴۴ وحدتوں (بجلی پراجیکٹس) میں سے ۱۳۸ کی لاگت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ابتداً ان کی تخمینی لاگت ۶۰/۸۵۰،۴۰ کروڑ روپے تھی، جو اب بڑھ کر ۴۷،۴۷۷/۸۷ کروڑ روپئے ہوگئی ہے۔ کارپوریشن کے مطابق اس ضمن میں دو پرانے نظریے غلط ثابت ہوچکے ہیں: اولاً یہ کہ بجلی گھروں کے قائم کرنے میں تخصیصی زمرے (پرائیویٹ سیکٹر) کی دلچسپی نہیں ہے اور گورنمنٹ اُن کے لیے ضروری وسائل مہیا کرسکتی ہے۔ دوئم یہ کہ گورنمنٹ زمرہ میں سستی بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں کل ۷۰ ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن اس صلاحیت کے مقابلے میں محض دو تہائی سے کم ہی پیداوار ہو پاتی ہے، جب کہ اگر پوری صلاحیت بھر پیداوار ہو بھی جائے، تو بھی بجلی کی رسد اُس کی طلب کے مقابلہ میں ۱ فیصدی

ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف اکونامکس جواہر لال نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج بارہ بنکی (یو پی)

کم ہی رہ جائے گی۔ چنانچہ واقعتاً جتنی پیداوار ہوتی ہے، اس کے حساب سے تو رسد، اس کی طلب کے مقابلہ میں ۳۲ سے ۴۰ فیصدی تک کم رہتی ہے، جس کے نتیجہ میں زراعت اور صنعت دونوں زمروں کو اکثر بجلی کی رسد میں انقطاع کا معاملہ درپیش رہتا ہے۔

ملک میں خام تیل کی پیداوار بھی ۱۹۸۹ء میں ۳۴ ملین ٹن سے کم ہو کر سال رواں (۱۹۹۱-۹۲ء) میں محض ۲۹ ملین ٹن رہ گئی ہے، جب کہ ملک میں خام تیل کی طلب فی الوقت ۶۰ ملین ٹن ہے لیکن اگلے پانچ سال میں اس میں اضافہ ہو کر اس کے ۹۰ ملین ٹن ہو جانے کا تخمینہ کیا گیا ہے۔ گیس کی رسد کے معاملہ میں بھی حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ گیس کی سالانہ پیداوار تقریباً ۱۸ ہزار ملین کعب میٹر ہے، جو ملک میں اس کی طلب کے محض ۵۰ فیصد کے بقدر ہے۔ چنانچہ ملک کے ۳ ملین سے متزائد صارفین پکوان گیس حاصل کرنے کے لیے معروضی ہیں، اور ۷۰ اکلو میٹر لمبی پائپ لائین سے گیس حاصل کرنے کے حرص سے بہت سے بجلی گھر اور صنعتی ادارے پُرامید ہیں۔ لہٰذا ملک میں توانائی سے متعلق اس گہرے بحران کا ادراک کر کے ہی مرکزی گورنمنٹ نے ملک کے ۴۳ گیس علاقوں کو غیر ملکی و بیرملکی شخصی کمپنیوں کے لیے کھول دیا ہے۔ جو گیس علاقے شخصی کارندازوں کے لیے کھولے گئے ہیں، اُن میں ممبئی سے تقریباً ۱۰ اکلو میٹر مغرب کی جانب بحر عرب میں واقع مُکتا اور پنا کے علاقے شامل ہیں، جن میں ایک ایک ارب بیرل سے بھی متزائد تیل کے ذخائر ہونے کا تخمینہ ہے۔ مزید یہ کہ جن دیگر ۵ علاقوں میں شخصی زمرہ کو مدعو کیا گیا ہے، اُن میں ۲۰۰ سے ۵ ملین بیرل تک تیل کے ذخائر کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ تاپتی ندی کے دہانہ کے نزدیک کے دو علاقوں میں تقریباً ۷، ۶ ہزار ملین کعب میٹر گیس ہونے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ چونکہ ان علاقوں میں اصل کاری کر کے کافی منافع ملنے کا امکان ہے، اس لیے برطانیہ، امریکہ اور آسٹریلیا کی کمپنیوں نے ان علاقوں میں کام کرنے کے تئیں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ ٹاٹا اور ریلائنس جیسی چند ملکی کمپنیوں کے لیے بھی مرکزی گورنمنٹ کوئلہ کی صنعت اور بازار کو کھولنے پر آمادہ ہے۔

یوحنا، نئی دہلی

ہندوستانی بجلی گھروں میں استعمال ہونے والے کوئلہ میں ۴۰ فیصدی راکھ کا عنصر ہوتا ہے جب کہ بین الاقوامی منڈیوں میں دستیاب کوئلہ میں محض ۱۰ فیصدی راکھ ہوتی ہے۔ مزید برآں ملک کی معدنوں سے بجلی گھروں تک کوئلہ پہنچانے میں نقل و حمل کے ذرائع بھی ایک اہم مسئلہ ہیں۔ ہمارا یا معدنی کال کی معدنوں سے تامل ناڈو کے بجلی گھروں تک کوئلہ پہنچانے میں تین دو ہفتہ کی مدت صرف ہوتی ہے انڈونیشیا یا آسٹریلیا سے کوئلہ جہ میں ہی پہنچ جاتا ہے۔ غالباً اسی گورنمنٹ نے آزمائش کے بجلی بورڈ کو مقررہ درکار ۳ فیصدی ... کر کے ایک بار کوئلہ درآمد کرنے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح ٹاٹا الیکٹرک کمپنی کو بھی آزمائشی انداز پر ایک لاکھ ٹن کوئلہ درآمد کرنے کی سہولیت دی گئی ہے۔ غیر ملکی کمپنیوں کو بھی ملک میں بجلی گھر بنانے اور چلانے کے لیے مدعو کیا گیا ہے، اور اس کیلئے انھیں ۱۶ فیصدی کی در سے منافع کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ اس ضمن میں بجلی کی بڑھتی ہوئی طلب کی سیری کے لیے توانائی کے درآمدات پر زرمبادلہ کے صرف کی دلیل کو اب زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اگر ہندوستان اپنے خام تیل کی پیداوار میں خاطر خواہ حد تک اضافہ کر ہی لے، تو بھی اس کو توانائی حاصل کرنے کے لیے خام تیل کی درآمد کرنا پڑے گی۔ چنانچہ اس معاملہ میں ملکی پالیسی مرتب کرنے والے پُرامید ہیں کہ خام تیل کی درآمد میں اضافہ ہونے سے پٹرو کیمیا اور پلاسٹک کی بڑھتی ہوئی طلب کی سیری کرنا آسان ہو جائے گا اور اس بارے میں تو سب ہی ہم رائے ہیں کہ بجلی کی قلت کی بنا پر بھی ملک کی کارساز کمپنیوں کے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

پٹرول اور ڈیزل سے ماخوذ اشیاء کی قیمتوں کے حالیہ اضافہ سے بہ مخصوص عام آدمی ملکی کاشتکار، صنعت کار اور نقل و حمل کے ذرائع مہیا کرنے والے لوگ، وغیرہ سب ہی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ فی زمانہ ہمارے تقریباً سبھی معاشی اعمال توانائی ماخذ ہیں اور یہ ...

اس نے توانائی کے تئیں دنیا کے انداز فکر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک نے اس کے تئیں اپنے ردعمل کا اظہار اپنے توانائی کے صرف میں کمی اور توانائی کی عمیقیت میں ۳۵.۳ فیصدی کی تخفیف کر کے کیا ہے، ترقی پذیر ممالک اس ضمن میں نہایت سست رو رہے ہیں۔ ماحولیات پر پڑنے والے اثرات کے معاملہ میں بھی تشویش میں اضافہ ہو گیا ہے کہ اب توانائی سے متعلق معاملات عمومی طور پر ماحول کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے اور قدرت کے عطیات کی حفاظت کے سوال سے متاثر ہو رہے ہیں۔

ہندوستان میں فی کس توانائی کا صرف

عالمی معیار کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن اس میں تیز روی سے اضافہ کا رجحان ہے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان یہ صرف ۱۱۰ سے دوگنا ہو کر ۲۱۹ کلوگرام تیل کے مساوی (کے جی او ای) ہو گیا ہے۔ ملک میں توانائی کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں متواتر بڑھ رہی ہے جس کے باعث مستقل پٹرول پر مبنی اشیاء، بجلی اور عمدہ کوئلہ کی قلت پیدا ہو رہی ہے۔ حالانکہ غیر تجارتی روایتی توانائی اب بھی ملک کے کل توانائی کے صرفے کا ۴۰ فیصدی سے متجاوز تخمینہ کیا گیا ہے، تاہم موجودہ اعداد و شمار ناکافی اور مشکوک ہیں۔ ہماری توانائی کی طلب کا تقریباً نصف کوئلہ، پٹرول اور ابتدائی بجلی جیسے تجارتی ذرائع سے پورا ہوتا ہے۔ مزید براں مستقبل کے دو عشروں سے کم مدت میں ملکی معیشت میں توانائی کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے باعث تجارتی توانائی کی طلب کا موجودہ ۲۵ سے اضافہ ہو کر اس کے تین گنا یعنی ۷۰ ملین ٹن تیل کے مساوی (ایم ٹی او ای) ہو جانے کا تخمینہ کیا گیا ہے اور ۲۰۰۴-۵ تک توانائی کے مجموعی صرفے میں تجارتی توانائی کا حصہ بڑھ کر ۸۰ فیصدی ہو جانے کا اندازہ کیا گیا ہے۔

درآنحالیکہ یہ تو عیاں ہے کہ صنعتی زمرہ ہی توانائی کا سب سے بڑا صارف رہے گا، تاہم مستقبل میں توانائی کی طلب میں سب سے زیادہ اضافہ نقل و حمل کے زمرہ میں ہونے کا امکان ہے، جب کہ زراعتی زمرہ میں توانائی کی مجموعی طلب میں تخفیف ہو جانے کا اندازہ ہے۔ حالیہ برسوں میں ملک میں توانائی کے کل صرفہ میں تیل کے تناسبی حصہ میں نمایاں فروغ ہوا ہے، جس کے لیے زراعتی اور نقل و حمل کے زمرے براہ راست ذمہ دار ہیں۔ مزید یہ کہ صنعت اور نقل و حمل کے زمروں کی طلب میں تخفیف ہو جانے کے باعث کوئلہ کے صرفہ میں بھی انضباط کا رجحان ہے۔ توانائی کے وسیلہ کی حیثیت سے بجلی کے صرفہ میں متواتر وسیع رجحان ہے اور یہ وسیلہ ہمیفینی کاربن (ہائیڈروکاربس) سے دیگر ابتدائی وسیلوں تک عبور حاصل کرنے کے ذریعہ کی حیثیت سے زیادہ بہتر اور مستحکم ثابت ہو رہا ہے۔

مستقبل میں نہاں چیلنج کے پیش نظر توانائی کے زمرہ میں اہم ساختی تبدیلیاں لازمی ہیں تاکہ معیشت کو اس کی موجودہ سدھی سی اس خطرناک نہج سے ہٹایا جاسکے کہ جو ہر ایک وحدت کی معاشی نمو کے لیے زیادہ سے زیادہ توانائی کے درآمد کو ضروری قرار دیتی ہے۔ گذشتہ ایک سال میں آغاز کردہ معاشی وسیع الخیالی کے عمل کو برقرار رکھنا بھی اس وقت تک دشوار ہوگا کہ جب تک ایک قومی توانائی پالیسی نہیں مرتب کی جاتی ہے۔ ایسی کسی قومی پالیسی میں: (۱) طلب کا انتظام (۲) عمل آوری کی کارکردگی میں بہتری، (۳) طلب و رسد کے مابین بہتر توازن (۴) تجدید پذیر توانائی کا تیز روی سے استعمال، (۵) توانائی کے تحفظ کے لیے یکمشت ترغیب و عدم ترغیب، جیسے عوامل کی شمولیت لازمی ہے۔ مزید یہ کہ توانائی کے زمرہ کے تئیں ۱۵۔۲۰ سالہ تکنیکی فروغ اور اس کی ترسیل کے منصوبہ کی ابتدا کے لیے ایک نشانہ بند اور میعادی اقدام کی عمل آوری ضروری ہے۔ کسی ایسے ملک کے لیے کہ جو توانائی کی شدید قلت سے متاثر ہو، درآنحالیکہ حملہ ممکنہ ذرائع سے اس کی رسد میں وہ اضافہ بھی کرتا رہا ہو، کو اپنے توانائی کے صرفہ کا نہایت مؤثر معاشی طریقہ سے تعین درکار ہے۔ حال میں تو یہ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے کہ تحفظی اقدامات کے تئیں اصل کاری سے طویل مدت میں بیش بہا بچت ظہور پذیر ہوگی اور بہتر پیداواریت کے ضمن میں درآمد کی رسد میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ پرداخت اور پرورش پر توجہ نہ دینے کے اپنے روایتی نظریہ میں بنیادی تبدیلی لانے اور اس کے تئیں خصوصی کاوش کرنا لازمی ہوگا۔ اس ضمن میں توانائی کے تحفظ کے لیے عالمی بینک کے سفارش کردہ اقدامات کا ذکر مناسب ہے: (۱) قلیل مدت میں تحفظ کو بغیر کسی اصل کاری یا بہت ہی قلیل اصل کاری کے ذریعہ اس جہت پر یقینی بنایا جاسکتا ہے کہ توانائی قوت کے تئیں وسائل کی سخت جانچ کی جائے۔ بالفاظ دیگر، اس کی پرداخت و پرورش اور ترسیل کے عمل کی حسابی عمل کاری کی جانچ کی جائے۔ (۲) درمیانہ مدت (دو تین سال) میں قلیل صرفہ سے سطح ص کے عمل میں تبدیلی لائی جائے کہ اس کے صرفہ میں ۱۵ فیصدی کی تخفیف ہو سکے۔ (۳) طویل المدتی اقدامات، بشمول پیداواری وحدتوں کی مکمل تنویع کاری، کے ذریعہ مزید ۱۵ فیصدی کی تخفیف ممکن بنائی جاسکتی ہے۔ اس جہت پر اگر مندرجہ بالا تینوں طریقوں پر عمل کیا جائے تو کل طلب میں ۴۰ فیصدی کی تخفیف ممکن ہو جائے گی کہ جس کے باعث معدنی تیل کی درآمد میں خاطر خواہ ضبط ظہور پذیر ہوگا۔ اگر یورپی ممالک کے تجربہ پر عمل کیا جائے تو بچت میں خاطر خواہ اضافہ کوئلہ، گیس اور برقی توانائی جیسے ابتدائی و ثانوی ذرائع کو متبادل کے طور پر استعمال میں لائے جانے سے ممکن ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر ہمارے اپنے ملک میں قدرتی گیس کی وافر مقدار معدنی تیل کے کنوؤں سے ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس بربادی کو

جلد سے جلد روکنے کی ضرورت ہے۔
توانائی کا تحفظ غالباً ایک لامرکزیت پر مبنی مسئلہ ہے، برخلاف توانائی کی ترسیل سے متعلق منصوبوں کے کہ جو مکمل طور پر مرکزی ہیں۔ چنانچہ ان کے تئیں اقدامات میں شخصی زمرہ کی شمولیت کی زیادہ ضرورت ہے۔ توانائی کی تخلیق، ترسیل و تقسیم، کوئلہ کی تقسیم اور اس کی تسویق، و نیز ایل پی جی گیس کی تقسیم کے لیے صنعت، گورنمنٹ اور تحقیقی اداروں کے درمیان رفاقت اور تعاون کی ضرورت ہے
بہرلو قومی سطح پر پالیسی کی ترتیب میں قانون سازی اور انتظامی عوامل کی شمولیت موزوں ہے۔ قانون سازی کے عمل میں، (۱) توانائی کے استعمال کی ایسی تمام ترکیبوں کی حکمی لیبل کاری کہ جو توانائی کی تبدیلی کی بہتر کارکردگی پر دلالت کرتی ہوں، (۲) توانائی کی تخلیق اور اس کے استعمال کے تمام آلات کی معیار بندی و نیز اُن کے استعمالی عمل کے لیے ایک مجموعۂ قانون کی وضع کاری، اور (۳) مخصوص تناسبوں کے ساتھ اور تشریح شدہ مدت کے لیے توانائی کے جامع منصوبے تیار کرنا، کی شمولیت ہونا چاہیئے۔
اسی طرح انتظامی پالیسی سے متعلق اقدامات میں: (۱) قلت کے اوقات میں مختلف زمروں کے تئیں توانائی کی تقسیم کے لیے ایک انتخابی زاویۂ نگاہ، (۲) توانائی پر مبنی پیداوار کا درآمد۔ برآمد تجزیہ تاکہ قومی سطح پر ان کی سماجی لاگت اور فوائد کا تعین کیا جا سکے، (۳) توانائی کی موجودہ قیمت ساخت پر وقفہ واری نظرثانی، اور (۴) افراد و نیز صنعتوں کے ذریعہ توانائی کے تحفظ کے عمل کے لیے ان کو انعام دینے کی قومی پالیسی کی ترتیب، وغیرہ شامل کیے جانا چاہیئے۔
درآنحالیکہ توانائی کے استعمال میں کارکردگی کو بہتر بنانے کے امکانات نقل و حمل، زراعت اور گھریلو زمروں میں بھی خاطر خواہ ہیں، تاہم

سب سے زیادہ جلد نتائج ملنے کی توقع صنعتی زمرے میں ہی ہے۔ مزید برآں ابتدائی توانائی کی پیداوار اور تخلیق کے ذریعہ اُس کے تبدل کے لیے کافی اصل کاری لازمی ہے۔ چنانچہ پیداواری تکنیک اور اصل کاری کے طرز کے مابین انتخاب کے لیے اُن پر اثر انداز ہونے والی توانائی سرمایہ اور محنت کی اضافی حقیقی لاگت کا تخمینہ لگانے کی حکمت عملی کو بروئے کار لانا ہوگا اور توانائی کی طلب کو مطمئن کرنے والے اضافی ذرائع کی اصل لاگت کی بھی تخمینہ ضروری ہے۔ حالانکہ ہندوستان جیسے ملکوں میں توانائی کی قلت ہے لیکن سرمایہ کی قلت بھی کم نہیں ہے۔ لہذا توانائی کے تحفظ اور فروغ پر سرمایہ کاری سے حاصل اصل کی حاشیائی در میں مساوی یا یہ روش کا تیقن ہی نہیں کرنا ہوگا، بلکہ سرمایہ کے دیگر مدات پر سرمایہ کاری سے حاصل اصل کی در سے بھی مطابقت لازمی ہوگی۔ اب دنیا بھر میں توانائی کے منصوبہ کار اور سائنسداں
اس کے لامرکزی نظام پر توجہ
ہندوستان نے تو پہلے ہی اس
اعلیٰ اختیاری متبادل توانائی کے
(سی اے ایس ای) اور ایک توا
ذرائع کا شعبہ (ڈی این ای ایس)
فی الوقت ملک میں سو سے متبادل
مختلف تجدید پذیر توانائی نظام کی تحقیق اور تنظیم و نیز اُس کی ترکیبوں کے وضع کرنے اور اُن کے فروغ میں منہمک ہیں۔ بہت سے شعبہائے گورنمنٹ، پبلک زمرہ کے کارخانے، آزاد انجمنیں، شخصی ادارے اور افراد نے آبی حرارتی بادبانی چکی، کیمیاوی و پمپ، اصلاح شدہ چولھے اور حیاتیاتی گیس متین جیسے نظام اور ترکیبوں کو منتخب کر لیا ہے۔ چنانچہ توانائی کے جو بھی اعمال تکنیکی اعتبار سے ممکن اور معاشی نقطۂ نظر سے قابل عمل ہیں، ان عوامل کو مقبول عام کرنے کی غرض سے قرار یافتہ اور تمام تر ممکنہ کوششیں کی جانا چاہیئے، تاکہ ان کے بازاری اساس کو وسعت دی جا سکے اور اُن کو ایک بازاری نظام

ودلیعت ہو سکے۔ نیز ایسی ہی ٹکنالوجی کے تئیں صارفین میں اعتماد کی افزائش ہو جائے۔ ایسے تمام وسائل شعاعی اور حیاتیاتی کمیت پر مبنی ٹکنالوجی و نیز بادبانی توانائی کے استعمال کو بڑے پیمانے پر وسعت دینے میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق ملک میں بادبانی فارم سے توانائی کی تخلیق کی صلاحیت ۴ ہزار میگاواٹ کے مساوی ہے۔
ہماری دیہی زندگی کا ایک بنیادی اور اہم جزو یعنی مویشیوں کی قوت بھی نہایت ہی معنی خیز کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مویشیوں کی قوت اُس سے چلنے والی گاڑیوں و نیز اوزاروں کی اصلاح و فروغ کی اشد ضرورت ہے۔ لہذا دیہی علاقوں میں قلیل فاصلوں کے نقل و حمل کے لیے بھی اگر [illegible]
[illegible] ماحولیاتی معاملات کی جانب سے ہماری بے توجہی کے باعث میٹروپولیٹن شہروں کے طبعی ماحول کے عدم توازن اور کوئلہ کے معدنی ذخائر کے حامل جیسے علاقوں میں طبعی ماحول کی تباہی جیسے نہایت ہی تشویشناک اور نا عاقبت اندیش مسائل ظہور پذیر ہوئے ہیں۔
اسی نہج پر مستقبل قریب اور بعید میں توانائی کی اضافہ پذیر طلب کی سیری کے لیے ہمیں اس کے موجودہ نظام، اداروں اور ٹریننگ پروگرام، وغیرہ کو قوت بخشنے کے ساتھ ساتھ استحکام بھی عطا کرنا لازمی ہوگا۔ مزید یہ کہ توانائی کے مختلف ذرائع کے صارفین کے لیے قیمتوں کی ساخت کو اس طرح وضع کرنا

ہوگا کہ مختلف توانائی کے ذرائع کے مابین مناسب توازن ظہور پذیر ہوجائے۔ اس ضمن میں معروضی کی تحصیل کیلئے شاید تعزیری ٹیکس کاری کی پالیسی مفید ہو تاکہ تجدید پذیر توانائی کے ذرائع اور روایتی ذرائع میں ٹکنالوجی کے استعمال کی ہمت افزائی و سرگرمیاں اور ممکنہ ذرائع کی مدد کی جاسکے۔ اور آخرکار بنک رقمے میں توانائی کے مطلوبہ انتظام و انصرام اور اس کے تعمل میں کارکردگی کو فروغ دینے کی کاوشوں کو برقرار رکھنا ہی ہوگا۔ یہ تو ہندوستان میں توانائی کے فروغ وافزائش کے مسئلے کا کلیدی نکتہ ہے، کیونکہ خصوصاً ایسے مسائل کے حل کے تئیں عمومی طور پر رقم کو تخصیص کی سفارشات پر عمل کرنے سے ہی بظاہر کوئی خاطر خواہ نتیجہ اخذ ہونے کی گنجائش نظر نہیں آتی ہے۔

۱۹۷۳ء کے معدنی تیل کے بحران نے دنیا میں روایتی ایندھن پر مبنی توانائی کی تخلیق کی محدودیت اور اس کی ناکافیت پر ناعلاوہ نظر یقیناً تجدید پذیر توانائی کے ذرائع پر توجہ مرکوز کی ہے۔ قلیل و قدری استثنی کے علاوہ تب ہی سے ایسے توانائی کے ذرائع کے تئیں دنیا کی دلچسپی میں فروغ کا رجحان پایا گیا ہے۔ حقیقتاً گروپ ۱۵ کے ممالک نے حال ہی میں ہندوستان میں اپنے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ وہ شعاعی توانائی، کہ جو مختلف غیر روایتی توانائی کے ذرائع میں سے ایک ہے، کے ضمن میں کلیدی کردار ادا کرے۔ بادبانی، شعاعی حرارت اور اب حال میں مدّوجزر پر مبنی توانائی کے غیر روایتی ذرائع کے تئیں دنیا میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے، خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں برقی توانائی کے فروغ کے لیے اِن ذرائع کے استعمال کی تیزی سے ہمت افزائی ہوئی ہے۔ تجدید پذیر ذرائع سے توانائی حاصل کرنے کے شعاعی، بادبانی، حیاتیاتی کمیت پر مبنی، مدّوجزر پر منحصر، وغیرہ ذرائع پر خاصی تحقیق و تفتیش پہلے ہی کی جاچکی ہے۔ لیکن اِن میں کسی ذریعہ سے بھی اس پیمانہ پر توانائی حاصل ہونے کے تخمینوں کو قطعیت نہیں دی جاسکی ہے کہ اگلے ۱۰۔۲۰ برسوں میں استعمال کے لیے ان کے تجارتی استفادہ پر توجہ دی جاسکے۔ بہرحال ان حالات کے باوجود اس معاملہ پر تو اتفاق ہے ہی کہ توانائی کے یہ روایتی ذرائع تو دنیا میں اگلی صدی کے دوران سہایت ہی اہم اور کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اس کی استثنیٰ نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان میں برقی توانائی کی تخلیق کی نصب شدہ استعداد ۱۹۴۷ء میں محض ۱۳۶۲ میگاواٹ سے ترقی کرکے ۱۹۹۱-۹۲ء میں تقریباً ۶۹۰۰۰ میگاواٹ ہوگئی ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دوران ہر ۸۔۹ سال میں اس کی او دوگنی ہوتی رہی ہے۔ کل تخلیق شدہ توانائی کے ۷۰ فیصدی حصہ کا سرچشمہ کوئلہ اور حال میں معدنی تیل و گیس رہا ہے، جب کہ آبی توانائی محض ۲۸ فیصدی فراہم کرتی ہے۔ بقیہ مختصر ۲ فیصدی حصہ نیوکلیائی وسائل مہیا کرتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ صدی کے اختتام تک توانائی کی نصب شدہ صلاحیت ایک لاکھ میگاواٹ سے بھی متزائد ہوجائے گی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مستقبل قریب میں نصب شدہ صلاحیت میں ہر سال ۳۔۴ ہزار میگاواٹ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس پس منظر کے برخلاف قومی سطح پر غیر روایتی ذرائع سے توانائی ماخوذ کرنے کے عمل سے اب تک متواتر بہت خفیف سی مدد ہوئی ہے۔ بادبانی فارم سے اب تک براہ راست توانائی کی تخلیق کی استعدادی صلاحیت تقریباً ۴۵ میگاواٹ ہوتی ہے، جس میں سے ۳۰ میگاواٹ کی شرکت محض تامل ناڈو اور گجرات کی دو ریاستوں کی ہے۔ ۱۰۰ کلوواٹ کے شمسی فوٹو کیمیاوی برق پلانٹ کے قیام کا ایک منصوبہ اترپردیش نے بھی وضع کیا ہے۔ انڈمان و نکوبار اور لکشدیپ جیسے منفصل جزائر میں بھی چند شمسی فوٹو کیمیاوی برق کے رسدی نظام آراستہ کیے گئے ہیں۔

چنانچہ توانائی کی رسد کے تناظر میں منصوبہ بندی ذیل نقطہائے نظر سے ایک کثیرالانواعی تجزیہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱:۔ بادبانی، شمسی، مدّوجزر پر مبنی، وغیرہ غیر روایتی توانائی کے منبع کے امکانات کی تفتیش و تحقیق کرنا،

۲:۔ پلانٹ کے کارکردگی میں بہتری لانا، تاکہ مقررہ نصب شدہ استعداد سے ہی توانائی کی تخلیق میں اضافہ کیا جاسکے۔ اس نظریہ سے توانائی کا انتظام و انصرام نہایت ہی اہم ہے،

۳:۔ توانائی کی تبدیلی کے تدابیر عمل میں لانا، خصوصاً صنعتی و زراعتی زمروں میں، اور

۴:۔ گرم کرنا، خشک کرنا، وغیرہ جیسے مختلف اہداف میں، جہاں بھی یہ آسانی ممکن ہو، بجلی کے بجائے متبادل توانائی کے ذرائع کا استعمال کرنا۔

جیساکہ بیان کیا جاچکا ہے، بادبانی، شمسی حرارتی ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کی تدابیر خاصی معقول حد تک کی گئی ہیں۔ مختلف ترقی یافتہ ممالک نے بادبانی توانائی تخلیق کرنے کی ۲۰۰۰ سے ۲۵۰ میگاواٹ کے مدارج کے معیاری استعداد کی مشینیں نصب کی ہیں۔ ڈنمارک، جو بادبانی توانائی کی تخلیق کی مشینوں کا دنیا میں اول نمبر کا صانع ہے، اپنی توانائی کی کل طلب کا ۲ فیصدی بادبانی مشینوں سے حاصل کرتا ہے۔ دوسری جانب حرارتی بجلی تخلیق پلانٹ کی جملہ معیاری استعداد اب تک محض ۳۰۰ میگاواٹ ہی ہوپائی ہے، اور ایسے تقریباً تمام ہی پلانٹ امریکہ (یو ایس اے) میں مرکوز ہیں۔ مدّوجزر پر مبنی، تموّج سے ماخوذ، سمندری، حرارتی، وغیرہ دیگر ذرائع

سے توانائی کی تخلیق کرنے کی قابل لحاظ استعداد کہیں بھی قائم نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن حال میں چند ایسے اشارے موصول ہوئے ہیں کہ چند ترقی یافتہ ممالک۔ خصوصًا برطانیہ۔ مدّو جزر پر مبنی توانائی کی تخلیق کی خاصی استعدادی صلاحیت مستقبل قریب میں نصب کرلیں گے۔ چنانچہ بیسویں صدی کا آخری عشرہ غیر روایتی ذرائع سے توانائی ماخوذ کرنے میں اس قدر کامیابی حاصل کرلے گا کہ اگلی صدی میں غیر روایتی ذرائع سے حاصل توانائی کے کلیدی کردار کے نقطہ نظر سے بیسویں صدی کا آخری عشرہ قابل لحاظ حد تک اہم ہوگا۔ لہٰذا موجودہ صدی کے اختتام تک دنیا کی کل توانائی تخلیق کا کم از کم ایک فیصدی غیر روایتی ذرائع سے ماخوذ کرنے کے قابل استعدادی صلاحیت پیدا کرلینا ہی مصلحت آمیز ہوگا، باوجودیکہ اس کی اصل کاری کی لاگت طاہر بہ ظاہر زیادہ ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں کم از کم ۸۰۰۰-۱۰۰۰ میگا واٹ کی استعدادی صلاحیت تخلیق کرنے کے لیے مکتفی وسائل فراہم کرنا لازمی ہوگا۔ اس لیے ملک کے آٹھویں پنجسالہ منصوبہ میں توانائی کے لیے مختص ۸۰۰ کروڑ روپے کی دور اندیشانہ اصل کاری کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ محض ایسا ہی قدم ملک کے اگلی صدی کے چمکتے سورج کی روشنی میں بہ اطمینان داخلہ کے لیے حالات کو سازگار بنائے گا۔ ●●

بقیہ: جموں وکشمیر کی اقتصادی خوشحالی

زیادہ مطلوبہ صنعتی ترقی وفروغ کی رفتار میں تیزی لانے کے لیے مختلف مرحلوں میں خصوصی ترغیبات فراہم کی گئی ہیں، جن سے صنعتی پیداوار میں کافی بہتری آئی ہے۔

ریاستی حکومت نے آئندہ مالی سال کے دوران صنعتی شعبے کیلیے ۸۰.۴۳ کروڑ روپے کی رقم مختص کی ہے، جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے ۴۰.۴۴ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں مجموعی ترقی وفروغ کے لیے ایک ٹھوس اور بیش قیمت بنیادی ڈھانچہ قائم ہوا ہے اور ریاست، زراعت، باغبانی، صنعت سیاحت، بجلی کی پیداوار، تعلیم، صحت اور مواصلات سمیت سرگرمی کے تمام شعبوں میں ایک زبردست توسیع اور ترقی وفروغ کے لیے پوری طرح سے تیار ہے۔

دوسرے محاذوں پر ریاست کی کارکردگی قدرے غیر معمولی رہی ہے۔ اس نے ہر ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پرائمری اسکول قائم کرکے اور ایک سو لوگوں کو مستفید کرکے ابتدائی تعلیم کر لے کے آئینی حکم کی ہے۔ اگرچہ ریاست والے حالیہ واقعات اور دشواریاں درپیش سے یہ ریاست بالآخراں مسئلہ ... پاسکے گی۔ ●●

یوجنا، نئی دہلی

جوابات کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ لیلا سیٹھ (Leila Seth)
۲۔ گریگاری مینڈل (Gregory Mendel)
۳۔ ۱۹۲۲ء میں، آر۔ ڈی۔ بنرجی (R.D. Banerjee) نے۔
۴۔ نائٹرس آکسائیڈ (Nitrous Oxide)
۵۔ پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے (Fifth Plan)
۶۔ شملہ (ہماچل پردیش)۔
۷۔ لارڈ چیلمس فورڈ (Lord Chelms-Ford)
۸۔ پرنس حرم
۹۔ ستیراٹگس۔
۱۰۔ ایٹلی (Attlee)
۱۱ یکم ستمبر ۱۹۹۲ء، جکارتہ (انڈونیشیا)۔
۱۲۔ مل ناڈو۔
۱۳۔ پھیپھڑا (Lunga)
۱۴۔ چرک (CHARAK)
۱۵۔ سید احمد بریلوی
۱۶۔ خان عبدالغفار خاں۔
۱۷۔ رام دھن (Ramdhan)
۱۹۔ ۰ ۱۶ ء۔
۱۹۔ یو آر راؤ (U.R.RAO)
۲۰۔ بٹھل بھائی پٹیل، سی آر داس اور موتی لال نہرو
۲۱۔ مہراجی
۲۲۔ ٹامس (TOMSON)
۲۳۔ آنا یتیم۔

۲۹ چند بردئی (Chanda Baradai)
۳۰۔ مخالف دہشت پسندی (Anti Terrorism) کے عنوان سے
۳۱۔ سنیل گواسکر
۳۲۔ کے۔ سی۔ پنت۔
۳۳ یوروکروم (Urochrome) کے سبب۔
۳۴۔ اسرائیل کے ساتھ۔
۳۵۔ آریہ بھٹ۔ (Aryabhata)
۳۶۔ بنگلہ فلم کی ایک مشہور ومعروف ہیروئن۔
۳۷۔ "ناسک" (Nasik) اور "دیوس" (Devas)
۳۸ پاکستان۔
۳۹ ۱۲۷ ممالک نے
۴۰۔ بہار۔ ●

بقیہ: مرکزی عام بجٹ

میں قائم کی جانے والی صنعتوں کو پانچ سال کے لیے ٹیکس سے پوری طرح مستثنیٰ کر دیا ہے جس سے نئی صنعتوں کو [illegible] مل سکے گا۔

[illegible] ترقی سے [illegible] آمدنی [illegible] پچھلے [illegible] سال سے [illegible] اقتصادی اصلاحات [illegible] سال میں [illegible] کیا ہے۔

اس بجٹ کی [illegible] میں ۱۴ ارب ۲۲ کروڑ روپے کی نئی رقم کی تجویز [illegible] علاوہ [illegible] مالی خسارہ مجموعی اندرونی آمدنی کا تقریباً چار فی صد رہ گیا ہے۔ اگر وزیر خزانہ نے شرح [illegible] میں صرف ایک فی صد کمی کی ہے، تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ ایک طرف معیشت کی ترقی اور عام آدمی کی فلاح کے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں، تو دوسری طرف وہ افراطِ زر کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دیں گے۔

پچھلے سال کے بجٹ کے برعکس، آئندہ سال کے بجٹ میں دیہی ترقی اور سماجی خدمات کے لیے رکھی گئی رقموں میں نمایاں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ معیشت کے کلیدی شعبوں: زراعت، بجلی، پٹرولیم اور قدرتی گیس کے لیے رقوم بڑھائی گئی ہیں۔ مرکزی ترقیاتی منصوبہ کی کل رقم ۹۳-۱۹۹۲ء میں [illegible] ارب سات کروڑ روپے تھی، جو ۹۴-۱۹۹۳ء میں بڑھا کر ۶۳۹ ارب ۴۶ کروڑ روپے کر دی گئی ہے یعنی اس میں ۴۴ فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مرکزی ترقیاتی منصوبہ کے تحت دیہی ترقی کے لیے رقم ۲۶ ارب دس کروڑ روپے سے بڑھا کر ۴۴ ارب ۲۹ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے، جو کہ ۶۲ فی صد اضافہ کے مترادف ہے۔ [illegible] کے لیے رقم ۱۰ ارب ۹ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۴۴ ارب ۶۳ کروڑ روپے [illegible] کر دی گئی ہے، جو [illegible] ۲۵ فی صد کا اضافہ ہے۔ ماحولیات کے لیے رقم [illegible] ارب ۲۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۶۴ ارب ۴۵ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے جو ۲۲ فی صد کا اضافہ ہے۔ توانائی کے سیکٹر کے لیے اگلے سال ۲۱۹ ارب گیارہ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے جو کہ رواں مالی سال کے بجٹ تخمینوں کے مقابلے میں ۴۴ فی صد زیادہ ہے۔ اس شعبے میں بجلی اور پٹرولیم شامل ہیں۔ ٹیلی کمیونیکیشن سیکٹر کے لیے رقم بڑھا کر اگلے سال ۱۰ ارب ۹۳ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے، جو کہ ۱۰۳ فی صد کا اضافہ ہے۔ مواصلات کے لیے رقم ۷۸ فی صد کے اضافے کے بعد ۲۶ ارب ۵۴ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ صنعت اور معدنیات کے لیے رقم ۱۷٫۵ فی صد کے اضافے کے بعد ۹۶ ارب ۳۵ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔

اگلے سال کے بجٹ میں دفاع کے لیے ۱۹۰ ارب دس کروڑ روپے رکھا گیا ہے، جبکہ سالِ رواں میں یہ رقم ۱۷۵ ارب روپے تھی یعنی اس میں ۸٫۶ فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اضافہ افراطِ زر کے اثر کے بعد صحیح معنوں میں اضافہ نہیں ہے اور دفاع کے نگراں اس سے خوش نہیں ہیں کیونکہ ماہرین کی عام رائے یہ ہے کہ دفاعی نظام کو جوں کی توں حالت پر قائم رکھنے کے لیے دفاعی بجٹ میں پندرہ فی صد کا اضافہ ہونا چاہیے، لیکن چونکہ دفاعی اخراجات کو غیر پیداواری نوعیت کا سمجھا جاتا ہے اس لیے وزیرِ خزانہ نے دفاعی بجٹ میں صرف ۸٫۶ فی صد کا اضافہ کرنا مناسب سمجھا۔

۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ سے مرکزی حکومت کی نئی اقتصادی پالیسیوں کے معترضین کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ پچھلے بیس مہینوں میں، جب سے ان نئی پالیسیوں کا آغاز ہوا ہے، معترضین کا یہی کہنا تھا کہ ترقیاتی اخراجات میں کافی کمی اور حکومت کی نگرانی میں تیار ہونے والی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے سے معیشت کی کمر ٹوٹ رہی ہے۔ یہ کہ حکومت اقتصادی ترقی اور روزگار کے مواقع کھو رہی ہے۔ لیکن معترضین یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اُس وقت حکومت کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ نویں دہے کے آخری نصف حصے کی اعلیٰ شرح ترقی کو جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا، کیونکہ یہ شرح ترقی مجموعی مالی خسارہ اور غیر ملکی زرمبادلہ میں برابر بڑھنے والے خساروں کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۹۹۱ء میں، جب کہ موجودہ حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی، ملک کے پاس درآمدات کے سلسلے میں صرف پندرہ دن کے لیے زرمبادلہ تھا اور ملک کے سونے کا ذخیرہ رہن رکھا جا چکا تھا۔ اس لیے حکومت نے معاشی توسیع کے مقابلہ میں مالی استحکام کو ترجیح دی، جیسا کہ پچھلے ۲۰ مہینوں کے مالی نظم و نسق سے ظاہر ہے۔ حکومت کے پاس مالی سطح پر کمر کسنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ حکومت نے اقتصادی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا ہے، جو پچھلے چالیس سال کی پالیسیوں سے بالکل الگ تھیں۔ ان اصلاحات کے تحت صنعتی اور تجارتی اداروں پر قیمتوں سے لائسنس اور کنٹرول کا نظام ختم کیا گیا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کے سودوں، بینک کاری اور غیر ملکی سرمایہ کے آنے پر پابندیوں کو کم کیا گیا۔ اس کے علاوہ، مجموعی مالی خسارہ میں تقریباً چار فی صد کی کمی کی گئی، جو ترقیاتی اخراجات میں نیز خوراک اور کیمیاوی کھادوں کو دی جانے والی سرکاری امداد میں کمی کر کے ہی ممکن ہو

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

یوجنا، نئی دہلی

ایم۔ایل۔ کپور

بجٹ اور دیہی ترقی: تخصیص زر میں بے مثال اضافہ

مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے کہ بھارت دیہات میں آباد ہے اور جب تک دیہات ترقی نہیں کریں گے ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے ملک کی منصوبہ بند ترقی کے عمل میں دیہی ترقی پر متواتر زور دیا جاتا رہا ہے۔ چونکہ دیہات کی بیشتر آبادی کی روزی روٹی زراعت پر منحصر ہے، اس لیے پچھلے پنج سالہ منصوبوں میں زرعی ترقی پر ہی زور دیا گیا ہے۔ ایک حد تک زراعت اور دیہی ترقی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے لیکن بعد ازاں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ صرف زرعی ترقی دیہی ترقی کا خاطر خواہ جواب نہیں ہے، کیونکہ دیہات میں آبادی بڑھ رہی ہے اور فی کس اراضی کم ہوتی جا رہی ہے۔ دیہات کے لوگوں کی غریبی اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے اور کروڑوں دیہی باشندوں کو روزگار اسی صورت میں مہیا کیا جا سکتا ہے، جب دیہات میں روزگار کے نئے وسیلے پیدا کیے جائیں، دیہات کے لوگوں کی کام کرنے کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے، انھیں خود روزگار پیدا کرنے کی ضروری تربیت دی جائے اور دیہات میں کافی سرمایہ لگایا جائے۔

اس نصب العین کے حصول کے لیے وزارت زراعت میں دیہی ترقی کا ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا تھا، جسے بعد میں وزارت میں تبدیل کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ اس وزارت کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ گزشتہ ایک برس سے وزیر اعظم خود اس وزارت کے نگراں ہیں۔

اقتصادی جائزہ

حکومت دیہی ترقی [illegible] کو کتنی اہمیت دیتی ہے [illegible] کے اقتصادی جائزے [illegible] جس کے مطابق، سال بھر [illegible] تحت ایک کروڑ دو لاکھ دنوں [illegible] مہیا کیا گیا۔ نہرو روزگار یوجنا کی لاگتوں کا مرکزی حکومت ۸۰ فیصد سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ یہ اسکیم ۱۹۸۳ء میں شروع کی گئی تھی۔ ۱۹۹۲ء تک اس اسکیم کے تحت ۱۵ لاکھ ۱۲ ہزار نوجوانوں کو ۴۰۰ کروڑ روپے کے قرضے دیے گئے۔ صرف ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۹۳ ہزار نوجوانوں کو ۲ کروڑ روپے کے قرضے دیے گئے تھے۔

بجٹ

آئندہ برس کے بجٹ میں بھی نہ صرف اس رجحان کو برقرار رکھا گیا ہے بلکہ دیہی ترقی کے مختلف کاموں کے لیے تخصیص زر میں گزشتہ برس کے مقابلے میں ۶۲ فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے، جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ چنانچہ یہ رقم ۳۶۱۷ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۵۰۱۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔

[illegible] ترانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اپنی بجٹ تقریر میں تسلیم کیا ہے کہ زراعت اور دیہی ترقی کے [illegible]

[illegible] علی پانی وغیرہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ چونکہ دیہات کی ترقی کا عمل صرف زراعت پر ہی منحصر نہیں رہ سکتا اس لیے بجٹ میں دیہی ترقی کے مختلف شعبوں کے لیے جن میں روزگار، صحت، تعلیم، پانی، مکانات وغیرہ شامل ہیں، تخصیص زر بڑھا دی گئی ہے حالانکہ ان کاموں کے لیے زیادہ تر خرچ ریاستوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، لیکن مرکزی حکومت نے اپنی طرف سے اس مقصد کے لیے اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔ بجٹ میں منصوبے کے تحت ملنے والی امداد میں جو اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے سماجی خدمات کے شعبوں میں مرکزی منصوبے کے پروگرام شروع کیے جا سکتے ہیں۔

بجٹ سے دیہات میں روزگار مہیا کرنے اور سرمایہ پیدا کرنے والی اسکیموں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی

روزگار کے ذرائع فراہم کرنا ہے۔ رواں مالی سال میں اس مقصد کے لیے ۲۶۴ کروڑ روپیہ مختص کیا گیا تھا جبکہ اب یہ رقم بڑھا کر ۳۲۳ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے۔ اس رقم سے سال بھر میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ افراد کے لیے روزگار فراہم کرنے کی امید ہے۔ آئندہ برس سے تخصیص دیہات کے نوجوانوں کو روزگار کی تربیت کے کام سے دیہات سے ۱۵۳ لاکھ نوجوانوں کو تربیت دی جائے گی۔

دیہات میں پانی کی بہم رسانی کے لیے رواں مالی سال میں ۴۶۲ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی اب یہ رقم بڑھا کر ... کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے۔ دیہی ترقی کے پروگراموں سے بھی بجٹ میں اضافہ کیا گیا ہے۔

دیہات کی ترقی کے مختلف پروگراموں کے لیے آئندہ برس کل ۴۴۳ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے اس میں سے TRYSEM کے لیے ۱۳ کروڑ روپیہ، DDP کے لیے ۰۰ کروڑ روپیہ، DPAD کے لیے ۵۰ کروڑ روپیہ، DDP کے لیے ۵۰ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ مربوط دیہی ترقی کا پروگرام دیہات میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کو روزگار کے آمدنی بخش ذرائع مہیا کرکے غریبی دور کرنے کا پروگرام ہے۔ آئندہ برس کے بجٹ میں اس پروگرام کے لئے ۶۳۰ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔ خود روزگار کے لیے دیہات کے نوجوانوں کو تربیت دینے کی غرض سے کئی مرکزی اور ریاستی ادارے اور رضاکار ادارے کام کر رہے ہیں۔ جہاں مرکزی اداروں کو سو فیصد مالی امداد مرکزی حکومت دیتی ہے، وہاں دیگر اداروں کو نصف امداد مرکز اور نصف امداد ریاستی حکومت دیتی ہے۔

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کی بہتری کے پروگرام وہاں خشک سالی سے نپٹنے کے لیے طویل مدتی پروگرام ہیں۔ یہ پروگرام جس سے

... کی جاتی ہے اور مالی وسائل مہیا کئے جاتے ہیں، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی امداد سے چلائے جاتے ہیں۔ اس طرح پارلیمان کی ہدایت سے جنگل بانی اور ... کے پروگرام مرتب کئے گئے ہیں۔

جواہر روزگار یوجنا کے تحت روزگار مہیا کرنے کی اسکیموں کے لئے مرکزی حکومت ۳۳ کروڑ روپیہ مہیا کرے گی۔

زرعی اصلاحات

آئندہ برس کے بجٹ میں اصلاحات اراضی کے لیے ۳۵ کروڑ ۵ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس کا مقصد زمین کے نظام کو درست کرنا اور اصلاحات کے کاموں میں نئی ٹیکنالوجی کو شامل کرنا ہے۔

دیگر پروگرام

دیہی ترقی کے دیگر پروگراموں کے لئے ۱۹۹۳-۹۴ کے بجٹ میں ۳۵ کروڑ ۵ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے اس میں سے ۱۷ کروڑ روپے ... کی ترقیاتی اسکیم اور ۶ کروڑ ۵۴ لاکھ روپیہ دیہی ترقی کی رضاکارانہ سرگرمیوں کے لئے مخصوص ہے۔ دیہی روزگار کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے افراد کی تنظیم کے لیے ایک کروڑ ۲۹ لاکھ روپیہ، پنچایتوں کی ترقی و بہتری کے لیے ایک کروڑ ۲۸ لاکھ روپیہ اور خصوصی مسائل والے علاقوں میں سڑکوں کی مرمت و تعمیر کے لیے ۱۲ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔ دیہات میں خواتین اور بچوں کی ترقی و بہبود DWCRA ایک خصوصی اسکیم ہے جس کا مقصد خواتین کے لیے آمدنی بخش اسکیمیں چلانا ہے۔ ڈیری کی اسکیموں کے لیے بجٹ میں ۸۵۲ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت دیہات کے لوگ شہروں میں چلنے والی بڑی بڑی ڈیریوں کے لیے دودھ مہیا کرتے ہیں۔

مچھلی پالن : مچھلی پالن بھی دیہی ترقی کا

اس پروگرام ہے جس کے لیے بجٹ میں ۱۱۶ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔

جنگل بانی اور جنگلی جانور

اس مقصد کے لیے بجٹ میں ۲۲۳ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے جو جنگل بانی، جنگلات کے تحفظ، زمین کے کٹاؤ کو روکنے اور جنگلی جانوروں، قومی پارکوں کے تحفظ پر خرچ کیا جائے گا۔ چائے، کافی، ربڑ، گرم مسالوں کی کاشت کی ترقی و فروغ کے لیے ۱۰ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

خوراک و گودام

دیہات میں خوراک کے تحفظ کے لیے گودام تعمیر کرنے اور پھلوں و سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے عمل کے لیے ۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

امداد باہمی

امداد باہمی انجمنیں دیہی ترقی کے لئے اہم کام انجام دے رہی ہیں۔ خاص طور پر کم ماندہ ترقی یافتہ ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں یہ ادارے بہت کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ ان اداروں کی حوصلہ افزائی کے لیے آئندہ بجٹ میں ۲۳۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

لامرکزیت

دیہات میں ترقی کے عمل کے لیے مرکزی بجٹ میں سال بہ برس اضافہ ہو رہا ہے لیکن دیہات میں کام کرنے والے ادارے اکثر صوبائی یا مرکزی صدر مقام سے جوابات کا انتظار کرتے رہتے ہیں، جس سے ترقی کے بہت سے ضروری کام وقت پر نہیں ہو پاتے۔ اس لیے جیسا کہ وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں کہا ہے کہ جب نیا پنچ

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

جگدیش وبھاکر

بھارت روس تعلقات

دوستی اور تعاون کے بھارت روس معاہدے پر روس کے صدر بورس یلسن اور بھارت کے وزیر اعظم سری نرسمہا راؤ کے دستخط کرنے سے روپیہ۔ روبل شرح تبادلہ کے طویل معاملے کے سلسلے میں معاہدے کے ذریعہ دونوں ملکوں نے نئے تعلقات کو ایک شکل دینے کے لیے ایک ٹھوس بنیاد رکھی ہے۔

مذکورہ معاہدے میں دفاع، سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت تمام شعبوں میں بہتر تعلقات کو فروغ دینے کے لیے اقتصادی، سیاسی اور دیگر شعبوں میں تعاون کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں جنگی سلامتی کی دفعہ شامل نہیں ہے، جسکے تحت سابق سوویت یونین اور بھارت ایک دوسرے کے دفاع کے لیے پابند تھے، لیکن اس میں دونوں ملکوں کی علاقائی سالمیت کے لیے حمایت اور مدد کرنے کا عہد کیا گیا ہے۔ معاہدے کی تمہید میں ۱۹۷۱ میں معاہدے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس کے تحت بیرونی حملے کی صورت میں بھارت اور سابق سوویت یونین کو ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرنا تھا۔

دفاع کے شعبے میں تعاون کے سلسلے میں تین نکاتی معاہدے پر سابق وزیر دفاع سری شرد پوار اور روس کے وزیر دفاع جنرل پی۔ ایس۔ گراچیف کے دستخط کرنے سے ان نئے تعلقات کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے، جنھیں دونوں ملک فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات اس حقیقت کے باوجود ہے کہ دونوں ملک اب سلامتی کے بارے میں یکساں نظریہ نہیں رکھتے ہیں۔ معاہدے کے تحت اس دفاعی ساز و سامان کے لیے جو بھارت نے سابق سوویت یونین سے خریدا تھا، زائد حصوں، پرزوں کی سپلائی کے انتظامات کیے جائیں گے۔ معاہدے میں ... ء

سے متعلق زائد حصے پرزے تیا...

کارکردگی کو بہتر بنانے ...

میں زائد حصے پرزے تیار کرنے ...

کرنے پر ٹیکنالوجی کی منتقلی ...

بھارت میں فیکٹریاں یہ حصے پرزے ...

روس کے صدر یلسن نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ چونکہ دونوں ملکوں نے معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی ملک کسی تیسرے فریق کے دباؤ کی وجہ سے اس سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ قیاس آرائی ختم ہو گئی ہے کہ روس امریکی دباؤ کے آگے جھک سکتا ہے اور بھارت کو ۱۹۹۵ء تک کرائیوجینک انجن سپلائی کرنے اور ۱۹۹۷ تک ٹیکنالوجی کی منتقلی کرنے کے اپنے وعدے سے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اسلام آباد کو کسی قسم کی فوجی اور تکنیکی امداد کے لیے ان کے واضح انکار سے اس ترجیح اور اہمیت کا اظہار ہوتا ہے، جو ماسکو نئی دہلی کو دیتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا برمحل ہے کہ قرضہ کا معاملہ طے ہو جانے سے دفاعی قرضوں سے متعلق معاہدے پر دستخط کرنے میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ بھارت کی مسلح افواج کے لیے ۷۰ فی صد سے زیادہ ساز و سامان روسی ساخت کا ہے۔ ۱۹۶۰ کی بات ہے جب اسلحہ کی امداد کے پہلے بھارت روس معاہدے پر دستخط کیے گئے تھے اور بھارت نے سابق سوویت یونین ...

... ط ...

... ی

یلیلیس نو چاہو رکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنا فوجی ساز و سامان فروخت کرنا ہوگا اور کچھ رقم کمائی ہوگی جس کی اسے بہت زیادہ ضرورت ہے۔

ایک قطبی دنیا کے پیدا کردہ مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ انہیں فوجی اور سیاسی شعبوں میں ایک دوسرے کی مدد اور حمایت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ روسی صدر یلسن کی ٹیم نے دفاع کے شعبے میں تعاون کے معاملے پر تبادلۂ خیالات کے لیے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس کی ایک وجہ سابق سوویت یونین سے نئی دہلی کے خریدے ہوئے طیاروں اور ٹینکوں سمیت ساز و سامان کے لیے زائد حصے پرزے سپلائی کرنے کے سلسلے میں آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ (سی آئی ایس) کے دیگر اراکین کی معذوری بھی ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

روس نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ صنعت کے لیے اس قسم کی سپلائی کے ذرائع کا جائزہ لینے کے علاوہ ماسکو بھارت کو سپلائی کرنے کے سلسلے میں خود اپنے مسلح افواج کے ذخائر کا بھی جائزہ لے رہا ہے۔ یہ بات خاص طور سے ان زائد حصے پرزوں کے بارے میں جو اب روس میں تیار نہیں کیے جا رہے ہیں۔ روس کے دفاعی ماہرین اب بھارت کے دفاعی ماہرین کے ساتھ تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ بھارت کو درکار زائد حصے پرزے اور دفاعی ساز و سامان کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔ لوگ اس بات پر بھی تبادلہ خیالات کر رہے ہیں کہ یہ زائد حصے پرزے اور ساز و سامان کیسے حاصل کیا جائے۔ انہیں کہاں تیار کیا جائے تاکہ بھارت کی دفاعی صلاحیت کسی طرح سے بھی متاثر نہ ہو۔

روسی حکومت نے تجویز پیش کی ہے کہ مگ-۲۱ طیاروں کے زائد حصے پرزے مشترکہ طور سے تیار کیے جائیں اور انہیں ان مختلف ممالک کو مشترکہ طور سے فروخت کیا جائے، جہاں اب اس قسم کے ۶۸ سے زیادہ لڑاکو طیارے اڑ رہے ہیں۔ بھارت نے ماسکو سے ۵۰ لاکھ ڈالر کی تخمینہ شدہ مالیت کے مزید ۲۵ مگ-۲۱ لڑاکو طیارے خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ روس کی اس تجویز اور بھارت کے اس فیصلے سے باہمی طور سے ہند بھارت روس تعاون کو مزید فروغ حاصل ہوا ہے۔ دراصل روسی تجویز کا مقصد یہ ہے کہ بھارت کو روس میں تیار کردہ ساز و سامان کے لیے بھی زائد حصے پرزے جوڑنے، ان کی سروس کرنے اور انہیں فراہم کرنے کا مرکز بنایا جائے۔ اس کے علاوہ بھارتی فضائیہ کے پاس زائد حصے پرزوں کی اب صرف ایک سال کی سپلائی باقی ہے۔ بھارتی فضائیہ کے پاس ۴۰۰ مگ-۲۱ بی آئی ایس طیارے ہیں۔

روس نے مگ-۲۱ بی آئی ایس طیاروں کو جدید ترین بنانے کے لیے بھی ایک منصوبہ پیش کیا ہے، جس سے ان کی عمر میں دس سال سے پندرہ سال تک کا اضافہ ہو جائے گا۔ جدید کاری کے منصوبے میں مگ-۲۱ کے بازوؤں میں ترمیم، آگ پر قابو پانے کا ایک نیا راڈار، ایک جدید ترین انجن وغیرہ شامل ہیں۔

موجودہ معاہدے بھارت کی مسلح افواج کے لیے بہت مفید رہے گا کیونکہ ہماری مسلح افواج کو زائد حصوں پرزوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ روس کی دفاعی صنعتوں کے لیے بھارت سب سے بڑی منڈیوں میں سے ایک منڈی ہو سکتا ہے۔ روس کی ان دفاعی صنعتوں میں بہت سی صنعتیں خستہ حال ہو چکی ہیں اور ان کی پیداوار تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ ستمبر میں سابق وزیر دفاع شری شرد پوار کے دورۂ ماسکو سے دونوں ملکوں کے درمیان دفاعی تعاون کے لیے نئے مواقع پیدا کرنے میں بہت زیادہ مدد ملی تھی۔

روسی صدر نے بھارت کی اس بات کی غیر مبہم حمایت کی ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ حصہ ہے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور دیگر بین الاقوامی فورموں میں بھارت کی بھرپور حمایت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ روس بھارت کی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ روسی صدر کی حمایت، ان کے وعدے اور ان کے زور کو ان کے اس غیر مبہم بیان کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کا ملک بھارت کے دفاعی پروگرام میں اس کی مدد کرے گا۔ اس کے علاوہ ان کی رائے کہ بین الاقوامی امور میں بھارت، روس اور چین کو اہم کردار ادا کرنا ہے، بہت ہی پُرمعنی اور اہم ہے۔

●

بقیہ: فلاح و بہبود ۔ رجحانات ایک نظر میں۔

● بھارت کی آبادی کا تقریباً دس فی صد حصہ نابینا یا بہرہ ہونے کی وجہ سے معذور ہے یا جسمانی یا ذہنی طور سے معذور ہے۔ ان لوگوں کو اصل دھارے میں شامل کرنے کے عظیم چیلنج سے نپٹنے کی غرض سے معذور افراد کی بہبود کے لیے ایک قومی پالیسی وضع کی جا رہی ہے۔

● درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے مفاد کے لیے متعدد نئی اسکیمیں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات کے ایک حصے کے طور پر شروع کی گئی ہیں۔ ان پروگراموں اور اسکیموں پر عمل درآمد کے لیے ۱۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔

● درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق نہ رکھنے والے طلبا کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک غیر ملکی فیلوشپ پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

● ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے نام سے دو انعامات (ایک قومی اور دوسرا بین اقوامی) قائم کیے گئے ہیں۔ ان انعامات سے عوامی خدمت میں مصروف افراد اور اداروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ ان انعامات سے عوامی خدمت کے قومی اور بین الاقوامی شعبوں میں ڈاکٹر امبیڈکر کی خدمات کی بھی تشہیر ہوگی۔

● ان کاموں میں جنہیں ابھی تک خاص طور سے حکومت کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے، غیر سرکاری تنظیموں کی شرکت اور شمولیت حاصل کرنے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔ آزادانہ مالی اور تکنیکی امداد کے ذریعہ ان غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

●

بقیہ: بجٹ اور دیہی ترقی

قانون عمل میں آ جائے گا۔ جو آئین میں ۷۲ ویں ترمیم کر کے وضع کیا گیا ہے، تو دیہی پنچایتوں کو وسیع اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ مرکزی اداروں کا کردار کم ہوگا اور دیہی ترقی کے عمل میں دیہات کے عوام کا ہاتھ مضبوط ہوگا اور اس کام میں ان کی زیادہ سے زیادہ شرکت رہے گی۔

●

ارونا شرما

اسکیموں کی بہتر تکمیل کیسے ممکن ہے

ہے تو اُس کی نسل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن
یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ کیا ہمارے منصوبہ بند
ترقیاتی حاصل کیا جا سکتا ہے [illegible] روزگار
کے نئے پروگرام اور [illegible]

> مصنفہ کا خیال ہے کہ پروگراموں کی تعداد کو محدود کیا جانا چاہیے۔ اس سے ان کے عمل درآمد کرنے میں زیادہ بہتری پیدا ہوگی اور ان کی مناسب کامیابی کے لیے ان پر قابو بھی پایا جا سکے گا۔

آٹھویں پانچ سالہ منصوبے

(۹۷ - ۱۹۹۲ء) اور سالانہ منصوبے (۹۳-۱۹۹۲) میں پورا روزگار مہیا کرنے اور کم از کم موزوں معیار زندگی مہیا کرنے کے یقینی اہتمام پر زور دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اُس میں منصوبہ بندی کے عمل کی لامرکزیت، اُجرتی روزگار پر زور اور ذاتی روزگار کے ایسے پروگرام شامل ہیں جو افراد کی حق املاک پر مبنی ہوں۔ چنانچہ ایسے پروگراموں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جو عوامی نوعیت کے ہوں اور جن کی منصوبہ بندی اور تکمیل میں عوام کی رائے کو دخل ہو۔

مذکورہ بالا موضوع کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ اہم سوال اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا طریقۂ عمل کو ٹھوس اور آسان کرنے کے لیے کوئی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اسکیموں پر عمل درآمد کرنے والا کوئی شخص ریاستوں اور مرکز کی طرف سے جاری کی جانے والی اسکیموں کی تعداد کو دیکھ کر پریشان

سو جانا ... کیوں کر جائے اس
شامل کیا جائے اُن کے عمل
کا کام مختلف اداروں کے
ان تمام اسکیموں کی منصوبہ [illegible]
عوامی اشتراک عمل کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ کلکٹر ضلع میں انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے اس لیے تمام ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کی ذمہ داری اُسی کی ہوتی ہے۔ لیکن وہ بہت پیا نتائج دکھانے کے لیے ایک ہی نوعیت کی بہت سی اسکیمیں اور دیہی ترقی کے پروگرام شروع کر دیا ہے۔ کئی ایک کاموں کو ہاتھ میں لے کر کلکٹر کو اسکیموں کو عمل میں لانے، ضلع میں صلاحیتوں کا پتہ لگانے اور ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان اسکیموں میں رابطہ قائم کرنے۔ ان پر عمل کی پیش رفت کا جائزہ لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان مختلف اسکیموں کو عمل میں لانے کے ذمہ دار حکام کی طرف سے جب عوامی اشتراک کے لیے ایک عام شخص سے کہا جاتا

[illegible] مسئلوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے لیے ساری اسکیموں کو اکٹھا کرنے پر غور کریں۔ کتابت کے اقدامات کے حسب ضروری افرادی قوت اور ساز و سامان میں کمی کرنے کی غرض سے سب سے اچھا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک جیسی اسکیموں کو یکجا کر دیا جائے۔

درج فہرست والوں اور درج فہرست قبائل کے افراد کے لیے ذاتی روزگار کی ملتی جلتی اسکیمیں ریاستی اور مرکزی پروگراموں میں شامل ہیں۔ ایسی ایک اسکیم مربوط دیہی ترقی کے پروگرام میں ہے ریاستی سرکاروں نے بھی اس مقصد کے لیے اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں اور اضلاع کے صنعتی مراکز کھادی و دیہی صنعتی کارپوریشن اور کھادی و دیہی صنعتوں کے

... دوں کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں اس سے ... بہت سی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں مثلاً ایک ہی کام کئی ادارے کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ایک ادارے کو معلوم ہی نہ ہو کہ کام کن کن اداروں سے کروا رہے ہیں اور اُن تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے ان حالات میں مختلف اداروں کی طرف سے کی جا رہی کوششوں میں کریمپ ایک کام کو بار بار کرنے کے رجحان اور بیجا فائدہ اٹھانے کے عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ترقیاتی اداروں اور ... کے لیے ایک ہی اسکیم پر عمل کیا جائے اور ریاستی و مرکزی اخراجات کے بارے میں حساب کتاب جمع خرچ کر لیا جائے

ایک اور مثال کے طور پر آبپاشی کے لیے جو کنواں کھدوا دیا جاتا ہے اس کے پیچھے سرمایہ (۱) غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے افراد کے لیے ... کی اسکیم ... ذاتوں، قبائل کے فائدے کے لیے اسکیم یا ... دوری سے نجات دلائے گئے افراد کی امداد کے لیے مہیا کیا جاتا ہے (۲) ... غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے الگ الگ کسانوں کو بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ (۳) اور محکمۂ زراعت بھی اس مقصد کے لیے قرض دیتا ہے اور یہ رقم محکمۂ زراعت اور درج فہرست قبائل کی کارپوریشن کے کھاتے میں جمع خرچ کی جاتی ہے۔

اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے اور اسکیم پر عمل کرنے والے دونوں افراد کو ہی بہت پریشانی اور تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور رقوم کے بے جا استعمال کا راستہ ہموار ہوتا ہے جبکہ یہ کام کئی ادارے کر رہے ہیں اس لیے کنویں کھدوانے کی اسکیم پر عمل درآمد میں صحیح کے لیے بجلی بورڈوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی اس کام کو دیہی ترقی کے دیگر کاموں سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اس سارے تصور سازوں پر زور دیا جا سکتا ہے کہ وہ اسکیموں کی تعداد کم کریں تاکہ اسکیموں پر عمل کرنے والے اور ان سے فائدہ اٹھانے والے عوام ان سے فائدہ اٹھا سکیں

نیا طریقۂ کار

منصوبے کی منتارا اور طریقۂ کار میں اصلاح کی موجودہ ضرورت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صرف دو قسم کی اسکیمیں ہونی چاہئیں جن میں سے ایک شہری علاقوں کے لیے اور دوسری دیہی علاقوں کے لیے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ شہری اور دیہی علاقوں کی اسکیموں میں مشابہت ہو کیونکہ بہت سے شہری علاقے وسیع تر دیہی علاقے ہی ہیں جہاں کی معیشت کا انحصار زراعت و دیگر متعلقہ دیہی سرگرمیوں پر ہے

شہری علاقوں کے لیے اسکیموں کے پہلے مجموعے کا مقصد (۱) ذاتی روزگار (۲) گروپ یا افراد کے مجموعے کے لیے روزگار (۳) اجتماعی ترقی ہو سکتا ہے۔

ذاتی روزگار یا گروپ کے لیے روزگار میں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل اور خواتین کے تناسب مقرر ہونا چاہیے۔

اسی طرح اجتماعی ترقی کے متعلق اسکیموں کے دوسرے مجموعے میں (۱) جواہر روزگار یوجنا جس پر عمل پنچایت کے سپرد ہو (۲) اور وہ اسکیمیں شامل کی جا سکتی ہیں جن پر ضلع کی سطح کے محکمے عمل کریں۔

اس کے علاوہ یہ کہ ایک اسکیم کے لیے امداد دینے کا مرکز ایک ہی ہونا چاہیے۔ جیسے کہ پینے کا صاف پانی مہیا کرنا، ٹیوب ویل یا سوراخ کے ذریعہ کنواں، پائپ لائن بچھانے، بلندی پر ٹینک تعمیر کرنے یا آبپاشی کے ذخیرے سے پانی مہیا کرنے کے کام ایک ہی ادارے کے سپرد ہونے چاہئیں۔

وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک ہی جیسی اسکیموں کو ایک ہی فہرست میں شامل کیا جائے جن کو ایک ساتھ اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ ان اسکیموں پر سرمایہ لگانے کے لیے ریاستی اور مرکزی سرکاروں میں حساب کتاب میں جمع خرچ کی اجازت دی جانی چاہیے لیکن اس عمل سے اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے والوں یا ان سے فائدہ اٹھانے والوں کے راستے میں کوئی اڑچن پیدا نہ ہو۔

کنٹرول

وقت کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ کامیابیوں کا اندازہ معیار کی بنا پر کیا جائے جس کے لیے پیمانہ پورا روزگار اور سب کے لیے موزوں معیار زندگی رکھا جائے۔ آج اسکیموں کی پیش رفت کا اندازہ لگانے کے لیے متعلقہ لوعیت کی اسکیموں کو یکجا کرکے وقت اور قوت ضائع کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مقصد کے لیے بھی ایک ہی قسم کی اسکیموں کو اکٹھا کیا جائے۔ لاگو کرنے، منصوبہ بندی، مربوط طریقۂ کار، باہمی تال میل کا مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے اگر ضلع میں منصوبہ بندی اور عمل کرنے والے کے ہاتھ اسکیموں کی تعداد کم کرکے مضبوط کیے جائیں اور انھیں تال میل اور عمل درآمد کی زیادہ سہولت مہیا کی جائے۔ اسی صورت میں اسکیموں میں عوام کی زیادہ سے زیادہ شرکت کی توقع کی جا سکتی ہے جس سے اسکیموں پر مناسب عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ آج ایک عام آدمی اسکیموں کی تعداد اور انھیں لانے والوں کے ہجوم سے ہراساں سا ہے۔ ضلع کا کلکٹر ان تمام اسکیموں کی پیش رفت کا جائزہ لینے کا ذمہ دار ہے اور انھیں یکجا کرنے کا کام اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا ہمارا دیہی ترقی کا نظام ایک فرد واحد یعنی کلکٹر کی

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ایم۔ بی۔ پاٹل

زراعتی قرضوں کی انجمنیں : انہیں جھنجوڑنا کیوں ضروری ہے

بھارت میں امداد باہمی کا نظام دنیا کے سب سے بڑے امداد باہمی نظاموں میں سے ایک ہے۔ یہاں امداد باہمی انجمنوں کی تعداد ۳،۴۸،۰۰۰ ہے جن کے ممبروں کی تعداد ۱۵ کروڑ اور کُل کاروباری سرمایہ ۴۰،۰۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔ ان اداروں کی طرف سے جو زراعتی قرضے دئے جاتے ہیں وہ ۶۵ فی صد دیہی آبادی کو حاصل ہوتے ہیں اور امداد باہمی زرعی قرضوں کا کُل کاروبار ۵۴ ہزار کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۶ء کے عرصے میں زرعی قرضے دینے والی انجمنوں کی جو تنظیم نو کی گئی ہے اُس سے اُن کی تعداد ۲،۱۲،۱۷۹ سے کم ہو کر ۹۰،۸۱۰ رہ گئی ہے۔ اب وہ ملک کے ۹۲.۰ فی صد دیہات میں قرضے تقسیم کرتی ہیں۔ ہر انجمن اوسطاً چھ دیہات میں قرض دیتی ہے۔ لیکن جہاں کیرل میں دیہات کی اوسط ایک ہے وہاں اڑیسہ میں ۱۷ ہے۔ ان انجمنوں کے ممبروں کی کُل تعداد ۱۹۶۶-۶۷ء میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ تھی، جو ۱۹۸۷-۸۸ء میں بڑھ کر ۴ کروڑ ۷۳ لاکھ ہو گئی۔ جن میں بہت سے ارکان ایسے بھی تھے جو کسان نہیں تھے۔ فی انجمن ارکان کی اوسط ۱۹۶۱ء میں ۸۰ تھی جو ۱۹۸۸ء میں ۹۶۱ ہو گئی۔ تاہم بہت سی ریاستوں میں ارکان کی اوسط تعداد قومی اوسط سے کم ہے۔ یہ تعداد گجرات میں ۳۱۰، مہاراشٹر میں ۳۰۲ اور مغربی بنگال میں ۲۰۶ تھی

لیکن افسوس ...

انتظامیہ اور مالی لحاظ سے

امداد باہمی ادارے

تجارت میں ...

میں کوئی رکن صرف ...

والا یا ... نہیں ہوتا ... انجمن کا سرگرم رکن ہوتا ہے ... شراکت کار امداد باہمی جمہوریت کی جان ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ زرعی قرضے دینے والی ان انجمنوں میں سرگرم شرکت کرنے والے ارکان کی تعداد بہت کم ہے جس سے ان انجمنوں کی کارکردگی افسوسناک حد تک گر گئی۔

اگرچہ رکنیت میں بھاری اضافہ ہوا ہے، لیکن ان انجمنوں سے قرضے لینے والے ممبروں کا کُل ممبروں کے مقابلے میں تناسب بتدریج گر رہا ہے۔ ۱۹۶۰-۶۱ء میں تناسب ۵۴.۰ فی صد تھا جو ۱۹۸۷-۸۸ء میں گر کر ۳۴ فیصد رہ گیا جس کا مطلب ہے کہ ان انجمنوں کے ۶۷ فی صد ارکان اس کاروبار میں شریک نہیں ہوتے

تامل ناڈو ... ریاستوں میں قرضے لینے والوں کا تناسب ۴۲ فی صد ... اوسط ... آسام ... صرف ۱۶ ...

... ۳۵۳، ۲۲۵ ... ۲۹۹ تھی۔ یہ تعداد مہاراشٹر میں صرف ...، کرناٹک میں ۱۰۲، گجرات میں ۱۲۴، آندھرا پردیش میں ۲۰۷، پنجاب میں ۲۶۳، راجستھان میں ۲۶۹ اور تامل ناڈو میں ۲۴۳ تھی۔

مالی کمزوری

کسی امداد باہمی انجمن کی مالی مضبوطی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُس کے ارکان سرمایہ حصص کے طور پر یا حسابات میں کتنا روپیہ جمع کراتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں فی انجمن سرمایہ حصص ایک لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ تھا۔ سب سے زیادہ یعنی ۴ لاکھ ۱۷ ہزار سرمایہ کی اوسط کیرل میں اور سب سے کم یعنی ۱۳۵۰۰ منی پور میں تھی۔ ۱۹۷۵ء میں ان انجمنوں کا ادا شدہ سرمایہ حصص ۳۲۷ کروڑ

روپے تھا جو ۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۸۳۱٫۵۹ کروڑ روپے ہوگیا۔ یعنی سالانہ شرح اضافہ ۸٫۹ فی صد رہی۔ ہر انجمن کی ملکیت سرمایہ کی اوسط جو ۱۹۷۵ء میں ۳۰ ہزار روپے تھی ۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ایک لاکھ ۲۲ ہزار روپے تھی لیکن ریاستوں میں اس تناسب میں بہت فرق تھا جہاں یہ تناسب مغربی بنگال میں ۴٫۲۱۲، بہار میں ۲۵٫۲۷۷، آسام میں ۴٫۰۹۸ اور آندھرا پردیش میں ۵۵٫۷۵۹ تھا اور یہاں سرمایہ حصص کی اوسط قومی اوسط سے بہت کم تھی۔ گجرات، کرناٹک، ہریانہ، اترپردیش اور راجستھان جیسی بڑی ریاستوں میں بھی سرمایہ حصص کی اوسط ۱ لاکھ روپے سے کم تھی

بہت کم سرمایہ کی وجہ سے پرائمری زراعتی انجمنوں کو سرمایہ حصص کے لیے سرکار پر بہت انحصار کرنا پڑا چنانچہ ان انجمنوں کے سرمایہ حصص میں حکومت کا اوسط حصہ ۱۵ ہزار روپے تھا — — بہت سی ریاستوں میں یہ سرمایہ ۲ ہزار روپے سے زیادہ تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کیرل میں یہ سرمایہ ۴۴ ہزار روپے سے اور آسام میں ۷ ہزار روپے سے بھی زیادہ تھا۔ لہٰذا اگر حکومت اپنا سرمایہ واپس لے لے تو یہ کوآپریٹو انجمنیں ختم ہو جائیں۔

بنیادی طور پر یہ انجمنیں چھوٹی بچتوں کو فروغ دینے والی انجمنیں ہیں۔ لیکن ان انجمنوں کے سرمایہ میں ترقی کی اوسط شرح ۱۰ فی صد رہی ہے جب کہ قومی اوسط ۲۳ فی صد تھی۔ جون ۱۹۸۸ء میں ان انجمنوں میں جمع کرایا گیا سرمایہ ۸۰۸٫۸ کروڑ روپے تھا جس میں سے ۴۹۱٫۱ کروڑ روپیہ صرف کیرل میں تھا۔ دیکھنے کی اہم بات یہ ہے کہ امدادِ باہمی کے لحاظ سے ترقی یافتہ گجرات و مہاراشٹر جیسی ریاستوں میں بھی انجمنوں کے حساب میں جمع رقوم بالترتیب ۳۰٫۲۳۰ — اور ۱۰٫۳۴۰ — روپے تھیں۔ آسام اور بہار میں جمع کرائی گئی رقوم کی فی انجمن اوسط ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۸٫۱۱۴ — روپے تھی۔ جموں و کشمیر میں یہ اوسط صرف ایک — آسام میں — بہار میں پانچ — اور اڑیسہ میں ۱۶ — تھی۔ صرف تین ریاستوں میں یہ رقوم قومی اوسط سے زیادہ ہیں۔ یہ ہیں کیرل (۶۶۵ روپے)، ہماچل پردیش (۴۰۹ روپے) اور پنجاب (۲۲۵ روپے) باقی تمام ریاستوں میں جن میں ہریانہ، اترپردیش اور آندھرا پردیش بھی شامل ہیں۔ فی ممبر جمع کرائی گئی رقم قومی اوسط سے کہیں کم تھی۔

قرضے اور اُدھار

قومی سطح پر انجمن کی طرف سے دیئے گئے قرضوں کی اوسط ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۴٫۰۹ لاکھ روپے تھی۔ زرعی قرضوں کا جائزہ لینے والی کمیٹی (۱۹۸۹ء) نے سفارش کی ہے کہ ان میں سے ہر ایک انجمن کو کم از کم ۱۱ لاکھ روپے کے زرعی قرضے دینے چاہئیں اس کا مطلب ہے کہ ان انجمنوں نے قابلِ عمل ہونے کے مقرر کردہ نشانے کا نصف بھی حاصل نہیں کیا۔ صرف کیرل اور ہریانہ کی دو ریاستوں میں بالترتیب ۳۵٫۶۲ لاکھ اور ۱۷٫۱ لاکھ روپے کے قرضے دیئے گئے ہر ایک انجمن کی طرف سے دیا گیا قرضہ آسام میں ۱۶٫۱۰۰ روپیہ جموں و کشمیر میں ۳۹٫۷۰۰ مغربی بنگال میں ۸۷٫۶۵۰ روپے اور ہماچل پردیش میں ۹۲٫۷ روپے تھا اور اُتر پردیش (۲٫۹۷ لاکھ روپے)، راجستھان (۳٫۴۵ لاکھ روپے) مہاراشٹر (۳٫۸ لاکھ روپے) آندھرا پردیش (۳٫۴۸ لاکھ روپے) اور گجرات (۴٫۲۳۱ لاکھ روپے) یعنی قومی اوسط کے قریب تھا۔ تھوڑی مقدار میں قرضے دیئے جانے کے نتیجے کے طور پر قومی سطح پر ہر انجمن کی طرف سے اپنے ہر رکن کو دیئے گئے قرضے کی اوسط ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۷۵۰ تھی۔ یہ اوسط قومی اوسط سے زیادہ صرف ہریانہ (۶۸۵ روپے) گجرات (۳۹۲۰ روپے) مہاراشٹر (۳۴۱۰ روپے) اور پنجاب (۳۱۴۵ روپے) تھی۔ جموں و کشمیر میں یہ اوسط انتہائی کم یعنی (۴۴۰ روپے) تامل ناڈو میں (۵۰۰ روپے) اور منی پور میں (۲۰۰ روپے) تھی۔

دیکھا گیا ہے کہ امدادِ باہمی انجمنوں میں منافع کی شرح ۳٫۲۱ رکھی جاتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ہر ایک سو روپے قرض پر ایک انجمن کو ۳٫۲۱ روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر وصولی کے قابل رقمیں اور بٹّے کھاتے کی رقمیں بھی شامل کر لی جائیں تو یہ خسارہ یقیناً اور بھی زیادہ ہوگا۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ انجمن کی سطح پر مجموعی منافع کی شرح دو فی صد ہی رہ جاتی ہے۔ اس طرح مالی اور کاروباری اخراجات کی اونچی سطح، کم کاروبار اور کم مجموعی منافع کے سبب ان انجمنوں کے لیے امدادِ باہمی قرضوں کے کاروبار میں زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں زرعی قرضے دینے والی بہت سی انجمنیں قابلِ عمل نہیں رہیں۔

ان امدادِ باہمی انجمنوں کے منافع پر اثر انداز ہونے والا ایک امر کاروباری سرمائے کے لحاظ سے اُن کا سائز ہے۔ انجمن کے سائز اور کاروباری اخراجات کا بہت بڑا باہمی تعلق ہے۔ کاروباری اخراجات ایک حد تک انجمن کے سائز میں اضافے کے ساتھ کم ہوئے ہیں اور اس کے بعد سائز کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں چنانچہ خسارے کے اس چکر سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ انجمنیں اپنے موجودہ عملے کے ساتھ ہی اپنے کاروبار میں کئی گنا اضافہ کریں۔

منافع کمانے والی انجمنوں کا تناسب ۱۹۷۵ء میں ۵۸٫۱ تھا جو ۱۹۸۵ء میں گر کر ۵۶٫۵ رہ گیا۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ منافع کمانے والی انجمنوں کا تناسب آسام میں (۱۴٫۶) تامل ناڈو میں (۳۵٫۸) مغربی بنگال میں (۴۴٫۷) کرناٹک میں (۴۶٫۱) بہار میں (۵۰٫۱) مہاراشٹر

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

جے ایل کول جلالی

جموّں و کشمیر کی اقتصادی خوشحالی

برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، پھولوں سے بھری وادی، زعفران کے کھیت، تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھیت، ہاؤس بوٹ اور پیچیدہ کام والی دستکاریاں — ان سب چیزوں کی وجہ سے جموں و کشمیر کسی بھی سیاح کے سیاحتی نقشے میں سر فہرست ہوتا ہے لیکن اس ریاست کی قدرتی دولت مندی کی ترجمانی مطلوبہ حد تک اقتصادی خوشحالی کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے۔ جغرافیائی دوری سے لے کر وسائل کی مجبوریوں تک بہت سی دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں۔ چنانچہ مرکز نے فنڈ اور مرکزی امداد دینے کے سلسلے میں ریاست کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔

درحقیقت، جموں و کشمیر ملک میں واحد ریاست ہے، جہاں تمام اضلاع اپنی اقتصادی پسماندگی کی بنیاد پر رعایتی مالیہ کے حقدار ہیں۔ ریاست کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اقتصادی و سماجی ترقی کے سلسلے میں خصوصی توجہ پانے کا بھی مستحق ہے کیونکہ یہ یا تو درج فہرست قبیلوں یا دیگر پسماندہ طبقوں کے درجہ میں آتا ہے۔

اس سرحدی ریاست کے مسائل پر مناسب توجہ دیتے ہوئے، منصوبہ سازی کے دور کی شروعات سے ہی مختلف ترقیاتی سرگرمیوں کے ذریعہ کافی رقوم فراہم کی گئی ہیں۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے دوران، جموں و کشمیر کے لیے مرکزی امداد مجوزہ اخراجات کا تقریباً ۵۸٫۵ فیصد تھی، جو دوسرے منصوبے کے دوران بڑھ کر ۷۳٫ فیصد اور تیسرے منصوبے کے دوران بڑھ کر صد فیصد ہو گئی

کے لیے امداد اخراجات

زیادہ تھی نیز پانچویں او

کے لیے مرکزی امداد منصو

زیادہ تھی۔ چنانچہ اس

حکومت کی فراہم کردہ رقومات کا استعمال ریاستی حکومت نے غیر منصوبہ جاتی اخراجات کے لیے بھی کیا ہے۔

ساتویں اور آٹھویں منصوبے کے دوران جموں و کشمیر کے لیے مرکزی امداد میں بڑھتے ہوئے رجحان نے زیادہ لچکدار شکل اختیار کر لی ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران مرکز نے ۹۱۹٫۳۷ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی تھی جو، ساتویں منصوبے کے دوران بڑھ کر ۲۳۰۶٫۲ کروڑ روپے ہو گئی۔ آٹھویں منصوبے کے لیے منصوبہ بندی کمیشن نے ۴۰۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات کی منظوری دی ہے۔ چنانچہ ریاست کے آٹھویں منصوبے میں سرکاری شعبے کے اخراجات میں ساتویں منصوبے کے مقابلے میں ۹۵٫ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ برسوں میں ریاست اپنے کچھ غیر منصوبہ جاتی اخراجات کے سلسلے میں بھی مرکزی امداد پر منحصر رہی ہے۔

روپے کے ایک خصوصی امدادی پروگرام کو منظوری دی گئی تھی، جس کے بعد سیاحت توانائی، نقل و حمل اور زراعت کے خاص شعبے کے پروگراموں سے متعلق پروجیکٹوں پر عملدرآمد کیا گیا تھا۔

ریاست کی اقتصادی ترقی پر آزادانہ مرکزی امداد کا مفید اثر پڑا ہے۔ جموں و کشمیر کی معیشت بنیادی طور سے زراعت پر مبنی ہے اور کل ریاستی پیداوار کا تقریباً ۵۰ فیصد حصہ اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ریاست میں بجلی کی کمی، آب و ہوا مواصلات اور جغرافیہ کی دشواریوں کی وجہ سے ایک وسیع صنعتی بنیاد کی کمی ہے۔ بہت

باقی صفحہ پر

سب کے لیے مٹھاس

چینی کی پرچون قیمت میں حالیہ اضافے کو بہت سے حلقوں میں ایک ناپسندیدہ اور سخت قدم سمجھا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدم چینی کی پیداوار کو تجارتی لحاظ سے ایک کارآمد سرگرمی بنانے کی حکمت عملی ہے، بصورت دیگر جس کے بہت خراب نتائج ہوتے۔ گذشتہ برسوں میں، چینی کے پورے گنے کی قیمتوں کا تعین کرنے سے متعلق عوامی پالیسی اور کوٹے کے ایک غیر منصفانہ نظام کی وجہ سے نقصان برداشت کرتے رہے ہیں اس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر خستہ حالی آئی ہے اور اس صنعت میں سرمایہ کاری دلچسپی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ نئے اقدامات کا مقصد اس ملک میں چینی کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا اور اس طرح بالآخر قیمتوں اور معیار دونوں کے معاملے میں صارفین کی مدد کرنا ہے۔ حکومت کے ان اقدامات کے پیچھے جو نظریہ اور معقول وجوہات کارفرما ہیں، مندرجہ سوالات اور جوابات کے ذریعہ اُن کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوال: چینی کی قیمتوں میں اضافے سے عام آدمی پر کتنا اثر پڑے گا؟

جواب: اس وقت عام آدمی کو ایک کلوگرام چینی کے لیے ایک روپیہ چالیس پیسے زیادہ دینے ہوں گے۔ اس اضافہ کا حساب اشیائے صرف کی قیمتوں کے عدد اشاریے میں صرف ۱۵.۰۰ فی صد اضافے کی بنیاد پر لگایا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر قیمتوں میں کمی آنی چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی دوسرے شعبے کی طرح، جب رعایتوں میں کمی کی جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ایک مرتبہ حالات معمول پر آجانے اور ان میں استحکام پیدا ہو جانے پر قیمتوں میں کمی واقع ہونی چاہئے۔

سوال: قیمتوں میں یہ اضافہ کیوں ضروری تھا؟

جواب: قیمتوں میں یہ اضافہ اس لئے ضروری تھا کیوں کہ کافی عرصے سے چینی کی صنعت میں منفی رجحانات پائے جا رہے تھے۔ اگر ان رجحانات پر توجہ نہیں دی جاتی تو ان کی وجہ سے چینی کی پیداوار پر بہت زیادہ خراب اثر پڑتا، جس کے نتیجے میں چینی کی قیمتوں میں ایک بار پھر اضافہ ہو گیا ہوتا۔

سوال: وہ منفی رجحانات کیا ہیں؟

جواب: چینی ملوں کے ذریعے لیوی کی چینی اور فری سیل کی چینی کی فروخت سے قیمت کی اوسط وصولیابی پیداوار کی لاگت سے بھی کم ہوتی جا رہی تھی

بڑی تعداد میں ملیں بہت زیادہ مالی نقصان برداشت کرتی رہی ہیں۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں نقصان کی مالیت ۶ کروڑ روپے تھی، جو ۹۲-۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ۷۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ یہ ملیں اس قابل نہیں تھیں کہ وہ کسانوں کو گنے کی واجب الادا رقموں سمیت مختلف قرضوں کی ادائیگی کر سکیں

بہت سی ملوں نے مالی دشواریوں کی وجہ سے مرمت کے اپنے کام ملتوی کر دیے تھے اور گنے کی پڑائی کا کام کافی تاخیر سے شروع کیا تھا۔ اپنی واجب الادا رقمیں ملنے میں تاخیر ہونے کی وجہ سے گنے کی کاشت میں کسانوں کی دلچسپی کم ہونا شروع ہو گئی تھی اور انھوں نے گنے کی کاشت والی اپنی زمینوں پر ایسی دوسری فصلیں اگانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو زیادہ منافع بخش تھیں۔

اس سب کے نتیجے میں چینی کی پیداوار میں تیزی سے کمی آنے لگی، جس کی وجہ سے آبادی کے غریب ترین طبقوں

پر بہت ہی ناپسندیدہ اثر پڑتا۔

سوال: چینی ملوں کی مدد کرنے اور اس طرح چینی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے حکومت نے کیا فیصلے کیے ہیں؟

جواب: پہلا قدم لیوی کی چینی اور آزادانہ فروخت کی چینی کے تناسب میں اضافہ کرنا تھا (لیوی کی چینی وہ چینی ہے، جو سرکاری نظام تقسیم کے ذریعہ تقسیم کئے جانے کی غرض سے حکومت کو فروخت کرنی ہوتی ہے۔ آزادانہ فروخت کی چینی وہ چینی ہے، جو آزادانہ طور سے بازار میں فروخت کی جا سکتی ہے) یہ تناسب، جو اس سے پہلے ۵۵:۴۵ تھا، بڑھا کر ۶۰:۴۰ کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، یونٹوں کے لیے زیادہ منافع۔

ایک اور فیصلہ ۵ لاکھ ٹن چینی کا ذخیرہ کرنا تھا۔ اس ذخیرے کے سلسلے میں ذخیرہ کرنے، سود اور بیمہ کے چارجز کے لیے اخراجات ملوں کو ادا کئے جائیں گے۔

چینی کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لیے چینی ملوں کو متعدد ترغیبات بھی دی گئی ہیں، جن میں جنوری سے اپریل ۱۹۹۳ء تک کی مدت کے دوران چینی کی زائد پیداوار کی اسی فی صد فری سیل کی اجازت دینا بھی شامل ہے۔ اسی طرح مئی سے جولائی تک کی مدت کے دوران (تاخیر سے گنے کی پڑائی کا سیزن) چینی کی پیداوار ۷۰ فی صد فری سیل کے لیے حقدار ہوگی۔

حکومت نے نئی چینی فیکٹریوں کے لیے موجودہ ترغیباتی اسکیم اور پرانی چینی فیکٹریوں کے لیے توسیعی پروجیکٹوں کی نظرثانی کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے (جن یونٹوں کو ستمبر ۱۹۹۰ء سے مارچ ۱۹۹۴ء تک کی مدت کے لیے لائسنس دیئے گئے ہیں، انھیں نئے ترغیبات دی جائیں گی۔

سوال: چینی کے نئے صنعت کاروں کے لئے ترغیبات کیا ہیں؟

جواب: زیادہ وصولی والے علاقوں میں واقع نئے یونٹ پہلے آٹھ برسوں کے لیے چینی کی صد فی صد فری سیل کے لیے حقدار ہوں گے۔ جب کہ دیگر علاقوں میں یہ نو برسوں کے لیے ہوگا اور ایک سال کے لئے چینی کی ۶۰ فی صد فری سیل ہوگی۔

زیادہ وصولی والے علاقوں میں توسیعی پروجیکٹ پہلے پانچ برسوں کے لیے صد فی صد فری سیل کے لیے حقدار ہوں گے جب کہ ...
... چھ سال کے لئے ...
صنعتی لاگتوں ...
سے کہا گیا ہے کہ ...
لیے اپریل، ۱۹۹۴ء سے ...
جائے گا ان فیکٹریوں کو دی جانے والی ترغیبات کے طریقے کا از سر نو جائزہ لے نئے صنعت کاروں کو دی جانے والی ان اہم ترغیبات سے بالالتزام قطعی بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ نئے اقدامات کا مقصد خاص طور سے چینی کے جاگیرداروں کی مدد کرنا ہے

سوال: کسانوں کے لیے ترغیبات کیا ہیں؟

جواب: کم سے کم لازمی قیمت، جو چینی فیکٹریاں کسانوں کو ادا کریں گی ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے گذشتہ سیزن میں فی کوئنٹل گنے کے لیے ۲۶ روپے کے مقابلے میں فی کوئنٹل گنے کے لیے ۳۱ روپے کردی گئی ہے (جو ۸.۵ فی صد کی بنیادی وصولی سے وابستہ ہے) ۹۴-۱۹۹۳ء کے سیزن کے لیے کم سے کم لازمی قیمت فی کوئنٹل گنے کے لیے ۳۲.۵۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔

سوال: کیا کم سے کم لازمی قیمت میں اضافہ کا بوجھ حکومت پر پڑے گا؟

جواب: حکومت کا ارادہ ہے کہ وہ سرکاری نظام تقسیم کے ذریعہ سپلائی کردہ لیوی کی چینی کے لیے زیادہ تھوک قیمت لگا کر (یعنی ایک روپے چالیس پیسے فی کلوگرام کا اضافہ کرکے) یہ بوجھ صارفین پر منتقل کر دے۔

سوال: یہ اقدام کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: گذشتہ دو برسوں کے دوران، حالانکہ کم سے کم لازمی قیمت ...

... اس سال کم سے کم لازمی قیمت میں اضافہ کی تلافی بھی ہوگی۔ اس سے یقینی طور پر مالی لحاظ سے چینی فیکٹریوں کی مدد ہوگی اور اس طرح یہ بہتر پیداوار کے لیے ایک ترغیب ثابت ہوگا۔

سوال: خستہ حال چینی یونٹوں کی مدد کرنے کے لیے کیا کوئی جامع اور ٹھوس منصوبہ بھی ہے؟

جواب: حکومت ان چند چینی یونٹوں کی مدد کرے گی، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے جائیں گے تاکہ یہ یونٹ بہتر جگہوں پر لگائے جا سکیں۔ ان یونٹوں کو مزید فری سیل چینی کی ترغیبات دی جائیں گی تاکہ وہ ان قرضوں کی ادائیگی

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

شکنتلا مہاول

ہندوستان میں ماحولیاتی بیداری

باوجود اس کے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ افلاس اور ناخواندگی کا شکار ہے، ماحولیاتی امور سے اس کی واقفیت نے بڑی حد تک ہمارے جنگلات اور حیوانات کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ مثال کے طور پر راجستھان کے دیہاتوں میں بشنوئی مذہب کے لوگ اپنے علاقوں میں شکار کرنے یا درخت کاٹنے کی اجازت نہیں دیتے بشنوئی کے لفظی معنی ہیں انتیس (۲۹) اور اس فرقے کے مذہب کے مطابق ماحولیات کے تحفظ سے متعلق ۲۹ اصول ہیں۔ بشنوئی گاؤں راجستھان کے لق و دق ریگستان میں نخلستان کی طرح دور دراز بالکل الگ تھلگ مقام پر واقع ہیں۔

کافی عرصہ قبل ۱۷۳۰ میں جودھپور کے نزدیک ان گاؤں کی سینکڑوں عورتوں اور بچوں نے درختوں کو کٹنے سے بچانے کے لیے اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ ان لوگوں کو کاٹ کر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے درختوں کو کٹنے سے بچانے کے لیے گھیر لیا تھا۔ ماحولیات کے تحفظ پر آمادہ انسانوں کی یہ سب سے کامیاب مثال چپکو تحریک کا شاید نقطۂ آغاز تھی۔

صدیوں سے ہندوستانی فطرت کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔ فطرت سے گہری محبت و عقیدت کے ان جذبوں کا اظہار ہماری مقدس کتابوں میں کیا گیا ہے۔ پودوں میں پانی ڈالنے اور پرندوں و جانوروں کو کھلانے کی مقدس مذہبی رسوم تمام جانداروں کے باہمی انحصار سے متعلق ہماری واقفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہماری مذہبی کتابوں میں سادہ طرز زندگی اور وسائل کے ایک خاص حد تک ہی استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ گاندھی جی اکثر کہا کرتے تھے کہ قدرت ہر انسان کی ضرورت کی تکمیل کے لیے وسائل فراہم کرتی ہے لیکن کسی کے لالچ کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

عام آدمی کے استعمال میں آنے والے مٹکے کو ان مصنوعات کے نشان کے طور پر منتخب کیا ہے جو ماحولیات پر برا اثر نہیں ڈالتیں۔ یہ نشان ماحولیات سے متعلق ملک گیر پیمانے پر بیداری پیدا کرنے کی حکومت کی کوششوں کی نشاندہی کرتا ہے

حکومت ماحولیات کی گراوٹ کو روکنے اور مستقبل کی نسلوں کے لیے وسائل کو سنبھال کر رکھنے کی غرض سے مسلسل کوششیں کرتی رہی ہے۔ ہندوستان پہلا ترقی پذیر ملک ہے جہاں مارکیٹنگ کے لیے ماحولیاتی اعتبار سے ٹھیک مصنوعات کو یہ نشان دیا جا رہا ہے۔ مصنوعات پر ماحولیاتی نشان لگانے کے لیے صنعت کاروں کو مقررہ فیس جمع کر کے انڈین اسٹینڈرڈز بیورو سے اجازت لینی پڑے گی۔ ایسی مصنوعات کی تکمیل تک کئی مرحلوں میں ماحولیاتی کسوٹی پر جانچ اور تصدیق کی جائے گی۔

ایسی مصنوعات پر لیبل لگانے کو ماحول کی صفائی سے متعلق ہندوستان کے پختہ عہد کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ استعمال میں لائی جانے والی ہر وہ چیز جو ماحولیاتی نقصانات کو کم سے کم کرتی ہے، ماحولیات کی دوست شے کہلائے گی۔

رواں سال کے اوائل میں ہی حکومت نے کافی دنوں تک انتظار کے بعد آلودگی میں کمی لانے کے لیے قومی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ جو صنعتی اداروں کی سالانہ ماحولیاتی جانچ پڑتال اور آلودگی پر قابو پانے کے لیے نسبتاً زیادہ صاف ٹکنالوجی اپنانے کو ضروری قرار دیتی ہے۔

۲۲ فروری کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر ماحولیات و جنگلات شری کمل ناتھ نے کہا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے احتیاطی اقدام یہ ہیں: نقطۂ آغاز سے ہی آلودگی کو ختم کرنا، آلودگی کی روک تھام کے لیے موجودہ تکنیکی ذرائع کو اپنانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا، اس امر کی یقین دہانی کرنا کہ آلودگی پھیلانے والے اس کی روک تھام پر توجہ دیں، ندیوں، بے حد آلودگی والے علاقوں پر خصوصی توجہ دینا، ماحولیاتی مسائل کے حل میں عوام کو شامل کرنا۔

آلودگی پر قابو پانے والے آلات کی تنصیب اور آلودگی پھیلانے والی صنعتوں کی گنجان آبادی والے علاقوں سے منتقلی کے لیے فی الوقت کئی مالی ترغیبات دستیاب ہیں۔ ایسی اشیاء جن پر کسٹم اور محصولات کی چھوٹ ہے ان کے بارے میں بھی از سر نو غور کیا جا رہا ہے جن سے آلودگی میں کمی لانیوالی ٹکنالوجیوں کی ترقی ہوگی اور مصنوعات کی مانگ میں اضافہ ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک اور قابل ذکر پیش رفت یہ ہے کہ مرکزی وزارت ماحولیات ایک قومی ماحولیاتی عدالت قائم کرنے جا رہی ہے جو لوگوں کے ذریعے دائر ہرجانہ کی رقم کے دعووں کو نمٹائے گی۔ یہ خصوصی عدالت ملک میں صنعتی تباہ کاری یا ماحولیات سے ہونے والے نقصانات کے لیے حال میں بنائے گئے عوامی ذمہ داری قانون کے نفاذ اور اس پر نگرانی کے لیے ایک ایجنسی کے طور پر کام کریگی۔

اس عدالت کے اہم کاموں میں سے ایک صنعتی تباہ کاری یا صنعتوں کے ذریعہ استعمال میں لائے جانے والے خطرناک کیمیاوی مادوں کے زہریلے اثرات سے متاثرہ لوگوں کے لیے ابتدائی راحت فراہم کرنا اور معاوضہ کی رقم طے کرنا ہوگا۔ ماحولیات کو متاثر کرنے والے ایسے خطرناک مادوں کی شکایت اور ماحولیات سے متاثر ہونے والے لوگوں کے ہرجانے کی رقم بھی یہ عدالت طے کرے گی۔

وزارت ماحولیات نے ایک قومی ماحولیاتی کمیشن کے قیام کی بھی تجویز پیش کی ہے جو ماحولیات سے متعلق مختلف قوانین کے آئینی، سماجی و دیگر پہلوؤں کا مطالعہ کرے گی اور اگر ضروری ہوا تو ان میں ترمیم کا مشورہ دے گی۔

اس برس ۱۲ جون کو ماحولیات اور ترقی پر پالیسی اور حکمت عملی سے متعلق ایک بیان جاری کیا گیا جو ہماری قومی زندگی اور ہماری ترقی کے لائحہ عمل کے دھاگے میں ماحولیاتی سوچ کو پرونے پر زور دیتا ہے۔ یہ پیالے گذشتہ دو برسوں کے درمیان مرکز، ریاستی حکومتوں، ماہرین، غیر سرکاری تنظیموں اور تعلیمی اداروں کے مابین صلاح و مشورہ کا نتیجہ ہے۔ ماحولیات سے متعلق ہماری تشویش کو ترقیاتی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے پر احتیاطی اقدام کے فروغ کے لیے یہ ایک اہم قدم ہے۔

ماحولیاتی اسکیم ماحولیاتی بیداری پیدا کرنے اور عوام کو اس سے جوڑنے، آلودگی پر قابو پانے کے لیے خاص طور سے نوجوانوں کو سرگرم طریقہ سے شریک کرنے، جنگلات میں ہونے والے غیر قانونی کاموں، جنگلا... اور آلودگی و ماحولیاتی گ... کرنے، محکمہ جنگلات... تقویت دینے اور ان... کے لیے بیداری پیدا کر... اکٹھا کرنے، ہوا و پانی... سے ہونے والی آلودگی کا تجزیہ کرنے کے مقصد سے تشکیل کی گئی ہے۔

اس اسکیم کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت کی سنجیدگی اس بات سے ظاہر ہے کہ پریا ورن واہنی (ماحولیاتی دستہ) کے نام سے ایک ادارہ شروع کیا گیا ہے۔ وزیر ماحولیات نے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے اس اسکیم کے نفاذ میں تعاون کی درخواست کی ہے۔ پہلے سال میں تقریباً سو پریاورن واہنیاں ہر ضلع میں ایک کے تناسب سے قائم کی جائیں گی۔ یہ دستے پہلے ان اضلاع میں قائم کیے جائیں گے جہاں صنعتی آلودگی زیادہ ہو یا گھنے جنگلات ہوں یا قبائلی آبادی ہو یا ایک جگہ یہ تمام باتیں موجود ہوں۔ ایسی تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال ان واہنیوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ کیا جائے گا تاکہ آٹھویں منصوبہ کے دوران یہ مکمل طور پر پورے ملک میں قائم ہو جائیں۔

مختلف جغرافیائی ڈھانچوں، موسمی حالات اور طبعی خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان تنوع سے بھرپور متضاد ماحولیات والا ملک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک میں جانوروں کی ۷۵ ہزار اور نباتات کی ۴۵ ہزار اقسام پائی جاتی ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ کی راہ میں شجرکاری پروگرام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۹۱ سے ۱۸۸ ہیکٹیئر اراضی میں شجر کاری کی گئی اور جنگلی درختوں کے تقریباً ۱۶۰ کروڑ پودے پرائیویٹ ایجنسیوں میں تقسیم کیے گئے۔ مہاراشٹر نے ایسے ... ہے تجاوز کیا ہے اور اس نے ۱۵۱ ...

سے یہ سفارش کی ہے کہ دو ہیکٹیئر سے زیادہ جنگلات کی زمین پر شجر کاری کی تمام تجاویز پر غور کرنے کے لیے مشاورتی کمیٹیاں قائم کریں۔

بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ دنیا کا پہلا تحریری حفاظتی ضابطہ بالخصوص جنگلی جانوروں کے لیے ہندوستان میں تیسری صدی قبل مسیح میں وضع کیا گیا۔ شہنشاہ اشوک نے پرندوں اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے پتھر پر جو احکامات کندہ کرائے تھے وہ آج بھی محفوظ ہیں اور آج کے جدید دور میں حکومت ایک نئے ماحولیاتی نظام کے قیام کے لیے مسلسل کام کر رہی ہے۔ ●

ارجن سنگھ

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ

بھارت کے سیاق و سباق میں انسانی وسیلہ، بہت سے دیگر وسائل کے برخلاف ترقیاتی کوششوں کی راہ میں سب سے زیادہ حائل ہوتا ہے گوناگوں ثقافت ترقی پذیر معیشت کے چیلنج اور دیگر سماجی و اقتصادی تقاضے اس وسیلے کو ایک مخصوص نوعیت عطا کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک کثیر پہلوئی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے تاکہ اس کثیر وسیلے کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جائے۔ چنانچہ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے معاملے کو آٹھویں پنجسالہ منصوبے کا اہم موضوع بنایا گیا ہے انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے اہم شعبے اس منصوبے کی کامیابی کی کلید کے حامل ہوں گے۔ گزشتہ کامیابیوں کو یکجا اور مستحکم کرنے کے علاوہ، حکومت نے متعدد نئے اقدامات بھی کئے ہیں۔

تعلیم کے بارے میں نظرثانی شدہ پروگرام عمل میں ذمہ داری یا جوابدہی، کم اخراجات اور تعلیم کے انتظامات پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک قومی مشن شروع کرنے، قومی خواندگی مشن (این۔ ایل۔ ایم) کو مستحکم بنانے اور آپریشن بلیک بورڈ کی توسیع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ناخواندگی کا خاتمہ حکومت کی اعلیٰ ترجیحات میں سے ایک رہا ہے قومی خواندگی مشن کی سرگرمیاں اب ۱۷۸ اضلاع میں شروع کی گئی ہیں شرحِ خواندگی ۸۰ فی صد تک پہنچا کر آٹھویں منصوبے کے آخر تک مکمل خواندگی مہم کے تحت ۳۵۰ اضلاع کو مستفید کرنے کی تجویز ہے تمام سطحوں پر اسکول کے طالب علموں اور خاص طور سے نوجوان طالب علموں کے نصابِ تعلیم کے بوجھ کو کم کرنے کے طریقوں پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک قومی مشاورتی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

مالی پہلو کا جائزہ لینے کے لیے بھی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی مرکزی یونی ورسٹیوں کو بہتری اور رکھ رکھاؤ کے لیے گرانٹ دینے کے موجودہ طریقے، گرانٹ کے استعمال اور اخراجات کے لیے قواعد و ضوابط وضع کرنے کے امکانات کا جائزہ لے گی۔ عرصے سے چلی آ رہی مانگیں پوری کرنے کے لیے بھی ایک بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی اور ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جا رہی ہے ان کی جگہ اور مالی اہتمام کے سلسلے میں تفصیلات طے کی جا رہی ہیں۔

تعلیمی پالیسی کے بارے میں غیر یقینیوں کو دور کرنے کے لیے تعلیم سے متعلق ترمیم شدہ قومی پالیسی ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ میں پیش کر دی گئی ہے تعلیم کے بارے میں سب سے اعلیٰ مشاورتی ادارے تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ (سی۔ اے بی ای) سمیت مختلف سطحوں پر صلاح مشورے اور تبادلۂ خیالات کے بعد ترمیمات کر دی گئی ہیں

عوامی خواندگی کے سلسلے میں بھارت کی کوششوں کو بین الاقوامی طور سے تسلیم کیا گیا ہے۔ کیرالہ اور مغربی بنگال کے بعد پانڈیچری کو ۱۹۹۲ء کے لیے یونسکو خواندگی انعام دیا گیا ہے۔ یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل سٹر فیڈریکو میور نے اپنے دورۂ بھارت کے دوران ضلع کو مکمل طور سے خواندہ قرار دیے گئے مہاراشٹر میں وردھا کے مقام پر منعقد تقریب میں شرکت کی تھی اور ناخواندگی دور کرنے کے سلسلے میں بھارت کی کوششوں کو سراہا تھا۔

ستمبر ۱۹۹۳ء میں بھارت سب کے لیے تعلیم کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کی میزبانی کرے گا۔ یہ کانفرنس یونسکو، یونی سیف کے اُن اقدامات کا ایک حصہ ہے، جن میں سب سے زیادہ آبادی والے نو ترقی پذیر ممالک پر توجہ مرکوز کی گئی ہے، جہاں دنیا بھر کے کُل ناخواندہ افراد کا ۷۵ فی صد حصہ رہتا ہے۔ بھارت اور چین نے حال ہی میں تعلیم کے سلسلے میں تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کئے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت تعلیمی پالیسی اور ابتدائی تعلیم، بنیادی تعلیم، بالغوں کی خواندگی اور اعلیٰ تعلیم کے

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے مرکزی وزیر

سلسلے میں تجربات کا تبادلہ کیا جائے گا۔

خواتین اور بچوں کے گروپ پر توجہ دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں۔ حکومت نے بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کو مان لیا ہے۔ سب بچوں کے لیے ایک قومی منصوبۂ عمل اور بچیوں کے لیے سارک منصوبۂ عمل وضع کیا گیا ہے۔ ایک حالیہ اہم تبدیلی آنگن واڑی کارکنان اور معاونین کے لیے اعزازی رقم کی شرحوں میں اضافہ تھی۔ اس سے ۲۰ر۵ لاکھ آنگن واڑی کارکنان اور معاونین کو فائدہ ہوا ہے، جو ملک بھر میں بچوں کی فلاح و بہبود کی مربوط خدمات کے پروگراموں کے تحت کام کر رہے ہیں۔

پارلیمنٹ نے شیر خوار اور بہت چھوٹے بچوں کے لیے دودھ کی متبادل اشیاء، دودھ کی بوتلوں، شیر خوار اور بہت چھوٹے بچوں کے لیے خوراک کی تیاری، سپلائی اور تقسیم کی ضابطہ بندی کے بل ۱۹۹۲ء کو منظوری دے دی ہے، جس کا مقصد ماں کے دودھ پلانے کو فروغ دینا اور شیر خوار اور بہت چھوٹے بچوں کی خوراک کے مناسب استعمال کو یقینی بنانا ہے۔ خواتین کے لیے قومی کمیشن کے قیام اور خواتین کے لیے خواندگی کے بارے میں رسالہ نکالنے سے آگے چل کر خواتین میں بیداری پیدا ہوگی۔

سال ۱۹۹۲ء میں ثقافت کے بارے میں ایک قومی پالیسی وضع کرنے کا عمل بھی شروع کیا گیا ہے۔ تمام ریاستوں کے ثقافت کے محکموں کے وزراء اور سیکریٹریوں کے ساتھ میٹنگ کے بعد ایک رسائی دستاویز تیار کی گئی ہے۔ ایک قومی کانفرنس گزشتہ سال نومبر میں منعقد کی گئی تھی، جس میں ثقافت کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا۔ ثقافت کے بارے میں کسی قسم کی پالیسی عائد کیا جانا خارج از امکان قرار دیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ثقافت کے بارے میں ایک پالیسی صرف تخلیقی برادری کے تعاون

سے ہی اختیار کی جائے گی۔

سوامی ویویکانند کے بھارت پریکرما اور شکاگو میں مذاہب کی پارلیمنٹ میں اُن کی تاریخی تقریر کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات کے ایک حصّہ کے طور پر ایک قومی کمیٹی قائم کی گئی ہے، جو سوامی ویویکانند کی حیات، اصول اور تعلیمات پر مبنی کرنے والے مناسب پروگرام وضع کرے گی۔ صد سالہ سالگرہ کا سال "راشٹریہ چیتنا ورش" یعنی قومی بیداری کے سال کے طور پر منایا جائے گا۔

مختلف سطحوں پر ثقافتی تال میل کی پالیسی جاری رکھتے ہوئے ایک چھ ہفتے طویل جشن میلے کا افتتاح دسمبر ۱۹۹۲ء میں نئی دلّی میں ہوا تھا۔ یہ میلہ کسی بھی ملک میں سب سے پہلا اہم اور بڑا جشن ثقافتی میلہ تھا۔ ظاہرہ جالی صوں کے اس الو کھے اور عجیب و غریب ثقافتی میلہ میں سٹوں کے کھیل، اوپیرا، کٹھ پتلیوں کے ناٹ اور دستکاروں کی نمائش۔ تھا۔ ایک بھارتی میلے کا جرمنی میں کیا گیا تھا۔ بیا فنکار، سائنس داں اور جرمنی گئے۔ یہ میلہ نمائشوں، سیمیناروں، تھیٹر، کلاسیکی اور عوامی موسیقی و رقص کی محفلوں پر مشتمل تھا۔ ●

بقیہ، سب کے لیے مٹھاس

کر سکیں، جو اُنھوں نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے سلسلے میں لیے ہیں۔ ان ترغیبات کے بارے میں ایک کمیٹی ہر معاملے کی نوعیت کی بنیاد پر فیصلہ کرے گی۔

سوال: چینی ترقیاتی فنڈ کیا ہے؟

جواب: چینی پر ٹیکس سے متعلق قانون، ۱۹۸۲ء کے تحت، بھارت میں کسی بھی چینی فیکٹری کی تیار کردہ کُل چینی پر ۱۴ روپے فی کوئنٹل کے حساب سے ٹیکس لیا جا رہا ہے۔ یہ فنڈ فیکٹریوں کی بحالی اور جدید کاری، گنّے کی ترقی و فروغ، تحقیقی اور ترقیاتی کام، وافر ذخیرے کی دیکھ بھال وغیرہ کے سلسلے میں استعمال کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

سوال: چینی ترقیاتی فنڈ کے سلسلے میں نیا اقدام کیا ہے؟

جواب: حکومت نے اب فیصلہ کیا ہے کہ تمام تر چینی ترقیاتی فنڈ تقسیم کرنے کی غرض سے دستیاب کیا جائے گا۔ اس سے فیکٹریوں کی جدید کاری اور بحالی نیز فیکٹری والے علاقوں میں گنّے کی کاشت کی رفتار میں تیزی آئے گی۔

سوال: کیا حکومت چینی کی صنعت کے لیے [illegible] برآمدات کا سلسلہ جاری رہے گا؟

جواب: جی ہاں۔ نئے اقدامات سے، جن سے چینی کی پیداوار میں اضافہ ہونے کی توقع ہے، مستقبل میں قیمتی غیر ملکی زرِ مبادلہ کمانے میں مدد مل سکتی ہے۔ حالانکہ بھارت دنیا میں سب سے زیادہ سفید چینی تیار کرنے والا ملک ہے، لیکن اس شعبے میں اس کی برآمدات زیادہ نہیں ہیں۔ یہ اقدامات اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ اگر بھارتی چینی کی برآمدات مقابلہ جاتی طور سے کی جاتی ہے، تو اس سے چینی یونٹوں اور گنّے کے کاشتکاروں، دونوں کو ہی بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ ●

جمیل اختر

جہیز اور نوجوانوں کی ذمّہ داریاں

ہندوستانی معاشرہ جہاں بہت سی خوبیوں کا حامل ہے وہیں اس معاشرے میں بہت سی خرابیاں بھی پورے طور پر جڑ پکڑے ہوئی ہیں۔ غلط رسم و رواج، کمزور اعتقادات، غلط قسم کی جنونیت، غلط اقدار و روایات کی پیروی اور اس کے تحفظ نے ہمارے معاشرے میں لا تعداد ایسی برائیوں کو جنم دیا ہے جو آج ہمارے سماج کے لیے ایک لعنت بن گئی ہیں۔ اور لعنتیں دھیرے دھیرے ہمارے پورے معاشرے کے لیے ناسور بنتی جا رہی ہیں جس نے انسان کے اندر خوف، عدم تحفظ، حیوانیت، درندگی اور بدامنی پھیلا کر پورے معاشرے کو ایک غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے اور ہندوستانی معاشرہ ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا ہے جہاں ادنیٰ سے اعلیٰ تک ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور پوری انسانیت عدم تحفظ اور دہشت زدگی میں مبتلا نظر آ رہی ہے۔ انسانیت کا شیرازہ بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کے غلط رسم و رواج اور اقدار و روایات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے جو ہمارے معاشرے کے لیے لعنت اور رسم قاتل بنی ہوئی ہیں۔

ان ہی سماجی لعنتوں میں ایک لعنت جہیز ہے جو ہمارے معاشرے کے لیے ناسور بن گئی ہے۔ اور اس کی خاطر اب تک لا تعداد جانیں قربان ہو چکی ہیں اور روزانہ کئی جانیں اس کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں اور چڑھائی جا رہی ہیں۔ پوری انسانیت کے لیے یہ واقعہ کتنا ہی دردناک اور شرمناک کیوں نہ ہو لیکن ہمارے معاشرے کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ان واقعات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا اور ہم اسے روزمرّہ کا معمول سمجھ بیٹھے ہیں۔ جب بھی اس طرح کی کوئی خبر سامنے آتی ہے اس پر پُرزور احتجاج ہونے کی بجائے معمول کے مطابق خاموشی طاری رہتی ہے اور کاروبارِ زندگی پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا۔ جیسے کہ یہ لعنت اب لعنت نہیں رہی اور اسے سماج نے رسم سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس لعنت سے جو آج انسانیت کے لیے سب بڑا خطرہ بن گئی ہے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور معاشرے کو اس لعنت سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ اس کی صرف ایک صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ نوجوان اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اُسے عملی طور پر نبھانے کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ براہِ راست ان سے متعلق ہے اور اس معاملے میں وہ موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی بھی معاشرے، سماج، ملک اور قوم کی اصل رُوح اور قوت نوجوان ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف ملک و قوم کا مستقبل ہوتے ہیں بلکہ اس کے معمار بھی ہوتے ہیں۔ کسی بھی ملک اور معاشرے کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کا سارا عمل ان کے تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر نہ ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ معاشرہ۔ اور نہ ہی ایک بہتر سماج کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے تمام تر انقلابات، ترقی کا ہر عمل نوجوانوں کے عملی تعاون کا محتاج رہا ہے۔ اور اسی قوت نے دنیا میں انقلاب برپا کئے ہیں۔ حکومتیں بدلی ہیں اور ملک اور معاشرے کو ایک بہتر رُخ عطا کیا ہے۔ اگر آج یہی نوجوان جہیز کی اس لعنت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو کوئی مشکل نہیں کہ اس لعنت سے معاشرے کو پاک نہ کیا جا سکے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ نوجوان اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اس سمت میں مثبت رول ادا کریں۔

اس سمت میں نوجوانوں کو اپنی ذمہ داریاں کئی پہلو سے نبھانی ہوں گی۔ مثلاً کہیں والدین سے ٹکراؤ ہوگا، کہیں پر دوست آڑے آئیں گے، کہیں پر سماج راہ میں حائل ہوگا، کہیں مجبور کیا جائے گا، اور کہیں طرح طرح کا لالچ دیا جائے گا اور اس سارے عمل میں اُسے نہایت ہی ادب و احترام صبر و تحمل

۲۶۶، کاویری ہاسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

اور صبر و استقامت کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے گزرنا ہوگا۔ ذراسی لغزش پورے منصوبے کو خاک میں ملا دے گی۔

سب سے اہم بات جس کی طرف نوجوانوں کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شادی کا مسئلہ اس کا اپنا نجی اور ذاتی معاملہ ہے اور اُسے اس معاملہ میں تمام تر فیصلہ لینے کا تنہا اختیار رہے کسی کی مداخلت بے جا اس کے لیے قابل قبول نہیں ہونی چاہیئے۔ اور نہ اُسے اس سلسلہ میں کسی دباؤ میں آنا چاہیئے بلکہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق خود ہی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اور جب نوجوان اپنا فیصلہ خود ہی کریں گے تو پھر ظاہر سی بات ہے کہ یہ لعنت ان کی راہ میں مخل نہیں ہوگی۔ بلکہ جتنی سادگی اور کم خرچ میں ممکن ہو سکے اس تقریب کو انجام دینا چاہیئے۔ غلط قسم کے رسوم و روایات کو ختم کر کے شادی کے مسئلہ کو بالکل آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہر طرح کی فضول خرچی سے دامن بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لیے کہ شادی میں بے جا شان و شوکت سماج کے دوسرے طبقے کے لوگوں پر غلط اثر ڈالتی ہے اور وہ لوگ جن کے پاس اس قدر زر نہیں، وہ ایک طرح کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا معاشرے کو مختلف طرح کے احساسات میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے ان رسوم و روایات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، جس سے یہ پُرمسرت تقریب ایک مصیبت بن گئی ہے۔ آج بھی تعلیم ہونے اور معاشرے کی تبدیلی کے باوجود بہت سے غلط رسم و رواج ہمارے معاشرے میں جڑوں کے توں برقرار ہیں جن کو ختم کر دینے میں ہی معاشرے کی بھلائی ہے اور ان رسوم و روایات کو ہماری بزرگ نسل نہیں بلکہ نوجوان نسل کو ختم کرنا ہے۔

اس سارے عمل میں نوجوانوں کو محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ رسوم و روایات ہمارے معاشرے کی جڑوں میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کے ترک کرنے میں انھیں بہت سی دشواریاں ہوں گی۔ خاص کر بزرگ نسل جو روایات کی پیروی کو جزو ایمان سمجھے ہوئی ہے، اتنی آسانی سے ترک نہیں کرنے دے گی۔ والدین اپنے حوصلہ و ارمان کی دُہائی دیں گے سماج ان رسومات کی حفاظت میں ہی اپنی بھلائی سمجھے گا، رشتہ دار بزرگوں کی روایات کے ترک پر ان کی روح کے تڑپنے کا بہانہ بنائیں گے اور طرح طرح کی تاویلیں اس کی سپورٹ میں دی جائیں گی لیکن آپ کو پہلے تو ان رسومات کی بُرائیوں کو اُجاگر کرنا ہوگا اور انھیں علم و عقل کی روشنی میں بہت ہی احترام کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرنی ہوگی اگر اس پر کامیابی مل جاتی ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اس معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیئے اور ان کی جا و بے جا خوشنودی کی پرواہ کئے بغیر اپنے طریقے سے شادی کرنی چاہیئے۔ ان حالات میں اگر گھر، خاندان اور سماجی بائیکاٹ کی [illegible] آئے تو ہنسی خوشی اسے قبول کرنا [illegible] کے دباؤ میں پڑ کر اپنے [illegible] چاہیئے۔

اس سلسلے میں بعض [illegible] بھی آئی ہے وہ یہ کہ اگر لڑکے والے [illegible] کیا ہے تو لڑکی والے اس کے باوجود اپنی شان و شوکت کو دکھلانے کے لیے بھرپور جہیز دینے کی کوشش کرتے ہیں اور دیتے بھی ہیں۔ یہاں پر بھی نوجوانوں کو پہل کرنا چاہیئے اور اس طرح کے جہیز کو بھی قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیئے تاکہ اس طرح کے سر پھرے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو اور غلط قسم کا سماجی بھرم قائم نہ رہے۔ اس سلسلے میں لڑکیوں کو بھی اپنے والدین کو اس طرح کے عمل سے روکنا چاہیئے اور اس طرح کی شادی کو رواج دینا چاہیئے جس میں سادگی ہو اور جہیز نام کی کوئی چیز نہ ہو۔

یہ تمام عمل تو وہ تھے جو انفرادی نوعیت کے تھے لیکن اس ناسور کو سماج سے ختم کرنے کے لیے انفرادی عمل کے ساتھ ساتھ اجتماعی کوششوں کی بھی ضرورت ہے۔ آج بہت سی تنظیمیں جہیز مخالف مہم میں مصروف ہیں اور سماج کو اس لعنت سے پاک کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پھر بھی جہیز کی لعنت جس تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور جس کثیر تعداد میں روزانہ لڑکیاں جلائی جا رہی ہیں یا انھیں گھر سے نکلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ناکافی ہیں اور ان کوششوں کو ایک بڑی عوامی تحریک کی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی بُرائیوں کو لوگوں پر واضح کرنے کے لیے طرح طرح کے پروگرام منعقد کرنے کی ضرورت ہے۔ تحریر و تقریر سے الگ ہٹ کر عمل پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کو کثیر تعداد میں اجتماعی شادی کو بھی رواج دینا چاہیئے جو ہر طرح کی لوازمات [illegible]

[illegible] معمولی طریقے سے کریں تو ایسی شادی بھی سماج اور علاقے کے لیے ایک مثال بنے گی اور دوسروں کو اس سے حوصلہ ملے گا۔ شادی جتنی زیادہ سادگی سے ہوگی وہ اتنی ہی اہم مثال بنے گی ضرورت ہے اس سمت میں مثبت پیش رفت کی جو ظاہر سی بات ہے کہ صرف نوجوان ہی کر سکتے ہیں۔

اگر آج کا نوجوان جہیز کے خاتمے کا تہیہ کر لے تو یہ لعنت سماج سے راتوں رات ختم ہو سکتی ہے اس لیے کہ یہ صرف نوجوانوں پر ہی منحصر ہے اور اس کا تعلق کسی دوسری نسل سے نہیں ہے۔ اگر آج کا نوجوان جو کل باپ بننے والا ہے اور معاشرے کا ذمہ دار فرد ہوگا وہ ان باتوں کو محسوس کر لے تو اپنی آنے والی نسل کو اس زہریلے اثرات سے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

فلاح وبہبود — رجحانات ایک نظر میں

اپنی تشکیل سے ہی بھارتی جمہوریہ کی اولین ترجیحات میں سے ایک ترجیح ملک کی آبادی کے کمزور طبقوں کی ترقی اور فلاح وبہبود رہی ہے۔ مجموعی ترقیاتی حکمت عملیوں میں کمزور اور نادار طبقوں کے لیے خصوصی اقدامات سے ہمیشہ ہی اضافہ کیا گیا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سال کے دوران ان خصوصی اقدامات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ اہم اقدامات مندرجہ ذیل ہیں:-

- آٹھویں منصوبے کی مدت کے دوران خاکروبوں کی آزادی اور بازآبادکاری کے لیے ایک مقررہ مدتی پروگرام شروع کیا گیا ہے جس پر ۴۶۴ کروڑ روپیے کے اخراجات آئیں گے۔ اس اسکیم سے خاکروبوں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ذریعہ سر پر فضلہ لے جانے کی صدیوں پرانی لعنت اور گندا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ یہ اسکیم آمدنی سے وابستہ خودروزگار پر مبنی ہے۔
- پس ماندہ طبقوں سے متعلق کارپوریشن قائم کی گئی تھی، جس کا منظور شدہ سرمایہ ۲۰۰ کروڑ روپیے ہے۔ کارپوریشن کے سرمایہ حصص اور دیگر پروگراموں کے سلسلے میں گرانٹس دے کر کارپوریشن کو مناسب طور سے مستحکم بنایا جارہا ہے۔ یہ کارپوریشن پس ماندہ طبقوں کے مفاد کی غرض سے بہت سے حوصلہ مندانہ پروگرام شروع کرنے کے لیے اب مکمل طور سے تیار ہے۔
- درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے متعلق قومی مالی ترقیاتی کارپوریشن اپنا سرمایہ حصص ۵۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۱۲۵ کروڑ روپے کردے گی۔ اس کارپوریشن کا مقصد درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں میں صنعت کاری کا رجحان پیدا کرنا ہے۔ ملک بھر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کرنے کے لیے سرمایہ حصص میں اضافہ کیا جائے گا۔ لیکن اس بات کا انحصار کارپوریشن کی کارکردگی پر ہے۔ مذکورہ کارپوریشن نے اب تک جتنی رقم تقسیم کی ہے وہ کل ملا کر جلد ہی ایک سو کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔
- حکومت کے تحت درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لیے مخصوص کردہ خالی آسامیوں کو پر کرنے کے لیے خصوصی مہمیں چلائی جاری ہیں۔
- مختلف سروسز اور آسامیوں کے لیے انٹرویو اور امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کی امتحان سے قبل تربیت اور انہیں دیگر سہولیات فراہم کرنے پر بھی مناسب زور دیا جارہا ہے پس ماندہ طبقوں کے لیے بھی اسی طرح کی ایک اسکیم شروع کی جارہی ہے۔
- پہلی بار حکومت نے گذشتہ سال اکتوبر سے سماجی دواع کے بارے میں بیداری کا ایک قومی پروگرام شروع کیا ہے۔
- سڑکوں پر پھرنے والے بچوں کو مختلف قسم کے استحصال سے بچانے کے لیے ان کی بازآبادکاری کا ایک مناسب پروگرام بھی شروع کیا جارہا ہے۔
- بھیک مانگنے کے سلسلے کی روک تھام اور بھیک مانگنے والے بچوں کی بازآبادکاری کے سلسلے میں ایک پروگرام وضع کیا جارہا ہے۔
- کم خواندگی والے علاقوں میں درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام شروع کرنے اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کی نئی اسکیمیں تیار کی جارہی ہیں مقصد یہ ہے کہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والی انتہائی کمزور اور نادار لڑکیوں پر حکومت کی توجہ مرکوز کی جائے۔ اس سے خاص طور سے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لیے قائم کردہ تعلیمی اداروں اور بیداری پیدا کرنے والے اداروں کے ذریعہ دیہی علاقوں میں بنیادی خدمات کی فراہمی کے نظاموں کو مستحکم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔
- بھارت میں قبائلی امداد باہمی مارکٹنگ ترقیاتی فیڈریشن لمیٹڈ ٹرائیفیڈ کے سرمایہ حصص میں اضافہ کرکے، اس کی سرگرمیوں کی توسیع کرکے اور اس کی خدمات کے معیار کو بہتر بناکر، موجودہ سال کے دوران مذکورہ فیڈریشن کو فروغ دیا جارہا ہے ریاستی سطح کی قبائلی ترقیاتی کارپوریشنوں کے لیے قیمتوں میں رعایت اور دیگر خصوصی گرانٹس کے لحاظ سے بھی ٹرائیفیڈ کو مستحکم بنایا جارہا ہے۔

باقی صفحہ ۱۲ پر

ضیا حسنی

(انشائیہ)

ننھّے منّے دُشمن

زندگی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے اور اس نعمت کا تحفظ ازبس ضروری ہے جاگتے رہئے! دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے۔ ذرا سی چوک اور چشم پوشی سے اسے موقع مل سکتا ہے اور وہ کسی وقت بھی ہماری غفلت اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کوئی طوفان برپا کر سکتا ہے۔

انسان کو، دوست اور دشمن ہی زندگی کے راستے پر سنبھل سنبھل کر چلنا سکھاتے ہیں آج اُس کے دشمنوں کی بات چل رہی ہے اس لیے اُن کے چہروں کو ایک نظر دیکھتے چلیے۔

اُس کے دشمن وہ بھی ہیں جو پستول اور بندوق سے لیس اسکوٹر یا موٹر سے ایک دم کسی گنجان آبادی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بجلی کی سرعت سے اپنے ہم جنسوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ خونخوار درندے، مہلک سانپ اور زہریلے بچھو بھی اس کے دشمن ہیں جو آبادیوں میں پہنچ کر دیکھتے ہی دیکھتے کتنے انسانوں کو موت کی نیند سُلا دیتے ہیں۔ بقامت کہتر قسم کے چند دشمن بھی رواں دواں دکھائی دیتے ہیں جو اذیت رسانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اُسے موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی نہیں چوکتے۔

جب کبھی ہمارے آس پاس دہشت گردی سر ابھارتی ہے، انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگتا ہے، درندوں کے منہ میں خون لگ جاتا ہے، سانپ اور بچھو انسانی بستی پر اُتر آتے ہیں تو ہم انھیں مار ڈالنے کی اجتماعی کوشش کرتے ہیں اور ایسی ایسی تدبیریں [illegible] کار لانے کا منصوبہ بناتے [illegible] آبادیوں میں امن و سکون کی [illegible] کوئی دشمن ہمارے ہم جنسوں [illegible] ہاتھ نہ رنگ سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ ہم آسانی سے کر لیتے ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ تھوڑی سی چوک ہم سے برابر ہو ہی جاتی ہے۔ ہم بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے لپک کر اور دوڑ کر بجھا دیتے ہیں لیکن ایک چنگاری کو ضرور چھوڑ دیتے ہیں ہم زہریلے سانپ کو بڑھ کر مار دیتے ہیں۔ لیکن اُس کی نسل چلتی رہے اس لیے اُس کے پلنے بڑھنے اور زہر پھیلانے کے لیے اُس کی جان بخش دیتے ہیں غرض ہم خود ہی ایسے مقتل سجا رہے ہیں جن میں ننھّے منّے دشمن پل رہے ہیں اور پروان چڑھ رہے ہیں اُن کی فوج ظفر موج موقع بموقع انسانی صفوں کو روندا کرتی ہے اور اُن کے ٹھکانوں کو تاراج کرنے اور برباد کرنے کا ہمیں ذرا سا خیال نہیں آتا۔

یہ ہلکے پھلکے دکھائی نہ دینے والے کیڑے گرمی اور رطوبت میں پیدا ہوتے ہیں اور حیرت انگیز طریقے پر بڑھتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی [illegible]

اور برباد کرنے کی بجائے انھیں پنپنے اور بڑھنے کا موقع دیتے رہے تو وباؤں اور بیماریوں کا لامتناہی سلسلہ کیسے رُکے گا اور یہ سرکاری منصوبے کیسے کامیاب ہوں گے؟ اس بات کو بغور سوچیے اور اس بڑھتی ہوئی تباہی کو بڑھ کر روکیے۔

یقین جانیے! بسا اوقات یہ ننھّے منّے دشمن گاؤں والوں کو اس طرح ستاتے، کرب دیتے اور جان و مال کا نقصان کرتے ہیں کہ یہ بیچارے کھیتوں کھلیانوں کو چھوڑ کر ہسپتالوں کو آباد کرتے ہیں۔ اس دوڑ دھوپ میں بیوی کی مسکان، بچوں کا بھولاپن، کھانا پینا، نہانا دھونا کچھ بھی یاد نہیں آتا اور وہ تیمارداری اور مُردوں کے ٹھکانے لگانے کے علاوہ کوئی کام نہیں

۳۵، چھوٹا بازار، فتح پور۔ ۲۱۲ ۶۰۱۔

کر پاتے۔

یہی کیڑے جانوروں کے جسم میں بھی اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ ناؤلے کتے کاٹ کر پاگل پن کو فروغ دیتے ہیں۔ داد، کھاج اور جلدی بیماریوں کو بلیاں اور کتے پھیلاتے ہیں۔ سؤروں سے بھی بخار اور دوسرے امراض پھیلتے ہیں۔

معصوم بچے ناسمجھی سے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر ایک بچے سے دوسرے بچے کو مرض لگ جاتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ہم بچوں کی پوری نگہداشت نہیں کرتے۔ وہ ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔ ہم انھیں ہنساتے ہنساتے نہیں ملتے۔ وہ منہ میں انگلی ڈالے رہتے ہیں، انگوٹھے چوستے ہیں، دانت سے ناخن کترتے ہیں، قمیص کا دامن چوستے ہیں اور ہم انھیں نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے اور نہ ہی ایسے کام کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ خود رو پودوں کی طرح پلتے اور بڑھتے ہیں کسی طرح سانس کی دھونکنی چلتی رہی تو کوئی نہ کوئی مرض آگے چل کر انھیں کمزور یا بالکل اپاہج بنا دیتا ہے۔ محل غور ہے کہ کتنا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ انھیں میں سے کوئی مستعد کسان، کوئی کلرک یا افسر، کوئی انجینئر، ڈاکٹر اور تاجر بنتا ہے اور کوئی رائے عامہ کے سہارے ملک کی باگ ڈور سنبھالتا ہے۔ صاف ستھرا ماحول بنا کر بچوں کو بیماری کا لقمۂ اجل نہ ہونے دیجئے۔ انھیں ہنسنے کھیلنے کا موقع دیجئے اور ایسی کوشش کیجئے کہ وہ صحت مند، قوی اور باحوصلہ جوان بنیں۔

ہمارے یہاں مکھیوں، مچھروں، کھٹملوں، جوؤں اور چیلروں کو پیدا ہونے، پلنے اور بڑھنے کا جیسا سازگار ماحول ملتا ہے وہ کہیں میسر نہیں آتا۔ انھیں ہم گھر کے فرش اور دیواروں پر رینگتے ہوئے، چارپائیوں اور بینچوں سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں، مکھیوں اور مچھروں کو جگہ جگہ بیٹھے ہوئے پاتے ہیں ہم سر اور بدن میں اچانک کھجلی محسوس کر کے ہاتھ متحرک کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر انھیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ انھیں بوند بوند خون پلاتے ہیں بیماریاں قربان کر دیتے ہیں نیز پھر سست رہتے ہیں لیکن ایسی تدبیریں نہیں کرتے کہ ان سبھی کا قلع قمع کر دیں اور نیست و نابود کر دیں تاکہ چین و آرام سے سونا نصیب ہو اور کھٹملوں، جوؤں، مچھروں اور چیلروں کو ہمارا خون اچھے اور صحت مند جسم میں پہنچانے کا موقع نہ ملے۔

اگر آپ قابل رشک، مسرت رساں اور خوشحال زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ اگر آپ خود بھی اپنے دامن کو خوشیوں سے بھرنا چاہتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں تو آج ہی سے ان اصولوں کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیجئے۔ جیسے ہی آپ ان اصولوں کے تحت زندگی گزارنے لگیں گے تو خوشیاں اور کامرانیاں بڑھ کر آپ کا خیر مقدم کریں گی۔

اپنے ذہن و دماغ کو پاک و صاف رکھئے۔ اچھی کتابوں کو اپنا دوست بنائیے۔ بدقسمتی سے آپ علم سے محروم ہیں تو آج ہی سے لکھنے پڑھنے کی ابتدا کر دیجئے خواہ آپ باشعور ہو گئے ہوں اپنے گھر، گرد و پیش کو صاف و ستھرا رکھئے اور اس سلسلہ میں دوسروں کی مدد کیجئے۔ صاف ستھرے کپڑے پہننا، بستروں کو صاف رکھنا اچھی عادت ہے اُسے خود اختیار کیجئے اور متعلقین کو بھی اسی راستے پر لگائیے۔ محنت سے نہ کترائیے کہ اسی سے زندگی نکھرتی سنورتی ہے۔ اشیائے خوردنی گھر میں صفائی اور احتیاط سے تیار کیجئے بازار سے یا جہاں سے کوئی کھانے پینے کی چیز لائیے تو اس پر نظر رکھئے کہ وہ ڈھکی مندی ہو۔ گھر میں کھانے پینے کے برتن ڈھک کر رکھئے جب بھوک ستائے تب کھائیے، کم کھانے سے نقصان نہیں ہوتا لیکن بسیار خوری پریشان کرتی ہے اور کبھی مار کر چین لیتی ہے۔ اسی قسم کی باتیں آپ کو زندگی کے راستہ پر لگا دیں گی۔

●

بقیہ: ہاؤسنگ اور متعلقہ شعبے میں غیر مقیم بھارتیوں کی سرمایہ کاری

غیر مقیم بھارتیوں کو غیر ملکی زر مبادلہ کے ذریعہ دو مکانات بھی حاصل کرنے کی اجازت ہوگی تاہم انھیں مکانات کی خریداری کے بعد ۹۰ دن کے اندر تمام تر دستاویزی ثبوت کے ساتھ اطلاع فراہم کرنی ہوگی۔

دولت ٹیکس پر غیر مقیم بھارتیوں کو ملنے والی موجودہ رعایات جاری رہیں گی۔ یہ رعایات بھارت واپس آنے والے غیر مقیم بھارتیوں کی املاک پر دی جاتی ہیں۔ بھارت آنے کے بعد ایک سال کی مدت کے اندر بھارت لائی گئی دولت سے خریدی گئی چیزیں بھی اس رعایت کے تحت آئیں گی۔ یہ رعایت سات برس کی مدت اور صرف ان غیر مقیم بھارتیوں کے لیے ہے جو مستقل رہائش کی غرض سے بھارت لوٹے ہوں۔

قومی ہاؤسنگ بینک (این ایچ بی) کا مرکزی سیل تمام منظور شدہ پروجیکٹوں اور شکایات کے معاملے میں اصلاحی اقدامات کی نگرانی کا کام متعلقہ ریاستی و مقامی اداروں کی مدد سے انجام دے گا۔ یہ ایجنسیاں جائدادوں اور بلڈروں کی ڈائرکٹری بھی تیار کریں گی۔ ان سہولیات کے لیے مستحق ٹھہرائے جانے کے ضمن میں غیر مقیم بھارتیوں کے بھارت نژاد ہونے کا مسئلہ الگ الگ ممالک کے لحاظ سے حکومت ہند وقتاً فوقتاً کرے گی۔

●

ڈاکٹر عرفان علیمی

لونیتِ خون

(جسم میں فولاد کی زیادتی بھی ایک مرض ہے)

ھر شئے اعتدال میں ہی اچھی لگتی ہے کوئی بھی شئے خواہ کیسی ہی مفید اور بہتر کیوں نہ ہو لیکن اس کی کثرت بری ہوتی ہے۔ غذا صحت جسمانی کے لیے کس قدر ضروری اور لازمی ہے لیکن اگر ضرورت سے زیادہ کھانا کھا لیا جائے تو وہی غذا صحت اور زندگی کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ صحت مند رہنے کے لیے غذائی اجزا کو اعتدال میں استعمال کیا جائے۔

جسم انسانی میں فولاد کی کثرت بھی ایک مرض ہے جسے لونیتِ خون - (HAEMOCHRO MATOSIS) کہتے ہیں۔ اگرچہ فولاد ہمارے جسم کا ایک اہم جزو ہے۔ خون کے سرخ ذرات میں فولاد کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ خون میں سرخی کا سبب بھی فولاد کی موجودگی ہی ہے۔ لیکن اگر یہی فولاد ضرورت سے زیادہ ہوجائے تو مرض کا سبب بن جاتا ہے۔

فولاد کا شمار زمین کی اہم دھاتوں میں ہوتا ہے۔ یہ دھات تقریباً تمام جاندار اشیا میں پائی جاتی ہے۔ ہم تقریباً ایک ملی گرام فولاد اپنی غذا سے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں تقریباً آدھا ملی گرام خون کے سرخ ذرات، ہیموگلوبن اور مایوگلوبن میں اور سرخ خون کے پروٹین اور جسم کے عضلات

جذب ہوجاتا ہے۔

لونیتِ خون ایک موروثی مرض ہے جس میں چھوٹی آنت بہت زیادہ فولاد جذب کرلیتی ہے جس کی وجہ سے جسم کی ہر قسم کی بافتوں کو نقصان ہونے لگتا ہے۔ اس ...

ایک جرمن پیتھالوجسٹ نے ...

تھا اس سے قبل اسے تلف ...

جاتا تھا۔ کیونکہ اس مرض کے ...

کا رنگ تانبے کی طرح سرخ ہوجا ...

یہ سمجھا گیا تھا کہ اندرونی اعضا اور جلد دونوں میں موجود حمرۃ الدم (HAEMOGLOBIN) کے کیمیائی رنگ سے رنگ کر سرخ ہوجاتے ہیں چنانچہ اس مرض کا نام لونیتِ خون رکھا گیا تھا۔ جس کے معنی ہیں خون سے رنگ جانا۔ جب کہ دراصل یہ مرض جسم میں فولاد کی زیادتی کے سبب واقع ہوتا ہے۔

اسباب :

ہم روزمرہ جو غذا استعمال کرتے ہیں اس میں ۱۰سے ۲۰ ملی گرام فولاد موجود ہوتا ہے۔ غذا سے جسم میں فولاد کا جو انجذاب ہوتا ہے۔ وہ ایک

ایڈیٹر "نوائے طب و صحت" پوسٹ آفس
سنگم سرائے، الہ آباد۔ ۱۵ (یو۔پی)

منظم طریقے سے ہوتا ہے اور فولاد کا جو انجذاب ہوتا ہے وہ روزمرہ کی مصروفیات میں خرچ ہوجاتا ہے۔ جب جسم کو فولاد کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے تو ایسی حالتوں میں آنتیں فولاد کا ایک اسی تہ ...

عضلات، قلب، جگر، معدہ، غدہ عابیہ، لبلبہ اور غدہ فوق الکلیہ میں جمع کردیتا ہے۔ جن اعضا میں فولاد پہلے ہی سے جمع ہوتا ہے انھیں نقصان پہنچنے لگتا ہے اور فولاد کی مقدار جب ۲۰ سے ۴۰ ملی گرام تک پہنچ جاتی ہے تو جسم انسانی کے اہم اعضا کے فعل میں خلل پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ کام کرنا بند کردیتے ہیں۔

علامات :

اس مرض کی اگرچہ کوئی مخصوص اور متعین علامات نہیں ہوتی ہیں تاہم کچھ ایسی علامات ضرور پائی جاتی ہیں جن سے اس مرض کے ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ فولاد کے مضر اثرات عموماً ۴۰ سال کی عمر کے بعد ہوتے ہیں، خواتین میں اس سے بھی زیادہ عمر میں اثرات

رہتا ہے میں۔ خواتین کے مقابلے مردوں میں یہ مرض زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس مرض کی ایک علامت پیٹ میں درد کا ہونا بھی ہے۔ درد پیٹ کے بیچ کے حصے میں او پر دائیں جانب ہوتا ہے۔ درد ہلکا ہوتا ہے۔ اکثر مریضوں کی جلد پر تانبے کی طرح بھورے رنگ کا دھبہ آجاتا ہے۔ اگر یہ مرض نوجوانوں کو ہو تو ایسی حالت میں بازوؤں کے تناسب میں خرابی آسکتی ہے اور جنسی مسائل پیدا ہونے کے امکانات ہو جاتے ہیں جیسے عدم دلچسپی اور نامردی کی شکایت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں جسم کے کچھ حصوں کے بال بھی جھڑنے لگتے ہیں۔ فولاد کی کثرت کے سبب ذیابیطس بھی لاحق ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس کی زیادتی کے سبب لبلبہ جو انسولین تیار کرتا ہے، تباہ ہو جاتا ہے۔ اس مرض میں جگر بھی بڑھ جاتا ہے۔ اگر اس مرض کو نظرانداز کیا جائے اور علاج پر توجہ نہ دی جائے تو قلب کی تکالیف بھی ہوسکتی ہیں جیسے دل کی دھڑکن کا بے قابو ہو جانا۔ اس مرض میں مبتلا افراد کے جوڑوں میں فولاد کے جمع ہونے کے سبب گٹھیا جیسا تکلیف دہ مرض ہوسکتا ہے جوڑوں میں سوجن اور درد ہو سکتا ہے۔ اس مرض کے دیگر علامات میں ضعف، ٹخنوں میں ورم، یرقان، تنفس میں بے قاعدگی اور مردوں میں سینے کا بڑھ جانا بھی ہے۔ چونکہ اس مرض کی تشخیص محض علامات کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا مریض کے خون کی جانچ ضروری ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خون میں فولاد کی سطح کیسی ہے؟

علاج :

جسم میں فولاد کی زیادتی کو کم کرنے کا مفید اور بہتر طریقہ خون کا اخراج ہے زمانہ قدیم میں فصد کھولنے کا رواج تھا جو بہت ہی موثر اور مفید تھا جو اب متروک ہو چکا ہے۔ اسی طرح جونک لگانا بھی ایک محفوظ اور بہتر طریقہ سمجھا جاتا تھا لیکن یہ طریقہ بھی اب ترک ہو چکا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

آج کل صاف ستھری سوئیوں سے خون نکال لیا جاتا ہے جب تک مریض صحت یاب نہیں ہو جاتا اس کے جسم سے خون نکالا جاتا ہے۔ پہلے یہ مرض شاذ و نادر ہوتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے اندازوں کے مطابق ۲۰ ہزار میں سے صرف ایک بچہ اس کا شکار ہوتا تھا لیکن حالیہ اعداد و شمار کے مطابق خون دینے والے ۲۰ افراد میں سے ایک کے خون میں فولاد کی مقدار معمول سے زائد ہوتی ہے۔ اوہائیو یونیورسٹی کے ایک سروے کے مطابق کم از کم ۱۰ لاکھ امریکی ضرورت سے زیادہ مقدار میں فولاد کا استعمال کرتے ہیں جس سے ان افراد کے اس مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ہاں ایسے ممالک جہاں نقص تغذیہ عام ہے وہاں عام طور پر فولاد کی کمی پائی جاتی ہے تاہم فولاد کے استعمال سے اگر ایسے علامات ظاہر ہوں جن سے اس مرض میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو مکمل احتیاط اور تصدیق لازمی ہے۔

●

بقیہ: مرکزی عام بجٹ

اس بڑے پیمانے پر دست کشی سے ظاہر ہے کہ لوگوں پر بوجھ پڑا۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بار بار کہا تھا کہ آئندہ کے لیے حالات کو سازگار بنانے کی غرض سے یہ سب ضروری ہے، لیکن نئی پالیسی کے معترضین اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ معترضین اب ان کے تیسرے بجٹ پر ششدر ہیں کہ انھوں نے مرکزی ترقیاتی منصوبہ کے اخراجات میں ۳۲ فی صد کا اضافہ کر دیا، جن میں دیہی ترقی کے لیے رقم میں ۶۲ فی صد کا اضافہ شامل ہے۔ ۲۰ مہینے میں مجموعی مالی خسارہ میں تقریباً چار فی صد کی کمی کر دی۔ اور یہ سب انھوں نے ٹیکس لگا کر نہیں کیا بلکہ ٹیکسوں میں ۵۴ ارب ۲۲ کروڑ روپیے کی کمی کر کے کیا ہے۔ اس کارنامہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ پچھلے دو برسوں میں جو سخت مالی اقدامات کیے گئے تھے اُن کے نتائج اب برآمد ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اور اب ایسی زمین ہموار ہو گئی ہے، جس میں آنے والے برسوں میں تیز اقتصادی ترقی ہو سکے گی۔ ترقیاتی اخراجات میں نمایاں اضافہ کے ساتھ مجموعی مالی خسارہ میں کمی مرکزی سرکار کے لیے پیدا شدہ مالی استحکام کی علامت ہے۔ پچھلے ۲۰ مہینوں کے اچھے مالی نظم و نسق کی سب سے زیادہ واضح کامیابی یہ نہیں ہے کہ سالِ رواں میں ترقیاتی اخراجات میں بڑا اضافہ ہوا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اندرونی قرضوں میں اضافہ رُک گیا ہے اور ان قرضوں کی ادائیگی میں جو بڑی رقم خرچ ہوتی تھی، وہ جلدی گھٹنی شروع ہو جائے گی۔

مرکزی حکومت کا ۹۴-۱۹۹۳ء کا بجٹ جس کی ہر طرف واہ واہ ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ مرکزی حکومت نے ۲۰ مہینے پہلے اقتصادی اصلاحات کی جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ صحیح ہے۔ اس پالیسی کے اچھے نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ملک کا مالی بحران ختم ہو چکا ہے اور ملک کے عام و خاص اب اچھے دِنوں کی اُمید کر سکتے ہیں۔ خود ڈاکٹر منموہن سنگھ کے الفاظ میں، اس بجٹ کا بڑا مقصد اقتصادی اصلاحات کے پروگرام کے فوائد کو مستحکم کرنا ہے اور ان فوائد کو ملک کی صنعتوں کی تیز بحالی، صنعتی معیشت کی توسیع، زراعت کے لیے روپیہ کی فراہمی، برآمدات کے فروغ اور مختلف شعبوں میں عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے۔

توحید خان

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ہائی کورٹ کی پہلی خاتون چیف جسٹس کا نام بتائیے؟

۲۔ "فادر آف جینیٹکس" (Faither of Genetics) کسے کہا جاتا ہے؟

۳۔ "موہنجو داڑو" کی دریافت کب ہوئی اور کس نے کی؟

۴۔ "لافنگ گیس" (Laughing Gas) کا کیمیاوی نام (Chemical Name) کیا ہے؟

۵ 'غریبی کو دور کرنا' (Removal of Poverty) اور معاشی خود مختاری حاصل کرنا (Attainment of Economic Self Reliance) کس پنج سالہ منصوبہ کے اہم مقاصد تھے؟

۶۔ "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانس اسٹڈیز" ہندوستان کے کس شہر میں ہے؟

۷۔ "جلیان والا باغ" کے المناک واقعے کے وقت ہندوستان کا وائسرائے (Vice-rey) کون تھا؟

۸۔ شاہجہاں کا اصل نام کیا تھا؟

۹۔ نورجہاں کے پہلے شوہر کا نام کیا تھا؟

۱۰۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت برطانیہ کا وزیر اعظم کون تھا؟

۱۱۔ ناوابستہ تحریک کی دسویں کانفرنس (10 th Non-Aligned Summit) کب اور کہاں ہوئی تھی؟

۱۲ تیلگو گنگا پروجیکٹ"... کس ریاست میں۔

۱۳۔ نمونیہ (NEUMONIA) کون سا حصہ اثر انداز

۱۴۔ "سسروتا" (SRUTA) (MEDICINE) کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کے مصنف کا نام بتائیے؟

۱۵۔ "وہابی تحریک" کی شروعات کس نے کی تھی؟

۱۶۔ "سرحدی گاندھی" کے نام سے کسے جانا جاتا ہے؟

۱۷۔ نو تشکیل شدہ نیشنل کمیشن ایس سی ایس۔ٹی (ST/ST) کا چیرمین کون ہے؟

۱۸۔ ایسٹ انڈیا کمپنی (EAST INDIA Company) کب قائم ہوئی تھی؟

۱۹۔ ایس پیس کمیشن (Space Commission) کا چیرمین کون ہے؟

۲۰۔ "سوراج پارٹی" (Suaraj Party) کو قائم کرنے والے کون تھے؟

۲۱۔ "گیت ہی گیت" بتلائیے یہ کس کا شعری مجموعہ ہے؟

۲۲۔ طباطبائی نے کس انگریزی شاعر کی مشہور نظم (Elegy) کا ترجمہ "گو ... سال"

... اشاعت کے بارے میں یہ کون پیشین گوئی کرتی رہتی تھیں؟

۲۵۔ انگریزی اصناف سخن میں ۱۴ سطری نظم کو کیا کہتے ہیں؟

۲۶۔ "انڈین آئل کارپوریشن" (Indian Oil Corporation) کس سال قائم ہوا تھا؟

۲۷۔ ہندوستان کی کس ریاست میں "آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن" (Oil and Natural Gas Commission) یعنی ONGC کا ہیڈ کوارٹر ہے؟

۲۸۔ نابیناؤں کے پڑھنے کے طریقے کو کس نے ایجاد کیا؟

۲۹۔ "پرتھوی راج راسو" (Prithviraj Raso) کا مصنف کون ہے؟

۳۰۔ شری راجیو گاندھی کا پہلا یوم وفات کس

عنوان سے منایا گیا؟

۳۱۔ "ون ڈے ونڈرس" (ONE Day Wonders) کتاب کا مصنف کون ہے؟

۳۲۔ دسویں فائنانس کمیشن (10 th Finance Commission) کا چیئرمین کون ہے؟

۳۳۔ بیتیاب کا رنگ کس چیز کی موجودگی کے سبب پیلا ہوجاتا ہے؟

۳۴۔ ہندوستان نے حال ہی میں کس ملک کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات قائم کئے ہیں؟

۳۵۔ ہندوستان کا کون سا سٹیلائٹ (Satellite) ۱۹۰۵-۱۰ میں چھوڑا گیا تھا؟

۳۶۔ کاس دلوی کون تھی؟

۳۷۔ اُن دو جگہوں کا نام بتایئے جہاں روپیہ کی چھپائی ہوتی ہے؟

۳۸۔ ۱۹۹۵ء کے ورلڈ کپ کرکٹ کا فائنل میچ کہاں کھیلا جائے گا؟

۳۹۔ کتنے ممالک نے حال ہی میں "کیمیکل ویپن" (Chemical Weapon) کی پابندی کے معاہدے پر دستخط کئے ہیں؟

۴۰۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے کون سے صوبے میں خواندگی کی شرح سب سے کم ہے؟

بقیہ: اسکیموں کی بہتر تکمیل کیسے ممکن ہے

صلاحیت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جانا چاہیئے۔ یعنی وہ ضلع کی ضروریات کا اندازہ لگائے، اسکیموں کو سمجھ کر اُن میں باہمی ربط پیدا کرے اور اُن کی پیش رفت کا جائزہ بھی لے؟ علاوہ ازیں اُسے اکثر ہوتے رہنے والے تقاضوں کے لیے بھی تیار رہنا ہوتا ہے۔ تمام اسکیموں پر عمل درآمد کی تقویت کے لیے ضروری ہے کہ:۔

(۱) کہ عام آدمی کی بہتر سمجھ کے لیے ایک جیسی اسکیموں کو اکٹھا کیا جائے۔ (۲) درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل کی کارپوریشن، خواتین اور بچوں کی ترقی کے اداروں اور کھادی و دیہی صنعتوں وغیرہ کی طرف سے الگ الگ اسکیمیں رائج کرنے کی بجائے ہر اسکیم میں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل اور خواتین کے لیے تناسب مقرر کیا جانا چاہیئے۔ (۳) امداد کے لیے ایک ہی مرکز پر زور دیا جانا چاہیئے جس سے ایک جیسا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ (۴) اطلاعات کے لیے مختلف سطح پر کم سے کم فارم رکھے جائیں۔ (۵) مرکزی اور ریاستی سطح محکموں اور کارپوریشنوں کی تعداد گھٹا کر اخراجات میں کفایت کی جائے۔ ●

بقیہ: جہیز اور نوجوانوں کی ذمہ داریاں

محفوظ کر سکتا ہے اور ایک بہتر معاشرے کی تخلیق میں ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ نوجوانوں کی اس وقت کی ذراسی لغزش آنے والی نسل کی تباہی بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے نوجوانوں کے لیے یہ لمحہ بہت ہی فکر کا لمحہ ہے۔ اُسے ایک ایک قدم بہت ہی سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے تاکہ نسلوں کی تربیت ہو سکے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ بس ذراسی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ اور قافلے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔ تو آیئے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس لعنت کے خلاف جہاد کرنے کا عہد کیجئے اور اپنی بہنوں کو آگ کے شعلوں سے بچایئے اور بہتر مستقبل عطا کیجئے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
انھیں منزل نظر آتی ہے اپنی آسمانوں میں

●

بقیہ: زراعتی قرضوں کی انجمنیں

میں (۴۸ء۵) اور کیرل میں (۱۹ء۵) تھا۔ پنجاب، راجستھان، اڑیسہ اور اترپردیش اُن کچھ ریاستوں میں ہیں جہاں منافع کمانے والی انجمنوں کا تناسب ۶۷ فی صد سے زیادہ تھا۔

کرناٹک زرعی قرضے دینے والی خستہ حال انجمنوں کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ ریاست میں ایسی ۱۹۸۱ء انجمنوں میں سے صرف ۱۴۹۳ منافع کما رہی تھیں۔ باقی سب خسارہ میں تھیں۔

چنانچہ ان انجمنوں کی طرف سے زرعی قرضے دینے میں ناکامی کی وجہ سے کاروباری بنکوں کا زرعی سرمایہ مہیا کرنے کا کاروبار اس مدت میں بڑھا ہے۔ چنانچہ اس وقت فوری اقدامات کی ضرورت ہے جس سے دنیا کے سب سے بڑے امدادی باہمی نظاموں میں سے ایک اس نظام کو بچایا جا سکے تاکہ وہ ملک کے کسانوں کو کم خرچ پر خدمات مہیا کر سکے۔ ●

دیہی خواتین کی بے روزگاری کا خاتمہ

دیہی علاقوں میں خواتین اور بچوں کی ترقی کے لیے مرکزی امداد کے طور پر ۱۲ لاکھ روپے کی رقم جاری کی گئی ہے۔ یہ ایک خصوصی پروگرام ہے جس کا مقصد خواتین کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔ اور یہ پروگرام ۲۸۶ اضلاع میں چل رہا ہے۔ ان میں سے ۱۴۵ اضلاع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جبکہ ۹۳-۱۹۹۲ میں ۵۰ اضلاع کی تخصیص ہے۔ بقیہ پانچ اضلاع کا انتخاب ریاستی حکومتوں سے تجاویز موصول ہونے پر عمل میں آئے گا۔ مربوط دیہی ترقی پروگرام جس کے تحت ۴۰ فی صد فائدہ خواتین کے لیے مخصوص کیا جانا ہوتا ہے۔ ملک بھر میں پہلے سے ہی عمل آوری کے مراحل میں ہے۔ خود روزگار کی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے تربیت دیہی نوجوانوں کو خود روزگار کی تربیت کے پروگرام (ٹرائی سم) کے تحت دی جا رہی ہے۔ ●

نئی دہلی

یوجنا

جلد، ۱۳ شمارہ، ۳ - ۴

یکم تا ۳۱ مئی ۱۹۹۳ء :: ۱۱ ویساکھ تا ۱۰ جیٹھ تک ۱۹۱۵

قیمت : ۳ روپے ٹیلی فون ۳۸۱۰۱۶

چیف ایڈیٹر ——— ڈی. کے. بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر ——— توحید خان

معاون ——— وسیم حیدر

کتابت سجاد علی خاں

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دو سالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے. فی کاپی . ۳ روپے.

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ -

ایڈیٹر یوجنا (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (میں)، نئی دلی ۱۱۰۰۶۶ -

پروڈکشن آفیسر: سدرشن موہن چبل

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے. مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں.

اس شمارے میں

بھارت تھائی لینڈ : تاریخی تعلقات

جنوب مشرقی ایشیا کے سب سے زرخیز علاقوں میں سے ایک علاقے میں تھائی لینڈ واقع ہے، جو برما، لاؤس اور کمبوڈیا سے گھرا ہوا ہے۔ تھائی لینڈ برصغیر کے چند ممالک میں سے ایک ملک ہے، جو کسی مغربی طاقت کے ذریعے نوآبادیاتی نظام کے تحت نہ رہنے پر فخر کر سکتا ہے۔ تھائی لینڈ نے ابھی تک مشرقی ثقافت اور فنون کی خصوصیات کامیابی کے ساتھ برقرار رکھی ہیں۔ بھارت کے ساتھ تھائی لینڈ کا ثقافتی تعلق عیسوی دور سے بھی پہلے سے ہے، جب بدھ مذہب دونوں ممالک کے درمیان تعلق قائم کرنے والے نمایاں عنصر کے طور پر ابھرا تھا۔

اگرچہ تھائی لینڈ کی قدیم تاریخ کے لیے دستاویزی ثبوت مہیا نہیں ہیں لیکن اس علاقے میں پائے گئے پہلے پالی کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری اور چھٹی صدی کے دوران بدھ مذہب جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا تھا۔ تھائی لینڈ میں بدھ مذہب کا اتنا زیادہ دیرپا اثر ہوا تھا کہ آج وہاں ۹۵ فیصد آبادی سے ظاہر ہوا ہے کہ متعدد معاملات میں اصل نمونوں کے مقابلے میں تھائی لینڈ اور فنِ سنگ تراشی کو کہیں زیادہ ترقی و فروغ حاصل ہوا ہے۔ لیکن فن اور فنِ سنگ تراشی سے بھارتی نمونے رفتہ رفتہ غائب ہو گئے — یہ

یوجنا، نئی دہلی

تبدیلیاں گوتم بدھ کی مورتیوں میں بھی مرتب ہوئیں، جو بھارتی مورتیوں سے بھی کہیں آگے نکل گئیں۔

تھائی فن کی بہترین توضیح ایک ملے جلے فن کے طور پر کی جاتی ہے جس میں تھائی فن کاروں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ نیز اپنے کام اور اپنی تخلیق میں یک جہتی کا ایک احساس برقرار رکھا ہے۔

بدھ مذہب سے متعلق موضوعات، خیالات اور نظریات غالب ہیں لیکن تھائی لینڈ کی بو۔ ڈنگ مصوریوں میں رامائن کے مختلف واقعات کا پیش کیا جانا ایک اور دلچسپ پہلو ہے۔ درحقیقت، بو۔ ڈنگ اسکول نئی خصوصیات کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ بعد ازاں، قصّوں اور روایات کے بارے میں فن کی آزادانہ ترقی و فروغ اور ادبی ذرائع اس اسکول کو ملک کے موجودہ تصویری فن کی جانب لے گئے۔

ثقافتی تبادلہ

آزادی کے بعد دونوں ممالک کے درمیان مسلسل بنیاد پر ثقافتی تبادلے کا سلسلہ رہا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کے لیے بھارت اور تھائی لینڈ نے اپریل ۱۹۷۷ء میں ایک ثقافتی معاہدہ کیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت عوام میں دونوں ممالک کی ثقافتوں اور سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بیداری پیدا کی جائے گی نیز فن اور ثقافت، سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں تعلیمی سرگرمیوں سمیت تعلیم، ذرائع ابلاغ کی اطلاعات، صحت عامہ، کھیل کود اور سمعی و بصری ذرائع ابلاغ سمیت صحافت کے شعبوں میں تعاون حاصل کیا جائے گا۔

اس کے نتیجے میں، ایک اہم بات آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے لیے دو طرفہ امداد رہی ہے تاکہ وہ کھدائی کے کاموں نیز قدیم اشیاء کے تحفظ اور اُن کی نمائش کے بارے میں تجربہ حاصل کر سکیں، اس سلسلے میں تربیت حاصل کر سکیں اور نمونوں و تصاویر کا تبادلہ کر سکیں۔

گذشتہ دو دہوں میں رقص اور موسیقی کے پروگراموں کے تبادلے کے سلسلے میں کافی تیزی آئی ہے۔ تھائی کلاسیکی رقص کی مسحور کن کشش نے بھارت میں بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ رقص کے پروگراموں میں سے سب سے مقبول عام رقص "کھون" جو نقاب پہن کر کیا جاتا ہے اور رقص پر مبنی ڈرامہ "کھون"

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

ڈاکٹر ایس. کے. جوشی

سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل

عالمی تجارت میں ایک بہتر حصہ حاصل کرنے کے لیے بقابلے کی بڑھتی ہوئی مانگوں کا دارومدار بڑی حد تک جانکاری کے مناسب استعمال پر ہے۔ موثر تحقیق کی بنیاد پر صنعتوں اور سیٹرلوں کے درمیان قریبی روابط اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل (سی ایس آئی آر) نے تحقیقی اور ترقیاتی پروگرام شروع کرکے اپنی سرگرمیوں کو ہندوستانی صنعت کے لیے مزید کارآمد بنانے کی غرض سے انھیں تیز تر کر دیا ہے۔

حکومت کے زیر اہتمام اس اعلیٰ ترین ادارے کا سب سے اہم کام ہندوستان میں سائنسی اور صنعتی تحقیق کی ترقی و فروغ، نگرانی اور اس میں تال میل پیدا کرنا ہے۔ ملک بھر میں سی ایس آئی آر ۴۰ تجربہ گاہوں اور ۸۰ علاقائی اور توسیعی مراکز کے ایک مربوط اور نتیجہ خیز نظام پر مشتمل ہے۔ آج سی ایس آئی آر کا دائرہ کار مائیکرو الیکٹرونکس سے لے کر ادویاتی پودوں، مولی کیولر سے لے کر میٹیریل سائنسز، اوشنو گرافی سے لے کر خلا تک اور کیمیاوی اشیا سے لے کر تعمیراتی انجینئرنگ تک پھیلا ہوا ہے۔

سی ایس آئی آر ٹکنالوجیوں پر مبنی مجموعی سالانہ پیداوار کی مالیت ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے ہے جب کہ پیداواریت میں بہتری آنے کے باعث کو ہونے والی بچت تقریباً ۱۵۰ کروڑ روپے ہے۔ ٹکنالوجیوں سے ۱۶۰ کروڑ روپے کی سالانہ صنعتی پیداوار ہوتی

پچاس برسوں میں

ضروریات اور ترجیحات

کیا ہے۔ ابتدا میں، ...

فروغ کے ابتدائی مرحلے میں

نے موسمیات، معیار بندی، جانچ پرکھ اور پرکھ کے کام میں کارآمد مدد کی ہے اور تربیت یافتہ سائنسی افرادی قوت فراہم کی ہے۔ اب جب کہ صنعت بلوغت کو پہنچ چکی ہے، سی ایس آئی آر نے اپنی تحقیقی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو از سرِ نو وضع کیا ہے۔ تاکہ اسٹیٹ آف دی آرٹ اور کم لاگتی ٹکنالوجیاں فراہم کی جائیں۔

بہت عرصہ قبل ہی تحقیقات کے نتائج برآمد ہونے لگے تھے۔ زیادہ تر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ مکمل طور سے اندرونِ ملک تیار کردہ ملک کا سب سے پہلا ٹریکٹر سی ایس آئی آر کی ٹکنالوجی پر مبنی تھا۔ پیٹرو کیمیکل، کیڑے مار ادویہ اور دوا سازی کی صنعتوں کے لیے

کونسل کی خدمات کا اعتراف اب قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ سی ایس آئی آر نے کئی معدنیات ...

کو کام میں لاتا ہے، خاص طور سے دیہی خواتین کی بدحالی اور مزدوری میں کمی لاتا ہے، آمدنی اور روزگار کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ رہن سہن کے ماحول کو بہتر بنا کر معیارِ زندگی کو بہتر بناتا ہے، صحت اور خاندانی بہبود کو فروغ دیتا ہے نیز فصل کی کٹائی کے بعد زرعی باغبانی اور خوراک کے تحفظ کے طریقوں کو بہتر بناتا ہے۔

کونسل نے دیہی دست کاروں اور کاریگروں کے اوزار اور مصنوعات کو بہتر بنا کر اُن کے ہنر کو بھی بہتر بنانے میں بھی مدد کی ہے۔ مغربی بنگال کے بانکورہ ضلع اور ہریانہ کے میوات علاقے میں واقع پروجیکٹ نے مظاہرے اور تربیت کے پروگراموں کے ذریعہ لوگوں کو مقامی ہنر اور ضروریات کے لحاظ سے موزوں سی ایس آئی آر کی ٹکنالوجیوں سے واقف کرایا ہے۔ کم قیمت

سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل کے ڈائریکٹر جنرل

کے معیاری سامان اور طریقوں، ادویاتی اور خوشبودار پودوں کی کاشت وغیرہ کو کافی مقبولیت ملی ہے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے انھیں اپنایا ہے۔ سی ایس آئی آر ملک کے کئی شہروں میں دیہاتی کیندر (سائنسی مراکز) شروع کر رہا ہے تاکہ سائنس و تکنیکی جانکاری کو صارفین اور دیہاتی شعبوں کے لیے منتقل کرنے کے کام میں مزید تیزی لائی جائے۔

گذشتہ برسوں میں سی ایس آئی آر نے خاص طور پر سماج کے کمزور طبقوں کے لیے موزوں ٹکنالوجیاں تیار کی ہیں اور ان کی تشہیر کی ہے، جن میں کم رسمی پیشہ ورانہ تربیت یا محدود وسائل سے کم قیمت کی برتن سازی کے طریقے اور پیتل سے پیالیاں اور رکابیاں بنانے کی تکنیکیں شامل ہیں۔ سی ایس آئی آر کی جو ٹکنالوجیاں ان اکائیوں میں بہت مقبول ہیں، جن کے لیے یہ وضع کی گئی ہیں ان ٹکنالوجیوں میں پینے کے پانی سے متعلق ٹکنالوجیاں مثلاً کلورین کی گولی، پانی سے لوہے کے ذرات ہٹانے کے طریقے، پانی چھاننے کی کینڈل، کم لاگتی بیت الخلاء، دیہی اسکولوں کے لیے ٹوائلٹ سلاب وغیرہ شامل ہیں۔

پٹرولیم اور پٹروکیمیکل کے معاملے میں بھی سی ایس آئی آر نے کچھ اعلیٰ تکنیکی شعبوں میں پیش رفت کی ہے، جن پر ابھی تک کثیر ملکی کمپنیوں کا قبضہ تھا۔ سی ایس آئی آر کی ٹکنالوجیوں پر مبنی اس شعبے میں سالانہ صنعتی پیداوار کا تخمینہ ۷۰۰ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔

دنیا میں پہلی مرتبہ ٹشو کلچر کے ذریعے بانس کے قبل از وقت پھلنے پھولنے والے پودوں کی کاشت اور ٹشو کلچر والے معاشی اعتبار سے اہم درختوں اور فصلوں مثلاً ٹیک، گنا، یوکلپٹس، الائچی اور ہلدی کی کاشت، الگائی سے خوراک کی پیداوار، صنعتی الکحل کی پیداوار اور ڈی این اے فنگر پرنٹنگ، جو دنیا میں اپنی نوعیت کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ بائیو سائنس کے شعبے میں کچھ کامیابیاں ہیں۔

ادویہ اور ادویہ سازی کے شعبے میں کونسل نے ہندوستان کو نہ صرف خود کفیل بنانے بلکہ برآمد کنندہ بنانے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ سی ایس آئی آر کی دو پہلوئی حکمت عملی ہے: یعنی مشہور دواؤں کے لئے متبادل اور کم لاگتی طریقے وضع کرنا۔

کونسل نے ہندوستان میں چمڑے کی صنعت کی ترقی و فروغ میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے اور ملک کو خام چمڑے اور کھالوں کے برآمد کنندہ سے ترقی دے کر تیار چمڑے اور چمڑے کے سامان کا برآمد کنندہ بنا دیا ہے۔ سی ایس آئی آر چمڑے کے بارے میں تحقیق کے لئے دنیا کے سب سے بڑے خصوصی ادارے کا انتظام چلاتی ہے، جس کا نام چمڑے سے بال صاف کرنے کے لئے ماحولیاتی لحاظ سے سازگار انزائم پر مبنی طریقہ شامل ہے، جو دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا طریقہ ہے، گیلے چمڑے سے متعلق کاموں میں خودکاری کے عمل سے اس شعبے کے معیار اور پیداواری صلاحیت میں بہت زیادہ بہتری آئی ہے۔

تحقیقی اور ترقیاتی پروجیکٹوں کے ابتدائی مرحلوں سے ہی صارف صنعتوں کے ساتھ قریبی روابط پیدا کئے جا رہے ہیں تاکہ سی ایس آئی آر، جہاں کہیں ضروری ہو، ٹکنالوجی کے پروگرام وضع کر سکے۔ ایسے مراکز بھی کھولے گئے ہیں، جن کا انتظام و انصرام صنعت کے ساتھ مشترکہ طور پر کیا جائے گا تاکہ ساجھے داری کا معاملہ زیادہ بامقصد اور پائیدار رہے تحقیق اور ترقی نیز ٹکنولوجی کی مارکیٹنگ کے سلسلے میں بین الاقوامی اشتراک عمل کو تیز تر کیا جا رہا ہے۔

اس وقت سی ایس آئی آر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کی اٹھارہ تنظیموں کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں تعاون کر رہا ہے۔ اس کا مقصد باہمی طور سے مفید تحقیقی اور ترقیاتی سرگرمیوں، سائنسی معلومات اور ماحولیات کے لئے تحقیق اور ترقیاتی پروگراموں کے سلسلے میں مشترکہ طور پر کام کرنے کے لئے سائنسدانوں کا تبادلہ کرنا ہے۔

سی ایس آئی آر نے ایک لچکدار فعال تنظیم کے طور پر کام کرتے ہوئے، عالمی ترقیات سے خود کو الگ تھلگ کئے بغیر ہمیشہ ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کے مسائل کے حل فراہم کئے ہیں۔ اس کا مقصد ایسی ٹکنالوجیاں وضع کرنا ہے، جو عالمی سطح پر مقابلہ کر سکیں، مقامی وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے کے لئے موزوں ہوں اور جن میں درآمد شدہ خام مال اور اجزا کو اندرون ملک ہی تبادلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔

سب سے اہم کامیابیوں میں سے ایک کامیابی ٹکنالوجی اور خدمات کی برآمدات کے شعبے میں اس کا داخلہ ہے۔ کونسل نے چند ادویہ کے بارے ٹکنالوجیوں اور خدمات کی برآمدات اور مشاورتی خدمات فراہم کی ہیں۔ اس کی وجہ سے غیر ملکی زرمبادلہ میں سالانہ دس لاکھ امریکی ڈالر کی آمدنی ہونے کی توقع ہے۔ ٹکنالوجی کی تشہیر کے لیے سی ایس آئی آر کے چارجز بہت کم ہیں، جن کی وجہ سے ٹکنالوجی کی درآمدات میں کمی لانے میں مدد ملے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ٹکنالوجی کی درآمدات میں کمی لانے سے سالانہ دو کروڑ روپے سے لے کر پانچ کروڑ روپے تک کی بچت ہوگی۔

ڈاکٹر پی۔ راما راؤ

معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کردار

سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں تحقیقات ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے سائنس اور ٹکنالوجی کا محکمہ (ڈی ایس ٹی) نئے نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق سرگرمیوں کو منظم کرنے، ان میں تال میل پیدا کرنے اور انھیں فروغ دینے کے لئے اہم مرکز کے طور پر کام کرتا ہے

موسم کی پیش گوئی آب و ہوا کے بارے میں تحقیق، زلزلے کے بارے میں بیداری پیدا کرنے، طبی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے سازوسامان اور تکنیک وضع کرنے، نچلی سطح پر سائنس اور ٹکنالوجی کو مقبول عام بنانے پیداوار کے بہتر طریقوں سے روزگار کے مواقع پیدا کرنے، سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب لوگوں، خواتین اور سماج کے کمزور طبقوں کی ترقی و بہبود ایسے شعبے ہیں جن میں ملک میں تحقیق کرنے کی کافی گنجائش ہے۔

چوں کہ بھارت کی معیشت زیادہ تر زراعت پر منحصر ہے اس لیے بھارت کو کاشت کار برادری کے لیے زراعت نیز موسمیات کے بارے میں مشاورتی اداروں کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے درمیانی دوری کے لئے موسم کی پیش گوئی کا قومی مرکز اور زراعت کی ترقی و فروغ کے لیے مشاورتی ادارے جو ایک کثیر شعبہ جاتی وضع کئے گئے ہیں۔ موسم کی ... میں ایک اعلیٰ سطحی ... نصب کیا گیا ہے۔ علاوہ نظاموں کی نشاندہی کر۔

کارگزاری کو درج کرنے کے لیے کرامس ... ویئر تیار کئے گئے ہیں۔ درمیانی فاصلے کی پیش گوئیوں پر مبنی ... زرعی مشاورتی اداروں نے آنند، حصار، لدھیانہ، پنت نگر، ترچور، بیکانیر، فیض آباد، جبل پور، کانپور اور رائے پور میں واقع زرعی یونیورسٹیوں سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

"بہت چھوٹے کاشت کاروں کے لیے چھوٹے پیمانے کی آبپاشی کی ٹکنالوجی کے زیادہ سے زیادہ استعمال" کے نام سے ایک پروجیکٹ کے تحت آبپاشی کے لیے مٹی نکالنے کے نظام پر ایک آلہ تیار کیا گیا ہے۔ جس کی

لاوٹ ... بھی سادی ہے۔ اس کے لیے کسی ... سازوسامان کے ساتھ کسی ... کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ پانی ... کا انتظام کھیلاؤ ... [illegible]

اندازمات ... جارہے ہیں

... کی ایک بڑی تعداد پولیو اور دیگر ... سے دوچار ہے جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے کے لئے سہارا دینے والے سازوسامان پر منحصر ہو جاتے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی کے محکمے نے ایس اینڈ ٹی کے اپنے پروگرام کے تحت کم وزن والے ... ایک ملٹو ... ایکس اور تھرپس (ایف آر او) تیار کی ہے جس کے متعدد خصوصی فوائد ہیں۔

طبی آلات کے شعبے میں خون کا ذخیرہ کرنے کے لیے خون رکھنے والی تھیلیاں تیار کی گئی ہیں۔ ہر برس ۲ لاکھ سے زیادہ تھیلیاں تیار کی جارہی ہیں۔ تھیلیاں تیار کرنے کی تکنیک نے مصر کو بھی فراہم کی گئی ہے۔ دل کا والو تیار کرنے کے ایک تجرباتی

سائنس اور ٹکنالوجی کے محکمے کے سکریٹری

پروجیکٹ پر کام چل رہا ہے۔ اور اس الفوں پر تجربات ۱۰۰ ابجے کے ساتھ مکمل کئے جا چکے ہیں دماغ کی سرجری میں مدد کے لیے ایک ہائیڈرو لفولس شنٹ بھی تیار کیا گیا ہے۔

بے روزگار افراد کے لئے تربیت فراہم کرنے کے لیے اضافی کاموں میں دستیاب ہونے والے کام کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے تیار کیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی ایک اسکیم (ایم ای جی ایس اے ٹی) شروع کی گئی ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے روزگار کے مستقل ذریعے کے تحت سالانہ ۲ لاکھ روزگار پیدا کرنا ممکن ہوا ہے۔ دیہی علاقوں کے حساب سے تکنیکی مہارت کی گئی ہے ان میں مصنوعی بیجوں کی کاشت اور پالش شدہ لکڑی کی دستکاری جیسی کئی صنعتیں شامل ہیں۔

دہلی اور ہماچل جیسے علاقوں میں خواتین کے لیے ملازمت کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں، پودوں کی مخصوص اقسام کی پودکاری کرنے، مٹی اور پانی کے تحفظ کے سلسلے میں ترقیاتی کام، آلات و وسائل کی نشاندہی کرنے اور پینے کے پانی کے روایتی اور غیر روایتی ساز و سامان کی دیکھ بھال کے کام میں خواتین کو شامل کرنے، پہاڑی علاقوں میں بہتر قسم کے کرگھوں کو فروغ دینے اور بانس کے ریشوں سے مربع اور گول چٹائیاں بُننے کے سلسلے میں ۲۸ پروجیکٹوں کی منظوری دی گئی ہے۔

سیوارائیس پہاڑیوں، بارگوڑ ادوڑ، سالم ضلع، تامل ناڈو میں قبائلی عوام کی بہبود و ترقی کے پروجیکٹ کے تحت خرگوش پالن، شہد کی مکھیاں پالنے، تعمیر مکانات وغیرہ جیسی آمدنی مہیا کرنے والی سرگرمیاں شروع کی گئی ہیں۔ اسی طرح سے تامل ناڈو میں کولی پہاڑیوں اور سالم ضلع میں قبائلیوں کو ٹکنالوجی کی منتقلی کا ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ تاکہ خوراک، رہائش، کپڑا، گھریلو ساز و سامان، پینے کے پانی، صفائی

ستھرائی اور دیہی بجلی کاری کے شعبوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال سے قبائلی کنبوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس پروجیکٹ کے تحت جو سرگرمیاں شروع کی گئی ہیں ان میں مویشی پالن، فارم اور مویشیوں کی پیداوار کرنے کی اسکیموں کا قیام نیز سائنسی اور ثقافتی تعلیم شامل ہیں۔

سماج کے کمزور طبقوں کو کم لاگت والے مکانات فراہم کرنے کے لئے مقامی طور پر دستیاب ساز و سامان استعمال کرنے لاگت کم کرنے والی تکنیکوں کے ایک تجرباتی پروجیکٹ پر کامیابی سے ساتھ عمل درآمد کیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں غیر ہنر مند کاریگروں، راج مستریوں، دستکاروں، اور تعمیرات کا کام کرنے والوں کو تربیت فراہم کرنا شامل ہے۔

علاوہ ازیں کنکریٹ سے چھت ڈالنے کے کم لاگت والے طریقے کی معیار بندی کی گئی ہے۔ یہ چھت ہلکے ڈھانچوں پر ڈالی جا سکتی ہے۔ راجستھان اسٹیٹ چھتوں کے متعلق اس نئے نظام پر عمل ایک ہائی لاگت ہی آتی ہے۔ گاؤں کی سطح پر یہ چھتیں تیار کرنے کے سلسلے میں چھوٹے پیمانے کی یونٹ قائم کرنے کے لیے صنعت کاروں سے بڑا اچھا ردعمل ملا ہے۔ مفصل تجربات کے بعد اسے کا مد تیار کرنے کے نظام کی بھی معیار بندی کی گئی ہے۔

سکلور میں واقع قومی ایروناٹیکس تجربہ گاہ میں ملٹی پرپز حسیکٹ، بحری جہازوں کے دریعے موٹی رسیاں وغیرہ جیسی بڑی مدد گار مصنوعات میں استعمال ہونے والی بڑی میعاد مائیڈ فائبر کے لیے بنیادی پروسیس ٹکنالوجی تیار کی گئی ہے۔ ٹکنالوجی کی منتقلی سے متعلق ایک معاہدے کے تحت یہ ٹکنالوجی صنعت کو منتقل کی جا رہی ہے۔ اسی طرح سے دو آلات تیار کرنے کے پروگرام کے تحت ایٹومک ابسوربشن اسپکٹر فوٹو میٹر اور ہائی پریشر لکیوڈ کروماٹوگراف تیار کئے گئے ہیں۔ نیز بڑے پیمانے پر تیاری کے لیے ان کو صنعت

کو منتقل کیا گیا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے تحت مصنوعی سیارے کے ذریعے موسمیاتی خدمات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ مصنوعی سیارے انسیٹ ۱۱ کے ذریعے زمین پر اطلاعات موصول کرنے کا نظام نصب کر دیا گیا ہے اور اس نظام کو انسیٹ ۱۱ کی خلائی گاڑی کے کام کاج میں ہم وقتی کے ساتھ چالو کر دیا گیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زمینی اسٹیشن یا نظام اندرون ملک ہی تیار کیا گیا ہے۔ یہ نظام انسیٹ ۱ اور انسیٹ ۱۱ دونوں کے سگنلوں کو پروسیس کر سکتا ہے۔ موسم کے بارے میں پیش گوئیاں کرنے والے ماہرین کی مدد کے لیے انسیٹ ۱۱ سے اعلیٰ معیاری تصویریں مسلسل موصول ہو رہی ہیں۔ اس سے مستقبل میں انسیٹ ۱ ڈی کے کام بند کر دینے کے بعد بھی انسیٹ موسمیاتی سروس کا جاری رہنا یقینی ہو گیا ہے۔

ایک مقررہ علاقے میں قدرتی وسائل اور سماجی و اقتصادی پیمانوں کے بارے میں مکمل طور پر اعداد و شمار جمع کرنے، ان کی تقسیم کرنے اور ان کے استعمال کے سلسلے میں ایک سائنسی طریقۂ کار وضع کرنے کی غرض سے وسائل کے اعداد و شمار کے انتظام کے قومی نظام (این آر ڈی ایم ایس) کا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ این آر ڈی ایم ایس کے تحت اعداد و شمار کے ذخیرے کے مراکز دھارواڑ، میسور اور دکشن کنڑ اضلاع میں قائم کئے جا چکے ہیں۔ یہ مراکز خشک سالی پر نظر رکھنے اور اسے کم کرنے، ساحلی کٹاؤ اور پینے کے پانی کے مسئلے جیسے علاقے پر مبنی مخصوص مسائل سے نپٹنے کے لیے فضا سے متعلق اعداد و شمار کا ذخیرہ تیار کرے گی۔

●

رام کے۔ آئینگر
جے۔ ایس۔ خان اور این۔ ڈی۔ سیٹھ

مربوط دیہی ترقّی: ترقیّاتی ایجنسیوں کا تفاعلی کردار

ملک میں آزادی کے بعد دیہی ترقی کے پروگراموں کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک جامع انتظامی ڈھانچے کا قیام عمل میں لایا گیا ہے پھر بھی ضلعی انتظامیہ کو اُن تمام کنبوں تک (جن کی تعداد ایک ضلع میں ...۰۰۰ کے قریب ہے) پہنچنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ متعدد جائزوں سے آشکار ہو چکا ہے کہ مختلف سرکاری پروگراموں سے استفادہ کرنے والوں کے بے وسائل کو حرکت میں لانے کے لیے ایک اضافی تنظیم کی ضرورت ہے۔ سرکاری مشینری ابھی تک ترقیاتی پروگراموں میں عوام کی شرکت بھی حاصل نہیں کر سکی ہے۔ وسائل کی قلت کے سبب ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کے متبادل راستوں پر غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ایک متبادل راستہ تو یہ ہے کہ ترقیاتی پروگراموں پر عمل آوری میں سب سے نیچے کی سطح کے عوام کی تنظیموں کو شریک کیا جائے۔ لہٰذا ان تنظیموں کا اشتراک عمل حاصل کرنے کے لیے ایک موزوں حکمت عملی پر غور ضروری ہے۔ مسلسل جاری رہ سکنے والی ترقی کے لازمی ہے کہ سماج کے سبھی طبقوں کی نہ صرف اقتصادی ضروریات کی تکمیل کی جائے بلکہ ان کی جسمانی، نفسیاتی اور ثقافتی ضرورتیں بھی پوری کی جائیں۔

دیہی ترقی کے عمل میں بھی سب سے پہلے دیہی آبادی کی بنیادی ضرورتوں پر اور پھر اُس کی نفسیاتی اور ثقافتی ضرورتوں کی تکمیل پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ بازار کا نظام عوام کی ضرورتوں کو صرف جزوی طور پر ہی پورا کر سکتا ہے۔ یعنی صرف اُن ضرورتوں کو ہی جنھیں لو ا
لوگوں میں قوتِ خرید ہو
ضرورتوں کو دو زمروں میں تقـ
ایک کنبے کی انفرادی ضرورتیں
خوراک، صاف پانی، ایـ ـ
وغیرہ اور دوسرے سماجی ضرورتیں مثلاً بجلی، ذرائع آمد و رفت، ٹیلی مواصلات کی سہولت، تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال وغیرہ۔

دیہی علاقوں کی ترقی کے متذکرہ بالا لوازمات کے لیے آمدنی کا ہونا ضروری ہے اور آمدنی تبھی ہو سکتی ہے جب بڑھتی ہوئی آبادی ... ضرورت ہوگی ... کے لیے سیاسی عزم و ارادہ درکار ہوگا۔

ضرورتیں (ترتیب وار بلحاظ اہمیت)	ترقی کے لوازمات
بنیادی ضرورتیں	خوراک، کپڑے، مکان اور صحت کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے آمدنی کے مواقع پیدا کرنا۔ گاؤوں کو قریبی شہروں سے ملانے والی سڑکوں، نلوں کے ذریعے پانی کی بہم رسانی اور صحت کے ابتدائی مراکز جیسی بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کی فراہمی۔
نفسیاتی اور ثقافتی ضرورتیں	اعلیٰ تعلیم، صنعتی بندوبست، سیاحت، ذرائع تفریح اور تھیٹروں وغیرہ کے لیے سرمایہ فراہم کرنا اور سرمایہ کاری کے مواقع پیدا کرنا۔ لوٹ مار، آتش زنی، فساد، کمزور طبقات، مظالم اور دشمنوں کے حملے سے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے تحفظی انتظامات کرنا۔

سہولیات اور بہتر زندگی

تعلیم، آمد و رفت کے لیے گاڑیوں، طبی خدمات، آرام دہ مکان اور گھریلو آلات آسائش وغیرہ کے لیے فاضل اقتصادی وسائل پیدا کرنا۔
ذیلی ڈھانچے کی سہولیات مثلاً ایک شہر سے دوسرے شہر کو اور ایک ریاست کو دوسری ریاست سے ملانے والی سڑکوں، ذرائع نقل و حمل، ترسیل اور مواصلات وغیرہ مہیا کرنا۔

ابتدا میں حسب ذیل مقاصد کو دیہی ترقیات کے پروگراموں کا نصب العین مانا جانا چاہیے۔ زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں، تجارتی کاروبار اور خدمات فراہم کرنے والی اکائیوں کے ذریعے آمدنی کے موقعوں کو بڑھانے کی خاطر محنت کے پیداواری استعمال میں اضافہ کرنا۔

منڈی کی ترغیبات، ذیلی ڈھانچے اور ٹکنالوجی کو فروغ دیا جانا چاہیے تاکہ درج ذیل اقدامات کے ذریعے محنت کے پیداواری استعمال: موزوں پالیسیوں کی تشکیل، ذیلی ڈھانچے کے فروغ کے لیے کافی سرمایہ کاری اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ذریعے بڑھایا جاسکے۔

زندگی کو بہتر بنانے کے لیے درج ذیل سماجی خدمات فراہم کی جانی چاہئیں۔

(۱) کم لاگت مکانات کی تعمیر و فراہمی
(۲) ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغاں۔
(۳) صحت و خاندانی بہبود کی خدمات وغیرہ۔

مندرجہ بالا عناصر ایسے ہیں جن سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا کافی ثابت نہیں ہو سکتا۔ محنت کے پیداواری استعمال کے بارے میں اطلاعات کی اشاعت سے غریبوں کے لیے نئے فائدہ مند مواقع میسر آسکتے ہیں۔ منڈی کی ترغیبات، ذیلی ڈھانچے، ٹکنالوجی اور سماجی خدمات، خصوصاً صحت اور تعلیم پر سرمایہ کاری لوگوں کو نئے موقعوں سے مستفید ہونے کے قابل بناتی ہے۔

عوامی تنظیمیں

دیہات میں تعمیری کام کرنے کی خواہش کے زیر اثر یونیورسٹی طلباء سے لے کر سند یافتہ پیشہ ور اصحاب نے کو آپریٹو سوسائٹیاں یا امداد باہمی کی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں کے مقاصد حسب ذیل ہے۔

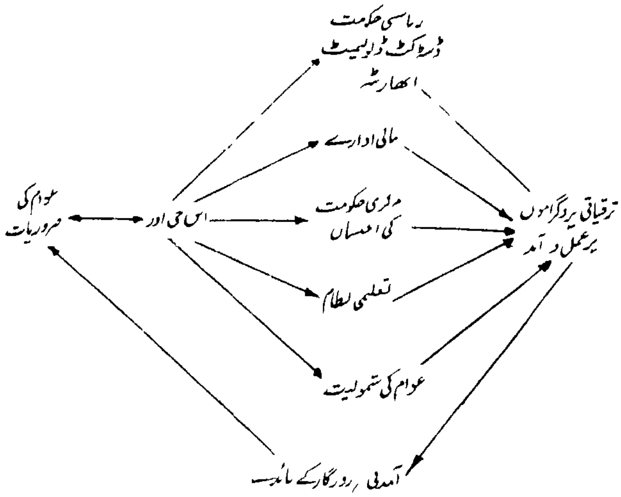
(الف) سماجی نابرابریوں کو کم کرنا (ب) دیہی علاقوں کے خوشحال طبقے کے ہاتھوں استحصال کو کم کرنا اور (ج) دیہات کے غریبوں کی حالت سدھارنا۔ تعلیم یافتہ اور امداد باہمی کے پیشہ ور ادارے اجتماعی مداخلت کے لیے پُرخلوص سماجی کارکن کی ٹیمیں بنا سکتے ہیں۔ ان رضاکار ایجنسیوں نے دیہات کے غریبوں کی تنظیموں کو اپنی مدد آپ کرنے کے عملی گروپ بنانے کی ترغیب دی تاکہ وہ دیہات کے سماجی ڈھانچے میں جب بھی ضروری ہو اجتماعی مداخلت کر سکیں۔

اپنی مدد آپ کرنے والے گروپوں کی تشکیل کے بعد رضاکار ایجنسیوں نے ایسے گروپوں کی شکل میں کام کرنا شروع کیا جو فیصلے کرنے، امداد باہمی کے مختلف طریقوں کو زیر عمل لانے اور قیادت کی صلاحیت کو ابھارنے میں اپنے تمام ارکان کو شریک کرتے تھے۔ اپنی امداد آپ کرنے والے گروپ اور رضاکار ایجنسیاں دیہات کے غریب لوگوں کے فائدے کے لیے جو خدمات انجام دیتی ہیں ان میں مقامی وسائل جیسے بے کار پڑی ہوئی زمین اور جنگلاتی پیداوار وغیرہ کا استعمال کرنا، پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے کنویں کھودنا، صحت کی دیکھ بھال کے کیمپ لگانا، مویشیوں کی نسل سدھارنا، اور مفت محنت یا رضاکارانہ خدمت سے کنویں، تالاب اور گاؤں میں سڑکیں وغیرہ شامل ہیں۔

حکمت عملی کا اولین مقصد سب سے نیچے کی سطح کے لوگوں کی تنظیموں کے ذریعے عوام کی شرکت حاصل کرنا ہونا چاہیے۔ سرکار کو چاہیے کہ وہ مذکورہ بالا لوگوں اور اپنی مدد آپ کرنے کی تحریکوں کی مدد اور حوصلہ افزائی کے لیے موزوں پالیسیاں وضع کرے۔ سرکار کے پاس دیہی ترقی کے لیے عوام کے مکمل اشتراک کو حاصل کرنے کے لیے وسائل بھی ہیں اور اختیار بھی۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور ان کے ٹکنالوجی تیار کرنے والے اداروں اور ترقیاتی تنظیموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ رضاکار ایجنسیوں اور اپنی مدد آپ کرنے والے گروپوں کے ساتھ کام کریں تاکہ یہ عوامی تنظیمیں دیرپا دیہی ترقی کے لیے زیادہ موثر رول ادا کر سکیں۔ کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے ترقیاتی مشنری اور ترقیاتی ایجنسیوں کو عوامی تنظیموں کے مخلص مددگاروں کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔

حکمت عملی کا دوسرا مقصد سائنس اور ٹکنالوجی کے اداروں، سرکاری محکموں، ضلع کے ترقیاتی افسروں اور غیر سرکاری تنظیموں کے درمیان قریبی تال میل قائم کرنا اور ضلع کے پالی ٹکنیک اداروں اور انجینئرنگ کالجوں سمیت تمام تعلیمی اداروں کے طلباء و اساتذہ کو ترقیاتی کاموں میں شریک کرنا ہونا چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے اداروں / سرکاری محکموں کو شریک کرنے سے ترقیاتی پروگراموں کو سائنس و ٹکنالوجی کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جس کی بدولت

مربوط دیہی ترقی   ایک تعاملی ماڈل



INTEGRATED RURAL DEVELOPMENT AN INTERACTIVE MODEL

ٹکنالوجی کے اداروں کے مائے وں اور یا سے س

روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنے کے لیے نئی سرگرمیاں اور نئے کام شروع کیے جا سکتے ہیں، مقامی وسائل کا بہتر استعمال کیا جا سکتا ہے، لوگوں میں نئی ہنرمندیاں پیدا کی جا سکتی ہیں، انھیں صفائی ستھرائی سے رہنے اور اپنی صحت کی زیادہ اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کی تربیت دی جا سکتی ہے اور ضلع کی ترقی کے لیے اپنے وسائل کو مجتمع کرنا سکھایا جا سکتا ہے کیونکہ مذکورہ اداروں میں سے بہت سے ادارے پہلے ہی سے یہ کام کر رہے ہیں یا ان کاموں کے لیے روپیہ فراہم کر رہے ہیں۔

حکمت عملی کا تیسرا مقصد ضلع کے ترقیاتی منصوبے کے اندر یک جہتی پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ تاکہ ذیلی ڈھانچے کی ترقی، زندگی کو بہتر بنانے اور روزگار کے مواقع بڑھانے پروگراموں پر بہت سے گاؤوں کے لیے ایک ساتھ کوشش کی جا سکے۔

حکمتِ عملی کا چوتھا مقصد سائنس و ٹکنالوجی اور مالی، سماجی، صنعتی اور مارکٹنگ تنظیموں کے ماہرین کی سرگرم شمولیت حاصل کرنا ہونا چاہیے تاکہ تکنیکی و اقتصادی نصب العینوں کی نشاندہی کی جا سکے اور اُن کے حصول کے لیے متبادل طریقے معلوم کیے جا سکیں۔

حکمتِ عملی کا پانچواں مقصد قومی، ریاستی، اور ضلعی سطح پر اسٹیرنگ / کوآرڈی نیشن گروپوں کے شکل میں ایسا تنظیمی ڈھانچہ فراہم کرنا ہونا چاہیے جو (۱) شریک تنظیموں کے وضع کردہ مربوط دیہی ترقی کے پروگراموں کی منظوری دے۔ (۲) منظور شدہ پروگراموں کے لیے وسائل کے مختص کیے جانے کو یقینی بنائے۔ (۳) ان پروگراموں کو سہولت کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری رہنمائی اور امداد فراہم کرے اور (۴) ان پروگراموں کی رفتار ترقی پر نظر رکھے۔

یوجنا، نئی دہلی

تنظیم

مکمل تال میل ا...

ارادوں کے اظہار سے ہیں اس کے لیے ایک سچی لگن ماحول بنانے کی ضرورت ہے۔ ادارے اور ایجنسیاں الگ الگ حالوں سے کام کرنے کی بجائے تمام دِقتوں اور مسئلوں کو حل کرنے کے لیے مل جل کر کام کر سکیں۔ یہ کام قومی اور ریاستی سطحوں پر اسٹیرنگ کمیٹیوں کی تشکیل اور ضلعوں کی اہم تنظیموں کی شناخت کرکے کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ تنظیمیں سائنس اور ٹکنالوجی کی تنظیموں اور ضلعی انتظامیہ کے درمیان ایک کڑی بن سکتی ہیں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی مفید باتوں کو ضلع کے ترقیاتی پروگراموں میں شامل کر سکتی ہیں۔ این جی او اور نجی صنعتی گھرانے اور پبلک سیکٹر کے ادارے وغیرہ ضلع کی اہم ایجنسیوں کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔

اسٹیرنگ کمیٹیوں میں صنعتی گھرانوں، بنکوں، مشہور رضاکار ایجنسیوں، مرکزی اور ریاستی سرکار کے متعلقہ محکموں، سائنس اور

سب سے نیچے کی سطح کے گروپ

- ملک کے متعدد گاؤوں کا سروے کرکے وہاں کے لوگوں کی ضرورتوں کا پتہ لگایا جائے اور ان ضرورتوں کو موٹے طور پر درج ذیل زمروں میں تقسیم کیا جائے۔
  - روزگار کی ضرورتیں۔
  - سماج سیوا یا معیارِ زندگی سے متعلق ضرورتیں۔
  - ذیلی ڈھانچے کی ضرورتیں۔
- عوام کی شمولیت کے ساتھ ذیلی ڈھانچے کی ترقی کی خاطر ضلع انتظامیہ سے تال میل
- زندگی کو بہتر بنانے والی کچھ اسکیموں پر، جن میں تعلیم بالغان، بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے اور خاندانی بہبود

وغیرہ کے پروگرام شامل ہیں، عمل درآمد کا ریاستی حکومت اور ضلع افسران کی مدد سے اہتمام کرنا۔

- ★ بحیثیت مجموعی کئی گاؤوں کے لوگوں کی ضرورتوں پر مبنی پروگراموں کو سائنس اور ٹکنالوجی کے اداروں ــ خصوصاً اُن اداروں کی مدد سے جن کا تعلق روزگار کے مواقع پیدا کرنے سے ہے، پروجیکٹوں کی شکل دینا
- ★ ایسے منظموں کا پتہ لگانا جو چھوٹے پیمانے کی صنعتیں، گھریلو دستکاریاں یا گھریلو پیداواری اکائیاں قائم کر سکیں۔
- ★ ان منتظموں کو تربیتی و پیداواری مراکز میں مختلف پیشوں اور ٹکنالوجیوں کی تربیت دلانا۔
- ★ ان منتظموں کو بینکوں سے قرضے لینے، مشینری، ساز و سامان اور خام مال حاصل کرنے اور تیار شدہ مال کی منڈیوں میں فروخت میں مدد دینا۔
- ★ باغبانی کے لیے پود گھروں جیسی بنیادی نرسریاں قائم کرنا یا حاصل کرنا اور کھمبیوں کی کاشت کے لیے لیبارٹری، مویشیوں کی نسل کشی اور مویشیوں سے متعلق خدمات وغیرہ کا انتظام کرنا۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے ادارے / سرکاری محکمے

سائنس اور ٹکنالوجی کے ادارے اور سرکاری محکمے درج ذیل خدمات انجام دے سکتے ہیں:۔

- عوامی تنظیموں کی شناخت کردہ ضرورتوں پر مبنی پروگراموں کو پروجیکٹوں کی شکل دینا۔
- عوامی تنظیموں کے عملے کو نئے پیشوں اور روزگار پیدا کرنے والی ٹکنالوجیوں کی تربیت دینا اور تکنیکی امداد فراہم کرنا۔
- بنیادی نرسری کی سہولیات قائم کرنے میں مرکزی عوامی تنظیموں کو تربیت دینا۔ اور ضروری امداد فراہم کرنا۔
- عوامی تنظیموں کے ذریعے پروگراموں پر عمل درآمد میں سرگرم حصہ لینا۔

ضلع انتظامیہ

ضلع انتظامیہ کو ان کاموں کی ذمہ داری لینی ہوگی:۔

- ★ ایک بلاک کے گاؤوں کے گروہ کی ضرورتوں کے مطابق دیہی ڈھانچے کی سہولیات فراہم کرنے کی اسکیموں پر عمل درآمد۔
- ★ گاؤوں کے گروہ کے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کی اسکیموں پر عمل درآمد۔
- ★ عوامی تنظیموں اور سائنس اور ٹکنالوجی کے اداروں کی شروع کی ہوئی روزگار پیدا کرنے کی سرگرمیوں کے لیے مالی، تکنیکی اور دیگر ضروری امداد فراہم کرنا۔

کوششوں کا ادغام و یک جہتی

ملک میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی متعدد ایجنسیاں، مالی ادارے اور غیر سرکاری تنظیمیں روزگار پیدا کرنے میں معاون مہارتیں یا ٹکنالوجیاں پیدا کرنے یا ان مہارتوں اور ٹکنالوجیوں بڑھانے یا وسعت دینے کے کام میں مصروف ہیں۔

ضلع کی دیہی ترقیاتی ایجنسی جس میں ریاستی حکومت کے مختلف متعلقہ محکمے شامل ہوتے ہیں اور جس کا سربراہ ضلع مجسٹریٹ ہوتا ہے، دیہی ترقی کی مرکزی ایجنسی ہے۔ لیکن دیہات کے غریبوں کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس سے اور کہاں سے مطلوبہ امداد حاصل کریں۔ انھیں اس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ مختلف ایجنسیاں کیا کام کرتی ہیں۔

★ رضاکار ایجنسیاں / این جی او مختلف سرگرمیوں کی شناخت کرتے ہیں جو زیر نشانہ گاؤوں میں مقامی آب و ہوا، دستیاب ہنرمندی اور اقتصادی حالات اور ریاستی حکومت کے متعلقہ محکموں کی اسکیموں وغیرہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے شروع کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد ان تنظیموں سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے جو شناخت کردہ سرگرمیوں میں مہارت رکھتی ہیں تاکہ وہ مستفید ہونے والے لوگوں کو براہ راست یا پھر رضاکار ایجنسیوں کے عملے کو تربیت دے سکیں جو بعد میں مستفید ہونے والے لوگوں کو تربیت دے۔ بعد ازاں مالی اداروں کو ان لوگوں کو ایسے قرضے دینے پر آمادہ کیا جاتا ہے جن کی مدد سے وہ شناخت سرگرمیاں شروع کر سکیں۔ دیہی ترقی کی ضلعی ایجنسی (ڈی آر ڈی اے) اور دیگر متعلقہ ایجنسیوں سے ان سرگرمیوں کے لیے سبسڈیاں دلائی جاتی ہیں۔ عام سماجی بہبود یا دیہی ڈھانچے سے متعلق پروجیکٹوں پر عمل درآمد کرانے والی ایجنسی ضلع انتظامیہ ہوتا ہے۔ عوام کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ محنت یا نقدی کی شکل میں اپنا تعاون پیش کریں۔ ایک طرف بہت سی ایجنسیوں اور دوسری طرف زیر نشانہ آبادی کے درمیان تال میل ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے رضاکار ایجنسیوں نے دیہی آبادی کی کچھ ضرورتوں کو موثر ڈھنگ سے پورا کرنا سیکھا ہے۔

دیہی علاقوں میں تیار یا پیدا ہونے والی چیزوں کی مارکیٹنگ دیہی صنعتوں کی ترقی کی کوششوں میں مصروف اداروں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ابھی حال ہی میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس مسئلے کے حل کے لیے مختلف طریقے آزمائے جا رہے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں تیار ہونے والی چیزوں کو میٹرو پالیٹن شہروں اور بڑے شہری مراکز میں فروخت کرنے کا انتظام

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

آتم بھائی ایچ پٹیل

دیہی ترقیات کی پالیسیاں

بھارت اپنے گاؤں میں آباد ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کیوں کہ ملک کی تقریباً ۷۵ فی صد آبادی آج بھی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور زبردست شہری اور صنعتی ترقی و فروغ کے باوجود ہماری معیشت زیادہ تر زراعت پر ہی منحصر ہے لہٰذا مسلسل اور پائیدار دیہی ترقی قومی ترقیاتی پالیسیوں کا اہم جزو رہی ہے۔

حصول آزادی ہی سے غریبی کا خاتمہ اور بہبود کے پروگرام دیہی ترقی کی کوششوں کے اہم آلہ کار رہے ہیں۔ چھوٹے پیمانے کی دیہی صنعت کی ترقی و فروغ اور پائیدار خود روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر مزید زور دینے کے ساتھ ساتھ ان کوششوں کو تیز تر کرنے کے لیے ۱۹۸۰ء میں پورے ملک میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) شروع کیا گیا تھا اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ دیہی علاقوں کے جن غریب کنبوں کی نشاندہی ہو چکی ہے، انھیں پیداواری ساز و سامان اور اثاثے فراہم کر کے غریبی کی سطح سے اوپر اٹھنے کے قابل بنایا جائے حکومت کی جانب سے سب سڈیز (رعایت) کی شکل میں مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ نیز اثاثے پیدا کرنے کے لیے مالی اداروں سے

معیادی قرضے فراہم کیے جاتے ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام پر ملک کے تمام بلاکوں میں مرکز کی جانب سے اسپانسر کی گئی اسکیم کے طور پر بلاک سطح کی [illegible] کے ذریعے عمل درآمد کی [illegible] مرکز اور ریاستیں [illegible] فراہم کرتی ہیں۔ مرکزی [illegible] نگرانی کرنے اور پروگرا[م] [illegible] لیے ذمہ دار ہے۔

غریبی کی سطح طے کرنے کے لیے موجودہ قیمتوں اور ترقی کے مطابق آمدنی کی سطح کی حد میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا گیا ہے۔ غریبی کی سطح کی توضیح کے لیے سالانہ آمدنی کی حد ۹۲-۱۹۹۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر بڑھا کر ۱۱۰۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کی قیمتوں کی بنیاد پر یہ حد ۶۴۰۰ روپے تھی۔ آئی آر۔ ڈی۔ پی کے تحت ۸۵-۱۹۸۴ء کی قیمتوں کی بنیاد پر انھیں کنبوں کو شامل کیا جاتا تھا جن کی سالانہ آمدنی ۴۸۰۰ روپے سے کم تھی۔ لیکن ۹۲-۱۹۹۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر اب اس پروگرام میں ان کنبوں کو شامل کیا جاتا ہے جن

کی سالانہ آمدنی ۸۵۰۰ روپے سے کم ہے ابتدائی منتخبہ گروپوں میں سے اعلیٰ ترجیح اب تمیں کنبوں کو دی جاتی ہے جن کی سالانہ آمدنی ۹۲-۱۹۹۱ء

[illegible] ۳ فی صد خواتین اور جسمانی طور پر معذور افراد کے تین فی صد کنبے شامل ہیں۔ آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں کو مالی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے لیے اعلیٰ ترین ترجیح دی جاتی ہے۔

۱۹۷۹ء میں آئی آر ڈی پی کی ایک ضمنی اسکیم خود روزگار کے معاملے میں دیہی نوجوانوں کی تربیت (ٹی آر وائی ایس ای ایم) شروع کی گئی تھی، جس کا مقصد دیہی علاقوں کے غریب کنبوں کے نوجوانوں میں تکنیکی اور کاروباری ہنر کو فروغ دینا ہے۔ ۱۸ سال سے ۳۵ سال تک کی عمر کے نوجوانوں کو دی جانے والی ضرورت پر مبنی تربیت خود روزگار شروع کرنے اور کسی حد تک اُجرتی روزگار حاصل کرنے میں ان کی مدد کرتی ہے۔ یہ تربیتی کورس صنعتی تربیتی اداروں

وزیر مملکت برائے دیہی ترقیات

(آئی ٹی آئی) پولی ٹیکنکس، کرشی وگیان کیندروں، نہرو یووک کیندروں نیز رضا کار اداروں اور ماہر دست کاروں کے زیر اہتمام اداروں میں چلائے جاتے ہیں۔

تربیت کی مدت کے دوران، تربیت حاصل کرنے والے افراد کو وظیفہ دیا جاتا ہے۔ یہ مہ روں اور ارمعت فراہم کئے جاتے ہیں ٹرائی سیم کے تحت تربیت حاصل کرنے والا فرد آئی آر ڈی پی سے منتخب کیا جانے والا فرد ہوتا ہے اور تربیت مکمل کرنے پر وہ آئی آر ڈی پی امداد حاصل کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اس اسکیم سے استفادہ کرنے والے نوجوانوں کی تعداد جو ۹-۱۹۸۹ء میں ۲،۱۲ لاکھ تھی، ۹۲-۱۹۹۱ء میں بڑھ کر دوگنی یعنی ۴۴ء۴ لاکھ ہوگئی ہے۔

آئی آر ڈی پی کی ایک اور ضمنی اسکیم، دیہی علاقوں میں خواتین اور بچوں کی ترقی و بہبود (ڈی ڈبلیو سی آر اے) ہے، جو ستمبر ۱۹۸۲ء میں دیہی علاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والی خواتین کے لیے خود روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی غرض سے شروع کی گئی تھی۔ ایسی ضمنی اسکیم کی ضرورت ان سماجی دشواریوں کے پیش نظر محسوس کی گئی تھی، جو خواتین کو آئی آر ڈی پی کے تحت حاصل ہونے والے مواقع سے استفادہ کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اب منتخبہ کنبوں کی خواتین ڈی ڈبلیو سی آر اے کے گروپوں کی، جو ۱۰ سے ۱۵ خواتین پر مشتمل ہوتے ہیں، رکن بن سکتی ہیں نیز آئی آر ڈی پی کے تحت ملنے والے قرضوں اور رعایتوں سے استفادہ کر سکتی ہیں۔

ڈی ڈبلیو سی آر اے کے گروپ کے ذریعے اراکین کو کوئی نیا کاروبار شروع کرنے سے قبل، اس کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہنر سکھایا جاتا ہے۔ ڈی ڈبلیو سی آر اے کے ہر ایک گروپ کو بنیادی ڈھانچے، خام مال کی خریداری، خرید و فروخت، بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے ایک ریوولونگ فنڈ کے طور پر پندرہ ہزار روپے کی ایک وقتی گرانٹ دی جاتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں ۵۰ منتخبہ اضلاع میں تجرباتی بنیاد پر شروع کی گئی ڈی ڈبلیو سی آر اے کی اسکیم ۱۹۹۱ء تک ملک کے ۲۴۴ اضلاع میں شروع کردی گئی تھی۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران اس اسکیم کو تمام اضلاع میں لاگو کر دیا جائے گا۔

گاؤں، ضلع اور ریاست کی سطح پر عملے کا سہ سطحی طریقہ پروگرام کے مناسب عمل درآمد اور موثر نگرانی کو یقینی بناتا ہے۔ گرام سیویکا گاؤں کی سطح پر ایک اہم کارکن کی حیثیت سے کام انجام دیتی ہے۔ ریاستی حکومتوں نے ڈی ڈبلیو سی آر اے پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لیے علیحدہ سیل قائم کئے ہیں۔

دیہی علاقوں میں پیداواری اثاثے پیدا کرنے کے علاوہ، ان علاقوں میں پینے کا صاف پانی فراہم کرنے کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں شروع کئے گئے پینے کے پانی سے متعلق قومی مشن (این ڈی ڈبلیو ایم) نے اس سمت میں کی جانے والی مختلف کوششوں کو سائنسی اور منظم جہت عطا کی ہے جس کی بہت ضرورت تھی۔

سائنسی اور تکنیکی ترقیات نے ٹھوس اور مفید روایتی طریقوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال میں مدد کی ہے۔ اس قسم کا نظریہ پانی کی صفائی اور وسیع پیمانے پر اس کی سپلائی کے سلسلے میں واقعتاً دستیاب بڑے اور چھوٹے ساز و سامان کے وسائل کے بہتر ممکنہ استعمال کے لیے نہایت موزوں ہیں۔

پینے کے پانی کے قومی مشن کا مقصد جو ٹکنالوجی مشن کی پالیسی کے ضابطے کے تحت کام کر رہا ہے، تین بڑی اسکیموں یعنی کم از کم ضروریات کا پروگرام (ایم این پی)، دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی کے تیز رفتار پروگرام پر چھوٹے مشنوں اور ضمنی مشنوں کے ذریعے باقاعدگی کے ساتھ علاقوں کو پانی سپلائی کرنا ہے۔ مشن کی سرگرمیوں میں گنی کیڑوں کے خاتمے فلیوروسس کی روک تھام، لوہے کے زائد ذرات کو نکالنے، کھارے پن کی روک تھام، سائنسی مسائل کی سائنسی تلاش، پانی کی بچت پر پانی کے معیار کی نگرانی اور ایکیوفر کو دوبارہ چارج کرنے پر توجہ دینا شامل ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران این ڈی ڈبلیو ایم کے لیے ۱۹۰ کروڑ روپے کی اضافی رقم منظور کی گئی تھی تاکہ ۹۳-۱۹۹۲ء تک ان تمام گاؤں میں پینے کا پانی فراہم کردیا جائے جہاں پانی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ان تمام گاؤں میں، جہاں پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا تمام مقررہ معیارات کے مطابق پینے کے صاف پانی کے ذرائع فراہم کردیئے گئے تھے پانی کے شعبے سے جزوی طور پر دو چار باقی گاؤوں میں آٹھویں منصوبے کے آخر تک پینے کا صاف پانی فراہم کردیا جائے گا۔ زیر زمین پانی کی کمی کی وجہ سے ایسے گاؤوں کی نشاندہی کرنے کے لیے جہاں اب پانی کی قلت پیدا ہو رہی ہے۔ بروقت سروے کئے جارہے ہیں۔ پانی کے ایسے تمام ذرائع کو جو خالی ہوگئے ہیں دوبارہ بھرنے کے لیے اقدامات کئے جارہے ہیں۔

مسلسل اور پائیدار دیہی ترقی کے لیے پروگرام کے سلسلے میں تال میل قائم کرنے اور بنیادی رہنما خطوط وضع کرنے، نگرانی کرنے اور جائزہ لینے کی غرض سے قومی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ اختیارات کو لامرکزی بنانے اور گاؤں کی سطح تک اختیارات منتقل کرنے کے لیے اقدامات کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں منظور شدہ پنچایتی راج بل نچلی سطح کے اداروں کو نئے اقدامات کرنے اور عوام کا سرگرم تعاون حاصل کرنے کے لیے اختیارات دے گا۔ ●

پائدار ترقّی کے لیے مکانوں کی فراہمی

ماحولیاتی اور انسانی نقصانات کو نظرانداز کرتے ہوئے بیش تر مالی نفع اور نقصان پر آنکی جانے والی ترقی کی کئی دہائیوں کی کوشش میں مضر خطرات نے بالآخر ہمیں ایسی رد میں لے لیا۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ ماحولیاتی اور اقتصادی چیلنج کتنے بڑے اور ہنگامی نوعیت کے ہیں اور یہ کہ ترقی کا پائیدار کلچر سامنے لانے کی کوشش کرنا انسانیت کے لیے کتنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ پائیدار ترقی کی اس جستجو میں مکان کو کلیدی رول ادا کرنا ہے

مناسب رہائش سے صحت مند شہری پروان چڑھتے ہیں جو ہمارے کرۂ ارض کے نظام حیات میں معاون ہیں۔ علاوہ ازیں مکان اور متعلقہ سامان میں سرمایہ کاری سے عمارتی سامان اور تعمیراتی سیکٹر پر اس کے مثبت اثرات کے ذریعہ اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے کیونکہ تعمیراتی سیکٹر مزدوروں کو بڑے پیمانے پر روزگار فراہم کرتا ہے جن میں ہنر مند و غیر ہنر مند دونوں طرح کے مزدور شامل ہیں۔ یہ واقعی مناسب بات ہے کہ اس سال عالمی یوم رہائش کے موقع پر "پائیدار ترقی کے لیے مکان" کے نظریے کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔

انسانی سرگرمیوں کی تنظیم: دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ جو انتہائی غریب افراد پر مشتمل ہے، اُس کے اندر خوفناک ماحولیاتی تباہی کے نتیجے میں بہت ساری علامات پیدا ہو چکی ہیں۔ انھیں پہلے ہی سے ماحولیاتی بحران کا سامنا ہے جس میں خوراک، پانی ... تھیا... فقدان اور ... روزی روٹی ... ہیں۔ ہندوستان جیسے ترقی ... اور دیہی غریبوں کی کھا... ہوئے اقتصادی مواقع اور ... ہوئے ماحول کی وجہ سے سخت مشکل کام بن گیا ہے۔ پس ہر کسی کو اتقار کی سہولت اور مکان فراہم کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ پائیدار ترقی کی سمت میں قدم اٹھایا جائے۔

لہٰذا ترقیاتی مقاصد کی طرف توجہ مبذول کرتے وقت انسانی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ قدرتی ماحول پر ان کے ضرر رساں اثرات کو محدود کیا جا سکے۔ ترقی کا تعلق موجودہ نسل کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے ہے جبکہ بقا کا تعلق اس انسانی سرگرمی سے ہے جو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے نسل آئندہ کی صلاحیتوں کا سودا نہیں کرتی۔ اب جب کہ ہماری آبادی پانچ ارب تک پہنچ چکی ہے مکان اور طرز رہائش کے ہمارے طریقے جو کہ صرف کرۂ ارض پر سانس لینے والوں کی بقا کو متاثر کریں گے بلکہ ماحولیاتی توازن بھی اس سے متاثر ہوگا جو دنیا میں زندگی کی تمام شکلوں کو جاوداں رکھے ہوئے ہے۔

پائیدار ترقی حاصل کرنے میں انسانی آبادی کے کردار کو شہروں کی توسیع کے رجحانات ...

... ہوسلیس کی۔ جہاں تک ... کا تعلق ہے ترقی پذیر ملکوں میں پچاس فی صد شہری آبادی کو اپنی رہائش کا انتظام آپ کرنا ہوگا۔

پائیدار ترقی بڑے پیمانے پر بڑے کام کرنے کے لیے ایک بھاری بھرکم لفظ ہی نہیں ہے۔ جب کوئی ان سہولت بخش پلاسٹک کے تھیلوں کے استعمال میں، جن کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ کمی لاتا ہے کیونکہ ان سے نالیاں جام ہوتی ہیں، تو یہ شخص مقامی سطح پر پائیدار ترقی میں اپنا حصہ دے رہا ہے۔ جب کوئی شخص گھریلو استعمال کا پانی محتاط طریقے سے کم مقدار میں خرچ کرتا ہے تو وہ علاقائی سطح پر پائیدار ترقی کے حق میں خدمت انجام دے رہا ہے اور جب کوئی پیدل طے کرنے کے لائق فاصلے گاڑی کے استعمال سے گریز کرے تو وہ بھی اس

سمت ایک چھوٹی سی کوشش ہے یہ مثبت سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے کام عالمی تناظر میں پائدار ترقی کے حق میں جاتے ہیں۔

ماحولیات کے موافق مکان

ماحولیات کے لیے سازگار مکان اس طرح بنائے جائیں کہ پیداواری ریں کم سے کم استعمال ہو اور اس میں سورج کی روشنی اور ہوا کے گذر کا زیادہ سے زیادہ انتظام ہو، تاکہ توانائی کے استعمال کی ضرورت کم پڑے۔ مزید یہ کہ ایسے سامان سے یہ مکان بنائے جائیں جس میں زہریلے اثرات نہ ہوں یہ گھریلو استعمال کا سامان اس طرح کا ہو کہ ان میں توانائی کا استعمال کم سے کم ہو گھر کے لوگ پانی کا استعمال محتاط طور پر کریں۔ انفرادی طور پر یہ کام کئے گئے تو عالمی ماحولیات پر مجموعی طور پر اس کا زبردست اثر پڑے گا۔

اسی طرح ہماری بستیوں کو ماحولیاتی میداری کی نئی سمتیں متعین کرنا ہوں گی ماحولیاتی شعور کے ساتھ اگر استعمال شدہ ناکارہ اشیاء کو نئے طریقوں سے استعمال کرنے کی ایک مرتبہ عادت پڑ گئی تو ماحولیات کے تئیں ایک سماجی دتقاضی رویہ سامنے لایا جا سکتا ہے۔

پائدار ترقی کے لیے انسانی بستیوں کا فروغ نہ صرف عمدہ رہائشی حق سے محروم دنیا بھر کے لاکھوں انسانوں کے گذر بسر کے ماحول کو بہتر بنانے کے مقصد کو پورا کرتی ہیں، بلکہ ماحول اور اس سے وابستہ قدرتی ماحولیاتی نظاموں کی بھی حفاظت کرتی ہیں۔

.. ۲۰۰۰ء تک مکانات کے لیے عالمی حکمت عملی، جس کا اعلان اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۱۹۸۸ء میں کیا گیا تھا، لوگوں کے رہائشی مسئلے پر رجوع کرنے کی عالمی برادری کی جانب سے کی جانے والی کوششوں میں سے ایک ہے۔ امداد پر مبنی یہ حکمت عملی دستیاب انسانی، تکنیکی اور مالی وسائل سے فائدہ اٹھانے کے وسیع تر اور مربوط رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔

کرۂ ارض چوٹی کانفرنس کے جامع ایجنڈا ۲۱ ایکشن پلان میں آبادیوں سے متعلق قرارداد کی عالمی سطح پر دوسری خاص اہمیت رکھنے والی کوشش ہے جس میں انسانی آبادیوں کے مسائل کو پائدار قومی ترقی کے مجموعی نظام سے جوڑ دیا گیا ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان اقدامات کے ذریعے ہر آدمی کو عمدہ گھر اور کام کا ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری پر گرفت مضبوط کرنے کی بنیاد ڈال دی گئی ہے اور باقاعدہ عہد کرلئے گئے ہیں۔ پالیسیوں کا اعلان کیا جا چکا ہے، بنیاد تیار کرلی گئی ہے، وعدے کرلئے گئے ہیں اور منصوبے تیار ہو چکے ہیں۔ پائدار مستقبل کی اُمید کی کرن پھوٹ چکی ہے۔ ایک ایسا مستقبل جس میں ہر شخص کے لیے ایک عمدہ جائے پیدائش پرورش کی ایک عمدہ جگہ اور اچھی صحت اور انسانی وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ایک عمدہ جگہ یقینی ہے۔ ●

بقیہ، امن اور ہم آہنگی کی اہمیت

خود عوام پر عائد ہوتی ہے۔

بنی نوع انسان کو گھیرنے والے سنگین خطرات چونکہ خود انسانوں کے ہی پیدا کردہ ہیں اس لیے ہمیں ان طاقتوں کے خلاف اجتماعی طور پر لڑنا ہے، خواہ یہ خطرات انفرادی نوعیت کے ہوں یا مذہب کو سیاست سے ملانے والے اور اپنی پارٹی اور ذاتی مفادات کے لیے علاقائی عصبیت اور ذات پات کے بھید بھاؤ کو ہوا دینے والے گروں کی شکل میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمیں ہندوستان کو کٹرپن، تشدد اور دہشت گردی سے پاک جگہ بنانا چاہیے۔

●

بقیہ، سماجی انصاف کے علمبردار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

عیش و آرام کی جگہوں، تعلیمی اداروں، مسافر خانوں، کنوؤں، تالابوں اور عام استعمال کے لیے لگے نلوں وغیرہ کا استعمال کرنے کی ممانعت تھی۔ چونکہ ڈاکٹر امبیڈکر بھی اسی اچھوت طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انہیں بھی ان تمام مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ اس مصیبت کا بالکل قریب سے احساس کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آئین کی دفعات ۱۵، ۱۹، ۲۳/۲۴ اور ۴۵ میں کمزور و پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود کے لیے قانون بنا دیا۔ دفعہ ۳۴۵ میں تو انھوں نے درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لوگوں کے لیے سرکاری نوکریوں اور عہدوں کے لیے رزرویشن کا انتظام کرکے صدیوں سے کمزور و دبے کچلے لوگوں کے لیے مسیحا کا کام کیا۔ اس کے علاوہ سماج میں رائج بہت سی برائیوں کا بھی انھوں نے صفایا کر دیا۔

حکومتِ ہند نے ڈاکٹر امبیڈکر کے ان عظیم کارناموں پر ان کی یوم پیدائش کی صد سالہ برسی ۱۹۹۰ء کو سماجی انصاف کے طور پر منایا اور بعد مرگ انھیں بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس طرح جب تک ہندوستان میں جمہوریت باقی ہے اور جب تک ملک میں آئین پر عمل ہوتا رہے گا ہم ڈاکٹر امبیڈکر کو بھلا نہیں سکتے۔ اور ان کا نام معمارِ آئینِ ہند کی حیثیت سے ہمیشہ روشن رہے گا۔ ملک ان کے اس عظیم ترین کارنامے پر فخر کرتا رہے گا۔ اور ہمیشہ ان کا مقروض رہے گا۔

●

ڈاکٹر منجو شرما

پیداواریت کی راہ کی رُکاوٹیں دُور کرتی بایوٹکنالوجی

صنعتی مصنوعات اور زرعی پیداوار میں زیادہ پیداواریت کے ساتھ مقدار کے لحاظ سے ہونے والے زبردست اضافے نے ان اشیاء کو عالمی تجارت کے ضمن میں مقابلے والی اشیاء کی قطار میں لا کھڑا کیا ہے۔ طبّی شعبے میں بھی بھارت ایسے طریقے وضع کرنے میں کامیاب ہوا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کر سکے۔ ادویہ کی صنعت کو ملنے والے فروغ سے ضروری تحقیق اور ادویہ کی سپلائی میں توسیع ہوئی ہے اور اس شعبے کی رکاوٹوں کا خاتمہ ہوا ہے۔

مختلف میدانوں میں ان کامرانیوں کے پس پُشت بایوٹکنالوجی کا قابل قدر تعاون کارفرما ہے۔ بایو نظام کی سیلولر اور مولے کیولر سطحوں پر سائنسی ادراک، ان پر مبنی عملی اور ترقیاتی ٹکنالوجیوں نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

بھارت میں ٹکنالوجی سے متعلق سرگرمیوں میں اس وقت اضافہ ہوا جب ۱۹۸۶ء میں بایو ٹکنالوجی کا ایک الگ محکمہ قائم ہوا۔ آج تحقیق کے اعلیٰ شعبوں میں متعدد تربیت یافتہ بایوٹکنالوجی ماہرین اور دیگر ماہرین مصروفِ عمل ہیں تاکہ بایو ٹکنالوجی کے کامیاب استعمال کو یقینی بنایا جاسکے۔

بنیادی ادراک اور مصنوعات تیار کرنے، مظاہرہ جاتی پروگراموں، افرادی قوت کی تربیت اور صنعت کو ٹکنالوجی بہم پہنچانے کے ضمن میں تحقیق و ترقی کے پروجیکٹوں کی نشاندہی بایوٹکنالوجی کے محکمے نے ترجیحی شعبوں کے طور

اس امر کو تسلیم کرتے ہ

ہمارے پر پام کے تیل کی پیداوا

کے ضمن میں خود کفالت حاصل

میں آندھرا پردیش، کرناٹک اور

پام کے تیل سے متعلق مظاہرہ جاتی پروجیکٹ شروع کئے گئے جن سے ڈیڑھ ہزار سے زائد اشخاص نے استفادہ کیا۔ الائچی کے پودے کے ضمن میں زیادہ سے زیادہ پیداوار کے لیے کیرالا، کرناٹک، اور تامل ناڈو میں ٹیشو کلچر اور اس پودے کی دیکھ بھال کے مظاہرے کیے گئے ہیں۔ تحقیق و ترقیاتی شعبوں اور خصوصی طور پر ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے شہتوت اور M A G A کی نشاندہی کرلی گئی ہے اور اس ضمن میں پروگرام شروع کردئے گئے ہیں۔ چوں کہ ریشم کے کیڑے پالنے کا کام دیہی علاقوں اور ان کے گردونواح میں کیا جاتا ہے، کسی بھی پیداواری اضافے سے اس کام میں

مصروف ۶۰ لاکھ کارکنوں کو فائدہ حاصل ہوگا جن میں ۴۰ فی صد کارکنوں کا تعلق درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے ہے۔

پیدا کر رہے ہیں منصلوں میں بیماریوں سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کرنے والے جینز کی خصوصیات طے کرنے اور انھیں پہچان کر الگ کرنے کے ضمن میں ملک بھر میں پلانٹ مولے کیولر بایوٹکنالوجی کے چھ مراکز مصروفِ عمل ہیں۔

بھرپور پیداوار کے لیے سمندری بایو فرٹیلائزر کا استعمال بہت کامیاب رہا ہے۔ دھان کے کھیت میں نیلے سبز بحری پودے کی کھاد کے استعمال سے پیداوار میں ۹ فی صد کا اضافہ رونما ہوا۔ بایو فرٹیلائزر پروجیکٹ کے تحت تقریباً ۴۲۵ تالابوں کو نیلے سبز سمندری پودوں کی پیداوار کے لیے استعمال میں لایا جارہا ہے۔ تامل ناڈو اور مہاراشٹر میں اس پودے کے ۱۲ بایو فرٹیلائزر پارک بھی مصروفِ عمل ہیں۔

بایوٹکنالوجی کی تسخیر

ممالک میں جنگل لگانے کے کام میں بھی تیزی لانے کا عمل شروع کیا گیا ہے۔ اب تک کرناٹک، آندھرا پردیش، تامل ناڈو، مہاراشٹر، ہریانہ اور مدھیہ پردیش میں ریاستی محکمۂ جنگلات کو ٹیشو کلچر کے ذریعہ اگائے گئے ۲۰ ہزار سے زائد پودے سپلائی کئے گئے ہیں۔

جینین تبادلہ ٹکنالوجی (ای ٹی ٹی) پروجیکٹ مکمل ہو گیا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک بڑی بنیادی ڈھانچہ سہولت وجود میں آئی ہے جسے قومی نیٹ ورک کے طور پر قائم کیا گیا ہے اور اس میں اس ٹکنالوجی پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک ہنرمندی سے متعلق پول بھی موجود ہے۔ ای ٹی ٹی کے ذریعہ ۲۰۰۰ بچھڑے (گایوں اور بھینسوں کے بچے) پیدا ہوئے جن میں سے ۵ فی صد بچھڑے کاشت کاروں کی سطح پر ہی پیدا ہوئے ہیں۔

ٹیکوں کے ضمن میں چلائے جانے والے تحقیقی پروگرام میں ایک نئی پیش رفت ہوئی ہے اور سائنس کی متعدی بیماری اور جگر کی سوجن۔ بی کے علاج سے متعلق ٹیکے تیار کرنے کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔ جگر کی سوجن۔ بی، کوڑھ اور دیگر امراض کی پہچان کے لیے صنعت کو ٹکنالوجیاں فراہم کی گئی ہیں۔ سائنس کے لئے ٹیشو کلچر دوہرے طور پر ردعمل کا حامل ایعو ٹر نیبن۔ بی، بایو سائیڈ، ایس عناصر اور جانوروں کی پیدائش کی روک تھام کے لیے انکشن ہی وضع کئے گئے ہیں اور انھیں صنعتوں کو پہنچایا گیا ہے۔

محکمے کے ذریعہ تشکیل کردہ ۱۲ ٹاسک فورسیز کے ذریعہ تحقیق و ترقی کی سرگرمیاں چلائی جاتی ہیں۔ کچھ غیر معمولی کامیابی والے نتائج میں حیاتیاتی طور پر روک تھام کے طریقوں کا حصول، چھوت کی بیماریوں کی شناخت اور روک تھام کے موروثی نقائص کی تلاش کے طریقوں کا حصول، آنتوں کی بیماریوں کے عوامل کی تلاش کے لیے ای ایل آئی ایس اے اور ڈی این اے طریقۂ جانچ جیسے امور شامل ہیں۔ تولد و تناسل کے ضمن میں ٹیکنکیات وضع کرنے کے لیے تحقیقی پروجیکٹوں کی شکل میں کچھ نئے اقدامات کئے گئے ہیں جن میں ادویہ جاتی پودوں اعصابی سائنس، ہیضہ، ملیریا، ٹی بی، ڈینگو بخار وغیرہ نیز پیٹرولیم بایو ٹکنالوجی، کثافت کی روک تھام کے لیے بایو سینسرز، کے شعبوں اور نئے حیاتیاتی ٹولز کے ذریعہ بایو گوناگونی کا تحفظ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نشاندہی کئے گئے شعبوں میں متعدد کثیر الادارہ جاتی اور بین سمت جاتی پروجیکٹوں کو بھی مدد دی گئی ہے۔ جدید بایولوجی کے لیے ایک مضبوط تحقیقی بنیاد بھی بنائی گئی ہے جس سے علم، ہنرمندی، مصنوعات، پروسیس اور ملک میں نئی ٹکنالوجیوں اور ان کے استعمال کے لیے راستہ ہموار ہوگا۔

مولے کیولر بایولوجی اور صنعتی ضروریات کے اعلیٰ شعبوں میں تحقیق و ترقی کی ضروریات کی تکمیل کے لیے محکمے نے افرادی قوت کو فروغ دینے کے کام پر توجہ مرکوز کی ہے۔ فی الوقت پوسٹ گریجویٹ اور پوسٹ ڈاکٹورل تدریسی پروگراموں کے لیے ہر برس ۲۵۰ طلبا کو داخل دیا جاتا ہے۔ مختصر مدت کے تربیتی کورس، صنعتی ملازمین کے لیے تربیت اور تکنیکی ماہرین کی تربیت کے پروگرام بھی چلائے جاتے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ، فیڈرل ری پبلک آف جرمنی، امریکہ، برطانیہ اور روس کے ساتھ نشاندہی کئے گئے میدانوں میں بین الاقوامی اشتراک کو بھی فروغ دیا گیا ہے۔ جی۔۱۵ ممالک میں ادویہ جاتی، خوشبودار مسالا جاتی پودوں کے لیے جین بینک قائم کرنے کے پروجیکٹ میں بھی قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ بھارت کو کُلّی طور پر تال میل کا ذمہ دار مانا گیا ہے اور اسے ایشیائی ممالک کے لیے خطہ جاتی تال میل پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے۔ ●

بقیہ: مربوط دیہی ترقی: ترقیاتی ایجنسیوں کا تفاعلی کردار

کیا جائے۔

سائنس اور ٹکنالوجی دیہی ترقی کی رفتار تیز کر سکتی ہے۔ ملک میں ایسی متعدد تنظیموں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جنھیں یہ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔

(۱) ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کے ذریعہ مناسب ٹکنالوجی پیدا کرنا (۲) ان ٹکنالوجیوں کو زیریں سطح آبادی تک پہنچانا اور مقبول بنانا۔ (۳) زیریں سطح آبادی کو مالی وسائل مہیا کرنا تاکہ وہ دیسی ٹکنالوجی کی مدد سے بڑے، درمیانی، چھوٹے اور گھریلو سیکٹروں میں صنعتی اکائیاں قائم کر سکیں۔ (۴) صنعتی اکائیوں کی پیداوار کی فروخت کا انتظام کرنا اور (۵) خام مال، پلانٹ اور مشینری وغیرہ کے حصول کے لیے ضروری خدمات فراہم کرنا۔

اس کے علاوہ وزارت دیہی ترقیات کی بھی متعدد اسکیمیں ہیں جن کا مقصد روزگار پیدا کرنا، لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا اور ترقی کے لیے مطلوب ذیلی ڈھانچہ فراہم کرنا ہے۔

بہت سی اسکیموں اور انھیں عملی جامہ پہنانے والی بہت سی تنظیموں کی موجودگی سے عام آدمی کا، جسے ان اسکیموں سے فائدہ پہنچانا مقصود ہے، دماغ بھول بھلیاں میں پڑ جاتا ہے۔ دیہات کے غریبوں کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کیسے کہاں اور کس کے پاس جائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرکاری پروگراموں کے فائدے ابھی تک اُن تک نہیں پہنچے ہیں۔

●

پروفیسر پی۔ جے۔ کورین

برآمدات : مسلسل اضافے کی راہ پر

ادائیگیوں کے توازن کی خطرناک صورتِ حال، بڑھتا ہوا قرضہ اور افراطِ زر کے بڑھتے ہوئے رجحانات گذشتہ دو برسوں کے دوران بھارتی معیشت کو درپیش اہم چیلنج رہے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں تبدیلی لانے کی غرض سے برآمدات میں تیزی سے اضافہ، اندرونِ ملک اور برآمداتی پیداوار سے متعلق پالیسیوں کو آسان بنانے نیز غیر ملکی براہِ راست سرمایہ کاریوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ایک حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔

چنانچہ موجودہ حکومت نے اقتصادی انتظام کے ایک عظیم چیلنج کا سامنا کیا۔ نئے اقتصادی اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑا۔ جس میں جولائی اور اگست، ۱۹۹۱ء کے دوران اعلان کردہ صنعتی اور تجارتی پالیسیوں میں دوررس اصلاحات کے علاوہ، یکے بعد دیگرے دو مرتبہ شرحِ تبادلہ میں تبدیلی بھی شامل ہے۔ پالیسیوں کو آسان اور نرم بنانے کے پروگرام میں آگے کی سمت ایک اہم قدم کے طور پر مارچ، ۱۹۹۲ء میں ایک نئی درآمداتی برآمداتی (ایگزم) پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا۔

نئی درآمداتی برآمداتی پالیسی کے پیچھے کارفرما مقصد درآمدات اور برآمدات کی صرف ایک چھوٹی سی منفی فہرست کو چھوڑکر تجارت کو آزاد کرنا تھا۔ استحکام نئی پالیسی کا ایک اور اہم جزو رہا ہے کیوں کہ اس کو پانچ سال کی مدت کے لئے صحیح لاگو کیا گیا ہے۔

برآمدات کے فروغ کے ساز و سامان سے متعلق اسکیم تحت آسان بنا دیا گیا ہے۔ اس کسٹمز محصول کی رعایتی شرح پر ذریعہ درآمد کیا جا سکتا ہے جس کے لیے برآمد ذمہ داری کی شرط ہے، جو ایک مقررہ مدت میں پوری کرنی ہوگی۔ مالیت پر مبنی ایک لائسنسنگ لائسنس بھی شروع کیا گیا ہے۔

برآمداتی پروسیسنگ علاقوں اور برآمداتی یونٹوں سے متعلق اسکیم کو زراعت، باغبانی، مرغی پالن اور مویشی پالن کے شعبوں کے لیے لاگو کر دیا گیا ہے۔ "ڈیمڈ برآمدات" کی توضیح کو بھی نئی ایگزم پالیسی میں آسان بنا دیا گیا ہے۔ برآمد کنندگان سے موصولہ ردِعمل پر غور و خوض کرنے کے بعد پالیسی کے متن کو بہتر بنانے کی شکل میں، پالیسی میں نئی تبدیلیوں کا اعلان جولائی ۱۹۹۲ء میں کیا گیا تھا۔

اُن مخصوص اشیاء کی درآمدات کے لیے، جن کا ذکر ایگزم پالیسی میں درآمدات منفی فہرست میں کیا گیا ہے، خصوصی درآمداتی لائسنسوں کی اسکیم کی تفصیلات کا اعلان بھی گذشتہ سال

[illegible]

فی صد، تجارتی ایوانوں کے لئے دو فی صد، برآمداتی ایوانوں کے لیے ۵ فی صد اور مقررہ معیاری تصدیق کے حامل تیار کنندگان کے لیے ۵ فی صد ہوگی۔ اس اسکیم کا مقصد برآمد کنندگان اور خاص طور سے اُن برآمد کنندگان کو ترغیبات فراہم کرنا ہے، جو تبادلہ کی نرم شرحوں کے انتظام سے فائدہ حاصل نہیں کرتے ہیں۔

از سرِ نو تشکیل اور تبدیلی کے لیے حکمتِ عملی تین اہم جزو پر مشتمل ہے، یعنی تجارتی اور صنعتی پالیسی کے شعبے میں شرحِ تبادلہ کی تبدیلی مالی اصلاح نیز ڈھانچہ جاتی اصلاحات، تجارت اور صنعت کے شعبے میں ڈھانچہ جاتی اصلاحات بھارتی معیشت کو عالمی معیشت کے ساتھ مربوط کرنے کی غرض سے شروع کی گئی ہیں، آسان

تجارت کے وزیر مملکت

بنانے کی پالیسی کے سلسلے میں ۹۳-۱۹۹۲ء کے مرکزی بجٹ میں چالو کھاتے میں روپے کی جزوی تبدیلی کا سلسلہ شروع کرکے ایک قدم اٹھایا گیا تھا۔

جولائی ۱۹۹۱ء سے تجارتی اصلاحات کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اُس میں تجارت کو تمام پابندیوں سے آزاد کرنا، مقابلہ جاتی شرح تبادلہ برقرار رکھنا، محصول کی زیادہ سے زیادہ سطح میں کمی کرنا نیز خام مال اور بڑے ساز و سامان کی درآمدات پر سے لائسنس ختم کرنا شامل ہیں۔ ان اصلاحات سے برآمدات کے لیے زیادہ سازگار ماحول پیدا ہوا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ برسوں میں برآمداتی کارکردگی پر ان پالیسیوں کا بھرپور اثر ہوگا۔ حکومت نے انتہائی توجہ طلب شعبوں کے طور پر ۲۴ اشیاء کی نشاندہی کی ہے، جس کا مقصد ہر سال مالیت میں ۳۰ فی صد کا اضافہ کرنا ہے۔

۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے ۵،۸۵۰ کروڑ روپے کا برآمداتی نشانہ مقرر کیا گیا ہے، جو گذشتہ سال کے مقابلے میں ۵ء۴ فی صد کی شرح اضافہ پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ ایک بڑا برآمداتی نشانہ ہے، جو گذشتہ برسوں کی حوصلہ شکن برآمداتی کارکردگی کی روشنی میں ۹۳-۱۹۹۲ء میں برآمداتی اہداف کو یقینی بنانے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے مقرر کردہ نشانوں کو بھارتی معیشت کے درمیانہ مدتی تناظر کے سیاق و سباق میں بھی دیکھا جانا چاہیے۔ آٹھویں منصوبے میں ادائیگیوں کے توازن کی ایک مستحکم صورتِ حال برقرار رکھنے کے لیے مقدار کے لحاظ سے ۷ء۱۳ فی صد کی برآمداتی شرح اضافہ رکھی گئی ہے۔ مجوزہ برآمدات چالو کھاتے کے خسارے کو مجموعی اندرونِ ملک پیداوار کے ۱ء۶ فی صد سے زیادہ نہ بڑھنے دینے کے لیے ضروری ہے۔

بہتر برآمداتی کارکردگی کی توقع کی جا سکتی ہے کیوں کہ مقدار اور مالیت دونوں لحاظ سے عالمی تجارت میں سال کے دوران اضافہ ہونے کا اندازہ ہے۔ نئی ایگزم پالیسی اور لرمس (ایل ای آر ایم ایس) میں بھی صنعتی پیداوار اور برآمدات کے لیے ضروری درآمدات کرنے کی اجازت ہوگی۔ افراطِ زر کی شرح میں کمی اور صنعتی پیداوار کی بحالی سے بھی برآمداتی نشانے کی تکمیل کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

تجارتی پالیسی میں اصلاحات اور دیگر ترغیباتی اسکیموں سے ۹۲-۱۹۹۱ء کی برآمداتی کارکردگی میں کمی کی روک تھام کرنے میں مدد ملی ہے اور ۹۳-۱۹۹۲ء کے پہلے چھ مہینوں میں اضافہ کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ عالمی کساد بازاری کے باوجود، بھارتی برآمدات کی کارکردگی اپریل سے ستمبر ۱۹۹۲ء کے دوران عام کرنسی علاقہ (جی سی اے) میں اچھی رہی ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں برآمدات میں بتدریج تیزی آئی ہے۔ برآمدات میں اضافے کی شرح اپریل سے جون ۱۹۹۲ء میں ۴ء۰ فی صد سے بڑھ کر اپریل سے جولائی ۱۹۹۲ء میں ۲ فی صد، اپریل سے اگست ۱۹۹۲ء میں ۶ء۴ فی صد، اور اپریل سے ستمبر ۱۹۹۲ء میں ۴ء۵ فی صد ہو گئی ہے۔ توقع ہے کہ برآمدات کی شرح موجودہ مالی سال کے بقیہ مہینوں میں مستحکم رہے گی، جس سے آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے لیے مقدار کے لحاظ سے مقرر ۶ء۱۳ فی صد سالانہ کے برآمداتی نشانے کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

ملک میں برآمداتی پیداوار کی بنیاد کو وسیع تر کرنے اور مصنوعات کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے ضروری اقدامات کئے گئے ہیں۔ برآمدات میں معیار کو یقینی بنانے اور مصنوعات میں بین الاقوامی معیارات حاصل کرنے کے لیے خصوصی پروگرام شروع کئے گئے ہیں۔ موجودہ سال میں صنعتی پیداوار میں عام اضافہ، سازگار مونسون نیز خریف کی فصل کی حوصلہ افزا زائد پیداوار سے، جو اشیاء سازی کے شعبے اور زرعی شعبے دونوں سے دستیاب ہے، برآمدات میں تیزی آئے گی۔ نرم اور آسان پالیسی ڈھانچے سے، جو ٹھوس مختصر اور درمیانہ منصوبہ ہائے عمل سے از سرِ نو نافذ کیا گیا ہے، اور معیار کو بہتر بنانے کے علاوہ برآمدات کو مقابلہ جاتی بنانے کے لیے کئے گئے خصوصی اقدامات سے آئندہ برسوں میں برآمدات میں کافی تیزی آئے گی۔ ادائیگیوں کے توازن کی صورتِ حال کو بہتر بنانے اور عالمی معیشت کے ساتھ تیزی سے ربط پیدا کرنے کے سلسلے میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے کام میں اس کا ایک ٹھوس اثر ہوگا۔

یوجنا، نئی دہلی

منظر نیاز صدیقی

بار بردار جانور : غیر رسمی توانائی کا اہم وسیلہ

ھمارے ارد گرد بہت سی ایسی
…وعیں موجود ہیں جن کی اہمیت اور افادیت
…ہیں کبھی یہ احساس ہوتا ہے اور نہ ہم
…کے متعلق سنجیدگی سے غور کرتے ہیں حالانکہ
…ات کے خالق نے دنیا کے تمام تر جاندار
…ات و نباتات کی تخلیق نظام کائنات کو
…نظر رکھتے ہوئے اس کی ضروریات کی تکمیل
…لیے کی ہے۔

اس تیز رفتار سائنسی دور میں ہر کوئی
…کے لیے کوشاں ہے اور مادّی ترقی کا تمام تر
…ذمہ دار جدید سائنس اور ٹکنالوجی پر ہے۔
…ی طور پر خود سائنس اور اس کی ایجادات
…ائی کے سہارے ہی اپنا کام انجام دیتے
…ہیں اور انسان کے لیے آسانیاں
…ہم کرتی ہیں۔ توانائی کے مختلف وسائل ہیں
…ہیں بڑے طور پر دو زمروں میں تقسیم کر سکتے
…۔ ایک طرح کے وسائل وہ ہیں جن کا
…تعمال ازمنۂ قدیم سے ہوتا آیا ہے اور جن کے
…تعمال کے لیے کسی طرح کی سائنسی ایجادات نہیں
…نا پڑی ہیں۔ یہ قدرتی وسائل ہیں جن میں
…، دھوپ، پانی، مختلف بار بردار جانور وغیرہ
…تے ہیں۔ توانائی کے ان غیر رسمی وسائل کا استعمال
…ں وقت بھی ہوتا تھا جب عہد حاضر کی دیگر

ایجادات اور توانائی کے رسمی وسائل دستیاب
نہیں تھے۔ اس ضمن میں اگر غور سے مطالعہ کیا
جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان نے
سب سے پہلے اپنے کاموں کی انجام دہی
میں جس ذریعہ کا استعمال کیا وہ توانائی کا غیر
رسمی وسیلہ یعنی جانور تھے۔ جانوروں کی مدد
سے انسان نے کاشت شروع کی۔
غرضیکہ کُلی انسانی سرگرمیاں جانوروں
تعاون کی مرہونِ منت تھیں۔ یہاں تک کہ
توانائی کے رسمی وسائل کو بہم رسانی کے بعد جب
زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی، انسان موٹر
گاڑیوں میں سفر کرنے لگا، ہوا میں اڑنے لگا
تب بھی بنیادی سطح پر بھارت میں ہی نہیں بلکہ
دیگر ممالک میں بھی جانوروں کا استعمال ہوتا ہی
رہا ہے۔ آج بھی ہمارے ملک کے دور دراز
اور اندرونی علاقوں میں، جہاں نقل و حمل کے
جدید ذرائع اب بھی بہت عام نہیں ہیں، جہاں
زراعت کے کاموں میں استعمال ہونے والی
جدید ترین مشینیں اور توانائی کے رسمی وسائل
اب بھی نہیں پہنچے ہیں وہاں بھی بے زبان جانور
انسانوں کے محسن ہیں، وہاں کاشت کاری سے

لے کر نقل و حمل تک تمام تر سرگرمیوں میں انسان
انھیں بے زبانوں کے تعاون کا محتاج ہے
…عام میں جانور [illegible] جس پر

[illegible]
عام طور پر ہمارے ملک میں مویشیوں کی نسل
کی ترقی کا مطلب زیادہ تر یہ لیا جاتا ہے کہ دودھ
دینے والے جانوروں کی افزائش نسل کو فروغ
دیا جائے، دودھ دینے والے جانوروں کی نسل
میں سُدھار لایا جائے اور انھیں زیادہ سے
زیادہ کار آمد بنایا جائے۔ یہ اچھا طریقہ ہے
اور اس سے یقیناً ہماری معیشت پر خوشگوار
اثرات مرتب ہوں گے تاہم معیشت کا استحکام
صنعتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دیہی و زرعی
کارکردگی پر بھی منحصر ہے اور دیہی و زرعی
سرگرمیوں، ترقی و فروغ کا انحصار دودھ دینے
والے جانوروں، مویشیوں کے ساتھ ہی ساتھ
بار بردار جانوروں پر بھی ہے جسے کسی طور
سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر

لے آئی او۔ پی آئی بی۔ شاستری بھون، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

کھیت کی جُتائی کے لیے ٹریکٹر موجود ہے تاہم اس سے جانوروں کی افادیت اور ضرورت ختم نہیں ہو جاتی۔ نقل و حمل کے جدید ترین ذرائع موجود ہیں لیکن اس سے دشوار گذار علاقوں میں جہاں سڑکیں اور راستے ہموار اور آسان نہیں ہوتے، گھوڑوں، گدھوں، خچروں، کھسسوں کی ضرورت آج بھی برقرار ہے۔ برفانی پہاڑوں کے بعض علاقوں میں بھی ان جانوروں کی ضرورت آج بھی ناگزیر ثابت ہوئی ہے۔ البتہ پُرانے شہروں کی تنگ گلیوں میں گدھے معمولی اشیاء اور سازوسامان ڈھو کر پہنچاتے ہیں۔ گاؤں میں اس سے زیادہ کا استعمال اب بھی اہم کردار ادا کرتی ہے اور شاید آئندہ برسوں میں کرتی رہے گی۔ گھوڑوں کی افادیت کو ازمنۂ قدیم سے تسلیم کی گئی تھی جو آج بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ یہ بات بھی شاید بہت کم لوگ سنجیدگی سے سوچتے ہوں کہ اگر توانائی کے رسمی وسائل اچانک ختم ہو جائیں (۱۰ سال کے اندر پیٹرول ختم ہو جائے) تو شاید انسان ایک مرتبہ پھر انھیں جانوروں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

غیر رسمی توانائی کے اہم وسیلے کے طور پر جانوروں کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے غیر رسمی توانائی وسائل کی وزارت ملک میں مربوط تحقیق و ترقی اور مظاہرے کے پروگراموں کے ذریعہ بہتر ٹکنالوجی وضع کرنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ باربردار جانوروں کی وافر توانائی کو مفید مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جا سکے۔ اس ضمن میں ایک منصوبہ بھی وضع کیا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں غیر رسمی توانائی وسائل کے وزیر مملکت مسز ایس کرشنا کماری کی سرکردگی میں منعقدہ جائزہ میٹنگ میں بھی اس موضوع پر غور و فکر کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں بنگلور میں جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں بھی اس موضوع کی افادیت تسلیم کی گئی تھی۔ اس کانفرنس سے اس وقت کی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے بھی خطاب کیا تھا۔

لوجنا، نئی دہلی

ایک سروے کے مطابق اس وقت ملک میں ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ بیل، ۸۰ لاکھ بھینسوں کو ملاکر باربردار جانوروں کی کُل تعداد تقریباً ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ باربردار جانوروں کی توانائی دراصل دودھ دینے والوں سے حاصل ہونے والی ضمنی چیز ہے اور اس ضمن میں یعنی باربردار مویشیوں کی افزائش نسل کے لیے علیحدہ سے کسی طرح کی سرمایہ کاری نہیں ہوتی۔ ایک طرف ملک میں دودھ دینے والے مویشیوں کی افزائش نسل اور سُدھار کے لیے مختلف پروگرام چلائے جا رہے ہیں تاہم باربردار جانوروں کی افزائش اور ان کی صلاحیتوں میں اضافے اور سُدھار کا کوئی پروگرام نہیں ہے جو تشویش کا پہلو ہے۔

آج باربردار جانوروں کے استعمال سے ملک میں سالانہ بنیاد پر تقریباً ۶۰ لاکھ لیٹر پٹرول ایندھن کی بچت ہوتی ہے۔ موٹے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ باربردار جانوروں کی بدولت ملک کی معیشت کو قابلِ ذکر سہارا ملتا ہے اور کروڑوں روپے کے برابر زرمبادلہ کی بچت ہوتی ہے۔ نقل و حمل کے شعبے میں یہی باربردار جانور مختلف گاڑیاں کھینچتے ہیں اور تقریباً ۲۵۰۰ کروڑ ٹن مال کا نقل و حمل کرتے ہیں۔ نسبتاً کم وزن اور مختصر فاصلے کے لیے تو یہ گاڑیاں آئیڈیل ثابت ہوتی ہیں۔ شاید دیہی علاقے میں پٹرول یا ڈیزل کے انجن سے چلنے والی کوئی بھی گاڑی، باربردار جانوروں کے ذریعہ کھینچی جانے والی ان چھوٹی گاڑیوں کی افادیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ایک جائزے کے مطابق دیہی علاقوں میں باربردار جانوروں کے ذریعہ کھینچی جانے والی گاڑیوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے تاہم اُن کا استعمال پورے سال میں باقاعدہ طور پر صرف ۱۰۰ دن ہی ہو پاتا ہے اور سال کے بقیہ دنوں میں وہ کام میں نہیں لائی جاتیں۔ نئے سازوسامان اور نظام کے اضافے کے ساتھ ان گاڑیوں کے استعمال اور اُن کی افادیت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

باربردار جانوروں کی طاقت سے چلنے والا نظام ہر برس توانائی کی ۵۰ کروڑ یونٹیں فراہم کر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس توانائی کا محض ۵۰ فی صد حصہ ہی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ اس طرح کی طاقت و توانائی قیمت پانچ ہزار سے آٹھ ہزار کروڑ روپے کے درمیان ہو سکتی ہے۔ باربردار جانوروں کی طاقت کا اصلاح شدہ نظام دیہی علاقوں میں روزگار فراہم کرانے، زرعی پیداوار بڑھانے، نقل و حمل کی صلاحیتیں بڑھانے، ان جانوروں پر کی جانے والی سختی کے خاتمے، سڑکوں کو کم سے کم خراب کرنے اور اس طرح کی دیگر افادیت کا باعث بن سکتا ہے۔

باربردار جانوروں کی توانائی اور اس کی افادیت کی اہمیت کو نہ صرف بھارت بلکہ دیگر بہت سے ممالک میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ برطانیہ، آسٹریلیا جیسے ممالک میں اس نظام کو جدید ترین بنانے کے لیے تحقیقی مراکز قائم کیے گئے ہیں تاکہ اس اہم اور قابلِ اعتبار توانائی وسیلے کو بروئے کار لایا جا سکے۔ برطانیہ میں اڈنبرا یونیورسٹی، میں یہ کام چل رہا ہے افریقہ کے بین الاقوامی مویشی مرکز، آسٹریلیا میں بین الاقوامی ڈیری ایگن تحقیق مرکز کی کونسل بھی اس کام میں مصروف ہے۔ غیر رسمی توانائی وسائل کی وزارت باربردار جانوروں کی توانائی کو بروئے کار لانے کے لیے پالیسی وضع کرنے کے ساتھ تفصیلات بھی طے کر رہی ہے۔ ابھی اس سمت میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر جانوروں کی توانائی کو پوری طرح سے بروئے کار لایا گیا تو

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

لولانا یئر

آبادی کی روک تھام : ایک امتیازی منصوبہ

آبادی کی روک تھام کے لیے نئے
حہ حیز منصوبۂ عمل کا مقصد موجودہ سُبسیا دی
ھانچے کو مستحکم بنانا ہے۔ منصوبہ میں ریاستوں
ر مرکزی علاقوں کو مختص کی جانے والی رقم کے
سلسلے میں لچکدار نظریہ اپنایا گیا ہے۔

نئے نظریہ میں ریاستوں کے لیے یہ ضروری
رد ا گیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مرکزی امداد
حاصل کرنے کے لیے شرح پیدائش میں حقیقی کمی کو
یتی کریں ریاستوں کو ریاست میں ہونے والے
س بندی آپریشنوں کی تعداد کی بنیاد
ر دی جانے والی ترغیبات کی موجودہ اسکیم کو
ختم کیا جا رہا ہے کیوں کہ دعووں کی تصدیق کا کوئی
قطعی طریقہ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا موجودہ اسکیم
ں ترمیم کی جا رہی ہے تاکہ اُسے ریاستوں کے
لیے مزید لچکدار بنایا جا سکے۔ بچوں کی پیدائش
میں وقفہ رکھنے کے طریقے سے شرح پیدائش کو
کم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں نوجوان
جوڑوں کو زیادہ شامل کیا جائے گا کیوں کہ ان
میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔
چونکہ ریاستیں خاندانی بہبود سے متعلق اقدامات
کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کر رہی ہیں یہ
توقع کی جاتی ہے کہ اس سے آبادی کی روک تھام
پر زیادہ اثر پڑے گا۔

یہ منصوبۂ عمل ریاستی حکومتوں اور مرکزی
علاقوں کی انتظامیہ کے اتفاقِ رائے سے تیار کیا
گیا ہے۔ اس میں لوگوں کو دی جانے والی منفرد
ترغیبات کو ختم کرنے کا اہتمام ہے۔ ان ترغ
کی جگہ کمیونیٹی پر مبنی ترغیبات اور چھوٹ
اصول اپنانے والے لوگوں کے لیے سما
اقدامات کی شروعات کی جا رہی ہے
کمیونیٹی پر مبنی ترغیبات کو علاقے
سماجی و اقتصادی ترقی کے مختلف منصوبوں کے
ساتھ مربوط کر دیا جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ
کرنے کا اختیار ریاستوں ہی کے لیے چھوڑ دیا
جائے گا کہ وہ کسی خاص معاملے میں دی جانے والی
ترغیبات کی نوعیت کے بارے میں فیصلہ کریں۔

نشانوں کے جھنجھٹ سے نجات پانے کے
لیے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ترغیب دینے
والے افراد کو دی جانے والی موجودہ ترغیبات
کو ختم کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس سے مانع حمل
کے خصوصی طریقوں کی تشہیر ہو رہی تھی۔ تاہم
خصوصی مقامی ضروریات کے لیے موزوں چھوٹے
پیمانے کی منصوبہ بندی پر مبنی نشانے پروگرام
کی نگرانی کے لیے مقرر کئے جاتے رہیں گے

فی الحال ریاستوں کو آئی یو ڈی (مانع حمل
آلہ) لگوانے کے لیے فی معاملہ دس روپے، فی
لس بندی ۱۰۰ روپے اور فی ٹل سانی ۲ روپے
دیے جاتے ہیں۔ اس رقم میں سے آئی یو ڈی لگانے
والے کو ۱ روپے یہ لس ... ان ا ا ...

ایک حصہ ان طریقوں کو اپنانے والے افراد کا کسی
حادثے کی صورت میں اس کے قریبی رشتہ دار
کو بطور معاوضہ دینے کے لیے الگ سے رکھا
جاتا ہے۔

نئے منصوبے کے مطابق سرکاری ملازمین
کو چھوٹے کنبے کا اصول اپنانے کے لیے دی جانے
والی ترغیبات کو بھی ختم کرنے کی تجویز ہے۔ تاہم
بعض حلقوں میں اس سلسلے میں اعتراضات کئے
گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چھوٹے کنبے کے
اُصول اپنانے والے درجہ سوئم اور چہارم کے
ملازمین کے لیے زائد ترغیبات جاری رکھی جانی
چاہئیں۔ دریں اثنا، مرکزی اور ریاستی دونوں
حکومتوں کے ملازمین کے لیے ترغیبات کی مناسب
اسکیم تقریباً تیار ہے۔

مانع حمل اشیاء کا فروغ خاندانی بہبود

کے پروگرام کا ایک اور پہلو ہے جس سے تبدیلی لانا مطلوب ہے حالانکہ اس سے قبل کنڈوم اور مانع حمل گولیوں کی مفت تقسیم کے ذریعہ مانع حمل اشیاء کے استعمال کو فروغ دیا جاتا تھا لیکن اب یہ تمام اشیاء فروخت کی جائیں گی۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کیوں کہ مفت تقسیم کی اسکیم پر کیا جانے والا خرچ کسی حد تک بے سود پایا گیا۔ علاوہ ازیں، بڑھتی ہوئی شرح پیدائش پر اس اسکیم کا کوئی اثر رونما نہیں ہوا۔ اس کے بجائے مانع حمل اشیاء سماجی خرید و فروخت کے لئے ایک بہتر شکل میں مختلف اسکیموں کے تحت دستیاب ہوں گی۔

مفت تقسیم کئے جانے والے حستک کنڈوم کی سپلائی کو مرحلہ وار ختم کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ چکنے کنڈوم سپلائی کئے جائیں گے۔ جب کہ تین نئے چکنے نرودھ کے ایک پیکٹ کی قیمت پچاس پیسے ہی رہے گی، پانچ ڈی لکس نرودھ کے ایک پیکٹ کی قیمت ایک روپیہ سے بڑھا کر ایک روپیہ پچاس پیسے اور چار سپر ڈی لکس نرودھ کے ایک پیکٹ کی قیمت دو روپے سے بڑھا کر تین روپے کر دی جائے گی۔

کھانے والی مانع حمل گولیوں کے معاملے میں، کینیچر، من سر مالا ڈی اور مالا۔ این کی تیاری میں رفتہ رفتہ اضافہ کیا جائے گا اور ان کے معیار کو بہتر بنایا جائے گا۔ جب کہ مانع حمل اشیاء کی مفت تقسیم بڑی حد تک ختم کر دی جائے گی، لیکن یہ سلسلہ ان علاقوں میں جاری رہے گا جہاں اقتصادی صورتِ حال کا تقاضہ ہے یا ان علاقوں میں جاری رہے گا جو سماجی خرید و فروخت یا کمیونٹی پر مبنی تقسیم کے پروگراموں سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں۔

اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ وضع حمل سے متعلق خدمات کا معیار مختلف ریاستوں میں مختلف ہے، ان خدمات کے معیار کو بہتر بنانے اور ان خدمات تک رسائی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ قبائلی اور دور دراز علاقوں میں نئے ادارے کھولنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن فنڈز اس ضرورت کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں۔ منصوبہ میں صحت سے متعلق بنیادی ڈھانچے شہری گندی بستیوں میں بھی، جہاں ان کی خاص طور پر کمی ہے قائم کرنے اور انھیں مستحکم بنانے کا اہتمام ہے۔

بیماریوں سے محفوظ کرنے کے پروگرام کے سلسلے میں بیشتر ریاستوں سے زیادہ سے زیادہ عمل درآمد کی رپورٹیں مسلسل موصول ہو رہی ہیں۔ تاہم اب بھی ایسے علاقے باقی ہیں جہاں عمل درآمد کی سطح کم ہے۔ آئندہ برسوں میں دیگر علاقوں میں عمل درآمد کی اعلیٰ سطح کو برقرار رکھتے ہوئے اس قسم کے علاقوں پر خصوصی توجہ مرکوز کی جائے گی۔

۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کے نشانے کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک مرحلہ وار طریقے میں آئی ڈی اے اور یونی سیف کی امداد سے بچوں کی بقار اور محفوظ مادریت کے ایک نئے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کی تجویز ہے۔ اس سے دیگر باتوں کے علاوہ، تین برس تک کی عمر کے تمام بچوں کے لیے وٹامن اے کی فراہمی سانس کے ذریعے لگنے والی خطرناک بیماریوں کی روک تھام کے اہم پروجیکٹ کی توسیع اور ابتدائی حفظانِ صحت سے متعلق بنیادی ڈھانچہ مستحکم ہوگا۔ توقع ہے کہ اس پروجیکٹ سے شیر خوار بچوں کی شرحِ اموات میں نمایاں کمی آئے گی اور یہ خاندانی بہبود کی اسکیموں کو بہتر بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔

منصوبۂ عمل میں موجودہ اسکیموں کی جدید کاری اور انھیں بہتر بنانے نیز ان علاقوں میں حفظانِ صحت سے متعلق سہولیات فراہم کرنے کا بھی اہتمام ہے، جہاں یہ سہولیات فراہم نہیں ہیں۔ حکومت کی کوششوں میں مدد کرنے کے لیے غیر سرکاری اور رضاکار اداروں کے لیے بھی ایک زیادہ اہم کردار کی تجویز ہے۔ ●

بقیہ: کیا آپ جانتے ہیں؟

کے پانچ ادیبوں کو عناصر خمسہ کا نام دیا ہے، اُن کے نام بتایئے؟

۲۸۔ دنیا کے اُس پہلے اسپتال کا نام بتایئے جو پہیوں (On Wheels) پر ہے؟

۲۹۔ ہندوستانی آئین کے شیڈول آٹھ میں کُل کتنی زبانیں ہیں؟

۳۰۔ "رام کرشن مشن" کا بانی کون تھا؟

۳۱۔ مشہور شاعر امیر خسرو کس بادشاہ کے درباری شاعر تھے؟

۳۲۔ "بیری بیری" (Beri Beri) کا مرض کس وٹامن کی کمی کے سبب ہوتا ہے؟

۳۳۔ ہندوستان کے سمندری راستے کی دریافت کس سال ہوئی تھی؟

۳۴۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کس سال قائم ہوئی تھی؟

۳۵۔ بتایئے کہ "ذکرِ میر" کے نام سے میر تقی میر کی سوانح عمری کس نے لکھی ہے؟

۳۶۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ غالب کو "حیوانِ ظریف" کس نے کہا تھا؟

۳۷۔ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا قیام بابر کے ذریعہ کس سال عمل میں آیا تھا؟

۳۸۔ کتے کے کاٹنے سے کون سی بیماری ہوتی ہے؟

۳۹۔ ممتاز ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کس مشہور ادیب کی صاحبزادی ہیں؟

۴۰۔ "ہرش چرتر" (Harshcharitra) نام کی کتاب کا مصنف کون تھا؟

(جوابات صفحہ ۳۰ پر) ●

سیتارام کیسری

فلاح و بہبود کی اِسکیمیں

یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جمہوری اداروں سے ترقی پذیر اور جدید ملک کی حیثیت سے گزشتہ چار دہائیوں کے دوران ہندوستان کی کارکردگی اچھی رہی ہے۔ ترقی اور خود کفالت کے حصول کی کوششوں میں ہندوستان نے بہرحال سماج کے کمزور اور نادار طبقوں کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ سب کے لیے مساوات اور انصاف کے آئینی نصب العین کی تکمیل کے لیے حکومت نے ان طبقوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے فلاح و بہبود کے پروگرام اور ٹھوس اقدامات کئے ہیں۔

درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں کی قومی ترقیاتی اور مالی کارپوریشن (این ایس ایف ڈی سی) کی کارکردگی کا جائزہ ۱۹۹۱ء میں لیا گیا تھا اور آمدنی کے پائیدار مواقع فراہم کرنے کی اسکیمیں شروع کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۹۲ء تک ۶ء۲۴ کروڑ روپے کی رقم جاری کی جا چکی تھی۔ ۱۹۹۳ء کے لیے ایک سو کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔

درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں کی ترقی کے لیے حکومت نے درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی کارپوریشن (ایس سی ڈی سی) قائم کی ہیں، جو اٹھارہ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے تین علاقوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ایس سی ڈی سی میں مرکز کی سرمایہ کاری ۴۹ فی صد اور ریاستی حکومتوں کی سرمایہ کاری ۵۱ فی صد ہے۔

فضلہ سر پر ڈھونے کے غیر انسانی طریقے کو ختم کرنے کے لیے، حکومت نے
لیکن با عزت کاروبار اور پیشہ
اس پیشے سے نجات دلانے
کے لیے ایک اسکیم شروع کی
خاکروبوں کی تعداد تک بھگ پا
خاکروبوں کی اس پیشے سے نجات اور بار آباد کاری کے لیے ۹۰.۵ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی، جو ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے بڑھا کر ۰۰ اکروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ ایک خصوصی مہم میں ملک بھر میں ۰۰ ء۷ سے زیادہ خاکروبوں کو اس پیشے سے نجات دلائی گئی ہے۔ سماجی انقلاب لانے میں چونکہ تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے، اس لیے ملاطت والا کام کرنے والے لوگوں کے بچوں کے لیے میٹرک سے قبل وظیفوں کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔

سماج کے نادار اور عرصے سے ظلم کے شکار طبقوں یعنی درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے فائدے کے لیے متعدد اسکیمیں موجود ہیں۔ ان گروپوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کو ٹک

مرکزی وزیر برائے بہبود

نیک اسکیموں کے تحت مدد کی جاتی ہے، ہوسٹلوں میں رہائش کی جگہ فراہم کی جاتی ہے، کل سد سطح
کے معا ... ۱-۱۱ ... کر ... ۱-۱۱ ... مسا

کے لیے ۴۸، ۸ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کو تربیت دینے کے لیے مجموعی طور پر کوچنگ کے ۲ ا مراکز کھولے گئے ہیں۔ ایک نئی اسکیم کے تحت ہر سال ۶ طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجا جائے گا۔ درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے لیے ملک بھر کے تقریباً ۴۸ اضلاع میں رہائشی اسکول کھولے گئے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں آشرم اسکول کھولے گئے ہیں تاکہ قبائلیوں کے معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کی غرض سے اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

حکومت نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ۱۵ نکاتی پروگرام کے تحت خصوصی اقدامات کئے ہیں۔ ان پروگراموں کا مقصد اقلیتوں میں اعتماد پیدا کرنا ہے۔ تکنیکی تعلیم دینے کے لیے اقلیتوں کی

اکثریت والے اضلاع میں کمیونٹی پولی ٹیکنک کے توسیعی مراکز چلائے جا رہے ہیں۔ اقلیتی فرقوں کے امیدواروں کو مختلف مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تیار کرنے کی غرض سے امتحان سے قبل کوچنگ کی ایک اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے سلسلے میں ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے دو کروڑ روپے کی رقم کی منظوری دی گئی ہے۔

وقف بورڈوں نے بھی شہری علاقوں میں وقف املاک کی بہتری کے لیے مالی امداد دی ہے ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران مرکزی وقف کونسل نے ۱۲ لاکھ روپے کی رقم مختص کی ہے

معذور لوگوں کو پیداواری کاموں میں لگانے کے لیے اور انھیں خود کفیل بنانے کے لیے حکومت انھیں مصنوعی آلات، ساز و سامان اور پیشہ ورانہ تربیت فراہم کر کے اُن کی مدد کرتی ہے خواندگی کی سطح کم ہونے، ابتدائی طبی خدمات کی عدم موجودگی اور جہالت کی وجہ سے یہ مسئلہ دیہی علاقوں میں زیادہ سنگین ہے۔ حکومت معذور لوگوں کو ۳۶ روپے تک کی مالیت کے آلات اور ساز و سامان فراہم کرتی ہے، جس کے لیے بعض منتخب پابندیاں لگائی گئی ہیں اور کچھ رعایتیں بنائے گئے ہیں۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں اس مقصد کے لیے مجموعی طور پر ۳۰ لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں۔

معذور افراد کی خدمت میں مصروف پیشہ ور لوگوں کے لیے تربیت اور تعلیم کے یکساں معیار کو یقینی بنانے کے سلسلے میں ایک قانون بھی وضع کیا جا رہا ہے غیر سرکاری تنظیمیں بھی حکومت کی کوششوں میں مدد کرنے کے لیے اس شعبے سے زیادہ سے زیادہ وابستہ ہو رہی ہیں۔

سماجی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طبقوں کی بہبود کے لیے حکومت نے بڑے پیمانے پر اقدامات کئے ہیں۔ ۲ کروڑ روپے کے منظور شدہ حصص سرمائے سے پسماندہ طبقوں کی قومی مالی اور ترقیاتی کارپوریشن کا قیام اس سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ آمدنی پیدا کرنے والی اسکیمیں شروع کرنے کے لیے یہ کارپوریشن ان لوگوں کو مالی امداد بطور قرض فراہم کرے گی، جن کی سالانہ آمدنی ۲۲۰۰ روپے سے کم ہے۔ یہ مالی امداد سود کی رعایتی شرح پر دی جائے گی، جسے آسان قسطوں میں ادا کرنا ہوگا۔

حکومت نے منڈل کمیشن کی سفارشات کو سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق لاگو کرنے کا عزم مصمم کر رکھا ہے سماجی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طبقوں کے لیے ریزرویشن مخصوص کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قومی دھارے میں شامل ہونے کے لئے اُن کی مدد کی جائے اور انھیں قوم کی تعمیر کے کام میں برابر کا حصہ دار ہونے کے قابل بنایا جائے۔

سماج کے نادار طبقوں تک پہنچنے کے سلسلے میں ہماری مجموعی کوششوں میں غیر سرکاری تنظیموں کو اہم کردار دیا گیا ہے۔ حکومت غیر سرکاری تنظیموں کے ۹۰ فی صد اخراجات ادا کرتی ہے۔ نگرانی کا ایک نظام بھی وضع کیا گیا ہے تاکہ حکومت جو خصوصی مالی امداد دیتی ہے اُس کا مناسب استعمال کیا جائے اور اُس کا صحیح حساب کتاب رکھا جائے۔ نادار اور یتیم بچوں کو اچھے اور ذمہ دار شہری بنانے کے لیے اُن کی دیکھ بھال اور تحفظ کے لیے بھی اسکیمیں وضع کی جا رہی ہیں۔

نوجوانوں کو منشیات کی لعنت سے بچانے کے لیے حکومت ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے رائے عامہ تیار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک سہ پہلوئی حکمت عملی اختیار کی گئی ہے، جو عوامی تعلیم کے ذریعہ بیداری پیدا کرنے، منشیات کے عادی لوگوں کی نشاندہی کرنے، اُن کا علاج کرنے اور اُن کی بازآبادکاری کرنے نیز سرکاری اور غیر سرکاری کارکنان کی تربیت پر مشتمل ہے۔ اس وقت ملک میں مشورے دینے، منشیات کی عادت چھڑانے اور بازآبادکاری کے ۲۲۹ سے زیادہ مراکز ہیں۔ جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں کے دوران منشیات کے عادی لوگوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر شیام سنگھ ششی (ڈائرکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن) کے دانش مندانہ اور دلیرانہ اقدام

۲۷ مارچ کو ہری سنگھ نامی شخص نے ایک ہندوستانی طیارہ (اندرونی ملک) کا اغوا بڑے ہی ڈرامائی انداز سے کر لیا تھا اس اطلاع سے طیارہ کے مسافروں میں نہ صرف سراسیمگی پیدا ہوگئی بلکہ بیشتر مسافر حیات و موت کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ البتہ ان میں سے ایک مسافر پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر جنرل پدم شری ڈاکٹر شیام سنگھ ششی بغیر کسی خوف و دہشت کے بڑے اطمینان سے "ہمدردانہ اپیل" لکھنے میں منہمک تھے ـــ اغوا کار کی مطالبہ تقریر جیسے ہی ختم ہوئی، ڈاکٹر ششی نے درخواست پر تقریباً پچاس مسافروں کے دستخط کروائے اور اُسے اغوا کار تک پہنچایا ـــ "اپیل" کا متن کچھ اس طرح تھا

"جناب! ہمیں آپ کے ساتھ
پوری ہمدردی ہے۔ ہم آپ کے
خیالات کی اخلاقی حمایت کرتے
ہیں۔ ہم آپ کی آواز کو مرکزی سرکار
تک پہنچائیں گے ـــ آپ براہ کرم
بچوں اور عورتوں کو تو جانے دیجئے"

اس اپیل کو پڑھ کر اغوا کار کافی متاثر ہوا اور اُس نے مائک پر کہا

"میرے خیالات کی آپ نے اخلاقی
حمایت کی، بس مجھے زندگی کا بیش
قیمت خزانہ مل گیا۔ اب میری آواز
دور دور تک پہنچ جائے گی۔ میں آپ
لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

ان الفاظ کی ادائیگی کے بعد اُس اغوا کار نے کچھ اپنی آپ بیتی بھی سنائی اور پھر خود کو سپرد کر دیا اس طرح ڈاکٹر ششی کی بروقت دانش مندی اور دلیری سے نہ صرف کئی جانیں تلف ہونے سے بچ گئیں بلکہ ایک بڑا حادثہ بھی ٹل گیا۔ ●

رشید الدّین خاں

فرقہ وارانہ ہم آہنگی

"چونکہ جنگوں کی شروعات انسان کے ذہن سے ہوتی ہے لہٰذا اس کی مدافعت بھی انسانی ذہن سے ہی شروع ہونا چاہیئے" یہ بات یونیسکو چارٹر میں کہی گئی ہے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اور ذات پات کے فسادات کے پس منظر میں اس بیان سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا سکتا ہے کہ "چونکہ فسادات انسانوں کے اذہان سے شروع ہوتے ہیں، لہٰذا فرقوں اور ذاتوں کے درمیان اس کی مدافعت بھی انسانی ذہن سے ہی شروع ہونا چاہیئے" فرقہ واریت نہ صرف ایک غیر حقیقی بیداری پیدا کرتی ہے، بلکہ شہریوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بدظن کر کے قومی یگانگت کے ڈھانچے کو کمزور کر دیتی ہے۔

یہ یاد رکھنا لازم ہے کہ ہندوستان کی یہ تہذیب زمانہ ہائے قدیم سے ہی الگ الگ ذاتوں، زبانوں، تہذیبوں اور مذہبوں کی ملنے والی برادریوں کے تانے بانے سے مل کر ایک خالص، روایتی اور کثرت پسند سماج بنی ہے۔ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ لینا تقاضائے وقت ہے کہ ہندوستان کا بنیادی اتحاد اس کثرت کو خود مختاری اور ہم آہنگی کے ڈھانچے میں

ملحوظ کر کے برِّ اعظم کی سیاست میں امن اور ترقی لانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

وفاقی تصوّر

ہندوستان میں اتحاد خود ایک [illegible] ہے۔ یہ محض متحدہ سیاسی نظام کا [illegible] یہ وہ اتحاد ہے جو مختلف سماجی و [illegible] کے ایک دوسرے پر انحصار کر [illegible] ہوتا ہے اور مقابلے، تنازعات اور [illegible] کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہ گروہ اس احساس کو پا جاتے ہیں کہ آپسی مخاصمت سے وہ خود ایک دوسرے کو تباہ کر سکتے ہیں، جب کہ آپس میں تعاون کے ذریعہ یہ لوگ اجتماعی طور پر بہتر طریقے سے پھل پھول سکتے ہیں۔

تاہم ہندوستان میں فرقہ واریت اور ذات پات پر مبنی تنازعات کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے بعض بنیادی حقائق کو یاد رکھنا ضروری ہے یہاں کچھ مخصوص تضادات اور الجھنیں ہیں مثال کے طور پر ہندوستان ایک قدیم سماج اور جدید قوم ہے، یہ فرقہ وارانہ سماج اور سیکولر ملک ہے یہ ایسا صنعتی سماج ہے جو جاگیردارانہ کلچر میں بندھا ہوا ہے۔ یہاں جمہوریت پسند سیاست ہے جبکہ قبل از جمہوریت کے، ذات پات اور مسائل

یہ مذہبی نظریات [illegible] ہیں [illegible] آبادیاتی نظام سے آزاد ملک ہے لیکن جہاں کو آبادیاتی صورت حال والے طاقتور حلقے [illegible] ہیں

ثقافتی حلقوں کے تناظر میں دیکھا جائے اور یہ بھی مختلف علاقائی سطحوں پر ہونا چاہیئے

ہندوؤں اور مسلمانوں کو کل ہند سطح پر بڑے فرقے کہا جا سکتا ہے جو علاقائی لسانی، ثقافتی اور نسلی اعتبار سے کئی ممتاز ذیلی برادریوں سے مل کر بنتے ہیں۔ ان کے سائز اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مسائل اور مسلم مسائل دراصل ہندوستانی مسائل ہیں یہ کسی فرقے یا برادری کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک قومی مسئلہ ہیں۔

جمہوریت شہریوں کو انفرادی طور پر دیکھتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جمہوریت کی نظر میں تمام شہری برابر اور خود مختار ہیں انھیں خاندان، قبیلے، ذات پات اور لسانی برادری

جیسے کم اہم گروہوں کے تناظر میں دیکھنا غلط ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں شہریوں کو بڑے پیمانے پر پھر سے بیدار کرنے کی ضرورت ہے جس سے اتحاد اور ہم آہنگی، سیکولرزم اور جمہوریت، مساوی حقوق اور منصفانہ و انسانیت نواز معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔

سیکولرزم کسی بھی مذہبی نظام حکومت کے کلچر کی نفی کرتا ہے اور یہ کسی چرچ، پادری یا کسی بھی قسم کے مذہبی اقتدار کے خلاف ہے۔ ہمارے کثیر مذہبی حالات میں سیاسی سیکولرزم کو فروغ دینے کے لیے لیڈر اور پارٹیاں عمداً جو خاص حکمت عملی اختیار کرتی ہیں وہ ان کے اخلاقی نظریات اور انسانیت نواز تعلیمات پر مبنی تمام مذاہب کا اتحاد ہے۔ ہماری قومی تحریک کے لیڈروں نے کثرت میں اتحاد لانے کے لیے اسی پر زور دیا تھا۔ ہمارے بھگتی اور صوفی تحریک کے سنتوں نے اس بنیادی قدر پر صدیوں تک عمل کیا۔ ویدوں کے نظریے "سرو دھرم سمبھو" (تمام مذاہب کا یکساں احترام) میں اسی نظریے کی مثال ملتی ہے۔ مذہبی روایات سے پُر ہندوستانی معاشرے میں اس طرح کا نظریہ آپسی رواداری اور احترام کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اس نظریے کے تحت سیکولرزم مذہبی برادریوں میں سماجی و سیاسی مصالحت کا کام کر سکتا ہے۔

قومی یک جہتی کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ کثرت میں وحدت کی وہ حالت ہے جس میں شامل حصے یکساں طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر منحصر رہتے ہیں۔ قومی یک جہتی، اتحاد اور اختلاف دونوں کی موجودگی کو تسلیم کرتی ہے۔ کیوں کہ صرف اتحاد ہو تو ہم آہنگی ضروری نہیں اور اگر صرف اختلاف ہو تو ہم آہنگی ممکن نہیں۔ ہم آہنگی کثرت کو یکسانیت میں بدلنے کا عمل نہیں ہے بلکہ کثرت کو ایک اعلیٰ ترین سطح کے اتحاد کی طرف لے جاتا ہے۔ جس میں اختلاف و یکسانیت دونوں کو برقرار رکھا جائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کثرت کی حالت میں مختلف گروہوں کو اپنے کاموں میں علاحدگی پسند نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال کامیاب کثرت پسند معاشروں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ کثرت میں مصالحت ممکن ہے۔

ایک نئی ثقافت بنانے اور ایسی اتحاد کو فروغ دینے کے لیے ہم ہندوستان کی قومی تحریک سے حوصلہ حاصل کر سکتے ہیں، جو بذات خود قومی سیاست میں مشترکہ تہذیب کا شاندار اظہار تھی۔ اس تحریک نے مشترکہ ثقافت میں مضمر اقدار کو کل ہند پلیٹ فارم بخشا اور مشترکہ تہذیب کو اجتماعی زندگی مثلاً سیکولر قوم پرستی، جمہوریت، مساوی حقوق، سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ اور استدلال پسند مزاج جیسی اقدار سے مالا مال کیا تھا۔

ہموار کرنے کا عمل

فرقہ پرستی صرف مذہبی برادریوں کو تسلیم کرتی ہے اس کے نزدیک سیاسی وفاداری کا سرچشمہ قوم اور ملک نہیں ہیں۔ فرقہ پرستی مذہب کو اخلاقی ضابطے سے اقدار کی سیاست کا ایک گھٹیا آلہ کار بنا لیتی ہے۔ ایک سیکولر ملک کا مذہبی ورثہ اور جمہوری مواقع۔ یہ دونوں ہی فرقہ پرستی کے ہاتھوں پامال ہوتے ہیں۔ یہ دیگر فرقوں کو دشمن قرار دیتی ہے اور اس طرح لوگوں کے باہم اور ہم آہنگی کے عمل میں رخنہ ڈالتی ہے جس سے قومی اتحاد کمزور پڑتا ہے۔ یہ سیاست کو جرائم سے آلودہ کرتی ہے اور سیاست کو بے رحم بناتی ہے۔ فرقہ پرستی ہندوستانی تہذیب کے انسانیت نوازی اور بھائی چارے کے تابناک ورثے اور ہندوستانی تہذیب کے تانے بانے کو تباہ کرنے کا باعث ہے۔

فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد میں ہمیں عوام کے مختلف طبقات کے اصلی مذہبی افراد عورتوں، نوجوانوں، پیشہ ور گروہوں، خاص طور پر ذرائع ابلاغ کے لوگوں کو ہموار کرنا چاہیے کیونکہ فرقہ پرستی قوم اور انسانیت دونوں کے لیے مضر رساں ہے۔ سب سے پہلے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور قومی سطح پر یہ سمجھ لیا جائے کہ فرقہ پرستی ہماری زندگی کی بنیادی اقدار، ہمارے ملک کے نظام اور نئی ابھرتی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے کیونکہ یہ سیکولر اور جمہوری ہندوستان کے نظریے کی دشمن ہے جس کے ہم پاسدار ہیں۔ یہ احساس ہمارے شعور کا اٹوٹ حصہ ہونا چاہیے۔ ●

بقیہ، بھارت تھائی لینڈ۔ تاریخی تعلقات

رہا ہے۔ کھون کی کتاب راماکین ہے جو رامائن کا تھائی ترجمہ ہے۔ تھائی ترجمہ بالمیکی کی کلاسیکی رامائن سے کافی مختلف ہے۔ تھائی ترجمہ کچھ حد تک بودھوں کے بیانوں اور بڑی حد تک شری وجیہ سے کیا گیا ہے۔ ان حصوں کو چکری سلطنت کے بانی بادشاہ رام اوّل نے یکجا کر دیا تھا۔

ثقافتی تعلقات کی بھارتی کونسل، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور حکومت ہند یا تو عام تعلیم حاصل کرنے یا خصوصی ثقافتی پروگراموں کے سلسلے میں بھارت آنے کے لیے تھائی لینڈ کے لوگوں کو وظائف کی پیشکش کرتی رہی ہے۔

ہر سال متعدد تھائی راہب سنسکرت، پالی اور بودھ مطالعات کے لیے بھارت آتے ہیں۔ بودھ گیا اور سارناتھ میں تھائی دَیر بھی تھائی لینڈ کے لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ چنانچہ اقتصادی دباؤ کی یکساں صورت حال کے علاوہ، کیونکہ دونوں ہی ترقی پذیر ملک ہیں، یکساں ثقافتی ورثہ بھارت اور تھائی لینڈ کے درمیان قریبی تعاون اور بہتر مفاہمت کے لیے ایک ٹھوس بنیاد کا کام کرتا ہے۔ ●

ویریندر ایم ترپاٹھی

امن اور ہم آہنگی کی اہمیت

اس وقت کو بیتے کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے جب ہر صبح مندروں سے گھنٹیوں کی آواز اور بھجن کے بول، گردوارے سے شبد اور مسجد سے اذان کا ملا جُلا ترنم دن شروع ہونے کی اطلاع دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چڑیوں کی چہکار اور نسیم صبح کے خوشگوار جھونکے ذہن کو ایک مسحور کن سکون اور پاکیزہ کیفیت عطا کرتے تھے

لیکن آج کل کی صبحیں مختلف ہیں۔ اخبارات ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ہونے والی دہشت گردی، آتش زنی، لوٹ اور فرقہ وارانہ فسادات کی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ یہ سب ہندوستان میں ہو رہا ہے جو عدم تشدد کے پرچار کی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ اور اسے بین الاقوامی سطح پر امن و آشتی کا محرک تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہم صدیوں سے اچھے بُرے حالات میں مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تہواروں پر خوشیاں بانٹیں اور مختلف ذاتوں اور برادریوں کے درمیان شادیاں کیں۔ پھر آج وہ کون سی طاقت ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما کر رہی ہے یقیناً ایسی کوئی طاقت نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا ماحول امن و آشتی کی زندگی گزارنے کے لیے کہیں زیادہ سازگار ہے

آج ہندوستان کے دستور نے اسے ایک سیکولر ملک قرار دیا ہے جہاں تمام مذاہب کو پھلنے پھولنے کی پوری آزادی اور تمام مواقع [illegible] گئے ہیں پسماندہ طبقات کو سماجی [illegible] کرنے ترقی کے مواقع حاصل ہیں جس [illegible] دھارے میں شامل ہو سکیں۔ اظہار [illegible] آزادی ہے اور تمام شہریوں کو [illegible] حاصل ہیں۔

دراصل کوئی بھی مذہب تشدد کی تبلیغ نہیں کرتا۔ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات نبھاتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اوروں کے حقوق کی پامالی نہ ہو اور ہم ایماندارانہ زندگی بسر کریں۔

گوتم بدھ کا قول ہے کہ خواہش جھگڑوں اور پریشانیوں کی جڑ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنی خواہشات محدود کر لیں تو بہت سی مصیبتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے یہی خیال اپنے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ "آدمی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دنیا میں بہت کچھ ہے لیکن لالچ پورا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" دراصل لالچ ہی ہے جو ہمیں دوسروں کا حصہ ہڑپنا سکھاتا ہے اور یہیں سے تنازعات جنم لیتے ہیں حکومت نے مختلف فرقوں کے مابین [illegible]

[illegible]

زیادہ سے زیادہ قربت پیدا کرنے کے اقدام بھی کئے ہیں تاکہ فرقہ وارانہ تشدد کو روکا جا سکے۔ ہندوستان کے ہر ایک شہری کا یہ فرض اور ذمہ داری ہے وہ انتشار پسند طاقتوں کے خلاف اسی طرح لڑیں جس طرح وہ آزادی کے دوران لڑے تھے

قومی یک جہتی کونسل جو کچھ عرصہ تک غیر فعال رہی تیزی سے حرکت میں آگئی ہے۔ وقفے وقفے سے اس کی میٹنگیں ہوتی ہیں جن میں مختلف معلومات پر اتفاق رائے حاصل کرنے اور فرقہ واریت کے مسئلوں کو حل کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔ حکومت ان سماجی تنظیموں کی بھی حمایت کرتی ہے جو قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کے لیے کوشاں ہیں۔ شرپسندوں سے ہوشیار رہ کر تمام فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی ذمہ داری

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

یوجنا، نئی دہلی

سی۔ کے۔ جعفر شریف

بھارتی ریلویز: سماجی ذمّہ داریاں نبھانے میں پیش پیش

ریل مسافروں کی ایک بڑی تعداد میں عام طور سے یہ احساس پایا جاتا ہے کہ حکومت نقل و حمل اور آمد و رفت کی ان ضروریات کو پوری کرنے کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کر رہی ہے۔ لمبے سفر والا مسافر ایک ایسے آرام دہ سفر کا متمنی ہے جو کم خرچ ہونا چاہیئے اور اسی کے ساتھ ساتھ تیز رفتار بھی ہونا چاہیئے۔ مسافر اور مضافاتی مسافر چاہتے ہیں کہ بھیڑ بھاڑ کم سے کم ہو اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں ریل گاڑیاں چلائی جانی چاہیں۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے بہت سے ... چاہتے ہیں کہ ان شہروں کے اطراف مسافروں کے لیے مضافاتی ریل گاڑیاں چلائی جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مسافروں کے لیے زیادہ تر خدمات ریلوے نے فراہم کی ہیں اور اب بھی وہ کافی مالی نقصان اٹھا کر یہ خدمات فراہم کر رہی ہیں۔

بھارت ایک وسیع ترین ملک ہے اور ریلوے کو نہ صرف مسافروں کی آمد و رفت کے لیے خدمات فراہم کرنی ہیں بلکہ مال کی نقل و حمل کے سلسلے میں زیادہ ضروری اور اہم کردار بھی ادا کرنا ہے۔ حالانکہ ریلوے عوام کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف نئی خدمات فراہم کرتی رہی ہے لیکن اب ایک ایسا وقت آگیا ہے، جب ریلوے کے لیے اپنے مالی استحکام کو بہت ہی شدید طور سے متاثر کئے بغیر، مسافر خدمات کی توسیع کرنا دائماً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم امر ملک کی مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ قومی مفاد میں اور ریل مسافروں کے مفاد میں یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ آبادی میں اضافے کی روک تھام کی جائے کیونکہ موجودہ شرح اضافہ کے لحاظ سے آبادی کی تخمینہ شدہ ضروریات کو پورا کرنا ریلوے نظام کی صلاحیت سے باہر ہو جائے گا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں بھارتی ریلویز کو اپنی مسافر خدمات کے سلسلے میں ۱۰۰۸ کروڑ روپے کا خسارہ ہوا ہے۔

بھارتی ریلویز پر سماجی بوجھ نہ صرف رعایتی مسافر ٹریفک کے سلسلے میں، بلکہ اناج، کیمیاوی کھادوں وغیرہ جیسی بڑی تعداد میں ضروری اشیاء کے سلسلے میں بھی ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران ریلویز کو ان اشیاء کی نقل و حمل کے سلسلے میں ۴۱۹ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے۔

ریلوے کو درپیش ایک اہم مسئلہ ۱۲۰ بے منافع برانچ لائنوں کا ہے۔ ان میں سے بیشتر لائنیں قطعی بے منافع ہو کر رہ گئی ہیں اور ریلوے اصلاحاتی کمیٹی نے ۱۹۸۳ء میں اپنی رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ ریلوے کے نقصانات میں کمی لانے کے لیے ان لائنوں میں سے کم سے کم ۴۰ لائنیں بند کر کے اس سلسلے میں ایک شروعات کی جاسکتی ہے

اس کے علاوہ موجودہ مالی سال یعنی ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران ریلوے کے مالی بوجھ میں تقریباً ۵۴۰ کروڑ روپے کا مزید اضافہ ہوا ہے۔ مالی بوجھ میں یہ اضافہ ریاستی بجلی بورڈ کے ذریعہ بجلی کی شرحوں میں کافی اضافے، ڈیزل تیل کی قیمتوں میں اضافے، فولاد کی قیمتوں میں اضافے، کیمیاوی کھادوں پر امداد کا سلسلہ ختم کرنے کے سبب مال بھاڑے کی آمدنی میں زیادہ خسارے کی وجہ سے ہوا ہے۔

ہمارے اس وسیع ترین ترقی پذیر ملک کے ریلوے نظام کو ملک کے مختلف شعبوں میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ ملک بھر میں عوام کو بجلی، اناج، کیمیاوی کھادوں، سیمنٹ، فولاد اور پیٹرولیم کی ضرورت ہے لیکن ان اشیاء کی دستیابی وسیع پیمانے پر نہیں ہے۔ چنانچہ ملک کو خوش حال بنانے کے لیے، ریلویز کو کوئلے، خام لوہے، چونے کے پتھر، پینتھا جیسے بڑے پیمانے پر خام مال اور فولاد، سیمنٹ، کیمیاوی کھادوں، پیٹرولیم مصنوعات جیسی تیار مصنوعات کی نقل و حمل کا ابتدائی بوجھ برداشت کرنا ہے۔

ریلوے کے مرکزی وزیر۔

ریلوے کے پاس بڑے پیمانے پر بھاری اشیاء کی نقل و حمل کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ہمیں اپنی ضروریات کے لیے زیادہ تر پٹرولیم کی مصنوعات کی درآمدات پر انحصار کرنا ہے اور غیر ملکی زر مبادلہ کی کمی ہے۔ چنانچہ ہمیں تیل کے ہر ایک قطرے کا استعمال کرنا ہے کیونکہ یہ ہمارے لیے واقعتاً کالا سونا ہے۔ اگر ریلوے بڑے پیمانے پر بھاری اشیاء کی نقل و حمل نہیں کر سکتا تو سڑکوں کے ذریعے ان اشیاء کی نقل و حمل کے لیے درکار غیر ملکی زر مبادلہ کی رقم بہت زیادہ ہو جائے گی اور رفاہ عام کے لیے سڑک ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنا ناممکن ہو گا۔ ریل ٹرانسپورٹ میں خاص طور سے درمیانہ اور لمبے فاصلے پر توانائی کا کہیں زیادہ کفایتی اور موثر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں ایک مکمل طور سے ترقی یافتہ ریل ٹرانسپورٹ نظام کی ضرورت کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت حال ریلوے نظام کے مالی استحکام کی بھی ہے جو مال کی نقل و حمل کی مانگ پوری کر رہا ہے۔

ملک کو درپیش اقتصادی مسائل کی بڑی وجوہات میں سے ایک وجہ سرکاری شعبے کی غیر اطمینان بخش مالی کارکردگی رہی ہے۔ نئی اقتصادی پالیسی کا خاص زور سرکاری شعبے کی تنظیم نو پر رہا ہے تاکہ اس کو نظریاتی اور عملی لحاظ سے کارگر بنایا جائے۔ اس سیاق و سباق میں بھارتی ریلوے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کرائے بھاڑے سے متعلق اپنی پالیسی کے سلسلے میں ماضی سے قطع تعلق کرلے۔ حکومت نے ریلوے کرائے اور مال بھاڑے کے بارے میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی قائم کی ہے۔ کمیٹی کی سفارشات کا انتظار ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کچھ فوری اقدامات کئے جائیں تاکہ ریلوے کا اہم بنیادی ڈھانچہ مالی طور سے مستحکم رہے۔ نظام کی ترقی، جدید کاری

اور احیاء کے لئے یہ کافی وسائل پیدا کرے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کمی کی صورت حال میں ترجیحات کو از سر نو وضع کرنا ہوگا۔ چنانچہ یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہمیں سب سے پہلے غلے، اناج، کیمیاوی کھادوں اور سیمنٹ جیسی ضروری اشیاء کی اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اشیاء کی نقل و حمل کے لیے ہمارے پاس ریل گاڑیوں کو چھوڑ کر بہت ہی محدود ذرائع ہیں۔ چنانچہ اس بات کو یقینی بنانا ہمارے قومی مفاد میں ہے کہ ان ضروری اشیاء کی نقل و حمل کسی بھی قیمت پر متاثر نہیں ہونے پائے۔ ●

بقیہ: کوڑھ کے علاج کی کوششیں

باقی دس ہزار روپے اس ادارے میں جو اس طرح کے لوگوں کی تربیت کرتا ہے۔

بعد کے پروگرام

انسداد کوڑھ کے پروگرام سے وابستہ السیکارنال۔ میڈیکل سپروائزر اور ہیلتھ ایجوکیٹر دیہات میں اپنے دوروں کے دوران ایسے لوگوں پر نظر رکھتے ہیں جو تربیت کے دوران اور اس کے بعد اپنے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس تربیتی پروگرام میں دیہات کے رہنماؤں کو بھی جوڑا گیا ہے۔ تربیت پانے والوں کی کارگذاری کی وقتاً فوقتاً جانچ کی جاتی ہے۔ اور جہاں ضروری ہوتا ہے وہاں اصلاحی اقدامات کئے جاتے ہیں۔ ایک سال کے بعد کشتھ نوارن سنگھ حتمی طور پر جائزہ لیتا ہے اور یہ جانچتا ہے کہ صحت یافتہ مریض تربیت پانے کے بعد کس طرح اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ یہ سنگھ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان کی آمدنی میں کس طرح مرحلہ وار اضافہ ہو رہا ہے اور سماج

پر کیسے میں ان کا مرتبہ کس طرح سے بحال ہو سکتا ہے۔

دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام اور ڈی آر آئی کے تحت تربیت یافتہ مریضوں کو کام شروع کرنے کے لیے بینک سے مدد دی جاتی ہے تاکہ وہ اس رقم سے ضروری سامان فراہم کر سکیں۔ یہ بھی خیال ہے کہ تربیت پانے والے افراد کے ساتھ وقتاً فوقتاً میٹنگ ہوتی رہے اور ان کی مشکلات کا اندازہ لگایا جاتا رہے نیز مشکلات دور کرنے اور ان پر قابو پانے کی تدابیر کی کھوج کی جاتی ہے۔

اب تک کے تجربے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کوڑھ کے مریضوں کی سماجی حالت سے یہ لوگ سماج میں الگ تھلگ ہوتے ہیں۔

ا۔ ۔ ۔ ک ا

کو لگایا جائے، اس کے لیے مقامی دستکاروں اور صناعوں کی نشاندہی کرکے ان کو تربیت دینے کے کام پر لگایا گیا۔ اس کام میں آنگن واڑی ورکروں اور صحت کی دیکھ بھال کے میدانی عملے کو بھی لگایا جائے گا۔ یہ عملہ مقامی وسائل کے طور پر کام دے گا اور ایسے لوگوں کی نشاندہی کرے گا جو اس پروگرام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ●

بقیہ: باربردار جانور: غیر رسمی توانائی کا اہم وسیلہ

وہ دن دور نہیں جب بھارت خوش حالی اور ترقی کے ایک نئے دور میں قدم رکھے گا جہاں دیہی علاقوں میں بھی مزید آسانیاں ہوں گی اور عام کاشتکار کا معیار زندگی اور زیادہ بہتر اور بلند ہو گا۔ ●

تبصرہ

نام کتاب : ہندوستانی اقتصادی مسائل
مصنف : سید ساجد علی توکل
قیمت : پچاس روپے
صفحات : ۱۵۲
ناشر : سید ساجد علی ۔ بیا محلہ دہلی ۶

یہ کتاب پہلی بار دسمبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اس کے بعد جنوری دسمبر ۱۹۹۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس موضوع پر کتابوں کی کتنی مانگ ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو کو ادب اور شعر و شاعری کی زبان ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ تکنیکی، سائنسی، مالی موضوعات پر بہت ہی کم بلکہ شاذ و نادر ہی کوئی کتاب دیکھنے کو آتی ہے۔ طلباء سائنس، ٹکنالوجی اور ماحولیات کے موضوعات کے لیے عام طور پر انگریزی کتابوں کا ہی مطالعہ کرتے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام فہم اردو زبان میں ان موضوعات پر کتابیں ہی دستیاب نہیں ہیں۔ اگر کچھ لکھی بھی جاتی ہیں تو ان میں انگریزی الفاظ کی اور غیر ملکی اصطلاحات کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ طالب علم بھی بہتر خیال کرتا ہے کہ ان موضوعات کا مطالعہ انگریزی زبان میں ہی کر لیا جائے۔

اس لحاظ سے مصنف کی کاوش قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ہندوستانی اقتصادیات کے مسائل کو غیر ملکی اصطلاحات میں الجھائے بغیر عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر اُن طالب علموں اور ریسرچ کے لیے بہت مفید ہے جو ان موضوعات کا مطالعہ شروع کر رہے ہوں۔ اس موضوع پر جس کسی کو بھی ہو جاتا ہے اور مسئلہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آتی۔ کتاب میں ملک کی اقتصادیات کے قریب میں مسائل پر مفید معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ خاص طور پر رولنگ بلاں اور الفلیشن جیسی بہت سی اصطلاحات کی تشریح بہت عمدہ انداز میں کی گئی جس سے قاری کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

کتاب کی کتابت اور چھپائی اچھی ہے اردو میں ان موضوعات پر اس قسم کی کم قیمت کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ کتاب میں نہ صرف کارخانہ داروں، مزدوروں، پیداوار اور کھیت اور صارفین کے مسائل ہی زیر بحث لائے گئے ہیں بلکہ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کو ایک ہی وقت کے جو مسائل پیش آ رہے ہیں وہ بھی بہت خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں۔

(م۔ک۔ مہتاب)

جوابات ۔ کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ارسطو ۲۔ کوچین۔
۳۔ ۱۸۰،۱۹ کروڑ روپے۔
۴۔ یکم دسمبر کو۔
۵۔ موڑہ اسٹشن۔ ۶۔ لوک سبھا کا اسپیکر۔
۷۔ ۸ (آٹھ) منٹ۔
۸۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبران
۹۔ اسپیشل اسٹیٹس آف سکم۔
۱۰ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس
۱۱ ابراہیم ذکی۔ ۱۲ عراق۔
۱۳۔ ۱۹۹۰ء کو۔ ۱۴۔ ۸۸۴۸ میٹر۔
۱۵۔ این فلیمنگ (IAN Fleming)
۱۶۔ راجندر پرشاد۔ ۱۷۔ وی۔پی۔ سنگھ۔
۱۸۔ گجرات، مدھیہ پردیش، بنگال اور بہار۔
۱۹۔ فو دورجی (Phu Dorjee)
۲۰۔ دہلی اور امرتسر۔
۲۱۔ اینجلس (Angels)
۲۲۔ فیدو میٹر (Fatho meter)
۲۳ ایم سری لیکھا (M.Sri Lekha) جس کی عمر صرف بارہ سال ہے اور جس نے ایک تیلگو فلم کے لیے موسیقی دی ہے۔
۲۴۔ مہاتما گاندھی کا "ڈنڈی مارچ"۔
۲۵ ہیروشی ناکاجیما (Hiroshi Nakajima)
۲۶۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔
۲۷۔ سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد۔
۲۸۔ لائف لائن ایکسپریس (Lifeline Express)
۲۹۔ ۱۱۱۸ (اٹھارہ) ۳۰۔ سوامی دویکانند۔
۳۱۔ علاؤالدین خلجی۔
۳۲۔ وٹامن۔بی (Vitamine-B)
۳۳۔ ۱۴۹۸ء میں۔ ۳۴۔ ۱۶۰۰ء میں
۳۵ خود میر تقی میر نے
۳۶۔ الطاف حسین حالی نے۔
۳۷۔ ۱۵۲۶ء میں۔
۳۸۔ ہائیڈرو فوبیا (Hydrophobia)
۳۹۔ سجاد حیدر یلدرم۔
۴۰۔ بان بھٹ (Bana Bhatt) ●

بقیہ: آپ سب کے لیے

طور پر ہاؤزنگ اور شہری بنیادی ڈھانچے کی اسکیموں کے قرضوں کے لیے ہے جو حکومت کے ذریعہ منظور شدہ رہنما خطوط کے تحت دیے جائیں گے۔ •

پیشہ ورانہ سلامتی اور صحت کے موضوع پر تیرہویں عالمی کانگریس کا افتتاح

پیشہ ورانہ سلامتی اور صحت کے موضوع پر منعقدہ ۱۳ویں عالمی کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے کل یہاں نائب صدر جمہوریہ شری کے۔ آر۔ نارائنن نے کہا کہ کارکن کی پیشہ ورانہ سلامتی اور صحت وسیع معنوں میں اہمیت دیے جانے کا موضوع ہے کیوں کہ اقتصادی آزادی کے موجودہ دور میں مزدوروں کی بہبود کا پہلو خاصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ٹکنالوجی ترقی کی پوشیدہ کیفیت کے پیش نظر جس کے متعلق کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی، ہمیں ٹکنالوجیوں کی ان تبدیلیوں سے خبردار رہنا ہوگا جو کارکنان، عوام اور ماحولیات پر برعکس طور پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ جدید ترین مشینری اور عمل کے ساتھ جو کام کرنے کی جگہ پر لگائی جا رہی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ قابل بھروسہ سلامتی اور صحت سے متعلق آلات اور طریقوں میں اضافہ لانے کی ضرورت ہے۔ •

خوراک کی ڈبہ بندی کی صنعتوں پر قومی مذاکرہ

حکومت نے ملک میں خوراک کی ڈبہ بندی کے شعبے کے فروغ کے لیے متعدد اسکیمیں وضع کی ہیں۔ دیہی علاقوں میں اس صنعت کی بنیاد کو وسیع کرنے کے لیے کچھ خصوصی اسکیمیں بھی وضع کی گئی ہیں۔ ان کوششوں سے ان علاقوں میں اقتصادی ترقی کو جلا حاصل ہوگی کیوں کہ ہمارے ۷۰ فیصد عوام دیہی علاقوں میں بستے ہیں اور زرعی بنیاد والی سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار خوراک کی ڈبہ بندی کی صنعت کے وزیر مملکت شری ترون گوگوئی نے خوراک کی ڈبہ بندی کی صنعتوں پر منعقدہ ایک سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا ہے۔ اس مذاکرے کا اہتمام چھوٹے اور اوسط درجے کی صنعتی اکائیوں کی عالمی اسمبلی نے کل ہند خوراک محفوظ کاروں کی ایسوسی ایشن کے تعاون و اشتراک سے کیا ہے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ حکومت نے صنعت کو مالی ترغیبات سمیت مختلف النوع ترغیبات فراہم کی ہیں۔ حکومت جدید ڈبہ بندی پلانٹ لگانے کے لیے سود پر اکوئٹی اور ... بھی فراہم کر رہی ہے۔ •

ہندی یونیورسٹی کمیٹی کی رپورٹ

تعلیم و ثقافت کی نائب وزیر شیلجا نے ہندی شکشا سمیتی کی ۲۰ ویں میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی کی رپورٹ جلد متوقع ہے۔ مجوزہ بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی کے قیام کے لیے مقام کا انتخاب کرنے اور اس کی مالی توضیحات کے لیے گزشتہ برس جون میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔

کماری شیلجا نے بتایا کہ حکومت آٹھویں منصوبے کے دوران ہندی زبان کو فروغ دینے کے لیے ۲۶،۳۴ کروڑ روپے کی رقم خرچ کرے گی جب کہ ساتویں منصوبے میں ۲۶،۹۳ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی تھی۔

کماری شیلجا نے ابتدائی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک تعلیم میں ہندی زبان کے استعمال میں ہونے والی پیش رفت پر اطمینان کا اظہار کیا۔

ہندی شکشا سمیتی ہندی کو فروغ دینے کے لیے پالیسی رہنما خطوط وضع کرنے میں حکومت کو مشورہ دیتی ہے۔ اراکین پارلیمنٹ، ممتاز اسکالر اور رضاکار تنظیموں کے نمائندے اس سمیتی کے رکن ہیں۔

میٹنگ میں شرکت کرنے والے اراکین نے ہندی کے فروغ کی حوصلہ افزائی کے لیے مزید لغات سمیت اور اقدامات کرنے کا مشورہ دیا۔ •

بچوں کو بازآبادکاری امداد

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا قومی فاؤنڈیشن (این۔ ایف۔ سی۔ ایچ) نے ایسے دیگر ۲۹ بچوں کا انتخاب کیا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہوئے ہیں اور جنھیں مالی امداد دی جانی ہے۔

واقعات سے جنت فسادات رونما ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی این ایف سی ایچ سے بازآبادکاری کے لیے دی جانے والی امداد حاصل کرنے والے بچوں کی کل تعداد ۱۲۵ ہو جائے گی۔

مذکورہ ادارے کا قیام سوسائیٹیوں کے رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت عمل میں آیا ہے اور ادارہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر بچوں کو بازآبادکاری کے لیے مالی امداد دینے کا کام کرتا رہا ہے۔ •

توحید خان

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ کس نے کہا ہے کہ "انسان فطرتاً ایک سیاسی جاندار (Man is by nature a political animal) ہے"؟

۲۔ ہندوستان میں پہلا تتلیوں کا پارک (Butterfly Park) کس جگہ بنانے کا منصوبہ ہے؟

۳۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں دفاع (Defence) کی مد میں کتنی رقم مختص کی گئی ہے؟

۴۔ "عالمی یوم ایڈس" (World AIDS day) کب منایا جاتا ہے؟

۵۔ ہندوستان کے سب سے بڑے ریلوے اسٹیشن کا نام بتائیے؟

۶۔ لوک سبھا کے سیکریٹری جنرل کا تقرر کون کرتا ہے؟

۷۔ سورج سے زمین پر روشنی کے پہنچنے میں تقریباً کیا وقت لگتا ہے؟

۸۔ راجیہ سبھا کے چیرمین کا انتخاب کون کرتا ہے؟

۹۔ ہندوستانی آئین کا دسواں شیڈول (10th Schedule) کس بات کی وضاحت کرتا ہے؟

۱۰۔ جب کسی ریاست کا گورنر استعفیٰ دے دیتا ہے یا مر جاتا ہے تو نئے گورنر کے تقرر تک اس کے فرائض کون نبھاتا ہے؟

۱۱۔ سارک (SAARC) کا سیکریٹری جنرل کون ہے؟

۱۲۔ کس ملک کو پہلے میسوپوٹامیہ (Meso-potamia) کہا جاتا تھا؟

۱۳۔ اقوام متحدہ نے کس سال کو بین اقوامی خواندگی سال (International Literacy Year) کے طور پر منایا تھا؟

۱۴۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی کیا ہے؟ (میٹر میں)۔

۱۵۔ کردار "جیمس باؤنڈ" (James Bond) کا خالق کون ہے؟

۱۶۔ کتاب "انڈیا ڈیوائیڈیڈ" (India devided) کے مصنف کا نام بتائیے؟

۱۷۔ ہندوستان کے اس وزیر اعظم کا نام بتائیے جسے لوک سبھا میں اعتماد کا ووٹ کھو دینے کے سبب استعفیٰ دینا پڑا تھا؟

۱۸۔ ہندوستان کی کتنی ریاستوں سے "ٹراپک آف کینسر" (Tropic of Cancer) گذرتی ہے؟

۱۹۔ ہندوستان کے اس پہلے آدمی کا نام بتائیے جس نے بغیر آکسیجن سیلنڈر کے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کی؟

۲۰۔ ہندوستان کا "نیشنل ہائی وے نمبر ا" (National Highway No. I) کن دو شہروں کے بیچ ہے؟

۲۱۔ کمیونسٹ مینوفسٹو (Communist Manifesto) لکھنے میں کارل مارکس (Marx) کے علاوہ اور کون شامل تھا؟

۲۲۔ بحر اعظم (Ocean) کی گہرائی ناپنے والے آلے کو کیا کہتے ہیں؟

۲۳۔ ہندوستان کے سب سے کم عمر موسیقی کار (Music Director) کا نام بتائیے؟

۲۴۔ ۶ر اپریل ۱۹۳۰ء ہندوستانی تاریخ میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟

۲۵۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W.H.O.) کے ڈائریکٹر جنرل کون ہیں؟

۲۶۔ سر سید احمد خاں کی تاریخ پیدائش بتلائیے؟

۲۷۔ اردو کے مشہور ادیب مہدی حسن نے اردو

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

نئی دھلی

یوجنا

جلد، ۱۲ شمارہ، ۵ - ٦

یکم تا ۳۰ جون ۱۹۹۳ء ۱۱ جیٹھ تا ۹ آساڑھ شک ۱۹۱۵

قیمت : ۳ روپے ٹیلی فون ۶۰۱۸۱۸

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر : توحید خان

معاون : وسیم حیدر

کتابت : سجاد علی خاں

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی : ۳ روپے۔
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ :۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴
لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)، نئی دلی ۱۱۰۰۶۶۔

پروڈکشن آفیسر : سدرشن موھن چھل

ترسیل زر کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اِس شمارے میں

م۔ک۔ مہتاب

صارفین کے حقوق کا تحفّظ

ہمارے ملک میں ہر سال صارفین کے حقوق کے تحفّظ کا دن ۱۵ مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اس برس بھی یہ دن منایا گیا جس میں خاص طور پر دیہی علاقوں میں جہاں تعلیم کم ہے شکایات کے ازالے کے ذرائع اور بھی کم ہیں اور جہاں بدعنوان تاجر اور صنعت کار کوالٹی اور قیمتوں پر دو لحاظ سے عوام کا استحصال کرتے ہیں عوام کو اُن کے حقوق سے آگاہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت جیسے ملک میں جہاں آبادی بہت زیادہ ہے اور اشیاء و خدمات کی فراہمی ضرورت سے کہیں کم ہے کھپت کاروں یا صارفین کا استحصال روکنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ اسی لیے زمانہ ماضی سے یہاں ایک محاورہ ہر بازار میں مستعمل ہے کہ صارمس ہشیار باش" یعنی خریدار کو ہوشیار رہنا چاہیے۔ مال یا خدمت مہیا کرنے والا اُسے ٹھگنے یا لوٹنے کی کوشش کرے گا اُس پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پوری ذمّہ داری خریدار کی ہی ہے

یہ خرابی بھارت میں ہی نہیں دنیا کے بہت سے ممالک میں بھی قدیم ادوار سے چلی آرہی ہے۔ اُن کے حقوق کے تحفظ کے لیے کبھی منظم پیمانے پر کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ پہلا ملک تھا جہاں ۱۹۵۰ء کے دہے میں صارفین کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک قانون بنایا گیا۔ اس تحریک نے امریکہ میں بھی زور پکڑا اور صدر جان ایف کینیڈی نے صارفین کے کچھ حقوق کے تحفّظ کے لیے ایک خصوصی پیغام امریکی کانگرس کو ارسال کیا۔ صارفین کی بین الاقوامی یونین نے ان حقوق میں تین اور حقوق کا اضافہ کیا جنھیں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ اب اس منشور کے مطابق ایک کھپت کار کو سلامتی، اطلاعات، انتخاب کرنے، شنوائی، شکایت کا ازالہ کرانے، مال اور خدمات کے بارے میں آگاہی دئے جانے اور صحت مند ماحول حاصل کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔

بھارت میں صارفین کے تحفّظ کی تحریک کی بہت کم عمر ہے، ایسا نہیں ہے کہ منظم تحریک شروع ہونے یا ایک جامع قانون بنائے جانے سے پہلے بھارت میں صارفین کے تحفّظ کے لیے کوئی قانون نہیں تھا۔ یہاں خوراک اور ادویہ میں ملاوٹ کی روک تھام، ناپ تول کے پیمانوں کا قانون اور اشیائے ضروریہ جیسے قوانین موجود تھے لیکن اُن کے تحت اوّل تو سزائیں ناکافی تھیں دوسرے تاجر اور صنعت کار قانونی طویل چکر میں اپنی دولت کا استعمال کر کے سزاؤں سے بچ نکلتے تھے، صارفین کے لیے نہ تو جلد انصاف مفید تھا نہ معاوضہ اور نہ ہی صارف کے بس کی بات تھی کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکے۔

۱۹۸۶ء کا قانون

اقوام متحدہ کے منشور اور بھارت میں صارفین کے تحفّظ کی ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ۱۹۸۶ء میں ایک جامع اور مربوط کوشش اس ضمن میں کی گئی۔ اس برس صارفین کے تحفّظ کا جو قانون بنایا گیا اُس میں پہلی بار شکایات کے ازالے کا ادارہ جاتی اہتمام کیا گیا جس کے تحت کوئی بھی کھپت کار جو یہ محسوس کرے کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور بنا کوئی خرچ کیے یا محض ایک کاغذ پر درخواست لکھ کر ایک معین وقت کے اندر اندر انصاف ہی نہیں معاوضہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ قانون بنانے کے بعد بھارت کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں صارفین کے حقوق کا سب سے تیز رفتار اور سب سے کم خرچ کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔

۱۹۸۶ء کے تحفّظ حقوق صارفین کے مطابق ضلع، ریاست اور مرکز کی سطح پر شکایات کے ازالہ کے لیے تین مدارج کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس اہتمام کے تحت ہر ضلع میں شکایات سننے والے فورم قائم کئے جا رہے ہیں۔ جہاں کسی طرح کا نقصان بھی اٹھانے

والا صارف ایک سادہ کاغذ پر درخواست لکھ کر انصاف حاصل کرسکتا ہے۔ ضلع کی سطح کے فورم ایسے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں جہاں مال یا خدمت کی قیمت اور معاوضے کے دعویٰ کی رقم ایک لاکھ روپے سے کم ہو۔

ریاست کی سطح پر کمیشن قائم کیے گئے ہیں جو ضلع فورم کے فیصلوں پر اپیل بھی سُنتے ہیں اور ایک سے دس لاکھ روپے کی مالیت کے سامان یا معاوضے کے دعووں کا فیصلہ بھی کرتے ہیں۔ یہ دعوے یا درخواستیں بھی سادہ کاغذ پر بنا کسی وکیل کی امداد کے دی جاسکتی ہیں اگر سامان یا خدمتوں کی مالیت دس لاکھ روپے سے زیادہ ہو تو قومی کمیشن میں یہ درخواست دی جاسکتی ہے۔ قومی کمیشن ریاستی کمیشن کے فیصلوں کی اپیل بھی سُنتا ہے۔ فورم اور ریاستی و قومی کمیشنوں کے ارکان میں ایک قانون رُکن کی موجودگی لازم قرار دی گئی۔

ان تینوں مدارج کی کارکردگی میں ضابطے کی نوعیت کی بعض خامیاں دیکھنے میں آئیں جو حقیقی رکاوٹیں تھیں جنھیں بعد ازاں قانون کے ذریعہ دور کردیا گیا۔

عمل درآمد

یہ قانون یکم جولائی ۱۹۸۷ء سے ملک بھر میں نافذ ہو چکا ہے۔ کُل ملا کر ۲۷ ریاستی کمیشنوں اور ۳۶۰ ضلع فورموں نے کام شروع کردیا ہے۔ ریاستی کمیشنوں کے پاس ۲۸۵۲ شکایات درج کرائی گئیں جن میں سے ۱۷۴۳ کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ ضلع فورموں میں قریب ۴۹ ہزار شکایات درج کرائی گئیں جن میں سے ۲۴۸۴۸ شکایات کا فیصلہ کردیا گیا ہے۔ بہت سی شکایات ریل، فون اور ڈاک محکمہ کے حکام کے خلاف بھی درج کرائی گئیں۔ بہت سے حالات میں اُن سے معاوضہ بھی دلایا گیا ہے۔

مرکزی حکومت نے صارفین کے تحفظ کی ایک مرکزی کونسل بھی قائم کی ہے جس کی کئی میٹنگیں ہو چکی ہیں۔ جہاں مختلف موضوعات اور مختلف نوعیت کے سامان اور خدمتوں میں معیاروں کو نافذ کرنے اور عوام کو استحصال سے بچانے کی سفارشات کی گئی ہیں۔ حکومت پر یہ بھی زور دیا گیا ہے کہ صارفین کو گمراہ کُن اشتہار بازی سے بچایا جائے۔ انھیں سفارشات کی بنا پر حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اشیاء اور سامان پر قیمتوں کا اندراج ضروری ہوگا اور اس قیمت میں ہر قسم کا ٹیکس شامل ہونا چاہیئے۔

صارفین کے حقوق کا تحفظ کرنے والی انجمنوں اور رضا کار اداروں کو مرکزی سرکار کی طرف سے مالی امداد بھی دی جارہی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ حد ۲۵ ہزار روپے ...
گئی ہے۔ صارفین کے تحفظ کی تحر...
خاص طور پر طلباء کی حوصلہ افزائی ...
اعزاز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ صارف...
کے لیے حال ہی میں شہری رسدات ...
نے ایک ماہنامہ بھی ہندی میں شروع کیا ہے

سیکریٹریوں کی کمیٹی کی سفارش پر صارفین کے امور کے بارے میں ایک چھوٹا ڈائرکٹوریٹ بھی قائم کیا جارہا ہے۔ فورمز اور ریاستی و مرکزی کمیشنوں کے ارکان کے قانون اور ضابطوں کی خاطر خواہ تربیت و آگاہی کے لیے تربیتی پروگرام بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

فورمز نے جن شکایات کے فیصلے کیے ہیں اُن میں سے ۸۲ فی صد فیصلے صارفین کے حق میں ہوئے ہیں۔ ریاستی کمیشنوں نے جو فیصلے کیے ہیں اُن میں سے ۶۳ فی صد فیصلے صارفین کے حق میں ہوئے ہیں۔

چونکہ صارفین کے تحفظ کا قانون اپنی نوعیت کا واحد قانون ہے لہٰذا نہ تو یہ خامیوں سے پاک کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی ضروری ہے کہ وہ ہر شکایت کا ازالہ کرسکے۔ لہٰذا قانون کی کارکردگی کا جائزہ لے کر خامیوں کو دُور کرنے کی غرض سے ایک عاملہ جماعت قائم کی گئی جس نے دُور رس نوعیت کی سفارشات پیش کی ہیں۔ سفارشات میں اشیاء اور خدمتوں کے معیار اور احتزار کے بارے میں قانون کے دائرہ کار میں توسیع کے لیے کہا گیا ہے۔ ان سفارشات پر حال ہی میں ریاستوں کے وزراء خوراک کی ایک میٹنگ میں غور کیا گیا۔ صارفین کے تحفظ کی مرکزی کونسل جس کے صدر پردھان منتری ہیں، ان سفارشات پر غور کرنے کے بعد ایسی سفارشات کرے گی جس کی روشنی میں ۱۹۸۶ء کے قانون میں مناسب ترامیم کی جائیں گی۔

بھارت میں صارفین [illegible]

سے فوائد سے محروم ہیں۔ کروڑوں افراد کی آبادی کو تاجروں اور بدعنوان صنعت کاروں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رکھنا اتنا بڑا کام ہے کہ وہ صرف حکومت کی کوششوں سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ عوام، رضا کار تنظیموں، دیہات کی پنچایتوں اور دیہات میں کام کرنے والے سرکاری کارخانوں کو اس کام میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔

منافع اور اس سے بھی زیادہ منافع کمانے کی دُھن اور ماحول صارفین کے حقوق کی پامالی کا سبب ہے۔ یہاں تک کہ طب اور تعلیم کے پیشے میں بھی اس رجحان نے متوسط اور سماج کے نچلے طبقے کے لیے زندگی دُشوار کردی ہے۔ اس لیے صارفین کے تحفظ کا مسئلہ ایک اہم سماجی و معاشی مسئلہ بن چکا ہے جس کا

(باقی صفحہ ۱ پر)

ڈاکٹر اے۔ کے سرکار

انفرادی سرمایہ کاری کا نظام

سرمایہ کاری کرنے والوں کے پاس سرمایہ تو محدود ہوتا ہے جب کہ بازار میں حصص لامحدود ہوتے ہیں لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ احتیاط سے کام لیا جائے۔ زیر نظر مضمون میں مصنف نے جو کہ مالی امور کے تجزیہ نگار ہیں۔ سرمایہ کاروں کے مفاد کے تحفظ کے لیے کچھ اہم باتوں اور عام غلطیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

ہندوستانی سرمایہ بازار یونہی لگانے والوں کو زبردست مواقع مہیا کرتا ہے جب کہ حصص بازار اس میدان میں نئے داخل ہونے والوں کے لیے ثانوی منڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستانی سرمایہ بازار جس طرح فروغ پا رہا ہے مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۹۰-۹۱ء میں کمپنیوں نے بازار حصص سے ۴۲۰۰ کروڑ روپے حاصل کیے جب کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یہ رقم محض ۱۰۰ کروڑ روپے تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ رواں سال کے دوران یہ رقم ۱۰۰۰۰ کروڑ روپے سے بھی تجاوز کر جائے گی۔

ادارہ جاتی مالی اداروں کی طرف سے کمپنیوں کو فراہم کی گئی رقم بھی ۱۹۹۰-۹۱ء میں بڑھ کر ۱۹۹۱۷ کروڑ روپے ہو گئی جب کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ ۲۵۲۵ کروڑ روپے تھی۔ اسی طرح کمپنیوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۰-۸۱ء میں کمپنیوں کی تعداد محض ۲۵۰۰ تھی جو ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۶۵۰۰ ہو گئی۔ تسلیم شدہ کمپنیوں نے بازار حصص سے ۱۹۸۰ء میں صرف ۳۴۸۰ کروڑ روپے حاصل کیے تھے جب کہ ۱۹۹۰ء میں یہ سرمایہ ۵۵۴۰.۹ کروڑ روپے ہو گیا اور اس وقت یہ رقم تقریباً ۲۵۰۰۰ کروڑ روپے ہے۔ ۱۹۸۰ء میں یہ کمپنیاں روزانہ ۱۵ سے ۲۰ کروڑ روپے کا کاروبار کر رہی تھیں اور ۱۹۹۰-۹۱ء میں یہ لین دین ۳۰۰۰ کروڑ روپے تک جا پہنچا۔ سرکاری شعبے کے اداروں کے تمسکات کو شامل کر لیا جائے تو اس کاروبار کی مالیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ حصص بازار میں سرمایہ کرنے والوں کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت ان افراد کی تعداد دو کروڑ ہے جب کہ ایک دہے پہلے ان افراد کی تعداد صرف ۵۰ لاکھ تھی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ کاری کے لیے پیسہ لگانے کے زبردست مواقع موجود ہیں۔ سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھنے والے افراد بنیادی مارکیٹ یا ثانوی مارکیٹ یا پھر دونوں میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ کسی بھی سرمایہ کار کو پیسہ لگاتے وقت چار اہم مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی تحفظ، آمدنی، سیالیت اور مدت۔ مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری کرتے وقت پیسے کو جوکھم میں نہ ڈالنے اور تحفظ کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد پیسہ لگانے والوں کو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اُسے کچھ منافع بھی ہو یا پھر کم از کم اس کی رقم محفوظ ہو۔ بعض سرمایہ لگانے والے اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ تمسک کی واجب الادا ہونے کی مدت کتنی ہے۔

مصنف ایچ این۔ بی گڑھوال یونیورسٹی کے شعبۂ کامرس کے سربراہ ہیں۔ یوجنا، نئی دہلی

تحفظ

ایک سرمایہ کار پونجی لگاتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اپنے پیسے کو محفوظ کرنے کو دیتا ہے۔ جتنی رقم اس نے لگائی ہے اور اگر اس کی مالیت کم ہوتی ہے تو اس صورت میں سرمایہ کار سرمایہ کاری کے وسائل تلاش کرتے وقت اپنے پیسے کو محفوظ رکھنے کو سب سے زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ تاہم یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جتنا زیادہ جوکھم ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ منافع ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اگر خطرہ یا جوکھم کم ہے تو آمدنی یا منافع کا امکان بھی کم ہے تاہم پیسہ یقیناً محفوظ رہتا ہے۔

منافع یا آمدنی

ایک سرمایہ کار دوسرے جس اہم پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے وہ آمدنی یا منافع ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ آمدنی کا براہِ راست تعلق جوکھم سے ہے۔ سرمایہ پر منافع کا خیال کرتے وقت، خطرے، افراطِ زر کی شرح اور محصولات کے فائدے کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔

سیالیت

سیالیت یہ ایک اہم عنصر ہے کیوں کہ ہنگامی صورت حال میں فوری طور پر نقد رقم نہیں مل سکتی لہٰذا سرمایہ کار کو نسبتاً زیادہ شرح سود پر اس کو رقم لینی پڑتی ہے۔ املاک وغیرہ میں پیسہ لگانا کافی حد تک غیر یقینی رہتا ہے، جب کہ تمسکات یا بنکوں میں لگایا گیا پیسہ اور اس کی ادائیگی یقینی ہے۔

واجب الادائیگی کی مدت

سرمایہ کار اپنے منصوبے کے مطابق تقلیل یا طویل مدت کے لیے سرمایہ لگاتا ہے۔ ادائیگی کی مدت ۱۰ دن سے ۳ سال ۱۵ سال یا پھر اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس مدت کا انحصار سرمایہ لگانے والے کے منصوبے یا پھر خود اس کی ضروریات پر ہوتا ہے۔

ان تمام عوامل پر غور کرنے کے بعد ایک سرمایہ کار اپنے منصوبے کے مطابق سرمایہ کاری کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔ سرمایہ کاری کے وسائل لامحدود ہیں جب کہ سرمایہ محدود ہوتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ کار کو اس سلسلے میں اپنی صواب دید اور ضروریات کے مطابق حصص کی خریداری کے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

البتہ یہاں یہ ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ سرمایہ کار سرمایہ کاری کے ... کرتے وقت کچھ عام نوعیت ... کرتے ہیں۔ اس مضمون میں ا... دوسرے اہم عوامل کی طرف تو... کوشش کی گئی ہے تاکہ سرما... وقت انھیں ذہن میں رکھا جائے۔

سرمایہ کار عام طور پر سرمایہ کاری کرتے وقت مندرجہ ذیل غلطیاں کرتے ہیں۔

۱۔ سرمایہ کاری کے مقاصد کا فقدان

اکثر و بیشتر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ سرمایہ کار جب سرمایہ کاری کرتے ہیں کہ تو وہ اس بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ مجموعی طور پر کتنی رقم لگائیں۔ ان کے کیا مقاصد ہیں اور انھیں اس رقم سے کتنا منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ یہ حساب لگائیں کہ وہ کتنی رقم تک کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ اگر کسی سرمایہ کار نے یہ حساب نہ لگایا کہ وہ کتنی رقم کو خطرے میں ڈال رہا ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ حصص خریدنے میں غلطی کرے گا اور اس طرح اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اگر کوئی سرمایہ کار زیادہ منافع کمانا چاہتا ہے تو اُسے نسبتاً زیادہ رقم کی سرمایہ کاری کرنی چاہیئے اور اسی کے مطابق اُسے حصص خریدنے چاہئیں۔ لیکن عام طور پر صورت حال یہی ہے کہ سرمایہ کار حصص خریدنے، پیسہ جمع کرانے اور اپنی ضروریات کے مطابق منصوبہ سازی نہیں کر پاتے اور نہ ہی یہ فیصلہ کر پاتے ہیں کہ وہ اگر منصوبہ بند طریقے پر پونجی لگائیں تو اس سے ان کے منافع میں کس قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ آمدنی اور جوکھم میں تضاد

...م منافع ہوتا ہے۔ عام طور پر سرمایہ کار زیادہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے لیکن وہ منافع ضرور زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ رقم لگا کر جتنا منافع حاصل کرتے ہیں وہ عام طور پر ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہوتا

اسی طرح اگر کوئی شخص حصص وغیرہ کی خریداری کا اختیار کسی دوسرے ادارے یا شخص کو دے دیتا ہے اور خود زیادہ سرگرم نہیں رہتا تو وہ یقیناً اس شخص کے مقابلے میں کم منافع حاصل کرے گا جو خود سرگرم رہتا ہے۔

۳۔ سرمایہ کاری کا غیر متعدد فیصلہ

عام طور پر یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ سرمایہ کار بازار حصص کا مناسب اور موثر

جائزہ لیے بغیر حصص کی خریداری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ عام طور پر سرمایہ کار بازار حصص جاری کرنے والے کمپنی اخبارات اور رسالوں وغیرہ کے سرسری جائزے اور معلومات کی بنیاد پر حصص خریدنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

۴۔ غیر ضروری تنوع

دس پندرہ مختلف اثاثوں میں پیسہ لگاکر اچھا خاصا منافع کمایا جا سکتا ہے لیکن نفسیاتی اعتبار سے سرمایہ کار بہت سے حصص خرید کر خود کو مطمئن سمجھتا ہے۔ یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ ایک سرمایہ کار پندرہ سے زائد حصص خریدتا ہے۔ اتنا زیادہ حصص خریدنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کمپنیاں کم تعداد میں حصص جاری کرتی ہیں۔ بہت زیادہ تعداد میں حصص کے اجراء سے لاگت اور دوسرے اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے نیز اس صورت میں لین دین میں بھی دشواری ہوتی ہے۔

۵۔ بے موقع خریداری

حصص کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے اور کبھی بھی یہ اتار چڑھاؤ بڑی تیزی سے آتا ہے۔ اس اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہوئے سرمایہ کار یہ چاہتا ہے کہ وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع کمالے اور وہ ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے۔ جو لوگ اس داؤ پیچ میں رہتے ہیں انھیں وال اسٹریٹ کے اس محاورے کو یاد رکھنا چاہیئے کہ حصص بازار سے زید و بکر روپیہ بٹور سکتے ہیں لیکن یہ کام ایک احمق کے بس کا نہیں ہے۔ بہرحال جب تک ایک سرمایہ کار نہایت دور اندیشی اور دانشمندی سے بازار کے اتار چڑھاؤ رجحانات اور قیمت کو مد نظر رکھ کر اپنی صلاحیت اور مہارت کو بروئے کار نہیں لاتا تب تک وہ بازار حصص سے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں کر سکتا۔

۶۔ ناکافی نظر ثانی

بازار حصص میں تبدیلیاں آنے سے تمسکات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی فرق آتا ہے اور اس صورت میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک سرمایہ کار اپنے نظام پر نظر ثانی کرے۔ عام طور پر سرمایہ کار نظر ثانی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو وہ ناکافی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وقت کا نہ ہونا، لاگت اور نظر ثانی سے ناکافی فوائد حاصل ہونا ہیں۔ حصص بازار بڑا متحرک ہوتا ہے اور وہاں تیزی سے ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا نئے / تبدیل شدہ حالات میں سرمایہ کار کے نظام کو از سر نو ترتیب دینا یا پھر اس پر نظر ثانی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سرمایہ کاری کا بندوبست

مذکورہ بالا مضمون میں کچھ ایسی غلطیوں اور کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو عام طور پر ایک سرمایہ کار سے حصص خریدتے وقت سرزد ہوتی ہیں۔ ذیل میں اب کچھ اہم اشارے دیے جا رہے ہیں جو سرمایہ کار کے بندوبست اور نظام کو مؤثر اور منافع بخش طریقے پر چلانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک سرمایہ کار کو اپنے مقاصد واضح طور پر طے کرنے چاہئیں تاکہ اسی کے مطابق تمسکات کا تعین کیا جا سکے۔ جو بھی مقاصد ہوں ان میں رقم اور منافع کا ضرور تعین کیا جانا چاہیئے۔ اس بات کو بھی طے کر لینا چاہیئے کہ وہ کس حد تک اپنی رقم کو خطرے میں ڈال سکتا ہے اور وہ کس حد تک منافع چاہتا ہے نیز یہ کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے سرمایہ کاری کے بندوبست میں کس حد تک تگ و دو کر سکتا ہے۔ جب ایک بار سرمایہ کار یہ سب طے کر لے گا تو وہ تمسکات کے تعین اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوئی غلطی نہیں کرے گا اور اس کا جو فیصلہ ہوگا وہ بالکل درست ثابت ہوگا۔ اس سب کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ کار کے ذہن میں سرمایہ کاری کے واضح مقاصد ہونے چاہئیں۔

سرمایہ کاری کا فیصلہ محض سنی سنائی باتوں اور اہم عوامل کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جانا چاہیئے۔ حصص کی خریداری کا فیصلہ کرتے وقت متعلقہ کمپنی کے بنیادی اور تکنیکی عوامل کا بغور تنقیدی جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں برٹن جی مالکل کے مندرجہ ذیل رہنما اصول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(i) حصص کی خریداری صرف اُن ہی کمپنیوں کی کی جانی چاہیئے جو اپنی شرح ترقی کو اوسط سے زیادہ رکھ سکیں۔

(ii) محض اُن ہی کمپنیوں کے حصص کی خریداری کی جائے جن کی ساکھ اور بنیاد مضبوط ہو۔

(iii) اُن ہی کمپنیوں کے حصص خریدے جائیں جن کی نشوونما اور ترقی کے روشن و اطمینان بخش امکانات ہوں۔

حصص کی خریداری کی ابتدائی پیش کش پر غور کرتے وقت، بازار میں اس کی قدر و قیمت اور دوسری تمام شرائط پر غور کیا جائے۔ اس بات پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ کمپنی کتنے فی صد حصص عوام کو فروخت کر رہی ہے اور کتنا اس نے ترجیحی پیش کش کے لیے مخصوص کیا ہے۔

قابلِ تبدیل یا جزوی طور پر قابلِ تبدیل حصص، اور ان کی تبدیل شدہ قیمت پر توجہ دینی چاہیئے نیز یہ بھی مد نظر رکھا جائے کہ عوام کے لیے

اور پروموٹر (Promoter) کے لیے اس کی کیا قیمت ہے ۔ دونوں کی قیمت میں بہت زیادہ فرق تو نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو سرمایہ کار اسی کے مطابق اپنا فیصلہ کر سکتا ہے ۔

اسی طرح یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میوچول فنڈ اور مالی اداروں کے لیے مخصوص ترجیحی رقم بھی نگاہ میں رکھی جائے ۔ اگر مالی اداروں نے حصص کی خریداری سے اتفاق کر لیا ہے تو اس سے کمپنی کی ساکھ بڑھے گی اور اس طرح کی سرمایہ کاری ایک درست فیصلہ ثابت ہوگی ۔ اگر سرمایہ کاری کی کھلی پالیسی کے تحت کوئی غیر ملکی کسی کمپنی کے حصص خریدتی ہے تو یہ بھی اس کی ساکھ کا ایک پیمانہ ہوگا اور ایک سرمایہ کار کو ایسی کمپنی کے حصص ضرور خریدنے چاہئیں ۔

سرمایہ کاری کرتے وقت کسی بھی کمپنی کی گذشتہ حالت کا بغور جائزہ لیا جانا چاہیے ۔ اگر کوئی نئی کمپنی حصص جاری کر رہی ہے تو اس کمپنی کے خالص منافع، حصص پر آمدنی، اور کم از کم گذشتہ تین سال کے ڈیویڈنڈ کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے کیوں کہ جب کوئی کمپنی حصص جاری کرتی ہے تو مذکورہ بالا تفصیل ضرور دیتی ہے ۔ علاوہ ازیں کمپنی کی قلیل اور طویل مدتی مالی حالت کا جائزہ بھی لیا جانا چاہیے ۔

کسی ایک کمپنی کے حصص کا دوسری کمپنی سے مقابلہ کرتے وقت نہ صرف حصص کی قیمت کا بلکہ کاروبار، مقررہ صلاحیت منصوبے کی لاگت اور مجموعی سرمایہ کاری وغیرہ کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے ۔

کمپنی کے حصص خریدتے وقت اس بات کا پتہ لگانا بھی بہت ضروری ہے کہ کمپنی کا نظام کن کن افراد کے ہاتھ میں ہے ۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں کمپنی کا نظام ہوتا ہے وہ اسے ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ اگر ایسے لوگ کمپنی کی انتظامیہ میں شامل ہیں جو اپنے شعبے میں ماہر اور تجربے کار ہیں اور ان کی اپنی شہرت و ساکھ ہے تو اس طرح کی کمپنی میں سرمایہ لگانا یقیناً منافع بخش ثابت ہوگا ۔ اس سلسلہ میں نئی کمپنیوں میں پیسہ لگاتے وقت بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ ملتے جلتے نام والے افراد نئے سرمایہ کاروں کو راغب کرنے کی غرض سے انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔ اگرچہ ایسی کمپنیوں میں جو غیر روایتی شعبوں میں پیر جمانے کی کوشش کر رہی ہوں سرمایہ لگانا خطرے سے خالی نہیں تاہم جب مجموعی سرمایہ کاری کا جائزہ لیں گے تو یہ بھی منافع بخش ہی ثابت ہوگا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض غیر روایتی سرگرمیاں بے حد کامیاب ثابت ہوئی ہیں ۔

فنی ماہرین کی طرف سے قائم کی گئی کمپنیاں بھی کامیاب ثابت ہوئی ہیں ۔ ان ماہرین کی طرف سے قائم کی گئی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ روایتی شعبوں میں سرمایہ کاری کر... جہاں منافع کے امکانات بڑھتے ہیں وہیں خسارے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ آپ سارے انڈے ایک ہی مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے ۔ سرمایہ کاری کے متنوع نظام میں تمسکات کی تعداد دس پندرہ ہوتی ہے اس طرح نقصان کے امکانات کم ہو جاتے ہیں ۔ ایک سرمایہ کار کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ اپنے اثاثہ حصص کو دوگنا یا تین گنا کر دے تو اس کے نقصان کا خطرہ کم سے کم ہو جائے گا لہٰذا ایک سرمایہ کار کو اپنے نظام حصص کو پندرہ تک ہی محدود رکھنا چاہیے البتہ نقصان کے امکانات کو کم کرنے کے لیے اسے چھوٹی چھوٹی منڈیوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح فائدے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں ۔ علاوہ ازیں جب نظام حصص کو محدود کر دیا جائے گا تو اسی پر بہتر طور پر نگاہ رکھی جا سکے گی ۔

بجائے اس کے کہ ایک ہی کمپنی کے بہت سے حصص خریدے جائیں بہتر یہ ہے کہ مختلف کمپنیوں کے حصص خریدے جائیں اور یہ یقیناً زیادہ منافع بخش ثابت ہوں گے ۔ لہٰذا ایک سرمایہ کار محض حصص کی خریداری میں معمولی تنوع لا کر مطلوبہ فوائد حاصل کر سکتا ہے ۔

کمپنی کی ماضی کی کارکردگی اور اس کا نظام ہی ایسے اہم عوامل ہیں جو حصص خریداری کی بنیاد بنتے ہیں ۔ منصوبوں کی بروقت عمل آوری اور ان کی تکمیل کمپنی کی انتظامیہ کے باصلاحیت اور مستعد ہونے کا ثبوت ہے ۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ منصوبوں کی جدید کاری، ان...

... صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے ۔

سرمایہ کاری کے نظام میں مذکورہ بالا عوامل انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر غور کیے جانے کی ضرورت ہے ۔ ایک سرمایہ کار کو جلد بازی اور قلیل مدتی فائدوں کے چکر میں نہیں پڑ جانا چاہیے ۔ اپنی سرمایہ کاری کی تفصیل طے کرتے وقت کمپنی کی مصنوعات، ٹکنالوجی، منصوبوں کی پیش رفت اور انتظامیہ وغیرہ کا گہرائی سے تجزیہ کرنا چاہیے ۔ صنعت کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے ۔ کیوں کہ فروغ پاتی ہوئی صنعت میں پونجی لگانا زیادہ منافع بخش ہوتا ہے ۔ مختصر بات یہ ہے کہ تکنیکی اور بنیادی عوامل پر مناسب توجہ دی جانی چاہیے ۔ سرمایہ کاری کا مؤثر نظام یہی ہے کہ صحیح وقت پر صحیح تمسکات خریدی جائیں ۔ ●

عادل صدیقی

فوڈ کارپوریشن آف اِنڈیا

ترقی پذیر ملکوں میں زمینوں کے بہت سے قطعات ایسے ہیں جہاں سورج، مٹی اور پانی کے وسائل سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے، چنانچہ اکثر جگہوں پر اب بھی قحط سالی کا سامنا ہے۔ ہندوستان میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک خشک سالی اور قحط سالی کے خطرات انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہے تھے۔ چناں چہ جنوری ۱۹۴۳ء میں ریاست بنگال میں ایسے بھیانک قحط کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان کی تاریخ کا بھیانک ترین قحط تھا، اس وقت ملک میں غلّے کے ذخیرے بھی موجود نہ تھے، اور ایسا کوئی ہنگامی منصوبہ بھی تیار نہ تھا جس کے ذریعے اس مصیبت پر نجات پائی جاتی، اُس وقت حکام نے باہر ملکوں سے غلّہ منگانے کے لیے کوششیں کیں لیکن کسی مربوط نظام کے نہ ہونے سے بھوک سے مرنے والوں کو موت سے نجات نہیں دلائی جا سکی، لہٰذا ہزارہا انسان موت کی نذر ہو گئے۔

اس کے چار سال بعد ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا، اب سوال یہ تھا کہ دنیا میں دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ آبادی والے ملک میں خوراک کا ایسا جامع نظام تیار کیا جائے جس سے اس طرح کے بھیانک قحط سے لوگوں کو بچایا جا سکے، سرکار نے اس کام کو اوّلین ترجیح دی اور بھوک کے خلاف جنگ کرنے کے لیے مورچہ سنبھالا۔ ملک کی کثیر آبادی کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان کا معیارِ زندگی بلند ہو اور انھیں اچھی غذائیت والی خوراک بہم پہنچائی جائے۔ چنانچہ زراعتی اصلاحات اور زرعی شعبوں میں تحقیق کے کام کو اولین ترجیح دی گئی۔ اس سلسلے میں خوراکی محاذ پر خود کفیلی کو ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کسانوں کے نفع کا خیال رکھتے ہوئے انھیں پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کا خیال رکھا گیا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں اندرونِ ملک خوراکی اجناس کی ناکافی پیداوار کو دیکھتے ہوئے زرعی تحقیق کے کام کو بڑھاوا دیا گیا۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی خوراکی ضرورتیں پوری کرنے کے خیال سے غیر ملکوں سے اناج منگانے پر شروع میں کافی زور تھا جس سے بیش قیمت غیر ملکی زرمبادلہ خرچ ہوتا جا رہا تھا۔ ملک میں سبز انقلاب کے ذریعے پیداوار میں ایک انقلاب لایا جا سکا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان میں ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوتا تھا جو بڑھ کر ۱۷ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گیا۔

ہندوستانی کسان کو کھیتی باڑی کے جدید طریقوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا، زرعی سائنس دانوں نے لیباریٹریوں میں جو تجربے کئے، انھیں کھیتوں تک منتقل کیا جا سکا، لیکن ان تمام کوششوں کے ساتھ ایک نقص ضرور رہا اور وہ یہ کہ زراعتی ٹکنالوجی کو ٹھوس مارکیٹنگ پالیسی کے ساتھ مربوط نہیں کیا جا سکا، چنانچہ خوراکی اجناس کی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھوس بنیادوں پر فراہمی کو یقینی بنانے پر زور دیا گیا۔ اور غلّہ کی تقسیم کے منظّم نظام کی ضرورت محسوس کی گئی، یہ دونوں کام اس لیے ضروری تھے کیوں کہ ان کے بغیر عوام کو خوراک کی فراہمی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی، اس مقصد کے لیے ۱۹۶۵ء میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں ۳۰ لاکھ مربع کلو میٹر رقبے پر کھیتی کے لیے مانسونوں کے رحم و کرم پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کچھ علاقوں میں بارشیں ہو جاتی ہیں اور کھیتی اچھی ہوتی ہے جب کہ کچھ علاقے بارش سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہاں قحط سالی کا سامنا ہوتا ہے، چنانچہ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کی بنیادی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ملک بھر

انچارج پبلسٹی، دارالعلوم دیوبند۔ سہارنپور، یو۔ پی۔

میں اناج کی سپلائی متاثر نہ ہونے دے بلکہ ہر مقام پر ایک ہی طرح سے اناج ملتا رہے اور سال کے کسی بھی حصے میں اناج کی قلت نہ محسوس ہونے دی جائے۔ اس ادارے نے گزشتہ ۲۷ برسوں میں ملک کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اسس ادارے نے خوراکی معیشت کو بحران کا شکار ہونے سے بچایا اور اسس بڑے ملک میں ہر جگہ اناج کی سپلائی کو یقینی بنایا۔ ملک میں مختلف حصوں میں زراعت کے لیے حالات یکساں نہیں ہوتے، کہیں آب و ہوا موافق ہے تو کہیں مخالف، اس لیے ملک میں اناج کی پیداوار اور کھپت کے نظام کو مستحکم بنانے میں اسس کارپوریشن نے مؤثر رول ادا کیا ہے۔ اس کے کام کے تین اہم اجزاء ہیں۔ (۱) وافر پیداوار، (۲) سپلائی کا مستحکم نظام۔ (۳) قیمتوں کا ایسا نظام جس سے اناج عوام کی دسترس سے باہر نہ ہو۔

فوڈ کارپوریشن آف انڈیا ان مقاصد کے حصول کے لیے اناج خریدتی ہے، ان کی درجہ بندی کرتی ہے، ان کا ذخیرہ محفوظ کرتی ہے، اور ان کو ضرورت والے مقامات تک پہنچاتی ہے، اسس کی وجہ سے اشیاء کی تقسیم کا سرکاری نظام چل سکا ہے، غلّہ کی فراہمی سے متعلق سرکاری دکانیں اسی کارپوریشن کی وجہ سے کامیاب ہیں۔ یہ نظام اتنا وسیع اور اتنا جامع ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے — یہ کارپوریشن اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت مل سکے اور یہ پیداوار ان کو گھاٹے سے بچا سکے۔ اس کارپوریشن نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ اناج کی قیمت ایک خاص سطح سے گرنے نہ پائے اور قیمت گرنے کی صورت میں سرکار اناج کو اسی قیمت پر خریدتی ہے جس کا پہلے سے اعلان ہوتا ہے، اسس کارپوریشن نے کسانوں کی آمدنی بڑھانے اور ان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، یہ کارپوریشن پندرہ ہزار سے زیادہ مراکز پر کسانوں سے غلّہ خریدتی ہے، اناج کی سرکاری خرید شروع میں ۴۰ لاکھ ٹن تھی مگر اب یہ بڑھ کر ۲ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی ہے۔

اس کارپوریشن نے اناج کو محفوظ کرنے کے لیے جگہ جگہ گودام قائم کئے ہیں، اناج اسٹور کرنے کے لیے ایسے مقامات کو چُنا گیا ہے جہاں سے اناج کی سپلائی بآسانی ہو سکے۔ آج فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس جدید طریقوں پر مبنی تقریباً ۲ کروڑ ٹن غلّہ محفوظ کرنے کی سہولتیں موجود ہیں جو ملک میں مختلف پیداواری مراکز پر قائم کی گئی ہیں، یہیں سے یہ اناج ضرورت والے مقامات پر بآسانی منتقل ہو جاتا ہے۔ گوداموں میں موجود غلّہ کے بڑے ذخیروں پر نظر رکھی جاتی ہے تاکہ انھیں کسی طرح کا ... نہ پہنچے۔ یہ اناج مال گوداموں، جد... کھتیوں، کوٹھوں اور پیپوں میں محفو... اسس کے علاوہ فوڈ کارپوریشن آ... اناج محفوظ کرنے کا ایک دیسی طریقہ بھی ... ہے جسے کوَر اینڈ پلنتھ (Cover and Plinth) یا مختصراً کیپ (CAP) اسٹوریج کہتے ہیں۔ محفوظ کئے جانے والے اناج کی سائنسی طریقہ پر درجہ بندی کی جاتی ہے۔ اسس کام کے لیے تربیت یافتہ عملہ اس کارپوریشن سے متعلق ہے۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کی ملک بھر میں ۱۵۰ سے زیادہ لیباریٹریاں ہیں جہاں اس بات کی جانچ کی جاتی ہے کہ محفوظ غلّہ اپنی غذائیت تو نہیں کھو بیٹھا۔ اسس طرح سے ملک کے غریب عوام کو تغذیہ بخش غلّہ مناسب داموں پر مُہیا کرایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصے مختلف طرح کی آب و ہوا رکھتے ہیں۔ شمال میں ہمالیہ کی چوٹیاں ایک طرح کی آب و ہوا پیش کرتی ہیں تو جنوب میں سمندری کنارا دوسری طرح کی آب و ہوا رکھتا ہے۔ شمال مشرق میں گھنے جنگل ہیں تو مغرب میں ریگستان۔ آج اوسطاً ہر روز ۴ لاکھ بوری اناج صارفین کے مراکز تک پہنچایا جاتا ہے، یہ اناج ریل، سڑک، آبی راستوں، بیل گاڑیوں، اونٹوں اور خچروں پر ڈھویا جاتا ہے۔ اسس طرح اضافی خوراک والے مراکز اور ضرورت مند علاقوں کے درمیان ہر روز تقریباً ۲ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں غلّہ کی سرکاری دکانوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے۔ ان سے سماج کے وہ طبقے خاص طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں جو اقتصادی طور پر کمزور ہیں۔ اس طرح آج ہر ہندوستانی کو اناج اس قیمت پر ملتا ہے، جو ایک مناسب قیمت ہے، حالاں کہ ... لاگت ...

غریبوں کی قوتِ خرید بڑھی ہے۔ آج یہ کارپوریشن ایسا مستحکم ادارہ ہے جس نے بھارت ایسے وسیع و عریض ملک کے کروڑوں عوام کے لیے اناج کی سپلائی کو یقینی بنایا ہے۔ اس کی مثال دنیا میں کم ہی ملے گی۔ اس میں ۷۰ ہزار سے زیادہ افراد برسرِ روزگار ہیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تیز رفتار ترقی

کے لیے نئے اقدامات

خواتین کے لیے "تجارتی مواقع" کے موضوع پر آج یہاں ایک سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے صنعت کے وزیر مملکت شری ایم ارونا چلم نے کہا کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تیز رفتار ترقی پر جو زور دیا گیا ہے اس کی روشنی میں کچھ نئے اقدامات تجویز کیے گئے ہیں شری ارونا چلم نے کہا کہ دیہی علاقوں میں چھوٹی اور بہت چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں ڈھانچہ جاتی ترقی کے لیے اسکیم تجویز کی گئی ہے جس میں دیہی علاقوں کی خاتون صنعت کاروں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

شری ارونا چلم نے صنعت کاروں پر زور دیا کہ مرکزی بجٹ میں جن رعایتوں کا اعلان کیا گیا ہے وہ اُن کا فائدہ اٹھائیں۔ انھوں نے صنعت کاروں سے معیار برقرار رکھنے، قیمتیں کم کرنے اور برآمدات میں اضافہ کرنے کی اپیل کی

وزیر موصوف نے کہا کہ خواتین صنعتکاروں کو حکومت کی جانب سے فراہم کی جانے والی سہولیات سے استفادہ حاصل کرنا چاہیئے۔ خواتین صنعت کاروں کو جو اب تک عام طور پر روائتی صنعتوں سے ہی وابستہ ہوتی تھیں، غیر روائتی شعبے میں داخل ہونا چاہیئے تاکہ ہم اپنی صنعت کو مکمل طور پر خود کفیل اور برآمدات حسّاس بنا سکیں۔ شری ارونا چلم نے بتایا کہ پسماندہ طبقات کی خواتین صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات شروع کرنے کے لیے معقول امداد فراہم کی جاتی ہے۔ ریاستی حکومتوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ صنعتی ڈائرکٹوریٹوں میں خواتین سیل قائم کریں۔ شری ارونا چلم نے حکومت کی جانب سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے اعلان کیے گئے پالیسی اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ برآمداتی اکائیوں کی سرمایہ کاری کی حد کو بڑھا کر ۷۵ لاکھ روپے کر دیا گیا ہے۔

شری ارونا چلم نے کہا کہ چین، ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، تائیوان، کوریہ اور دیگر ممالک جیسے پڑوسی ملک چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی جدید کاری اور اس کے فروغ دینے پر زور دے رہے ہیں۔

شری ارونا چلم نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے شعبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بھارت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے ایک مستحکم شعبے کو فروغ دینے میں کامیاب رہا ہے۔

اس سیمنار کا اہتمام وزارت صنعت کی چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی تنظیم اور نوجوان صنعت کاروں کی قومی انجمن کے خواتین گروپ نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ ●

بقیہ، صارفین کے حقوق کا تحفظ

تعلق ملک کی معاشی و سماجی فضا اور عوام کی معاشی حیثیت سے ہے۔ قانون صرف ایک حد تک صارفین کی مدد کر سکتا ہے۔ تاجر اور صنعت کار طبقے کو بھی احساس کرانے کی ضرورت ہے کہ عوام اور سماج کے تئیں اُن کی بھی کچھ ذمہ داری ہے۔

مذکورہ قانون میں ترمیم کی جو باتیں کہی جا رہی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ طبی خدمات کو بھی قانون کے دائرہ کار میں لایا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس ترمیم کے بعد مریضوں کو دوا اسپتال سے باہر سے خرید کر نہیں لانا پڑے گی اور کیا ڈاکٹروں کی فیس پر کوئی پابندی لگ سکے گی۔ اگر کسی ڈاکٹر کو گرفت میں لیا جائے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ قصور اس کا نہیں بازار سے لائی گئی دوا کا ہے۔ اس سے مقدمہ بازی کا نیا چکر شروع ہو جائے گا۔

قانون کا دائرہ کار وسیع کرنا درست ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم کام ہر طبقے میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا ہے کہ خریدار یا خدمت کے طلب گار کو لوٹا نہ جائے اور اُس کی مشکلات و ضرورت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔

یہ احساس حکومت یا حکومت کے قانون پیدا نہیں کر سکتا۔ رضاکار ادارے اور سماج کے خدمت کرنے والے افراد ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ حکومت کی طرف سے دی جانے والی امداد سے ایسے افراد اور اداروں کی حوصلہ افزائی ہو سکتی ہے اور آہستہ آہستہ صارفین کے حقوق کے تحفظ کے حق میں ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔ ●

آر۔ ایس۔ سکسینہ

چھوٹی آبپاشی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی ضرورت

برسوں سے ہندوستان ایک زرعی ملک رہا ہے اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی غلّہ کی ضرورت پورا کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی بڑھ کر ۸۴ کروڑ ۵۰ لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ سال کے چند ہی مہینوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور اس کا بھی کوئی علم نہیں ہوتا کہ کب اور کہاں ہوگی؟ علاوہ ازیں زرعی پیداوار کے لیے صرف بارش پر تکیہ کر لینے سے کافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خشک سالی ہو جاتی ہے۔ اور کئی بار تو قحط تک کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور عوام کو شدید مشکلات اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ملک میں ۱۹۸۷ء میں سخت خشک سالی کے حالات پیدا ہو گئے تھے لہٰذا بارش نہ ہونے کی وجہ سے جو خشک سالی ہوئی اُس نے آبپاشی کے مصنوعی طریقوں پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ہندوستان میں قدیم دور سے سینچائی کے ان طریقوں پر عمل ہوتا رہا ہے اور آریائی حضرات کی قدیم کتابوں، ویدوں میں ان کا ذکر ملتا ہے جن میں کنوئیں، نہریں اور باندھ شامل ہیں۔ رگ وید میں چار طرح کے پانی کا ذکر آتا ہے یعنی بارش سے حاصل ہونے والا پانی، ندی اور جھرنوں، آبشاروں اور کنوئیں کا پانی۔

ملک میں عہد وسطیٰ سے باندھوں اور نہروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے اور اس سے

کافی معلومات جمع کی گئی ہیں۔

آب پاشی پر بطور خاص توجہ د

اُس دور کے ریکارڈ اور ا

پتہ چلتا ہے کہ حکمرانوں نے رعا

فائدے کی خاطر اس طرح کے تعمیری کام ا

دینے کی خاطر کیا کیا مصائب برداشت کیے۔ جنوبی ہند میں سینچائی کے لیے باندھوں، تالابوں اور نہروں سے خاص طور سے سینچائی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پانی کے بہاؤ کو باقاعدہ بنانے کے لیے بھی باندھوں اور تالابوں کا استعمال ہوتا تھا۔ پہلے پانی کو اصل نہر میں ذخیرہ کیا جاتا تھا اور اسے ذیلی نہروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

برطانوی دورِ حکومت سے پہلے زیادہ تر تالابوں، باندھوں اور نہروں میں ہی آب پاشی کے مقصد سے پانی کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد پہلے پانچ سالہ منصوبے سے ہی بڑے بڑے باندھوں اور تالابوں کی تعمیر پر زور دیا جا رہا ہے۔ زیرِ زمین پانی کا استعمال، کنوؤں اور کچھ حد تک ٹیوب ویلوں تک ہی محدود رہا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کی شدید خشک سالی کے پیشِ نظر ٹیوب ویلوں اور کنوؤں کو ترقی دینے اور انھیں عام کرنے کے لیے قرضوں اور

ایک باقاعدہ نظام وضع کیا گیا ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں زیادہ سے زیادہ آراضی میں نہروں کے ذریعے سینچائی کی جا رہی تھی لیکن اس کے بعد کنوؤں اور ٹیوب ویلوں سے کی جانے والی آراضی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جبکہ نہروں سے کی جانے والی آب پاشی میں کمی آ رہی تھی اس کے ساتھ ہی غیر سرکاری نہروں اور دوسرے ذرائع جیسے باندھ اور لفٹ وغیرہ سے سینچائی کرنے کے رجحان میں کمی آئی ۔

۹۰-۱۹۸۹ء تک کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ سمیت درمیانہ درجے کی اہم آبپاشی اسکیموں پر ۲۸۲۹۲ کروڑ روپے، چھوٹی آب پاشی اسکیموں پر ۲۰،۴۴ کروڑ روپے اور چھوٹی آب پاشی اسکیموں کے لیے قرضے کی شکل میں ۷۰.۵۰ کروڑ روپے صرف کیے گئے۔ مجموعی طور پر یہ رقم ۴۲،۷۶۲ کروڑ روپے بیٹھتی

ہے۔ یہ اعداد و شمار منصوبہ بندی کمیشن کے آٹھویں منصوبے کی دستاویز سے حاصل کئے گئے ہیں۔ مزید علاقوں میں (۵۱ - ۱۹۵۰ء) سے لے کر ۹۰ - ۱۹۸۹ء تک نہروں سے آب پاشی کرنے پر ۲۸۲۹۲ کروڑ روپے خرچ کئے گئے اور ۶۲ ، ۸۶ لاکھ ہیکٹیئر میں یہ سہولیات مہیا کی گئیں۔

کنوؤں اور ٹیوب ویلوں سے سینچائی کرنے پر ۱۱۰۰۰ کروڑ روپے صرف کئے گئے جس میں کسانوں کی رقم بھی شامل ہے۔ اس طرح مزید ۱۸۲ ، ۱۶۷ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں سینچائی کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ نہروں سے آب پاشی کرنے کے فی ہیکٹیئر اخراجات ۲۲۶۶۲ روپے بیٹھتے ہیں جب کہ کنوؤں اور ٹیوب ویلوں سے سینچائی کرنے پر ایک ہیکٹیئر پر صرف ۶۵۵۵ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ نجی نہروں، تالابوں اور باندھ وغیرہ جیسے روایتی طریقوں سے سینچائی کرنے میں کمی آئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل گوشوارے سے ظاہر ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

(لاکھ ہیکٹیئر میں)

سینچائی کے طریقے	سیراب کی جانے والی زیادہ سے زیادہ آراضی	۹۰ - ۱۹۸۹ء میں سیراب کی گئی آراضی	کمی
نجی نہریں	۱۳،۹۰ (۵۶ - ۱۹۵۵ء)	۵،۰	۸،۶۰
تالاب	۴۵،۷۱ (۶۱ - ۱۹۶۰ء)	۳۲،۰۰	۱۳،۷۱
دوسرے	۲۹،۶۷ (۵۱ - ۱۹۵۰ء)	۲۰،۷۰	۰،۹۷
			۲۴،۱۸

مذکورہ بالا گوشوارے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تالابوں سے مزید علاقوں میں سینچائی کے باوجود روایتی طریقوں سے کی جانے والی آراضی میں ۱۸ ، ۲۴ لاکھ ہیکٹیئر کی کمی آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ناکافی توجہ دی گئی ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس نے اس پر مناسب توجہ نہیں دی۔ رہا کسانوں کا سوال تو انفرادی طور پر یہ بات کسان کے بس کی نہیں ہے کہ وہ اس نظام پر اور پھر اس کی دیکھ بھال پر اخراجات کرے اور اگر اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو ایسی کوئی قیادت نہیں ہے جو یہ سب کام انجام دے سکے۔ حکومت نے باندھوں اور بڑی بڑی نہروں پر زیادہ توجہ دی تو کاشت کاروں نے اپنے طور سے کنوؤں اور ٹیوب ویلوں کا انتظام کیا۔ اگرچہ ان سبھی ذرائع سے اناج کی پیداوار بڑھانے میں زبردست مدد ملی ہے تاہم ان میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ نہروں سے زمینی کٹاؤ ہوتا ہے اور آخری سرے کے کسان کو تو بمشکل ہی پانی مل پاتا ہے اسی طرح کنوؤں یا ٹیوب ویلوں سے بہت زیادہ پانی لے لیا جائے تو پینے کے پانی کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں گاد بیٹھ جانے کا بھی امکان رہتا ہے۔ علاوہ ازیں آب و ہوا متاثر ہوتی ہے جس کا اثر سبزیوں کی کاشت پر بھی پڑتا ہے۔

فوائد

اگر ہم سینچائی کے نالیوں، باندھ اور تالابوں جیسے روایتی طریقوں کو اپناتے ہیں تو ان سے ماحول کو محفوظ بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔ تالابوں میں فاضل پانی کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے جو وقت ضرورت سینچائی اور پینے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس پانی کو مویشی بھی پی سکتے ہیں۔ باندھوں سے زمینی کٹاؤ کی روک تھام ہوتی ہے اور یہ محفوظ بھی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیر زمین پانی وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب طریقے ایسے ہیں جن میں مزدوروں کی زیادہ کھپت ہوتی ہے اس طرح گاؤوں میں بے روزگاری دور کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر تالابوں وغیرہ سے کیچڑ نکالنے اور انھیں صاف کرنے کے لیے کثیر تعداد میں مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح باندھوں وغیرہ کی تعمیر میں بھی مستریوں وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کرناٹک میں کمان ایریا کے تحت ۵۵،۴۸۳ ہیکٹیئر آراضی آتی ہے اور وہاں ۳۶۵۵۲ تالاب ہیں۔ ان میں سے محکمۂ تعمیرات عامہ کے تحت ۲۰۰ ہیکٹیئر آراضی اور ۴۳۴۴ بڑے تالاب ہیں جو ۱۸۳۶۶۸ ہیکٹیئر میں آب پاشی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ باقی تمام تالاب چھوٹے ہیں جو ضلع پریشد کے زیر انتظام ہیں۔ درحقیقت ان تالابوں سے صرف ۵۰ فی صدی علاقے میں ہی سینچائی ہو رہی ہے۔ ان تالابوں کی صلاحیت کو بحال کرنے کے لیے اندازاً ۷۰۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہے اور پھر ۳ لاکھ ہیکٹیئر فصلوں کے لیے آب پاشی کی سہولیات مہیا ہو سکیں گی۔ وزارت آب پاشی کے ایک جائزے کے مطابق (مرکزی زیر زمین آبی بورڈ کے سہ ماہی جولائی - ستمبر ۱۹۹۰ء کے رسالہ بھوجل نیوز) ۲۳۰۰۰ تالابوں میں سے ۴۹۰۰۰ استعمال نہیں ہو رہے تھے۔ اس میں بہار، راجستھان اور آسام کے اعداد و شمار شامل نہیں ہیں۔ مذکورہ بالا کرناٹک کی مثال کے مطابق

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

گوکل پٹنایک

آم کی برآمد — روشن امکانات

دُنیا بھر میں جن چھ اہم پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ آم بھی اُن میں شامل ہے۔ ہندوستان میں تو چار ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے آم کی کاشت ہو رہی ہے۔ اس وقت ملک کے جتنے علاقے میں پھل پیدا ہوتے ہیں اُس کے ۴۲ فی صد پر تو صرف آم ہی پیدا ہوتا ہے۔ ملک میں پھلوں کی مجموعی پیداوار میں ۴۰ فی صدی آم ہوتا ہے اور اس کی سالانہ پیداوار تقریباً ۹۵ لاکھ ٹن بیٹھتی ہے۔ عمدہ ذائقہ اور خوشبو کے ساتھ ساتھ آم وٹامن اے اور وٹامن سی سے بھرپور ہوتا ہے۔ اسی لیے آم کو تمام پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

اگرچہ دنیا کے ۶۳ ملکوں میں آم پیدا ہوتا ہے تاہم ہندوستان میں سب سے زیادہ آم پیدا ہوتا ہے جو کُل عالمی پیداوار کا ۶۰ فیصدی سے زیادہ ہے۔ گوشوارہ نمبر ایک میں دی گئی تفصیل کے مطابق ۱۹۹۰ء میں آم پیدا کرنے والے دس ملکوں میں ہندوستان پہلے نمبر پر تھا، اس کے بعد میکسیکو اور پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔

تمام پھلوں کے مقابلے میں آم کو اس وجہ سے بھی اہم مقام حاصل ہے کہ اس کی ایک ہزار سے زیادہ اقسام پائی جاتی ہیں۔ البتہ تجارتی نقطہ نظر سے صرف ۲۰ اقسام مقبول عام ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

آموں

ملک		
دنیا		
ہندوستان	۹۵۰۰	۶۰٫۵۱
میکسیکو	۸۰۰	۵٫۰۹
پاکستان	۷۶۰	۴٫۸۴
تھائی لینڈ	۵۷۲	۳٫۶۴
انڈونیشیا	۴۴۱	۲٫۸۱
برازیل	۴۱۵	۲٫۶۴
ہیٹی	۳۰۰	۱٫۹۱
زائر	۲۰۸	۱٫۳۲
مدغاسکر	۱۹۶	۱٫۲۵
تنزانیہ	۸۶	۱٫۱۸

ذریعہ: الف اے او ایربک ۱۹۹۰ء۔

عالمی منڈی

ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن کی آموں کی عالمی پیداوار میں سے صرف ۶ر۰ فی صدی بین اقوامی سطح پر تازہ شکل میں فروخت کئے جاتے ہیں۔ باقی ۴ر۹۹ فی صدی اُن ہی ملکوں میں استعمال

ہوتے ہیں جہاں ان کی پیداوار ہوتی ہے تازہ آموں کی سب سے بڑی منڈی شمالی امریکہ ہے جہاں عالمی درآمدات کے ۵۰ فی صد کی کھپت ہوتی ہے۔ یوروپی اقتصادی برادری اور مشرقِ وسطیٰ دوسرے اہم درآمدکار ہیں۔ وینی زویلا، میکسیکو، ہیٹی اور برازیل کا مال شمالی امریکہ جاتا ہے۔ کچھ ضابطوں کی وجہ سے شمالی امریکہ کو ہندوستان کی برآمد برائے نام ہی ہے تھوڑا بہت مال ہندوستان یوروپی اقتصادی برادری کو برآمد کرتا ہے جب کہ برازیل اور میکسیکو اُس کے اہم برآمدکار ہیں ہندوستان اور پاکستان مشرقِ وسطیٰ کی منڈی پر چھائے ہوئے ہیں۔ جتنا دنیا بھر میں آم پیدا ہوتا ہے اُس کا ۰ فی صدی ایشیا میں پیدا ہوتا ہے البتہ بین الاقوامی تجارت کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصّہ ۱۰ فی صدی سے بھی کچھ کم ہے۔

ہندوستان میں ہر سال تقریباً ایک کروڑ ٹن آم کی پیداوار ہوتی ہے۔ آم ویسے تو ملک بھر میں ہی پیدا ہوتا ہے تاہم اتر پردیش (۲ر۳۴ فی صدی)۔ آندھر پردیش (۹ر ۱۹ فی صدی) بہار (۴ر۱۳ فی صدی) اڑیسہ (۲۲ر۸ فی صدی) اور کرناٹک (۷ر۵ فیصدی) آم پیدا کرنے والی اہم ریاستیں ہیں۔

ہندوستان میں آموں کا موسم مارچ سے شروع ہوتا ہے اور جولائی تک جاری رہتا ہے۔ الفونسو اور جنوبی ہندوستان کی مدراسی ایسی اقسام ہیں جو شروع میں یعنی فروری کے وسط میں منڈی میں آجاتی ہیں۔ اس کا موسم اپریل یعنی دو مہینے تک رہتا ہے۔ بادامی اپریل میں آتی ہے اور یہ مئی تک بازار میں رہتی ہے۔ اتر پردیش کا چوسا، دسہری اور لنگڑا، اپریل میں منڈی میں آتے ہیں اور جون / جولائی تک ان کا موسم رہتا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

پاکستان میں جو ہندوستان کا حریف ہے آموں کا تقریباً وہی موسم ہوتا ہے جو شمالی ہندوستان میں ہوتا ہے اور اس کی اقسام بھی کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس کا چوسا اور لنگڑا مئی میں آنا شروع ہوتے ہیں اور اگست تک منڈی میں رہتے ہیں۔ تاہم ہندوستان کے الفونسو کا کوئی مقابلہ نہیں اس کے علاوہ ہندوستان کو ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اُس کی (جنوبی ہندوستان کی مدراسی، بادامی اور سکم یلی جیسی اقسام جلد آجاتی ہیں اور یہ پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں دنیا کی مجموعی پیداوار کا ۶۰ فی صدی آم پیدا ہوتا ہے تاہم عالمی برآمدات میں اُس کا حصّہ اس کے مطابق نہیں ہے۔ بھارت سے گذشتہ چند برسوں میں جتنا آم برآمد کیا گیا اُس کی تفصیل گوشوارہ نمبر ۲ میں دی گئی ہے۔

میں آم برطانیہ، کینیڈا، سنگاپور اور آسٹریلیا کو بھی برآمد کیا جاتا ہے تاہم ان ملکوں میں اصل صارف ہندوستانی نژاد افراد ہی ہیں۔ ہندوستانی آم یوروپی اقتصادی برادری کی منڈیوں اور جنوبی ایشیا کے ملکوں میں اپنے قدم نہیں جما پایا ہے اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ ان ملکوں میں ہندوستانی نژاد افراد خاطر خواہ تعداد میں نہیں ہیں۔ جاپان اور امریکہ جیسی بڑی منڈیوں میں کچھ بندشوں کی وجہ سے ہندوستان کو رسائی حاصل نہیں ہے۔

برآمد کے مسائل

ہندوستان آموں کی برآمد سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا سکا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اُن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) آم برآمد کرنے کے معاملے میں الفونسو پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے جب کہ اس کی پیداوار

گوشوارہ نمبر ۲
ہندوستان سے آم کی برآمدات

سال	مقدار میٹرک ٹن میں	مالیت کروڑ روپے میں
۸۶ — ۱۹۸۵ء	۱۶۵۳۹	۱۹۳۲
۸۷ — ۱۹۸۶ء	۱۶۲۵۷	۱۹۱۲
۸۸ — ۱۹۸۷ء	۲۰۳۰۲	۲۳۳۴
۸۹ — ۱۹۸۸ء	۱۶۸۳۹	۲۲۱۱
۹۰ — ۱۹۸۹ء	۱۲۰۰۸	۱۶۷۵
۹۱ — ۱۹۹۰ء	۱۹۳۸۰	۳۱۲۲
۹۲* — ۱۹۹۱ء	۲۵۰۰۰	۳۶۰۰

* عبوری

ذریعہ: اپیڈا / ڈی جی سی آئی ایس

آم خریدنے والے ملک:-

روایتی طور پر ہندوستانی آم کی اصل منڈی مغربی ایشیا کے ملک ہیں۔ اگرچہ کچھ مقدار

محدود پیمانے پر ہوتی ہے۔ حال ہی میں توتا پری آم کی برآمد شروع کی گئی ہے۔

(ب) عالمی منڈی میں ہندوستانی آموں کا شمار سب سے زیادہ قیمت والے آموں میں ہوتا ہے

اسی لیے اگر الفونسو کا گوشوارہ نمبر ۲ کے مطابق بادامی اور چوسا سے مقابلہ کیا جائے تو اندرونِ ملک بھی اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی آم زیادہ تر طیاروں کے ذریعے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں کے کرایے کے مقابلے میں ہوائی جہاز کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔

(ج) مشرق وسطیٰ میں ہندوستان کا اصل حریف پاکستان ہے۔ وہاں آموں کا موسم بھی وہی ہوتا ہے جو ہندوستان میں ہوتا ہے اور وہاں بھی چوسا اور لنگڑے جیسی اقسام پائی جاتی ہیں۔ پاکستان کو مشرق وسطیٰ میں کرایے کے اعتبار سے مال بھیجنے میں فائدہ رہتا ہے کیوں کہ وہ اپنا مال کراچی سے کشتیوں وغیرہ کے ذریعے بھیجتا ہے۔ کراچی سے دوبئی تک ۳ روپے فی کلوگرام کے حساب سے کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے جو کہ بہت کم ہے جب کہ ممبئی سے دوبئی تک ہوائی جہاز کے ذریعے مال بھیجنے میں ۹ روپے فی کلوگرام صرف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب مئی میں ہی پاکستان کا آم منڈی میں آجاتا ہے تو قیمت کے اعتبار سے ہندوستان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

(د) ہندوستانی آم امریکہ اور جاپان جیسی بڑی بڑی منڈیوں میں برآمد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ ان ملکوں کے سخت ضابطے ہیں جن کے مطابق برآمد کئے جانے والے آموں کو بھاپ دینا ضروری ہے اور برآمد سے پہلے آموں کو بھاپ دینے کی سہولت کا ہندوستان میں کوئی انتظام نہیں ہے۔

(ہ) بینک سے سرمایہ اور پیکنگ کے لیے قرضہ لینے میں دشواری بھی برآمدی کوششوں میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس وقت جو پالیسی ہے اُس کے مطابق ایف۔ او۔ بی کے اعتبار سے برآمدی لاگت کا دس فی صدی پیکنگ کے لیے قرضے کے طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناکافی ہے خاص طور سے اُس صورت میں جب کہ مال فرج والے کنٹینروں میں بھیجا جاتا ہو جس کی لاگت ایف۔ او۔ بی کے اعتبار سے ۵۰ سے ۶۰ فی صدی کے قریب بیٹھتی ہے۔

برآمدی امکانات

ہندوستان آموں کی اپنی انواع و اقسام اور الفونسو جیسی کچھ عمدہ اور لاجواب قسموں کی بدولت اپنی برآمد میں خاطر خواہ اضافہ کرسکتا ہے۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان یوروپ اور جنوبی ایشیائی منڈیوں تک رسائی حاصل کرے۔ ہندوستان کے عمدہ قسم کے آموں اور اس کے بہترین ذائقہ کے لیے عوام میں بیداری لانا بہت ضروری ہے
چوسا، سفیدہ اور بادامی جیسے
برآمد سے ملک کی برآمد کو متنوع بنا
اس طرح کافی عرصہ تک ہندوستانی
میں دستیاب رہے گا۔ اندازہ لگایا گیا
ہندوستان ۷۲ کروڑ روپے کی مالیت کے ۴۴۰۰ میٹرک ٹن آم برآمد کرسکتا ہے۔ امریکہ اور جنوبی ایشیائی ملکوں کی منڈیوں کو چھوڑ کر جہاں بذریعہ ہوائی جہاز مال بھیجنا ہوتا ہے ممبئی، دلی اور حیدرآباد کی اہم بندرگاہوں سے بحری راستے سے آموں کی برآمد کی جاسکتی ہے

اس وقت ہندوستان یوروپ کے ملکوں کو صرف ۱۰۰ میٹرک ٹن کے قریب آم برآمد کرتا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق یوروپ کے ممالک کو ۳۶۰۰ میٹرک ٹن آم برآمد کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ یوروپ میں آموں کی ایک بڑی منڈی ہے جب کہ فرانس، جرمنی اور ہالینڈ بھی اہم منڈی کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔

یوروپ کو جتنا آم بھیجا جاتا ہے اُس کا ۷۵ فی صدی مارچ سے اگست کے درمیان بھیجا جاتا ہے جو آم فراہم کرنے والا بیشتر ممالک کا خاص موسم ہوتا ہے۔ کینیا واحد ملک ہے جہاں پورے سال آم پیدا ہوتا ہے اور فراہم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آموں کا وہی موسم ہوتا ہے جو زیادہ تر آم سپلائی کرنے والے ملکوں کا ہوتا ہے لیکن شروع میں یعنی مارچ سے اپریل اور آخر میں یعنی جون سے جولائی کی مدت میں کھپت کچھ کم ہوتی ہے ہندوستان اس خلا کو پُر کرسکتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کو ۶۷۵۰ میٹرک ٹن آم برآمد کرنے کا موقع مل جائے گا۔

حکمتِ عملی

یوروپی ممالک کو آم کی برآمد کے لیے مندرجہ ذیل حکمت عملی اپنائی جانی چاہیئے۔

اور سی لینڈ جیسی کئی جہاز راں کمپنیوں کے پاس ٹکنالوجی موجود ہے۔ ان میں سے متعاملتا کسی بھی بہتر کمپنی کے ذریعے یوروپ کو مال فراہم کیا جاسکتا ہے۔

(ب) یوروپی منڈیوں میں سفیدہ، چوسا اور بادامی جیسی غیر روایتی اقسام کو تجارتی میلے اور نمائش وغیرہ لگا کر بڑے اور طریقے پر مقبول بنانے کی ضرورت ہے۔ الفونسو محدود پیمانے پر ہی فراہم کیا جاتا ہے لہٰذا دوسری اقسام کا مال سپلائی کرنے سے نہ صرف آموں کی فراہمی میں اضافہ ہوگا بلکہ طویل عرصے تک ہندوستانی آم بازار میں دستیاب ہوگا کیوں کہ چوسا/لنگڑے کا موسم (مئی۔ جون۔ جولائی) اور بیگم پلی کا موسم (اپریل۔ مئی) ہوتا ہے جب کہ الفونسو شروع

میں آتا ہے اور اس کا موسم مارچ سے مئی تک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا جب مئی، جولائی میں الفونسو کا موسم ختم ہونے لگتا ہے تو آندھرا پردیش سے بادامی اور شمالی ہندوستان سے چوسا اور سفیدہ جیسی دوسری اقسام برآمد کی جا سکتی ہیں۔

(ج) یوروپی منڈیوں میں مارچ سے جولائی تک مال کی فراہمی میں کمی رہتی ہے۔ ہندوستان فی الحال مارچ کے وسط سے اپریل تک . ۱ میٹرک ٹن آم یوروپ کو فراہم کرتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان اپنی اس موجودہ مقدار کو سپلائی کرنے کے ساتھ ساتھ مال کی کمی کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ ہندوستان مارچ میں ایک ہزار میٹرک ٹن کی کمی کا محض ۵۰ فی صدی ہی سپلائی کر پائے گا کیوں کہ ملک میں آموں کا موسم ۱۵ مارچ یا اس کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ دوسرے مہینوں یعنی اپریل سے مئی تک یوروپی منڈیوں کی صد فی صد کمی کو ہندوستان پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح ہندوستان اپنی موجودہ ۱۰۰ میٹرک ٹن کی سپلائی کے علاوہ ۵،۵۰۰ میٹرک ٹن مال فراہم کر سکے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کی منڈی

ہندوستان اور پاکستان مشرقِ وسطیٰ کی منڈی پر چھائے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں افریقہ اور جنوبی امریکہ کا آم بھی اس منڈی میں آنا شروع ہو گیا ہے۔

خلیج میں کس قدر مال کی کھپت ہوتی ہے اس کے صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن برآمد کاروں کی معلومات کے مطابق رمضان المبارک میں یہ مانگ ۳۶۰ سے ۴۸۰ میٹرک ٹن یومیہ ہو جاتی ہے۔

دوبئی آموں کی آمد اور تقسیم کا خاص مرکز ہے جہاں سے ۵۵ فی صدی مال خلیج کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ دوبئی سے تقسیم کے جدید نظام کے ذریعے سعودی عرب اور بحرین کو مال سپلائی کیا جاتا ہے۔ اہم صارفین میں متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، بحرین، کویت اور کسی حد تک یمن شامل ہیں۔

متحدہ عرب امارات جو مال درآمد کرتا ہے اُسے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو دوبارہ برآمد کر دیا جاتا ہے۔ متحدہ عرب امارات کی منڈی میں کافی اُتار چڑھاؤ رہتا ہے اور یہاں سمندری راستے سے بیشتر مال ہندوستان اور پاکستان سے آتا ہے جن کی قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں۔ ہوائی جہازوں سے زیادہ تر مال سعودی عرب اور بحرین جاتا ہے جو زیادہ قیمت دینے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان مال سپلائی کرنے والے اہم ممالک ہیں جو ۹ سے ۹۵ فی صد مال سپلائی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ جغرافیائی حالات اور وہاں آباد ہندوستانی، پاکستانی ہیں جو ان ملکوں کے آموں کو پسند کرتے ہیں۔ ہندوستان مشرق وسطیٰ کو ۹۰۰۰ سے ۱۱۰۰۰ میٹرک ٹن مال فراہم کرتا ہے جس میں الفونسو اور توتا پری شامل ہیں۔ پاکستان مئی کے بعد سے چوسا سپلائی کرتا ہے۔ ہندوستانی آم شروع میں یعنی مارچ اپریل میں مقبول ہوتے ہیں بعد میں پاکستانی آم پسند کئے جاتے ہیں جو کہ سستے ہوتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے ممالک کو سالانہ ۴۴۰۰۰ میٹرک ٹن آم برآمد کیا جا سکتا ہے۔ وہاں اوسطاً ۱۰۰۰۰ میٹرک ٹن ماہانہ آم کی مانگ رہتی ہے، سوائے رمضان المبارک کے جب کہ مانگ ۴۵۰ میٹرک ٹن یومیہ ہو جاتی ہے۔ خلیج کو مال کی سپلائی کے لیے متحدہ عرب امارات ایک اہم منڈی ہے جہاں قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ رہتا ہے جب کہ سعودی عرب اور بحرین منافع بخش منڈیاں ہیں جہاں اچھے مال کی اچھی قیمت ملتی ہے۔

ہندوستان میں آموں کا موسم فروری کے وسط میں شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت کوئی اور ملک مشرق وسطیٰ میں آم سپلائی نہیں کرتا۔ لہٰذا ہندوستان دس مارچ کے قریب وہاں آم سپلائی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ پورے مارچ کے مہینے میں وہاں چھایا رہ سکتا ہے۔ یہی صورت حال اپریل کے مہینے میں بھی رہتی ہے۔

کیسے ممکن ہے؟

اس سلسلہ میں حکمت عملی وضع کرتے وقت مندرجہ ذیل حقائق کو سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(الف) مشرق وسطیٰ کے ممالک کو تمام احتیاطی تدابیر کرنے اور پیکنگ کے بعد مال کو بحری راستے سے بھیجا جا سکتا ہے۔ سمندری راستے سے ان ممالک کو ہندوستانی آم بھیجنے سے بار برداری کے اخراجات بھی کم ہوں گے۔

(ب) چوسا اور بادامی جیسی اقسام کو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں مقبول بنایا جائے کیوں کہ یہ آم کہیں زیادہ ارزاں ہوتا ہے لہٰذا یہ منڈی میں دوسرے ملکوں کے آم کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکے گا

(ج) بذریعہ ہوائی جہاز مال کی سپلائی جہاز میں بعض مرتبہ جگہ نہ ملنے کی وجہ سے برآمد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آموں کو مارچ کے شروع میں ہی بحری راستے سے سپلائی کیا جانا چاہیئے۔ سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے کچھ دوسرے ملکوں میں جہاں اچھی قیمت ملتی ہے ہوائی جہازوں کے ذریعہ مال سپلائی کیا جانا چاہیئے۔

مارچ اور اپریل میں الفونسو آم مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کیا جانا چاہیئے۔ یہ آم شروع موسم میں ہی آتا ہے لہٰذا اسے منڈی میں مقابلے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ البتہ موسم کے شروع میں لمبی منڈی تک پہنچنے کے لیے مال کی کچھ مقدار کو

ہوائی جہازوں سے سپلائی کر دیا جانا چاہیئے باقی مال بحری جہازوں سے بھیجا جا سکتا ہے۔ بادامی آم کو اپریل، مئی میں حیدرآباد سے بحری جہازوں سے سپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مئی، جون میں چوسا اور سفیدہ دلی سے برآمد کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح تقریباً ۷۰ فی صدی آم کو بحری جہازوں سے سپلائی کرنا ہوگا ورنہ قیمت کے اعتبار سے ہندوستانی آم پاکستانی آم کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مشرقِ وسطیٰ کی زیادہ منافع بخش منڈیوں یا پھر ہنگامی طور پر ہی آم کی کچھ مقدار کو ہوائی جہازوں سے سپلائی کیا جانا چاہیئے۔

جنوبی ایشیائی ملکوں کی منڈی خاص طور پر جاپان اور ہانگ کانگ پر مشتمل ہے۔ جاپان پانچ ہزار اور ہانگ کانگ تین ہزار میٹرک ٹن آم خریدتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔

جاپان زیادہ تر مال میکسیکو، فلپائن اور امریکہ سے خریدتا ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ مال ہوائی جہازوں سے وہاں پہنچتا ہے۔ جاپان مال سپلائی کرنے کے لیے اسے بھاپ دینا بہت ضروری ہے سائنسی طریقے پر بھاپ دینے کی سہولت ہندوستان میں دستیاب نہیں ہے اس لیے یہ اب تک وہاں کی منڈی میں داخل نہیں ہو سکا ہے۔

جنوب مشرق ایشیا کے ملکوں میں قیمت کے قطع نظر عمدہ قسم کے آم کی مانگ رہتی ہے، اس وقت امریکہ اور میکسیکو جیسے دور دراز ملکوں سے آم سپلائی کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے آم خوشبو اور ذائقہ کے اعتبار سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں اس لیے یہ یقیناً جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی منڈیوں میں کم از کم دس فی صدی ہندوستانی مال کی کھپت ہو سکتی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو جتنا آم برآمد کیا جاتا ہے اس کا ساٹھ فی صدی جاپان اور ہانگ کانگ خریدتے ہیں۔ اس طرح جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو ۱۲۵۰۰ میٹرک ٹن آم برآمد ہوتا ہے جس میں سے دس فی صد یعنی ۱۲۵۰ میٹرک ٹن ہندوستان سپلائی کر سکتا ہے۔

تاہم جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو آم سپلائی کرنے کے لیے ہندوستان کو مختلف امور پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔

(الف) جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو آم ہوائی جہازوں کے ذریعے سپلائی کرنے ہوں گے کیوں کہ بحری راستہ کافی طویل ہے (بحری راستے سے جاپان اور ہانگ کانگ تک آم پہنچنے تک یہ خراب ہو جائے گا)

(ب) ہندوستان کو بہت سے مگر الفونسو بادامی، چوسا اور سفیدہ جیسے مقبول بنانا ہوگا تاکہ پورے موسم تک رہے گا حیدرآباد سے بادامی، دلی سے ... ممبئی سے الفونسو ہوائی جہازوں سے سپلائی کرنا ہوگا۔

باور کیا جاتا ہے کہ امریکہ کی آموں کی منڈی بھی ایک بڑی منڈی ہے۔ تاہم شمالی امریکہ میں ایک بڑی نسلی آبادی کے لیے ہندوستان سے محض سالانہ ایک ہزار ٹن آم ہی سپلائی ہو رہا ہے۔ خیال ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی آم کے بہتر ذائقہ اور عمدگی کی وجہ سے زیادہ قیمت دینے کو بھی تیار ہیں۔ امریکہ بھی ہوائی جہازوں سے ہی آم سپلائی کرنے ہوں گے۔ امریکہ کو باقاعدہ آم سپلائی کرنے کی غرض سے ملک میں سائنسی طریقے کے مطابق آموں کو بھاپ دینے کا نظام وضع کرنا پڑے گا۔

●

جوابات: کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ۵۴۰ قبل مسیح، ویشالی (بہار)

۲۔ گپتا شاہی سلسلہ (Gupta Dynasty)

۳۔ اینی بسنت (Ms. Annie Besant) نے۔

۴۔ محمد تغلق کو۔

۵۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء۔

۶۔ مکمل آزادی (Complete Independence)

۷۔ ۱۹۷۱ء میں۔

۸۔ ۱۹۴۲ء میں

۹۔ پنچ تنتر (Panchtantra)

۱۰۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو۔

('Adventures of Sherlock Holmes', Arthur Canon)

۱۷۔ ۰۰،۹۸،۷ کروڑ۔

۱۸۔ کلوروفِل (CHLOROPHYLLL) کی موجودگی کے سبب۔

۱۹۔ رتوندھی (Night Blindness)

۲۰۔ آئرن (Iron) کی کمی کے سبب۔

۲۱۔ مارکونی (Marconi)

۲۲۔ فریڈرک بنٹنگ (Frederick-Banting) نے۔

۲۳۔ ٹی۔بی (Tuberculosis) سے۔

۲۴۔ ہیموگلوبن (Haemoglobin) کی موجودگی کی وجہ سے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

ہندوستان میں آلوؤں کی پیداوار

بھارت میں جن سبزیوں کی بڑے پیمانے پر کھیتی سال بھر رہتی ہے، اُن میں سے ایک سبزی آلو بھی ہے اور اتنی ہی عام اس کی کاشت بھی ہے۔ آلوؤں کی پیداوار ہماچل پردیش کے اونچے اونچے پہاڑوں سے لے کر مغربی بنگال کے میدانی علاقوں تک ملک کی تقریباً تمام ریاستوں میں کی جاتی ہے۔ آلوؤں کی کاشت کے تحت مجموعی علاقہ ۹ر۵ لاکھ ایم۔ ٹی ہیکٹیئر ہے، جس میں سالانہ تقریباً ۱۵ لاکھ ایم۔ ٹی آلوؤں کی پیداوار ہوتی ہے۔ اگرچہ آلوؤں کی قومی اوسط پیداواریت تقریباً ۱۶۔ ایم۔ ٹی فی ہیکٹیئر ہے، لیکن یہ سطح مہاراشٹر میں ۷ار۴ ایم ٹی فی ہیکٹیئر سے لے کر مغربی بنگال میں ۲۳۔ ایم ٹی فی ہیکٹیئر تک بہت زیادہ مختلف ہے۔ کم پیداواریت کی اہم وجوہات میں سے ایک وجہ اچھے معیار کے بیجوں کی عدم دستیابی ہے۔

ان بیجوں کی پیداوار صرف چند ریاستوں مثلاً ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش میں کچھ حد تک اروناچل پردیش اور میگھالیہ میں ہی کی جا رہی ہے آلوؤں کی پیداوار کرنے والی دیگر تمام ریاستوں کو بیجوں کے لیے ان ریاستوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے نقل و حمل پر بہت زیادہ خرچ آتا ہے اور نقل و حمل کے دوران بیجوں کا کافی نقصان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، بروقت سپلائی کے سلسلے میں بھی غیر یقینی صورت حال رہتی ہے۔ ایک ہیکٹیئر رقبہ کے لیے تقریباً ۲ سے ۳۔ ایم ٹی بیجوں کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لیے کسانوں کو آٹھ ہزار روپے سے دس ہزار روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ بیجوں کی بہت زیادہ قیمت ان ریاستوں میں، جہاں بیجوں کی پیداوار نہیں ہوتی ہے، آلوؤں کی کاشت کرنے والوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

انقلابی کامیابی

آلوؤں کے بیجوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں اہم کامیابی حاصل کی گئی ہے، جس کے نتیجے میں ان بیجوں پر آنے والی لاگت میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔ زرعی سائنس دانوں نے آلوؤں کے بیجوں کی متعدد اقسام، جنھیں ٹی۔ پی۔ ایس کہتے ہیں، تیار کی ہیں، جو بہت زیادہ کم لاگتی اور پیداواری ثابت ہوئی ہیں۔ ان بیجوں سے روایتی بیجوں کے مقابلے میں آلوؤں کی کہیں زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ ایک پیداوار کے لیے ۳۔ ۵ر۲۔ ایم۔ ٹی بیجوں کے مقابلے میں، جن پر تقریباً آٹھ ہزار روپے سے لے کر دس ہزار روپے تک کی لاگت آتی ہے، صرف ۱۰۰ گرام مذکورہ بیجوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن پر تقریباً ایک ہزار روپے کی لاگت آتی ہے۔ اس کے علاوہ، بیشتر بیماریاں ان بیجوں کے ذریعہ منتقل نہیں ہوتی ہیں۔

آلوؤں کی پیداوار کے لیے اس نئی ٹکنالوجی کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے کی غرض سے ملک کے شمال مشرقی علاقے میں ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے تاکہ آلوؤں کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس علاقے میں آلوؤں کی کاشت کے تحت ۸ر۰ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں صرف ۵ لاکھ ٹن ایم۔ ٹی آلوؤں کی پیداوار ہوتی ہے، جب کہ اوسط پیداواریت صرف ۶۔ ایم ٹی فی ہیکٹیئر ہے۔

سب سے پہلے تری پورہ نے ۱۹۸۵ء میں تجربات کا سلسلہ شروع کیا، جس سے ثابت ہوا کہ نئے بیج روایتی بیجوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کم لاگتی اور پیداواری متبادل ہیں۔ ریاست کی موسمی صورت حال کے مطابق ان بیجوں کا استعمال کر کے آلوؤں کی کاشت کے زرعی طریقوں کو معیاری بنانے کے بعد ان بیجوں کی تجارتی پیداوار کے لیے ایک پروجیکٹ ۱۹۹۰ء سے شروع کیا گیا ہے اس پروجیکٹ

(باقی صـ۲۶ـ پر)

مونی دیپا مکھرجی

آئیل پام کی کاشت : حوصلہ افزا امکانات

ہندوستان نے، جو روایتی طور سے مونگ پھلی کی کاشت کرنے والا ملک ہے، حال ہی میں غیر روایتی تلہنوں کی کاشت شروع کی ہے۔ ان تجربات کی نمایاں کامیابی تلہنوں کی پیداوار میں بڑھتے ہوئے رجحان سے عیاں ہے۔ تلہنوں سے متعلق ٹکنالوجی مشن نے، جو ۱۹۸۶ء میں قائم کیا گیا تھا، تلہنوں کے سلسلے میں خود کفالت کے حصول میں تیزی لانے کی غرض سے پیداوار، پراسسنگ اور انتظامی ٹکنالوجیوں کے سلسلے میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔

آئیل پام کی پیداوار کے زبردست امکان نیز کیرالہ اور انڈومان میں آئیل پام کی کاشت کے حوصلہ افزا نتائج سے، ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بڑے پیمانے پر آئیل پام کی کاشت میں اضافہ کرنے کی کوششوں کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

تجارتی پیمانے پر آئیل پام کی کاشت کے سلسلے میں تجرباتی پروجیکٹ شروع کرنے کی غرض سے تین مقامات یعنی کرناٹک میں شموگا، آندھرا پردیش میں مشرقی گوداوری اور مہاراشٹر میں کنکاولی کا انتخاب کیا گیا تھا۔

تجرباتی پروجیکٹ:۔ درحقیقت مہاراشٹر کا پورا کونکن علاقہ ہی آئیل پام کی کاشت کے لیے نہایت موزوں علاقہ ہے۔ اس علاقے میں قابل کاشت بنجر زمین ہے، جو کل علاقے کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہے۔ موزوں مقامات کنکاولی — کسروے، اوسں رام، لورا سالدے، د اور کرکل گاؤوں میں واقع تھے۔

کنکاولی کے پروجیکٹوں کے لیے مسائل درپیش رہے، جو عموماً ملک کے کسی بھی دیہی علاقہ کو درپیش ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تھا، زمینی اثاثوں کا مقابلتاً چھوٹا سائز جو وسطاً آٹھ سے دس گنٹھا تھا۔ (ایک گنٹھا۔ ایک ہزار مربع فٹ کے برابر) اور ہر ایک زمینی اثاثے کے لیے ملکیت کے حقوق رکھنے والوں کی بڑی تعداد۔ چونکہ منتخبہ جگہوں پر کاشت کا کام نہیں کیا جا رہا تھا، اس لیے زمین کی جدوجہد کا معاملہ بھی واضح نہیں تھا۔ سخت محنت کے نتیجے میں ان مسائل پر قابو پا لیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد ایک اور مسئلہ درپیش آیا، یعنی گاؤں کے لوگ زمین دینے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومت نے اس شرط کے ساتھ کہ مالکان کو تجارتی پیداوار کی آمدنی میں سے حصہ دیا جائے گا، لمبے عرصے کے لیے پٹے پر زمین لینے کی پیشکش کی۔ اس کے نتیجے میں زمین کے مالکان کی

[illegible] سے پٹے پر لی گئی تھی۔ چار سال بعد، یعنی ۱۹۹۴ء میں اس پودکاری سے پہلی بار تیل حاصل ہونے کی توقع ہے۔

اہم ذریعے

تمام پودوں کے مقابلے میں آئیل پام میں خوردنی تیل کا سب سے زیادہ عنصر ہوتا ہے۔ پام کی فی ہیکٹر کاشت سے فی ہیکٹر ۳ ٹن سے ۶ ٹن تیل حاصل کیا جا سکتا ہے، جب کہ ہندوستان میں عام طور پر اُگائے جانے والے تلہنوں جیسے مونگ پھلی، سرسوں، توریہ، تیل اور السی سے فی ہیکٹر زیادہ سے زیادہ ۶۷۰ کلوگرام تیل حاصل ہوتا ہے۔ آئیل پام گرم خطے کا سدا بہار پودا ہے۔ اس کی

ڈ سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انھیں خصوصیات کی وجہ سے یہ پودا کاشت کاروں کے لیے سب سے زیادہ دیرپا اور پُرکشش بن گیا ہے۔

یہ تیل پھل اور گودے سے نکالا جاتا ہے بقیہ چیزیں مویشیوں کا چارہ بنانے کے سلسلے میں فوراً کام آ جاتی ہیں۔ پھل سے نکالے گئے تیل کو رقیق، اولین اور ٹھوس اسٹیرین میں الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔ اولین کو اکثر کھانا پکانے کے دیگر تیلوں کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ گودے سے نکالے گئے تیل کی بڑی مقدار کا استعمال بھی صابن بنانے تیار کرنے میں کیا جاتا ہے۔ پام آئیل میں ٹرائی گلیسرائیڈ چربی کا تجزیہ۔ خردیاتی چربی دار تیزابوں اور گلیسرول میں کیا جاتا ہے جو کپڑے دھونے کا صابن، چکنا کرنے والی زائد اشیاء کپڑے کو نرم بنانے والی اشیاء، صنعتی امیلشن اور کاسمیٹک اجزاء تیار کرنے کے سلسلے میں اولیو کیمیکل صنعت کے لیے خام مال کا کام کرتے ہیں۔

تیل نکالنے کا ایک پلانٹ کونکن علاقہ میں ۱۹۹۴ء تک مشترکہ شعبے میں قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ پلانٹ اس علاقہ کے قریب واقع ہوگا جہاں آئیل پام کے پودے لگائے گئے ہیں کیوں کہ فصل کی کٹائی کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر پھلوں سے تیل نکالنا ہوتا ہے۔ آئیل پام کی پودکاری امدادِ باہمی کے شعبے یا تجارتی شعبے میں کی جا سکتی ہے، جس کے لیے حکومت پودکاری کا ساز و سامان اور توسیعی خدمات فراہم کرتی ہے تاکہ کسانوں کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی ہو کہ وہ اپنی غیر مزروعہ زمین آئیل پام کی کاشت کے لیے استعمال کریں۔

آئیل پام کی کاشت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے آٹھویں منصوبے میں ۹۴ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ اس مدت کے دوران تقریباً ۸۰۰۰۰ ہیکٹیئر رقبے پر آئیل پام کی پودکاری کی جائے گی۔ آئیل پام کے منظر میں روشن امکانات سے اس بات پر یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات ملی ہیں کہ آٹھویں منصوبے میں ۲۳۰ لاکھ ٹن تلہن کی پیداوار کے نشانے سے تجاوز کیا جائے گا۔ ●

بقیہ: بھارت میں سیاحت کی ترقی و فروغ

کھانے پینے سے متعلق اسکیم کے تحت، ہوٹل انتظام، کھانے پینے سے متعلق ٹکنالوجی اور اطلاعاتی تغذیہ کے بارہ ادارے یہ رکھا یا تیار کرنے کے فن کے بارہ ادارے مختلف مقامات پر قائم کیے گئے ہیں۔ یہ ادارے نگراں اور انتظامی سطح کے عملے کے لیے ہوٹل انتظام خوراک کے انتظام اور کھانے پینے سے متعلق ٹکنالوجی کے بنیادی اصولوں سے متعلق کورسیز کا اہتمام کرتے ہیں۔

سیاحت اور سفری انتظام کے سلسلے میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم دینے کے لیے یہ ایک خود مختار تنظیم ہے، تاکہ سیاحت کی صنعت کے موثر انتظام کے لیے پیشہ ورانہ لحاظ سے تربیت یافتہ عملے دستیاب ہو سکے۔ ●

بقیہ: چھوٹے آبپاشی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی ضرورت

دیکھا جائے تو ۱۴٫۶۱ لاکھ ہیکٹیئر میں پھر سے سینچائی کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ۴٫۶۴ کروڑ روپے درکار ہوں گے۔ البتہ اگر یہ کام غیر سرکاری تنظیمیں کسانوں کی شرکت سے انجام دیں تو اخراجات کافی کم ہو سکتے ہیں۔

آندھرا پردیش کے میدک ضلع میں کیے گئے ایک جائزے کے مطابق ۱۲۰۰۰ باندھ تعمیر کرکے وہاں ۶۵۶۰۰ مربع کلومیٹر علاقے میں آب پاشی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح زیرِ زمین پانی کو مزید ۳۰۰۰ کنوئیں کھود کر ۶۰۰۰ ہیکٹیئر علاقے میں آب پاشی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے ایک باندھ پر ۱۵۰۰۰ روپے لاگت آتی ہے۔ اگر ملک کے ۲۰۰ اضلاع میں بھی اس طرح کے پروگرام پر عمل کیا جائے تو ۱۵۶۰۰ کروڑ روپے صرف کرکے ۱۲۰ لاکھ ہیکٹیئر میں سینچائی کی جا سکتی ہے۔ ان اخراجات میں کنوؤں کے اخراجات بھی شامل ہیں ایک کنوئیں پر لگ بھگ ۲۰۰۰۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔

جہاں تک نہروں سے سینچائی کا تعلق ہے تو جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، اتر پردیش، سکم اور شمال مشرقی ریاستوں میں یہ پانی نالوں کی شکل میں ہیں لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں جدید بنانے کے لیے ہنگامی سطح پر ایک زبردست پروگرام بنایا جائے۔ جموں و کشمیر میں مرمت اور جدید کاری پر آنے والے اخراجات کا تخمینہ ایک ارب روپے لگایا گیا ہے۔ ملک بھر میں اس کام پر پانچ ارب روپے صرف ہونے کا امکان ہے۔ البتہ اس کے نتیجے میں ۹٫۵۷ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں سینچائی ہونے لگے گی۔ تالابوں، بڑے نالوں کی مرمت اور نئے باندھ تعمیر کرکے ۱۴۴ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں سینچائی کی جا سکتی ہے اور اس کام پر اخراجات کا تخمینہ ۲۰۸۶۴ کروڑ روپے ہے۔ اس سرمایہ کاری سے دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر روزگار کی فراہمی میں بھی مدد ملے گی۔ ساتھ ہی اس اقدام سے ماحول کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ ملک بھر میں غیر سرکاری تنظیموں اور کسانوں کے تعاون سے ماحول کی بہتری اور دیہی روزگار کا پروگرام شروع کیا جا سکتا ہے۔ اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ملک کی آب پاشی کی پالیسی پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ ●

معیار کی پابندی

'معیار' ٹکنالوجی کے انقلاب کے اس دور میں کلیدی نقطہ بنتا جا رہا ہے۔ معیار کا مطلب ہے کہ بیشتر استیار ساز اور سپلائی کنندگان حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔ پیداوار میں معیار کو یقینی بنانے کے سلسلے میں ایک صنعت کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ اُن رسدات کا معیار اچھا اور ایک ہی جیسا ہو۔ ———— اس بات کو برقرار رکھا جا سکتا ہے کہ معیار اچھا اور ایک ہی جیسا ہو، بشرطیکہ صنعت اور اس کے سپلائی کنندگان معیار کے سلسلے میں اپنے کام کاج کے لیے لاگو ٹھوس طریقوں اور پابندیوں پر عمل درآمد کریں۔

چنانچہ معیار کے ایک ایسے قابلِ قبول اور ٹھوس نظام کے لیے یکساں ضروریات ہونی چاہئیں، جس سے تمام خریداروں کی توقعات اطمینان بخش طریقے سے پوری ہوں گی۔ اس کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر قواعد و ضوابط معیارات وضع کرنے کی ضرورت ہے، جس سے اپنی اپنی تنظیموں میں معیار کے نظام وضع کرنے میں صنعتوں اور سروس تنظیموں کے لیے ضروری رہنما خطوط فراہم ہوں گے۔

معیار بندی کی بین الاقوامی تنظیم نے اس کو یکساں بنانے کی کوشش ہے اور معیارات وضع کیے ہیں۔ جنھیں معیار کے نظاموں کے بارے میں کے آئی۔ ایس۔ او۔ ۹۰ سلسلے کا نام دیا گیا ہے، جس سے معیار کے انتظام اور معیار کی یقین دہانی کے نظاموں کے انتخاب اور استعمال کے لیے ... رہنما خطوط فراہم ہوتے ہیں

معیارات کے آئی ایس او۔ ۰ ۹ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھارتی معیار کے بیورو (بی آئی ایس) نے ان آئی ایس او کو اپنایا ہے اور انھیں معیارات کے آئی ایس ۱۴۰۰ سلسلے کے طور پر شائع کیا ہے۔ معیار کے انتظام کے نظام کے تین نمونے آئی ایس ۱۴۰۰۱ (آئی۔ ایس۔ او۔ ۹۰۰۱) آئی۔ ایس۔ ۱۴۰۰۲ (آئی۔ ایس۔ او۔ ۹۰۰۲) اور آئی۔ ایس ۱۴۰۰۳ (آئی ایس او۔ ۹۰۰۳) میں شامل ہیں۔ ایک ٹھیکے کی پوری مدت میں مختلف مراحل پر خریداری کے لیے معیار کی یقین دہانی کے سلسلے میں یہ مقررہ طریقے ہیں۔ ان معیارات پر عمل درآمد کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ معیار کے انتظام اور طریقوں مثلاً ٹھیکے پر نظرِ ثانی، ڈیزائن کی دیکھ بھال، دستاویز کا خیال، خریداری ... اور جانچ پرکھ کے لیے پیر غیر کمرشنگ ... کی ... کے لیے ایک نظام وضع کیا جانا چاہیے

معیارات کے آئی ایس۔ او۔ ۹۰۰۰ سلسلے کو یورو پی اقتصادی برادری میں وسیع پیمانے پر لاگو کرنے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۹۲ء کے بعد فی الواقع

معیارات ... ایس۔ ۱۴۰۰۰ / ان آئی ایس او۔ ۹۰ سلسلوں کے مطابق معیار کے نظام کے لیے تصدیق کی ایک اسکیم شروع کرنے سے بھارت میں کافی دلچسپی دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھارت ترقی پذیر دنیا میں ان بڑے ممالک میں سے ایک ہے جو قومی سطح پر استیار کے معیار کے لیے تیسری پارٹی کے ذریعے تصدیق کا نشان لگانے کی سب سے بڑی اسکیم چلا رہا ہے۔ یہ صنعت اور صارفین میں اس کے بارے میں کافی بیداری پائی جاتی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ معیار کے نظام کی تصدیق کا معاملہ اُن صنعتوں کے لیے لاگو ہے، جہاں مصنوعات پر نشان لگانا ممکن نہیں ہے۔ دنیا بھر میں معیار کے نظام کی تصدیق کے لیے بڑھتے ہوئے رجحان اور کچھ ممالک مثلاً برطانیہ میں مصنوعات

پر نشان لگانے کی اسکیم کو رفتہ رفتہ شروع دینے کی وجہ سے بھارت میں بھی اس سلسلے میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔

بھارتی معیارات کے بیورو نے بھارتی معیارات کے بیورو سے متعلق قانون، ۱۹۸۶ء کے تحت ستمبر ۱۹۹۱ء میں معیار کے نظاموں کی تصدیق سے متعلق اسکیم شروع کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت، بی آئی ایس نے تصدیق کے لیے درخواستیں وصول کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ لائسنس دینے کے سلسلے میں ان درخواستوں پر کارروائی کی جا رہی ہے۔

گزشتہ متعدد برسوں سے مصنوعات کی تصدیق کی اسکیم چلانے سے بی آئی ایس قومی اور بین الاقوامی سطح پر تصدیق کے ایک ادارے کے طور پر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ معیار کے نظاموں کی تصدیق کے لیے بی آئی ایس جن نظاموں اور طریقوں پر عمل کرتا ہے، وہ یوروپ میں اس قسم کے اداروں کے نظاموں اور طریقوں کے مطابق ہیں۔ لہٰذا یہ توقع کی جاتی ہے کہ بی آئی ایس کے ذریعہ معیار کے نظاموں کی تصدیق کو یہ تمام ممالک تسلیم کریں گے۔

مزید برآں، بی آئی ایس بین الاقوامی طور سے منظور شدہ ایک نظام شروع ہونے تک دیگر ممالک کے ساتھ، معیار کے نظاموں کی اس کی تصدیق کو دوطرفہ طور سے تسلیم کئے جانے کے سلسلے میں بات چیت کر رہا ہے۔ غیر ملکی تصدیق کے ادارے بھارتی کمپنیوں سے فیس کے طور پر غیر ملکی زرِ مبادلہ میں بڑی بڑی رقمیں حاصل کر رہے ہیں۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر اب بی آئی ایس ان کمپنیوں کی تصدیق کا کام کر سکتا ہے۔

معیار کے نظام قائم کرنے کے سلسلے میں صنعت کی مدد کرنے کے لیے بی آئی ایس نے معیار کے نظاموں کو سمجھنے کے پروگرام معیار کے نظاموں کے جائزے اور آزمائشی اندازے کے نظاموں سے متعلق منصوبے پیش کئے ہیں۔

معیار کے نظاموں کو سمجھنے کے پروگرام میں معیار کے نظاموں کے نظریے کے بارے میں تعارف، معیار کے نظاموں کے معیارات کی ضرورت کی وضاحت، معیار کے نظاموں پر عمل درآمد کرنے کے سلسلے میں درکار دستاویز بندی، معیار کے نظاموں کی تشکیل، عمل درآمد اور جائزے کا مرحلے وار طریقہ شامل ہے۔ اس پروگرام میں ایک مشاورتی سروس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جس میں دستاویز بندی کے کام میں صنعت کی مدد کرنا، معیار کے اندرونی محاسبوں کا اہتمام کرنا اور معیارات کے آئی ایس۔ ۱۴۰۰۰ سلسلے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دستاویز بندی کے موجودہ کام میں بہتری لانا شامل ہے۔

ان یونٹوں کے معاملے میں، جو مذکورہ بالا اقدامات پہلے ہی کر چکے ہیں اور دستاویز بندی کا کام مکمل کرنے کے بعد اندرونی محاسبے کا کام انجام دے رہے ہیں، معیار کے نظاموں کا جائزہ لینے کی ایک اسکیم شروع کی جا رہی ہے اس سے ایک فرم کو اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کس زمرے میں آتی ہے نیز وہ جائزے کے نتیجے میں، جہاں کہیں ضرورت ہے، تدارکی کارروائی کر سکے گی۔ ان یونٹوں کے لیے، جو معیار کے نظام قائم کرنے کے آخری مراحل میں ہیں، بی آئی ایس کے تربیت یافتہ افسران کے ذریعہ آزمائشی اندازے کی ایک اسکیم بھی چلائی جا رہی ہے۔

تیسری پارٹیوں کے ذریعہ تصدیق کے اداروں کو منظور کرنے کے سلسلے میں، منظوری کی اسکیموں پر ترقی یافتہ دنیا میں عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ یوروپی برادری بھی اس قسم کا نظام قائم کر رہی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اس مقصد کے لیے رجسٹرارس ایکریڈیٹیشن بورڈ پہلے ہی قائم کر چکا ہے۔ باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، حکومتِ ہند بھی منظوری کا ایک قومی نظام قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

ایک اعلیٰ سطحی کونسل قائم کی جائے گی، جس کے تحت چار بورڈ ہوں گے، جو مصنوعات کی تصدیق، نظام کی تصدیق، تجربہ گاہ میں جانچ کرنے کے اداروں، تربیتوں اور عملے کو منظور کرنے کا کام انجام دیں گے۔

آئی ایس او۔ ۹۰۰۰ تصدیق کے سلسلے میں بہت زیادہ عالمگیر دلچسپی کے نتیجے میں آئی ایس او۔ ۹۰۰۰ فورم قائم ہوا ہے۔ اس فورم کی طرف سے جاری کردہ خبرنامے سے آئی ایس او۔ ۹۰۰۰ کا استعمال کرنے والوں، معیارات وضع کرنے والوں اور معیارات کے اس سلسلے کے اطلاق سے متعلق دیگر حلقوں کو آپس میں موثر طور سے رابطہ قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ آئی ایس او۔ ۹۰۰۰ فورم میں شامل ہونے سے، دنیا بھر میں ایک دوسرے کے تجربے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ساجھے داریاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ ●

ڈاکٹر ایس گنا سیکرن
اور
ڈاکٹر ایس۔ دھنا سیکرن

کثرت مذاہب اور ملک کی وحدت و سالمیت

فرد اور سماج کے لیے صحیح اقدار اور زندگی کو بہتر بنانے والے اصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ صحیح اقدار کے انتخاب اور ان پر عمل پیرائی سے انسانی معاشرہ کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور وہ مزید ترقی کرتا ہے ۔ ہر انسان یا سماج کا ہر فرد ان اقدار سے جانا جاتا ہے جو اسے عزیز ہوتی ہیں اور جن پر وہ عمل کرتا ہے۔ مذہب انسان کو ایک مکمل انسان اور ایک ہم آہنگ انسانی معاشرہ کی ایک اکائی بنانے کے لیے صحیح اقدار کے انتخاب میں مدد کرتا ہے

وسیع تر معنی میں مذہب انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان گہری ہم آہنگی برقرار رکھنے میں مصروف رہا ہے۔ مشرقی فلسفہ، بالخصوص ہندوستانی روایت انسان کے جسم، روح اور دماغ کی متوازن نشو ونما پر زور دیتی ہے۔ ہر مذہب ایک طرح سے ایک انسانیت نواز اور منضبط معاشرہ کی تشکیل کے لیے اس مرکزی فلسفہ کو زندہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ زندگی کی مادی آسائشوں کے لیے انسان نے اخلاقی راہوں سے ہٹ کر مذہب کا غلط استعمال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے مذہب کو اس کی اخلاقی بنیاد سے کافی دور کر دیا ہے اور اسے سیاسی اقتدار کے کھیل کا ایک حصہ اور سماجی و اقتصادی استحصال کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے جس سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں
ان حالات میں تعاون کا احترام کرے
شہری کی، جو ایک شائستہ اور پُرامن
کرنے کا خواہشمند ہے، ذمہ داری ہے
مذاہب کی تعلیمات ان کے ایک
حقیقت کو سمجھے اور مل جل کر سب کی بہبود و بہتری کے لیے کام کرے۔ اس قسم کا ادراک جو ایک متبادل غیر متشددانہ طرز زندگی سے مطابقت رکھتا ہے، دور جدید کے ایسے سماج کے لیے بے حد ضروری ہے جس میں مذاہب کی کثرت ہو۔

مذہب انسان کے اندر اور انسانوں کے درمیان کشمکش اور مسائل کو حل کرنے کے لیے بنا ہے۔ ہر مذہب ایک ذریعہ ہے انسان کو جسمانی طور پر تندرست اور دماغی طور پر چست بنانے کا اور روحانی طور پر اونچا اٹھانے کا۔ مذہب کا مقصد ایسے عمدہ اور بلند اخلاق انسانوں کی مدد سے کائنات سے ہم آہنگی کے ساتھ ایک پُرامن سماج بنانا ہے
اس طرح ہر مذہب انسان کو بلندی پر لے جانے کا ایک ذریعہ ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں "مذہب فطرتِ انسانی کا ایک شعبہ ہے " اپنا ایک مذہب رکھنا انسان کی اُن میں خصوصیات میں سے ایک ہے جو اسے

[illegible]
بصیرت ہمیں سانی ہے کہ وہ عظیم طاقت جسے ایشور یا خدا کہا جاتا ہے انسان کو اوپر سے ہدایات نہیں دیتی بلکہ وہ اس کے اندر بلکہ ہر چیز کے اندر موجود ہے۔

برہد اریا کا اوپنشد (۳، ۷، ۱۵) میں کہا گیا ہے :-

" وہ جو سبھی چیزوں میں موجود ہے
پھر بھی سب چیزوں سے الگ ہے،
جسے سب چیزیں نہیں جانتیں
لیکن جو سبھی چیزوں میں موجود ہے،
جو سب چیزوں پر ان کے اندر سے
کنٹرول کرتا ہے۔
وہ تمھاری آتما ہے
جو لافانی ہے ۔"

ڈاکٹر گنا سیکرن (انڈین اسکول آف مائنس دھن باد میں لیکچرر ہیں۔ اور ڈاکٹر دھنا سیکرن ایم۔کے۔ یونیورسٹی مدورئی سے وابستہ ہیں

جس طرح وہ بے شمار خلیے جسم کے اندر ہوتے ہیں اور جسم کا حصہ ہوتے ہیں اسی طرح تمام مخلوق کائنات کا حصہ ہے۔ ایسی صورت میں مختلف قسم کی مخلوقات میں ایک دوسرے سے امتیاز برتنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان نہ صرف دوسرے انسانوں کا بلکہ پوری مخلوق کا ایک ناقابلِ تقسیم حصہ ہے۔ پھر کوئی شخص یا گروہ کسی دوسرے شخص یا گروہ کے خلاف تشدد نہیں کرسکتا۔ یہ انوکھا مذہبی اندازِ نظر انسان کو اونچا اٹھا کر الوہیت کی طرف لے جانے کی ایک قابلِ تعریف کوشش ہے۔

بہبودِ انسانی

عمرانیات کی زبان میں مذہب کو ایک ایسے ادارے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو فلاح انسانی، امداد باہمی کے ساتھ مِل جُل کر رہنے اور نسلِ انسانی میں ایکتا برقرار رکھنے کے لیے قائم کیا جائے۔

ہر مذہب کے اہم بنیادی اصول سچائی، محبت، راسخ الاعتقادی، برداشت و رواداری اور خدمت (سیوا) ہیں۔ سچا مذہب وہی ہے جس میں یہ اصول انسان کے فکر و عمل میں نمایاں ہوں اور وہ انہی کی روشنی میں زندگی کے روزمرہ مسائل کو حل کرے۔ صرف مذہبی صحیفوں کو پڑھنا اور بعض رسوم کی پابندی کرنا ہرگز سچا مذہب نہیں کہلا سکتا۔ سوامی وویکانند نے سچ فرمایا ہے کہ "مذہب، مذہبی رسوم اور عقیدوں، مندروں اور گرجا گھروں پر مشتمل نہیں ہے۔ وہ تو صحیح عمل میں ہے، انسانیت کے اندر موجود الوہیت کے اظہار میں ہے۔"

کثرتِ مذاہب مختلف انسانی گروہوں کی موجودگی کی علامت ہے۔ ایسے گروہ جن کا پس منظر مختلف ہے، جن کی نسل مختلف ہے، سیاسی و سماجی ڈھانچہ مختلف ہے اور مذہبی عقائد مختلف ہیں۔ مذہبی تناظر میں دیکھیں تو کثرتِ مذاہب مختلف مذہبوں کے درمیان پُرامن بقائے باہم کی حوصلہ افزائی کی ایک کوشش ہے۔ یہ اس بات کی بھی کوشش ہے کہ ہر انسان دوسرے کے مذہب کو برابر کے احترام کی نظر سے دیکھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر مذہب کی آزاد روح اور راستوں کو برقرار رکھا جائے۔ لہٰذا کثرتِ مذاہب ایک طرزِ زندگی ہے جو مختلف عقیدوں کے لوگوں کو مل جُل کر ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کے سکھ دُکھ میں شریک ہونا سکھاتا ہے۔ حالیہ وقتوں میں یہ طرزِ زندگی اور زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ بہت سے مذہبی رہنما سادھو سنت، فقیر — درویش اور سدھار وادی (اصلاحی) تحریکیں مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور آپس میں مِل جُل کر رہنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔

ہندوستانی تجربہ

ہندوستان عجیب و غریب مذہبی و ثقافتی روایات کی سرزمین ہے۔ یہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کا گھر اور ان کے پروان چڑھنے کی جگہ ہے۔ لوگوں کو روحانی طور پر اونچا اٹھانے، سماجی لحاظ سے تہذیب یافتہ بنانے اور ان کے اندر ثقافتی رواداری پیدا کرنے اور انھیں اخوتِ انسانی کا درس دینے کے لیے بڑے بڑے مذاہب ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے جیسے ہندو دھرم، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت۔ ہندوستان میں مسیحیت اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ مسیحی مذہب اپنی سرزمین پر ہے۔ سینٹ تھامس ہندوستان کے مغربی ساحل پر آئے اور جنوبی ہندوستان میں اپنی عظیم مشنری زندگی کا آغاز کیا۔ گوتم بدھ نے ہندو دھرم میں اصلاح کرکے اس کے مرکزی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے بدھ مت کی داغ بیل ڈالی۔ اسی طرح اصلاحی خیالات و نظریات کی قبولیت کے ساتھ جین مت اور سکھ مت بھی وجود میں آئے۔ ایک اور بڑا مذہب اسلام بھی وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستانی مذہبی وراثت کا ایک حصہ بن گیا۔ ہندوستان ایک عمرانیاتی لیباریٹری کا کام کرتا رہا ہے جہاں مذاہب کے درمیان امن و آشتی کے بیج بوئے گئے، ان بیجوں میں انکر پھوٹے اور پھول آئے۔ اس کے نتیجے میں ایک مثبت اجتماعی احساس اور تمام مذاہب کے لیے عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں تمام مذاہب امن و آشتی اور باہمی مفاہمت کے ساتھ زندہ ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اس کے باوجود کبھی کبھی فرقہ وارانہ ناروا داری اور خونیں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ متعدد سماجی، اقتصادی اور سیاسی وابستگیاں اور بعض مذہبی جنونیوں اور بنیاد پرستوں کی تنگ نظری ہے۔ اس طرح کے غیر محبِ وطن اور غیر ذمہ دار لیڈروں اور اسی قماش کے مذہبی کارکنوں کی مناسب تعلیم نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے خود کو منضبط نہیں رکھ سکے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کا رُخ اس بات کو سمجھنے کی طرف نہیں موڑ سکے ہیں کہ آخر کار تمام مذاہب کی تعلیمات ایک ہی ہیں۔

راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ - ۱۸۳۳ء) نے جنھیں جدید ہندوستان کا بانی کہا جاتا ہے، سماجی و مذہبی سدھاروں کا پرچار کرنے کے لیے برہمو سماج تحریک شروع کی۔ انھوں نے اپنے مذہبی نظریات میں اسلام، مسیحیت، اپنشدوں اور جدید یوروپ کے فراخدلانہ فلسفے کے اصولوں سے استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے

تمام مذہبوں اور ساری انسانیت کے لیے ایک خدا یا پرماتما کا نظریہ پیش کیا۔

اسی طرح مہاتما گاندھی کا بھی نظریہ یہ تھا کہ "مذہب ایک درخت کی مانند ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ شاخوں کے لحاظ سے مذہب بہت سے ہیں اور بطور ایک درخت کے مذہب ایک ہی ہے۔" انھوں نے سچائی، محبت اور عدم تشدد پر مبنی ایک عالمی مذہب کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ "میرا دھرم سچائی اور عدم تشدد پر مبنی ہے۔ میرا دھرم مجھے کسی سے بھی نفرت کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ مذہب لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے نہیں ہے یہ انھیں ایک رشتے میں باندھنے کے لیے ہے۔" اب یہ پرامن انسانی زندگی کے مفاد میں ہے کہ ہم اپنے مشترک مستقبل کی حفاظت کریں اور کرۂ ارض کی سلامتی کے لیے بین مذہبی رواداری اور پرامن بقائے باہم کو فروغ دیں۔

نقلی مذاہب اور ان کی غیر انسانی تعلیمات ختم ہونی چاہئیں اور ہمیں سچے اور اخلاقی مذاہب اور ان کی اعلیٰ تعلیمات کو اپنے طرز زندگی میں شامل کرنا چاہیئے۔ اس کے لیے ہندوستانی عوام اور مختلف مذہبی و ثقافتی پس منظر رکھنے والے عوام کو محسوس کرنا ہوگا کہ کوئی بھی سچا مذہب کسی اور مذہب کی مخالفت کی تعلیم نہیں دیتا۔ تمام مذہبی روایات کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ سارے انسان ایک ہیں۔ ہمیں اس بات کو بخوبی سمجھ کر اسے اپنی فکر و زندگی کا حصہ بنانا ہوگا۔ ایسا کرنا ناگزیر نہیں کیونکہ تمام مذاہب ایک ہی مقدس درخت کی مختلف شاخیں ہیں جن سے لوگ تحریک عمل اور روشنی حاصل کرتے ہیں اور سب سے بڑی روشنی (بصیرت اور سکون قلب) انھیں موکش یا نروان یا نجات روح اور زندگی کی تکمیل کے لیے سیدھے اور سچے راستے پر چل کر خالق کائنات سے ملتی ہے۔

بھگوان بدھ نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی کہ "اے بھکشوؤں سنو! سچائی کا جو راستہ دکھوں اور تکلیفوں کے خاتمے کی طرف لے جاتا ہے وہ راسخ الاعتقادی، صحیح تحریک عمل، صحیح بول چال، صحیح طرز عمل، صحیح طریقوں سے روزی کمانے، صحیح الدماغی اور صحیح ڈھنگ سے گیان دھیان کا راستہ ہے۔"

ایسا ہی درس ہمیں بھگوت گیتا سے ملتا ہے جو کہتی ہے کہ جو شخص تمام خواہشات کو ترک کر دیتا ہے، سکھ دکھ سے بے نیاز ہو جاتا ہے، خود غرضی اور تکبر چھوڑ دیتا ہے وہ شانتی پالیتا ہے۔" دوسری طرف اسلام کہتا ہے:۔ "مذہب میں جبر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صحیح سمت غلط سمت سے الگ اور نمایاں ہے اور وہ جو جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ اللہ سب جاننے والا ہے اور تمہارا محافظ ہے اپنی مرضی سے اُن کی رہنمائی کرتا ہے ایمان رکھتے ہیں جس کے بارے میں انھیں اطلاع تھا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو صراط مستقیم پر پہنچنے میں رہنمائی کرتا ہے۔

(سورہ ۲۱۱، ۲۵۶ - قرآن حکیم)

جین روایت انفرادی آزادی اور سماجی انصاف پر زور دیتی ہے۔ بھگوان مہاویر کی زندگی سے بہت سے اہم سبق حاصل کر سکتی ہے۔ یہ اسباق درج ذیل تین اصولوں میں موجود ہیں:۔

۱۔ درست عقیدہ۔
۲۔ درست علم۔
۳۔ درست طرز عمل۔

ان اصولوں کا منشار فرد میں صحیح انداز نظر پیدا کرنا ہے جو ضبط نفس، اہنسا (عدم تشدد اور کسی کو بھی چوٹ نہ پہنچانے کے اصول)، رد عمل، رواداری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

مذاہب کی کثرت کا ہندوستانی زندگی اور طرز فکر پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ان مختلف مذہبی روایت کے اثر کا نتیجہ کبھی کبھی بھڑک اُٹھنے والے فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود رواداری، مذاہب میں دوستی، ان کے پیروؤں میں بھائی چارہ کے رشتوں اور بقائے باہم کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ ہماری اس مخلوط ہندوستانی روایت نے فرقہ وارانہ واقعات کے تدارک کے لیے مدتوں پہلے کچھ پرامن اور غیر متشددانہ طریقے بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہندوستان کی قدرتی اور ثقافتی دولت نے بہت سی

[illegible]

یورپی ممالک نے ہندوستانی زندگی اور وراثت کی صدیوں پرانی غیر متشددانہ سماجی و اقتصادی اور پرامن مذہبی و ثقافتی بنیاد کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔

غیر ملکی حملوں، نوآبادیاتی نظام اور اس کے نتیجے میں ہندوستانی زندگی کے انحصار باہم پر مبنی ڈھانچے کی تباہی نے باہمی اعتماد و رواداری کا فقدان پیدا کرکے مذہبی جنون کو جنم دیا۔ انھوں نے فرقہ پسندی، ذات پرستی، طبقاتی اختلاف جیسے بہت سے مسائل بھی پیدا کردیے۔ حالیہ برسوں میں پنجاب، کشمیر، اور آسام میں دہشت گردی کا جو مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ اس مذہبی جنون، جذبۂ علیحدگی پسندی

اور اقتصادی استحصال کا نتیجہ ہے جس کے لیے بعض تنگ نظر سیاست داں، فرقہ پسند رہنما، بنیاد پرست لوگ اور سماج دشمن عناصر ذمہ دار ہیں۔ امن کی کمی اور تشدد کے اس ماحول میں ہر قوم پرست انسان ایک متبادل پُرامن راستے کی تلاش میں ہے۔

اجتماعی مفاہمت

بھارت جیسے ملک میں مختلف مذہبی اور ثقافتی روایات کو ماننے والے لوگوں کو اُن تبدیلیوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے انسانی حالات میں ہونے والی بہتری کی وجہ سے آئی ہیں، محسوس کرنا چاہیے اور انھیں برقرار رکھنا چاہیے۔ یہ پسندیدہ تبدیلیاں اور ان کی تعمیری قوت اُن سنگین مسائل کو جو تا حال ہمارے سامنے ہیں حل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ مگر انسانی لالچ، خود غرضی اور تکبر جو مصیبتوں کا سرچشمہ سبب ہے محض موجودہ صدی کے بدل جانے سے یا نعروں سے یا سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت آئی تبدیلیوں سے ختم نہیں ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے اس اعتماد کو برقرار رکھنا ہوگا کہ مسرت انسانی کے حصول اور انسان کی تکمیل کا دارومدار بلند ترین روحانی خواہش اور قوتوں پر ہے جو ہمیں اس یقین کے ساتھ کام کرنے کے قابل بناتی ہیں کہ امن و سکون کا حصول ناممکن نہیں ہے۔

ہر مذہب لوگوں میں نہ صرف طبیعاتی بلکہ روحانی و رجحانی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دیرپا امن و آشتی ممکن ہو سکے۔ لہٰذا مختلف مذہبی عقائد کے ماننے والوں کو اس کا احساس کرکے اپنی زندگی اور طرز فکر کو ایک نئی سمت میں موڑنا چاہیے۔

ہم لوگوں کو جو مختلف مذہبی روایات میں یقین رکھتے ہیں، اپنے اپنے مذہب کی طبیعاتی ولطف باتی حدود کو مٹا کر مشترکہ فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہوگا۔ ورنہ بہت بڑی تباہی نازل ہو سکتی ہے، ایسی تباہی جس کے لیے ہم خود ذمہ دار ہوں گے۔ کیوں کہ آج کے زمانے میں مذہبی نظریات میں تشدد اور زندگی کے گھریلو اور بین الاقوامی دونوں شعبوں میں عسکریت کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ ہماری مذہبی خصوصیات اور ہمارے مشترکہ مستقبل کی بقا اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک واحد ابدی مذہب کی مختلف شاخیں ہیں۔ (یہ امن و سلامتی سے رہنے کا ایک فارمولا ہے۔ سوامی وویکا نند نے کہا تھا۔

"اگر کبھی کوئی آدرش مذہب ہوگا تو اسے اتنا بڑا اور وسیع ہونا ہوگا کہ وہ انسانی دماغوں کو ان کی خوراک مہیا کر سکے۔ اسے فلسفی کو فلسفے کی قوت عبادت گذار کو سچے معتقد کا دل اور رسوم پرست کو وہ سب دینا ہوگا جو حیرت انگیز استعاریت سمجھا سکتی ہے۔ اسے شاعر کو اتنا بڑا دل دینا ہوگا جس کا وہ متحمل ہو سکے۔ اتنا بڑا اور وسیع مذہب بنانے کے لیے ہمیں اس زمانے میں جانا ہوگا جب مذہبوں کی ابتدا ہوئی اور ان سب کو سمونا ہوگا۔"

آئیے ہم سب اپنے مذہبوں، ثقافتوں اور اپنے سماجی و اقتصادی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر امن و آشتی، اتحاد و یگانگت اور سبھی کی فلاح و بہبود کے لیے مل جل کر کام کرنے کا عہد کریں اور اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ ہم سب اُسی خالق کی اولاد ہیں۔

بقیہ: ہندوستان میں آلوؤں کی پیداوار

کے لیے شمال مشرقی کونسل نے رقم فراہم کی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں، ۱۴ کلوگرام مذکورہ بیجوں کی پیداوار ہوتی تھی، جو آئندہ سیزن میں بڑھ کر ۲۰ کلوگرام ہوگئی۔ توقع ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء تک تقریباً ۵۰۰ کلوگرام بیجوں کی پیداوار ہوگی۔

تری پورہ اور شمال مشرقی علاقے کی دیگر ریاستوں میں آلوؤں کی کاشت کرنے والوں کو مذکورہ بیجوں کا استعمال کرکے آلوؤں کی کاشت کی ٹکنالوجی منتقل کرنے کے لیے ایک وسیع توسیعی پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے۔ اس میں آلوؤں کی کاشت کرنے والوں کو عملی تربیت دینا بھی شامل ہے، جس کے بعد انھیں بیج سپلائی کیے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ انھیں اپنے کھیتوں میں استعمال کریں۔ نیز فصل تیار ہونے کی مدت کے دوران انھیں مسلسل توسیعی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

نئی ٹکنالوجی کی صلاحیت نے نہ صرف شمال مشرقی علاقہ میں بلکہ ملک کے دیگر علاقوں مثلاً اترپردیش، مدھیہ پردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک اور مغربی بنگال میں بھی آلوؤں کی کاشت کرنے والوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی ہے۔ اگر ملک بھر میں آلوؤں کی کاشت کرنے والے اس نئی ٹکنالوجی کو بڑے پیمانے پر اپناتے ہیں تو ہمارا ملک آج کل مستعمل آلوؤں کے تقریباً ۲۵ سے ۳۰ لاکھ ایم ٹی بیجوں کی سالانہ بچت کر سکتا ہے، جنھیں خوراک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ کھانکا

مزدور یونینوں کا نیا کردار

ہندوستان میں مزدور یونینیں صرف منظم سیکٹر تک ہی محدود ہیں جو ملک کے محنت کشوں کی کل تعداد کے صرف ۱۰ فیصد حصے پر ہی مشتمل ہے۔ دنیا میں ٹکنالوجی کی عظیم پیش رفت اور ہندوستان کی سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں ترقی یافتہ ممالک کے برابر پہنچنے کی پُرزور کوششوں کی وجہ سے پیداوار کے طریقوں اور ماحول میں مسلسل بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان حالات میں مزدور یونین تحریک کو اپنا رویّہ، انداز نظر اور طریق عمل بدلنا ہوگا۔

ہندوستان میں مزدور یونینوں کے بارے میں ایک غلط تاثر یہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ جدید ٹکنالوجی کے خلاف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہ صنعت میں جدید ٹکنالوجی کے استعمال کے ضمن میں مزدوروں اور مالکان کے درمیان شک شبہ اور بد اعتمادی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جدید کاری کی شکل میں محنت اور وقت بچانے والی مشینوں وغیرہ کا استعمال شروع کرنے سے پہلے مزدوروں کو اعتماد میں نہیں لیا گیا اور خودکار مشینوں وغیرہ کی وجہ سے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد بے کار ہوگئی۔ قدرتی طور پر مزدوروں نے اس کی مخالفت کی اور کر رہے ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے انسانوں اور مشینوں کی پیداواریت میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بدلتی ہوئی ٹکنالوجی کے نتیجے میں مزدوروں کے دائرے کے اندر اور باہر فرد کے طرز زندگی میں کیتہ اشیاء اور خدمات کے ایک صارف ایک نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ چنانچہ بدلتی ٹکنالوجی میں کام نہ صرف فرد کی اقتصہ ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ زندگی اور سما تیئں کام کرنے والے کے رجحان اور طرز عمل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندوستان کے پیداواری عمل کی جدید کاری میں دوسروں سے پیچھے رہ جانے کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری مالکان اور مزدوروں دونوں پر ہی ہے۔ مالکان جدید کاری کو بیرونِ ملک سے خودکاری درآمد کرتے اور اپنے مزدوروں کی کارکردگی کو معقولیت پسندانہ بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس مزدور یونینیں جدید کاری کے اس لیے خلاف ہیں کہ اس سے انھیں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے بے کار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن چوں کہ جدید کاری سے پیداواریت بڑھتی ہے اس لیے مالکان اور مزدور یونینوں دونوں کو جدید ٹکنالوجی کے استعمال کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا ہوگا۔ مزدور یونینوں کو اپنے روایتی کردار سے باہر نکل کر مزدور یونین تحریک کے ایک ایسے نعال روگرام کہ حد ، ہتی ، ۔ ۲

سنگین مسئلہ

کچھ سنگین مسائل کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ سب سے بڑا مسئلہ جو حل نہیں ہو پا رہا ہے سال بہ سال بڑھتی ہوئی آبادی کا ہے۔ صنعتی شعبے میں خستہ حال اکائیوں کی تعداد میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں بہت سی اکائیوں کے بند ہو جانے کی نوبت آجانے سے اور ہزاروں مزدوروں کے بے روزگار ہو جانے کی وجہ سے روزگار کا مسئلہ اور بھی زیادہ تشویشناک ہوتا جا رہا ہے۔ ملک میں خستہ حال صنعتی اکائیوں کی تعداد دسمبر ۱۹۸۰ء میں ۲۴،۵۵۰ سے بڑھ کر مارچ ۱۹۹۰ء کے اختتام تک ۲،۲۱،۰۹۷ یعنی نوگنا ہوگئی۔ اس مدت میں ان اکائیوں پر بنک کے

آئی۔ جی۔ این۔ او۔ یو، نئی دہلی میں ریڈر ہیں۔
یوجنا، نئی دہلی

واجب الادا قرضہ جات میں تین گنے سے زیادہ کا اضافہ ہوا اور بنکوں کی واجب الادا رقوم ۱۸۰۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۶۹۶۶، کروڑ روپے ہو گئی۔ مارچ ۱۹۹۰ء کے آخر میں بنک کے قرضوں کی ۶۹۶۶ کروڑ روپے کی رقم ۲،۲ لاکھ خستہ حال صنعتی اکائیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ رقم بنکوں کے دیئے گئے کل قرضوں کا ۹ء۵ فی صد ہے۔ صنعتوں سے واجب الوصول مجموعی رقم کا ۲۶،۱ فیصد تھی۔ خستہ حال صنعتی اکائیوں کی تعداد خاص کر کپڑے، پٹ سن اور انجنیئرنگ کی صنعت میں زیادہ ہے جو جدید ٹکنالوجی کے شانہ بشانہ چلنے میں ناکام رہی ہیں۔ جاپان، جنوبی کوریا اور تائیوان میں نئی ٹکنالوجی کی اختراعات برسوں پہلے استعمال میں لانی شروع کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ اب وہ بین الاقوامی منڈیوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس جن ملکوں نے دفعتاً اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے جدید ٹکنالوجی اختیار کی انھوں نے اپنے کارکنان کی تعداد میں وسیع پیمانے پر تخفیف کرنی پڑی جس کا نتیجہ بے روزگاری میں اضافے کی شکل میں ہوا۔

لہذا مزدور یونینوں کو ان تبدیلیوں کو تسلیم کرکے باہمی طور پر قابل قبول ایسے حل تلاش کرنے چاہئیں جن سے عظیم لیبر فورس کے حقوق اور مستقبل کی حفاظت کی جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ صنعت کو مزید ترقی و استحکام حاصل ہو سکے۔ یہاں پر انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی برن پور مغربی بنگال کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس میں مزدور یونینوں اور منتظمان نے کمپنی کی جدید کاری کے لیے آپس میں سمجھوتہ کر لیا۔

ملک میں اُجرتوں کی ایک قومی پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے اُجرتوں کا نظام ابھی تک درست نہیں ہے۔ معیشت کے مختلف شعبوں میں اجرتوں میں وسیع پیمانے پر نابرابری ہے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ٹکنالوجی کی مزید تبدیلیوں سے مختلف شعبوں میں اجرتوں میں مزید فرق پیدا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ملک میں ایک انصاف پسندانہ اُجرت پالیسی وضع کرنے کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔

جدید ٹکنالوجی کے تعلق سے ایک اہم بات جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ ہے کارکنان کی تربیت اور بازتربیت۔ اگر مزدور یونینوں کو تربیتی نصابات کی ترتیب و تشکیل میں شامل کیا جائے تو یہ نصابات زیادہ حقیقت پسندانہ اور کارآمد ہو سکتے ہیں، جو صنعت کے وسیع تر مفاد میں ہوگا۔

ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ (تحقیق و ترقی) کا ایک اور شعبہ ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس شعبہ کے تئیں عدم توجہی کی وجہ سے ہی صنعت میں منتظمانہ اور ٹکنالوجیکل اختراعات کا مکمل فقدان ہے۔ ریسرچ کرنے والوں اور فیکٹری یا کارخانے میں کام کرنے والوں کے درمیان [illegible] تکنیکیں دریافت کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال [illegible] چاہیئے۔

ہمارا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ ٹکنالوجی کی تیز رفتار تبدیلیوں سے انجینیئروں، منتظمان اور مزدوروں سب پر زیادہ جسمانی و دماغی بوجھ پڑتا ہے۔ اس لیے آٹھ گھنٹے کی شفٹ کا نظام بڑی حد تک اپنی مناسبت کھو چکا ہے۔ دوسری طرف صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک نے ثابت کر دیا ہے کہ ۶ گھنٹے اور ۴ گھنٹے کی شفٹوں سے زیادہ پیداواریت حاصل ہو سکتی ہے اور آدمیوں اور مشینوں کا معاشی طور پر بہتر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ بھارت میں مزدور یونینیں صرف منظم سیکٹر تک ہی محدود ہیں۔ غیر منظم اور دیہی سیکٹر جس میں ملک کی کل لیبر فورس کا نوے فی صد حصہ کام کرتا ہے، مزدور یونینوں کے دائرے میں نہیں آتا۔ اور چونکہ غیر منظم اور دیہی سیکٹر ہی ایسا شعبہ ہے جو عدم توجہی کا شکار ہے اور جس کا سب سے زیادہ استحصال ہو رہا ہے۔ مزدور یونینوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان شعبوں کے مفادات کا بھی تحفظ کریں۔ اگر وہ ان شعبوں کو مسلسل نظرانداز کرتی رہیں گی تو اس سے بالآخر انہی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

●

بقیہ: جوابات: کیا آپ جانتے ہیں؟

۲۵۔ بڑکھا رُت۔
۲۶۔ امیر مینائی نے۔
۲۷۔ پدما (Padma)
۲۸۔ آندھرا پردیش کا ساحلی علاقہ (Coastal Andhra Pradesh)
۲۹۔ لیٹرائیٹ مٹی (Laterite Soil)
۳۰۔ ہیمٹائیٹ (Haemetite)
۳۱۔ ۱۹۷۱ء میں۔
۳۲۔ آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت۔
۳۳۔ تلمیح
۳۴۔ شری سی۔ راج گوپال چاری۔
۳۵۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۶ء۔
۳۶۔ ڈائریکٹ ٹیکس
۳۷۔ ۱۸۵۴ء میں۔
۳۸۔ جرا یوگی۔
۳۹۔ ۸۴۳،۹۳ ملین۔
۴۰۔ ساراجیوو (SARAJEVO)

●

ڈاکٹر سلیم احمد

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی

ہمارا مادرِ وطن سونے کی چڑیا کے نام سے موسوم شہرۂ آفاق ملک ہے جو ہمیشہ سے اپنی ستم ظریفی کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ کبھی آریوں نے تو کبھی منگولوں نے قدرتی اشیاء سے متاثر ہوکر حکمرانی کا خواب دیکھا اور کبھی مغلوں نے شاہی حکومت کی اور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا تو دوسری طرف منحوس گوروں نے یہاں بے انتہا مظالم ڈھائے اور تاریخ میں ظلم وستم کا نیا باب جوڑکر ہمارے گلے میں غلامی کی آہنی زنجیر پہنائی۔

انگریزوں کا نظریہ صرف ہندوستان پر حکومت کرنا اور ہندوستانیوں کو اپنا غلام بناکر یہاں کے مال و اسباب اپنے ملک لے جانے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ عیسائیت کی تبلیغ وترسیل کرکے ہندوستان میں عیسائیت کا علم بلند کرنا ان کا مطمح نظر تھا۔ ایک انگریز ایو کمینڈی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ :-

"جب تک ہندوستان میں
ہماری سلطنت باقی ہے ہمیں
بھولنا نہیں چاہیئے کہ ہمارا
اصل کام اس ملک میں عیسائیت
کا پرچار ہے۔"

اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے ہر ممکن اور ناممکن حربوں کا استعما
ہمارے پرانے رسم و رواج، طرز
سماجی نظم وضبط، صنعت وحرفت ا
تمدن کی روایات کو بری طرح مسخ

انگریزوں کا روز بروز بڑھتا ہوا ستم نہ صرف ہندوستانی عوام پر نازل ہوتا رہا بلکہ ہندوستانی فوج بھی ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہی۔ اس بربریت کے خلاف عوام میں اندر ہی اندر برسوں سے سُلگ رہی چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کرنے کے لیے متفقہ طور پر پورے ہندوستان میں انقلابیوں اور رہنماؤں نے ۳۱ مئی کا دن مقرر کیا لیکن میرٹھ کے حالات اور جذبات نے وقت سے پہلے کروٹ بدلی اور ۱۰ مئی، ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی فوج نے انقلاب کا بگل بجادیا جسے انگریزوں نے غداری سے تشبیہہ دے کر "غدر" کے نام سے موسوم کیا۔

دراصل یہ جنگ ہندوستان کی پہلی باقاعدہ جنگ تھی جو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے ظلم وستم کے خلاف غیر منظم طریقہ سے لڑی گئی جس کی خاص وجہ فوج میں چربی

پہلا واقعہ جنوری ۱۸۵۷ء میں پیش آیا جب کسی ہندوستانی سپاہی اور کارخانے میں کارتوس بنانے والے کسی ملازم سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا جس پر کارخانے کے ملازم نے طنزیہ کہا کہ :-

"اب تم لوگوں کا دھرم کہاں
رہے گا جب کہ تمہیں سؤر اور
گائے کی چربی کے کارتوس
کا استعمال کرنا پڑیں گے۔"

اس معاملے کو فوری طور پر میجر کورنا نے دبا دیا پھر بھی یہ بات فوج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی جس کا علم انگریز افسروں کو بخوبی ہوگیا تھا لہذا ۸ مئی، ۱۸۵۷ء کو کرنل سمائتھ نے ہندوستانی فوج میں پھیلی افواہوں اور

بسنت پور (بکی سرائے)، گورکھپور۔ ۲۷۳۰۰۵۔

بے چینی کو دور کرنے کے لیے پریڈ کے موقع پر فوج کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان سپاہیوں پر ان کی تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا اور فوج نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا جس پر ۸۵ سپاہیوں کو حوالات کے سپرد کر دیا۔ اس سے قبل ۲۲ اپریل کو بھی تقریباً ۵۰ سپاہیوں کو اسی واقعہ کے تحت دس سال کی سزا دی جا چکی تھی۔

اس واقعہ کا تذکرہ صرف میرٹھ کے سپاہیوں ہی میں تھا بلکہ میرٹھ کے شہریوں میں بھی خبر گرم تھی کہ دو ہزار بیڑیاں باقی سپاہیوں کے لیے ہوائی جا چکی ہیں جو دوسرے دن پہنائی جائیں گی اس افواہ نے میرٹھ کے سپاہیوں کو مقررہ وقت سے پہلے فوری قدم اٹھانے کے لیے مجبور کیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کی بات ہے جب انگریز بالکل مطمئن گرجا گھر جانے میں مصروف تھے اور کچھ گرجا گھر پہنچ چکے تھے ٹھیک اسی وقت ہندوستانی فوج نے میرٹھ چھاؤنی کی چھتوں میں بندوقوں سے فائر کر کے جنگ آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگر ہندوستانی فوج چاہتی تو اس وقت ایک ایک منحوس کا میرٹھ میں صفایا کر سکتی تھی لیکن فوج کا اصل مقصد قتل و غارت گری نہیں تھا بلکہ ہندوستان سے کمپنی راج کا خاتمہ تھا۔ مگر جب انگریز افسروں نے اس طوفان کو زبردستی روکنا چاہا تو فوجی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر کیا تھا بیسویں رجمنٹ نے پہلے بندوق سنبھالی اور پہلے انگریز افسر کرنل فنٹس (Col. FINTS) کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا اس کے بعد تو ہندوستانی فوج نے جو اپنے تیور دکھلائے اسے انگریز خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتے تھے۔

اس ہنگامۂ دار و گیر سے انگریزوں کے لیے بحث و تحیۃ اور فنا و بقا کا سوال پیدا ہو گیا لہٰذا انگریزوں نے اپنے اکھڑتے ہوئے قدم کو جمانے اور ہندوستانیوں کو پسپا کرنے کے لیے ایسے ناروا بہیمانہ سلوک کیے جو انسانیت کے ماتھے پر کلنک ہے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلابیوں نے جیل خانے کی دیوار توڑ کر اپنے فوجی بھائیوں کو آزاد کرا لیا اور اس طرح میرٹھ فتح کرنے کے بعد ۱۱ مئی کی صبح کو انقلابی دہلی پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے انقلابی فوج کا امیر منتخب کرنے کے لیے انقلابیوں نے بہادر شاہ ظفر کو اس غیر منظم جماعت کا رہنما بننے پر مجبور کر دیا اور پھر اس طرح سے دہلی پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس وقت تک آزادی کی یہ لڑائی ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی تھی۔ کانپور میں انقلابیوں کی رہنمائی نانا صاحب اور وزیر عظیم اللہ خاں، اودھ میں واجد علی شاہ کی بیوی بیگم حضرت محل، بندیل کھنڈ میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے برہنہ شمشیر لے کر انقلابیوں کی رہنمائی کی اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ روہیل کھنڈ نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا اور سب سے آخیر میں اپنی ہار قبول کی۔ دہلی میں بخت خاں کو سپہ سالار اعظم اور شہزادہ مرزا تفضل حسین کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ فتح گڑھ اور فرخ آباد میں تفضل حسین خاں نے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کیا۔ نواب عبدالصمد اور نواب عبدالرحمان خان نے جھجر، فرخ نگر، ولبھ گڑھ، بہادر گڑھ، دوجانہ، پٹودی اور لوہارو وغیرہ ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ بہادر خاں نے بریلی اور محمود خاں نے بجنور کی کمان اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور انگریزوں کو پسپا کیا۔

اس طرح سے پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی لڑی گئی اور کچھ دنوں کے لیے ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد بھی ہو گیا لیکن انگریزوں کی لڑائی دہلی میں اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ دہلی دوبارہ انگریزوں کے ہاتھ میں نہ آ گئی۔ لہٰذا انگریزوں نے دہلی میں مسلسل جنگ جاری رکھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ مئی کو انگریزوں کے ہاتھوں سے نکلی ہوئی دہلی ۱۴ ستمبر کو دوبارہ انگریزوں کے اقتدار میں آ گئی جس کی خاص وجہ ہندوستانیوں کی غیر منظم تحریک اور فوج کی افراتفری تھی۔

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا پوری طرح سے قبضہ ہو گیا اور جنرل ولسن کو یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ دوبارہ برطانوی حکومت کو اقتدار میں لانے میں کامیاب ہو گیا ہے تو جنرل ولسن اور انگریزی افسروں نے جو ظلم و ستم ڈھائے اس کی مثال تاریخ میں تلاش بسیار سے بھی نہیں مل سکتی۔ سب سے پہلے انگریزوں نے جو قدم اٹھایا وہ تھا بہادر شاہ اور ان کے بیٹوں کی دھوکے سے گرفتاری اور بیٹوں کا سر کاٹ کر معزول بادشاہ کے سامنے پیش کیا جانا۔ اسی طرح سے انگریزوں نے ہندوستان کے محبانِ وطن کو قتل عام کر کے انتقام لینا شروع کر دیا ______ ان کی جاگیریں ضبط کر لیں اور ملازمت سے انھیں محروم کر دیا گیا لہٰذا انگریزوں کے اس درندگی سے محبانِ وطن میں اتنی قوت و ہمت باقی نہ رہی کہ وہ پھر سے اپنی فلاح و بہبود کی بات سوچ سکتے۔ مگر جذبۂ حریت کی چنگاری ناکامئ انقلاب کی خاکستر میں کبھی سرد نہیں پڑی بلکہ وقتاً فوقتاً سازگار ہوا پاکر دہکتی رہی اور محبانِ وطن نے آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ آخر میں ایک صدی کے بعد سچ ثابت ہوا۔

بقیہ: آپ سب کے لیے

بنجر زمین ترقیات ایوارڈ اسکیم

حکومت ہند نے بنجر زمین ترقیات کے قومی پروگرام میں عوام کو ملوث کرنے کی غرض سے ایک بنجر زمین ترقیات ایوارڈ اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا نام "راجیو گاندھی پرتی بھومی متر ایوارڈ" ہوگا۔ اس امر کا اعلان بنجر زمین ترقیات کے وزیر مملکت کرنل راؤ رام سنگھ نے بنجر زمین ترقیات میں عوام کے اشتراک و تعاون کے موضوع پر منعقدہ غیر سرکاری اداروں کی کانفرنس میں کیا۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ایوارڈ کے تحت ۵۰،۰۰۰ روپے کا انعام دیا جائے گا اور یہ اسکیم سرکاری ایجنسیوں کارپوریٹ ایجنسیوں / غیر سرکاری اداروں، گاؤں کی سطح کے اداروں، پنچایت راج اداروں، تعلیمی اداروں، انفرادی طور پر کاشت کرنے والوں اور ایسے دیگر افراد و اداروں پر احاطہ کرے گی جو کان کنی کے عمل کے بعد چھوڑ دیے گئے بیکار رقبے کی ترقی میں مصروف ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ ریاستی سطح پر بھی ایوارڈ دینے کی اسکیم بھی ہے۔ ●

دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی سپلائی

دیہی علاقوں میں پینے کا صاف پانی فراہم کرنا بنیادی طور پر ریاستوں کی ذمہ داری ہے۔ تاہم مرکزی حکومت دیہی عوام کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے اہم کام کو اولین ترجیح دے رہی ہے دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی کو تیز کرنے کا پروگرام ۷۳-۱۹۷۲ء پروگرام اے۔ آر۔ ڈبلیو۔ ایس۔ پی شروع کیا گیا تھا۔ اس کے تحت تکنیکی اور مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے — کم از کم ضرورت پروگرام کے تحت دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی کی شروعات کے ساتھ اے۔ آر۔ ڈبلیو۔ ایس۔ پی کو واپس لے لیا گیا تھا لیکن ۷۸-۱۹۷۷ء میں یہ پروگرام دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ اس پروگرام کو مزید کامیاب بنانے کے لیے ۱۹۸۶ء میں پینے کے پانی کا قومی مشن شروع کیا گیا۔

حکومت کی کوششوں سے ۹۲-۱۹۹۱ء کے اختتام تک ۸۴،۵۷ فی صد دیہی آبادی کو پینے کا صاف ایسا پانی فراہم کرنا ممکن ہوا ہے۔ یہ ۱۷۸ کروڑ روپے کی مرکزی امداد کے باعث ممکن ہوا ہے۔

۱۹۹۲ء میں تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ دیہی عوام کے لیے پینے کے پانی کی سپلائی کے بارے میں از سر نو جائزہ لیں یہ جائزہ دو حصوں میں کیا جا رہا ہے۔ اول یہ کہ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی صورت حال کیا ہے اور دوسرے یہ کہ دیہی عوام جو پینے کا پانی استعمال کرتے ہیں اس کا معیار کیا ہے۔ اس جائزے کی رپورٹ جون ۱۹۹۳ء تک مل جائے گی تو آٹھویں پنجسالہ منصوبے کی نئی حکمت عملی یہ ہوگی کہ تازہ جائزے کے نتائج کی بنا پر پانی کے مسائل سے نبٹا جائے۔ ضلع سطح پر ۱۵ لیبریٹریاں اور ۱۷ چلتی پھرتی تجربہ گاہیں پہلے ہی چالو کر دی گئی ہیں۔ تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں نے پانی کے معیار کی جانچ کرنے والی کٹ بھی خرید لی ہے۔ یہ تجویز بھی ہے کہ آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک ملک کے ہر ضلع میں پانی کی جانچ کرنے والی ایک تجربہ گاہ قائم کر دی جائے۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے کا ایک اہم مقصد ان دیہی علاقوں میں پینے کا پانی فراہم کرنا ہوگا جو اس سہولت سے اب تک محروم ہیں۔ منصوبے کے دیگر اہم مقاصد میں پانی کی سپلائی کی اسکیم کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ ●

بقیہ: دادا صاحب پھالکے ایوارڈ

پرتی دھونی (PRATI DHAUANI) سراج (SIRAJ)، لوٹی گھوٹی (LOTI GHOTI) چمیلی میم صاحب (CHAMELI MEM SAHEB) مون پرجاپتی (MON PRAJAPATI) سگلا فلموں میں جوبن ترشنا (JOBAN TRISHNA) اونا کیرالے، دمپتی (DAMPATI) دیو (DVI) کوری او کومل (KORI O KOMAL) آسام پتا (ASSAM PATTA) سیمانا پریہ (SIMANA PRIYA) اور ہندی فلموں میں آروپ (AAROP)، ایک پل (EK PAL) اور رودالی (RUDALI) اہم ہیں۔

۱۹۶۲ء میں انھیں ان کی فلم شکنتلا (SHAKUNTIA) پر پہلی بار قومی اعزاز عطا کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں پرتی دھونی (PRATIDHWNI) پر ۱۹۶۷ء میں لوٹی گھوٹی (LOTI GHOTI) ...

دو اعزازات عطا کیے گئے۔ اس سال انھیں ان کی فلم رودالی (RUDALI) پر تین قومی اعزازات بھی دیے گئے ہیں۔ یہ اعزازات بہترین اداکاری پر (DIMPLE) کو، بہترین آرٹ ڈائریکشن پر سمیر چندرا (SAMEER CHANDRA) کو اور بہترین کاسٹوم ڈیزائننگ (COSTUME DESIGN) پر مالادیو (MALADEV) کو عطا کیے گئے ہیں۔ انھیں قومی اعزازات کے علاوہ فلم فیئر اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

قصہ مختصر یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۹۳ء کا سال حقیقی معنی میں ڈاکٹر بھوپین ہزاریکا کا سال ہے۔ ●

توحید خان

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ بھگوان مہاویر کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے ؟

۲۔ کون سا شاہی سلسلہ (Dynasty) ہندوستانی تاریخ میں "سنہری دور" (Golden Age) کے طور پر جانا جاتا ہے ؟

۳ "نیو انڈیا" (New India) نام کا رسالہ کس نے جاری کیا تھا ؟

۴ کس مسلم حکمراں کو "عقل مند بے وقوف" (Wisest fool) کہا جاتا ہے ؟

۵۔ "ہندوستان چھوڑو تحریک" (Quit India Movement) کب شروع ہوئی تھی ؟

۶۔ "نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء" کی سفارش کیا تھی ؟

۷۔ بنگلہ دیش کا وجود کب عمل میں آیا تھا ؟

۸۔ مہاتما گاندھی نے "کرو یا مرو" (Do or Die) کا نعرہ کب دیا تھا ؟

۹۔ ہندوستان کی کون سی کتاب ۴۰ غیر ملکی اور ۱۵ ملکی زبانوں میں ترجمہ کی گئی ہے ؟

۱۰ ہندوستان کا بسمارک (Bismarck of India) کسے کہا جاتا ہے ؟

۱۱۔ بتائیے کہ بہادر شاہ ظفر کہاں دفن ہیں ؟

۱۲۔ اردو شاعروں میں "یاسیت کا امام" کسے کہا جاتا ہے ؟

۱۳۔ "گاندھی" نام کی کتاب کا مصنف کون ہے ؟

۱۴۔ "بین الاقوامی مالیاتی فنڈ" (IMF) کے ممبر کتنے ممالک ہیں ؟

۱۵۔ کملیش مہتا (Kamlesh Mehta) کا تعلق کس کھیل سے ہے ؟

۱۶۔ "ڈاکٹر واٹسن" (Dr. Watson) کس کتاب کا کردار ہے اور اس کا خالق کون ہے ؟

۱۷۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے لیے کل کتنی رقم مخصوص کی گئی ہے ؟

۱۸ پتے ہرے رنگ کے کیوں ہوتے ہیں ؟

۱۹ وٹامن اے (Vitamin-A) کی کمی سے کون سی بیماری ہوتی ہے ؟

۲۰ ہندوستان میں کس چیز کی کمی کے سبب "اینمیا" (Anaemia) کی بیماری ہوتی ہے ؟

۲۱۔ "وائرلیس ٹیلی گراف" کا موجد کون ہے ؟

۲۲۔ "انسولین" (Insulin) کی دریافت کس نے کی تھی ؟

۲۳۔ بی سی جی (B.C.G) کا ٹیکہ کس بیماری سے بچنے کے لیے لگایا جاتا ہے ؟

۲۴۔ کس چیز کی موجودگی کے سبب خون کا رنگ لال ہوتا ہے ؟

۲۵۔ "انجمن پنجاب" کے پہلے نظمیہ مشاعرے کا عنوان کیا تھا ؟

۲۶۔ "دامنِ گلچیں" کے نام سے رسالہ کس نے نکالا تھا ؟

۲۷۔ گنگا ندی، بنگلہ دیش میں داخل ہونے پر کس نام سے جانی جاتی ہے ؟

۲۸ کس علاقے کو "رائس بول آف انڈیا" (Rice Bowl of India) کہا جاتا ہے ؟

۲۹۔ چائے کی کھیتی کے لیے کس قسم کی مٹی مناسب ہوتی ہے ؟

۳۰۔ لوہے کی کچی دھات (Iron ore) کو کیا کہتے ہیں ؟

۳۱۔ ہماچل پردیش باضابطہ طور پر ایک ریاست کب بنا ؟

۳۲۔ آئین میں ترمیم کا اختیار کس آرٹیکل کے تحت فراہم کیا گیا ہے ؟

۳۳۔ شعر میں اگر کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو اسے شاعری کی اصطلاح میں کیا کہا جاتا ہے ؟

۳۴۔ ہندوستان میں "سوتنتر پارٹی" (Swatantra Party) کس نے بنائی تھی ؟

۳۵۔ ہندوستان کے آئین کی تشکیل کے لیے آئین ساز اسمبلی کب قائم ہوئی تھی ؟

۳۶۔ "وانچو کمیٹی" (Wanchoo Committee) کس بات کی وضاحت کرتی ہے ؟

۳۷۔ ہندوستان میں پہلا Cotton Mill کب قائم ہوا تھا ؟

۳۸۔ ہندوستان میں کس جگہ پر بارش سب سے زیادہ ہوا کرتی ہے ؟

۳۹۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی کتنی ہے ؟

۴۰۔ بوسنیا (BOSNIA) کی راجدھانی کا نام بتائیے ؟

(جوابات صفحہ ۲۱ پر)

نئی دھلی

یوجنا

جلد ۱۳ شمارہ ۷ - ۸

لم تا ۳۱ر جولائی ۱۹۹۳ء : ۱۰ر آساڑھ تا ۹ر شراون تک ۱۹۱۵

قیمت ۳ روپے . ٹیلی فون ۶۰۱۸۱۸

نرخ چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے ۔ فی کاپی ۳ روپے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۲۰ فی صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

یڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴

یول ۵، آر۔ کے۔ پورم (دہلی) نئی دلی ۱۱۰۰۶۶

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن : ایس۔ ایم۔ چہل

بیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس شمارے میں

آر. سی. راجہ منی

ایک تکلیف دہ حقیقت

جدید صنعتی سماج کی ایک بہت ہی تکلیف دہ حقیقت مزدور بچے ہیں۔ مزدور بچوں کی تعداد اور ان کی پریشانیاں ہر سال تقریباً بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ افسوس کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کے حقوقِ انسانی کی اس پامالی کی مذمت بھی کی جا رہی ہے۔ پھر بھی اس پر عمل وسیع پیمانے پر ابھی تک جاری ہے۔ اس مزدوری پیشہ بچوں کے چاروں طرف ایک خاموشی کی دیوار ہے جس کی بنیاد لاعلمی ہے اور اس کو ختم کرنا ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کچھ دنوں پہلے ساری دنیا میں "بچوں کا سال" منایا گیا تھا، اور ایک سو سے زیادہ ممالک نے بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے اجلاس کی منظوری دی تھی۔ عالمی ایجنڈہ میں مزدور پیشہ بچوں کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جب کہ حقیقت ایک دوسرا ہی پہلو پیش کرتی ہے۔

دنیا بھر میں کتنے مزدوری پیشہ بچے ہیں۔ اس کا علم کسی کو بھی نہیں ہے۔ مختلف قسم کی رپورٹیں آئی ہیں جس سے ۱۰۰ سے ۲۰۰ ملین کے قریب مزدور بچوں کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں زیادہ تر بچے جن کی عمر ۱۰ سے ۱۴ سال ہے کام کر رہے ہیں۔ کچھ دوسرے ترقی پذیر ممالک میں ان کی تعداد تقریباً ۲۰ فی صد سے ۳۰ فی صد ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ غریبی ہو سکتی ہے۔ مگر صرف غربت ہی اس کی وجہ نہیں ہے۔ اکثر بچے کام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو کچھ کرنے کے لیے ہوتا ہی نہیں ہے، اسکول کا انتظام نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو ناقص اور کافی خرچیلا ہے۔ فی الحال دو سطح پر تشویش جاری ہے۔ جن میں ایک مزدور بچوں کی تعداد میں اضافہ اور خطرناک قسم کے کاموں میں ان کا مصروف لگے رہنا۔ اس کی وجہ سے بڑھتی ہوئی شہروں کی طرف ہجرت اور صنعتی ترقی بھی ایک بہت بڑا سبب ہے۔ ان میں اُن بچوں کی زندگی زیادہ خطرے میں ہے جو بندھوا ہیں۔ ان کو زبردستی کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ کچھ کو تو غریب ماں باپ چھوٹے سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور نتیجتاً ان بچوں کو قید کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ کچھ بچوں کو اغوا کر کے اینٹ بنانے کے کام میں لگا دیا جاتا ہے کچھ کو گنّے کی کٹائی اور مٹھائی کی دوکان پر بھی کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ جو بچے کانوں میں کام کرتے ہیں اور جو سنگ تراشی کا کام کرتے ہیں، ان کی آنکھوں کی روشنی بہت قریب سے کام کرنے سے خراب ہو جاتی ہے۔ جو بچے کارخانوں میں کام کرتے ہیں وہ سانس لیتے وقت کیمیائی اشیاء کو اندر لیتے ہیں اور نتیجتاً وہ مختلف امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ مزدور بچے وقت سے پہلے جوان ہو جاتے ہیں۔ جسمانی، جذباتی، اخلاقی اور ان کی ذہنی قابلیت بالکل مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ بچے تعلیمی مواقع کو ضائع کر چکے ہیں کہ جو ان کے مستقبل کو سنوار دیتی۔ مزدور پیشہ بچے صرف ترقی پذیر ممالک ہی میں محدود نہیں ہیں۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بچوں میں بڑھتے ہوئے پیشہ ورانہ خطرات سے بھی ان کا سروکار ہے۔ گرچہ بچوں کی مزدوری کا پیشہ ایک ہمیشہ رہنے والی برائی ہے۔ اور یہ برائی پچھلے دس سال سے اور بھی سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ بچوں کو اب تو اور نئے نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

کیڑا مار دوائیں اور کھاد جو کہ مہلک کیمیائی اشیاء سے لیس ہوتی ہیں اور ان کا استعمال زراعت میں بہت عام ہے۔ بچے جو کھیت میں کام کرتے ہیں وہ اپنی لاعلمی کے سبب ان

کے نقصان کو نہیں جانتے، وہ وہیں کام کرتے ہیں اور بنا ہاتھ دھوئے کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ ہزاروں بچے کوڑا کرکٹ کے سہارے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ہاسپٹل سے پھینکے گئے فاضل تاب کار (RADIOACT-IVE WASTE) دواؤں کی بوتلیں اور خراب بیٹریوں کو جمع کرتے وقت ہاتھ لگاتے ہیں۔

جلائی جور بچوں پر حال ہی میں کیے گئے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خون میں بہت زیادہ مقدار میں دھات جمع ہو چکی ہے جس کی وجہ سے ان کی جسمانی اور دماغی نشوونما خطرے میں ہے۔ یہ چیزیں انسان کے جسم میں جمع ہو کر کئی مہلک بیماریوں کا شکار بنا دیتی ہیں۔ ایک صحت سے متعلق مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شیشہ اور دھات کے کارخانے میں نقصان دہ دھوئیں کو سانس کے ساتھ لینے سے ان کے پھیپھڑے بے کار ہو جاتے ہیں۔ جو بچے قالین کی فیکٹریوں میں کام کر رہے ہیں وہ گھنٹوں جھکی ہوئی حالت میں رہتے ہیں جس کی وجہ کر ان کا جسم بدنما اور کبڑا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل صورت حال ہے اور بچوں کی نشوونما میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

افسردہ منظر

ہندوستان میں مزدوری پیشہ بچوں کی حالت ایک بہت ہی افسردہ منظر پیش کرتی ہے۔ ۱۸ ملین بچے جن کو اسکول میں ہونا چاہیے تھا وہ متعدد غیر قانونی پیشہ میں کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۱ء کے سرکاری اندازے کے مطابق اس ملک میں قریب ۱۳۶۴۰۸۲ پیشہ ور بچے تھے۔ آج ان کی تعداد کا کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ سماجی حالات اور غربت کی وجہ سے والدین مجبوراً بچوں کو ایسے کاموں میں لگاتے ہیں جن سے ان کی پڑھائی اور صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو کہ ۱۰ سال پرانا ہے۔ زراعت میں ۷۴،۴۷،۰۰۰ بچے کام کرتے ہیں۔ یہ کل مزدور پیشہ بچوں کا ۴۲،۲۷۵ فی صد حصہ ہے۔ قالین سازی، ماچس فیکٹری، پٹاخوں کی فیکٹری اور بیڑی بنانے کے کاموں میں ابھی تک قانون کی خلاف ورزی کر کے بچوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مزدوری پیشہ بچوں کے لیے ۱۹۸۶ء میں ایک قانون بنا تھا جس میں ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو ناروں کی آمد و رفت، ریل اور مکان بنانے کے کاموں سے میں لگایا جا سکتا ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۱ء میں ٹرانسپورٹ، اسٹوریج اور آمد و رفت کے کاموں میں پیشہ ور بچوں کی تعداد .... مزدوری پیشہ بچوں کا ۱۳۱ فی ... سانے کی صنعت و حرفت ... کام کرتے ہیں جو مزدوری پیشہ ... فی صد حصہ ہے۔ صنعت حرفت میں قریب ایک ملین بچے کام کرتے ہیں۔ جو مزدوری پیشہ ور بچوں کا ۸ فی صد حصہ ہے۔ پتھر اور مختلف کانوں میں تقریباً ۲۷،۰۰۰ بچے کام کرتے ہیں جو مزدوری پیشہ ور بچوں کا ۲۴،۰ فی صد حصہ ہے۔ مویشی پالن، جنگلات کا پیشہ، مچھلی پالن اور شکار اور شجر کاری میں ۰،۴۰۰ بچے کام کرتے ہیں جو مزدوری پیشہ بچوں کا ۶،۳۰ فی صد حصہ ہے۔ تجارتی کاموں میں ۲،۴۶،۰۰ اور دوسرے کاموں میں ۳،۲۶،۰۰ بچے کام کرتے ہیں جو مزدوری پیشہ بچوں کا ۵ فی صد حصہ ہے۔ سرکار کے اندازہ کے مطابق ہندوستان میں ۱،۸۵ کروڑ مزدوری پیشہ بچے ہیں۔ ۱۹۸۶ء کے مزدوری پیشہ بچوں کے لیے قانون بننے کے باوجود ۵ فی صد بچے خطرناک حالت میں کام کرتے ہیں۔

ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۶ء کے ایکٹ کے مطابق اگر بچوں کی مزدوری کو جائز قرار دیا جائے تو یہ ملک اور حکومت کے لیے افسوسناک بات ہے۔ اگرچہ سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق تقریباً ۱۴ بچوں کی رہائی اور ان کے بازآبادکاری کا انتظام ہونا چاہیے اس کے باوجود ہمارے [illegible] ابھی تک [illegible] میں قالین [illegible] کام کرتے ہیں۔

[illegible] کی رپورٹ کے مطابق ۱۵ فی صد مزدوری پیشہ بچے [illegible] کی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ ایک [illegible] بات ہے کہ ان بچوں کی تعداد [illegible] کے حساب سے [illegible] [illegible] کام کرتے ہیں [illegible]

[illegible] میں پالش [illegible] اور [illegible] کی فیکٹریوں میں بچے کام کرتے ہیں جو قانوناً جرم ہے۔

۱۹۰۳ء کے آئی ایل او (بین الاقوامی مزدور تنظیم) کی مجلس نے دنیا بھر میں کام کرنے والے بچوں کی عمر ۱۵ سال کم از کم مقرر کی تھی اس کے بیس سال بعد بھی ۱۵ سے بھی زیادہ ملکوں نے اسے ابھی تک پوری طرح نافذ نہیں کیا ہے۔

نقص

ہندوستان میں مزدور بچوں کے لیے کم سے کم ایک درجن قانون بن چکے ہیں۔ جیسے دیکھائی ایکٹ، کم از کم اجرت ایکٹ، بچوں کے پیشہ کا قانون (۱۹۳۰ء)، بچوں کی مزدوری کو کم کرنے کا قانون (۱۹۳۳ء) وغیرہ وغیرہ بہر حال

بہت ساری کمیاں باقی رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے آجر مزدوری پیشہ بچوں کا استحصال کھلے عام کر رہے ہیں۔

۱۹۸۶ء کا قانون بہت ہی کم صنعت و حرفت پر پابندی عائد کرتا ہے کہ وہ ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو نوکری پر نہ رکھیں بدقسمتی سے یہ قانون مزدوری پیشہ بچوں کے استحصال کو پوری طرح سے روکنے میں ناکامیاب رہا ہے۔

۱۹۸۷ء میں سرکار نے بہت سارے پروجیکٹ کا اعلان کیا کہ یہ ایسے علاقے میں کیے جائیں جہاں پر مزدوری پیشہ بچے زیادہ تعداد میں جمع ہیں۔ ان سب منصوبوں کو ایسے علاقے میں لاگو کیا گیا ہے جہاں سے بچوں کو خطرناک کاموں سے چھٹکارا دلایا گیا تھا جیسے شیواکاسی کی ماچس کی صنعت و حرفت، جے پور میں قیمتی پتھروں میں پالش کا کام کرتے بچوں کے لیے ایک فلاح و بہبودی منصوبہ بھی تشکیل دیا گیا ہے اسی طرح کے کئی منصوبوں کو اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں بھی لاگو کیا جارہا ہے۔ ان کے لیے اسکول بھی کھولے گئے ہیں جن میں ان کو تکنیکی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔ غذائیت اور ان کی تندرستی کا بھی خیال کیا جاتا ہے پچھلے دو سالوں میں ۲۰۰ سے زیادہ ایسے اسکول کھولے جا چکے ہیں جن میں ۱۲۰۰۰ سے زیادہ بچے پڑھتے ہیں۔ اس منصوبہ میں دو لاکھ سے زیادہ روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔

ان سارے قوانین اور منصوبوں کے باوجود مزدوری پیشہ بچوں کا استحصال رکا نہیں ہے بلکہ اور تیزی کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہے جو کہ ان بچوں کی افسوسناک حالت کو سدھارنے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ رضاکارانہ کام کرنے والی تنظیموں کی کوششیں جاری ہیں مگر یہ صرف سمندر میں ایک قطرہ کے برابر ہے۔ مزدوری پیشہ بچے اپنی خواہش کے مطابق کام کر نہیں سکتے اسی وجہ سے وہ استحصال کی زد سے بہت حد تک غیر محفوظ ہیں۔ ان کا اور دوسرے مزدوروں کی طرح کوئی حق نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی مزدور یونین کے ساتھ مربوط ہو سکتے ہیں۔ نتیجتاً یہ بچے بہت ہی کم تنخواہ میں اور خراب حالت میں کام کرتے ہیں۔

یوحنا، نئی دہلی

مزدوری پیشہ بچوں کے حالات پر قابو پانے کے لیے جو قوانین بنے ہیں اُن کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ان کی غریبی کو رات ورات ختم نہیں کیا جاسکتا، لہذا اس کا مناسب حل یہ ہے کہ بچوں کی مزدوری پر پابندی عائد کردی جائے۔

لہذا ۱۲ سال کے بچوں کو کچھ خاص کاموں میں ہی لگایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کا استحصال نہ ہو۔ اور ان کی تعلیم اور نشوونما کا پورا موقع فراہم ہو اس کے علاوہ کم از کم تنخواہ کا مقرر ہونا۔ کام کرنے کی جگہ صحت کے لیے مناسب ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ۱۹۸۶ء کا قانون بھی ساتھ ہی ساتھ بچوں کے مقرر کردہ وقت سے زیادہ کام کرنے میں پابندیاں عائد کرتا ہے اور ان کے صحت کا خیال بھی رکھتا ہے۔

آئین کی دفعہ ۳۹ میں بھی بچوں کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ ملک اور سرکار کو ایسی پالیسی بنانی چاہیئے جو مرد و زن دونوں کے صحت و قوت کا خیال رکھے، اور ساتھ ساتھ بچوں کے استحصال کی ممانعت بھی کرتا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ بھی بچوں کے حقوق کو پامال ہونے سے روکنے کی بات کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کی نشوونما کے مواقع فراہم کرنے اور اخلاق اور مالی استحصال سے چھٹکارا دلانے کی حمایت کرتا ہے۔ اگر قانونی اور آئینی حفاظت کے باوجود یہ پیشہ جاری رہا تو اس کے وجوہات کسی سے چھپے نہیں ہیں۔ لہذا اس کے لیے وہی لوگ ذمہ دار ہیں جو ملک کی ترقی میں رکاوٹ، غریبی، جہالت اور لاعلمی کے ذمہ دار ہیں اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کی معاشی حالت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جہالت کو ختم کیا جائے جو ۵ء۸۴ کروڑ ہے نصف سے تھوڑا کم ہے۔

اس کے لیے قدم اُٹھائے جا رہے ہیں جیسے ۲۰۰۰ء تک منصوبہ صحت سب کے لیے، معاشی اصلاح، علمی منصوبے تیار کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کی رفتار بہت آہستہ اور تھمی ہوئی ہے۔ اس کے حصول کے لیے ایک بہت ہی سخت سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے جو بچوں کی زندگی سنوار سکتی ہے کیوں کہ بچے ملک کے بے قیمتی جواہرات سے کم نہیں ہوتے ہیں۔

آئی۔ ایل۔ او۔ عالمی پیمانے پر پوری کوشش میں لگی ہے کہ کسی طرح سے اس پیشہ کو روکا جائے اور یہ اس کے رُخ کو پلٹنے کی کوشش بھی کر رہی ہے جس میں معاشی ترقی کے لیے بچوں کا مزدوری پر منحصر ہونا ضروری بن گیا ہے۔ اس پیشہ کو ختم کرنے کے لیے آئی۔ پی۔ ای۔ سی (بچوں کی مزدوری ختم کرنے کے لیے بین الاقوامی پروگرام بھی ایک اظہار کا طریقہ ہے۔ جس کی بنیاد جنوری میں ہندوستان میں پڑی تھی۔ اس پروگرام کو پانچ دوسرے ممالک میں بھی لاگو کیا جارہا ہے جیسے برازیل، انڈونیشیا، کینیا، تھائی لینڈ۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بڑی تنظیموں سے مدد لیتی ہے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے جیسے یونی سیف، یونیسکو، ڈبلو۔ ایچ۔ او۔ اور یو۔ این۔ ایف۔ پی۔ اے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء تک کے لیے ۲۵ء۲ ملین ڈالر، آئی۔ پی۔ ای۔ سی

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ڈاکٹر حیدر علی خاں

نئی معاشی پالیسی

جون ۱۹۹۱ء میں مرکز میں وزیراعظم نرسمہا راؤ کی حکومت کے برسر اقتدار ہوتے ہی مرکزی حکومت کی معاشی پالیسی میں مسلسل تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور گذشتہ سنہ ۱۹۹۱ء-۹۲ء، ۱۹۹۲-۹۳ء اور حالیہ ۱۹۹۳ء-۹۴ء کے تین سالانہ بجٹوں میں ان پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ جس سے ملکی معیشت کے ہر شعبہ میں وسیع اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ چوں کہ ہر خاص و عام کی زندگی پر نئی معاشی پالیسی کے اثرات پڑ رہے ہیں لہٰذا عوامی و نجی مذاکرات، ذرائع ابلاغ اور ملک کی سیاسی فضا میں نئی معاشی پہلو کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر زور دار بحث ہو رہی ہے۔

ہندوستان کے آئین میں سوشلسٹ طرز حکومت قائم کرنے کا ذکر ہے جو بعد ازاں مخلوط معیشت یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کے مرکب کے طور پر نئی معاشی پالیسی کے مروج ہونے تک لاگو رہی ہے۔ اس نظام میں نجی سیکٹر کے ساتھ ساتھ عوامی یعنی پبلک سیکٹر بھی ترقی پاتا رہا ہے۔ لیکن منصوبہ بندی کے گذشتہ چالیس سالوں میں پبلک سیکٹر کے بیشتر کاروباری مراکز کی کارکردگی اچھی نہیں رہی ہے اور مسلسل خسارہ کی وجہ سے ان کی پونجی میں لگا ہوا عوامی پیسہ ختم ہونے لگا۔ دوسری طرف بین الاقوامی پیمانے پر زبردست سیاسی سرگرمیاں رونما ہوئے تھیں اور سوشلزم کے علمبردار سوشلسٹ روس کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک درجن آزاد ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ لہٰذا عالمی پیمانے پر کھلی معیشت (Open Economy) اور آزاد منڈی (Free Market Economy) کرنے کے لیے عالمی مالیاتی اداروں سے کافی زور دیا جانے لگا۔

شری راؤ کو جون ۱۹۹۱ء جو حکومت وراثت میں ملی تھی وہ معاشی طور پر بہت کمزور تھی۔ اس کا غیر ملکی سرمایہ کا محفوظ فنڈ کمترین سطح پر آ گیا تھا اور ملک کی ساکھ عالمی پیمانے پر کافی کمزور ہو گئی تھی۔ لہٰذا اسی پس منظر میں نئی معاشی پالیسی کو جولائی ۱۹۹۱ء سے لاگو کیا گیا۔ اس پالیسی کی خاص نکات ذکر یا مس اس طرح ہیں :۔

(۱) آزاد منڈی نظام معیشت کو رائج کرنا
(۲) معاشی پابندیوں کا خاتمہ۔ تجارت و صنعت وغیرہ میں پابندیاں و تحدیدات نافذ کرنے والے ذاتیں جیسے لائسنس وغیرہ کو منسوخ کرنا۔
(۳) عالمی تجارت کو آزاد کرنا اور اسے گاٹ (GATT) یعنی تجارت و ٹارف کے

عام معاہدہ کے مطابق آزاد طور پر کام کرنے دینا۔ درآمد کے سلسلے میں محفظات کی پالیسی (Protection Policy) کو چھوڑ دینا

ہم اپنا اور معیشت کے ہر شعبہ کو آزادانہ طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

(۶) غیر ملکی سرمایہ کاری کی کھلی اجازت۔ اب صنعتوں اور تجارتوں کے اکیاون فی صد ایکویٹی شیئر تک غیر ملکی حصہ داری کی اجازت ہوگی۔
(۷) عوامی شعبہ یعنی پبلک سیکٹر کو مزید توسیع نہیں دی جائے گی البتہ بڑی اکائیوں کے بیس فی صدی حصوں کو نجی شعبہ کو فروخت کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی بیمار اکائیوں یعنی مسلسل خسارہ اٹھانے والی اکائیوں (Board B.I.F.R. for Industrial & Financial Reconstruction) کو صحتیابی کے لیے سپرد کرنا اور لاعلاج اکائیوں کو

شری مرلی منوہر ٹاؤن، پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بلیا ۲۷۷۰۰۱۔

بند کر دینا۔

(۸) بین الاقوامی کمپنیوں (Multinationals) کے ملک میں داخلہ پر پابندیاں نہیں ہوں گی۔ وغیرہ۔

اس طرح ملک میں آزادانہ عالمی منڈی نظام رائج کرنے کے لیے راہ ہموار کر دی گئی ہے۔ حکومت ہند کی سیاسی معاملات کی پارلیمانی کمیٹی نے معاشی شعبے کے لیے یک مشت پروگرام کو اگلے چار سالوں میں سلسلہ وار نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گذشتہ تین سالانہ بجٹ اسی فیصلہ کی مناسبت سے بنائے گئے ہیں موجودہ بجٹ ۹۴ – ۱۹۹۳ء میں نئی پالیسی کے مطابق جو خاص باتیں شامل کی گئی ہیں وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ **شرح تبادلہ میں یکسانیت:** تمام برآمد کنندگان اور غیر ملکی زر مبادلہ کمانے والے دیگر لوگوں کو اپنی آمدنی کو مارکیٹ کی شرح پر گذشتہ ساٹھ فی صد کے بجائے سو فی صد تبدیل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس سے ملک کو غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

۲۔ **بنکوں میں جمع رقم اور قرض دینے کی شرحوں میں کمی:** افراط زر میں کمی کے پیش نظر بنکوں میں جمع رقوم پر زیادہ سے زیادہ شرح سود بارہ فی صد سے کم کر کے گیارہ فی صد کر دی گئی ہے۔ تجارتی قرضوں کے سلسلے میں سود کی شرح اٹھارہ فی صد سے کم کر کے سترہ فی صد کر دی گئی ہے۔

۳۔ یہ بجٹ معیشت کو طرح طرح کی پابندیوں سے آزاد کرانے کی سمت ایک مثبت قدم ہے۔ بجٹ میں دی گئی رعایتوں، سود کی شرح میں کمی، کسٹم ڈیوٹی اور ایکسائز ڈیوٹی کی شرحوں میں تخفیف اور روپیہ کو قابل مبادلہ بنائے جانے کے نتیجے میں بعض صنعتوں میں موجود مندی کسی حد تک دور ہو جائے گی نیز پیداوار، سرمایہ کاری، اور ایکسپورٹ میں اضافہ ہوگا۔

یوجنا، نئی دہلی

حالیہ بجٹ میں درمیانی طبقے کو بھی ایکسائز ڈیوٹی میں بعض رعایتوں سے فائدہ ہوگا مثال کے طور پر ریفریجریٹر، کولر، پنکھے، ریڈیو، ٹی وی پر ایکسائز ڈیوٹی کم کی گئی ہے اور ان میں سے بیشتر چیزیں درمیانی طبقہ استعمال کرتا ہے۔ چائے، منجن، جوتے اور چپل بھی سستے ہو جائیں گے تو سماج کے نچلے طبقے کو بھی راحت ملے گی۔

لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ کارخانہ دار و کاروباری طبقہ نے ایکسائز ڈیوٹی اور کسٹم ڈیوٹی میں تخفیف کے مطابق قیمتوں کو نہیں گھٹایا ہے جس سے صارفین کو راحت نہیں مل سکی ہے۔ وزیر خزانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے صنعت کاروں اور درآمد کرنے والوں کو متنبہ کیا ہے کہ انھیں دی گئی راحت واپس لی جا سکتی ہے۔ اس وارننگ کا نتیجہ آنا ابھی باقی ہے۔

۹۴ – ۱۹۹۳ء کے بجٹ میں شمال مشرقی خطے یعنی جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، سکم وغیرہ میں صنعتی کارخانوں کو پانچ سال کے لیے ٹیکس میں چھوٹ دی گئی ہے۔ یا تحقیق اور ترقی (Research and Development) کے لیے ٹیکس میں سو فی صدی کی تخفیف، اور پروجیکٹوں کی درآمدانی ڈیوٹی پچپن فی صد سے کم کر کے پینتیس فی صد کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ملک کے تمام بجلی گھروں اور بجلی سپلائی کرنے والے اداروں کو پانچ سال کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ ان سب تجاویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ملک کی معیشت بہتر ہوگی اور صنعتی پیداوار میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ کی یہ تجویز قابل ستائش ہے کہ فرقہ وارانہ اتحاد کے قومی فاؤنڈیشن کو دیئے جانے والے عطیات پر کوئی ٹیکس نہیں ہوگا۔ ملک کی موجودہ صورت حال میں جب کہ ہزارہا افراد فرقہ وارانہ تشدد کا نشانہ بن چکے ہیں اور کروڑوں کی جائداد فرقہ پرستی کی آگ میں جل کر خاک ہو چکی ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد سے متعلق فاؤنڈیشن کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے کی تجویز بلاشبہ قابل مبارکباد ہے۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے نئی صنعتی پالیسی اور اندرون ملک غیر ملکی سرمایہ کاری بڑھانے کی بات کی وضاحت کی ہے کہ کسی بھی ملک کے لیے صرف درآمد متبادلات (Import Substitution) پر زور دینا سود مند نہیں ہے۔ "خود کفالت" کے بجائے ساری دنیا میں "لگائیے" کا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اینڈ الکٹرن لاگت پر مال بنانے والے ملکوں و صنعتی اداروں کو نئے تقابلی ماحول میں زندہ رہنے کا حق ملے گا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ بہترین ٹکنالوجی کا استعمال ہی سود مند ہوگا۔ اس کے لیے غیر ملکی سرمایہ کاری اور ٹکنالوجی معاون ثابت ہوگی۔ اسی لیے غیر ملکی سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کے لیے نیا صحت مند نظام رائج کیا گیا ہے۔ انتظامی طریق کار سہل بنایا گیا ہے اور سرمایہ کاری سے متعلق تجاویز کو اب فوراً منظوری دی جاتی ہے۔ اب لائسنس اور پرمٹوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے سرکار ایسے اہم شعبوں میں سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینا چاہتی ہے جہاں سرمایہ کاری بڑے پیمانے پر درکار ہے اور جہاں دستیاب صلاحیت ناکافی ہے۔ مثلاً بجلی کی تیاری، ہائیڈرو کاربن سیکٹر وغیرہ۔ ہائیڈرو کاربن کی ترقی اور [illegible] کے مشترکہ پراجیکٹوں کی اب [illegible] جائے گی تیل اور قدرتی گیس کو صاف کرنے اور اسے فروخت کرنے نیز اس کی [illegible] دستیاب فراہمی کے سلسلے کی سرگرمیوں [illegible] کوششوں کے تحت بڑھاوا [illegible] کاربن پراجیکٹ ملک کے مستقبل کے [illegible]

اہم کردار ادا کریں گے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے تمام پراجیکٹ جن کا ایکویٹی سرمایہ زیادہ تر صنعتوں میں اکیاون فی صد تک ہے چند شعبوں کو چھوڑ کر خود بخود منظوری حاصل کر لیں گے غیر ملکی ایکویٹی سرمایہ کاری کی تجاویز پر فوری توجہ دی جائے گی اور انھیں وقت مقررہ کے اندر منظوری دے دی جائے گی اعلیٰ اختیارات کا حامل غیر ملکی سرمایہ کاری کے فروغ سے متعلق بورڈ متعلقہ سرمایہ کاروں سے بات چیت کریگا۔ اس بورڈ نے مارچ ۱۹۹۲ء تک پانچ سو گیارہ کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری پر مشتمل بارہ تجاویز کو منظوری دے دی ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اس طرح کی سرمایہ کاری سے ملک کے توازنِ ادائیگی پر کوئی بوجھ نہ پڑنے پائے۔ بھاری سامان کی درآمد ایکویٹی سرمایہ کے عوض ہوگی اور جو منافع ملک سے باہر جائے گا، اُسے برآمدات کی آمدنی کے ذریعہ متوازن بنایا جائے گا۔

نئی معاشی پالیسی کے اثرات جا بجا رونما ہونے لگے ہیں۔ ہندوستانی معیشت سنبھل گئی ہے اور بین الاقوامی پیمانے پر اس کی ساکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا ریزرو جو اگست ۱۹۹۱ء میں گھٹ کر محض ۱۴۱۱ (گیارہ سو اکتالیس) ملین ڈالر پر آگیا تھا وہ مارچ ۱۹۹۲ء میں بڑھ کر ۵۶۳۱ ملین ڈالر ہوگیا تھا اور مارچ ۱۹۹۳ء کے اواخر میں یہ ۶۴۴۹ ملین ڈالر پر پہنچ گیا تھا۔

افراطِ زر کی در گھٹ کر محض ۶٫۵ (چھ اعشاریہ ۵) فی صدی تک آگئی ہے لیکن بازار میں کئی چیزوں کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہوا ہے جس سے صارفین کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ امداد و اعانتوں میں بار بار کی تخفیف سے گیہوں، چاول، چینی، کھاد وغیرہ کے دام کافی بڑھ گئے ہیں۔ ساتھ ہی کوئلہ، پیٹرول اور کرایوں میں اضافہ سے عوامی زندگی پر بُرا اثر پڑا ہے۔

نئی معاشی پالیسی کے بارے میں کئی شعبوں اور ماہر معاشیات نے دلائل کے ساتھ تنقید کی ہے اور خطرات سے آگاہ کیا ہے ہندوستان کی معیشت ترقی پذیر (Developing) ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا مقابلہ بین الاقوامی سطح پر نہیں کر سکے گی۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں ناوابستہ ممالک کی تحریک سے متعلق پندرہ نمائندہ ممالک کے گروپ جنھیں جی ۱۵ یا گروپ ۱۵ کہا جاتا ہے، کے سینیگال کی راجدھانی ڈاکار میں منعقدہ کانفرنس میں باہمی تعاون کے لیے باہمی اشتراک و تعاون پر زور دیا گیا تھا۔ وہ صحیح پیش رفت تھی لہذا اُس جذبے کے مطابق ہندوستان سمیت تمام ناوابستہ ممالک کو اپنی معیشت کو اپنے خصوصی حالات کے پس منظر میں آگے بڑھانا چاہیے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی غیر ملکی سرمایہ کاری کو بالکل آزاد مفاد میں نہیں معلوم ہوتا لہذا وقت کے لیے حدود متعین کر دینی چاہئیں میں ٹکنالوجی اور سرمایہ کی کمی اور سرمایہ پچھڑی معیشت بے کاری اور بے روزگاری اور نجی شعبہ کی صارفین کے مفاد کے خلاف کارکردگی کے پس منظر میں محتاط پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ صنعتوں اور درآمد کی سرپرستی کے اصول (Protectionism) کو ترک کر دینے سے اندیشہ ہے کہ کمزور اور چھوٹے کارخانے بند ہو جائیں گے جس سے ملک میں بڑے پیمانے پر بے کاری پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ درآمدات کی آزاد پالیسی سے ملک کی کئی صنعتوں کے فیل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ یقیناً ملک کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی جانب سے جو شرائط عائد کی جا رہی ہیں جن کا ذکر رابرٹ۔ جے اینڈرسن کی ۱۹۹۰ء کی رپورٹ میں ہے وہ سب کی سب ملک کے وسیع مفاد میں نہیں ہیں لہذا درآمدات اور صنعتوں کے متعلق شرائط خاص کر منفی امپورٹ فہرست کو ختم کرنے اور ڈیوٹی ختم کرنے اور اعانت و امداد کو ختم کرنے پر محتاط انداز میں حکومتِ ہند کو اپنا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ●

بقیہ، چینی کی صنعت بجلی کی پیداوار بڑھانے میں مدد دے سکتی ہے۔

الکحل موٹر گاڑیوں میں پیٹرول کی جگہ پر بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ دنیا میں بھارت چینی کی پیداوار اور الکحل سے کیمیکلز تیار کرنے میں سب سے آگے ہے۔ الکحل سے مصنوعی ربڑ تیار کرنے کا دنیا کا واحد پلانٹ اتر پردیش میں برلی میں ہے۔ [illegible]

...دیہاتوں کے صارفین کو ریاستی یا مرکزی ترسیلی نظام کے ذریعے پہنچانے کے لیے واضح پالیسیاں مرتب کی جانی چاہئیں۔ اس سے گرد و نواح کے صارفین کو بلا رکاوٹ بجلی کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے گی۔ اس سے زراعت اور دیہی صنعتوں کی رفتار ترقی بڑھانے میں بھی مدد ملے گی اور دیہات کا منظر یکسر بدل جائے گا۔

لہذا 'کو جنریشن' کی سہولت رکھنے والی چینی ملوں کی توسیع اور جدید کاری کے پروگراموں کی تمام تجاویز کو اولین ترجیح دی جانی چاہیئے۔ ہم تو یہ بھی تجویز کریں گے کہ چینی کے مربوط کمپلیکس قائم کیے جانے چاہئیں۔ جن میں الکحل بنانے کی بھٹیاں اور کاغذ بنانے کے کارخانے بھی ہوں۔ ●

بجٹ کا تجزیہ

ترقی کی رفتار تیز کرنے والا ایک فعال بجٹ

۹۴-۱۹۹۳ء کے مرکزی بجٹ [illegible] سب سے [illegible] جاتے [illegible] روپے کو مکمل طور پر تبادلہ پذیر [illegible] اسٹاک [illegible] محاصل میں تخفیف کی گئی ہے۔

زرعی شعبے میں بھی قواعد و ضوابط میں نرمی لائی گئی ہے۔ وزیر مالیات ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا ہے کہ سرکاری پالیسی یہ ہے کہ ملک کے اندر زرعی پیداوار کے نقل و حمل پر سے [illegible] پابندیاں ختم کی جانی چاہئیں تاکہ کاشتکاروں کو کھلے بازار کی قیمتوں کا پورا فائدہ مل سکے۔

وزیر مالیات نے کاشتکاروں کو یقین بھی دلایا ہے کہ انہیں زراعت اور دیہی ترقی کے قومی بینک کے ذریعے زیادہ قرضے فراہم کیے جائیں گے۔ یہ بینک ایک سرمایہ فنڈ اور کوآپریٹو ڈیولپمنٹ فنڈ بھی قائم کرے گا۔ [illegible] کے مطابق ۹۴-۱۹۹۳ء میں زرعی [illegible] کے نظام کو زیادہ [illegible] جائے گا۔

[illegible] کی [illegible] کو کچھ راحت دی گئی ہے۔

وزیر مالیات [illegible] اخراجات میں اضافہ کرنے کی تجویز [illegible] کر کے اس اعتراض کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہیں امیروں اور مالدار طبقے کا زیادہ خیال ہے۔ پلان کے مصارف میں بھی نمایاں اضافہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً ذیلی ڈھانچے کے شعبے کے واسطے۔ اس کے علاوہ بجلی کے شعبے میں سرمایہ کاری پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔

بجٹ میں درآمدی محصولوں (امپورٹ ڈیوٹیوں) میں نمایاں تخفیف کی گئی ہے جس کے نتیجے میں مالیہ کو ۲۷۳ر۳ کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔ اکسائز محصولات میں کمی کیے جانے سے ۲۴۰ر۲ کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔ لیکن وزارت مالیات کو امید ہے کہ یہ نقصان پیداوار میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ۱۰۰ کروڑ روپے کی حد تک کم ہو جائے گا۔

بجٹ کی ایک اور اہم تجویز کے تحت قومی ملکیت کے بینکوں کو کافی سرمایہ رکھنے کے بین الاقوامی اصول کے مطابق اپنی اکویٹی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے بازار سے سرمایہ حاصل [illegible] جائے گی۔

بجٹ میں انکم ٹیکس دینے والوں کو بعض رعایتیں دی گئی ہیں۔ تنخواہ دار افراد کے لیے معیاری کٹوتی (یا اسٹینڈرڈ ڈیڈکشن) کی حد ۱۲ر۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۱۸ر۰۰۰ روپے اور ۷۵ ہزار روپے سالانہ تک کی آمدنی والی ملازمت پیشہ خواتین کے لیے ۱۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۱۸ ہزار روپے کردی گئی ہے۔ معمر اور بزرگ شہریوں اور جسمانی طور پر معذور افراد کو بھی رعایت دی گئی ہیں۔ تاہم وسائل کی شدید قلت کی بنا پر ایک لاکھ روپے سے زائد کی ذاتی آمدنی پر عائد ۱۲ فی صد سرچارج ختم نہیں کیا گیا ہے۔

مکمل تبادلہ پذیری

روپے کے مکمل طور پر تبادلہ پذیر بنا دیئے جانے سے برآمدات نسبتاً سستی ہو جائیں گی اور وہ چھپا ہوا ٹیکس نہیں دینا پڑے گا جو ایک سال پہلے شروع کی گئی روپے کی جزوی تبادلہ پذیری کے سسٹم کے تحت برآمدات پر دینا پڑتا تھا۔ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں فوری طور پر اضافہ ہونے کی امید نہیں ہے کیونکہ فی الوقت تیل کی بین الاقوامی قیمتوں میں سستی کا رجحان ہے اور جہاں تک اندرونِ ملک تیل کی قیمتوں کا سوال ہے ان میں گزشتہ ستمبر میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔ تاہم کیمیاوی کھادوں کی قیمتیں درآمدات کی روپے کی صورت میں بڑھی ہوئی لاگت اور سبسڈی میں کمی کیے جانے کی وجہ سے بڑھ سکتی ہیں۔

[illegible]

اس اندیشے کو کہ کہیں روپے کی قیمت کم نہ کر دی جائے، دُور کرنے کی غرض سے ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ ہمارا پچھلے سال کا تجربہ ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا کرتا ہے کہ ہم ایک ہی شرح تبادلہ رائج کر سکتے ہیں اور ادائیگیوں کی صورت حال کو شرح تبادلہ میں معقول حد تک استحکام کی بدولت سنبھال سکتے ہیں۔

صنعت کے بعض شعبوں کو کساد بازاری کی موجودہ حالت سے باہر نکالنے کے لیے وزیر مالیات نے صارفین کے استعمال کی دیر پا چیزوں مثلاً موٹر کاروں، رنگین ٹیلی ویژن، ریفریجریٹروں اور ایئرکنڈیشنروں وغیرہ پر ایکسائز ڈیوٹیاں کم کر دی ہیں۔

ملک کے اندر سرمایہ جاتی سامان تیار کرنے والے کارخانوں اور مسدہ کاشتکار فیکٹریوں کی مدد کے لیے بھی ایکسائز ڈیوٹیوں میں تخفیف کی گئی ہے۔ قہوہ، چائے، اور انسٹینٹ چائے پر ڈیوٹی بالکل ختم کر دی گئی ہے۔ بناسپتی اور کھادی اور دیہی دستکاریوں کی اکائیوں کے تیار کیے ہوئے جوتوں پر ڈیوٹیاں گھٹا دی گئی ہیں۔ بُخارائی کولروں، بجلی کے پنکھوں اور دیگر گھریلو آلات، ڈرائی بیٹری سیلوں، ریڈیو، روشنائی، لوڈلز' بسکٹ، پلاسٹک کے ڈھلے ہوئے سوٹ کیسوں اور چٹائیوں پر بھی ایکسائز ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے۔ بہت سی قسموں کے سرمایہ جاتی سامان اور آلات پر بھی ایکسائز محصول کم کر دیا گیا ہے اور سب سے زیادہ کمی بجلی پیدا کرنے کے ساز و سامان پر کی گئی ہے۔ تین پہیوں والی گاڑیوں، پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال کی جانے والی وہیکلز، اور ایسی وہیکلز کی (Chassis) پر باڈی بنانے پر بھی ایکسائز ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے اس امر کا غالب امکان ہے کہ مانگ کی کمی کا شکار صنعتیں ان فائدوں کو صارفین کو منتقل کریں گی جس سے ان کے مال کی مانگ بڑھے گی۔

یوجنا، نئی دہلی

اگرچہ بجٹ میں کارپوریشنوں پر انکم ٹیکس کے ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کی ہے تاہم وزیر مالیات نے صنعتوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کی کوشش کی ہے کہ شمالی مشرقی ریاستوں، جموں اور کشمیر، ہماچل پردیش، سکم، گوا اور مرکزی انتظام کے علاقوں۔ انڈمان و نکوبار اور دادرا اور نگر حویلی، دمن اور دیو لکش دیپ اور پانڈیچری میں قائم کی جانے والی نئی صنعتی اکائیوں کو ٹیکس سے پانچ سال کے لیے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اس سے ان ریاستوں کی ترقی میں بہت مدد ملے گی۔

بجلی کی پیداوار اور تقسیم کے لیے ملک میں کسی بھی جگہ قائم کیے جانے والے صنعتی اداروں کو پانچ سال تک ٹیکس سے چھٹی دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ کھلی تجارت کے خطوں (ایکسپورٹ پروسیسنگ زونوں) میں صنعتی اکائیوں کو ٹیکس سے جو ... حاصل ہے اس کی توسیع سا... ہارڈویئر ٹکنالوجی پارکوں پر بھی

انکم ٹیکس کی مزید رعایات

صنعتوں کے ذریعے منظور شدہ یونیورسٹیوں اور ٹکنالوجی اور مینجمنٹ کے اداروں وغیرہ کو دیے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس سے جو رعایت دی جاتی ہے اس کی شرح دوگنی کر دی گئی ہے تاکہ صنعتوں کو ان اداروں کو مزید عطیات دینے کے لیے حوصلہ افزائی کی جا سکے اور یہ ادارے سرکاری فنڈس پر کم انحصار رکھیں۔ تحقیقی اداروں کی آمدنی پر بھی ٹیکس میں رعایت دی گئی ہے۔

فرقہ وارانہ اتحاد کی قومی فاؤنڈیشن کو دیے جانے والے عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ پولسٹر اور نائلون فلامنٹ یارن پر ایکسائز ڈیوٹیوں میں کمی کر کے ٹیکسٹائلز کے شعبے کو بھی راحت دی گئی ہے۔

مخصوص مفرد ادویات کی بیرون ملک سے درآمد پر امپورٹ ڈیوٹی گھٹا کر ملک کے اندر دوائیں اور طبی ساز و سامان بنانے والے اداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

پروجیکٹوں، سرمایہ جاتی سامان اور دھاتوں وغیرہ پر بھی امپورٹ ڈیوٹی کم کر دی گئی ہے۔ وزیر مالیات نے واضح کیا ہے کہ اندرون ملک سرمایہ جاتی سامان تیار کرنے والے اداروں کے جائز مفادات کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ کیمیکلز اور پیٹرو کیمیکل مصنوعات اور خام مال پر کسٹمز ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے۔ بیرون ملک سے درآمد کیے جانے والے الیکٹرانک اجزاء اور پرزہ جات اور ٹیکسٹائلز، چمڑے، سمندری پیداوار، ہیرے جواہرات اور خوراکی اشیاء کی پروسیسنگ او... ...ں

غیر ممالک سے آنے والے مسافر جو اسباب (Baggage) اپنے ساتھ لاتے ہیں ان پر عام ڈیوٹی کی شرح ۲۵۵ فی صد سے گھٹا کر ۱۵۰ فی صد کر دی گئی ہے۔ یہ اقدام ضابطۂ عمل کو سادہ بنانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔

مالی سیکٹر میں بنکوں کو کافی مقدار میں اپنے پاس سرمایہ رکھنے کے بین الاقوامی معیار تک پہنچنے کے لیے ۱۰،۰۰۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ وزیر مالیات نے اس کے لیے ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں سرکاری بانڈوں کی شکل میں ۵،۰۰۰ کروڑ روپے مہیا کرنے کی گنجائش رکھی ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے خزانے سے اتنی رقم فوراً ہی باہر نہیں جائے گی تاہم ان بانڈوں پر سود اور مدت پوری ہونے پر بانڈوں کی رقوم کی ادائیگی مستقبل

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

ڈاکٹر بی۔بی۔بھٹاچاریہ

ٹیکسوں کے ڈھانچے میں اصلاح پر زور

۹۳-۱۹۹۴ء کا بجٹ متعدد امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں کسٹم اور ایکسائز ڈیوٹیوں میں ۲۲۵۴ کروڑ روپے کی مجموعی کمی کی گئی اور ایسا بھارت کی مالی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ بجٹ کے خسارے کو ۴۳۱۴ کروڑ روپے تک محدود رکھنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ روپے کی دوہری شرح تبادلہ ختم کر دی گئی ہے۔ تمام غیر ملکی تجارت جس میں سرکاری درآمدات سمیت برآمدات و درآمدات دونوں شامل ہیں، اب بازار میں رائج شرح تبادلہ پر کی جائے گی۔ اندرون ملک مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) کے ساتھ تناسب کے طور پر مجموعی مالی خسارہ ۹۲-۱۹۹۲ء میں تقریباً ۵ فی صد سے کم ہو کر ۹۳-۱۹۹۴ء میں ۴ء۸ فی صد ہو جائے گا۔ منصوبے کے اخراجات میں نمایاں اضافہ کیا گیا ہے۔ زراعت، دیہی ترقیات اور دیہی ڈھانچے کی سہولیات کے لیے زیادہ رقوم مخصوص کی گئی ہیں۔ غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو، جن میں سود کی ادائیگیاں شامل نہیں ہیں، ظاہرہ قیمت کے لحاظ سے چھ فی صد اور حقیقی قیمت کے لحاظ سے ۱۴ فیصد کی کمی کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ بینک ڈپازٹوں اور بینک کے ذریعے دیے جانے والے قرضوں پر سود کی شرحوں میں ایک فیصد کی کمی کی گئی ہے۔ علحیٰ کے پلانٹوں پر بھی سرمایہ کاری اور پہاڑی اور پسماندہ دیگر ریاستوں میں تمام نئے کارخانوں پر پانچ سال تک ٹیکس چھوٹ کا اعلان کیا گیا ہے۔ قومی ملکیت کے مستقل بینکوں کے بنیادی سرمائے میں اضافے کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ نیز برآمدات کے لیے مزید ترغیبات مہیا کی گئی ہیں۔ تاہم بجٹ میں، حلاف توقع، براہ راست ٹیکسوں کی شرحوں میں کمی نہیں کی گئی ہے۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں جب معیشت میں استحکام لانے اور ڈھانچہ جاتی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا گیا تھا اس وقت ہماری معیشت کی حالت خراب تھی۔ افراط زر کی شرح نقطہ بہ نقطہ بنیاد پر ۱۷ فی صد تک پہنچ گئی تھی۔ ادائیگیوں کے توازن کی صورت حال ایسی تھی غیر ملکی زرمبادلہ کا ذخیرہ اس قدر کم ہو گیا تھا کہ اس میں فقط ایک بلین ڈالر باقی بچے تھے جو صرف دو ہفتے کی درآمدات کا خرچ ہی پورا کر سکتے تھے۔ غیر ملکی قرضہ جات پر سود کی ادائیگی وغیرہ کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ اندرونی قرضہ جات بھی ایک سنگین مسئلہ بن گئے تھے۔ مرکز کا مجموعی مالی خسارہ بطور جی ڈی پی کے ساتھ تناسب کے ۸ فی صد سے زیادہ تھا۔ زیادہ سود اور ماہانہ بڑھ رہے دونوں خساروں کی شرحیں تین فی صد سے زیادہ ہیں۔ اس وقت کے مقابلے میں موجودہ صورت حال کچھ بہتر ہے۔ افراط زر کی شرح نقطہ بہ نقطہ بنیاد پر گھٹ کر سات فی صد ہو گئی ہے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے میں اب چار ارب پانچ بلین ڈالر موجود ہیں۔ مرکز کے عمومی (FISCAL) خسارے کی شرح گھٹ کر پانچ فی صد ہو گئی ہے۔ ٹیکس و غیر مالیات کی بجٹ تقریر اور اقتصادی جائزے میں جو امیدیں ظاہر کی گئی تھیں ان کے برخلاف صورت حال ابھی تک معمول پر نہیں آ سکی ہے۔ سال ۹۳-۱۹۹۲ء کی افراط زر کی شرح ابھی تک دس فی صد سے زیادہ ہے جب کہ ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۴ء۵ فی صد تھی۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ لگاتار پانچ نارمل یا اچھی فصلوں اور اب بہت سخت مالی پالیسی اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے کی کافی بہتر صورت حال کے باوجود افراط زر کی شرح میں زیادہ کمی نہیں آئی ہے۔ ماضی میں ایسے ہی حالات میں افراط زر اس سے تقریباً دو گنی تھی۔ جس کا یہ مطلب ہوا کہ افراط زر کے ... ابھی درست نہیں ہیں۔

غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے میں جو اضافہ

یکم تا ۳۱ جولائی ۱۹۹۲

مصنف انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ میں پروفیسر ہیں۔

یو ڈبلیو، نئی دہلی

دیکھنے میں آیا ہے وہ تجارتی توازن میں بہتری آنے کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ روپے کی قیمت میں کافی کمی کیے جانے اور درآمدات کے گھٹائے جانے کے باوجود ڈالر کمانے والی برآمدات کی شرحِ ڈالر کے خرچ سے کی جانے والی درآمدات کی شرح سے کافی کم ہے۔ لہٰذا غیر ملکی زرِمبادلہ کے ذخیرے میں حال ہی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ نئے بیرونی قرضوں اور بیرونِ ملک سے بھارت میں زرمبادلہ کی ترسیلات کی اسکیم کا مرہونِ منت ہے اور پھر ایسا ہر سال تو نہیں ہو سکتا۔ ملک کا مجموعی غیر ملکی قرضہ اب تقریباً ۸۰ بلین ڈالر تک پہنچ گیا ہے اور قرضوں پر سود کی ادائیگی وغیرہ کا خرچ ایک سال میں ۸ بلین ڈالر تک جا پہنچا ہے۔ ادائیگیوں کے توازن میں جو بہتری آئی ہے اسے ابھی عارضی سمجھنا چاہیے، مستقل نہیں۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں اندرونِ ملک مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) کم ہو کر صرف ۲ فیصد رہ گئی۔ زراعت اور صنعت میں منفی شرحِ ترقی دیکھنے میں آئی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں جی ڈی پی میں اضافے کی شرح کا سرکاری اندازہ تقریباً ۴ فی صد ہے۔ اگرچہ زراعت کے امکانات اچھے نظر آ رہے ہیں، صنعتی صورتِ حال جیسی کہ اس وقت ہے، روشن نہیں ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں سرکاری اور نجی دونوں سرمایہ کاریوں کی شرحیں ۹۱-۱۹۹۰ء سے کم تھیں۔ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء دونوں ہی سالوں میں حقیقی سرکاری اخراجات میں جو کمی کی گئی، خصوصاً منصوبائی اخراجات میں، اس سے روزگار کی صورتِ حال پر بُرا اثر پڑا ہے۔ افراطِ زر کی شرح میں حالیہ کمی غریب عوام کی قوتِ خرید کے کم ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بیرونِ ملک سے خالص سرمایے کی آمد میں گزشتہ دو برسوں میں اضافہ ہوا ہے لیکن پیداوار، ایکسپورٹ اور ٹکنالوجی میں فی الوقت کوئی ظاہرہ تبدیلی نظر نہیں آ رہی ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دو برسوں میں ترقی کے منظر میں بہتری کے کوئی واضح آثار نہیں پائے جا رہے ہیں۔

منصوبے کے مصارف:

اس بجٹ کی ایک مثبت خصوصیت یہ ہے کہ اس میں منصوبے کے مصارف میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء کے بجٹوں میں منصوبے کے مصارف میں کمی کر کے ہی مجموعی مالی خسارے کی شرح گھٹائی گئی تھی۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں مرکزی پلان مصارف حقیقی معنوں میں ۹۱-۱۹۹۰ء سے کم تھے۔ اگرچہ ۹۳-۱۹۹۲ء ...

مرکزی پلان مصارف میں ا...

حقیقی معنوں میں یہ اخراجات ...

ہوں گے جو ۹۱-۱۹۹۰ء میں

کے بجٹ میں مرکزی منصوبے

۳۰،۹۳ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں جو ۹۳-۱۹۹۲ء کے نظرثانی شدہ تخمینوں سے ۲۰ فی صد زیادہ ہیں۔ زراعت اور دیہی ترقی کے لیے مرکزی پلان مصارف میں ۲۸ فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے، توانائی کے لیے ۳۳ فی صد کا، نقل و حمل اور مواصلات کے لیے ۳۰ فی صد کا، صنعت اور معدنیات کے لیے ۲۰ فی صد کا اور سماجی خدمات کے لیے ۲۴ فی صد کا۔

۴۳۹۳۰ کروڑ روپے میں سے ۲۳۳۴۱ کروڑ روپے حکومت بجٹ میں تجویز کردہ اقدامات سے حاصل کرے گی اور ۴۰۶۹۵ کروڑ روپے کی باقی رقم اندرونی پبلک انٹرپرائیزز کے غیر بجٹی وسائل سے جُٹائی جائے گی جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۸۵،۳۰ کروڑ روپے کی رقم ان وسائل سے حاصل کی گئی۔ اس لیے وسائل جُٹانے کا اصل بوجھ ٹیکسوں اور سرکار کے ذریعے اُدھار لی جانے والی رقوم سے ہٹ کر انتظامیہ قیمتوں اور پبلک انٹرپرائیزز کے ذریعے بازار سے اُدھار لی جانے والی رقوم پر پڑے گا۔ اس سے دو مسئلے پیدا ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ انتظامیہ قیمتوں کے بڑھنے سے لاگت بھی بڑھے گی۔ دوسرے یہ کہ جب کہ کچھ پبلک انٹرپرائیزز بازار سے کافی رقوم اُدھار لے سکیں گے، بہت سے دوسرے ادارے نہیں لے سکیں گے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حقیقی مرکزی پلان مصارف بجٹ کے تخمینوں سے کم رہ جائیں۔

ماضی میں اصل خسارہ ...

کروڑ روپے۔ لہٰذا اصل معنوں میں ۹۴-۱۹۹۳ء میں مجموعی مالی خسارے کے ۹۳-۱۹۹۲ء سے کم ہونے کی اُمید ہے۔ گزشتہ دو بجٹوں کے برخلاف اس بجٹ کا مقصد منصوبہ جاتی اخراجات کے بجائے غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو کم کر کے مجموعی مالی خسارے کو کم کرنا ہے۔ بجٹ تخمینوں کے مطابق ۹۴-۱۹۹۳ء میں غیر منصوبہ جاتی اخراجات (جن میں سود کی ادائیگیاں شامل نہیں ہیں) ۵۲۰۰۲ کروڑ روپے کے بقدر ہوں گے جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے نظرثانی شدہ تخمینوں میں یہ اخراجات ۵۲۵۳۵ کروڑ روپے کے بقدر دکھائے گئے ہیں۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں افراطِ زر کی شرح ۸ فیصد ہی رہے گی، اس سال غیر منصوبہ جاتی اخراجات

(جن میں سود کی ادائیگیاں شامل نہیں ہیں) کے ۹۲-۱۹۹۲ء کے مقابلے میں اصل معنوں میں ۱۲ فی صد کم ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مشکل نشانہ ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اخراجات پر سخت نگرانی کے باوجود ۹۳-۱۹۹۲ء میں منصوبہ جاتی اخراجات (جن میں سود کی ادائیگیاں شامل نہیں ہیں) کا نظرثانی شدہ تخمینہ بجٹ کے تخمینوں سے تقریباً ۳۰۰۰ کروڑ روپے زیادہ ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں سرکاری اخراجات پر کنٹرول اور بھی مشکل کام ہوگا کیوں کہ اب سرکاری درآمدات کے لیے ادائیگی بازار کی شرح تبادلہ پر کرنی ہوگی جو اس وقت سرکاری شرح تبادلہ سے تقریباً ۲۵ فیصد زیادہ ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جب کہ تمام خدمات پر مرکز کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں ۲۹۲ کروڑ روپے کا اضافہ ہونے کی توقع ہے، ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو مرکز کے غیر منصوبہ جاتی عطیات اور قرضوں میں بالترتیب ۴۵۰ کروڑ اور ۴۴۰ کروڑ روپے کی کمی ہوگی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مرکز کے بجٹ میں بہتری ریاستی بجٹوں کی قیمت پر آئے گی۔ تاہم ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے لیے مرکزی امداد میں ۱۷۰۶ کروڑ روپے کا اضافہ ہوگا۔

ٹیکسوں میں رعایت

بجٹ میں بہت سی اشیاء پر کسٹمز ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے۔ بیشتر سرمایہ جاتی سامان پر کسٹمز ڈیوٹی کی شرح ۱۰ فی صد سے لے کر ۳۵ فی صد تک کے درمیان ہوگی۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں اوسط امپورٹ ڈیوٹی (درآمدی محصول) ۵ فی صد سے بھی کم ہو سکتی ہے۔ کسٹمز ڈیوٹی میں کمی سے جو نقصان ہوگا وہ جزوی طور پر بازار کی شرحِ تبادلہ بڑھنے کی وجہ سے پورا ہو جائے گا۔ صارفین کے استعمال کی بہت سی اشیاء پر خاص کر دیرپا اشیاء جو مندے کا شکار رہیں، ایکسائز ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے۔ براہِ راست ٹیکسوں کے ڈھانچے کو قریب قریب جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ اس سال کچھ مینوفیکچرڈ اشیاء بھی سستی ہو جائیں گی۔ لیکن مجموعی قیمتوں کے عدد اشاریہ پر اس کا بہت معمولی اثر پڑے گا۔

اسٹاک مارکیٹ کو بجٹ سے مایوسی ہوئی ہے کیوں کہ بجٹ میں ذاتی انکم ٹیکس یا کارپوریٹ ٹیکس کی شرحیں نہیں گھٹائی گئی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کے حالات سے صنعتوں کے حالات کا ہمیشہ ہی صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ گزشتہ سال جب صنعتیں مندے سے دوچار تھیں، اسٹاک مارکیٹ بلندی پر پہنچ گئی اور پھر تمسکات کے گھپلے کا پتہ چلنے پر اس میں بڑی گراوٹ آ گئی۔

پروفیسر منموہن سنگھ کے پہلے دو بجٹوں میں معیشت میں استحکام لانے کو زیادہ ترجیح دی گئی تھی۔ موجودہ بجٹ سے ایسا لگتا ہے کہ اس میں ٹیکسوں کے ڈھانچے میں اصلاح پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ پلان کے مصارف بڑھا دینے سے سرکاری اور نجی دونوں سرمایہ کاروں کو بھی بڑھاوا ملے گا اور اس اعتبار سے موجودہ بجٹ کو ایک ایسا بجٹ قرار دیا جا سکتا ہے جس کا رُخ ترقی کی طرف ہے۔ لیکن مجموعی اقتصادی منظر حوصلہ افزا نہیں ہے۔

ڈھانچہ جاتی اصلاحات کے پہلے دو برسوں میں جی ڈی پی خصوصاً صنعتی جی ڈی پی کی شرح ترقی طویل المدت رجحان سے بھی کافی کم ہو گئی ہے۔ سرکاری اور نجی سرمایہ کاری کی شرحیں کم ہو گئی ہیں۔ شرحِ افراطِ زر میں بھی کمی آئی ہے لیکن افراطِ زر کے امکانات موجود ہیں۔ مالی خسارہ کم ہو گیا ہے لیکن توازنِ تجارت بدستور ناموافق ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں بھارتی معیشت کی جو تجدید ہوئی ہے۔ اس کا سہرا صنعتی شعبے کی بہ نسبت شعبۂ زراعت کے سر پر زیادہ ہے۔

بہرحال امید کے ساتھ ساتھ احتیاط سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ●

بوجبنا، نئی دہلی

بقیہ: ہندوستان کی پہلی خاتون ریل ڈرائیور

عرصے بعد سُریکھا کو منتخب ہو جانے کی اطلاع بھی مل گئی۔

جنوری ۱۹۸۸ء میں طبی جانچ میں چُست درست ہونے کے بعد سُریکھا نے کلیان (بمبئی) کے ڈرائیور کے تربیتی کالج میں ڈیڑھ سال تک ڈرائیوری کی تربیت لی اور اس طرح وہ ہندوستان کی اوّل خاتون ریل ڈرائیور بن گئیں۔

دورانِ تربیت، سُریکھا کافی تھک جاتی تھیں، لیکن ان کے سامنے کچھ کر گزرنے کا خواب تھا۔ اس لیے اپنے نشانے سے ہٹے بغیر، انھوں نے ریل ڈرائیور بن کر ایک انوکھے ریکارڈ کی داغ بیل ڈالی۔

آج کل سُریکھا معاون ڈرائیور کی حیثیت سے مال گاڑیاں چلا رہی ہیں، لیکن ان کی محنت اور لگن، اور ان کے جوش و خلوص سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح سے ڈرائیور کے عہدے پر فائز ہو جائیں گی۔

خدانخواستہ، کسی سفر کے دوران کہیں سُریکھا پر آپ کی نظر پڑ جائے تو چونکیے گا ہرگز نہیں، بلکہ ہاتھ اٹھا کر ان کے لیے تہنیتی الفاظ کہیے گا، ان کی فتح مندی پر انھیں مبارکباد دیجیے گا اور ان کی مزید کامیابیوں کے لیے اپنی دعاؤں سے ضرور نوازیے گا۔ ●

بقیہ: بچوں کی بہبود اور بھارت سرکار

اس پروگرام کی وسعت میں ڈرامائی توسیع ہوئی ہے اور بچوں کو غذا مہیا کرنے کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا نظام بن چکا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کی سالانہ رپورٹ کے تحت ایک کروڑ ۸۳ لاکھ بچوں اور عورتوں کو اس پروگرام کے تحت خوراک مہیا کی جارہی ہے یہ پروگرام اب ۲۷۶۱ ترقیاتی بلاکوں میں زیر عمل ہے اور ملک کے دو لاکھ ۷۰ ہزار دیہات و شہروں کی گندی بستیوں میں رہنے والے بچے اور عورتیں اس سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔

۹۳-۱۹۹۲ء میں بچوں کی مربوط ترقی کے مزید ۳۰ پراجیکٹ منظور کئے گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کا بچوں کا ہنگامی فنڈ، ناروے کا فوڈ پروگرام، ہر کہیں امریکی مدد کی انجمن امداد باہمی اور عالمی بنک جیسے ادارے بچوں کی ترقی کے لیے خدمات کے مربوط پروگرام کے مختلف پہلوؤں کے لیے امداد دیتے ہیں

اس کے علاوہ بچوں اور عورتوں کی بہبود کے لیے جو دیگر اہم پروگرام شروع کئے گئے ہیں اُن میں دیہات میں بچوں و عورتوں کی ترقی، تین سے چھ برس کی عمر کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم، چھ برس سے کم عمر بچوں کو امدادی غذا مہیا کرنے کا خصوصی پروگرام، دیہات، شہروں کی گندی بستیوں، قبائلی علاقوں میں حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو امدادی غذا مہیا کرنے کا خصوصی پروگرام اور تین سے چھ برس کی عمر کے بچوں کو غذا فراہم کرنے کے لیے بال واڑی غذائی پروگرام شامل ہیں۔

۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں کارکن عورتوں کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال ۱۲۴۷۰ کریچ یا نگہداشت کے مراکز کام کر رہے تھے۔ جہاں قریب تین لاکھ بچوں کی دیکھ بھال کی جارہی تھی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں تین سے چھ برس کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لیے ملک میں ۴۳۶۵ مراکز کام کر رہے تھے۔ جہاں ڈیڑھ لاکھ بچوں کو اسکول جانے سے قبل کی تعلیم دی جارہی تھی۔ کم عمر لڑکیوں کو غذا، صحت کی دیکھ بھال، گھر میں کام کرنے کے قابل بنانے کی تربیت اور روایتی حرفتوں و دستکاریوں کی تربیت دینے کے لیے، ۵۰۷ ترقیاتی بلاکوں میں پروگرام پر عمل ہو رہا تھا۔

بچوں و عورتوں کی بہبود کے ان پروگراموں کے لیے ۹۳-۱۹۹۲ء کے بجٹ میں ۱۹۴ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا لیکن نظر ثانی شدہ تخمینوں کے مطابق ان پروگراموں پر سال بھر میں ۱۵۵ کروڑ روپیہ خرچ آیا۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں ان کاموں کے لیے ۲۰۶ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں سے ۱۱ کروڑ روپیہ بچوں کی بہبود کی مد ... خرچ کیا جائے گا۔ حاملہ اور دو... خواتین کی خوراک، کام کرنے وا... بچوں کی نگہداشت کے مرکزوں... لڑکیوں کی تربیت کے کاموں پر ۶۲ کروڑ ... لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

بچوں کی آبادی اور سماجی تحفظ

مذکورہ امدادی پروگراموں سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی اور ریاستی سرکاریں بچوں و عورتوں کی بہبود پر کتنا سرمایہ خرچ کر رہی ہیں۔ لیکن سوال صرف ان بچوں کو غذا اور تعلیم دینے یا انھیں بیماریوں سے بچانے اور کام پر لگانے کا ... ہے۔ مسئلہ کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جانا چاہیئے کہ بھارت میں بچوں کی آبادی دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۴ برس تک کے بچوں کی تعداد ۲۶ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی جو کل آبادی کی ۳۸.۸ فی صد کے برابر ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام تک بچوں کی یہ تعداد بڑھ کر ۳۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ہو جائے گی۔ بچوں کی موجودہ آبادی کا ۷۹ فی صد حصہ دیہات اور ۲۲ فی صد شہروں میں رہتا ہے۔

کنبے اور سماج میں بچوں کی دیکھ بھال اور خوراک و سماجی تحفظ کی روایت صنعت کاری کے عمل کی رفتار تیز ہو جانے اور دیہات سے لوگوں کی شہروں کو نقل مکانی کے ساتھ ختم ہوتی جارہی ہے جو غریب کنبے تلاش معاش کے لیے شہروں میں آرہے ہیں ایسے کنبوں کے اکثر بچے لاپرواہی اور محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں ... سماج اور کنبے ... کے ... ہیں اور ... کی ذمہ داری پوری ... کر ...

... ان بچوں کے لیے ۷۵-۱۹۷۴ء سے ہی کئی اسکیموں پر عمل ہو رہا ہے۔ اس اسکیم کے مطابق رضاکار اداروں کو مرکز مساوی مالی مدد مہیا کر رہا ہے۔ کئی علاقوں میں تو مرکزی سرکار ایسے بچوں کی تعلیم تربیت، اور صحت کے ۹۰ فی صد اخراجات مرکزی سرکار ادا کر رہی ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں اس اسکیم پر ۸ کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس برس ۲۱ رضاکار اداروں کو مرکز کی طرف سے مالی مدد دی گئی۔

گمراہ بچوں سے انصاف

کنبوں کی لاپرواہی کے شکار گمراہ اور جرائم کی دنیا میں داخل بچوں کی دیکھ بھال، تحفظ اور تعلیم و تربیت کی غرض سے ۱۹۸۶ء

ہیں ملک میں پہلی بار ملک بھر کے لیے ایک یکساں قانون منظور کیا گیا۔ اس قانون کے تحت ایسے بچوں کی اصلاح کی تدابیر میں بھاری تبدیلیاں لی گئیں۔ اس کام میں کنبوں، فرقوں اور سماج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ قانون کے تحت اب کسی بھی بچے کو کسی بھی حالت میں جیل یا پولیس حوالات میں نہیں رکھا جاتا بلکہ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک کسی کنبے یا تنظیم کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ملک میں ۱۲۷۶ آبزرویشن ہوم قائم کئے گئے ہیں۔ نابالغ مجرموں کو رکھنے کے لیے بھی ۲۴۹ آشرم بنائے گئے ہیں

گلی بازاروں کے بچے

تجربہ یہ شاہد ہے کہ شہری علاقوں میں خاص طور پر غریبی کے خط سے نیچے رہنے والے کنبوں کے بچے انتہائی محرومی کا شکار ہوتے ہیں جنھیں کنبے یا سماج سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس مسئلہ کا سبب شہروں میں صنعت کاری اور غریبوں کی نقل مکانی ہے۔ یہ بچے بھٹک جاتے ہیں، مجرموں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور گداگری کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وزارت بہبود نے ان بچوں کی اصلاح اور بحالی کے لیے ایک اسکیم آٹھویں منصوبے میں شامل کی ہے۔ گلی بازار کے بچوں سے مراد ایسے بچے ہیں جن کے کنبے تو ہیں لیکن مختلف مجبوریوں کے سبب وہ گلی بازار میں بھٹک رہے ہیں۔ یہ بچے کاغذ، پلاسٹک، جوتے اکٹھے کر کے پالش کرتے، اخبار فروخت کرتے، گاڑیاں صاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے شک لڑکے یہ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن بہت سی لڑکیاں بھی یہی کام کرتی ہیں۔ بے شک بچوں کی بہبود کے لیے کئی مربوط خدمتیں شروع کی گئی ہیں لیکن اس قسم کے بچوں کے لیے ابھی تک کوئی اسکیم شروع نہیں کی گئی تھی

چنانچہ آٹھویں منصوبے میں شامل کی گئی اسکیم کے لیے آٹھ کروڑ روپیہ وقف کیا گیا ہے۔ شروع میں اس اسکیم سے ۴۴ ہزار بچوں کو فائدہ پہنچے گا اور اسے ملک کے ۲۴۰ بڑے بڑے شہروں میں شروع کیا جائے گا۔

گداگری

بچوں کا بھیک مانگنا یا بچوں کو گداگری کے لیے استعمال کرنا ہمارے معاشرے کا ایک قدیم مسئلہ اور ایک بدنما داغ ہے۔ اس کے کئی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی اسباب ہیں۔ یہ مسئلہ اس سے کہیں شدید ہے۔ جتنا دکھائی دیتا ہے اس سے نہ صرف انسانی زندگی کا معیار اور وقار گرتا ہے بلکہ سماجی صحت پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔ عام طور پر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ جب تک لوگوں کی بڑی تعداد ترقی کے فوائد سے محروم رہے گی حکومت کو گداگری روکنے اور خاص طور پر بچوں و عورتوں کی اس کام میں استعمال کرنے سے بند کرنے کے اقدامات میں مداخلت کرنی ہی ہوگی۔

حکومت نے جو قوانین بنائے ہیں ان کے مطابق ملک کی ۱۶ ریاستوں اور دو مرکزی علاقوں میں گداگری جرم قرار دیا جا چکا ہے آٹھویں منصوبے میں ایک اسکیم گداگروں کو مفید کاموں پر لگانے کے لئے شامل کی گئی ہے۔ اس اسکیم کا ۹۰ فی صد خرچ مرکزی سرکار اور دس فی صد خرچ ریاستی سرکاریں ادا کریں گی۔

یتیم بچوں کو گود لینے کی سہولیات مہیا کرنے کی ایک اسکیم بھی سرو[?] ہے جو بعض جذباتی مصلحتوں کے سبب ابھی زیادہ مقبول نہیں ہو سکی حالانکہ غیر ملکوں میں معاشرے اس عمل میں ہم سے بہت آگے ہیں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ غریب ملکوں میں آکر بچوں کو گود لیتے ہیں۔

●

بقیہ، کیا آپ جانتے ہیں؟

"Secret Society" کا بانی کون تھا؟

۳۵۔ "معراج العاشقین" کے مصنف کا نام بتایئے؟

۳۶۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے درمیان ہندوستان میں غیر ملکی سیاحوں کی کل تعداد کتنی تھی؟

۳۷۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے درمیان ہندوستان میں تیل کی درآمدات کی کل رقم کتنی تھی؟

۳۸۔ وہ کون سے اردو کے مشہور ادیب ہیں جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے؟

۳۹۔ "ریزرو بینک آف انڈیا" کس سال قائم ہوا تھا؟

۴۰۔ امیر خسرو، قلی قطب شاہ اور ولی دکنی میں سے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟

(جوابات صفحہ ۲۴ پر) ●

بقیہ: ایک تکلیف دہ حقیقت

کے پروگرام کو ہندوستان میں لاگو کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس کے لیے ہندوستان اور آئی۔ ایل۔ او (بین الاقوامی مزدور تنظیم) کے بیچ ایک سمجھوتے پر دستخط کیے گئے ہیں جس میں بچوں کی مزدوری کو جڑ سے ختم کرنے کی بات کی گئی ہے۔

یہ بہت ہی اہم بات ہے کہ اس منصوبہ کو کامیاب بنانے میں صرف سرکار کی کوشش ہی نہیں بلکہ سماج کے ہر رکن کو لگن کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور خاص کر رضاکار تنظیموں کو۔

●

ڈاکٹر انجنی کمار مالویہ

برآمدات کے فروغ میں حکومت کا کردار

جب کسی ملک میں برآمدات کے فروع کے لیے صنعتوں کو مختلف قسم کی دفاعی آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں تو اس عمل کو برآمدی ترقی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں برآمدی ترقی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ کسی ملک کی برآمدات میں ترقی اس ملک کی معاشی ترقی کی نشانی ہے۔ موجودہ دور میں ہندوستانی تجارت غیر متوازن ہے۔ اس لیے ہندوستان کو اپنی تجارت متوازن کرنے کے لیے برآمدات کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ اس تناظر میں عالمی برآمدات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ جب کہ دوسری طرف عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ کم ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہماری برآمدات میں اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عالمی منڈی میں ہندوستانی برآمدات کے تناسب میں اس لحاظ سے اضافہ نہیں ہوا ہے جس لحاظ سے عالمی برآمدات میں اضافہ ہوا ہے۔ معاشی خود کفالت، تجارت کو متوازن کرنے، مصنوعات کے لیے منڈیوں کی تلاش، غیر ملکی زر مبادلہ کمانے اور صنعت کاری کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے برآمدی ترقی ہی واحد [illegible] ہے۔ برآمدی ترقی کی ضرورت کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں :-

- درآمدات کے اثرات کو کم کرنے اور ادائیگیوں کے توازن کو [illegible] رکھنے کے لیے۔
- مختلف ملکوں کے باہمی تعاون اور را[illegible] کے لیے۔
- غیر ملکی تجارت خاص طور پر [illegible] فہرست اشیا کی قیمتوں کو کم کرنے کے لیے۔
- اِن مخصوص اشیا کی برآمدات اور ترقی کے لیے جن کی مانگ ملکی منڈی میں صفر کے برابر ہے۔
- صنعتوں کو امداد فراہم کرکے ان میں اضافہ اور غیر ملکی مارکیٹنگ کی صلاحیت کے فروغ کے لیے۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد جب ہمارے ملک کی سرکار نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت سے ہی سرکاری سطح پر برآمدات کے فروغ کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں :-

جانچ کمیٹیوں کا قیام : برآمدات کے فروغ کے لیے حکومت نے وقتاً فوقتاً مختلف کمیٹیوں کو قائم کیا۔ سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں اے۔ ڈی۔ گوروال کی صدارت

[illegible] قائم کی گئی۔ اس کی کچھ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں :-

- ملک میں برآمدات کے فروغ کے لیے ایک ڈائریکٹوریٹ قائم کیا جائے۔
- ایک خصوصی ادارہ قائم کیا جائے جس کا کام غیر ملکوں میں منڈیوں کی تلاش ہو۔
- ہر سال ہندوستانی تاجروں کے وفود کو غیر ملکوں میں تجارت اور برآمدات کے فروغ سے متعلق حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا جائے۔
- برآمدات ٹیکس معاشی مقاصد کے دفاع میں ہو۔

۱۹۵۲ء میں حکومت نے وی۔ ایل۔ ڈی سوجا کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اس وقت ہندوستان میں پہلی صنعتی پالیسی

۱۹۵۶ء کا اعلان اور منصوبہ بند معاشیات کا دور چل رہا تھا اور ہندوستان صنعت کاری کی سمت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسے وقت میں برآمدات کے فروغ کے بارے میں پالیسیوں کا واضح ہونا نہایت ضروری تھا۔ کمیٹی نے کچھ مخصوص اشیا کی برآمدات کو فروغ دینے کے لیے مختلف تجاویز پیش کیں اور پیداواری لاگت کم کرنے پر زور دیا۔ نہ صرف برآمدات کے لائق اشیا کو پیداواری ٹیکس اور فروخت ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے کو کہا گیا بلکہ ان کی کوالٹی پر بھی خصوصی توجہ دینے پر زور دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ایک خصوصی تنظیم کے قیام کی سفارش بھی کی۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران برآمدی نشانوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۶۱ء میں مُدلیار کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی نے بھی خام مال، مشینری وغیرہ کے لیے ضروری غیر ملکی زرمبادلہ فراہم کرنے کے لیے کہا۔ اس کے علاوہ درآمدات و برآمدات مساوی فنڈ کے قیام کی تجویز بھی رکھی۔ اگر برآمدی صنعتیں کچھ دشواریاں محسوس کرتی ہیں تو ان کی دشواریوں کو دور کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آمدنی ٹیکس میں تین قسم کی رعائتیں دی جانی چاہئیں۔

۱۔ بنیادی برآمدات پر۔
۲۔ برآمدات فروغ فنڈ قائم کرنے کے لیے
۳۔ زائد برآمدات پر خصوصی رعایت۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ صوبائی تجارت کو ضروری قرار دیا گیا۔ اور ملک کی ترقی کے لیے برآمدات کو لازمی سمجھا گیا۔

جون ۱۹۷۹ء میں جناب پرکاش ٹنڈن کی صدارت میں ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے مئی ۱۹۸۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی لیکن اپنی مکمل رپورٹ جنوری ۱۹۸۱ء میں پیش کی۔ برآمدات کے فروغ کے لیے اس کمیٹی کی خاص تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

- وزارتِ کامرس میں برآمدات سے متعلق ایک انتظامیہ شعبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس شعبے کے تحت ماتحت شعبے ہوں اور ہر ایک کو برآمدات کی صنعت کے ایک گروپ کی ذمہ داری سونپی جائے۔
- برآمد کنندگان کو بین الاقوامی قیمتوں پر خام مال کی فراہمی کی جائے تاکہ ان کو مناسب قیمت پر مناسب خام مال حاصل ہو سکے۔
- چائے اور کافی کے لیے علاحدہ شعبے قائم کیے جائیں۔
- برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدنی اور منافع کو ڈائریکٹ ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔
- صد فی صد مصنوعات برآمد کرنے والی اکائیوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ پونجی پر مبنی ذرائع کی درآمدات کی سہولت فراہم کی جائے۔
- سیاحت کو صنعت کا درجہ دیا جائے تاکہ دیگر صنعتوں کی طرح اس کو بھی وقتاً فوقتاً فائدہ حاصل ہو سکے۔
- برآمدانی نوعیت کے پروجیکٹ اور برآمدات کے فروغ کو منصوبہ بند مالیہ فراہم کرنے کا انتظام کیا جائے
- معاوضہ جاتی منصوبوں کی اصلاح ہونا چاہیئے اور اس کی توسیع کرکے اس کا نام "ٹیکس ادائگی منصوبہ" رکھا جائے
- چھوٹے درجے کے برآمد کنندگان کو رعائتی در پر ساکھ کی سہولت فراہم کی جائے۔

- ریاستی حکومتوں کو برآمدات کے فروغ میں تعاون دینا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے حکومت برآمدات فروغ سرکل یا کارپوریشن کے قیام کی تنظیموں اور مرکزی تنظیموں سے رابطہ رکھے۔
- زائد صلاحیت کے پاور لوم پر عائد پابندی کو ختم کیا جائے اگر وہ دس فی صد حصّہ برآمد کرتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں جناب عابد حسین کی سربراہی میں ایک دیگر کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے قیام کا خاص مقصد تجارت سے متعلق ایک مناسب پالیسی وضع کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے کہا کہ برآمد کنندگان کو جو نقد معاوضہ فراہم کیا جاتا ہے وہ ان کو ہونے والے نقصان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دروں میں تبدیلی کرنا بھی ضروری ہے۔ برآمد کنندگان ایسے کمائے ہوئے زرِ مبادلہ کا پچاس فی صد منڈیاں تلاش کرنے اور ان کی توسیع میں خرچ کر سکتے ہیں۔ اس کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا کہ ایک طویل مدتی درآمد و برآمدی پالیسی کا اعلان کیا جائے جس سے برآمد کنندگان طویل مدتی اسکیم بنا کر اس پر عمل کر سکیں۔

اس کمیٹی کی تجاویز کو لاگو کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی وزارتی کاؤنسل کی کمیٹی سکریٹری مالیات کی سربراہی میں قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے لگ بھگ سبھی سفارشات کو منظور کر لیا اور درآمدات پر معیاری طریقے سے پابندی لگائی تاکہ مالیاتی انتظام پر کنٹرول حاصل کیا جا سکے۔ اسی بنیاد پر پہلی بار اپریل ۱۹۹۵ء سے مارچ ۱۹۸۸ء تک سہ سالہ درآمدات و برآمدات پالیسی کا اعلان کیا گیا اور حکومت نے رفاہِ عامہ کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً اس کے اصولوں کو تبدیل کرنے کا حق اپنے پاس محفوظ رکھا۔

حکومت نے برآمدات کو فروغ دینے کے لیے وقتاً فوقتاً جو مختلف ادارے قائم کیے ان میں

سے کچھ خاص مندرجہ ذیل ہیں :-

- برآمدات کے فروغ کا ڈائرکٹوریٹ
- تجارتی زون۔
- تجارتی ترقی اتھارٹی۔
- صوبائی تجارتی اتھارٹی۔
- ہندوستانی پیکیجنگ انسٹی ٹیوٹ۔
- برآمدات معائنے کی کاؤنسل۔
- ہندوستانی غیر ملکی تجارت انسٹی ٹیوٹ۔
- ہندوستانی تجارتی میلا اتھارٹی۔
- برآمدات جوکھم بیمہ کارپوریشن۔

برآمدات کے فروغ کے لیے حکومت نے ان کے علاوہ بھی کچھ اقدامات کیے ہیں جیسے :-

- خام مال کی درآمدات کی سہولت فراہم کرنا۔
- مشینوں کی درآمدات کا انتظام کرنا۔
- پیشگی لائسنس دینا۔
- رعایتی قیمت پر خام مال فراہم کرنا۔
- ٹیکس سے متعلق رعائتیں دینا۔
- قرضوں کی سہولیات دینا۔
- برآمدات کے لیے ٹرانسپورٹ اور کرائے سے متعلق رعائتیں فراہم کرنا۔

روپیے کی قیمت میں کمی اور برآمدات

برآمدات کے فروغ کے لیے

۶۶ - ۱۹۵۶ء اور ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت میں کمی کی گئی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسی طرح ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ریزرو بنک کے ذریعے کیے گئے ۳ر۳ فی صد تبدیلی بھی برآمدات کے فروغ میں ممدو معاون ثابت نہیں ہوسکے۔ سال ۸۷ - ۱۹۸۶ء سے سال ۹۰ - ۱۹۸۹ء میں بھی برآمدات میں جو ۱۷ فی صد اضافہ ہوا تھا وہ بھی ۹۱ - ۱۹۹۰ء میں گھٹ کر صرف چھ فی صد رہ گیا جب کہ اپریل ۱۹۹۱ء میں یہ در مزید کم ہو کر ۴ر۴ رہ گئی۔

روپے کی قیمت میں جو مرحلہ وار کمی کی گئی اس کی وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ اس سے ہماری برآمدات عالمی منڈی میں سستی ہوجائیں گی اور درآمدات مہنگی ہوں گی۔ نتیجتاً ادائیگیوں کے توازن کے مضراب کم ہوں گے۔ لیکن موجودہ دور میں عملی طور پر برآمدات سستی ہوجانے کی وجہ سے اپنی برآمدات کے معیار کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کم ازکم ۲۰ سے ۴۰ فی صد تک برآمدات بڑھانا ہوں گی اور ہمارا ملک جو اسباب برآمد کرتا ہے ان میں زیادہ تر خام مال یا نیم تیار خام مال کی شکل میں ہوتی ہیں۔ درحقیقت ہماری صنعتی صلاحیت معیار کے اعتبار سے اتنی ترقی یافتہ نہیں کہ ہم عالمی منڈی میں دوسروں سے مقابلہ کرسکیں۔ اس کے برخلاف درآمدات مہنگی ہوجانے کی وجہ سے ہمیں ترقی یافتہ تک
غیر ملکوں سے درآمد کرنا ہوں گی
صنعتی پیداوار میں اضافہ اور مد
اصلاح کرنی پڑے گی اور
پالیسی کو سخت بنانا پڑے۔

برآمدی بجٹ ۹۳ - ۱۹۹۲ء کی در میں جزوی تبدیلی سے ملک کو اقتصادی خود انحصاری اور حقیقی خود کفالت حاصل ہوگی۔ اس کا دوسرا مقصد برآمدات کو مستحکم کرنا اور معیاری درآمدات کو بڑھانا ہے۔ اس پر عمل درآمد سے نوکرشاہی کے کنٹرول میں کمی واقع ہوگی۔ اس کے نتیجے میں کام کرنے کی صلاحیت بڑھے گی اور بدعنوانی پر قابو پانے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ غیر ملکی کرنسی کی غیر قانونی تجارت بھی کافی حد تک کم ہوجائے گی۔ نئی پالیسی کے مطابق ۴۰ فی صد حصہ سرکاری ایکسچینج کی در پر تبدیل کیا جائے گا جب کہ بقیہ ۶۰ فی صد بازار میں مقرر در پر بدلا جائے گا۔ اس ۴۰ فی صد کا استعمال ضروری درآمدات کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ اس بجٹ کے ذریعے ہر ایک برآمدات کے لین دین کے لیے ایکزم اسکرپ جاری کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیوں کہ یہ سسٹم اب بنکوں کے ذریعے لاگو کیا جائے گا اب برآمد کنندگاں کو ۶۰ فی صد حصہ پر پریمیم کا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔ مجوزہ بجٹ میں برآمدی امداد کو ختم کردیا گیا ہے۔

حکومت نے حال ہی میں ۱۹۰ اشیاء کی برآمدات کے لیے لائسنس کی پابندی کو ختم کردیا ہے۔ اس کے لیے درخواست فارم فیس بھی ختم کردی ہے۔ لیکن ان سب اقدامات کے باوجود حکومت کو اگر برآمدات کو فروغ دینا ہے تو اس کو کچھ مزید تجاویز پر بھی دھیان

معلومات فراہم کرنا۔ ان سبھی تجاویز پر عمل درآمد کرکے اگر حکومت برآمدات کے فروغ کے لیے کوشش کرے گی تو لازماً ان میں نمایاں اضافہ ہوگا جس سے نہ صرف ہماری ادائیگی تسلی بخش ہوگی بلکہ ملک میں غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے میں مناسب اضافہ ہوگا اور ملک کی اقتصادی ترقی بھی ممکن ہوگی۔

ڈاکٹر سید شرافت حسین

ملک میں صنعتی منظر نامہ کی آب و تاب

سالِ ماسبق کے بالمقابل ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ملک میں صنعتی پیداوار کی شرحِ نمو میں حقیقتاً تخفیف ظہور پذیر ہوئی تھی۔ پیداوار کے اعداد و شمار کے مطابق صنعت میں زمرہ جاتی اعتبار سے مصنوعاتی زمرہ کی پیداوار میں ۱٫۴ فی صدی کی تخفیف ہوئی جب کہ کانکنی کے زمرہ میں ایک فی صدی کی کمتر درجے سے اضافہ ہوا، لیکن توانائی کی پیداوار میں مقابلتاً ۸٫۴ فی صدی کی خوش آئند درجے سے افزونی ہوئی تھی۔ مصنوعاتی زمرہ کی شرحِ نمو میں پہلی بار وارد یہ تخفیف تشویش کن تھی، کیوں کہ مذکورہ زمرہ صنعتی پیداوار کے تئیں ہمیشہ اولین اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس مظہر کی توضیح 'طلب' اور 'رسد' کے دوہرے عوامل کی کارکردگی میں پنہاں ہے۔ 'رسد' کے معاملہ میں تو درآمدات پر عائد سخت انضباط نے 'بنیادی اصل صنعت' کی نمو و فروغ کو مخالفانہ طور پر متاثر کیا تھا۔ چنانچہ جب کہ ۹۰-۱۹۸۹ء میں اشیائے اصل کی پیداوار میں ۲۹٫۱ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا، ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران اس کی پیداوار میں گرانی رہی، اور ۹۲-۱۹۹۱ء میں تو اس میں ۱۲٫۸ فی صدی کی تخفیف ہوئی، خصوصاً بنائی کی مشینوں سے متعلق گروپ کی اشیاء میں ۱۰ فی صدی، عام مشینری و سرنشتی اوزارات میں ۴ فی صدی، اور نقل و حمل کے آلات میں ۲٫۵ فی صدی کی تخفیف ہوئی تھی۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے پہلے سہ ماہی کے دوران ملکی روپیہ کی ۲ فی صدی کم قدری کے باعث مذکورہ صنعتوں کے ذریعہ استعمال ہونے والی درآمد شدہ اشیائے خام مال کا مہنگا ہو جانا بھی اس افسوس ناک حالت کا دوسرا سبب تھا۔ اس کے علاوہ بینکوں و مالیاتی اداروں کی سود کی دروں میں اضافہ کا بھی صنعتی پیداوار پر مضرت رساں اثر مرتب ہوا۔

دوسری جانب مستعمل یا پائدار سرمایہ یا پائدار دونوں قسم کی اشیائے صرف کا زمرہ بھی "طلب" کی اطراف سے حریفانہ طور پر متاثر ہوا۔ مذکورہ سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں پائدار اشیائے صرف کی پیداوار میں ۱۲٫۵ فی صدی کی تقلیل ہوئی تھی۔ ان اشیاء کی 'طلب' میں اس وجہ سے بھی تخفیف ہوئی تھی کہ گورنمنٹ کے ذریعہ بہت زیادہ آبکاری محصول عائد کیے جانے کے باعث ان اشیاء کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ وارد ہوا۔ معیشت میں مذکورہ کارگزار عوامل کا مجموعی اثر [illegible]

[illegible] صورت میں 'دوہرا ہندسہ' افراطِ زر کی شرح اضافہ میں ۵٫۲۱ فی صدی کی حد تک مدد کی۔ مزید برآں گورنمنٹ کی قیمت سازی کی پالیسی کی وجہ سے سیمنٹ اور کیمیاوی کھادوں کی بازاری قیمتوں میں علی الترتیب ۱۷٫۴ و ۲۸٫۸ فی صدی کی رفعت ہوئی۔ نیز سوتی کپڑوں کی قیمتوں میں ۱۶ فیصدی، مشینری کی قیمتوں میں ۱۷٫۸ فی صدی اور مختلف کیمیاوی پیداوار کی قیمتوں میں ۱۵٫۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران مصنوعاتی اشیاء کی پیداوار میں وارد تخفیف کا مضرت رساں اثر ملکی برآمدات پر بھی مرتب ہوا۔ مذکورہ سال کے دوران مصنوعاتی اشیاء کی برآمد محض ایک فی صدی ہی افزوں ہو سکی، جب کہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں اس میں ۶٫۵ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا۔ تفصیل کے طور پر ۹۱-۱۹۹۰ء میں چمڑے کے سامان کی برآمد میں ۲۲ فی صدی کے اضافہ کے بالمقابل ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ۲۱٫۷ فی صدی کے بقدر منفی ذر وارد ہوئی۔ اسی مدت کے دوران انجینیرنگ اشیاء کی برآمد میں ۶٫۴ فی صدی اضافہ کے مقابلہ میں ۱٫۴ فی صدی کی منفی ذر عیاں ہوئی۔ سوتی کپڑوں کے برآمدات میں فروغ [illegible] فی صدی

ہیڈ آف دی اکونامکس ڈیپارٹمنٹ، جواہر لال نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج، بارہ بنکی (یو۔پی)

رہ گئی، جب کہ سِلے سِلائے کپڑوں کی برآمد میں ۵ء۱۵ فی صدی ترقی کے بجائے فی صدی کی تخفیف ہو گئی۔ مجموعی طور پر مصنوعاتی اشیاء کی برآمد میں اضافہ کی دَر ۵ء۶ فی صدی سے تقلیل ہو کر محض ۱ء۱ فی صدی ہی رہ گئی۔

عمومی حالات میں بازار اصل کی نمو کی صنعتی پیداوار کے فروغ کا قیاس تصور کیا جاتا ہے۔ ایکس جب کہ ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران صنعتی پیداوار کی نمو میں تخفیف ہوئی، بازار اصل میں غیر معمولی سرگرمی رہی۔ سال ماقبل کے بالمقابل ۹۲-۱۹۹۱ء میں نئی اصل اجرائی کی رقم میں ۳۶ فی صدی اور تمسکات میں اصل کاری میں ۳۷ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ صنعتی پیداوار میں کساد بازاری ہونے کے باوجود عام اصل کار کی ہمت شکنی نہیں ہوئی، بلکہ اس نے زائد منافع حاصل کرنے کی غرض سے اپنی بچت کی تمسکات بازار میں بار اصل کاری بھی کی۔ ثانوی بازار حصص میں تجارتی سودے بغیر کسی مزاحمت کے پوری قوت سے بڑھتے رہے، جس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ریزرو بنک کے معمولی حصص کی قیمتوں کا اشاریہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۴۳ء۰۵ سے ۵۵ فی صدی بڑھ کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۶۷ء۲۱ ہو گیا۔ حصص کی کل فروخت کی اصطلاح کے اعتبار سے بمبئی تمسکات صرافہ سب سے زیادہ فعال تھا، کہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۳۶ ہزار کروڑ روپے کی کل فروختگی کے بالمقابل ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران کل فروخت ۶۸ ہزار کروڑ روپے کے بقدر ہوئی تھی۔ "بازار اصلیانہ" کی اصطلاح میں اوسط ماہانہ فروختگی تقریباً ۵ ہزار کروڑ روپے تھی اور اوسط قیمت: آمدنی تناسب ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۹ء۳ سے مرتفع ہو کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۶ء۱ ہو گیا۔ "بازار اصلیانہ" کی اصطلاح میں برتر پچاس کمپنیاں کل بازار اصلیائے کی تقریباً ۴۲ فی صدی کے لیے ذمہ دار تھیں، کہ جو مارچ ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۲۲ ہزار کروڑ روپے کے بقدر تھا۔ مذکورہ سال کے دوران کل اجراء شدہ حصص کے ۵۰ فیصدی سے متجاوز اجراء کے معاملہ میں ۱۰ گنا سے زائد حصص خریدے گئے تھے۔ مزید برآں صنعتی زمرہ نے مالیاتی اداروں سے بھی خطیر رقوم قرض کے طور پر حاصل کی تھیں۔

تخمیناً ۴۰۰ء۰ کروڑ روپے کی مجموعی پراجیکٹ لاگت والی ۱۲۵۷ پراجیکٹس کے تئیں مالیاتی اداروں سے مالی وسائل فراہم کیے گئے تھے۔ آل انڈیا مالیاتی اداروں سے پراجیکٹس کے تئیں مہیا امداد ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۸،۰۴۰ کروڑ روپے سے افزوں ہو کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۳،۰۰۸ کروڑ روپے کے بقدر ہو گئی تھی۔ منظور شدہ مالیات کی ادائیگی بھی ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۱،۴۱۰ کروڑ روپے سے ۳۴ء۳ فی صدی کی مستعجل دَر سے اضافہ ہو کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۵،۳۱۸ کروڑ روپے تک پہنچ گئی تھی، صنعتی زمرہ میں مرتفع تشکیل اصل کی سطح۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران صنعتی پیداوار روی کے باوجود صنعتوں میں سال ہی بہت زیادہ اصل کاری ہونا مستقبل کے لیے ایک خوش آئند فال ہے لہٰذا اگر پالیسی متوازن معقولیت کے ساتھ موافق رہتی ہیں تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ صنعتی نمو دوبارہ زیاں حاصل کر کے اگلے سال (یعنی ۹۳-۱۹۹۲ء) ۸ فی صدی کی شرح نمو حاصل کر سکے گی۔

چنانچہ ریزرو بنک کے دسمبر ۱۹۹۲ء کے جائزے میں ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران مجموعی قومی پیداوار میں ۴ فی صدی کی شرح نمو کا تخمینہ کیا گیا تھا۔ لیکن صنعتی زمرہ کی بابت مجموعی طور پر تقریباً ۳ فی صدی نمو کی دَر کا اندازہ کیا گیا تھا۔ گو کہ سال مذکورہ کے پہلے سہ ماہی میں صنعتی پیداوار میں ۵ء۴ فی صدی کی شرح نمو وارد ہوئی تھی، لیکن بعدہ، جولائی ۱۹۹۲ء میں مصنوعاتی زمرہ کی نمو میں ۳ء۲ فی صدی کی تخفیف کے باعث صنعتی پیداوار کی شرح نمو ۱ء۹ فیصدی منفی درج ہوئی تھی۔ باوجود اس کے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ زراعتی زمرہ میں مرتفع نمو سے متاثر ہو کر نومبر ۱۹۹۲ء کے بعد 'طلب' میں قرار واقعی اضافہ کا امکان ہے، جس کی باعث مصنوعاتی زمرہ میں نمو کی رفتار میں تیز روی آئے گی۔ مزید برآں 'رسد' کے جانب سے کسی رکاوٹ کا اندیشہ بھی نہیں تھا کیوں کہ بنیادی صنعتوں اور سہولیات سے متعلق صنعتوں میں مسلسل تیز روی جاری رہی ہے پھر خام مال اور تکمیلی اجزا کی درآمد پر کوئی مقداری ضبط بھی نہیں ہیں۔ زراعتی زمرہ میں نمو کی قرار واقعی دَر سے متاثر صارفی اشیاء کی وسیع 'طلب' کے باعث کارپوریٹ اصل کاری میں بھی اضافہ کا رجحان پیدا کرنے کا اندازہ کیا گیا تھا۔

حالانکہ ۹۲-۱۹۹۱ء کے بالمقابل

... سے تا ... سالانہ مذکورہ مدت کے دوران ۹۲-۱۹۹۱ء کی اسی مدت کے مقابلہ میں صنعتی پیداوار میں ۸ء۲ فیصدی اور مصنوعاتی زمرہ کی شرح نمو میں ۳ء۷ فی صدی کا اضافہ وارد ہوا۔ نمو کی یہ مثبت دریں ۹۲-۱۹۹۱ء کی سرد بازاری کے حوالہ سے ہیں، لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ۹۱-۱۹۹۰ء کے اوائلی سات مہینوں کے دوران پیداوار کی سطح سے مقابلہ کرنے پر ۹۳-۱۹۹۲ء کے حوالی سات مہینوں کی مدت میں مجموعی صنعتی پیداوار اور مصنوعات کی پیداوار میں علی الترتیب ۲ء۳ اور ۱ء۱ فی صدی کی مثبت نمو کی دریں وارد ہوئی ہیں۔ صنعتی پیداوار کے اشاریہ کو ۸۸ء۱ فی صد تک متعین کرنے والی چنندہ ۱۷ صنعتوں کی بابت اپریل لغایت ستمبر ۱۹۹۲ء کی مدت سے متعلق پیداواری اعداد و شمار کے تجزیہ سے عیاں ہوتا ہے کہ ۵ء۴۷

صدی کے مجموعی بھار (ویٹ) کی ۸۶ صنعتوں ں مثبت شرح نمو وقوع پذیر ہوئی اور ان ، ۷، ۱۲ فی صدی شکے بھار (ویٹ) والی ۴ عتوں نے تو ۱۰ فی صدی سے زائد اضافہ ج کرایا۔ ۱۰ فی صدی سے متجاوز شرح نمو درج نے والی صنعتوں میں سیمنٹ مشینری ہاتھ ، گھڑیاں، ایل ڈی پالیتھلین، جہاز سازی نت، شکر، کپڑا (نامرکزی زمرہ) پالیسٹر ئبر اور ریلوے ڈبہ جیسی نہایت اہم صنعتیں امل ہیں۔

صرف پر مبنی درجہ بندی کے اعتبار سے یل لغایتہ ستمبر ۱۹۹۲ء کے دوران ۲، ۱ نعتوں کے جائزے سے عیاں ہے کہ مذکورہ رت میں درمیانی اشیار اشیائے اصل، پائیدار صارفی اشیاء اور بنیادی صنعتوں نے ۲، ۲ ے لے کر ۸، ۸ فی صدی کی مثبت شرح نمو درج ئی ہے۔ صرف ناپائیدار صارفی اشیار کے معاملے میں منفی شرح نمو وارد ہوئی ہے لیکن اس س میں بھی شرح نمو میں خاص حاسیائی تصریف لی ہے دراصل جولائی تا اگست ۱۹۹۲ء کے ران صنعتی اور مصنوعاتی زمروں میں وارد شرح کی تصریف کے باعث یہ تشویش پیدا ہوئی ی کہ غالباً ہندوستانی صنعت کساد بازاری کی رفت میں آگئی ہے لیکن ستمبر ۱۹۹۲ء میں صنعتی و میں قرار واقعی اضافہ کے سبب سے اس تشویش کا ازالہ ہوگیا ہے درآنحالیکہ ابھی ندوستانی صنعتی نمو پائیداری سے ہنوز دور تھی، ہم ستمبر ۱۹۹۲ء میں وارد مربع نمو کی شرح کے یں یہ اندازہ کیا گیا کہ سال رواں (یعنی ۹۳-۱۹۹۲ء) ے بقیہ ایام میں طلب و رسد کے بہتر رجحان کے باعث صنعتی نمو کی روش میں اضافی رجحان رید مستحکم ہوگا اور صنعتی نمو کی اس اضافی روش و برقرار رکھا جا سکے گا۔ چنانچہ مرکزی حکومت ی بابت گورنمنٹ کے سالانہ جائزے میں یہ امید کی گئی تھی کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران مصنوعاتی زمرہ میں ۴ فی صدی اور تقریباً مماثل شرح نمو مجموعی طور پر صنعتی زمرہ میں بھی وارد ہوگی۔

چنانچہ ۹۲-۱۹۹۱ء کے مقابلہ میں، کہ جب صنعتی پیداوار میں حاسیائی طور پر منفی درجہ عیاں ہوئی تھی، ۹۳-۱۹۹۲ء میں زیادہ تر صنعتوں کی کارکردگی بہتر رہی، لیکن یہ روش صنعتی زمرہ کی عمومی نمو کے رجحان سے کمتر تھی۔ درحقیقت ۹۳-۹۲ء کے دوران صنعتی پیداوار میں بحالی کی سست روی کے لیے کئی عوامل ذمہ دار تھے۔ درآنحالیکہ ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران درآمدات پر عائد جن پابندیوں کے باعث صنعتی زمرہ کی کارکردگی پست رہی تھی، وہ سال مذکور کے آخر تک مکمل طور پر موقوف کر دی گئیں۔ اور اس کی جگہ مخلوط شرح مبادلہ کی حکمت کا یا نظام جاری کیا گیا، تاہم اس کے تئیں مقداری پابندیوں کے انقباضی عنصر کے موقوف ہو جانے کے بعد بھی شرح مبادلہ کی تبدیلی کے زیر اثر نسبتی درآمداتی صنعتوں میں استعمال کے لیے درآمد شدہ زر آمدے کی گراں لاگت اب بھی صنعتی زمرہ کے لیے امتناع کا سبب رہی۔ بہتر شرح مبادلہ کی نئی درسے برآمدات کی ہمت افزائی ہونے کی توقع ہے کہ جس کے باعث نسبتی برآمداتی صنعتوں کی پیداوار میں افزائش و دلیعت ہونے کی توقع ہے۔ لیکن شاید برآمدات پر مثبت اثرات قدرے وقفہ کے بعد ہی ظہور پذیر ہو سکیں گے۔

اس کے علاوہ ۹۳-۱۹۹۲ء کی ابتدا میں افراطی دباؤ کے جاری رہنے کے باعث سال مذکور میں بھی ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران قرضوں پر عائد انقباض کو جاری رکھنا لازمی تھا۔ بہرحال افراطی دباؤ میں قدرے سکون ہونے کے بعد صنعتی بحالی کی ہمت افزائی کی غرض سے ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران چند مراعات دی گئیں۔ سود کی دروں میں تخفیف کی گئی اور صنعتوں کو فراہم کردہ قرض کی ضمانت میں بھی وافر وسعت دی گئی۔ مثال کے طور پر ۸، جنوری ۱۹۹۳ء تک تجارتی زمرہ کو فراہم کردہ بنکوں کا قرض ۱۲۰۰، ۲۱ کروڑ روپے تک وسعت پاگیا، جبکہ ۹۲-۱۹۹۱ء کی جوابی مدت میں یہ قرض محض ۱۳۵، ۷ کروڑ روپے کے بقدر ہی تھا۔ نتیجتاً صنعتی نمو کی اسراع کے آثار نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ صنعتی پیداوار کے سالانہ اوسط کا متحرک اشاریہ جو ۷ ماہ پیشتر جامد تھا، اکتوبر ۱۹۹۲ء کو اختتام پذیر سال کے دوران ۲، ۲ فی صدی کی در سے فروغ کی نشاندہی کر رہا ہے حالانکہ دسمبر۔ جنوری ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران انتشار کی فراخی کی کمیت کا تعین کرنا آسان نہیں ہے، تاہم اگر اس سے پیشتر وارد صنعتی بحالی کی روش برقرار رہتی ہے تو احتیاطاً ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران مجموعی طور پر صنعتی نمو کی در ۴ فی صدی تک ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ اطلاقی معاشی تحقیق کی قومی کونسل (این سی اے ای آر) نے موافق مانسون، سال گذشتہ کے مقابلہ میں علامتی سرکاری اصل کاری کی در میں ۱۶ فی صدی کے اضافہ، ۵، ۸ سے ۹ فی صدی تک کی تطلیلی افراط زر کی شرح اور زر مبادلہ میں اوسطاً ۸ فی صدی کی فرسودگی کے مفروضہ پر اپنے ایک حالیہ جائزے میں ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران قائم قیمتوں کے اعتبار سے مجموعی قومی پیداوار میں ۵ فی صدی کے اضافہ کی پیش گوئی کی ہے۔ زمرہ جاتی اعتبار سے بشمول تعمیرات صنعتی پیداوار کی قدر میں ۶ سے ۵، ۶ فی صدی، بشمول کانکنی و پتھر کنی بنیادی سہولیات کے زمرہ میں ۵، ۵ سے ۶ فی صدی، خدمات میں ۶ فی صدی اور زراعت میں ۲، ۳ فی صدی کی شرح نمو کی پیش گوئی شامل ہے۔

جے. کے. گہلاوت

چینی کی صنعت بجلی کی پیداوار بڑھانے میں مدد دے سکتی ہے

بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں توانائی کی قلت ہے اور یہ سمجھی جاتے ہیں کہ توانائی کی دستیابی اور اقتصادی ترقی میں کیا تعلق ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کی مدت میں ترقی پذیر ملکوں میں جی ڈی پی (یا اندرون ملک مجموعی پیداوار) میں ۲٫۵ فی صد سے ۳٫۷ فی صد کا اضافہ ہوا جب کہ توانائی کی کھپت فی سال ۷ فی صد بڑھی۔ عہد حاضر میں بھارت میں بجلی کی شکل میں توانائی کی کھپت ۱۱ فی صد سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی ہے۔ مزید برآں بھارت میں فی کس توانائی کی کھپت عالمی اوسط کی ۲۵ فی صد ہے۔ اس صورت حال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ اقتصادی بقا کے لیے، خصوصاً ایک کھلی اور مقابلے والی معیشت میں جس کی طرف بھارت اس وقت بڑھ رہا ہے، توانائی کے وسائل کے فروغ پر اور زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔

سبھی شعبوں میں توانائی کی ضرورتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ توانائی کے روایتی وسائل، پن بجلی، حرارتی بجلی اور کچھ حد تک نیوکلیائی بجلی ہیں۔ تیل، گیس اور کوئلے جیسے روایتی ایندھن ہمیشہ بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا نہیں کر سکتے، خام تیل وغیرہ غیر ملکی زر مبادلہ کے بھاری اخراجات ہمارے ملک کے اقتصادی توازن میں بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ [illegible] ترقی کی موجودہ رفتار کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے آٹھویں منصوبے کے دوران ۱۲ ارب روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔ لیکن وسائل کی [illegible] قلت کی وجہ سے منصوبہ [illegible] لیے ۶۰۰ ارب روپے سے زیادہ [illegible] سکا۔ اس کے معنی ہوں گے [illegible] میگاواٹ بجلی کی کمی پیدا ہوگی [illegible] ہے کہ بجلی کی پیداوار بڑھانے کے [illegible] فنڈس کی ضرورت تو بڑی ہی جگہ ہے۔ روایتی طریقوں سے اور زیادہ بجلی پیدا کرنے کے مختلف پروجیکٹوں پر عمل درآمد سے کچھ سنگین مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ کیوں کہ ان سے ماحول پر برا اثر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حال ہی میں اس بات پر اور زیادہ زور دیا جانے لگا ہے کہ ہمیں شمسی توانائی، ہوائی توانائی اور بایو گیس وغیرہ غیر روایتی وسائل کی کھوج کرنی چاہیے۔ شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہوگا کہ بھارت میں چینی کی صنعت غیر روایتی توانائی کا سب سے بڑا واحد ذریعہ بن سکتی ہے۔ وہ ملک کی بجلی کی کل پیداوار کا ۱۰ فی صد (یعنی ۵۰۰۰ میگاواٹ) کم خرچ پر پیدا کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ چینی کی صنعت کی بیک وقت بجلی اور بھاپ پیدا کرنے کی [illegible] طریقوں کے [illegible] کی خوبیاں رکھتی ہے [illegible] اور ڈیلی ڈھانچے پر کم سرمایہ لگانا ہوگا اور ایندھن پر قریب قریب کچھ بھی [illegible] نہیں پڑے گا۔

بیک وقت بجلی اور بھاپ کی پیداوار

ایک ہی وقت میں بجلی اور بھاپ دونوں پیدا کرنے کو انگریزی میں "کو جنریشن" (Cogeneration) کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں مشترک پیداوار۔ پراسیس کرنے والی بہت سی صنعتوں میں توانائی دو شکلوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ایک بجلی اور دوسری بھاپ۔ ایسے تمام کارخانوں میں جنہیں بڑی مقداروں میں بھاپ اور بجلی کی ضرورت پڑتی ہے، (Co-generation) کا طریقہ ڈیزائن کے مرحلے پر شامل کیا جا سکتا ہے۔ بھاپ زیادہ دباؤ والے

مصنف انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کانپور میں کیمیکل انجینئرنگ کے پروفیسر ہیں۔

بوائلروں میں پیدا کی جانی چاہیئے اور پھر اسے بجلی پیدا کرنے کے لیے ایک اسٹیم ٹربائن میں لے جانا چاہیئے۔

چینی کی صنعت میں رس نکالنے کے بعد گنّے کا جو کھوجڑا یا پھوک ... بچ رہتا ہے اسے بھاپ اور بجلی پیدا کرنے کے لیے بطور ایندھن کام میں لایا جاتا ہے۔ کسی باہری ایندھن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے ایک وقت بھاپ اور بجلی پیدا کرنے کے لیے چینی کی ملیں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ گنّے کا کھوجڑ صاف ستھرا ایندھن ہوتا ہے۔ اس لیے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری گیسیں کم مقدار میں نکلتی ہیں اور ماحول پر خراب اثر نہیں پڑتا۔ چینی ملیں دیہی علاقوں میں ہوتی ہیں اس لیے ان کی پیدا کی ہوئی بجلی دیہی علاقوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔ جو اب تک عدم توجہی کا شکار رہے ہیں

'کوجنریشن' کوئی نئی بات نہیں ہے کیوں کہ بھارت میں چینی ملیں بہت سالوں سے اپنی ضرورت کے لیے بجلی پیدا کرتی رہی ہیں ہوائی اور ماریشس جیسے چھوٹے ملکوں میں بجلی کی پچاس فی صد ضرورتیں چینی ملیں ہی اس تکنیک سے پوری کرتی ہیں۔ چینی ملوں نے اس وقت تک فاضل بجلی پیدا کرنے اور اسے گرڈ کو فروخت کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔ اگرچہ فاضل بجلی پیدا کرنے پر اس سرمائے کا صرف ایک حصہ ہی خرچ ہوگا جو بجلی پیدا کرنے کے لیے پلانٹ لگانے کے لیے چاہیئے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کی چینی ملیں اور دوسری صنعتیں بایوماس، بایوگیس، گنّے کا کھوجڑا اور ڈیزل سے چلنے والے سسٹموں کے استعمال سے (Cogeneration) تکنیک سے تقریباً ۱۰۰۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس میں سے تقریباً ۵۰۰۰ میگاواٹ بجلی صرف چینی کی صنعت ہی پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

غیر روایتی توانائی کے دوسرے وسائل کے، جو ہنوز تحقیق و ترقی وغیرہ کے ابتدائی مرحلے میں ہیں، برعکس 'کوجنریشن' ایک آزمودہ اور پختہ ٹکنالوجی ہے۔ اس کے لیے ہائی پریشر بوائلر بیرونِ ملک سے درآمد کرنے پڑیں گے اگرچہ اس بات کے واضح آثار ہیں کہ اس قسم کے بوائلر جلد ہی ملک کے اندر ہی بنے لگیں گے۔ اس تکنیک کو فروغ دینے میں کسٹمز اور ایکسائز ڈیوٹی میں کمی، سیلز ٹیکس میں رعایت، ٹوٹ پھوٹ کے لیے سو فی صدی چھوٹ، مالیات کی فراہمی بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ سماج کے وسیع تر مفاد میں ہوگا کہ تمام ہی چینی ملوں میں شروع سے ہی کوجنریشن کی سہولیات قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جن چینی ملوں کی جدید کاری اور توسیع کی جا رہی ہو ان میں بھی یہ سہولیات مہیا کی جانی چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے صنعت کو کم سود پر کافی فنڈس فراہم کئے جانے چاہئیں۔ فنڈ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ چینی کا ترقیاتی فنڈ ہو سکتا ہے۔ (Cogeneration) اکائیوں میں پیدا کی گئی بجلی استعمال کرنے والوں پر ایک محصول لگایا جا سکتا ہے اور محصول سے جمع شدہ رقوم ترقیاتی فنڈ میں جمع کی جا سکتی ہیں۔ پاور فائنینس کارپوریشن بھی 'کوجنریشن' اکائیوں میں سرمایہ لگا کر مدد دے سکتا ہے۔ حال ہی میں عالمی بینک نے بھی کہا ہے کہ 'کوجنریشن' فاضل بجلی حاصل کرنے کا ایک اچھا اور کفایتی ذریعہ ہے۔ چنانچہ وہ مرکزی یا کسی ریاستی حکومت کے سفارش کردہ پرائیویٹ سیکٹر کے لیے قرض فراہم کرنے کو تیار ہے۔ اس لیے یہ بات تو صاف ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے اس حیرت انگیز طریقے کے لیے مالیات کی فراہمی مشکل نہ ہوگی۔

توانائی بخشنے والی فصل

وافر مقدار میں دستیاب شمسی توانائی کو بایوماس میں بدلنے کے سب سے اچھے اور موثر طریقوں میں سے ایک سب سے اچھا اور قدرتی عمل (Photosynthesis) ہے۔ اس لحاظ سے گنّے کا پودا ایک انوکھی خاصیت رکھتا ہے۔ گنّے کی فصل واحد فصل ہے جو شمسی توانائی کو بایوماس میں بدلنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے اور اسے بجا طور پر خوراک، ایندھن، ریشے، کھاد اور کیمیکلز کا ذخیرہ کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہیکٹر زمین ایک سال میں دس ٹن خوراکی اشیا (جس میں چینی بھی شامل ہے) ایک ہزار لیٹر الکحل اور دو ٹن کھاد پیدا کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس خام مال کو زیادہ اچھے ڈھنگ سے پراسس کیا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۵۰۰ ٹی سی ڈی گنّا پیلنے کی صلاحیت رکھنے والی متوسط سائز ایک چینی مل آٹھ دس میگاواٹ فاضل بجلی پیدا کر سکتی ہے جو گرد و نواح کے دوسرے صارفین کو فراہم کی جا سکتی ہے اس وقت بھارت میں چینی کی ۴۰۰ ملیں ہیں۔ مزید ۷ ملیں زیر تنصیب ہیں۔ اس طرح چینی کی صنعت اپنی ۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی کی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ ۵۰۰۰ میگاواٹ سے زائد بجلی قومی پاور گرڈ کو مہیا کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے جدید قسم کے بوائلر استعمال کرنے ہوں گے۔ گنّے کا کھوجڑ اور شیرہ بہت کارآمد چیزیں ہیں۔ کھوجڑ سے اچھی قسم کا کاغذ تیار کیا جا سکتا ہے اور شیرے کا استعمال الکحل تیار کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

(باقی صفحہ ... پر)

بی۔ این۔ لبسوال

چینی کی صنعت
کتنے خوش آئند ہیں مستقبل کے امکانات؟

معاملے [illegible] چینی کی [illegible] کی
[illegible] کی پہلی [illegible] ہوئی تھی
[illegible] تقسیم [illegible]
[illegible] ۱۹۲۱ء
میں ملی [illegible] حاصل ہونے کے بعد اس صنعت
نے عظیم ترقی کی [illegible]
[illegible]
[illegible] اس وقت بھارت دنیا
[illegible] تیار ہونے والی چینی کی پیداوار
[illegible] آگے ہے ۷۶ - ۱۹۷۸ء میں
ہماری چینی کی صنعت ملک کی سب سے
زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ کمانے والی واحد صنعت
بن گئی۔ اس طرح کہ برآمدات سے ہونے
والی مجموعی آمدنی میں اس کا تقریباً ۵ فی صد
حصہ تھا۔ لیکن چینی کی صنعت کی یہ شان
۱۹۸۰ء کے بعد رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور
اب صورت یہ ہے کہ ہم چینی کی پیداوار
کے معاملے میں کم و بیش خودکفیل ہیں۔
۱۹۹۱ء میں ہم نے دو لاکھ ٹن چینی [illegible]
دوسرے ممالک کو برآمد کیا جس سے [illegible]
۳۰ کروڑ روپے کے بقدر غیر زرمبادلہ حاصل
ہوا۔ یہ مقدار ہماری کُل زرعی مصنوعات
کی کُل برآمدات کا فقط ۸ر۰ فی صد ہے۔

اس [illegible] چینی کی صنعت کو [illegible] بڑے
مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں [illegible]
پرانی اور از کار رفتہ [illegible] کا استعمال،
گنے کی کم پیداوار [illegible]
[illegible] اور [illegible]
شامل ہیں
اس صنعت [illegible]
اہم کچا مال ہے۔ چینی کی کل [illegible]
میں ۶۰ فی صد حصہ گنے کا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر
ہے کہ اس صنعت کا دارومدار ملک میں گنے
کی پیداوار پر رہتا ہے۔
بدقسمتی سے ملک میں گنے کی پیداوار
گذشتہ تیرہ سالوں سے ٹھہراؤ کی سی حالت
میں ہے۔ ۷۸ - ۱۹۷۷ء میں گنے کا زیر کاشت
رقبہ ۳ر۱۵ ملین ہیکٹیئر تھا۔ ۹۱ - ۱۹۹۰ء میں
وہ قدرے بڑھ کر ۳ر۷ ملین ہیکٹیئر ہو گیا۔
پیداوار بھی ۷۸ - ۱۹۷۷ء کے ۱۷۶ ملین ٹنوں
کے مقابلے میں ۹۱ - ۱۹۹۰ء میں ۲۴۰ ملین ٹن
ہو گئی۔ ان اعداد کے مطابق گنے کی پیداوار
میں ایک فی صد سالانہ سے بھی کم کا اضافہ ہوا
اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی گنے کی پیداوار اتنی
نہ ہو پائے گی کہ چینی کی صنعت کی ضرورت
کو پورا کیا جا سکے [illegible] چینی کے محاذ پر

[illegible] ہونے کا خطرہ ہے۔ اس
کی [illegible] ہیں گھٹیا [illegible] کے گنے
کا [illegible]

[illegible] کے بعد جلد از جلد استعمال کیا جائے
چینی کی جو ملیں نقصان میں چل رہی
ہیں یا خستہ حال ہیں، وہ بھی صنعت کے لیے
ایک بوجھ ہیں۔ گُڈ تو راؤ کمیٹی نے کہا تھا کہ
بہت سی ہندوستانی چینی ملوں میں پرانی اور
از کار رفتہ مشینیں استعمال کی جا رہی ہیں اس
سے پیداوار میں کمی ہوتی ہے اور مل دھیرے
دھیرے خستہ حال ہو جاتی ہے۔ سین انکوائری
کمیشن نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ دس سال
پہلے انڈین شوگر ملز ایسوسی ایشن نے اندازہ
لگایا تھا کہ صنعت کو اپنی موجودہ اکائیوں
کی جدید کاری کے لیے ایک ارب پندرہ
کروڑ روپے کی ضرورت ہے

علاج:

چینی کی صنعت کی ترقی کے لیے گنے

---

* مصنف نوزنگ پور کالج اڑیسہ میں کامرس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔

کی پیداوار بڑھانا بہت ضروری ہے۔ اس کے لئے جلد تیار ہونے والی گنے کی فصلوں کو بڑھاوا دینے اور کاشت اور فصل کی کٹائی کے لئے جدید مشینوں کے استعمال کی ضرورت ہے۔ چینی کی فیکٹریوں کے علاقوں اور دوسرے ضلعوں میں بھی فصل اگانے کی جدید تکنیکیں مقبول بنائی جانی چاہئیں اور پانی اور کھاد وغیرہ کا مناسب بندوبست کیا جانا چاہئے۔ ۱۹۹۱ء میں ہم نے چینی کی صنعت میں ریسرچ پراجیکٹوں پر دیار روپئے ۴۲ لاکھ ۵۶ ہزار روپیہ خرچ کیا تھا۔

بیمار یا خستہ حال فیکٹریوں کی حالت کئی طریقوں سے بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ اگر خستہ حالی فرسودہ مشینری کی وجہ سے ہو تو اضافی سرمایہ اور انتظامیہ اور تکنیکی رہنمائی فراہم کر کے جدید مشینوں کا استعمال شروع کروایا جا سکتا ہے۔ خستہ حال اکائیوں کو مدغم کر کے انھیں کوآپریٹو سیکٹر کے تحت لایا جا سکتا ہے۔ ایسی اکائیوں کی دیکھ بھال کے لئے ریاستوں میں چینی کے ریاستی Directive قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے انتظامی مہارت اور ادارہ جاتی مالیات وغیرہ میں بہت مدد ملتی ہے۔

دس سال پہلے قائم کئے گئے چینی کے ترقیاتی فنڈ نے یہ سفارش کی تھی کہ اسٹوریج اور سود وغیرہ کے اخراجات سرکار کو برداشت کرنے چاہئیں۔ اس کے طے کردہ اصول کے مطابق ایک کوئنٹل چینی کی پیداوار پر ۱۴ روپے کا محصول لیا جائے گا۔ اس میں سے ۹ روپے فاضل ذخیرہ تیار کرنے اور ۵ روپے گنے کی قسم بہتر بنانے پر خرچ کیے جائیں گے۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس سے چینی تیار کرنے والی خستہ حال اکائیوں کو بہت مدد ملے گی۔ چینی کی پیداوار میں اب ہم خود کفیل ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر ہم ضروری احتیاطی اقدامات کریں تو چینی کی صنعت کی پیداوار اور برآمد کے معیاروں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اور وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر حاصل کر سکتی ہے۔

●

نقد: ترقی کی رفتار تیز کرنے والا ایک معاون عنصر

ان حالات کے تحت اس کی توقع تا ... ہوگی۔
حکومت نے سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج بورڈ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم کا بھی فیصلہ کیا ہے تاکہ سرمایہ بازار میں اصلاحات پر عمل لانے کے لئے اسے مزید اختیارات دیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ بینک کے شعبے میں اصلاحات کے سوال پر غور کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی بھی تشکیل دی جا رہی ہے۔

●

جوابات کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ہاں۔
۲ تلونڈی (Talwandi)
۳۔ ٹیکس (Tax) کو
۴ امبر (Amber) کی۔
۵۔ ہاں۔
۶ سدھودانا (SUDDHODANA)
۷۔ ۲۶۱ء قبل مسیح۔
۸ لیہہ (LEH)
۹۔ سندری (بہار)۔
۱۰ راجستھان۔
۱۱۔ برطانیہ
۱۲ مولوی عبدالحق۔
۱۳۔ جوش ملیح آبادی۔
۱۴ کرشنا ندی سے۔
۱۵۔ "مرچنٹ آف وینس"، شکسپیئر۔
۱۶۔ گلپھڑے (Gills) کے ذریعہ۔
۱۷۔ التمش۔
۱۸۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء۔
۱۹۔ انسولین (Insulin)
۲۰۔ سات ججوں پر
۲۱۔ ایک سال۔
۲۲۔ سپریم کورٹ۔
۲۳۔ ۱۴ دن میں۔
۲۴۔ دو تہائی رائے کو۔
۲۵۔ بارہ ممبروں کو۔
۲۶۔ سری نگر۔
۲۷۔ کرکٹ۔
۲۸۔ مانچسٹر، یو۔ کے Manchester (U.K.)
۲۹ سکندر لودھی۔
۳۰۔ جرمنی۔
۳۱۔ بہادر شاہ ظفر۔
۳۲ نئی دہلی۔
۳۳۔ عبدالحئی۔
۳۴۔ گنیش ساورکر۔ (Ganesh Savarkar)
۳۵۔ گیسو دراز بندہ نواز۔
۳۶۔ ۲۳۹، ۲۰ و ۱۸۔
۳۷۔ ۲۵۰ و ۱۲ کروڑ۔
۳۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔
۳۹۔ ۱۹۳۵ء میں۔
۴۰۔ قلی قطب شاہ۔

●

اریجیت باگچی

کان کنی اور ماحولیاتی منصوبہ سازی

کان کنی سے ماحولیات اور آراضی کو نقصان پہنچنا ایک لازمی امر ہے کیوں کہ اس سے زمین کی زرخیزی متاثر ہوتی ہے اور اوپری مٹی وغیرہ کو عارضی یا مستقل طور پر منتقل کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چراگاہیں اور کھیتی کی زمین ضائع ہوتی ہے نیز کان کنی زمینی کٹاؤ کیچڑ، بحری زندگی کے خاتمے، آبی کثافت اور مخصوص مویشیوں اور پیڑ پودوں کے خاتمے کا باعث بنتی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں کان کنی سے ۲۰۰ ہیکٹیر آراضی اپنی زرخیزی سے محروم ہو چکی ہے اور ہمیں اپنی اینٹوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے مزید ۵۵۰ ہیکٹیر زمین سے محروم ہونا پڑے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگلے ۲۰ برسوں میں کوئلہ کی کان کنی سے مجموعی طور پر ...... ۲ ہیکٹیر آراضی متاثر ہوگی۔ یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ کول انڈیا لمیٹڈ نے کوئلہ کی تلاش کے لیے سنگرینی کوئلہ میدانوں کے تحت جن علاقوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے ۳۰ فی صدی جنگلات کا علاقہ ہے۔

اراضی کو قابل کاشت بنانے کی ساری اسکیموں میں دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ماحولیات اور سماجی و اقتصادی صورت حال پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ زمین کو قابل کاشت بنانے اور مسلسل ترقیاتی عمل کو جاری رکھنے کے لیے ایک جامع پالیسی مرتب [illegible] جانے کی ضرورت ہے۔

بیشتر علاقوں میں کان [illegible]

ایک بڑا حصہ بے روزگار اور [illegible]

ہے۔ زیادہ تر کان جنگلاتی علا[illegible]

وہاں رہنے والے قبائلی افراد اور جنگلا[illegible]

کا آپس کا جو تعلق ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر سماجی اقتصادی حالات اور سماجی انصاف پر توجہ نہیں دی گئی تو نتیجتاً کانوں کے آس پاس رہنے والے افراد مصائب کا شکار ہوں گے۔

کان کنی کی سرگرمیوں کا قدرتی ہریالی اور ماحول پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھتی ہے۔ تیزاب کی بارش اور فضا میں بہت سی تبدیلیوں کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

کان کنی اور ماحولیات سے متعلق ورکنگ گروپ کی جنوری ۱۹۸۱ء کی رپورٹ اس سلسلہ میں پہلے اہم قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رپورٹ میں صنعت کی ماحولیات سے متعلق مسئلوں پر توجہ دینے کے لیے

جو سفارش کی گئی تھی۔ ۱۹۹۲ء کے اوائل میں ماحولیات سے متعلق ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمہ ماحولیاتی نقطۂ نظر سے [illegible]

[illegible] ان

ہی کے حوالے کرنے کی گنجائش نکالی گئی جو کہ اس کے اصل استعمال کرنے والے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں جنگلات سے متعلق نظرثانی شدہ پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جو بھی اراضی سے مستفید ہوگا اسی کو مروجہ قاعدوں کے مطابق اراضی کی مرمت، اسے ہرا بھرا اور پیڑ پودے لگانے کا کام انجام دینا ہوگا۔

باز آباد کاری

باز آباد کاری کی حکمت وسیع تر ہونی چاہیے اور اس میں کئی محکموں کو شامل کیا جانا چاہیے۔ قلیل مدتی اقدامات سے نہ تو پائیداری آسکے گی اور نہ ہی اقتصادی ترقی کی رفتار اور قدرتی ماحول برقرار رہ سکے گا۔ اگرچہ کان کنی

سے ماحولیاتی توازن کو نقصان پہنچتا ہے تاہم اس سے نمٹنے کے لیے مشکل سے ہی مناسب اخراجات کیے جاتے ہیں۔

زرخیز زمین، ماحولیاتی توازن، سماجی اقتصادی حالت، پانی کے ضائع ہونے، چارے وغیرہ کی ضروریات بعض ایسے عوامل ہیں جن پر کان کنی کی صورت میں بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قدرتی ماحول اور جنگل مالی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ عوام کا تعاون حاصل کیا جائے اور یہ تبھی ممکن ہے جب انھیں مفید کام دھندہ فراہم کیا جائے۔ جنگلاتی لکڑی کو بچانے کے لیے اس کا متبادل فراہم کرنا ضروری ہے جو کہ ایندھن کے طور پر استعمال ہو سکے۔

کسی بھی علاقے میں کان کنی کی وجہ سے جو علاقہ متاثر ہوتا ہے اُسے ماحولیاتی نظام کا ایک جزو تصور کیا جانا چاہیے۔ ترقیاتی منصوبہ علاقے کی ضروریات پر مبنی ہونا چاہیے اور متعلقہ قومی ترقیاتی پروگرام کے مطابق عملی منصوبہ کو بروئے کار لایا جائے۔ ابتدا میں علاقے کو جو نقصان پہنچے اس کی مرمت کا کام اُس وقت تک بالکل ختم ہو جانا چاہیے جب کان سے پیداوار ملنا بند ہو جائے۔

عملی منصوبہ مرتب کرتے وقت زمین، مٹی کی خصوصیات، آب و ہوا، بارش، آبادی، مانگ اور رسد، چارہ، لکڑی، ماحولیاتی ضروریات، مالی اور انتظامی وسائل وغیرہ عوامل کو مدنظر رکھا جانا چاہیے جو منصوبہ مرتب کیا جائے وہ کثیر المقصدی ہونا چاہیے تاکہ نہ صرف ماحول کی بلکہ مویشیوں اور انسانوں کی سوختہ اور چارے وغیرہ جیسی ضروریات بھی پوری ہو سکیں۔ مقامی لوگوں سے صلاح و مشورے سے ان کا تعاون حاصل ہو سکے گا اور صحیح فیصلہ کرنے میں مدد ملیگی۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ایسے پیڑ پودے جن میں نائٹروجن پایا جاتا ہے جلد اور تیزی سے بڑھتے ہیں اور اس طرح کے پیڑ پودے حتیٰ کہ ان کی پتیاں تک کانوں کے نواحی علاقوں کی زمین کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اگرچہ اس میں کچھ وقت لگتا ہے۔

تکنیک

مغربی ملکوں میں کان کنی کے لیے روایتی طریقوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ یہ طریقے نہ صرف کم خرچ ہیں بلکہ ماحولیاتی اعتبار سے بھی سودمند ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنے کان کنی کے طریقے میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے تاکہ ماحول کو پہنچنے والے نقصان کو کم سے کم کیا جا سکے۔ قابل قبول نعم البدل کے فروغ اور معدنیاتی کچرے کے پھر سے استعمال سے ماحول کو پہنچنے والے نقصان میں کافی حد تک کمی لائی جا سکتی ہے اور بالآخر یہ اس عمل کو جاری رکھنے میں بھی مددگار ہوگا۔

ملک کے مختلف حصوں میں جو معدنیات پائی جاتی ہیں وہ مساوی طور پر تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔ ملک کی لگ بھگ آدھے معدنیات وسطی اور مشرقی ہندوستان کے ۴ اضلاع سے حاصل ہوتی ہیں جو کہ قبائلی افراد کے خاص مراکز ہیں۔ عوام اور جنگلات کے رابطے خاص طور پر قبائلی علاقوں میں ان روابط کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ کانوں کے علاقوں سے فائدہ اٹھانے کے کام میں عوام کو بھی شامل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ابھی تک بڑے محدود پیمانے پر تحقیق کی گئی ہے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس خلاء کو پُر کرنے اور کانوں کے نواحی علاقوں کو قابل استعمال بنانے کے لیے نئے سرے سے اور عملی طریقے پر تحقیق و جستجو کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ مناسب اور سستی ٹکنالوجی کو عام کرنے کے لیے تحقیقی کام میں انڈین بیورو آف مائنز، فاریسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور یونی ورسٹیوں کو شامل کیا جائے۔ تحقیق کا کام سرکاری اور غیر سرکاری شعبے کی کان کنی سے متعلق کمپنیوں کے زیر اہتمام ہونا چاہیے تبھی ہم اندرون ملک کان کنی کی ایسی ویسی ٹکنالوجی وضع کر سکیں گے جو ہمارے ماحول کے مطابق بھی ہوگی۔ ●

بقیہ: پنچایتی راج ادارے

نفاذ عمل میں آ گیا۔

اس قانون کے تحت عام طور پر دیہی ترقیاتی پروگراموں اور بالخصوص جواہر روزگار یوجنا کو فروغ ملے گا۔ جواہر روزگار یوجنا کا بنیادی اصول یہ ہے کہ گرام پنچایت کو پروگرام کے تحت جو رقم ملے گی اس کے بارے میں پنچایت خود ہی فیصلہ کرے گی کہ اسے اپنے گاؤں میں کن اسکیموں پر کیسا پیسہ لگانا ہے۔ چوں کہ پنچایتی سطح پر منتخبہ اکائی الیکٹوریٹ کو جوابدہ ہے۔ اس لیے جواہر روزگار یوجنا پروگرام کے عمل درآمد میں عوام کی قوت ارادی کی زیادہ عکاسی ہوگی۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے میں دیہی ترقی کے لیے تیس ہزار کروڑ روپے کی جو رقم مختص کی گئی ہے۔ اس قانون کے سیاق و سباق میں اسے زبردست اہمیت حاصل ہے۔ جب کہ اب پنچایتوں کا آئین میں مذکورہ دیگر جمہوری اداروں کی طرح ایک مستقل وجود ہوگا۔ ان کے پاس عوام کے مفاد کے لیے دیہی ترقی کے پروگرام کو عمل درآمد کرنے کے لیے اسے اختیارات اور پیسہ ہوگا۔ ●

حسن ضیاء

سیکولرزم کی روایت اور ہمارا آئین

ہندوستان قدیم دور سے ہی تہذیب اور تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں سے علم اور فلسفے کا جو نور پھوٹا اس نے نئے ہی جہان روشن کئے ہیں۔ وسیع القلبی اور رواداری ہماری تہذیب کے بنیادی عناصر ہیں۔ سارے عالم کو ایک خاندان تصور کرنے کا قدیم نظریہ اس کی بین مثال ہے۔ اسی بلند خیالی کے بل پر ہماری تہذیب نے اپنی عمارت کو استوار کیا ہے۔ یونان ومصرو روما بھلے ہی مٹ گئے ہوں مگر اس کا نام ونشان ہنوز باقی ہے وقت گزرنے اور سماج کے ہمہ جہت ترقی کی منزلیں سر کرنے کے باوجود ہمارے قومی مزاج میں رواداری کا عنصر آج بھی قائم و دائم ہے۔ اس راستے سے انحراف کی جو مثالیں ملتی ہیں انھیں بآسانی مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ملک میں انگریزی سامراج کے تسلط کے خلاف ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے حصول آزادی تک کی طویل جدوجہد میں سبھی طبقات اور فرقوں کے لوگ شامل رہے ہیں۔ سب کی منزلِ مقصود ایک تھی، یعنی آزادیِ وطن۔ اسی جدوجہد کی فکری اساس پر مستقبل

حسن ضیاء سی - ۱۹۷، مدروائی نگر ایسٹ، نئی دہلی ۲۳ ۱۱-
یوجنا، نئی دہلی

کے ہندوستان کے تصور نے تشکیل پائی۔

کسی آزاد مملکت کے لیے بنیادی قانون کے طور پر جز مملکت کے مختلف ستونوں مثلاً انتظامیہ قانون سازیہ اور عدلیہ ... اور ... الٰئس، مرکزی اور ریا... وغیرہ کی تشریح کا اہم تر... ہے۔ شہریوں کے بنیادی حق... مملکت کے فرائض کے واضح... اس دستاویز کو سبھی کے لیے اہمیت کا حامل بنا دیا ہے

غیر ملکی تسلط کے نیچے دبے ملک کو ایک آزاد، خود مختار اور جدید طرز کی جمہوری اور فلاحی ریاست بنانا، تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر سب شہریوں کو برابر کا درجہ دینا اور ایک ترقی یافتہ معاشرے اور معیشت کی تشکیل ہمارے آئین سازوں کا مطمحِ نظر تھا جس کی فکری بنیاد آزادی کی تحریک استوار کر چکی تھی۔

تشکیل آئین کے ارتقائی عمل میں انگریزی دورِ حکومت کے دوران ہوئی قانون سازی کا اہم رول رہا۔ اس سلسلے میں پہلا قانون ریگولیٹنگ ایکٹ مجریہ ۱۷۷۳ء تھا۔ اس کے بعد ۱۷۸۱ء اور ۱۷۸۴ء کے قوانین نافذ ہوئے۔ ۱۸۱۳ء، ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۳ء میں چارٹر جاری کئے گئے۔

گو ان قوانین کا تعلق جنھیں برطانوی پارلیمان نے بنایا تھا۔ بنیادی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت سے تھا مگر تجارت کے ساتھ ساتھ ...

... تمام جنگ آزادی کے بعد ہندوستان پر مکمل طور پر قبضہ کر کے برطانوی پارلیمان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء بنایا۔ ۱۸۶۱ء کا انڈین کونسلز ایکٹ بھی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے نمائندہ اداروں کی داغ بیل پڑی۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی قانونی اصلاحات سے ملک کے انتظام و انصرام میں ہندوستانیوں کی شرکت بتدریج بڑھی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے آزادی کے راستے کو مزید ہموار کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مختلف صوبوں میں انتخابات ہوئے اور وزارتوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ انگریزی عہد میں بنے قوانین کی رو سے وجود میں آئے انتظامی اور قانون ساز ادارے نہ صرف موجودہ جمہوری اداروں کے پیش رو تھے بلکہ ان میں سے بعض نے موجودہ قوانین کی رہنمائی

بھی کی۔

ہماری آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کابینہ مشن منصوبے کے سبب نومبر ۱۹۴۶ء میں عمل میں آئی۔ اس کے اراکین کا انتخاب بالواسطہ طریقے سے، ریاستی اسمبلی کے اراکین کے ذریعہ عمل میں آیا۔ ۲۹۶ اراکین پر مشتمل اس آئین ساز اسمبلی میں کانگریس کے ۲۱۱ اور مسلم لیگ کے ۷۳ اراکین تھے۔ بعد میں لیگ کے اراکین نے اسمبلی کی کارروائی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، راجیندر پرساد، سردار پٹیل، گوپالا سوامی اینگر، گوبند بلبھ پنت، خان عبدالغفار خان، ٹی ٹی کرشنا ماچاری، ایچ این کنزرو، اچاریہ کرپلانی، ڈاکٹر امبیڈکر اور ڈاکٹر رادھا کرشنن اس اسمبلی کے ممتاز اراکین تھے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو آئین کو اسمبلی کی منظوری ملی۔ صدر راجیندر پرساد نے اس پر دستخط کیے اور اس کے پندرہ آرٹیکل اسی دن سے نافذ ہو گئے۔ بقیہ حصہ کا اطلاق ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہوا جسے ہم یوم جمہوریت کے طور پر مناتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ دستاویز ہندوستانی قوم کے آزادی، مساوات اور سیکولرزم کے نصب العین کا منشور ہے۔ آئین کے ابتدائیہ سے لے کر شہریت، بنیادی حقوق، رہنما ہدایات، انتظامیہ، عدلیہ، قانون سازیہ، ریاستی انتظامیہ، مرکز ریاست روابط تک سبھی موضوعات سے متعلق اندراجات میں نہ صرف سیکولرزم کے عنصر کی کارفرمائی ہے بلکہ اس سے ہمارے سیکولرزم کی باقاعدہ اور باضابطہ تشریح بھی ہوتی ہے۔ مغرب میں سیکولر لفظ کا استعمال مذہب کی ضد کے طور پر شروع ہوا بعد میں اس کے مفہوم میں قدرے تبدیلی آئی۔ ہمارے آئین نے سیکولرزم کو ایک مثبت نظریے کی شکل دی جو رواداری، وسیع القلبی، آپسی میل جول اور ایک دوسرے کے جذبات کے احترام پر مبنی ہے جہاں مملکت کا کوئی مذہب نہیں ہے، وہ لامذہب تو نہیں البتہ غیر مذہبی (NON RELIGIOUS) ضرور ہے۔ اس کی نظر میں سبھی مذہبوں کے لیے برابر احترام ہے۔

آئین کی مختلف دفعات مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی کی غمازی کرتی ہیں گو رسمی طور پر لفظ سیکولر ۱۹۷۶ء کی ۴۲ ویں آئینی ترمیم کی رو سے ابتدائیہ کا حصہ بنا ہے جس کے موجب ہمارا ایک سیکولر سوشلسٹ جمہوریہ ہے۔ اس ضمن میں آرٹیکل ۱۲ تا ۳۵ میں درج شدہ بنیادی حقوق میں خاص طور پر آرٹیکل ۲۵ تا ۲۷ و ۲۹، اور ۳۰ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ آرٹیکل ۲۵ سبھی شہریوں کو ضمیر کی آزادی اور کسی مذہب کو ماننے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ آرٹیکل ۲۶ مذہبی اور خیراتی اداروں کے قیام، ان کے انتظام و انصرام اور ان کے لیے جائداد حاصل کرنے کا حق عطا کرتا ہے۔ آرٹیکل ۲۷ کسی مذہب کے فروغ پر خرچ ہونے والی رقم کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ آرٹیکل ۲۸ حکومت کے خرچے سے چلنے والے تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم کی ممانعت کرتا ہے۔ آرٹیکل ۲۹ اقلیتوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کا حق دیتا ہے۔ آرٹیکل ۳۰ اقلیتوں کو اپنی مرضی سے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام چلانے کا حق دیتا ہے۔ آرٹیکل ۳۵۰۔اے ریاستوں کو اس بات کی کوشش کرنے کے لیے کہتا ہے کہ پرائمری سطح تک لسانی اقلیت کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کے انتظامات کیے جائیں۔ آرٹیکل ۳۵۰۔بی کے تحت صدر جمہوریہ لسانی اقلیتوں کے لیے خصوصی افسر مقرر کرتے ہیں۔ اس خصوصی افسر کی یہ ذمہ داری ہے کہ آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو دیے گئے تحفظات سے متعلقہ امور کی تفتیش کرکے اپنی رپورٹ صدر جمہوریہ کو پیش کریں۔

آئین میں ہوئی ۴۲ ویں ترمیم کے ذریعہ شہریوں کے جن ۱۰ بنیادی فرائض کو شامل کیا گیا ہے ان سے بھی ہمارے قومی مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔ آرٹیکل ۵۱۔اے میں درج شدہ ان فرائض میں تحریک آزادی کے اعلیٰ و ارفع آدرشوں پر عمل، آپسی بھائی چارے کا فروغ، سائنسی مزاج اور انسان دوستی کا جذبہ پیدا کرنا شامل ہیں۔

مذکورہ بالا مخصوص قوانین سے قطع نظر دیگر دفعات بھی جن کا تعلق مملکت کے مختلف امور سے ہے آئین کے سیکولر نظریے کی آئینہ دار ہیں۔ اس طرح یہ دستاویز ہندوستانی قوم کے سیکولر مزاج اور روادارانہ طرز فکر کو باقاعدہ اور منضبط قانونی شکل دیکر قومی یک جہتی کی راہ کو ہموار کرتی ہے۔ ●

پنچایتی راج ادارے

جمہوریت تمام سطحوں پر عوام کی سرگرم شمولیت اور شرکت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ حصولِ آزادی کے بعد ہی سے قومی اور ریاستی دونوں سطح پر جمہوری ادارے کافی مستحکم ہوئے ہیں۔ جمہوری لامرکزیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے آئین (ریاستی پالیسی کے ہدایتی اصول) کے چوتھے حصے کی دفعہ ۴۰ میں کہا گیا ہے۔

ریاست گاؤں پنچایت منظم کرنے کے لیے اقدامات کرے گی اور انھیں ایسے اختیارات دے گی جو کہ انھیں سیلف گورنمنٹ کی اکائیوں کے طور پر کام کرنے کا اہل بنانے کے لیے ضروری ہوں۔"

لیکن ضلع، بلاک اور گاؤں کی سطحوں کے ادارے پائیدار اور جوابدہ عوامی اداروں کا درجہ اور وقار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

ملک میں پنچایتی راج نظام کی شکل یکساں نہیں ہے اور مختلف ریاستوں میں مختلف نظام ہیں۔ کئی ریاستوں میں گرام سبھا جو کہ عوام کا ایک مجموعی ادارہ ہے۔ اس نظام کی بنیاد ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر سہ سطحی نظام ہے، بعض ریاستوں میں دو سطحی نظام ہے اور بعض ریاستوں میں گاؤں کی سطح پر ایک سطحی پنچایت ہی ہے۔

تاہم ان نچلی سطح کے اداروں میں متعدد خامیاں پیدا ہو گئی ہیں جس سے یہ ادارے مضحکہ خیز بن گئے ہیں۔ جہاں کہیں یہ ادارے کام کر رہے ہیں وہ دیہی سماج کے
اعتبار سے خوشحال طبقے کے زیر
اداروں کا استعمال اس طبقے کے
ہو رہا ہے۔

حکومت پنچایتی راج اداروں کی
شدہ اسکیم کے بارے میں صلاح مشورہ دینے کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف کمیٹیاں قائم کر چکی ہے۔

۱۹۸۹ء میں آئین میں ۶۴ ویں ترمیم سے متعلق بل پیش کیا گیا تھا۔ جس میں ہر ریاست میں گاؤں، بلاک اور ضلعی سطح پر پنچایت قائم کرنے کا اہتمام تھا۔ تاہم ان ریاستوں کو جن کی آبادی ۲۰ لاکھ سے کم ہو، بلاک کی سطح پر پنچایت قائم کرنے سے مبرا رکھا گیا تھا۔ لوک سبھا نے اس بل کو منظوری دے دی تھی۔

۱۹۹۰ء آئین میں ۷۴ ویں ترمیم سے متعلق بل پیش کیا گیا۔ جس میں یہ اہتمام تھا کہ ہر گاؤں میں ایک گرام سبھا قائم کی جائے۔ بل میں یہ اہتمام بھی تھا کہ گاؤں اور دیگر سطحوں پر پنچایتیں قائم کی جائیں۔ اور گاؤں کی سطح پر پنچایتوں کی نما نشستوں کے لیے براہ راست انتخابات منعقد کیے جائیں نیز دیگر سطحوں پر بھی پنچایتوں

[illegible]
میں موجودہ حکومت کے عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد پنچایتی راج اداروں سے متعلق نیا بل وضع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بل ستمبر ۱۹۹۱ء میں لوک سبھا میں پیش کیا گیا۔ اس بل پر غور کرنے کے دوران مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بعض نکات اٹھائے جس کی وجہ سے حکومت نے اس میں ضروری ترمیم کیں اور آئین میں ۷۳ ویں ترمیم سے متعلق بل لوک سبھا میں پیش کیا جسے کم و بیش اتفاق رائے سے منظوری دے دی گئی۔ راجیہ سبھا نے بھی اس بل کو منظوری دے دی۔ اور ۱۷ ریاستوں کے اس بل کی توثیق کرنے کے بعد اسے آئین (۷۳ ویں ترمیم) قانون، ۱۹۹۳ء کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ۲۴ اپریل ۱۹۹۲ء سے اس کا

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

عظیم اقبال

ہندوستان کی پہلی خاتون ریل ڈرائیور

اول اب خواہ کسی بھی میدان میں ہو، باعث افتخار و احترام ہے۔ اوّل مقام پانے والا امام یا قائد ہوتا ہے جب کہ بعد میں آنے والے اس کے جانشیں یا مقلد کہلاتے ہیں۔ امام کی حیثیت بے حد قابل قدر ہوتی ہے، لہٰذا اس کا درجہ بھی ناقابل فراموش ہوتا ہے کیوں کہ اسے تاریخی مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کے ہونے کے بعد ہی تاریخ کی تحریر بھی مکمل اور تب کہلاتی ہے۔

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دہلی پر حکومت کرنے والی خاتونِ اوّل کا نام بتائیں تو آپ فوراً جواب دیں گے — رضیہ سلطانہ۔ اسی طرح یہ دریافت کیا جائے کہ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے والی پہلی خاتون کا نام بتائیں تو آپ بلا جھجک کہہ اٹھیں گے — 'بچھندری پال'، بھارت رتن کے خطاب سے نوازی جانے والی پہلی ہندوستانی خاتون کا نام بتانے میں بھی آپ کو کوئی دشواری نہ ہوگی اور آپ بنا کسی تمہید کے محترمہ اندرا گاندھی کا ذکر کر دیں گے۔

مزید، کسی ہندوستانی ریاست کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ کی نشاندہی بھی آپ کسی دشواری کے بغیر کر دیں گے اور آپ کے ہونٹوں پر محترمہ سروجنی نائیڈو کا نام آ جائے گا۔ ممکن ہے آپ اس سے بھی باخبر ہوں کہ "انگلش چینل کو تیر کر پار کرنے والی پہلی ہندوستانی خاتون کا نام آرتی ساہا تھا اور فلم کے شعبے میں اعلیٰ ترین اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ پانے والی پہلی ہندوستانی خاتون دیویکا رانی تھیں۔

اس پس منظر میں آپ سے اب اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کی پہلی خاتون ریل ڈرائیور کا نام بتائیں تو سوال کی سنجیدگی پر ہی آپ شک کر بیٹھیں گے۔ آپ کا شک بے بنیاد بھی نہیں ہے، کیوں کہ اپنے تمام اسفار کے دوران آپ کی نظر شاید ہی کسی خاتون ریل ڈرائیور پر پڑی ہو۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ آج گھر کی چہار دیواری سے نکل کر ہندوستانی خاتون زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے اب ریل ڈرائیور کا میدان بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔

لیجئے، اپنی معلومات میں اضافہ کیجئے اور جان لیجئے کہ پہلی ہندوستانی خاتون ریل ڈرائیور کا نام سُریکھا بھونسلے ہے جیسا کہ سُریکھا کے لقب سے ظاہر ہے، وہ ایک مراٹھی خاتون ہیں اور ان کا تعلق صوبۂ مہاراشٹر سے ہے۔

۱۹۸۶ء میں، جب وہ محض اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھیں، انھوں نے گورنمنٹ پالیٹکنک سے الیکٹرک ٹریڈ میں ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد درونِ خانہ رہ کر خالی اوقات میں ملازمت کے لیے درخواستیں ارسال کرنے لگیں۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ مستقبل میں ایک روز یہی دوشیزہ ہندوستان کی اوّل خاتون ریل ڈرائیور بنے گی۔

خود سُریکھا بھونسلے کے الفاظ میں —

" مجھے کوئی فخر نہیں ہے کہ میں نے ریل ڈرائیور میں مردوں کی اجارہ داری ختم کی ہے۔ بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ جو میں نے سوچا بھی نہ تھا، وہ اچانک ہو گیا اور میں ہندوستان کی پہلی خاتون ریل ڈرائیور بن گئی۔"

ریل ڈرائیور بن کر ۲۳ سالہ سُریکھا کافی مسرور ہیں اور اپنے کام کو پوری تندہی کے ساتھ وہ بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

یوں تو سُریکھا کے پاس کئی ملازمتوں کے لیے بلاوا آیا تھا، لیکن جب ریلوے میں معاون ڈرائیور کے عہدے کے لیے بلایا گیا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ایک پل کے لیے انھیں محسوس ہوا کہ جیسے یہ ملازمت انھیں مل ہی جائے گی، اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

۱۹۸۷ء میں سُریکھا نے تحریری امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہونے کے بعد انھوں نے زبانی امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ کچھ

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

یوجنا، نئی دہلی گنج نمبر ۱، بتیا، بہار ۸۴۵۴۳۸۔

بقیہ: آپ سب کے لیے

ہے کہ وہ ان افراد کے لیے اُترنے چڑھنے کی خصوصی جگہیں، بیت الخلاء، خصوصی علامات و نشانات، وہیل چیئر رکھے جانے والی کرسیاں، خصوصی لفٹ اور کچھ تربیت یافتہ افراد فراہم کرائیں۔ انھوں نے توقع ظاہر کی ہے کہ ریاستی حکومتیں اور ان کے زیر نگرانی کام کرنے والے دیگر بڑے ادارے جیسے ہوائی اڈوں، بڑے ریل اسٹیشنوں اور بس اڈوں پر سہولیات فراہم کرانے کے تئیں توجہ دیں گے۔ ●

بچیوں کی حیثیت

جنوب ایشیائی ایسوسی ایشن برائے علاقائی تعاون (سارک) کے بچیوں کے دہے (۱۹۹۱ء-۲۰۰۰ء) کے لیے ایک قومی منصوبہ عمل تیار کیا گیا ہے جس کے تحت بھارت میں بچیوں کی بقا، تحفظ اور ترقی پر زور دیا جائے گا۔ اس کے تحت جوانی کی عمر کو پہنچنے والی بچیوں، زچہ و بچہ کی صحت، شیر خوار بچوں اور زچہ کی شرح اموات جیسے موضوعات کو نمایاں کرنا، بچوں میں دست، تنفس کی بیماریوں اور دیگر بیماریوں کی روک تھام اور ان کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس امر کا اعلان خواتین اور بچوں کی ترقی کی وزیر مملکت شریمتی باسوا راجیشوری نے بچوں اور خواتین کی ترقی کے ریاستی سکریٹریوں کی میٹنگ میں کیا ہے۔

اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ قومی منصوبہ عمل پر کامیابی سے عمل درآمد بنیادی طور پر تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کی کامیابی پر ہی منحصر ہوگا، انھوں نے ریاستی حکام سے کہا کہ وہ مقامی حالات و ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے ہی مماثل منصوبۂ عمل وضع کریں۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

غیر ملکی سرمایہ کاری میں اضافہ

پالیسی اصلاحات کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کی جانب سے مثبت ردِ عمل میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اگست ۱۹۹۱ء کی پوسٹ پالیسی مدت کے دوران غیر ملکی سرمایہ کاری کی منظوریاں ۶۸۶۰ کروڑ روپے کی ہیں جو اگست ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء کی مدت میں دی جانے والی منظوریوں کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہیں۔

غیر ملکی سرمایہ کاری منظوریوں کے خودکار طریقے کے تحت ریزرو بینک آف انڈیا نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۱ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء کے دوران ۱ کروڑ روپے کی غیر ملکی سرمایہ کاری کو منظوری دی ہے۔ یہ پالیسی کے دور میں کی جانے والی سرمایہ کاری کا خاصہ حصہ ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کاری کی زائد منظوریوں کا تعلق رجحان

۱۹۹۲ء میں ۱۵۲۰ غیر ملکی اشتراک کی تجاویز کو منظوری دی گئی۔ ان میں ۶۹۲ تجاویز ایسی بھی شامل ہیں جن کا تعلق ۳۸۹۰ کروڑ روپے کی غیر ملکی ایکوئٹی سے ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ۱۲۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کو منظوری دی گئی تھی اور ۱۹۹۱ء میں ۵۳ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کو منظوری دی گئی تھی۔ اس طرح ۱۹۹۲ء کی سرمایہ کاری مذکورہ دونوں برسوں کے مقابلے میں ۳۰ گنا اور سات گنا زیادہ ہے۔ ●

ماحولیات کی حفاظت

وزارت ماحولیات و جنگلات نے حیاتیاتی انجینئرنگ منظوری کمیٹی (جی ای اے سی) کمیٹی تشکیل دی ہے۔ کمیٹی کی تشکیل ماحولیات (تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء کے تحت ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عمل میں آئی ہے تاکہ مختلف شعبوں میں ماحولیاتی لحاظ سے محفوظ اور ہم آہنگ ٹکنالوجی کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ مذکورہ کمیٹی تحقیق و صنعتی پیداوار میں بڑے پیمانے پر استعمال کیے جانے والے مہلک مائکرو آرگنزم اور انجینئرڈ لائق استعمال اور سودھے سے متعلق سرگرمیوں کا تجزیہ کرتی ہے۔ یہ کمیٹی ان تجاویز پر بھی غور کرتی ہے جو مذکورہ مضر اشیاء کو ماحولیات میں خارج کرنے کے ضمن میں پیش کی جاتی ہیں۔ ●

[illegible]

کی جانے والی مصنوعات کی مادی برآمدات کو دوہری اہمیت دی جاتی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی مصنوعات میں ہتھ کرگھا اور گھریلو پیمانے پر تیار ہونے والی مصنوعات بشمول کھیل کود کے سامان ہاتھ سے بنی جانے والی مالس اور ریشم کی مصنوعات بھی شامل ہیں۔ ●

توحید خان

کیا آپ جانتے ہیں؟

١. کیا سندھو گھاٹی تہذیب کے لوگ لکھنے کا فن جانتے تھے؟

٢. گرو نانک کہاں پیدا ہوئے تھے؟

٣. مراٹھوں کے دورِ حکمرانی میں "چوتھ" (CHOUTH) کسے کہا جاتا تھا؟

٤ اکبر کی پہلی ہندو بیوی کہاں کی شہزادی تھی؟

٥. کیا آریاؤں (Aryans) کے یہاں بیوہ کی شادی کی اجازت تھی؟

٦. مہاتما بدھ کے والد کا نام کیا تھا؟

٧ کلنگا (Kalinga) کی لڑائی کب ہوئی تھی؟

٨. ہندوستان میں سب سے کم بارش کہاں ہوتی ہے؟

٩ ہندوستان میں پہلا کیمیائی کھاد کا کارخانہ (Fertilizer Plant) کہاں قائم ہوا تھا؟

١٠. جپسم (Gypsum) ہندوستان کی کس ریاست میں پایا جاتا ہے؟

١١. درگاپور اسٹیل پلانٹ کس ملک کے اشتراک (Collaboration) سے بنا ہے؟

١٢. "الہلال" اخبار کس نے جاری ؟

١٣. "فتنہ" "خانقاہ" اور "مناظر سحر" کس کی تصنیفات ہیں؟

١٤ "ناگر جونا ساگر ڈیم" (Nagarjuna sagar Dam) کا تعلق کس ندی سے ہے؟

١٥. "شائیلاک" (Shylock) کس کتاب کا کردار ہے اور اس کا خالق کون ہے؟

١٦ مچھلیاں کس کے ذریعہ سانس لیتی ہیں؟

١٧. کس بادشاہ نے ہندوستان میں خالص عربی سکہ جاری کیا تھا؟

١٨. مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ (Aryabhata) کب چھوڑا گیا تھا؟

کس چیز کی کمی کے سبب چینی کا مرض (Diabete) ہوتا ہے؟

٢٠. سپریم کورٹ کا آئینی بینچ کتنے ججوں پر مشتمل ہوتا ہے؟

٢١. لوک سبھا کی (Estimates Committee) کی مدت کتنی ہوتی ہے؟

٢٢ [illegible] کے پیدا ہو جانے پر اسے کس کے حوالے کیا جاتا ہے؟

٢٣. مالیاتی بل لوک سبھا میں پاس ہونے کے بعد راجیہ سبھا میں کتنے دنوں کے اندر پاس ہوتا ہے؟

٢٤. "Absolute Majority" کسے کہتے ہیں؟

٢٥. صدر راجیہ سبھا میں کتنے ممبروں کو نامزد کرتا ہے؟

٢٦. ہندوستان میں "شاہی چشمہ" کہاں ہے؟

٢٧. سندیپ پاٹل کس کھیل سے تعلق رکھتا ہے؟

٢٨. ١٩٩٣ء کے کرۂ ارض کانفرنس کی میزبانی کون سا دیش کرے گا؟

٢٩. آگرہ شہر کا بانی کون تھا؟

٣٠. کارل مارکس کس ملک کے رہنے والے تھے؟

٣١. "سراج الاخبار" کے بانی کا نام بتائیے؟

٣٢. ٨٩ ویں انٹر پارلیامنٹری یونین کانفرنس (89th Inter Parliamentary Union Conference) کہاں منعقد ہوئی تھی؟

٣٣ ساحر لدھیانوی کا اصل نام کیا ہے؟

٣٤ "Abhinava Bharat" نام کی

(باقی صفحہ ١٤٣ پر)

خصوصی شمارہ اگست ۱۹۹۳ء

یوجنا

جلد: ۱۳ — شمارہ: ۹ - ۱۰

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۹۳ء — ۱۰ شراون تا ۹ بھادر تک ۱۹۱۵

قیمت: ۶ روپے — ٹیلی فون ۶۰۱۸۱۸

چیف ایڈیٹر	ڈی۔ کے۔ بھاردواج
اسسٹنٹ ایڈیٹر	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر
سب ایڈیٹر	توحید خان
معاون	وسیم حیدر
کتابت	سجاد علی خاں

شرح چندہ: سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی ۳ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۶۶ ۱۱

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن: سدرشن موہن چہل

آرٹسٹ: ایم۔ اے۔ ملک

ترسیل زر کا پتہ۔ بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس شمارے میں

اس شمارے کے مختلف مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنفین کے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ خیالات ان اداروں، وزارتوں اور حکومت کے بھی ہوں جن سے وہ وابستہ ہیں۔

ہمارا نصب العین

[illegible]

کچھ وقت کے ساتھ کاشتکار کی حالت بگڑتی گئی۔ ان دنوں زراعت جو ملک کی معیشت کا مرکز ہوتی تھی، اصل میں محنت والا کسان نہایت حقیر زندگی گزار رہا تھا۔ اور ملک کی دولت جبر سے حکومت کرنے والے تھوڑے سے لوگوں کے ہاتھوں میں اکٹھی ہو رہی تھی۔ چھوٹے کھیتوں کے مالکوں، بٹائی پر کام کرنے والوں اور فارم کے مزدوروں کی حالت عام طور سے قابلِ رحم تھی۔ یہ خوار و خستہ حالت تھی جب ہماری قومی سرکار نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں سنبھالی۔ یقیناً اس کا سہرا ہماری سرکار کے سر ہے کہ اس نے بروقت بڑی سرگرمی کے ساتھ اقدامات کئے۔ اور بہت سی ان غلطیوں کا ازالہ کیا جن کی وجہ سے جفاکش کاشتکار طبقہ صدیوں سے پِس رہا تھا۔ خاتمۂ زمینداری، اصلاحاتِ اراضی کا نفاذ (اراضی کی سیلنگ اور انضمامِ اراضی کی شکل میں)، آب پاشی کی سہولیات میں بے تحاشہ اضافہ، فصلوں کی قسموں میں تنوع، زرعی مزدوم شماری کا تعارف، زرعی تحقیق کی رفتار ترقی، ترقی یافتہ زرعی ٹکنیک کا ارتقا، اور زیادہ پیداوار دینے والی قسموں کی فراہمی وغیرہ بعض ایسے اقدامات تھے جن کی وجہ سے ہماری جملہ زرعی ترقی میں وقیع تر اضافہ ہوا۔ قطع نظر اس کے کہ ہندوستانی دیہاتی کسان کا نصیب اس سے نہ سدھر سکا۔ سبز انقلاب نے ہندوستان کی زراعت میں کچھ اور سنگِ میل قائم کئے۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اگر ہندوستان کے کاشتکاروں کو مناسب مواقع اور سہولتیں بہم ہو جائیں تو وہ بھی دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے کسانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

مگر اصل مسئلہ جوں کا توں قائم ہے۔ پوری توجہ ہمیں اس بات پر صرف کرنی ہے کہ خوراک کی بڑھتی ہوئی گھریلو ضرورت کو کس طرح پورا کیا جائے۔ کیوں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب غذائی صورتِ حال کافی نازک شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے ہمیں کئی محاذوں پر کافی سوچ بچار اور باہم رابطہ پیدا کر کے مربوط تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ ان تدابیر میں ــــــ کم ترقی یافتہ اور کم مراعات یافتہ

ڈاکٹر بلرام جاکھڑ

نئی زرعی پالیسی

[illegible]

گزشتہ چالیس برسوں میں اناج کی پیداوار میں اگرچہ نمایاں اضافہ ہوا ہے لیکن اس میں مختلف خطوں اور فصلوں کی ترقی نابرابر رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں زراعت میں سرمائے کی پیداوار کا رجحان زوال پذیر رہا ہے جس سے زرعی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنے کے بارے میں ہماری اہلیت کے بارے میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ ملک کو نہ صرف زراعت میں متواتر اور ترقی پذیر اضافے کی ضرورت ہے بلکہ اس کی بنیاد کو کشادہ کرنے کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا براہ راست تعلق ملکی معیشت کو بہتر بنانے سے ہے۔ زرعی پیداوار کی برآمد، دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور کسانوں کے مرتبے و اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے مسائل بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔

زور

آٹھواں پانچ سالہ منصوبہ ان مسائل کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ زراعت چوں کہ معیشت کا سب سے اہم شعبہ ہے اس لیے آٹھویں پانچ سالہ منصوبے میں زرعی ترقی کی حکمت عملی کا مقصد نہ صرف خوراک کے لحاظ سے خودکفالت حاصل کرنا بلکہ خاص خاص زرعی اجناس کی ضرورت سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا تاکہ برآمد کر کے کسانوں کی آمدنی کی سطح میں اضافہ کیا جا سکے۔ لہٰذا آٹھویں منصوبے میں زرعی پروگراموں میں زیادہ زور

(۱) زراعت میں تنوع لانے اور باغبانی، مویشی پالن، ماہی گیری وغیرہ پر۔

(۲) تمام علاقوں میں پیداوار کی

(۳) بارانی علاقوں کی ترقی۔

(۴) تلہن اور دالوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے۔

(۵) امداد باہمی انجمنوں و زرعی قرضوں کے نظام میں نئی قوت پیدا کرنے، زرعی پیداوار کی فروخت کے انتظام کو بہتر بنانے اور

(۶) فصل کی کٹائی کے بعد کی تکنیک کو بہتر بنانے پر دیا گیا ہے۔

نشانے

بھارت کی آبادی ۲۰۰۰ء تک ۹۴ کروڑ ۱۰ لاکھ ہو جائے گی۔ اتنی آبادی اور آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ کھپت کی سطح میں اضافہ سے اندازہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں اناج کی ضرورت

۲۰۸ ملین ٹن ہو جائے گی۔ ہم آٹھویں منصوبے کے آخری برس تک اناج کی پیداوار ۲۱۰ ملین ٹن تک پہنچا دینے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ دوسری فصلوں جیسے کہ کپاس، گنے، تلہن وغیرہ کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ کیا جائے گا۔ آٹھویں منصوبے کے آخر تک دودھ اور دودھ کی مصنوعات کی پیداوار کا نشانہ ملین ٹن مقرر کیا گیا ہے جو ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۵۳٫۰ ملین ٹن تھی۔ انڈوں کی بہم رسانی میں ہر سال چھ فی صد اضافے کی توقع ہے۔ مچھلی کی پیداوار میں بھی مناسب سہولیات پیدا کر کے مقدار کے لحاظ سے نمایاں اضافہ کیا جائے گا۔ اُمید ہے کہ مچھلی کی پیداوار ۱۹۹۰ء میں ۵٫۵ ملین ٹن ہو جائے گی۔ جو ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۳٫۸ ملین ٹن تھی۔

آٹھویں منصوبے کا آغاز اچھا ہوا ہے۔ منصوبے کے پہلے برس میں اناج کی پیداوار ۱۸۰ ملین ٹن ہو جانے کا تخمینہ ہے جو گذشتہ بہترین برس ۹۱-۱۹۹۰ء کی ۱۷۶٫۴ ملین ٹن کی پیداوار سے ۳٫۶ ملین ٹن زیادہ ہے۔ اسی برس میں تلہن کی پیداوار ۲۱٫۲ ملین ٹن ہو جانے کی توقع ہے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ کپاس کی پیداوار بھی ایک کروڑ ۱۲ ملین گانٹھ کے ریکارڈ نشانے تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ باغبانی اور خاص طور پر ملک کے شمال مغربی حصے میں باغیچوں کی ترقی کی جانب خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ان اقدامات کا آٹھویں منصوبے کی مدت میں زراعت کی ترقی پر موافق اثر پڑے گا۔

تاہم زرعی شعبے میں دو بڑے مسائل کسانوں کے موافق اقتصادی ماحول اور زرعی ترقی کو تیز کرنے کے لیے سرمایہ کاری کے ہیں۔ اس کے لیے طریقہ کار زرعی پالیسی کی قرارداد میں بیان کیا گیا ہے، جس پر ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ء کو تبادلۂ خیال کیا گیا تھا۔ انھوں نے قرارداد کے مسودے میں توجہ اور پیش رفت کے لیے اقدامات کی کم و بیش تصدیق کر دی ہے۔

> زراعت ہی ایسی ہے کہ حیثیت کا سب سے اہم شعبہ ہے اس لیے آٹھویں پانچ سالہ منصوبے میں زرعی ترقی کی حکمت عملی کا نصب العین نہ صرف خوراک کے لحاظ سے خود کفالت حاصل کرنا بلکہ خاص خاص زرعی اجناس کی ضرورت سے زیادہ پیداوار حاصل کر کے برآمد کر کے کسانوں کی آمدنی کی سطح میں اضافہ کیا جا سکے۔

سرمائے کی پیداوار: زراعت اس ملک کے عوام کا قدرتی پیشہ ہے۔ اس لیے یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ گذشتہ برسوں میں زراعت میں سرمایہ کاری کا رجحان زوال پذیر رہا ہے۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں کل سرمائے میں زراعت میں سرمائے کی پیداوار کا تناسب ۶٫۱۸ فی صد تھا جو ۹۱-۱۹۹۰ء میں کم ہو کر ۵٫۹ فی صد رہ گیا۔ سرکاری دائرہ کار میں تو یہ زوال اور بھی تیز تھا۔ جو ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۲٫۵ فی صد سے گر کر صرف ۶٫۵ فی صد رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ کاری کے قابل وسیلے زراعت کے دوسری جانب منتقل کر دیے گئے ہیں۔ اسے لازماً روکا جانا چاہیے نئی زرعی پالیسی کا یہی مرکزی خیال ہے۔ مسودے میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ زراعت کے لیے وسیلوں کے نظام پر نظر ثانی کی جائے گی تاکہ دستیاب وسیلوں کو موجودہ امدادی اقدامات سے سرمائے کی تشکیل اور بنیادی سہولیات کی تعمیر میں لگایا جا سکے۔

زرعی پالیسی کا مسودہ

نئی زرعی پالیسی میں زراعت کی ترقی کے لیے ایک موافق اقتصادی ماحول پیدا کرنے اور مناسب قیمتوں و تجارتی ماحول کے ذرائع کسانوں کو زراعت میں اور زیادہ سرمایہ و کوششیں صرف کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ زراعت کو محض گذر بسر کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک بامعنیٰ اور منافع بخش پیشہ ہونا چاہیے۔ زرعی شعبے کو کاروباری اور اقتصادی لحاظ سے قابل عمل پیشہ ہونا چاہیے۔ آج ہمیں زراعت کے نئے اغراض و مقاصد کے بارے میں سوچنا ہے اور حکومت نے قرارداد کا جو نیا مسودہ تیار کیا ہے وہ اس سلسلے میں ایک دلیرانہ قدم ہے۔ زیادہ زور زراعت کو امدادی نظاموں

> زرعی شعبے میں دو بڑے مسائل کسانوں کے موافق اقتصادی ماحول اور زرعی ترقی کو تیز کرنے کے لیے سرمایہ کاری کے ہیں۔ اس کے لیے طریقہ کار زرعی پالیسی کی قرارداد میں بیان کیا گیا ہے۔

سے آزاد کرنے پر دیا گیا ہے جس
سے زراعت کو منافع بخش بنایا جاسکے
تاکہ زراعت کو معاشی زندگی کے طور پر
اپنا کر کسانوں اور قوم دونوں کو فائدہ ہو۔

قرارداد کے مسودے میں زراعت
کے اقتصادی طور پر قابلِ عمل پر توجہ دی
گئی ہے۔ صنعتی شعبے کی مانند اس میں بھی
ضروری لچک ہونی چاہیئے تاکہ کسان دیگر متعلقہ
کام شروع کرسکیں جس سے زیادہ آمدنی ہو

صنعتی پیداوار ملک میں کہیں بھی لائی لے جائی
جاسکتی ہے اور صنعت کار بازار کی حالت کے
مطابق اشیاء کے دام مقرر کرسکتے ہیں بلاشبہ
کسانوں کے تئیں یہ ایک امتیازی اور نامناسب
سلوک ہے۔ جسے ٹھیک کیا جانا چاہیئے۔
چنانچہ میں ریاستی پابندیوں کو ختم کرنے کا
فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ کسان اپنا مال آزادی سے
ملک کی کسی بھی منڈی میں لے جاسکیں۔ اس
سے کسانوں اور کھیت کار دونوں کو فائدہ

سورج مکھی کے بیجوں کے لیے ۱۳۰ روپے
اور کپاس کے لیے ۱۱۰ روپے کیا گیا ہے اسی
طرح ربیع کی فصلوں کے لئے کم از کم قیمت میں
فی کوئنٹل اضافہ گندم کے لیے ۵۵ روپے،
چنے کے لیے ۱۰۰ روپے، توریے اور سرسوں
کے لیے ۹ روپے اور سورج مکھی کے لیے
۸۰ روپے کیا گیا ہے امدادی قیمت میں یہ
بے مثال اضافہ اگرچہ اقتصادی مصلحتوں پر
مبنی ہے لیکن اس کا مقصد زراعتی شعبے
کی اقتصادی طور پر منافع بخش ہونے کی
اہلیت کو بہتر بنانا ہے۔

زرعی برآمدات

زیادہ زور زراعت کو امدادی نظاموں سے آزاد کرنے پر دیا گیا ہے جس
سے زراعت کو منافع بخش بنایا جاسکے تاکہ زراعت کو معاشی زندگی کے
طور پر اپنا کر کسانوں اور قوم دونوں کو فائدہ ہو۔

سکتی ہے۔ طویل المدت تناظر میں زرعی ترقی
کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس شعبے میں بھی
دوسرے شعبوں جیسی ہی آمدنی ہو تاکہ کسانوں
کی زراعت میں دلچسپی بنی رہے۔ چنانچہ حکومت
کی پالیسی کا مقصد یہ ہوگا کہ موثر نظام تیار
کیے جائیں جن سے کسانوں کو بھی وہی فوائد حاصل
ہوسکیں جو معیشت کے دوسرے شعبوں میں
مہیا کیے جارہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی
کسانوں کو قواعد و ضوابط اور حکومت کی ٹیکس
وصول کرنے والی مشینری کا زیر بار نہ ہونا
پڑے۔ اس سے کسانوں کو ترغیب ملے گی کہ
وہ اور زیادہ کوشش کریں اور اپنی آمدنی کی
سطح میں اضافہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ دوسرے
شعبوں کے مقابلے میں زراعت میں آمدنی
میں اضافے کی شرح سب سے زیادہ ہو۔

اناج کی آزادانہ آمدورفت

تاحال اناج کی نقل و حمل پر پابندی
لگی رہی ہے تاکہ مختلف زرعی اجناس کی قیمتوں
کی قاعدہ بندی کی جاسکے۔ اس کے مقابلے میں

پہنچے گا۔

منافع بخش قیمتیں

بہ حال حک۔
قیمتیں دلانے میں اہی د
اس مقصد کے حصول کے لئے حکومت تجارتی
اور تجارتی طریقوں پر نگاہ رکھے گی تاکہ موافق

ترقی کی رفتار تیز کی جاسکے۔ اس صلاحیت
سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد

مسودے میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ زراعت کے لیے وسیلوں
کے نظام پر نظرثانی کی جائے گی تاکہ دستیاب وسیلوں کو
موجودہ امدادی اقدامات سے سرمائے کی تشکیل اور بنیادی
سہولیات کی تعمیر میں لگایا جاسکے۔

حال آمدنی کا ماحول پیدا کیا جاسکے حقیقت
تو یہ ہے کہ ۹۳ - ۱۹۹۲ء کے لیے خریف اور
ربیع کی فصلوں کے لیے امدادی نرخ کافی اونچی
سطح پر مقرر کیے گئے ہیں۔ فی کوئنٹل کم از کم قیمت
میں اضافہ دھان کے لیے ۴۰ روپے، جوار
باجرے کے لیے ۱۵ روپے، دالوں کے لیے
۹۵ روپے، سالم مونگ پھلی کے لیے ۵ ار روپے،

کو حاصل کرنے کے لئے زرعی پیداوار کی توسیع
اور تنوع کے لیے ایک طویل المدت پالیسی
مرتب کی جائے گی جس سے کسانوں کو بھی فائدے
میں حصہ مل سکے۔ حکومت نے حال میں دیگر
ممالک کو اشیاء کی برآمد میں اضافے کے لیے
کئی قدم اٹھائے ہیں۔ مرکز اور ریاستوں کے
بہت سے افسروں کو اشیاء کی صفائی اور موزوں

منسلک ہونے کی اشیاء جاری کرنے کا اختیار [illegible] یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ مال کی آمد کے لئے [illegible] اس اقدامات سے [illegible]

زرعی تجارت کا ازارہ

[illegible]

تاکہ زراعت کی ترقی کے لیے مطلوبہ بنیادی سہولیات مہیا کی جاسکیں۔ ایسی تمام امدادِ باہمی انجمنوں کی کوششوں کو پوری پوری امداد دی جائے گی جو اقتصادی طور پر منافع بخش کام کررہی ہیں۔ جن کا کام [illegible]

جائے گی جس کی ملکیت، انتظام اور کنٹرول امدادِ باہمی کی بنا پر انجمنوں کے ممبروں کے ہاتھ میں ہو۔ کوآپریٹو انجمنوں کو زرعی پیداوار کی صفائی ستھرائی، گھریلو صنعتوں، مال کی فروخت اور زرعی اشیاء کی برآمد میں اعلیٰ ترجیح دی

> تجارت [illegible] زرعی اشیاء کی برآمد میں قدرتی طور پر مقابلتاً فائدہ حاصل ہے کیونکہ یہاں کاشت میں سب سے زیادہ [illegible] استعمال ہونے والی [illegible] محنت کا خرچ کم ہے اور ملک کے مختلف علاقوں میں [illegible] کے لیے الگ الگ حالات موجود ہیں۔ بھارت کو زراعت کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

> کوآپریٹو انجمنوں کو زرعی پیداوار کی فروخت اور زرعی اشیاء کی برآمد میں اعلیٰ ترجیح دی جائے گی اور یہ انجمنیں ممبروں کو مستحکم رکھنے، صارفین کے تحفظ اور ایک مضبوط عوامی تقسیم کے نظام کی تشکیل میں معاون ثابت ہوں گی۔

> [illegible] کا نظام [illegible] کسانوں کو [illegible] حاصل [illegible] اس کے ساتھ ہی کسانوں کو [illegible] اور حکومت کی [illegible] اس سے کسانوں کو ترغیب ملے گی کہ وہ اور زیادہ کوشش کریں اور اپنی آمدنی کی سطح میں اضافہ کریں۔

بے روزگاری ختم ہو، دیہات سے غریبی ہٹے، برآمدات میں مدد ملے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ترقی کے عمل میں قدرتی وسائل کو برقرار رکھا جاسکے۔ اس کنسورشیم کے طریقہ کار میں تمام متعلقہ افراد کو زراعت کے عمل میں شامل کیا جائے گا جن میں مالی ادارے، صنعتیں، تحقیقی ادارے، غیر سرکاری ادارے اور کسان بھی شامل ہیں۔

امدادِ باہمی اداروں کے لیے نئی قوت

قرارداد کے مسودے میں امدادِ باہمی اداروں کو نئی قوت دینے پر خاص زور دیا گیا ہے سے چلایا جانا ہے اور جو جمہوری طریقے سے چلائی جارہی ہیں۔ ان کوآپریٹو اداروں کو سرکاری کنٹرول سے آزاد کردیا جائے گا۔ منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے قائم کی گئی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق کوآپریٹو انجمنوں کے بارے میں نمونے کا ایک بل تیار کیا گیا ہے۔ حکومت کے تمام متعلقہ مفادات کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے بعد حکومت نے امدادِ باہمی انجمنوں کے بارے میں ایک قومی پالیسی کا مسودہ بھی تیار کیا ہے۔ اس پالیسی کے مطابق کوآپریٹو انجمنوں کی ایسے خود مختار بنیادی جمہوری اداروں کے طور پر پھلنے پھولنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے گی اور یہ انجمنیں ممبروں کو مستحکم رکھنے، صارفین کے تحفظ اور ایک مضبوط عوامی تقسیم کے نظام کی تشکیل میں معاون ثابت ہوں گی۔

حکومت کے مرتب کردہ زرعی پالیسی کے مسودے میں طویل المدت تناظر میں زرعی شعبے میں سرکاری پالیسی کے طور پر تحریک کا ایک خاکہ مہیا کیا گیا ہے۔ اس پالیسی میں اس رخ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جہاں

(باقی صفحہ ۶۷ پر)

کرنل راؤ رام سنگھ

بھارت کی بنجر زمین کی اصلاح

خاص مضمون کا کہنا ہے کہ ملک میں بنجر زمین کی بڑھتی ہوئی سطح سے پیداوار، وسیلوں اور زندگی کے لئے ضرورتوں سے نمٹنے کے واسطے ایک بڑا خطرہ ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ایک مربوط نظام تیار کیا جائے جس سے پیداوار بڑھے اور روزگار کے مزید مواقع حاصل ہوں۔

بھارت میں زمین، پانی، شمسی توانائی، ماحولیاتی نسل یا انسانی وسیلوں کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم قدرت کی نعمتوں اور امداد سے ہی زندہ ہیں اور اتنی بڑی آبادی کا بوجھ برداشت کر رہے ہیں۔ ہمارا مسئلہ وسیلوں کی موجودگی نہیں بلکہ انسانی قوت اور دانشمندی سے ان وسیلوں کے مناسب انتظام کا ہے۔ اب تک ہم اس کام میں ناکام رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس رخ میں سنجیدگی سے کوشش ہی نہ کی ہو۔

لیکن اب وقت ہے کہ ہم اس جانب سنجیدگی سے توجہ دیں۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کی کل ۳۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین کے مقابلے میں قریب ایک تہائی رقبہ بنجر یا معیار سے کم ہے۔ ۳ کروڑ ہیکٹیئر کے اعلان کردہ جنگلات کے [illegible] ایک کروڑ ہیکٹیئر زمین ایسی ہے جو [illegible] ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بعض دلچسپ حقائق جاننا ضروری ہیں۔ جن کی وجہ سے ہمارے قدرتی وسیلوں کے تحفظ کے لئے فوری اقدامات کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی

آزادی کے بعد ملک میں انسانوں اور مویشیوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا

[illegible] ضروریات پوری کی جا سکیں۔ جنگلات سے زمین میں نمی کی ہونی ہے [illegible] دلدل کے علاقے سے صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

جلانے کی لکڑی اور چارہ

زمین، پانی اور حیاتیاتی وسیلے جو زراعت اور ماحولیات کے بنیادی اور خوراک پیدا کرنے والے پانی اور ایندھن کی ضروریات پوری کرتے ہیں، بڑھتی آبادی کی ضروریات پوری کرنے

کیمتوار [illegible]

	۱۹۵۱ء	موجودہ صورت حال
۱۔ انسانی آبادی (دس لاکھ)	۳۶۱	۸۴۴
۲۔ مویشیوں کی آبادی (دس لاکھ)	۲۹۲	۴۱۶

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

۳۔ رقبہ زیر کاشت (دس لاکھ ہیکٹیر)	۹۴	۱۴۱٫۸
۴۔ سرکاری جنگلات کے رقبے میں کمی (دس لاکھ ہیکٹیر)	-	۴٫۴۴

کرتے بھاری دباؤ تلے آ گئے ہیں۔ ملک کے دیہات میں رہنے والی ۸۰ فی صد آبادی ایندھن کے لیے جلانے والی لکڑی استعمال کرتی ہے جو زیادہ تر گھر میں کھانا پکانے کے کام آتی ہے۔ جلانے کی لکڑی اور چارے کی مانگ اور دستیابی میں جو عدم توازن پایا جاتا ہے وہ گوشوارہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے۔

غیر جنگلاتی سرکاری زمینیں جیسے کہ چراگاہیں وغیرہ جن سے توقع تھی کہ وہاں سے

گوشوارہ نمبر ۲

	مانگ	دستیابی	خسارہ
جلانے کی لکڑی	۲۳۵ ملین مکعب میٹر	۴۰ ملین مکعب میٹر	۱۹۵ ملین مکعب میٹر
چارہ	۹۳۲ ملین ٹن	۴۵ ملین ٹن	۴۸۲ ملین ٹن

دیہات کے عوام کی جلانے کی لکڑی اور چارے کی ضرورت پوری ہوگی اُن کا زرخیزی کا معیار گر گیا ہے اُن پر ناجائز قبضہ ہو گیا ہے یا اُن کی حالت خراب ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ملک کی کل زمین کا ایک تہائی حصہ معیار کے لحاظ سے بُری طرح خراب ہو گیا ہے۔ ملک میں بنجر زمین کی یہ توسیع پیداوار کے ذرائع کو بُری طرح مجروح کر رہی ہے اور حیات کے معاون نظاموں کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔

زمین کی دستیابی

زمین ایک ایسا ذریعہ ہے جسے بار بار استعمال میں نہیں لایا جا سکتا اور زرخیز زمین کم ہوتی جا رہی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملک میں قابلِ کاشت زمین کی فی کس دستیابی جو ۱۹۵۱ء میں ۰٫۴۸ ہیکٹیر تھی ۲۰۰۰ء میں کم ہو کر ۰٫۱۵ ہیکٹیر رہ جائے گی۔

کٹاؤ زمین

دستیاب زمین میں بھی ہر سال ۱۶٫۳۵ ٹن فی ہیکٹیر کا کٹاؤ ہو رہا ہے جو زیادہ سے زیادہ برداشت کی حد ۱۲٫۵ ٹن فی ہیکٹیر سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ زمین کے انتظام کے بہت سے طریقوں کے تحت جیسے کہ تیز ڈھلانوں پر کاشت، بدلتی ہوئی ڈھلانوں وغیرہ میں زمین کا نقصان اور بھی زیادہ ہے۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کٹاؤ زمین کی سطح اور زمین کی زرخیزی میں کمی میں ایک یقینی تعلق پایا جاتا ہے۔

زمین کے معیار میں کمی

شورے کے زیادہ مقدار میں جمع ہونے، پانی کے کھڑا ہونے، صنعتی و کان کنی کے کچرے کے جمع ہونے، گھاٹیوں یا ندیوں کے کناروں کے کٹاؤ زمین کی زرخیزی میں کمی ایک سنگین معاملہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ہر برس کان کنی کے ذریعہ ہر سال ۱۴۰ ہیکٹیر زمین کا نقصان ہوگا جو اس وقت ۵۰۰ ہیکٹیر ہے۔ گھاٹیوں میں ناجائز قبضے اور جنگلات پر بے جا تصرف سے نقصان کا اندازہ ۸۰۰۰ ہیکٹیر سالانہ کا ہے۔ کٹاؤ زمین سے زرخیز مٹی کے کٹاؤ کا اندازہ ۵٫۳۷ سے ۸٫۴ ملین ٹن کا ہے۔ ان تمام زمینوں سے نباتاتی زرخیزی کے مجموعی نقصان کا اندازہ ۵۰ ملین ٹن

زمینیں، پانی اور حیاتیاتی وسیلے جو زراعت اور لشو پالن کے معاون ہیں اور جو ایک بڑے حصے کی پانی اور ایندھن کی ضروریات پوری کرتے ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرتے کرتے بھاری دباؤ تلے آ گئے ہیں۔

غیر جنگلاتی سرکاری زمینیں جیسے کہ چراگاہیں وغیرہ جن سے توقع تھی کہ وہاں سے دیہات کے عوام کی جلانے کی لکڑی اور چارے کی ضرورت پوری ہوگی اُن کا زرخیزی کا معیار گر گیا ہے اُن پر ناجائز قبضہ ہو گیا ہے یا اُن کی حالت خراب ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ملک کی کل زمین کا ایک تہائی حصہ معیار کے لحاظ سے بُری طرح خراب ہو گیا ہے۔

مالانہ کا ہے ۔

حیاتیاتی تنزل

جگہ تبدیل کرکے کاشت کرنے کے طریقہ کار میں درختوں کی جو اقسام ضائع ہو جاتی ہیں یا نباتات کی سطح میں جو کمی آتی ہے وہ بہت زیادہ اہم ہے ۔ چراگاہوں یا دیہی شاملات میں سے ضرورت سے زیادہ چارہ لے جانے سے وہاں پودوں کی افزائش کم ہو جاتی ہے بلکہ وہاں کم تر درجے کے اور کم ذائقہ دار پودے اُگنے لگتے ہیں ۔

زمین کی نمی میں کمی

کنوؤں، چشموں اور موسمی نالوں کا خشک ہو جانا اور خشک موسم کی طوالت، مرطوب اور نیم مرطوب علاقوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے ۔ ریگستان میں تبدیل ہونے کا عمل بلا روک ٹوک جاری ہے اور ریگستان جیسی حالت اور علاقوں کو اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی ہے ۔ آبی ذخیروں میں گاد کا جمع ہونا ایک اور سنگین مسئلہ ہے جس سے بھاری خرچ سے حاصل کی گئی آب پاشی اور توانائی کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے ۔

پانی کا سوکھنا

زمین کی طرح پانی بھی ایک سوکھ جانے والا وسیلہ ہے ۔ [illegible] تک پانی کی دستیابی ۲۱ فی صد کم ہو جائے گی ۔ سال بہ سال مقدار اور معیار کے لحاظ سے پانی کی دستیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم زمین کا انتظام کس طرح کرتے ہیں ۔ اندازہ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت جلد زراعت اور گھریلو استعمال کے پانی ایک کمیاب چیز بن جائے گی ۔ اس لیے زمین کے انتظام کی مانند زمین کے انتظام کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے ۔

> کنوؤں، چشموں اور موسمی نالوں کا خشک ہو جانا اور خشک موسم کی طوالت مرطوب اور نیم مرطوب علاقوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے ۔ ریگستان میں تبدیل ہونے کا عمل بلا روک ٹوک جاری ہے اور ریگستان جیسی حالت اور علاقوں کو اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی ہے ۔

کچرے کا نکاس

ندیوں، جھیلوں اور زمین پر شہروں کے کچرے، صنعتوں سے نکلنے والے فاضل مادوں اور شہروں کے غیر صاف کردہ گندے پانی کو جمع کرنے سے بہت سی زرخیز زمین ضائع ہوتی جا رہی ہے ۔ [illegible] چلا ہے کہ درجہ اوّل کے ۱۴۲ شہروں کا گندہ پانی ندیوں میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ ۴۴ شہروں میں زمین میں ڈالا جاتا ہے ۔ باقی ۲ [illegible] پانی سمندر میں ڈالا جاتا ہے ۔ ان تمام حالات میں حیاتیاتی نظام کی پیداواری صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے ۔ کچرے اور گندگی کے ڈھیر لگانا شہروں کا ایک سنگین مسئلہ ہے اور یہی حالت صنعتی کارخانوں سے نکلنے والی دھول کی ہے ۔ اس سے زمین کا رویہ بدل رہا ہے ۔ پانی کے نکاس کے قدرتی راستوں میں رکاوٹ پڑ رہی ہے اور بہت بڑے علاقوں کا ماحول کثیف ہوتا جا رہا ہے ۔

طریقہ کار

اس افسردہ پس منظر میں غیر جنگلاتی علاقوں کی بنجر زمینوں کو نباتات کی دستیابی میں اضافہ کرنے کے لیے اور خاص طور پر چارے اور ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کام میں لانا ایک ہمت آزما مسئلہ ہے ۔ ان میں سے ۸ فی صد زمین نجی ملکیت میں ہے ۔ باقی زمین اجتماعی ملکیت یا اداروں کی ملکیت کی ہے ۔ لہٰذا ہر ایک قسم کی زمین کی بحالی کے لیے طریقہ کار اور حکمت عملی الگ الگ ہوگی تاہم یہ ضروری ہے کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے [illegible]

(۳) روزگار اور آمدنی پیدا کرنے والے کاموں کی امداد کے لیے مخصوص اقدامات ۔

اور یہ طریقہ ایسا ہونا چاہیے جس سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے اور زمین کی پیداواریت کو قائم رکھنے کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکے ۔

حکمت عملی

ممالک بھر میں زمین کے معیار میں کمی اور اس سے لوگوں کے سماجی و اقتصادی معیار سے تعلق کا جو مطالعہ کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنجر زمین کی بحالی کے قومی بورڈ کو سپرد کیا گیا ہے اُسے ایک ایسے مربوط ایک دوسرے پر منحصر زمین کے انتظام کے ذریعہ

ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جس میں

(۱) زمین کی نمی اور خدا بخش قوت کی اصطلاح میں زمین کی زرخیزی پھر سے پیدا کی جائے۔

(۲) فی ہیکٹیئر سالانہ کے حساب سے نباتات کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔

(۳) روزگار کے مزید ذرائع پیدا کیے جائیں اور اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے افراد کی آمدنی بڑھائی جائے۔

اس سلسلے میں ایک اہم کمی مسائل کی نشاندہی اور گہرے مطالعہ کی معلوم ہوتی ہے جو کسی خاص بنجر زمین کے بارے میں ہو جس میں اُس طبقہ کی ضروریات اور خواہشات کو مدِنظر رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ بنیادی وسیلوں کی سطح کو ایک مقررہ حد تک برقرار رکھا جائے جس سے آنے والے برسوں میں مطلوبہ پیداوار حاصل ہوتی رہے۔ چنانچہ بنجر زمینوں کی ترقی کی سرگرمیوں کو درج ذیل ترجیحاتی پروگراموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مسائل کی نشاندہی کے مقصد سے گہری اور بالتفصیل چھان بین کی جائے۔

(۲) ایسے منصوبے مرتب کیے جائیں جن میں قابلِ استعمال ٹکنالوجی، ضروری ادارہ جاتی بنیاد اور پالیسی کے ذریعہ ملنے والی مدد کے خلا کو پُر کیا جائے

(۳) ترقی کے لیے نمونے تیار کیے جائیں، جن میں زمین کی زرخیزی کی بحالی کے لیے کم از کم خارجی اشیاء کے استعمال سے کام میں لایا جا سکے۔

(۴) مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر انتظامِ زمین کے طریقوں کے بارے میں بیداری پیدا کی جائے جس سے فوری اور طویل المدت ضروریات پوری کی جا سکیں، اور ایسے طریقوں سے زیادہ روزگار اور آمدنی کی تخلیق کی جائے۔

(۵) مسائل کا پتہ لگانے، پراجیکٹوں کے خاکے تیار کرنے، منصوبوں پر عمل کرنے میں عوامی کوششوں سے مدد لی جائے اور ان منصوبوں کو جاری رکھنے اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی ذمہ داری بھی اُن کے کندھوں پر ڈالی جائے۔

(۶) سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال میں اضافہ کیا جائے۔

(۷) مواصلات اور توسیعی خدمت کی حکمتِ عملی تیار کی جائے اور اس کی تشہیر کا سامان کیا جائے۔

> پچھلے دو دہوں سے زمین کے ذخیرہ جات ہونے کا ایک سنگین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ بہت سے حالات صنعتی کارخانوں سے نکلنے والے دھول فضلے سے زمینوں کا روپ بدل رہا ہے۔ پانی کے نکاسی کے قدرتی راستوں میں رکاوٹ پڑ رہی ہے اور بہت بڑے علاقے کا ماحول کثیف ہوتا جا رہا ہے۔

اسکیمیں

اِن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بنجر زمینوں کی اصلاح اور بحالی کا محکمہ درج ذیل اسکیموں پر عمل کر رہا ہے۔

بنجر زمین کی بحالی کے مربوط منصوبے کی اسکیم

اس اسکیم کے لیے سو فی صد خرچ مرکز کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ ۹۰-۱۹۸۹ء میں شروع کی گئی اس اسکیم کا مقصد ریاستوں میں موسے کے پراجیکٹ شروع کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے منصوبے زمین کی اہلیت، جگہ کے حالات اور مقامی لوگوں کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد بنجر زمین کی بحالی کے پروگرام کے ہر مرحلہ پر لوگوں کے اشتراکِ عمل میں اضافہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھیں یقین دلایا جاتا ہے کہ جو فائدہ ہوگا اُس میں سب شریک ہوں گے۔

چوں کہ اس اسکیم کے کئی پہلو ہیں اس لیے چیدہ چیدہ اضلاع میں مقامی اور آبی طاس کی سطح پر مربوط منصوبے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کی بڑی بڑی سرگرمیاں حسبِ ذیل ہیں :-

> یہ طریقہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے اور زمین کی پیداواریت کو قائم رکھنے کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکے۔

- زمین اور نمی کو قائم رکھنے کے لیے چھوٹے پیمانے کی انجینئرنگ تعمیرات، چیک ڈیم اور پانی جمع کرنے کے ذخیرے تعمیر

کیے جاتے ہیں۔

- مٹی کے تحفظ کے اقدامات میں زینہ بندی، پشتے لگانا، کھائیاں کھودنا اور نباتاتی حدیں وغیرہ قائم کرنا شامل ہے۔
- کثیر المقاصد درخت، جھاڑیاں اور گھاس لگائی جاتی ہے اور چراگاہیں بنائی جاتی ہیں۔
- قدرتی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔
- زراعتی جنگل بانی، باغبانی اور سائنسی ڈھنگ سے پیتو پالن کو فروغ دیا

معیار کو گرنے سے روکا جا سکے اور گھٹیا زمین یا آبی طاس کا معیار بلند کیا جائے۔

(۲) جلانے کی لکڑی، چارے اور جنگلاتی کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔

(۳) اور مقامی لوگوں کو پروگرام میں شامل کیا جائے۔

اس اسکیم کے تحت ریاستی محکمہ جنگلات یا دیگر سرکاری ادارے موزوں آبی طاسوں کی نشاندہی کریں گے جہاں یہ اسکیم عمل میں لائی جائے گی۔ اس عمل میں

اداروں، خواتین کی انجمنوں، نوجوانوں کی انجمنوں اور دیگر ایسے اداروں کو جنگل بانی یا بنجر زمینوں کی بحالی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق رکھنے والے کاموں کے لیے مالی مدد دی جاتی ہے۔ اس کام میں اسکیموں پر حقیقی عمل درآمد کام کے بارے میں بیداری، تربیت، توسیع کے کام شامل ہیں۔ پراجیکٹوں پر عمل درآمد نجی یا سرکاری زمین پر ہو سکتا ہے۔ جن پراجیکٹوں میں لوگ بڑے پیمانے پر رضاکارانہ طور پر شریک ہوں انھیں ترجیح دی جائے گی۔ رضاکار اداروں کو رقوم براہ راست مہیا کی جاتی ہیں۔

عوام کی پودگاہوں کی اسکیم

اس سلسلے میں ایک اہم کسی مسائل کے لئے سامنا ہے اور گہرے مطالعہ کے معلوم ہوتی ہے جو کسی خاص خطہ زمین کے بارے میں ہو جس میں اس علاقے کی ضروریات اور خواہشات کو مدنظر رکھا جائے اور اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ بنیادی وسیلوں کی کو ایک مقررہ حد تک برقرار رکھا جائے جس سے آنے والے برسوں میں مطلوبہ پیداوار حاصل ہوتی رہے۔

جاتا ہے۔

- لکڑی کی جگہ دیگر اشیاء کے استعمال اور جلانے کی لکڑی کے تحفظ کے اقدامات کیے جاتے ہیں۔

(زز) علاقے کے مطابق جلانے کی لکڑی اور چارے کی پیداوار

اس اسکیم پر نصف خرچ مرکزی سرکار ادا کرتی ہے۔ اس اسکیم کا بڑا مقصد خاص خاص آبی طاسوں میں زمین کی اصلاح کے مربوط پروگرام کا فروغ ہے۔ اس مقصد کے لیے درخت لگائے جاتے ہیں، باغیچے لگائے جاتے ہیں اور زمین کے کٹاؤ کو روکا جاتا ہے اور نمی کا تحفظ کیا جاتا ہے تاکہ (۱) زمین کے

گرام پنچایتوں اور دیہی سطح کے اداروں کا سرگرم تعاون حاصل کیا جائے گا۔ یہ ایک منصوبہ کم از کم دو سو ہیکٹیئر کا ہوگا اور جو زمین کسی بحالی کے لیے لی جائے گی اس کا رقبہ دس ہیکٹیئر سے کم نہیں ہوگا۔

منصوبہ تیار کرتے وقت محکمہ جنگلات شیئر دار ادارے کے طور پر زراعت، پیتو پالن باغبانی، دیہی ترقی جیسے دیگر محکموں سے بھی مشورہ کرے گا تاکہ ایک ہی جگہ ایک کام ایک سے زیادہ جگہ نہ ہوتا رہے۔

(ززز) امدادی عطیات کی اسکیم

یہ سو فی صد مرکزی خرچ کی اسکیم ہے اور اس کے تحت رجسٹرڈ رضاکار اداروں، کوآپریٹو

کو اسکولوں اور کوآپریٹو اداروں کو خود روزگاری کا ایک مستقل ذریعہ مہیا کیا جا سکے۔

(۲) مقامی سطح پر کافی مقدار میں اچھی قسم کے مطلوبہ پودے حاصل کیے جا سکیں اور عوامی پودگاہوں کا ایک جال بچھایا جا سکے۔

(۳) تجربہ زمینوں پر جنگل بانی کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس طرح روزگار کی صلاحیت اور آمدنی پیدا کرنے کے کام میں اضافہ کیا جا سکے۔

رواں مالی سال ... یہ اسکیم ریاستوں کے سپرد کر دی گئی ہے۔

(۷) اپنی گرہ سے خرچ کرنے کی اسکیم

یہ اسکیم سو فی صد

(۱۱) صفحہ ۲۰ پر)

ڈاکٹر جینت پاٹل

زراعت اور آٹھواں منصوبہ

معیشت کے زوال میں آٹھویں منصوبے کا مقصد ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے اور برآمدات کے لیے فاضل پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے زرعی پیداوار میں ٹکاؤ لانے سے حاصل ہونے والے فائدوں کو مستحکم بنانا ہے۔ ان کی رائے میں ہمارے سامنے ایک مشکل کام ہے لیکن ہم پہلے سے اس خیال سے کہ ہم اپنا نصب العین بارانی علاقوں کی ترقی، آبپاشی کی سہولیات کے اعلیٰ استعمال اور کاشتکاری کی بہتر اور فائدہ مند تکنیکوں کے ذریعے ترقی مسلسل فروغ کو یقینی بنا کر حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم آج تک مہاتما گاندھی سے متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ "میرے خیال میں بھارت کا اور بھارت ہی کیا ساری دنیا کا معاشی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے تحت کسی بھی شخص کو خوراک اور کپڑے کی کمی نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو اتنا کام ملنا چاہیے کہ وہ بآسانی گذارہ کر سکے۔ اور یہ آدرش صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے ذرائع پیداوار عوام کے کنٹرول میں ہوں۔ وہ سب کو اسی طرح دستیاب ہونے چاہئیں جیسے خدا کی بنائی ہوا اور پانی سب کو دستیاب ہیں یا ہونا چاہئیں۔" حصولِ آزادی کے بعد ملک میں منصوبہ بند اقتصادی ترقی کی ابتداء تیزی سے کردی گئی۔ پنڈت نہرو کہتے تھے کہ "ہر چیز انتظار کر سکتی ہے لیکن زراعت نہیں۔"

بھارت میں زراعت بدستور موسمی حالات پر بہت زیادہ انحصار رکھتی ہے، خاص کر بارش پر۔ اس کے نتیجے میں ہمیں خشک سالی اور سیلابوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی حد تک ژالہ باری بھی ہماری پیداوار پر اثرانداز ہوتی ہے لیکن ان قدرتی عناصر پر کسی کا بس نہیں ہے۔ کئی کارروائی کے باوجود منصوبہ بند زرعی ترقی آزاد بھارت کی ترقی کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ بھارت کا قلت اور انحصار کے دور سے نکل کر محض چالیس سال کے قلیل عرصے میں خود کفالت کے دور میں داخل ہو جانا کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے۔ یہ کامیابی ہمیں منصوبہ بندی اور پیداواری پروگراموں پر عمل درآمد کے ساتھ ساتھ اپنے کسانوں کی محنت و مشقت اور تحقیقی و توسیعی اداروں کی خدمات کی بدولت ہی حاصل ہو سکی ہے۔ شعبۂ زراعت میں ہماری حصولیابیاں ذیل کے گوشوارے میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

> منصوبہ بند زرعی ترقی آزاد بھارت کی ترقی کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ بھارت کا قلت اور انحصار کے دور سے نکل کر محض چالیس سال کے قلیل عرصے میں خود کفالت کے دور میں داخل ہو جانا کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

زرعی ترقی کے چند اشاریئے

نمبر شمار	جنس	اکائی	۱۹۵۰-۵۱ء	۱۹۷۰-۷۱ء	۱۹۹۰-۹۱ء
۱۔	غلہ	ملین ٹن	۵۰.۰۱	۱۲۹.۵۹	۱۰۶.۳۹
	(ا) گیہوں	”	۶.۴۶	۳۶.۳۱	۵۵.۱۴
	(ب) چاول	”	۲۰.۵۱	۵۲.۶۳	۱۴.۲۹
	(ج) موٹا اناج	”	۱۵.۳۱	۲۹.۰۲	۱۲.۷۰
	(د) دالیں		۸.۴۱	۱۰.۶۳	۱۴.۲۶
۲۔	تیل نکالنے کے بیج		۵.۱۶	۹.۳۰	۱۸.۶۱
۳۔	گنا		۵۷.۰۵	۱۵۴.۲۵	۲۴۱.۰۵
۴۔	روئی	ملین گانٹھوں میں ایک گانٹھ = ۱۷۰ کلو گرام	۳.۰۴	۷.۰۱	۹.۱۴
۵۔	پٹ سن اور MESTA	ملین گانٹھوں میں ایک گانٹھ = ۱۸۰ کلو گرام	۳.۳۱		
۶۔	دودھ	ملین ٹن			
۷۔	انڈے	ملین عدد			
۸۔	اُون	ملین کلو گرام			
۹۔	چائے	ٹن			
۱۰۔	کافی (قہوہ)		[illegible]	۱۱۸.۰۶	۱۰۲
۱۱۔	ربڑ		۱۴.۱۴	۱۵۳.۰۱	۳۳
۱۲۔	مچھلی	ملین ٹن	۰.۷۵	۲.۰۴۱	۲.۹۳

حالیہ برسوں میں پیداوار میں مزید اضافہ ہوا ہے اور کئی نئے ریکارڈ قائم کیے گئے ہیں جیساکہ ذیل کے گوشوارے سے ظاہر ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

نوے کی دہائی میں زرعی ترقی کے چند اشاریئے

نمبر شمار	جنس	اکائی	۱۹۸۹-۹۰ء	۱۹۹۰-۹۱ء	۱۹۹۱-۹۲ء	۱۹۹۲-۹۳ء	۱۹۹۳-۹۴ء (ہدف)
۱۔	غلہ	ملین ٹن	۱۰۱.۰۴	۱۰۶.۳۹	۱۶۷.۰۶	۱۸۰.۳۰	۱۸۸.۰۰
	(ا) گیہوں	”	۴۹.۸۵	۵۵.۱۴	۵۵.۰۹	۵۶.۹۰	۵۸.۵۰
	(ب) چاول	”	۷۳.۵۷	۷۴.۲۹	۷۳.۶۶	۷۱.۹۰	۷۸.۰۰
	(ج) موٹا اناج	”	۳۴.۷۶	۳۲.۷۰	۲۶.۲۶	۳۶.۸۰	۳۶.۰۰
	(د) دالیں	”	۱۲.۸۶	۱۴.۲۶	۱۲.۰۵	۱۴.۷۰	۱۵.۵۰

۲.	تیل نکالنے کے بیج	ملین ٹن	۱۶٫۹۲	۱۸٫۶۱	۱۸٫۲۸	۲۱٫۲۰	۲۱٫۰۰
۳.	گنا	〃	۲۹٫۵۷	۲۴۱٫۰۵	۲۴۹٫۲۶	۲۳۹٫۰۲	۲۴۵٫۰۰
۴.	روئی	ملین گانٹھیں (ایک گانٹھ = ۱۷۰ کلوگرام)	۱۱٫۴۲	۹٫۸۴	۹٫۸۴	۱۱٫۹۶	۱۲٫۵۰
۵.	پٹ سن اور MESTA	ملین گانٹھ (ایک گانٹھ = ۱۸۰ کلوگرام)	۸٫۲۹	۹٫۲۳	۱۰٫۱۸	۷٫۶۲	۹٫۳۰
۶.	دودھ	ملین ٹن	۵۱٫۴۴	۵۴٫۹	۵۷٫۵	۵۸٫۶	۶۳٫۰۰
۷.	انڈے	ملین عدد	۲۰۲۰۴	۲۱۳۰۰	۲۲۸۰۰	۲۳۱۰۰	۲۵۰۰۰
۸.	اون	ملین کلوگرام	۴۱٫۷	۴۲٫۰	۴۳٫۶	۴۳٫۳	۴۸٫۶
۹.	چائے	۰۰۰ ٹن	۷۱۴٫۹۰	۷۱۹٫۰	۷۴۱٫۷۲	۷۶۵٫۰×	۸۰۷٫۸۴ (عارضی)
۱۰.	کافی (قہوہ)	۰۰۰ ٹن	۲۱۵٫۰۰	۱۷۳٫۰	۱۸۰٫۰۰	۱۸۵٫۵×	۱۹۳٫۸۵ (عارضی)
۱۱.	ربڑ	〃	۲۹۷٫۳۰	۳۳۰٫۰	۳۶۶٫۷۰	۴۰۵٫۰×	۴۴۶٫۷۲ (عارضی)
۱۲.	مچھلی	ملین ٹن	۳٫۶۷	۳٫۸۳	۴٫۱۵	۴۳٫۲۱	۴۵٫۷۲

(× ممکنہ حصولیابی)

۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء کے سالوں میں غلہ، گیہوں، موٹے اناج، دالوں، تیل نکالنے کے بیجوں، گنے اور قہوہ (کافی) کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے۔ جس سے ملک کی مجموعی ترقی میں بہت مدد ملی ہے

آبادی کے محاذ پر ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ ہماری آبادی اکیسویں صدی تک ایک ارب ہو جائے گی۔ یہ بات ہمارے سب شہریوں کے لیے باعثِ تشویش ہونی چاہیئے۔ ہم سب کو اجتماعی طور پر ایسے طریقوں کا پتہ لگانا اور ان پر عمل کرنا ہوگا جن سے درپیش چنوتیوں کا مقابلہ کیا جا سکے، خاص کر کروڑوں لوگوں کی خوراک، چارے، ایندھن اور ریشوں کی ضروریات پوری کرنے کے معاملے میں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰-۲۰۰۱ تک ہماری آبادی کے جس سطح تک پہنچنے کا امکان ہے اس کے مطابق ہمیں ۲۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن غلہ کی ضرورت ہوگی۔ غلہ کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی تجارتی فصلوں، باغبانی، مویشی پروری اور ڈیری فارمنگ، ماہی پروری اور متعلقہ شعبوں کو بھی ترقی دینی ہوگی۔ تبھی ہم ترقی کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے درکار بیش قیمت غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کے لیے دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کے واسطے فاضل پیداوار حاصل کر سکیں گے۔

> ہماری آبادی اکیسویں صدی تک ایک ارب ہو جائے گی۔ یہ بات ہمارے سب شہریوں کے لیے باعثِ تشویش ہونی چاہیئے۔ ہم سب کو اجتماعی طور پر ایسے طریقوں کا پتہ لگانا اور ان پر عمل کرنا ہوگا جن سے درپیش چنوتیوں کا مقابلہ کیا جا سکے، خاص کر کروڑوں لوگوں کی خوراک، چارے، ایندھن اور ریشوں کی ضروریات پوری کرنے کے معاملے میں۔

چھٹے اور ساتویں منصوبے کے دوران پیداوار کے نشانے اور پیداوار جس سطح پر پہنچ سکی اس کے اعداد و شمار گوشوارہ نمبر ۳ میں درج ہیں۔ شرح ہائے ترقی کے اعداد و شمار گوشوارہ نمبر ۴ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ رقبہ زیر کاشت اور بڑی فصلوں کی پیداوار کے اعداد و شمار گوشوارہ نمبر ۵ میں دیے گئے ہیں (گوشوارے اگلے صفحات پر دیکھئے)

زراعت میں سرمایہ کاری

شعبۂ زراعت میں پیداوار میں گذشتہ چالیس برسوں میں کی گئی سرمایہ کاری کی بدولت کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء

گوشوارہ نمبر ۳

آٹھویں منصوبے کے پیداواری نشانے

زراعت کے شعبے میں حاصل شدہ پیداوار اور نشانے

زرعی فصلیں اور دیگر زرعی اشیاء	اکائی	چھٹا منصوبہ (۸۵-۱۹۸۴ء) نشانے	حاصل شدہ پیداوار	ساتواں منصوبہ (۹۰-۱۹۸۹ء) نشانے	حاصل شدہ پیداوار	آٹھواں منصوبہ (۹۷-۱۹۹۲ء) نشانے
چاول	میٹرک ٹن	۶۳٫۰۰	۵۸٫۳۴	۷۲٫۰۰	۷۳٫۵۷	۸۸٫۰۰
گیہوں	〃	۴۴٫۰۰	۴۴٫۰۷	۵۴٫۶۰	۴۹٫۸۵	۶۶٫۰۰
موٹا اناج	〃	۳۲٫۵۰	۳۱٫۱۷	۳۲٫۸۰	۳۴٫۷۶	۳۹٫۰۰
دالیں	〃	۱۴٫۵۰	۱۱٫۹۶	۱۴٫۵۰	۱۲٫۸۶	۱۷٫۰۰
غلّہ	〃	۱۵۴٫۰۰	۱۴۵٫۵۴	۱۷۴٫۱۰	۱۷۱٫۰۴	۲۱۰٫۰۰
گنّا	〃	۲۱۵٫۰۰	۱۷۰٫۰۰	۲۰۶٫۰۰	۲۲۵٫۶۰	۲۷۵٫۰
روئی (LINT)	ملین گانٹھیں (فی گانٹھ = ۱۷۰ کلوگرام)	۹٫۲۰	۸٫۵۱	۹٫۵۰	۱۱٫۴۱	۱۴٫۰۰
پٹ سن اور (MESTA)	ملین گانٹھیں (فی گانٹھ = ۱۸۰ کلوگرام)	۹٫۰۸	۹			
چائے	۰۰۰ ٹن	۷۰۵٫۰۰	.			
کافی (قہوہ)	〃	۱۵۹٫۰۰				
دودھ	〃	۳۸٫۰۰	۴۱٫۵۰			
انڈے	ملین عدد	۱۶۳۰	۱۴۲۵۲	۱۹۹۰	۲۰۲۰۴	۳۰٫۰۰
ربڑ	۰۰۰ ٹن	۲۰۰٫۰۰	۱۷۵٫۰۰	۲۶۵٫۰۰	۲۹۷٫۳۰	۶۰۰٫۰۰

گوشوارہ نمبر ۴

آٹھویں منصوبے میں زراعت کی شرح ہائے ترقّی

زرعی پیداوار کی حاصل شدہ شرح ہائے ترقّی اور نشانے

زرعی فصلیں اور دیگر زرعی اشیاء	اکائی	چھٹا منصوبہ (۸۵-۱۹۸۴ء) نشانے	حاصل شدہ پیداوار	ساتواں منصوبہ (۹۰-۱۹۸۹ء) نشانے	حاصل شدہ پیداوار	آٹھواں منصوبہ (۹۷-۱۹۹۲ء) نشانے
چاول	میٹرک ٹن	۸٫۲۸	۶٫۶۳	۴٫۰ - ۴٫۶	۴٫۷۵	۳٫۹۵
گیہوں	〃	۴٫۶۹	۶٫۷۲	۴٫۵ - ۴٫۸	۲٫۵	۳٫۳۴
موٹا اناج	〃	۳٫۸۰	۲٫۹۴	۱٫۲ - ۱٫۸	۲٫۲۰	۵٫۴۰
دالیں	〃	۱۱٫۰۹	۶٫۸۹	۲٫۹ - ۴٫۳	۱٫۴۶	۳٫۹۶
غلّہ	〃	۷٫۰۲	۵٫۸۲	۳٫۵ - ۴٫۱	۳٫۲۸	۴٫۰۱

تلہن (تیل نکالنے کے بیج)	میٹرک ٹن	۴٫۹۰	۸٫۱۸	۶٫۷۰	۵٫۴۶	۵٫۶۱
گنا	〃	۱۰٫۷۹	۵٫۷۴	۳٫۸۰	۵٫۷۸	۳٫۱۹
روئی (LINT)	ملین گانٹھیں (فی گانٹھ = ۱۷۰ کلوگرام)	۳٫۷۶	۲٫۱۵	۴٫۸۰	۶٫۰۴	۸٫۱۰
پٹ سن اور (MESTA)	ملین گانٹھیں (فی گانٹھ = ۱۸۰ کلوگرام)	۲٫۶۷	-۰٫۴۳	۴٫۸۰	۱٫۴۰	۱٫۰۹
چائے	〃 ٹن	۵٫۴۸	۱٫۵۱	۳٫۵۰	۲٫۲۳	۵٫۱۰
کافی ([illegible])	〃	۱٫۱۷	۵٫۳۸	-۱٫۵۹	۱٫۹۷	۹٫۴۶
دودھ		۴٫۵۶	۶٫۴۲	۵٫۶۰	۴٫۳۹	۴٫۰۱
انڈے	ملین عدد	۱۱٫۳۵	۸٫۴۰	۸٫۱۰	۷٫۲۳	۵٫۶۹
ریشم	〃 ٹن	۱۰٫۳	-۱٫۶۲	۷٫۲۰	۱۱٫۱۶	۱۰٫۱۵

گوشوارہ نمبر ۵

آٹھویں منصوبے میں بڑی فصلوں کے نشانے

اے = ملین ہیکٹیر
پی = ملین ٹن
وائی = پیداوار کلوگرام/ہیکٹیر

فصل	۹۲–۱۹۹۱ء*			۹۷–۱۹۹۶ء (نشانے)		
	اے	پی	وائی	اے	پی	وائی
چاول	۴۲٫۳۱	۷۳٫۶۶	۱۷۴۱	۴۳٫۵۰	۸۸٫۰۰	۲۰۲۲
گیہوں	۲۲٫۹۰	۵۵٫۰۹	۲۳۹۷	۲۴٫۲۵	۶۶٫۰۰	۲۷۲۲
موٹا اناج	۳۳٫۷۵	۲۶٫۲۶	۷۷۸	۳۷٫۷۵	۳۹٫۰۰	۱۰۳۳
دالیں	۲۲٫۵۷	۱۲٫۰۵	۵۳۴	۲۴٫۵۰	۱۷٫۰۰	۶۹۴
غلہ	۱۲۱٫۶۱	۱۶۷٫۰۶	۱۳۷۴	۱۳۰٫۰۰	۲۱۰٫۰۰	۱۶۱۵
تلہن (تیل نکالنے کے بیج)	۲۵٫۴۲	۱۸٫۲۰	۷۱۹	۲۴٫۵۰	۲۳٫۰۰	۹۳۹
گنا	۳٫۷۸	۲۴۹٫۲۶	۶۵۸۳۱	۳٫۹۰	۲۷۵٫۰۰	۷۰۵۱۳
روئی (ملین گانٹھیں)	۷٫۶۹	۹٫۸۴	۲۱۷	۷٫۵۰	۱۴٫۰۰	۳۱۷
پٹ سن اور (MESTA) (ملین گانٹھیں)	۱٫۱۰	۱۰٫۱۹	۱۶۵۶	۱٫۰۰	۹٫۵۰	۱۷۱۰

* منصوبے کے مسودے میں پیداوار کے ممکنہ اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں۔

میں زراعت میں کُل سرمایہ کاری ۱۲۶۶ کروڑ روپے کے بقدر تھی لیکن ۱۹۷۸ ـ ۷۹ء میں ۱۹۸۰ ـ ۸۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر وہ بڑھ کر ۲۵۴۶ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ تاہم ۱۹۷۸ ـ ۷۹ء سے زراعت میں سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوئی جس کی وجہ سے وہ ۱۹۹۰ ـ ۹۱ء میں صرف ۴۶۹۲ کروڑ روپے رہ گئی۔ شعبۂ زراعت میں سرمایہ کاری میں کمی کی بڑی وجہ اسّی کی دہائی میں سرکاری سرمایہ کاری میں کمی کا واقع ہونا ہے۔ مدّت زیرِ تبصرہ میں اس شعبے میں نجی سرمایہ کاری قریب قریب جوں کی توں رہی۔ مجموعی سرمایہ کاری میں زراعت پر لگائے گئے سرمایہ کا حصّہ ۱۹۵۰ ـ ۵۱ء میں ۲۲ فیصد سے گھٹ کر ۱۹۸۰ ـ ۸۱ء میں ۱۹ فی صد اور ۱۹۹۰ ـ ۹۱ء میں فقط ۱۰ فی صد رہ گیا۔ اس سے آب پاشی پر پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری پر خراب اثر پڑا۔ کیوں کہ زراعت کے شعبے میں پبلک سیکٹر کی جو بھی سرمایہ کاری ہوتی ہے اس کا نوّے فی صد سے زیادہ حصہ آب پاشی پر لگایا جاتا ہے۔ صرف ریاستوں کے شعبۂ آب پاشی میں ہی پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری کا حصّہ ۱۹۸۰ ـ ۸۱ء میں ۴۷ فی صد سے گھٹ کر ۱۹۹۰ ـ ۹۱ء میں ۶،۵ فی صد رہ گیا۔ جب کہ پبلک سیکٹر کی مجموعی سرمایہ کاری میں (۱۹۸۰ ـ ۸۱ء کی قیمتوں کی بنا پر) ۳،۶ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا اور وہ ۱۹۸۰ ـ ۸۱ء میں ۱۱۷۶۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۹۰ ـ ۹۱ء میں ۲۱۶۱۳ کروڑ روپے ہوگئی، آب پاشی کے شعبے میں سرمایہ کاری میں ۳،۵ فی صد سالانہ کی کمی واقع ہوئی اور وہ ۱۹۸۰ ـ ۸۱ء میں ۱۷۳۶ کروڑ روپے سے گھٹ کر ۱۹۹۰ ـ ۹۱ء میں ۱۲۱۵ کروڑ روپے رہ گئی۔ یہ کمی ساتویں منصوبے کی مدّت میں ۶،۱ فی صد کی شرح سے ہوئی جب کہ چھٹے منصوبے کے دوران ۲،۲ فی صد کی شرح سے ہوئی تھی۔

ساٹھ کی دہائی میں زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی بدولت جو سبز انقلاب شروع ہوا تھا اسے جاری رکھنے میں آب پاشی کی سہولیات کی توسیع ایک اہم عنصر تھی۔ اب اس شعبے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے کیوں کہ بوائی کے رقبے میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے اور ملکی اور بین الاقوامی منڈیوں میں زرعی پیداوار کی مانگ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ زراعت سے متعلق قومی کمیشن (۱۹۷۶ء) کے مرتب کردہ اندازے کے مطابق ملک میں آب پاشی کی امکانی صلاحیت ۱۱۳،۵ ملین ہیکٹیئر ہے [illegible] کے بعد آبی وسائل کے تحت [illegible] مطابقت ہے ۱،۰ ملین [illegible] ہے۔ ۱۹۵۱ء تک صرف [illegible] ہیکٹیئر اراضی پر آب پاشی [illegible] اوسطاً ۱،۱۳ ملین ہیکٹیئر فی سال کے اضافے کے ساتھ ۱۹۹۱ـ ۹۲ء میں ۱،۳۰ ملین ہیکٹیئر ہوگئی۔ پچاس کی دہائی میں سالانہ اوسط اضافہ صرف ۰،۵ ملین ہیکٹیئر کا ہوا۔ جو اسّی کی دہائی میں بڑھ کر ۱،۶ ملین ہیکٹیئر ہوگیا۔ آٹھویں منصوبے کے دوران آب پاشی کے رقبے میں تقریباً ۲،۷ ملین ہیکٹیئر فی سال کے اضافے کا نشانہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس نشانے کو پورا کرنے کے لیے آب پاشی کے شعبے میں سرمایہ کاری کو بڑھانا ہوگا۔ اور سرمایہ کاری میں کمی کے موجودہ رجحان کو جلد سے جلد بدلنا ہوگا۔ تبھی زرعی شعبۂ زراعت کی مجموعی ترقی ممکن ہو سکے گی۔

آٹھویں منصوبے کے تحت ملک کی ضروریات کو پورا کرنے اور غیر ممالک کو برآمد کرنے کے لیے فاضل پیداوار حاصل کرنے کے لیے زرعی پیداوار کی ٹکنالوجی سے حاصل ہونے والے فائدوں کو مستحکم بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کو اور بڑھایا جائے اور زراعت کو تجارتی لحاظ سے منفعت بخش بنایا جائے۔

آٹھویں منصوبے میں زراعت اور اُس سے منسلک شعبے میں اِن باتوں پر زور دیا جارہا ہے۔

آب پاشی کے شعبے میں
[illegible]

[illegible]

۱۔ خشک اراضی، بارانی زمین اور مسئلہ بنے ہوئے علاقوں کی ترقی۔

(۱) بڑا نصب العین قدرتی وسائل کو بچانا اور استعمال کرنا ہوگا۔

(ب) زرعی پیداوار اور پیداواریت میں اضافہ اور اس اضافے کو مستحکم بنانا۔

(ج) پچھڑے علاقے کی خالی پڑی زمین کو بہتر بنا کر روزگار اور آمدنی کے مواقع پیدا کرنا۔

(د) واٹر شیڈ مینجمنٹ اور دیگر پروگراموں کے ذریعے قدرتی توازن کو برقرار رکھنا اور

(۱) خاص طور پر پچھڑے ہوئے علاقوں کی ترقی کے پروگرام روبہ عمل لاکر علاقائی نابرابریوں کو کم کرنا۔

(۲) مشرقی خطے میں زرعی ترقی کی رفتار تیز کرنا

کیوں کہ اس خطے میں زرعی ترقی کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ اس خطے میں پیداواریت کو بڑھانے کے لیے ذیلی ڈھانچے کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے امداد دی جائے گی۔ باغبانی اور زرعی پیداوار کی پراسیسنگ وغیرہ پر خاص توجہ دی جائے گی

(۳) زراعت میں تنوع اور روزگار پیدا کرنا

فصلیں اگانے کے نظام کو متنوع بنایا جائے گا اور جن زمینوں کی پیداواریت کم ہو گئی ہے ان پر فصلیں اگانے کے بجائے باغبانی کی جائے گی یعنی پھلدار درخت سبزیاں، مسالے جات اگائے جائیں گے۔ پیداوار کی قیمت کے تعین کے لیے مناسب پالیسیاں وضع کی جائیں گی اور فروخت کے لیے موزوں انتظامات کیے جائیں گے۔

(۴) زرعی اجناس کے لیے امداد

زراعت کو متنوع بنانے کے ساتھ ساتھ مناسب پیداواری پروگراموں اور پالیسیوں کے ذریعے غیر ملکی منڈیوں کا پتہ لگانے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ منصوبہ بندی کمیشن نے پیداوار کی جگہ سے لے کر پیداوار کی نکاسی کے مقامات تک کا طریقہ کار تجویز کرنے کے لیے ماہرین کا ایک گروپ مقرر کیا تھا جس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور اس ضمن میں کام شروع ہو چکا ہے۔

(۵) فصل تیار ہونے کے بعد کی ٹکنالوجی

ملکی اور بین الاقوامی منڈیوں کے لیے مال کی فراہمی کے واسطے فصلیں تیار ہونے کے بعد کی ٹکنالوجی پر زیادہ توجہ مبذول کی جائے گی۔

(۶) کھیتی کے لیے درکار اشیاء اور قرضوں کی فراہمی

کاشت کاروں کو کھیتی کے لیے درکار اشیاء اور قرضوں کی فراہمی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ زراعت اور زراعت سے متعلق مشاورتی خدمات کی زرعی گریجویٹوں اور مویشیوں کے ڈاکٹروں کے اپنا روزگار خود مہیا کرنے کی اسکیم کے ذریعے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۷) باغبانی

باغبانی کا فروغ ایک اور سمت ہے جس پر زور دیا جائے گا۔ خشک علاقوں میں باغبانی کی فصلیں لگانے، شمال مشرقی خطے میں مسالہ جات اگانے نیز گرم اور گرم مرطوب خطوں اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے خصوصی پروگراموں پر خاص توجہ مبذول کی جائے گی۔

(۸) ماہی پروری

مربوط ماہی پروری، کھاری پانی میں مچھلیوں کی افزائش، ریشم کے کیڑے پالنے، مابعد فصل ٹکنالوجی، مارکیٹنگ اور ذیلی ڈھانچے کی سہولیات میں اضافہ ایسے موضوع ہیں جن پر آٹھویں منصوبے کے دوران زور دیا جائے گا۔

(۹) مویشی پروری اور ڈیری فارمنگ

اس منصوبے میں ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ یہ شعبہ ملک کے لاکھوں چھوٹے کسانوں کو روزی روٹی اور آمدنی کا اضافی ذریعہ بنے گا۔ اس سے ہمارے دیہی عوام کی سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

(۱۰) تلہن (یا تیل نکالنے کے بیجوں) کی پیداوار

ملک کی تیل کی ضرورتیں پوری کرنے اور تیل غیر ممالک سے درآمد نہ کرکے غیر ملکی زرمبادلہ بچانے کے لیے تلہن کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور اضافے کو برقرار رکھنے کے لیے مختصر اور طویل مدتی دونوں قسم کے اقدامات کیے جائیں گے۔ جن میں تلہن کی پیداوار اور پراسیسنگ کے پروگرام اور ناریل اور پام کے اور زیادہ درخت لگانے کے پروگرام شامل ہوں گے۔

زرعی تناظر

۱۹۹۷ء تک بھارت کی آبادی اندازاً ۹۴۱ ملین ہو جائے گی جس کے سن ۲۰۰۷ء تک اور بڑھ کر ۱۱۰۲ ملین ہو جانے کا امکان ہے۔ آتنی آبادی اور آمدنی بڑھنے پر اشیاء کی کھپت میں جو اضافہ ہوتا ہے اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں ۱۹۹۷ء میں اندازاً ۲۰۸ ملین ٹن اور سن ۲۰۰۷ء میں ۲۸۳ ملین ٹن غلہ کی ضرورت ہوگی اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے غلہ کی پیداوار میں اس رفتار سے اضافہ کرنا بہت ضروری ہے۔ جس سے کہ ہم ۱۹۹۷ء تک ۲۱۰ ملین ٹن اور ۲۰۰۷ء تک ۲۸۵ ملین غلہ پیدا کر سکیں۔ اہم نشانے ذیل کے گوشوارہ نمبر میں بیان کیے گئے ہیں۔

زراعت کی مطلوبہ ترقی ایک طویل مدت میں زیادہ وسیع البنیاد خطہ وارانہ ترقی کے عمل سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس میں بارانی علاقوں کی ترقی کے لیے زیادہ وسائل مختص کیے جائیں، آب پاشی کی

گوشوارہ نمبر ۶

زرعی تناظر

	۱۹۹۱-۹۲ء	۱۹۹۶-۹۷ء	۲۰۰۱-۰۲ء	۲۰۰۶-۰۷ء
خالص رقبہ کاشت جس پر بوائی کی گئی (ملین ہیکٹیر میں)	۱۴۰٫۰۰*	۱۴۱٫۰۰	۱۴۱٫۰۰	۱۴۱٫۰۰
مجموعی رقبہ جس پر فصل اگائی گئی (ملین ہیکٹیر میں)	۱۸۲٫۲*	۱۹۰٫۶	۱۹۷٫۲	۲۳٫۴
آب پاشی (ملین ہیکٹیر میں)	۷۵٫۰۰*	۸۹٫۳	۱۰۲٫۰	۱۱۴٫۰
کیمیاوی کھاد (ملین ٹنوں میں)	۱۲٫۷۳	۱۸٫۳	۲۳٫۷	۳ ٫
روئی (ملین گانٹھوں میں)	۹٫۸۴	۱۴٫۰۰	۱۸٫۰۰	۲۳٫۰۰
گنا (ملین ٹنوں میں)	۲۴۹٫۲۶	۲۷۵	۳۳۵	۴۰
تیل نکالنے کے بیج (ملین ٹنوں میں)	۱۸٫۲۸	۲۳٫۰۰	۲۹٫۰	۳۷٫
غلہ (ملین ٹنوں میں)	۱۶۷٫۰۶			

* ممکنہ

پیدا شدہ صلاحیت کا بہتر استعمال کیا جائے اور بارانی اور آب پاشی والی دونوں قسم کی اراضی کے لیے بہتر تکنیکیں دریافت کی جائیں اور ان کی واقفیت تسلسل کے ساتھ متعلقہ لوگوں کو فراہم کی جائے۔

مویشی پروری کے ذیلی شعبے کی ترقی سے روزگار کے مواقع بڑھانے میں مدد ملے گی اور چھوٹے اور سب سے چھوٹے کسانوں اور بے زمین مزدوروں کی آمدنی بھی بڑھے گی۔ دودھ اور دودھ سے بننے والی اشیاء کی پیداوار میں ۹۲-۱۹۹۱ء کی ۵٫۷۵ ملین ٹن کی پیداوار میں ۴ فی صد سالانہ کا اضافہ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ سن ۲۰۰۷ء تک ملک میں دودھ کی مجموعی سپلائی ۱۰۵ ملین ٹن کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ انڈوں کی سپلائی میں تقریباً چھ فی صد سالانہ کا اضافہ کرنے کا نشانہ ہے۔ مچھلیوں کی پیداوار میں موزوں ذیلی ڈھانچے کی ذریعے بھاری اضافہ کرنے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان اقدامات کی بدولت ماہی پروری کے ذیلی شعبے میں ۶٫۶ فی صد کی شرح ترقی حاصل کی جا سکے گی۔ توقع ہے کہ اس کے نتیجے میں مچھلیوں کی پیداوار بڑھ کر ۱۹۹۷ء تک ۵٫۵ ملین اور سن ۲۰۰۷ء تک ۱۰٫۵ ملین ہو جائے گی۔

زراعت میں توانائی کی کھپت

توانائی کے براہ راست استعمال اور کیمیاوی کھادوں کی شکل میں مسلسل اضافہ پذیر رہی ہے۔ زمین پر بڑھتے ہوئے دباؤ اور خوراک ریشے اور دوسری زرعی پیداواروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو مدنظر رکھتے ہوئے پیداواریت بڑھانا بہت ضروری ہے اس کی وجہ سے زراعت میں توانائی کی کھپت اور بڑھے گی۔ لہٰذا ابھی [illegible]

کھادوں کا اہل استعمال دو ایسی باتیں ہیں جن پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ زمین کو زرخیز بنانے اور فصلی کیڑوں کو ختم کرنے کے لیے بایو ٹکنالوجی کے شعبہ میں تحقیق کے لیے بھی مزید سرمایہ کاری ضروری ہے۔

پروفیسر سی ایچ ہنومنت راؤ

زرعی ترقی کے لیے موزوں ٹکنالوجیاں تیار کرنے کی ضرورت

کم بارش والے بارانی اور جنگل پر منحصر رہنے والے علاقوں میں روزگار پیدا کرنا اور دیہی غربت دور کرنے کے لیے زراعت کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک چنوتی بھرا کام ہے جسے انجام دینا ہمارے سائنس دانوں سے وابستہ توقعات کے مطابق انجام دیا جا سکتا ہے کیونکہ ہمارا زرعی تحقیق کا نظام کافی مضبوط ہے اور اس نے عظیم صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاہم مصنف کے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہمارے زرعی معاشیات کے ماہرین اور سائنس دانوں کو ساتھ لیا جائے اور وہ مل کر زراعت کی ترقی کے لیے موزوں ٹکنالوجیاں تیار کریں۔

ملک میں گزشتہ پچیس برسوں میں سبز انقلاب آیا اور ملک جس طرح اپنی خوراک کی ضروریات خود پوری کرنے کے قابل بن سکا وہ ہمارے سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے کی کامیاب خدمات کی ایک روشن مثال ہے۔ ہمارے زرعی تحقیق کے نظام کو خصوصاً پچھلے پندرہ برسوں میں کافی وسعت دی گئی ہے۔ بھارت کے کاشت کاروں کو، خواہ وہ بڑے کاشت کار ہوں یا چھوٹے یا دور دراز خطوں میں ہی کیوں نہ رہتے ہوں، توسیعی خدمات اور خود اپنے تجربوں کے ذریعے نئے اور بہتر طریقوں کے فائدوں کا پتہ چل چکا ہے۔ کاشت کاری کے جدید ساز و سامان کے لیے ان کی مانگ اور کاشت کاری کے سائنسی طریقوں کے لیے ان کا اشتیاق برابر بڑھتا رہا ہے جس کے نتیجے میں ہمیں دیہات میں سائنس اور ٹکنالوجی پر مبنی زراعت ابھرتی نظر آرہی ہے جو گزشتہ پچیس برس پہلے کی زراعت سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے زرعی تحقیق کے نظام کی صلاحیتیں اور ہمارے کاشت کاروں کا ان کے تئیں مثبت ردعمل قریب مستقبل میں ملک میں زرعی ترقی کی رفتار کے تیز تر ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

تاہم زراعت میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کے ضمن میں حالیہ تجربات کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ان تجربات کی روشنی میں زراعت میں سائنس اور ٹکنالوجی کے رول کو بڑھایا جا سکے اور نئی ٹکنالوجیوں سے حاصل ہونے والے فائدوں سے وسیع تر پیمانے پر مستفید ہوا جا سکے۔

سبز انقلاب کے فائدے تا حال بڑی حد تک گیہوں اور چاول تک محدود رہے ہیں جو زراعتی و موسمی اور سماجی و اقتصادی لحاظ سے کم و بیش یکساں علاقوں میں اگایا جاتا ہے۔ جہاں آب پاشی کے یقینی ذرائع موجود ہیں اور کاشت کار بھی حیثیت والے ہیں۔ اس لیے جب کہ بعض فصلوں کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، ایسے علاقوں میں جہاں غیر استعمال شدہ زیر زمین پانی کافی مقدار میں موجود ہے اور محنت کشوں کی بھی بہتات ہے کئی فصلیں اگانے کے طریقے کو فروغ حاصل نہیں ہوا ہے۔

سبز انقلاب کے پھیلاؤ کے محدود ہونے کی ایک وجہ تو دستیاب ٹکنالوجی کی نوعیت ہے اور دوسری طبیعاتی اور ادارہ جاتی دونوں طرح کی ذیلی سہولیات کی غیر مساوی ترقی ہے جب کہ یہ دونوں بہتر طریق ہائے کاشت کے استعمال کیے جانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔

منصوبے کی حکمت عملی

منصوبے میں زراعت کے لیے جو حکمت عملی وضع کی گئی ہے اس کے اہم مقاصد ہیں۔ دیہی غربت میں قابل لحاظ کمی لانا، والے بیج کی تیاری جیسے اقدامات سے کم وسائل رکھنے والے خطوں اور کاشت کاروں کو براہِ راست فائدہ پہنچتا اور زراعت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ سماجی جنگل بانی کے فروغ سے جہاں مٹی کے کٹاؤ کو روکا اور زمین کی نمی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے وہاں اس سے روزگار کے مواقع بڑھانے اور ایندھن اور چارے کی بنیادی ضرورت پوری کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ مقاصد زرعی سائنس اور ٹکنالوجی کے نئے چیلنج ہیں۔ سائنس دانوں کو کم ترقی یافتہ اور ماحولیاتی اعتبار سے مشکل ایک دوسرے سے مختلف خصوصیات کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ کاشت کاری کے بہتر طریقے اختیار کرنے کی سفارشیں الگ الگ علاقوں کی خصوصیات کے مطابق کی جائیں۔

اوپر بیان کی گئی نئی چنوتیوں کا سامنا کرنے کے لیے درج ذیل حکمت عملی ضروری ہو سکتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ تحقیق کو وسیع البنیاد بنایا جائے تاکہ اس کے دائرہ میں مختلف زرعی اور موسمی حالات میں اگائی جانے والی بہت سی نئی فصلیں بھی شامل کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں کی صلاحیت اور ان سے اس وقت حاصل ہونے والی پیداوار کے درمیان کافی فرق ہے۔ اس فرق کو دور کرنے کے لیے بھی کافی تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ سائنس دانوں کو کاشت کاری کے [illegible]

> سبز انقلاب کے پھیلاؤ کے محدود ہونے کی ایک وجہ تو دستیاب ٹکنالوجی کی نوعیت ہے اور دوسری طبیعاتی اور ادارہ جاتی دونوں طرح کی ذیلی سہولیات کی غیر مساوی ترقی ہے جب کہ یہ دونوں بہتر طریقے ہائے کاشت کے استعمال کیے جانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔

خطہ جاتی ترقی اور فصلی نابرابریوں کو کم کرنا، خشک زمین پر کھیتی کو بڑھانا، استحکام دینا نیز فصلوں کی پیداوار اور جنگل بانی کے درمیان بہتر توازن قائم کرنا۔ یہ مقاصد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک کی تکمیل سے دوسرے کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ کم ترقی یافتہ خطوں کی ترقی اور خشک زمین پر کھیتی کو فروغ دینے سے روزگار پیدا کرنے اور دیہی غربت کو کم کرنے میں کافی زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ تلہن اور دالوں جیسی فصلوں، جن کی مانگ اور سپلائی کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے، کی کاشت خشک کھیتی کے حالات میں کی جاتی ہے۔ آب پاشی کے عوامی ذرائع کی ترقی اور خشک سالی اور کیڑے مکوڑوں سے متاثر نہ ہونے

حالات والے علاقوں پر زیادہ کرنی ہوگی جن میں ایسے علاقے بھی شامل ہیں جہاں کم بارش ہونے کی وجہ سے زمین کی نمی کم ہو جاتی ہے، اور ایسے علاقے بھی جن میں نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے اکثر سیلاب کا پانی بھر جاتا ہے۔ انھیں ایسی فصلوں کے مسئلے کو بھی حل کرنا ہوگا جنھیں زیادہ توانائی درکار ہوتی ہے یا جن میں فصلی کیڑے لگ جاتے ہیں یا فصلی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سماجی و اقتصادی اصلاح میں زرعی تحقیق میں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا کہ چھوٹے اور سب سے چھوٹے کسانوں اور قبائلی علاقوں کے کاشت کاروں میں زیادہ سرمایہ لگانے یا زیادہ جوکھم اٹھانے کی طاقت نہیں ہوتی الگ الگ علاقوں کی

پر بنا پر دیتے ہوئے جانے کسی بھی زرعی سال میں تمام فصلوں کی مشترکہ آمدنی بڑھانے پر زور دینا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پورے سال میں زرعی موسمی حالات کے مطابق فصلیں بونے اور ایک کے بعد دوسری جنس کی فصل اگانے کے طریقوں کے بارے میں تحقیق کی جائے تاکہ کسان کے اپنے وسائل (مثلاً زمین اور محنت) اور قدرتی وسائل (جیسے زرزمین پانی اور دھوپ وغیرہ) کا پورے سال زیادہ سے زیادہ فائدہ مند استعمال کیا جا سکے۔ تیسرے یہ کہ کھیتی کے لیے درکار ساماں کو بچانے کے بارے میں تحقیق پر بھی کافی زور دینا ہوگا۔ پانی کے مندولست، فصلوں کو پانی دینے کی

تکنیکوں، حیاتیاتی اعتبار سے نائٹروجن کی مقدار کے تعین، کیمیاوی کھادوں کے استعمال میں تصحیح سے متعلق، زیادہ پیداوار دینے والے ایسے بیج تیار کرنے، جن میں کیڑا نہ لگے، اور مخالف ماحولیاتی حالات کے بارے میں بھی تحقیق کرنا شامل ہوگا

اس کے لیے لازمی ہے کہ زرعی تحقیق کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں سائنس داں کھیتوں سے حاصل ہونے والے نتیجے

> سائنس دانوں کو کاشت کار کے کھیتوں کے نزدیک جانا ہوگا تاکہ انھیں کھیتوں سے اور کسانوں کے تجربوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں گی اور کھیت سے لیبارٹری تک کا الٹا سلسلہ شروع ہو سکے گا۔ دوسرے یہ کہ صرف پیداوار بڑھانے والے طریقوں پر ہی زور دینے کے بجائے کسی بھی زرعی سال میں تمام فصلوں کی مشترکہ آمدنی بڑھانے پر زور دینا ہوگا۔

سکیں اور انھیں عمل کرنے کے طریقے نکال سکیں اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی توسیعی سروس کی بھی ضرورت ہوگی، جو جانکاری اور تکنیکوں کو کاشت کاروں تک پہنچا سکے اور ان کو سائنس اور ٹکنالوجی کی افادیت کا احساس کرا سکے

تجربہ

یہ مفروضہ کہ ترقی پذیر ملکوں میں سبز انقلاب کی ٹکنالوجیاں وہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے تیار کی گئی ہیں غلط اور حقیقت کے برعکس ہے۔ کیوں کہ بہت سی ٹکنالوجیاں ایک بڑی حد تک، ترقی یافتہ ملکوں سے آئی ہیں اور انھیں ترقی پذیر ملکوں کے خاص حالات کے مطابق ڈھالا گیا ہے۔ اس لیے ان ٹکنالوجیوں کی خصوصیات کو سمجھنا ضروری ہے خاص کر اس لیے کہ ترقی یافتہ ممالک کے حالات کی روشنی میں تیار کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر معیشتوں کے اُن حالات کو سمجھنا بھی ضروری ہے جن میں وہ ٹکنالوجیاں یہاں لائی اور استعمال کی گئیں۔

امریکہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک میں دوسری عالمی جنگ کے بعد کے پہلے بیس برسوں میں فصلوں کی پیداوار میں بڑی تیز رفتار ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں میں زراعت کے لیے ذیلی ڈھانچہ بشمول آبی بندوبست بہت اچھا تھا۔ وہاں کے موافق اور نسبتاً یکساں زراعتی و موسمی ماحول کی مناسبت سے بیج اور کیمیاوی کھاد کی نئی ٹکنالوجیاں تیار کی گئیں اس مدت میں زرعی پیش رفت، صنعتی پیش رفت کے بعد شروع ہوئی۔ چنانچہ جہاں صنعتی (Inputs) دستیاب تھیں وہاں زراعت کے لیے لیبر مہنگی ہوتی جارہی تھی۔ ایسا یکسر مختلف حالات میں ہو رہا تھا کیوں کہ جہاں امریکہ میں زمین کی کوئی قلت نہ تھی وہاں جاپان میں زمین کی بہت کمی تھی۔ لہٰذا جو بائیو کیمیکل ٹکنالوجیاں تیار کی گئیں وہ ایسی تھیں جن کے لیے زیادہ زمین کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور لیبر (محنت) کی بھی بچت ہوتی تھی لیکن سرمایہ بہت لگانا پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ وہاں پورا ادارہ جاتی ڈھانچہ جس میں کاشت کاروں کی بیداری و باخبری اور انتظامیہ صلاحیتیں بھی شامل تھیں، ایسا تھا جس سے نئی ٹکنالوجیاں جلد ہی زیر استعمال آگئیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان ملکوں میں زرعی پیداوار کی قیمت میں توسیعی خدمات کے خرچ کا تناسب ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں کم کیوں تھا۔

جنگ کے بعد کی مدت میں آبادی میں اضافے کا چیلنج بہت سے ترقی پذیر ممالک کی حکومتوں کو زیادہ پیداوار دینے والی ٹکنالوجیاں ترقی یافتہ ممالک سے اُدھار لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بھارت میں سبز انقلاب کے ابتدائی دور میں زمین کی بچت کرنے والی ٹکنالوجی ایسے علاقوں میں اختیار کی گئی جہاں فی ورکر زمین کی دستیابی قومی اوسط کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی لیکن وہ خطے جہاں زمین کی سخت قلت تھی لیکن لیبر بکثرت دستیاب تھی، زمین کی بچت کرنے والی ٹکنالوجی کافی عرصہ تک اختیار نہیں کی جا سکی اور وہ پیچھے رہ گئے۔

مختلف خطوں میں نئی ٹکنالوجی کے اثرات میں جو فرق دیکھا گیا اس کی سب سے بڑی وجہ ماحولیاتی یا زرعی و موسمی حالات کا فرق تھا۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ جن علاقوں کو قدرت سے موافق ماحول ملا ہے ان کے پاس سرمایہ جاتی اور ادارہ جاتی وسائل بھی ہونے چاہئیں۔ کم سے درمیانہ بارش والے اُن خطوں نے، جہاں آب پاشی کا معقول انتظام ہے، ثابت کر دیا ہے کہ وہ بیج کیمیاوی کھاد کی نئی ٹکنالوجیوں کے منافع بخش استعمال کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ ان علاقوں میں دھوپ کافی ملتی ہے اور یہ

کیڑے مکوڑوں اور فصلی بیماریوں سے بھی بچے ہوئے ہیں۔ یہ بھی محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ فی کس آمدنی کے لحاظ سے ملک کی چار اوّل نمبر کی ریاستیں نئی ٹکنالوجی اختیار کرنے میں سب سے آگے رہی ہیں۔ یہ ہیں پنجاب اور ہریانہ، جہاں آب پاشی کی یقینی و قابلِ اعتماد سہولیات موجود ہیں، اور گجرات اور مہاراشٹر جو زیادہ تر بارش پر انحصار رکھتی ہیں۔ ان ریاستوں میں جہاں کاشت کار بیدار اور حاضر دماغ ہیں وہاں ان کی حکومتوں کے پاس کافی وسائل ہیں اور ان کا انتظامیہ بھی اہل اور ذمہ دار ہے۔

> کم سے درمیانہ بارش والے ان خطوں نے جہاں آب پاشی کا معقول انتظام ہے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بیج، کیمیاوی کھاد کی نئی ٹکنالوجیوں کے منافع بخش استعمال کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

نئی ترجیحات

بھارت میں زرعی تحقیق کے لئے نئی ترجیحات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ بارانی علاقوں میں پیداوار کے گھٹنے بڑھنے کے امکان کو کم کرنا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ محض زیادہ تر پیداوار دینے والی قسموں (HYVs) کی کاشت کرنے کے بجائے زیادہ مستحکم اقسام (HSV) تیار کی جائیں۔ ان اقسام کو کیڑے مکوڑوں اور خشک سالی کے اثر سے بے نیاز ہونا چاہئے۔

۲۔ کاشت کاری کے لیے درکار اشیاء کی بچت کے ذریعے کاشت کاری کی لاگت کو کم کرنا۔

۳۔ کاشت کار کے ذریعے اس کے وسائل کے پورے سال استعمال کیے جانے کو یقینی بنا کر کاشت کاروں کی آمدنی بڑھانا اور اس کے لئے کھیتی باڑی اور فصلیں اگانے کا نظام الاوقات مرتب کرنا۔

ان ترجیحات کو پورا کرنے کے لئے کھیتوں کے ساتھ قریب تر رابطہ ضروری ہے تبھی وہاں کے حالات کے بارے میں پوری تحقیق کی جاسکتی ہے اور الگ الگ مقامات کے مخصوص حالات کے مطابق موزوں طریق ہائے کار وضع کئے جاسکتے ہیں۔ تحقیق کی آزمائش میں کسانوں کی اور زیادہ شرکت بھی ضروری ہے۔ موجودہ نظاموں کی خوبیوں اور خامیوں کا [illegible] سائنس دانوں اور سماجی [illegible] زرعی سائنس دانوں کے درمیان [illegible] عمل کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی جانکاری سے ٹکنالوجی کو کاشت کاروں کی ضرورت اور وسائل کے مطابق بنانے میں بہت مدد ملے گی۔

چاول، تلہن اور دالوں جیسی پیچھے رہ گئی فصلوں کی پیداوار میں گذشتہ دس برسوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ٹکنالوجی کے میدان میں نئی پیش رفت کی بہ نسبت دستیاب ٹکنالوجی کی خصوصی پروگراموں کے ذریعے علاقوں میں توسیع کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔ اس تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے علاقوں میں جہاں پہلے سبز انقلاب کی وجہ سے پیداوار کی نسبتی قیمتیں گر گئی ہیں، جہاں پیداوار اکثر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور جہاں کاشت کار وسائل کے لحاظ سے غریب اور جوکھم اٹھانے کے خلاف ہیں، یہ خصوصی پروگرام کتنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ کاشت کاروں کو منافع بخش قیمتیں خصوصاً تلہن کے لئے دلانے کے لئے کی گئی خصوصی کوششوں کا بھی نمایاں اثر ہوا۔

> چاول، تلہن اور دالوں جیسی پیچھے رہ گئی فصلوں

> خصوصی پروگراموں کے ذریعے نئے علاقوں میں توسیع کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔

بھارت کی زرعی تحقیق کی کونسل کے ٹکنالوجی ٹرانسفر پراجیکٹوں کے تحت کاشت کاروں کے کھیتوں پر کئے گئے قومی مظاہروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان مظاہروں اور قومی اوسط پیداوار میں کتنا زیادہ فرق ہے یعنی یہ کہ تمام بڑی فصلوں کی پیداوار [illegible] میں کتنا بڑھائی جاسکتی ہے۔ تاہم ایک جیسے زرعی وموسمی حالات میں اصل پیداوار اور ممکنہ پیداوار کے درمیان فرق ۵۰-۶۰ فی صد سے زیادہ نہیں ہے اصل پیداوار اور ممکنہ پیداوار کے درمیان بارانی حالات اور خریف کے موسم میں زیادہ فرق نظر آتا ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر

ہوتا ہے کہ کسانوں کو بارش کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے کھیتی میں محدود لاگت ہی لگانی چاہیئے۔ چوں کہ یہ پیداواری مظاہرے ایک فصل کے لیے ہی کیے جاتے رہے ہیں اس لیے یہ معلوم نہیں ہے کہ فصلوں کی یہ نئی اقسام کسانوں کی فصلوں کی کاشت کے پروگرام میں کس خوبی سے اپنی جگہ بنا سکیں گی۔ فصلیں اگانے اور کھیتی کے نظاموں کے بارے میں تحقیق میں خامیاں بھی پائی جاتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی پر لگائے گئے سرمائے کی وجہ سے حصولیابی آب پاشی والی کاشت میں یا بارش سے سیراب ہونے والی خریف کی فصل میں، جب کہ مٹی میں کافی نمی ہوتی ہے، زیادہ ہوتی ہے۔ پیداوار بڑھانے کی اس امکانی صلاحیت سے کھیتی کی حکمت عملی میں بیجوں کی نسل بدلنے کے کام اور زمین کی نمی کے تحفظ کے اقدامات کو ایک ... کے ساتھ ملا دینے کی ترغیب ملی ہے۔ یہ سلسلہ ... پروگرام نے جو بارش سے سیراب ہونے والے علاقوں کے لیے بنایا گیا ہے، برسوں کے تجربوں کے بعد ایک شکل اختیار کر لی ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ برسوں میں اس کی بدولت اہم نتائج برآمد ہوں گے۔

بایوٹکنالوجی

ناموافق زرعی و موسمی حالتوں میں پیداوار بڑھانے اور پیداوار کے اکثر گھٹنے بڑھنے کے سلسلے کو روکنے کے معاملے میں بھارت کے زرعی تحقیق کے نظام کی کامیابیوں کا سبز انقلاب کے ابتدائی سالوں میں موافق ماحول میں حاصل کی گئی کامیابیوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ابھرتی ہوئی بایوٹکنالوجی سے جس میں جینیٹک انجینیرنگ اور ٹشو کلچر جیسی ٹکنالوجیاں شامل ہیں، رکاوٹوں کو دور کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

پودوں کے جینیٹک جوڑ توڑ سے اصل پیداوار اور حسب صلاحیت ممکنہ پیداوار کے درمیان فرق کو دور کیا جا سکے گا۔ کیوں کہ جینیٹک جوڑ توڑ سے جو پودے تیار ہوں گے ان میں کیڑے مکوڑوں اور بیماریوں کی مزاحمت کرنے کی زیادہ طاقت ہو گی۔ اس کے علاوہ ناموافق مٹی اور آب و ہوا کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی پودوں کی نسلی بناوٹ میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

بایوٹکنالوجی کی شاید سب سے اہم خصوصیت جو اسے سبز انقلاب یا بیج۔کھاد ٹکنالوجی سے نمایاں کرتی ہے یہ ہے کہ اس کی بدولت کھیتی کی کیمیاوی لاگت یعنی فصلی کیڑے مارنے والی دواؤں اور کیمیاوی کھاد کے استعمال میں بچت کی جا سکتی ہے کیوں کہ بایوٹکنالوجی کے ذریعے بایو فرٹیلائزرس جن میں کیڑوں کی مزاحمت کرنے کی طاقت ہوتی ہے، تیار کیے جا سکتے ہیں اور حیاتی نقطۂ نگاہ سے مطلوب نائٹروجن کی مقدار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

بایوٹکنالوجیوں کے استعمال سے "جینیٹک انجینیرنگ" بڑی حد تک کیمیاوی اشیاء کی جگہ لے لے گی جن کا استعمال سبز انقلاب کی ٹکنالوجی میں کیا جاتا تھا۔ بایوٹکنالوجی میں "بیج" ہی مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔

بایوٹکنالوجی فصلوں کی پیداوار میں استحکام لاتی ہے کیوں کہ یہ فصلی کیڑوں اور بیماریوں سے فصل کو ہونے والے نقصان کو کم کر کے اصل پیداوار اور ممکنہ پیداوار کے فرق کو دور کرتی ہے اور سبز انقلاب کی ٹکنالوجی کی بہ نسبت وسیع تر علاقوں میں لاگو کی جا سکتی ہے کیوں کہ سبز انقلاب کی ٹکنالوجی تو زرعی اور موسمی لحاظ سے موافق علاقوں کے لیے ہی موزوں ہے۔ چوں کہ روایتی طریقوں سے پودے تیار کر کے "بیج" تیار کرنے کی تکنیک کے مقابلے میں جینیٹک انجینیرنگ کے ذریعے زیادہ طاقت ور پودے کم وقت میں تیار کیے جا سکتے ہیں اس لیے ٹکنالوجیکل پیش رفت کی رفتار بھی زیادہ ہو گی۔ جب ٹکنالوجیوں

> بایوٹکنالوجیوں کے استعمال سے "جینیٹک انجینیرنگ" بڑی حد تک کیمیاوی اشیاء کی جگہ لے گی جن کا استعمال سبز انقلاب کی ٹکنالوجی میں کیا جاتا تھا۔ بایوٹکنالوجی میں "بیج" ہی مرکزی اہمیت رکھتا ہے

میں تبدیلیاں تیزی سے رونما ہوتی ہیں تو پرانی ٹکنالوجیوں کے فرسودہ ہو جانے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بایوٹکنالوجی سے کھیتی کی کیمیاوی لاگت کم ہو جاتی ہے تاہم بایوٹکنالوجی کے استعمال کے لیے زیادہ علم اور مہارت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے تحقیق اور کاشت کاروں کی اہلیت بڑھانے پر اور زیادہ سرمایہ لگانا ضروری ہوگا۔

بایوٹکنالوجی کے بہت زیادہ لچکدار ہونے کی وجہ سے تحقیق کی حکمت عملی اور پالیسی کا رول بڑھ جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی حکومتوں کو بایوٹکنالوجی کے بارے میں تحقیق کے لیے صحیح ترجیحات

(باقی ص۵۳ پر)

ڈاکٹر مالکم الیس۔ ادی سیشیہ

زراعت اور قومی معیشت

زیرِ نظر مضمون میں مصنف نے ہندوستانی زراعت کی [illegible] صورتِ حال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے [illegible] سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ ملک کی [illegible] اضافہ اور [illegible] نئے میدانوں میں [illegible] کا خیال ہے کہ تقسیم کے عام [illegible] کو [illegible] کو اس پر توجہ کیا جانا چاہیئے۔

حکومت نے جون جولائی ۱۹۹۱ء میں عنانِ حکومت سنبھالتے وقت جو اقتصادی اصلاحات شروع کیں اُن میں زرعی شعبے کو بڑی حد تک نظرانداز کر دیا گیا۔ حکومت نے اقتدار میں آنے کے چھ ماہ کے عرصے میں اقتصادی پالیسی کے جو خدوخال مرتب کیے اور جو اصلاحات کیں اُن میں کئی صنعتوں کے لیے لائسنس اور ضابطوں کی چھوٹ، شرحِ تبادلہ کی شروعات پر روپے کی قیمت میں ۱۸ فی صد کی کمی، دوہری شرح تبادلہ اور پھر متحدہ شرح تبادلہ حتّٰی کہ سکہ کو پوری طرح قابلِ تبدیل بنانا، پانچ سالہ درآمدی و برآمدی پالیسی (۱۹۹۲ء - ۹۷) افراطِ زر کی شرح پر مسلسل ماہانہ نظر رکھنا، افراطِ زر کی روک تھام کے لیے ایک اہم [illegible] طور پر زر کے پھیلاؤ پر کنٹرول مالی تخمینے کے منصوبے اور [illegible] ملکی زرمبادلہ وغیرہ جیسی اقتصادی اصلاحات شامل ہیں۔ جس زور و شور کے ساتھ اقتصادی اصلاحات کی گئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ معیشت کے اس اہم شعبے کی ترقی اور فروغ کا کوئی ذکر نہیں ہے [illegible] جسے ہم زراعت کہتے ہیں۔

زراعت کو تو حصولِ آزادی کے پہلے سے ہی نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں زراعت کو نظرانداز کر کے صنعت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ اس پالیسی میں ترقیاتی پالیسی کی جگہ زراعت کو نظرانداز کر کے [illegible] [illegible] پالیسی [illegible] جاری رہا۔

زراعت کو [illegible] نظرانداز کیے جانے کی وجہ سے [illegible] خستہ حالت کی جانب رہی ہے۔ البتہ اس حالت کا نتیجہ کسی پروگرام یا [illegible] نتیجے کی شکل میں برآمد نہیں ہوا۔ گذشتہ تین برسوں میں زراعت کے فروغ کے لیے [illegible] میں [illegible] نہیں کیے جانے [illegible] ۵ فی صد [illegible] زرعی اصلاحات کے پروگرام کی [illegible] اور اس پر [illegible] سے عمل کیے جانے، زرعی مقاصد کے لیے دیے جانے والے [illegible] کی پالیسی میں [illegible] بالآخر ایک زرعی [illegible] کرنے کے لیے تجاویز پیش کی ہیں جن کا اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

اُمّید کی کرن

زراعت کے سلسلے میں اس بات میں کئی ... حال کے باوجود امید کی کرن دکھائی پڑتی ہے۔ ایک اہم بات تو یہ ہے کہ حکومت زراعت کے سلسلہ میں تمام تفصیل جمع کر رہی ہے جیسے زراعت سے متعلق قومی کمیٹی کے پروگراموں اور پالیسیوں میں استعمال کیا جائے گا۔ اس اعداد و شمار اور تفصیل کی بدولت ہی اس بات کا یقین کیا جا سکتا کہ زمینی قطعات پر عملی طور پر کون کاشت کرتا ہے اور اس کا حقیقی مالک کون ہے۔ اب تک زراعت سے متعلق تمام ترقیاتی پروگراموں میں مزارعوں کی بجائے مالکان کو ہی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ تفصیل جمع کرنے کے اس عمل کے نتیجے میں چھوٹے، معمولی اور بہت چھوٹے کسانوں پر زمینی قطعات کے سلسلہ میں ٹھوس اور واضح معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ بہت چھوٹے زرعی قطعات کا اوسط جن پر مزارعے کام کرتے ہیں ۵۸ فی صدی ہے جو زیر کاشت علاقے کا ۱۶ فی صد ہے۔ بڑے اور اوسط قسم کے زمینی قطعات پر محض دس فی صد مالکان کاشت کرتے ہیں جو مجموعی زیر کاشت علاقے کا ۴۸٫۷ فی صد ہوتا ہے۔

آٹھویں منصوبے میں جو مقاصد رکھے گئے ان میں سے ایک ترقی اور زراعت میں تنوع لانا ہے تاکہ علاقے کے معاملے میں خود کفالت حاصل کی جا سکے اور فاضل اناج برآمد کیا جا سکے۔ اسی آٹھویں منصوبے کے آغاز سے پہلے ہی جن کی شروعات ابھی ابھی رہی سالانہ منصوبوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔

۱۹۹۱-۹۲ء میں جنوب مغربی مانسون کے ٹھیک طریقے پر نہ ہونے کی وجہ سے اناج کی پیداوار کم ہو کر ۱۷۰ ملین ٹن رہ گئی جبکہ اس سے سابقہ سال میں یہ پیداوار ۱۷۶٫۴ ملین ٹن تھی۔ اس کی وجہ سے صرف چاول اور گیہوں کی پیداوار متاثر ہوئی بلکہ موٹے اناجوں اور دالوں کی پیداوار میں بھی کمی آئی۔ تلہن کی پیداوار بھی کم رہی لیکن گنے اور کپاس کی اچھی پیداوار رہی۔

> ... کے ساتھ اقتصادی اصلاحات کی گئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ معیشت کے اس اہم شعبے کی ترقی اور ثروت کا کوئی ذکر نہیں ہے جب ہم زراعت کی بات کرتے ہیں۔

زرعی پیداوار میں کمی ہوئی یا اضافہ ہوا یہ سوال ابھی تک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اس میں دو سوال خاص اہمیت رکھتے ہیں پہلا تو یہ کہ سبز انقلاب کی اصلی مدت کو کسی بھی ... اس بات پر تو اتفاق رائے ہے کہ ۶۸-۱۹۶۷ء سبز انقلاب کے بعد کی شروعات ہے کیوں کہ سبز انقلاب آنے سے پہلے کے دو سال خشک سالی میں گزر رہے تھے۔ یہ بھی رائے پائی جاتی ہے کہ سبز انقلاب کے بعد کے آٹھ برسوں کا شمار کیا جانا چاہیئے۔ جن میں خشک سالی والے سال بھی شامل ہیں۔ زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کی نشاندہی کے لیے سبز انقلاب کے بعد ۷۰-۱۹۶۹ء کے حالات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور یہ پتہ لگانے کی غرض سے کہ پیداوار میں کمی کا رجحان بدل گیا ہے۔ جامع اور تفصیلی چھان بین کی ضرورت ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پیداوار میں اضافے کی غرض سے کس طرح کے اور کیسے کیسے طریقے اپنائے گئے۔ یہ نظریہ عام طور پر پایا جاتا ہے کہ جو ٹکنالوجی اور نظام اپنایا گیا اس کے نتیجے میں محض گیہوں کی پیداوار کا اضافہ ہوا۔ چاول کی پیداوار میں حال ہی میں اضافہ ہونا شروع ہوا ہے اور ۱۹۰۰ء کے دہے کے اوسط سے مقابلہ کیا جائے تو یہ اضافہ صرف ۳٫۲ فی صد ہے۔ جب کہ گیہوں کی پیداوار میں ۵ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔ یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ چاول اور گیہوں کی فصلوں کو زیادہ سے زیادہ ملا جلا کر اُگایا جائے۔

۹۴-۱۹۹۳ء کا بجٹ

۹۴-۱۹۹۳ء کا بجٹ کسی حد تک حوصلہ افزا ہے اس کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں زراعت کی ترقی کے لیے حقیقی اقدام کیے گئے ہیں جب کہ نئے اقتصادی اصلاحات کے پروگرام میں اسے یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

زرعی اور دیہی ترقی سے متعلق قومی بنک کی بدولت زراعت کو تقویت ملی ہے جب کہ ریزرو بنک آف انڈیا نے ربیع کے موسم کے دوران زرعی مقاصد کے لیے چھوٹی مدت کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپے کے اضافہ شدہ قرضے جاری کیے ہیں۔

ایک اور متعلقہ پہلو یہ ہے کہ دیہی ترقی پر از سر نو زور دیا گیا ہے اور اس مد پر مخصوص رقم کو بڑھا کر ۵۰۰۰ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے

جو گزشتہ سال کے مقابلے میں ۶ فی صد زیادہ ہے۔

اپریل ۱۹۹۳ء کے وسط میں زراعت سے متعلق قومی کانفرنس نے ۹۳ - ۱۹۹۲ء میں اناج کی پیداوار کا نشانہ ۱۸۰ ملین ٹن رکھا گیا ہے جس میں موٹے اناجوں کی پیداوار میں اضافہ بھی شامل ہے۔ کانفرنس نے ان موٹے اناجوں کی پیداوار کا نشانہ بڑھا کر ۳۰،۵ ملین ٹن کر دیا ہے جب کہ پہلے یہ ۲۸،۵ ملین ٹن تھا اناجوں کی پیداوار میں اضافے کا نشانہ ۴،۶ فی صد اور غیر اجناس میں اضافے کا نشانہ ۲،۹ رکھا گیا ہے۔ اس طرح مجموعی زرعی پیداوار میں ۳،۹ فی صد اضافہ ہوگا۔ زرعی مال کی برآمد میں ۹۳ - ۱۹۹۲ء میں سابقہ سال کے مقابلے میں ۲۲ فی صد کا اضافہ ہوا جس میں زیادہ تر چاول، تلہن اور مسالے وغیرہ شامل ہیں۔ ڈبہ بند پھلوں اور سمندری مصنوعات کی برآمد میں مزید اضافے کے لیے ٹھوس کوششیں کی جانے کی ضرورت ہے۔

> زرعی اور دیہی ترقی سے متعلق ترقی سے ملک کی معیشت زراعت کو تقویت ملی ہے جب کہ ریزرو بینک آف انڈیا نے ربیع کے موسم کے دوران زرعی مقاصد کے لیے چھوٹی مدت کے لیے ۸۰۰ کروڑ روپے کے اضافی قرضہ جات ...

سرکاری خرید کے امکانات

ربیع کی فصل کے ابتدائی پانچ ہفتوں اپریل سے جون تک سرکاری طور پر گیہوں کی جتنی خریداری کی گئی وہ مقدار گزشتہ پورے موسم میں خریدی گئی مقدار سے زیادہ ہے۔ اپریل میں ۴۱،۵ ملین ٹن، اپریل ۱۹۹۲ء میں ۳،۰۹ ملین ٹن اور اپریل ۱۹۹۱ء میں ۲،۷۹ ملین ٹن گیہوں خریدا گیا۔ لہذا اس سال ربیع کی فصل کا ۱۰ ملین ٹن کا نشانہ پورا کر لیا جائے گا یا پھر یہ نشانے سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں سرکاری طور پر گیہوں کی اس خرید کی وجہ حکومت کی پالیسی ہے جس کے نتیجے میں یہ قیمت گزشتہ سال کے مقابلے میں ۵۵ روپے فی کوئنٹل زیادہ ہو گئی ہے۔ ویسے تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن یہ ادائیگی زرعی اضافے کا ذریعہ نہیں

یہاں ... اور یہاں ذرا ... بڑھانے میں ... کر رہی ہے کیوں کہ ... قیمت ہے وہ حکومت کی اعلان ... سے کم ہے۔ البتہ زراعت کو ... ضرورت ہے وہ سرمایہ میں اضافہ اور ... میں کی کارکردگی کو بڑھانا ہے تاکہ زراعت کو ترقی دی جا سکے اور اناج کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ منصوبے کے ہر سال میں زراعت کے لیے رقم میں اضافہ ضرور ہو رہا ہے لیکن عملی اعتبار سے اس مد پر جو سرمایہ کاری کی جا رہی ہے اس میں کمی رہتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجموعی وسائل کو زراعت کے لیے کس طرح بروئے کار لایا جائے سکے۔ دوسری طرف زراعت پر سرمایہ کاری میں کمی آ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی، آبپاشی، کیمیاوی کھاد اور قرضے وغیرہ پر رعایات کے نام پر ہر سال اخراجات کیے جا رہے

ہیں۔ ترجیحوں کو ... کیے جانے اور زرعی ترجیحوں کی کم وصولی بھی زراعت کے فروغ میں ایک رکاوٹ بنی رہتی ہے۔ لہذا فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ رعایات پر خرچ کی جانے والی رقم میں کمی کی جائے اور اس طرح جو رقم بچے گی اسے آبپاشی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جس کے نتیجے میں پیداوار میں عملی اضافہ ہوگا۔

تقسیم کے اثرات

ایسے دو نکتے بھی ہیں جو زرعی ترقی کی بابت ہمارے تقسیم کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پہلا یہ ... کئی عنصر تو ... زرعی ... سے تعلق ... ملک ...

... ان کے کسان وہاں کی حکومت جو رعایات دیتی ہے اور ان کے کاشتکار کو وہاں کی پیداوار سے جو استثنیٰ ملتا ہے اس کے مقابلے میں ہندوستان کے کسان کو دی جانے والی رعایات بہت کم ہیں۔ تاہم عالمی بینک نے جس پریشان کن پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری رعایات کا ایک بڑا حصہ زرعی اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں اور امیر کسانوں کو پہنچتا ہے۔ اس طرح یہ غریبی دور کرنے میں بھی کوئی مددگار یا معاون نہیں ہے۔ مثلاً ۱۰ ... ۱۹ء کے اوسط کے اعتبار سے پنجاب کو ۱۰۲۷ روپے فی ہیکٹیر ملتا ہے جب کہ ملک گیر سطح پر یہ اوسط ۱۱۵ روپے فی ہیکٹیر ہے۔ یہی حال ہریانہ

[illegible] پردیش، تمل ناڈو اور آندھرا پردیش کا ہے جہاں ملک کے دیگر حصوں کے مقابلے میں رعایات سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے [illegible] اور بڑے کسانوں کے پاس آب پاشی، کنوؤں [illegible] کی سہولیات حاصل ہیں [illegible] [illegible] کیمیاوی کھاد بھی استعمال کر سکتے ہیں [illegible] رعایات سے [illegible] فائدہ اٹھاتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔

[illegible] اگرچہ [illegible] اناج کی پیداوار [illegible] کے مقابلے میں ہم نے [illegible] حاصل کر لی ہے لیکن ہم اپنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے تعداد میں خوراک مہیا نہیں کر پا رہے ہیں [illegible] میں اناج کی مانگ زیادہ ہوتی [illegible] کی وجہ آبادی کے ایک [illegible] کی قوت خرید کا محدود ہونا ہے۔ علاوہ ازیں تقسیم میں عدم توازن بھی پایا جاتا ہے۔ بارش سے سینچائی کیے جانے والے ایک وسیع علاقے (۷۰ فیصد) کو نظر انداز کرنے کے علاوہ [illegible] زیادہ پیداوار [illegible] والی ۲۵ ریاستوں میں ۹۲ - ۱۹۸۹ء کے تین سال کے دوران [illegible] عدم توازن دیکھنے میں آیا۔ ان میں سے کئی ریاستیں تو ایسی تھیں جہاں پیداوار قومی اوسط سے کافی کم تھی۔ ان میں سے سات ریاستوں میں ۸۰ کی دہائی کے مقابلے [illegible] ۹۰ کی دہائی میں پیداوار میں خاصی کمی آئی ہے۔ تمل ناڈو میں

(۲۶۰-) آندھرا پردیش میں (۳۰۰-) مہاراشٹر میں (۱۲۰۵-) کرناٹک میں (۱۴-) مغربی بنگال میں (۱۵۰۸) [illegible] کیرالا اور گجرات کا تو اس سے بھی برا حال رہا، ان کی پیداوار [illegible] (۲۰۰۳۱) اور (۱۹۰۱-۲) کمی آئی [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] ترقی کا قومی سطح [illegible] ایک سال [illegible] [illegible] اس سے [illegible] [illegible] [illegible] متعلق پالیسیوں اور پروگراموں میں ان سات ریاستوں [illegible] [illegible] دی جانی چاہیے۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۹۰ - ۱۹۸۹ء [illegible] ۱۳۵ [illegible] [illegible] [illegible] اضافہ ہوا ہے۔

[illegible] ریاستوں کے کل [illegible] مطابق [illegible] ریاستوں میں [illegible] پیداوار حاصل کی جائے۔

[illegible] علاقوں [illegible] [illegible] جہاں علاقائی عدم توازن کو دور کرنے کی غرض سے خصوصی پروگرام [illegible] کیے [illegible] اور [illegible] [illegible] کیے جا سکتے ہیں۔ ان پروگراموں [illegible] [illegible] کہ [illegible] [illegible] ہوا ہے جیسے کہ مشرقی ہندوستان جہاں ترقی کی رفتار بہت کم تھی اور اس علاقہ میں آب پاشی کے بعض خصوصی تکنیکی مسائل کی وجہ سے آب پاشی پر [illegible] [illegible] کم

اخراجات کیے گئے۔ جنوبی ہندوستان میں اسی کی دہائی میں پیداوار میں بالکل انجماد آگیا تھا۔ آندھرا پردیش کو چھوڑ کر تمام جنوبی اور مغربی ریاستوں کی فصلوں کی پیداوار میں کمی آئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی کی دہائی میں جنوبی اور مغربی ہندوستان کی فصلوں کی پیداوار میں کمی کی وجوہات کا پتہ لگایا جائے۔ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ آئندہ یہ صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔

مستقبل کے امکانات

زرعی پالیسیوں اور مسلسل بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری کا مقصد ملک کے اندر زرعی پیداوار میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اناج کی کھپت میں بہتری لائی جا سکے۔ ساتھ ہی پالیسیوں کا مقصد زرعی مصنوعات کی برآمد میں خاص طور سے سمندر سے حاصل ہونے والے مال اور دوسری متعلقہ چیزوں کی برآمد میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ برآمدات زیادہ کیا جا سکے اور صنعتی برآمدات میں کمی اور اعتماد کا [illegible] کیا جا سکے۔

لے زرعی علاقوں کو جہاں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے خصوصی اہمیت دی جائے اور ان کا خاص خیال رکھا جائے۔

منصوبہ بندی کمیشن نے آئندہ کے لیے اناج کی پیداوار کا جو تخمینہ رکھا ہے اُس کے مطابق ۱۹۹۷ء میں اناج کی ۲۰۸

اگرچہ [illegible] اناج کی پیداوار کے مقابلے میں ہم نے خود کفالت حاصل کر لی ہے لیکن ہم اپنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے تعدادِ غذائیت سے خوراک مہیا نہیں کر پا رہے ہیں۔

ملین ٹن ۲۰۰۰ء میں ۲۴ ملین ٹن اور ۲۰۰۰ء میں ۲۸۲ ملین ٹن پیداوار ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدی کے باقی برسوں میں اناج کی پیداوار میں ساڑھے تین فی صد سالانہ کا اضافہ ہونا چاہیئے ۔ اگر زرعی قیمتیں ۸۰ء کی دہائی کی طرح عام قیمتوں کی سطح سے زیادہ ہوتی رہی تو اناج کی پیداوار میں ساڑھے تین فی صد کا اضافہ بہ آسانی پورا ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں زرعی مال کی قیمت میں ۹۰ء کی دہائی میں چار فی صد کا اضافہ ہوگا۔ بہ الفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا

بھی مسائل درپیش ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زراعت کی ترقی کے لئے طویل مدتی اقتصادی اقدامات کیے جائیں اگرچہ یہ کہ اس سلسلے میں کسی حد تک مقاصد میں تضاد پایا جاتا ہے

البتہ پیداواری صلاحیت، سرمایہ کاری اور پیداوار بڑھانے سے ہی دو عدم توازن اور ان دو مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا جن کا پہلے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اسے درست کرنے کے لئے اصلاحات آراضی کے حصولی پروگرام کو ازسرِنو ترتیب

اقتصادی ترقی کا پاپلٹ، روایت اور جدیدیت میں اہم ربط

جہاں تک دوسرے ان ادارہ کا تعلق ہے وہاں جس قسم کا تضاد پایا جاتا ہے اور جو روایات و جدیدیت کے تعلق کی پیداوار ہے۔ ہمارا ایک قدیم ترین معاشرہ ہے جہاں خواص اپنے حقوق کے لئے مدد رہا ہیں۔ اس سے ثانی کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی بات درج فہرست ذاتوں اور قبائلی افراد کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اگرچہ ان طبقوں کو آئین میں مساوی حقوق دیے [illegible]

پالیسیوں کا مقصد زرعی مصنوعات کی درآمد کے خاص طور سے سمندر سے حاصل ہونے والے مال اور دوسری متعلق چیزوں کی برآمد میں اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ درآمدی ضرورت پورا کیا جا سکے اور صنعتی برآمدات میں کمی سے اور اضافہ کیا جا سکے۔

ہے کہ صدی کے آخر تک موٹے اناجوں کی منڈی میں خسارے کو دیکھتے ہوئے مسلسل نگرانی اور چوکسی کی ضرورت ہوگی۔

یہی راستہ دالوں اور تلہنوں کی پیداوار کے سلسلہ میں قدرے پُرزور طریقے پر اپنانا ہوگا۔ آٹھویں منصوبے کے تخمینے کے مطابق ۱۹۹۷ء میں ۲۴ ملین ٹن اور ۲۰۰۰ء میں ۲۷ ملین ٹن پیداوار کا نشانہ رکھا گیا ہے اس کے مطابق شرح ترقی میں ۵ فیصد سالانہ کا اضافہ ہوگا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ موٹے اناج والے کچھ علاقوں میں تلہن گنّے، اور کپاس جیسی نقدی فصلوں کی پیداوار کی جا رہی ہے، اگر ایسا کیا جا رہا ہے تو یہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ خود کفالت کے اعتبار سے پیداوار بڑھانے اور مساوات کے اعتبار سے فلاحی مقاصد کے حصول میں

دیا ہوگا تاکہ یہ مبادا ایک جزو بن جائے جب۔

نہیں ہے پیداوار میں کمی یعنی کا انحصار کھیت کے سائز پر ہوتا ہے اور اصلاحات آراضی پر مکمل طور پر عمل کرنا مشکل ہے کیوں کہ معمولی دیہات چھوٹے اور متوسط درجے کے کسان کو بعض رعایات دی ہوتی ہیں اس کی وجہ سے ان کسانوں کے فوائد میں کچھ کمی آتی ہے تاہم پیداوار اور نظریات کی یکسانیت اس کی متقاضی ہے اگر زراعت کے سلسلے میں ان مبادی تبدیلیوں پر تیزی سے عمل نہ کیا گیا تو ہمارے نظامِ تقسیم کے جو اثرات زراعت پر مرتب ہوتے ہیں وہ دور نہیں ہوں گے بلکہ حالت مزید خراب ہو سکتی ہے۔

جاتا ہے۔ لیکن جب ہم ملازمت بعض دقیانوسیت اور رجعت پسند قوتوں کو دیکھتے ہیں تو بہت مایوسی کی تصویر سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف عوام خاص طور پر نوجوانوں، درج فہرست ذاتوں اور خواتین میں مساوی حقوق جمہوریت اور ایک بہتر معاشرہ بنانے کے لیے جو بیداری پیدا ہو رہی ہے تمام اس کو فروغ دینا چاہئے اور یہی ایک کم تشفی ہے۔

پروفیسر جی۔ ایس بھلہ

زرعی کایا پلٹ : روایت اور جدیدیت میں باہم ربط

مصنف نے ملک کے زرعی انقلاب پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حقیقی کایا پلٹ حصولِ آزادی کے بعد ہی ہوئی جب کہ مجموعی طور پر کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے۔ ان اقدامات میں اصلاحاتِ اراضی، جدید ٹکنالوجی اور آب پاشی کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری اور کسانوں کے لیے قیمتوں کی ایک موافقانہ [illegible] بنانا شامل ہے۔

ہندوستان ایک قدیم روایتی ملک ہے جہاں صدیوں سے [illegible] ہے۔ اصلاحات کے پروگرام پر عمل کرتے وقت قدیم رسم و رواج اور روایات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ان اصلاحات کو زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ روایتی ہندوستان کو عہدِ وسطیٰ کے ان مختلف حملوں سے اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا نقصان انگریزوں نے پہنچایا۔ انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کے بعد ہندوستان کو خاص طور پر نقصان پہنچا۔ سامراجیت کی ان کوششوں سے نہ صرف روایتی ہندوستان بلکہ ہندوستانی سیاسی معیشت کی اساس کو سخت نقصان پہنچا۔ انگریزوں کے تقریباً دو صدی کے دورِ حکومت میں دور رس تبدیلیاں کی گئیں جن میں سے بعض نے حالات کو مزید خراب کر دیا۔ اگرچہ غیر ارادی طور پر جدید سائنس کو ہندوستان لائے تاکہ جدیدیت کا مکمل [illegible] کیا جا سکے جس سے انسانی اقدار متاثر ہوئیں۔ جدید کایا پلٹ کے راستے کا دوسرا اہم موڑ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے آزاد ہونے پر آیا۔ زرعی ڈھانچے اور پیداوار سے متعلق ٹکنالوجی وغیرہ میں حصولِ آزادی کے بعد سے تبدیلیاں آتی رہی ہیں اگرچہ ملک کے کچھ حصوں میں اب بھی جاگیرداری نظام موجود ہے۔ زرعی کایا پلٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت ہندوستان روایت اور جدیدیت کے عبوری دور سے گزر رہا ہے۔

اس مقالے میں ان تبدیلیوں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے تاہم اس میں زرعی کایا پلٹ اور جدیدیت اور روایت کے باہم ربط پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ہندوستان کے روایتی کاشت کار معاشرے کی اہم خصوصیات بیان کی گئی ہیں جب کہ دوسرے حصے میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں زرعی ڈھانچے میں کی گئی تبدیلیوں اور تیسرے حصے میں حصولِ آزادی کے بعد زراعت کے میدان میں انقلاب لانے اور جدیدیت اور روایت کے درمیان آپسی تعلق پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے حصے میں پورے مضمون کا لب لباب پیش کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل

اسکالر ہندوستان کے کاشت کار معاشرے اور ہندوستانی دیہات پر بحث و مباحثہ کرتے رہے ہیں۔ البتہ اس مضمون

کا مقصد اس بات کی چھان بین کرنا نہیں ہے کہ مارکس کے مطابق ایشیا کی پیداوار کا کیا طریقہ اور وہاں کے گاؤں کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ اور نہ ہی اس بات کی تشریح کرنا ہے کہ عہد وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام کیا تھا اور اب کیا ہے۔ اس مضمون کا اصل مقصد ملک میں انگریزوں کے آنے سے پہلے عہد وسطیٰ کے کاشت کار معاشرے کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالنا ہے۔ اس حصے کو بھی پیداوار کی ٹکنالوجی اور پیداوار کے تعلق، جسے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔

پیداوار کی ٹکنالوجی

(الف) عہد وسطیٰ کی ٹکنالوجی: عہد وسطیٰ کی ہندوستانی زرعی ٹکنالوجی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اُس وقت ٹکنالوجی کا معیار کم تھا۔

ہندوستان کے کاشت کاروں نے صدیوں کے تجربے کے بعد کھیتی باڑی کا ایسا نظام اور ایسی مخصوص ٹکنالوجی وضع کی جو ملک کی زرعی آب و ہوا کے عین مطابق تھی۔ جب کہ وہ بارانی کھیتی والے علاقوں میں موٹے اناج اور گیہوں جیسی فصلوں کی کاشت کرتے تھے اور دریاؤں کی وادی پر ساحلی علاقوں میں دھان اور ایسی فصلیں اگاتے تھے جن میں پانی کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کسانوں نے سیلاب اور خشک سالی دونوں سے ہی نمٹنے کے لیے اپنا خالص ہندوستانی طریقہ وضع کیا۔ ان سب اقدامات کے باوجود پیداوار سے متعلق ٹکنالوجی ہزاروں سال تک جوں کی توں رہی۔ مارکس کے مطابق ٹکنالوجی میں انجماد کی سب سے زیادہ اہم وجہ دیہی معیشت کا خود کفیل ہونا تھا۔ خود کفیل گاؤں دیہات تھے اور حکمرانوں نے ماحول کی تبدیلی کے باوجود یہ گاؤں خود کفیل ہی رہے۔

(ب) زمین کی زرخیزی اور آبادی کا دباؤ۔

ہندوستان مکمل طور سے ایشیائی ایک خاص بات یہ ہے کہ علاقے کی ٹکنالوجی اور زرخیزی سے متعلق علاقے کی آبادی میں ایک توازن پایا جاتا ہے۔

زیادہ پیداوار دینے والے علاقوں میں آبادی کا دباؤ بھی زیادہ ہے۔ دریاؤں کی وادی اور ساحل کے علاقوں میں یہ خصوصیت خاص طور سے پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف ملک کے شمالی مغربی کم زرخیز علاقوں میں آبادی کا دباؤ کم ہے۔ آبادی کا یہ توازن قدرتی آفات اور نقل مکانی کا نتیجہ

اسی طرح تقریباً ملک بھر میں اوسط کارکردگی بھی ایک تھی ہے۔ اتنی کاوا کے مطابق دباؤ زیادہ پیداوار دینے

اسی طرح زیادہ پیداوار والی آراضی کا دباؤ [illegible]

> ہندوستان کے کاشت کاروں نے صدیوں کے تجربے کے بعد کھیتی باڑی کا ایسا نظام اور ایسی مخصوص ٹکنالوجی وضع کی جو ملک کی زرعی آب و ہوا کے عین مطابق تھی۔

زیادہ آبادی سے برابر ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی ٹکنالوجی کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کی آبادی اور آراضی کا آپس میں تال میل پایا جاتا ہے۔ رکاوٹوں اور ٹکنالوجی کے انجماد کی وجہ سے پیداوار میں تیزی سے اضافہ نہیں ہوتا اسی طرح آبادی میں بھی محدود اضافہ ہوتا ہے۔ قدرتی آفات کی وجہ سے بھی توازن پیدا ہوتا رہتا ہے۔ سیلاب اور [illegible] جیسے [illegible] تعداد میں [illegible] القصہ اصل [illegible] حالت میں [illegible] سے [illegible] اس تسلیم [illegible] ہیں [illegible] علاقے [illegible] اس طرح [illegible] پیداوار کی [illegible] کرتی ہے اور اس پر آبادی کا [illegible] کے [illegible] کی [illegible] ان ہی حالات پیدا [illegible] تھا

پیداواری تعلق

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان قدیم طور پر ایک زرعی معیشت تھا جس کی [illegible] بات [illegible] پیداوار [illegible] رعیت [illegible] ایک [illegible]

کہ یورپ میں جاگیرداری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ البتہ ہندوستانی دیہی معاشرے پر پیداوار کا ایشیائی ڈھانچہ چھایا ہوا تھا۔ مارکس کے مطابق ہندوستانی دیہی معیشت کی بھی دو اہم خصوصیات تھیں۔ پہلی یہ کہ ملکیت اور زمین و جائیداد کا استعمال اور ذات پات پر مبنی تقسیم محنت جس میں کوئی ردو بدل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کئی اسکالر

نے مارکس کے اس نقطہ نظر کو مسترد کر دیا اور یقین ظاہر کیا اگرچہ ایشیائی نظام یورپ سے بہت مختلف تھا البتہ ہندوستانی زرعی ڈھانچہ بھی مقامی جاگیردارانہ نظام کی ایک شکل تھی۔ زراعت اور پیداوار سے متعلق کے سلسلے میں انگریزوں کے دور سے پہلے جو حالات تھے اور جس پر عام اتفاق رائے تھا ان میں سے کچھ کا مختصراً یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

> پیداوار [illegible] والے علاقوں سے میں [illegible] آبادی کا [illegible] حصہ [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] ادارے اور [illegible] کے [illegible] سے [illegible] محنت [illegible] پائی جاتی ہے

(i) ملکیت آراضی

روایاتی اعتبار سے تمام زمین ریاست کی ملکیت تھی تاہم عملی طور پر کچھ مخصوص ذاتوں کی کاشت تھی جو اس پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ جاگیردارانہ نظام کہلاتا تھا اور جاگیردار کو مالی حقوق حاصل تھے۔ کھیتی باڑی کرنے والوں کو اپنی خالص پیداوار کا حصہ سے ایک تہائی تک مالک کو لگان کے طور پر ادا کرنا ہوتا تھا۔ بعض معاملات میں کھیتی باڑی کرنے والوں کو مراعات نیز لیوی بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ جنگلات اور ایسی آراضی کو جس پر کاشت نہیں ہوتی تھی گاؤں کی مشترکہ املاک مانا جاتا تھا۔ گاؤں کے سبھی رہنے والوں کو جس میں اقتصادی اعتبار سے پسماندہ طبقات بھی شامل ہیں مشترکہ حقوق سے فوائد حاصل تھے۔

اگرچہ زمین کی خرید و فروخت شاذ و نادر ہی ہوتی تھی لیکن نجی املاک کا تصور موجود تھا اور کھیتی باڑی کرنے والوں اصل افراد کے کھیتی باڑی کے تقریباً ایک جیسے طریقے تھے لیکن ساری زمین پر مشترکہ طور پر کاشت نہیں کی جاتی تھی۔

(ii) زراعت اور دست کاری

ہندوستانی دیہی معاشرے میں دست کاریاں محنت کش طبقے کی آمدنی کا معاون ذریعہ ہوتی ہیں۔ یہ دست کاریاں ان طبقوں کو [illegible] مالی ضرورت [illegible] رکھتی ہیں۔ یہ دست کاریاں گاؤں میں کسی حد تک خود کفالت رکھنے میں بھی مدد کرتی ہیں

(iii) ناقابلِ تقسیم محنت

ہندوستانی دیہی معاشرہ میں تقسیم محنت کا مطلب ہے اور اسے ناقابلِ تبدیل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تقسیم محنت نیچی ذات کے طبقوں پر مسلط ہے جنھیں اکثر گندے سے گندے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر غیر ہندو یعنی مسلمانوں یا عیسائیوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد تقسیم محنت کا اصول یعنی نیچی ذات والوں پر لاگو ہوتا ہے۔ ذات پات کے نظام سے ادنیٰ طبقے کے افراد کو وقار و عظمت اور حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اور چھوت چھات سے انتہائی اقتصادی اور سماجی استحصال کو بڑھاوا ملتا ہے۔ ذات پات کے اس نظام کی وجہ سے ہندوستانی گاؤں ظلم و ستم کے معاشرے بنتے جا رہے ہیں۔

> انگریزوں کے راج سے پہلے ہندوستان قطعی طور پر ایک زرعی معیشت تھا جس کی معاون دست کاری، صنعت اور تجارت [illegible] سرگرمیاں براہ راست زراعت سے وابستہ تھیں۔

کاشت کرنے والے بے زمین مزدوروں (جو کہ عام طور پر درج فہرست ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں) اور لوہار، نائی اور برہمن وغیرہ کو جو ادائیگی کرتے ہیں وہ ججمانی نظام پر مبنی ہے۔ جو ادائیگی کی جاتی ہے وہ مال کی شکل میں کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ پیداوار کا کچھ حصہ دے دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کسی حد تک گاؤوں کے رہنے والوں کی خوش حالی کا انحصار فصل کے اچھے یا خراب ہونے پر ہے۔ البتہ تقسیم بالکل غیر مساویانہ ہوتی ہے۔ یہ بات بھی باعث توجہ ہے کہ مالکان یعنی تعلق دار یا صوبے دار یا شاہ یا درباری ایک چوتھائی یا آدھا حصہ لگان کے طور پر لے جاتے ہیں۔ کسی بھی معیار سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملکیت لگان کے نام پر بہت کچھ لے جاتی ہے

استحصال دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک تو کھیتی کرنے والوں کا اُس وقت براہِ راست استحصال ہوتا ہے جب پیداوار کا ایک بڑا حصہ مملکت اور اس کے ایجنٹ لے جاتے ہیں۔ دوسری سطح پر اونچی ذات والے نیچی ذات والوں خاص طور پر بے زمین مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔

حصہ دوم

برطانوی دور: تمام غیر ملکی حکمرانوں کے

مفاد میں ہندوستان کی معیشت اور معاشرے پر انگریزوں نے سب سے زیادہ اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انگریز اس وقت ہندوستان آئے جب انگلینڈ میں صنعتی انقلاب شروع ہونے والا تھا۔ ہندوستان پر حملہ کرنے والے دوسرے حکمرانوں کی طرح انگریز ہندوستان میں رہنے اور اسے اپنا دوسرا وطن بنانے کے لیے نہیں آئے تھے وہ یہاں راج کرنے، استحصال کرنے اور جتنی ممکن ہو دولت حاصل کرنے آئے تھے۔

آر۔ پی۔ دت کے مطابق انگریزوں نے ہندوستانی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اپنائے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے لوٹ مار، آب پاشی اور تعمیراتی کام کو نظرانداز کرنا جس پر سابقہ حکومتوں میں برسوں سے عمل ہوتا رہا تھا، نظامِ اراضی کی شروعات جس کے تحت نجی املاک کی فروخت کی اجازت دی گئی اور زراعت کو تجارت بنا کر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی، پہلے ہندوستان میں اور پھر یورپ میں ہندوستانی مال کی درآمد پر پابندی یا بھاری محصولات جیسے اقدامات کرکے انگریزوں نے ہندوستانی معیشت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ہندوستانی معیشت کی اصل تباہی کی شروعات ۱۸۱۳ء کے بعد انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے آغاز سے ہوئی اور اس وقت ہندوستانی معیشت کو سامراج کی معیشت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے ہندوستان کو خام مال برآمد کرنے والا ملک۔ اور تیار مال کی منڈی بنا دیا گیا۔

برطانوی کارخانہ داروں کے سستے مال کا حملہ ہندوستانی کارخانہ داروں نے ہندوستانی دست کاری اور خاص طور پر ہتھ کرگھا، ڈھاکہ کی دست کاریوں نیز دوسرے ہنروں کے لیے یہ نہایت تباہ کن ثابت ہوا۔ شہری مراکز جو کارخانہ داروں اور دست کاروں پر انحصار کرتے تھے، دیوالیہ ہو گئے پھر پارچہ بافوں کو دیہات جانا پڑا جن کی وجہ سے صنعت اور زراعت کا تعلق ٹوٹ گیا اور سرزمینِ ہند پر

ہندوستانی معیشت کی اصل تباہی کی شروعات ۱۸۱۳ء کے بعد انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے آغاز سے ہوئی اور اس وقت ہندوستانی معیشت کو سامراج کی معیشت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے ہند...
اور تیار مال...

جو ضروری دباؤ بڑھ گیا۔

نیا رول

خام مال کے برآمدی شعبے میں تبدیلی لائے بغیر خواہ وہ زراعت ہو، کان کنی یا کوئی دوسری صنعت ایک نوآبادی کی معیشت کو ایک بڑی معیشت سے ملانا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام صرف سائنس اور ٹکنالوجی کو بروئے کار لا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ نوآبادی کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے سڑکوں، ریلوے اور آبپاشی نظام کو فروغ دینا ضروری ہے۔

مارکس کا خیال تھا مختلف میدانوں میں جو نیا سائنسی طریقہ اپنایا گیا ہے اس سے ہندوستان میں تاریخی تبدیلی آ جائے گی۔ اس سے نہ صرف ہندکی معیشت کا بنیادی تانا بانا تباہ ہو گا بلکہ قدیم اور پرانے طریقوں و روایات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سب کا لازمی نتیجہ سائنسی نظریے اور صنعتی بنیاد کی شکل میں نمودار ہو گا۔ مارکس کے الفاظ میں انگلینڈ نے کیسے بھی حالات رہے ہوں تاہم یہ انقلاب لانے میں تاریخ کا ایک بے ہوش ذریعہ ثابت ہوا۔

بعض دوسرے مکتبِ خیال کے لوگ مارکس کے اس نظریہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں ان کے مطابق ایک نیا رول ادا کرنے کی صلاحیت ...

... نے بہت سے ڈھانچے دانستہ طور پر تباہ کیے ہیں البتہ ان کے بعض مثبت اقدام کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا

برطانوی دورِ حکومت میں بعض اہم تبدیلیوں کے زراعت پر پڑنے والے براہِ راست اثرات پر ہم دو مدوں میں بحث کر سکتے ہیں۔

(۱) ادارہ جاتی ڈھانچے میں تبدیلی اور
(۲) تکنیکی اقدامات۔ زراعت کا درجہ بڑھانا۔

ادارہ جاتی ڈھانچے میں تبدیلی

انگریزوں کے زمانے میں اراضی کے سلسلے میں تین طریقوں پر عمل ہو رہا تھا۔ یہ

تھے۔ زمین داری، رعیت واڑی اور محل واڑی۔ انگریزوں نے ۱۷۹۳ میں بنگال بہار، اڑیسہ میں نیا نظام نافذ کیا اور نئے زمیندار اسلام شاہ نے رائج کیا۔ زمینداری نظام میں مالکان اراضی کو پیداوار میں حصہ لگان وصول کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا تھا کہ مالکان کی زمین پر کاشت زراعت کھیتی باڑی کے طریقوں کو بدل دیا جائے گی اور زراعت میں ایک نئی جان ڈالے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مالکان کاشت کرنے والوں سے لگان کی شکل میں موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں اور محنت کی بہ نسبت ان مزارعوں کی بدولت انہی کی وجہ سے مالکان حق ملکیت حاصل کرتے ہیں اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک مزارعہ دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو کھیتی باڑی کے لیے دیتا رہتا تھا۔ مزارعوں کے کوئی واضح حقوق نہیں ہیں۔ جب انگریز برسر اقتدار آئے تو انھوں نے باقی ہندوستان میں کہیں بھی یہ طریقہ شروع نہیں کیا۔ اس کی جائے جنوبی اور شمال مغربی ہندوستان میں جاری نظاموں کو برقرار رکھا گیا۔ رعیت واڑی اور محل واڑی نظاموں کے تحت گاؤں کی کاشت کار برادری کو براہ راست حقوق آراضی حاصل تھے اور نظریاتی اعتبار سے بچولیوں کو کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود آراضی بڑے پیمانے پر ایک شخص سے دوسرے شخص کو پٹہ پر دی جاتی تھیں اور قرضوں نیز دوسری وجوہات کی بنا پر یہ زمین ایسے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تھی جو کاشت کار نہیں تھے۔ راجوں مہاراجوں کی ریاستوں میں بھی مالکان کا طریقہ رائج تھا۔ آراضی پٹہ پر بھی دی جاتی تھی۔ انگریزوں نے آراضی کے تعلق سے سیاسی وجوہ کی بنا پر نہایت قدیم طریقے کو جاری رکھا۔ بعض خود غرض افراد آراضی میں زیادہ دلچسپی لینے لگے اور دراصل انگریزوں کے اقتدار کو زمین سے زبردست طاقت ملی۔ کھیتی باڑی نہ کرنے کے باوجود حق ملکیت مزید حقوق، حق ملکیت میں بے انتہا عدم مساوات اور بڑھتے ہوئے قرضے ملک میں زراعت کے سر اٹھانے میں ناقابل تسخیر رکاوٹ ثابت ہوئے تھے۔

(۲) تکنیکی تبدیلی۔

برطانوی دور حکومت میں جو دوسری تبدیلی آئی اس کا تعلق زرعی پیداوار کی ٹکنالوجی سے ہے۔ سینچائی کے ذریعے ٹکنالوجی کا معیار قدرے بلند کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بار بار کے قحط کی وجہ سے سینچائی سے متعلق ٹکنالوجی میں بہتری لانا ضروری ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے سینچائی کے شعبے میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی اور ۱۹۲۰ء تک پنجاب، سندھ اور اترپردیش میں نہروں کا جال بچھا دیا اور جنوب میں کامیابی کے ساتھ نہروں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۲۴ء تک لگ بھگ ۲۴ فی صدی علاقے میں سینچائی کی جا رہی تھی لیکن ان میں سے زیادہ تر علاقہ شمال مغربی ہندوستان اور جنوب میں واقع تھا۔

ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے جو ایک اور قدم اٹھایا گیا وہ بیسویں صدی کے اوائل میں زرعی تحقیق سے متعلق شاہی کونسل کا قیام تھا۔ بعض زرعی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ عمدہ قسم کے بیجوں اور نئی اقسام کے بتدریج درآمد کرکے تحقیق و ترقی کے سائنسی رنگ روپ دینے کی کوشش کی گئی۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خاطر خواہ سرمایہ کاری نہ ہونے کی وجہ سے کامیابی زیادہ تر تجارتی فصلوں تک محدود رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زرعی میدان میں سائنسی ترقی اور تحقیق کی بنیاد انگریزوں کے دور حکومت میں ہی ڈالی گئی تھی۔

برطانوی دور میں ہندوستانی زراعت اور دیہات کے خودکفیل کردار میں کچھ اہم تبدیلیاں آئیں کیونکہ انگریزوں نے زراعت کو تجارت بنا دیا تھا اور اسے برطانوی معیشت سے وابستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں نہروں کے نظام میں سرمایہ کاری کی وجہ سے یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زراعت کو سائنسی رنگ دینے کی شروعات کی گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے تھے۔

> انگریزوں نے سینچائی کے شعبے میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی اور ۱۹۲۰ء تک پنجاب، سندھ اور اترپردیش میں نہروں کا جال بچھا دیا اور جنوب میں کامیابی کے ساتھ نہروں کا قیام عمل میں آیا۔

کھیتی باڑی کے پرانے طور طریقوں، جاگیردارانہ نظام اور آراضی سے متعلق دوسرے امور کے باعث ان تبدیلیوں سے زرعی میدان میں کوئی خاص جان نہیں پڑی نتیجتاً زراعت کی ترقی مایوس کن رہی۔

سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو مشترکہ قانون پر مبنی وسیع قانونی نظام کے باوجود صدیوں پرانے فرقہ وارانہ تنازعے، ذات پات اور سماجی ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہا اور اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان سب کی وجہ سے دیہی معیشت میں نئے جوش کی کمی رہی۔ یہ آزادی کی قومی جدوجہد ہی تھی جس نے عوام میں انسانی عظمت اور مساوات کے تئیں بیداری پیدا کی۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی کا رول اور خاص طور پر ہریجنوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ان کی کوششیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ قوم پرستی کے جذبے نے بھی ذات، فرقے اور علاقائی انفرادیت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ہندوستانی زرعی ڈھانچہ حصول آزادی کے موقع پر بہت سے مسائل اور رکاوٹوں سے دوچار تھا۔ اس حصے میں حصول آزادی کے بعد ملک میں زراعت کی کایا پلٹ کے لیے لیے گئے اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حصہ سوئم

حصولِ آزادی کے بعد کا دور

حصول آزادی کے بعد ہی ہندوستان میں زرعی کایا پلٹ کے لیے منصوبہ بند طریقے پر کوششیں کی گئیں جن کا مقصد کسانوں کی حالت بہتر بنانا تھا۔

پالیسی سازوں نے زراعت میں اصلاح ... کے لیے دو رخی حکمت عملی اپنائی۔ حکمت عملی میں پہلا عنصر تھا کہ زرعی ترقی میں حائل ادارہ جاتی رکاوٹوں کو دور کرنے کی غرض سے اصلاحاتِ آراضی کا آغاز کیا جائے۔ قومی قیادت نے آزادی کے بعد ملک میں انقلابی اصلاحاتِ آراضی لانے کا

تہیہ کر رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسان قومی تحریک کا ایک حصہ تھے۔ اور انھوں نے اس تحریک کو زبردست طاقت دی۔ قومی پالیسی کا دوسرا عنصر یہ تھا کہ آبپاشی، بجلی اور دیہی ترقی کے دوسرے میدانوں میں زبردست سرمایہ کاری کی گئی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں قیمتوں کے سلسلہ میں نئ ت...

> حصولِ آزادی کے بعد ہی ہندوستان میں زرعی کایا پلٹ کے لیے منصوبہ بند طریقے پر کوششیں کی گئیں جن کا مقصد کسانوں کی حالت بہتر بنانا تھا۔

زرعی پالیسی اپنائی گئی ... کا ایک اہم عنصر تھا۔

اصلاحاتِ آراضی

... کے بعد ملک میں چار قسم کے اصلاحات کے لیے قدم اٹھایا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ۱۹۵۰ء کے وسط میں کی گئیں آراضی سے متعلق اصلاحات ہیں جن کا تعلق کھیتی باڑی کرنے کی صورت میں مالکانہ حقوق کے حاملین اور مزارعوں کے لیے قانون سازی سے تھا۔ سب سے پہلے زمین کی حد بندی سے زمین اور کم زمین رکھنے والوں کے درمیان فاضل زمین کی تقسیم سے متعلق قانون ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء کے وسط میں اور کچھ ہنگامی حالات کے نفاذ کے دوران بھی بیس نکاتی پروگرام کے تحت اسے خاص اہمیت دی گئی۔ اصلاحات ... اراضی کے پروگرام کے

جائزے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو مقاصد طے کئے گئے تھے وہ جزوی طور پر ہی پورے ہو سکے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں دلالوں کا طریقہ ختم کرنے کے سلسلہ میں زمینی اصلاحات کافی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ اس کے تحت لگ بھگ دو کروڑ ... مزارعین راست مملکت کے رابطہ میں آ گئے اور سابقہ دلالوں کو ۶ کروڑ ... لاکھ روپئے معاوضے کے طور پر ادا کیے گئے۔ اس میں تقریباً آدھی رقم پانچویں پنج سالہ منصوبے کے آغاز میں ادا کی گئی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ملک کے ... ریاستوں میں زمینی مالکان نے تقریباً ... کو ... سے ... کر کے خود کھیتی باڑی ... ...

... کسان تحریک کی شدت ... ان سب نا کامیوں کے باوجود ... بالا ریاستوں کے سوا ملک کے بیشتر حصوں میں دلالوں کا طریقہ ختم کرنے کے قانون پر کامیابی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ تبدیلیوں کے جانشینی کے قانون کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مزارعوں کی تعداد میں کافی حد تک کمی آ گئی اور ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں خود کھیتی باڑی کرنا پیداوار کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ کل ہند سطح پر دیکھا جائے تو مزارعوں کے ذریعہ کھیتی والا علاقہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں بیس فی صد اور پھر ۶۱-۱۹۶۰ء میں ... فی صد رہ گیا۔

زمین کی حد بندی سے متعلق قانون

میں خامیوں، ان کے ذمہ دار حکام سے کسانوں کی ساز باز پالیسی سازوں کی قوتِ ارادی میں کمی اور کسان تحریک کی کمزوری کی وجہ سے یہ قانون بڑی طرح ناکام رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی تقسیم برائے نام ہی رہی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

تقسیم اراضی کی رفتار ۱۹۵۰ء کے اوائل میں (۱۹۵۲-۵۴ء) نہایت سست رہی۔ چھوٹے اور بہت چھوٹے کاشتکار جن کے پاس دو ہیکٹیئر سے کم اراضی ہے وہ کھیتی باڑی کے تمام زمینی حصوں کا تقریباً ۲۰ فی صد ہے لیکن اگر عملی اعتبار سے

خود کھیتی باڑی کرنے کے رواج سے پیداوار کا سب سے زیادہ اہم یعنی طریقہ ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی ادارہ جاتی رکاوٹیں دور کر دی گئی ہیں اور زراعت کی ترقی کے لئے سازگار حالات بنائے گئے ہیں۔

(ب) ترقی کی نوعیت

(۱) ہندوستانی زراعت کی ترقی کی تاریخ میں آزادی کے بعد ایک نیا موڑ آیا۔ یہ بات اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی کے بعد زرعی ترقی میں ۲.۶ فی صد سالانہ کے حساب سے مسلسل اضافہ ہوا ہے جب کہ اس صدی کے پہلے نصف میں زرعی

> پٹہ داریوں کے خاتمے کے قانون کا ایک اہم نتیجہ یہ رہا کہ بیچ کے دلالوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب کسان آگے آئے اور ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں خود کھیتی کے ذریعے کاشت کا رجحان ایک اہم ذریعہ بننے لگا۔

دیکھا جائے تو یہ شرح ۵۱.۴ فی صد سے ۸۲-۱۹۸۱ء تک چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کا تناسب بڑھ کر ۷۴.۵ فی صد ہو گیا اگرچہ جس علاقے پر وہ کاشت کر رہے تھے وہ مجموعی علاقے کا ۲۸.۱ فی صد تھا۔ چھوٹے اور معمولی کسانوں اور بے زمین مزدوروں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہندوستان کے زرعی ڈھانچے کے لیے ایک سنگین مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔

مزارعوں کی پٹہ داروں کو ضمانت اور مناسب کرائے کے تعین سے متعلق قانون ماسوائے جموں کشمیر، کیرالہ اور مغربی بنگال کے محض کاغذی قانون رہا۔ عملی اعتبار سے پٹہ داروں کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی لہٰذا مارکیٹ کے عوامل کرایہ داری کا تعین کرتے ہیں۔ ملک کے بیشتر علاقوں میں

ترقی میں اضافہ کی شرح بہت معمولی یعنی ۰.۵ فی صد سالانہ تھی۔ آبادی میں تیزی سے اضافے اور فی کس آمدنی بڑھ جانے کے پیشِ نظر اگرچہ یہ شرحِ اضافہ کافی کم ہے اس کے باوجود سابقہ تاریخی ریکارڈ کے مقابلے میں یہ اہم پیش رفت ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد زرعی ترقی کے لیے جو مختلف پالیسیاں اور حکمتِ عملی مرتب کی گئی اسے دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی مدت یا پہلا حصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء کا ہے۔ اس مدت میں خاص زور ادارہ جاتی تبدیلیوں، زمینی اصلاحات اور آب پاشی کی سہولیات کو توسیع دینے پر دیا گیا۔ اجتماعی ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے زرعی ترقی کے فوائد ملک بھر میں عام کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاہم حاکم اور ملکانِ آراضی کے کمزور ہو جانے کے بعد بڑی تعداد میں آجرین کاشتکاروں کو آب پاشی کے جدید طریقوں سے واقف کرانے کی کوشش کی گئی۔ اسی عرصے کے دوران پیداوار میں اوسطاً ۳.۱۱ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا جب کہ زیرِ کاشت علاقہ بڑھ کر تقریباً ۸.۵ فی صد ہو گیا اور پیداوار میں مجموعی اضافہ ۲.۴ فی صد رہا۔

۶۱ - ۱۹۶۶ء کے بعد سے دوسری مدت میں علاقوں کی جامع ترقی کے پروگرام کے تحت ملک کے چیدہ علاقوں میں پیداوار کے نئے اور جدید طریقے اپنا کر پیداوار بڑھانے پر زیادہ زور دیا گیا۔ اس مدت کے دوران کسانوں کو یہ بتایا گیا کہ زراعت کے لیے ٹکنالوجی کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ ابتداء میں ٹکنالوجی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور زرعی صورتِ حال مزید خراب ہو گئی۔ خاص طور پر ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں۔ اس کی وجہ سے کثیر مقدار میں اناج درآمد کرنا پڑا۔ ۱۹۶۰ء کے وسط میں زراعت کے سلسلے میں نئی حکمتِ عملی مرتب کی گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب سبز انقلاب کی ٹکنالوجی کی کامیابی کے ساتھ متعارف کی گئی۔ اگرچہ یہ ابتداء میں صرف کچھ شمال مغربی ریاستوں میں گیہوں تک محدود رہی تاہم بتدریج اسے نئے نئے علاقوں اور دوسری فصلوں کے لیے بھی بروئے کار لایا گیا۔ نئی حکمتِ عملی کامیاب رہی کیوں کہ آب پاشی اور سائنسی تحقیق میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی تھی۔

علاوہ ازیں ۱۹۶۰ء کے وسط میں زرعی قیمتوں سے متعلق کمیشن کے قیام کے نتیجے میں قیمتوں سے متعلق مثبت پالیسی اپنائی گئی جس سے کاشتکاروں کو بڑے پیمانے پر نئی ٹکنالوجی اپنانے کی ترغیب ملی

۵۰ - ۱۹۴۹ء سے ۸۵ - ۱۹۶۴ء تک زرعی پیداوار میں اضافے کی شرح ۳۱ء۳ فی صد رہی جب کہ ۶۷ - ۱۹۶۶ء سے لے کر ۸۵ - ۱۹۸۴ء کی مدت کے دوران شرح اضافہ ۲ء۶ فی صد رہی۔ اس عرصے کے دوران مجموعی شرحی اضافہ ۵ء۷ فی صد رہی جب کہ شروع میں یہ صرف ۲۴ فیصد تھی۔ اس مدت میں زیر کاشت علاقہ ۵۰ فی صد سے کم ہو کر صرف ۲۵ فی صد رہ گیا۔

> اگرچہ یہ ابتدا میں دونوں کچھ شمال مغربی ریاستوں میں سب کچھ لوں تک محدود رہے تاہم بتدریج اسے نئے علاقوں اور دوسری فصلوں کے بیٹے کھیت بروئے کار لایا گیا۔ نئی حکمت عملی کامیاب رہی کیوں کہ آب پاشی اور سائنسی تحقیقات میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی گئی تھی۔

(۱۱) مختلف علاقوں کی مختلف صورت حال کی وجہ سے زرعی ترقی کا معیار بھی الگ الگ رہا اور اسی وجہ سے شرح ترقی بھی مختلف رہی۔ پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش جیسی شمال مغربی ریاستوں میں شرح ترقی زیادہ رہی۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں آندھرا پردیش میں شرح ترقی کافی اچھی رہی۔ وسطی ریاستوں میں گجرات اور مہاراشٹر نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اپنی کارکردگی کو بہتر بنایا جب کہ راجستھان اور مدھیہ پردیش کی شرح ترقی کم رہی۔ سب سے زیادہ غیر اطمینان بخش کارکردگی تمل ناڈو اور کیرالہ کی رہی۔ ملک کی مشرقی ریاستوں کا حال اچھا نہیں رہا سوائے آسام کے۔ اڑیسہ، بہار اور مغربی بنگال کی کارکردگی نہایت ناقص رہی۔ ان ریاستوں میں آب پاشی اور آبی بندوبست میں کم سرمایہ کاری اور ادارہ جاتی رکاوٹوں کی وجہ سے زرعی ترقی کی رفتار کم رہی۔

اگر ریاست وار جائزہ لیا جائے تو ملک کے مختلف حصوں کے کسانوں کے رہن سہن پر شرح ترقی کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض ریاستوں میں شرح ترقی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ملک کے مشرقی حصے میں دیہی آبادی اور مزدور شرح ترقی سے تجاوز کر گئی [illegible]
جن علاقوں میں شرح اضافہ [illegible]
مزدور ہیں۔ اس سے ظاہر ہے [illegible]
حالات اطمینان بخش نہیں [illegible]
پیمانے پر مفلسی پائی جاتی ہے [illegible]
محتاجگی کے حالات ہیں۔

(۱۱۱) ملک میں زرعی نظام کے سلسلہ میں ایک اہم بات ہے کہ کاشت کاروں کے مختلف زمروں کے درمیان زمینی قطعات کے سلسلہ میں برابری نہیں ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ قطعات میں کافی حد تک کمی آتی رہی ہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں یہ اوسط ۳ء۱ ہیکٹیئر فی ہزار تھا جو ۸۲ - ۱۹۸۱ء تک محض ۱ء۱ ہیکٹیئر فی ہزار رہ گیا۔ علاوہ ازیں چھوٹے کسانوں کی تعداد جو ۵۴ - ۱۹۵۳ء میں ۶ فی صد تھی ۸۲ - ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۳ء۵ فی صد ہو گئی۔ کاشت کار طبقے میں چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کی ایک کثیر تعداد کے باوجود زرعی اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں میں بھی کسان اپنے محدود وسائل کی وجہ سے نئی ٹکنالوجی سے محدود فائدہ ہی اٹھا سکے۔ ان میں سے کسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو زرعی اعتبار سے انجماد کا شکار علاقوں میں مفلسی اور محتاجگی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

(۱۷) ہندوستان کے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ علاقوں میں الگ الگ سیاسی عمل شروع کیے گئے ہیں۔ مالا مال زرعی علاقوں میں آمدنی بڑھ جانے سے صنعتی مصنوعات کی مانگ بڑھ گئی جس کا صنعتی فروغ پر خوشگوار اثر پڑا۔ کئی بنیادی ڈھانچے، انتظامی اور ثقافتی رکاوٹوں کی وجہ سے ان علاقوں میں صنعتی فروغ اور متوقع نتائج [illegible]

> زرعی ترقی یافتہ علاقوں میں بھی کسان اپنے محدود وسائل کی وجہ سے ٹکنالوجی سے محدود فائدہ ہی اٹھا سکے۔

طاقت اور کسانوں کی طاقت اور اثر و رسوخ سیاسی اعتبار سے کافی بڑھ گیا۔ مزدوروں کی زیادہ مانگ کے پیش نظر بے زمین مزدوروں کی سودا کاری کی قوت بھی بڑھ گئی۔ گاؤں میں منظم اور ایک گروپ کی شکل میں مزدوروں کی ایک طاقت ابھر رہی ہے۔ مارکس کے مطابق یہ طاقت ورگروپ

(مزدور) دیہات کے نظام میں دوررس اثرات کا حامل ہوگا

شروع میں ان کسانوں نے زراعت میں بڑے پیمانے پر نئی زرعی ٹکنالوجی کو اپنایا۔ جو پیسہ لگایا گیا اس کے بیشتر حصے رقم سرکاری اداروں سے حاصل کی گئی اور کچھ کسانوں کی بچت سے ادا کی گئی تھی۔ اب زرعی پیداوار میں اضافہ ہونے کی وجہ سے کسانوں کی ذہنی قوتوں کو کسی حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بار اتنا حاصل کرنے کے بعد سرمایہ لگانے کی شرح میں کمی آگئی۔ اب وہ غیر زرعی صنعتی سرگرمیوں میں پیسہ لگانے میں دلچسپی لے رہے ہیں جس کی اصل وجہ کم خطرات ہے۔ اس کے بعد زرعی بچت سے عالیشان مکان بنانے، شادیوں اور دوسری سماجی تقریبات وغیرہ پر سرمایہ صرف کیا جا رہا ہے

سیاسی اعتبار سے طاقت ور ہونے سے یہ کسان حکومت کے حاصل ہونے والے وسائل کو دینی محصول، انتہائی رعایتی شرح پر دی جانے والی بجلی کی قیمت میں کیمیاوی کھاد اور آب پاشی کے نرخ میں اضافہ کرکے بروئے کار لانے کی مخالفت و مزاحمت کرتے ہیں۔ کسان اہم فصلوں کی زیادہ سرکاری قیمت خرید مقرر کرانے کے لیے بھی زبردست دباؤ ڈالتے ہیں۔ یہ گروپ سرمایہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بنتا جارہا ہے۔

توقع کے مطابق زراعت سرمایہ کارانہ خطوط پر فروغ پا رہی ہے۔ تاہم زرعی مزدوروں اور سرمایہ دار کسانوں کے درمیان ایک بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ چوں کہ نئی ٹکنالوجی سے چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔ اس لیے اس ٹکنالوجی کے استعمال اور فوائد میں فرق کے باوجود چھوٹے اور امیر کسانوں میں کوئی سیاسی تفریق نہیں پائی جاتی۔

دوسری طرف باقی ہندوستان میں جہاں زراعت اب بھی پسماندہ ہے چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کی حالت قابل رحم ہے۔ جوش اور ولولہ کے نہ ہونے اور زراعت کے منجمد ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر منڈی محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ ان علاقوں میں صنعتی فروغ کا عمل شروع کرنا ممکن نہیں ہے

ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زرعی حالات کی وجہ سے کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اصلاحات اراضی تبدیلیوں کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اسی لیے کھیتی باڑی کرنے والوں اور مالکان اراضی کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ بے زمین درج فہرست ذاتوں، متوسط ذاتوں اور برہمنوں اور ٹھاکر مالکان اراضی کے درمیان تنازعہ پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی زراعت ترقی کے اس مرحلے پر ان تضاد اور مسائل سے دوچار ہے۔

حصہ چہارم

لب لباب ... کہیں پر بھی جدیدیت اور روایات کے آپسی تعلق سے اتنے حیران کن اور پیچیدہ حالات و مسائل پیدا نہیں ہوئے جتنے کہ ہندوستان میں زرعی اصلاحات کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔

ہندوستان میں زراعت جدید ٹکنالوجی سے کافی حد تک متاثر ہوئی ہے۔ ہندوستانی کسان آب پاشی کی ٹکنالوجی سے بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں قحط کی صورت حال پیدا ہونے سے آب پاشی کی سہولیات کو بڑے پیمانے پر توسیع دی گئی۔ اس سے پیداوار میں خاص طور پر تجارتی فصلوں کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ برطانوی دور حکومت میں ہی بیسویں صدی کے اوائل میں رائل کونسل آف ایگری کلچرل ریسرچ کے قیام سے سائنسی جانکاری کی بنیاد پڑی اور بہت سے زرعی کالج کھولے گئے۔ ان اداروں کے علاقے میں بہتر قسم کے بیجوں کی تیاری

لب لباب ... کہیں پر بھی جدیدیت اور روایات کے آپسی تعلق سے اتنے حیران کن اور پیچیدہ حالات و مسائل پیدا نہیں ہوئے جتنے کہ ہندوستان میں زرعی اصلاحات کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔

اور فصلوں کو سائنسی طریقے پر بدل بدل کر لگانے کی تشہیر کی۔

البتہ ان نئے طریقوں کا بڑے پیمانے پر کوئی اہم اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوآبادکار حکومت نے زرعی تحقیق میں کوئی خاص سرمایہ نہیں لگایا۔ جو بھی تحقیق اور جستجو کی گئی اس کا تعلق محض تجارتی فصلوں سے تھا اور وہ بھی ان علاقوں تک محدود رہا جہاں سینچائی کی جاتی تھی۔ بلاشبہ یہ بنیادی ڈھانچہ اور تکنیکی عوامل کم زرعی پیداوار کے لیے ذمہ دار تھے۔ زراعت کے سلسلے میں جوش و خروش کا فقدان اور نئی ٹکنالوجی کے فروغ میں رکاوٹیں جیسی اہم بندشیں

اس کے فروغ میں حائل تھیں۔ ان میں زمینداری
کھیتی کے بغیر مالکانہ حقوق اور بڑھتے ہوئے
قرضے بڑی بڑی رکاوٹیں تھیں۔ علاوہ ازیں
آب پاشی کے چھوٹے چھوٹے علاقے،
سرمایہ کی کمی، منڈی اور قرضے کی سہولیات
کا فقدان بھی بعض ایسی رکاوٹیں ہیں جن کی
وجہ سے زراعت کو فروغ نہیں مل سکا۔

حصول آزادی کے بعد ان رکاوٹوں
پر قابو پانے کی حکومت نے سنجیدگی کے ساتھ
کوشش کی گئی۔ آراضی سے متعلق اصلاحات
اگرچہ پوری طرح کامیاب نہیں ہیں۔ البتہ یہ
ہندوستان کے کچھ حصے کو چھوڑ کر باقی
ملک سے بچولیوں کو ختم کرنے میں کامیاب
رہیں۔ البتہ یہ زمین کی مساوی تقسیم کو یقینی
بنانے میں ناکام رہیں کیوں کہ زمین کی حد بندی
سے متعلق قانون نافذ نہیں لیا گیا تھا۔ لیکن
بچولیوں کے خاتمے سے زرعی ترقی میں حائل
ایک بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا گیا تھا۔ دوسرے
یہ کہ ٹکنالوجی کی خامیوں کو دور کرنے کے
لئے آب پاشی، توانائی اور دوسرے
بنیادی شعبوں میں بھاری سرمایہ کاری کی گئی۔
ایک حد تک یہ وہی سلسلہ تھا جو انگریزوں
نے شروع کیا تھا لیکن منصوبے میں بھاری
رقم مختص کیے جانے کے نتیجے میں خاص طور
پر گاؤں کے بنیادی ڈھانچے میں بنیادی
بہتری آئی۔ بجلی کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا اور
تمام علاقے میں سینچائی کی سہولیات مہیا کی
گئیں۔ تیسرے یہ کہ پالیسی سازوں نے
ٹکنالوجی کی خرابیوں کو دور کرنے کی غرض سے
بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری پر زور دیا۔
تحقیق و جستجو کو فروغ دینے کی غرض سے
انگریزوں نے جو بنیاد ڈالی تھی اور جو بنیادی
ڈھانچہ فراہم کیا تھا پالیسی سازوں نے اسے
توسیع دی اور مزید سرمایہ کاری کی۔ زرعی
تحقیق کی ہندوستانی کونسل (انڈین کونسل آف
ایگریکلچرل ریسرچ) کو ایک اہم مقام دیا گیا
اور کئی زرعی یونیورسٹیاں کھولی گئیں۔ بیجوں
کی نئی اقسام کو فروغ دینے اور فصلوں کی
بیماریوں کی روک تھام کے لئے باضابطہ تحقیق
کی گئی۔ اس تحقیق کے نتیجے میں معیاری
سہولیات میں اضافہ کیا گیا اور ٹکنالوجی نے
رد و بدل کر کے آب پاشی والے علاقوں پر
زیادہ توجہ مرکوز کی گئی۔ اس سرمایہ کاری کا نتیجہ
۱۹۶۰ کی دہائی میں بیجوں اور کیمیاوی کھاد
کی ٹکنالوجی کی نئی نسل میں [illegible]
پالیسی کا ایک اور اہم جزو ۱۹۶۵ میں زرعی
قیمتوں سے متعلق کمیشن کے ذریعے قیمتوں کی
موافقانہ ضمانتی قیمتوں سے متعلق پالیسی
اور نئی ٹکنالوجی کا نتیجہ سبز انقلاب [illegible]
کی شکل میں برآمد ہوا۔ لیکن

ہر سے کچھ سال بعد
وقت گزرنے کے ساتھ
ترقی اور خوشحالی حصے پر
پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں

مغربی ریاستوں میں نئی ٹکنالوجی کی بدولت
آمدنی میں اضافہ ہوا اور کاشتکاروں کے
رہن سہن کے حالات میں بہتری آئی۔

روایت اور جدیدیت کے تعلق کو
پیداوار کے طریقہ کار اور بنیادی ڈھانچے
دونوں نقطۂ نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔ علاوہ
ازیں یہ جائزہ لیتے وقت نئے اقتدار کے
نظام اختیار کو بھی مد نظر رکھا جانا چاہئے۔
کھیتی باڑی کے قدیم طریقے کے ساتھ ساتھ
ملک کے کچھ حصوں میں آج بھی نیم جاگیردارانہ
نظام موجود ہے۔ ان علاقوں میں برسوں
سے طبقاتی کشمکش چلی آ رہی ہے۔ ترقی کے
سلسلے میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ جدید
ٹکنالوجی کو پورے ملک میں یکساں طور پر
لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف علاقوں میں
علاقائی تفریق کی وجہ سے زرعی ترقی پر منفی
اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن علاقوں میں
زرعی ترقی تیزی سے اور مسلسل ہو رہی ہے
وہاں غریبی کے خاتمے کے سلسلے میں پیش رفت
ہوئی ہے۔ دوسری طرف ملک کے ایک
بڑے حصے میں اس طرح کی کایا پلٹ نہیں
ہوئی ہے اور آبادی کا ایک بڑا حصہ غریبی
کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس مضمون میں یہ کوشش نہیں ہے
کہ روایت اور جدیدیت کے تعلق کے سبھی
سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔
اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر جگہ
[illegible]
[illegible]

سے قدیم جاگیردارانہ نظام اور مضبوط تعلقات
میں تعمیر اور ملک کے میں کامیابیوں کے باوجود
ہندوستان لازمی طور پر ایک انتہائی غیر
جمہوری معاشرہ تھا۔ اگرچہ دیہات
میں پنچایتی نظام موجود تھا لیکن ان کا
رول اور اختیارات محدود تھے اور ذات
پات کی وجہ سے ان میں بھی مزید کٹوتی
کر دی گئی تھی۔ ہندوستان کو بالغ رائے دہی
سے حق حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگا ہے
کچھ مسائل بھی ہیں ذات پات اور مذہب
جیسے کچھ نظریات ہیں اور یہ سب انتخابات
پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر روایتی
قبائل اور ذات پات کی وفاداریاں جمہوری
اصولوں کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

کے۔ راجن

ہندوستانی زراعت کو درپیش چیلنج

مصنف نے اس مضمون میں ہندوستانی زراعت کو درپیش چیلنجوں کا عمیق تجزیہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان چیلنجوں کا مقابلہ صرف مربوط پالیسی اور پروگراموں کے پیکیج کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ صرف کسی ایک مسئلے پر زور دینے سے نصب العین کی کامیابی ممکن نہ ہوگی۔

زراعت ہندوستانی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہ صرف اس بات سے ظاہر ہے کہ ملک کی مجموعی پیداوار میں شعبۂ زراعت کا حصہ کتنا زیادہ ہے بلکہ اس سے بھی کہ ہماری کتنی زیادہ آبادی زراعت پر انحصار رکھتی ہے اور زرعی شعبہ صنعت کاری کے لیے بھی کتنا اہم رول ادا کرتا ہے۔ ملک کی کچھ اہم صنعتیں زراعت پر ہی انحصار رکھتی ہیں۔ مثلاً کپڑے کی صنعت، چینی کی صنعت، تیل ملوں، دال ملوں، آٹا ملوں اور بیکریوں جیسی چھوٹی اور گھریلو صنعتیں۔

آزادی کے بعد ہندوستانی زراعت نے کافی معقول ترقی کی ہے۔ اناج کی پیداوار میں تقریباً ۲۵۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۵۰.۸۲ ملین ٹن کی سطح سے بڑھ کر ۹۱-۱۹۹۰ء میں زائد از ۱۷۰ ملین ٹن کی سطح پر پہنچ گئی ہے۔ تلہن، روئی اور گنے کی پیداوار میں بھی ایسا ہی اضافہ ہوا ہے۔ اس سے آبادی میں کثیر اضافے کے باوجود کئی زرعی اشیا کی فی کس دستیابی کے بڑھنے میں مدد ملی ہے۔ ترقیاتی عمل کی ایک اور اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہم ہندوستان کی زرعی معاشیات میں کسی حد تک ابھرنے کی قوت پیدا کر سکے ہیں جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہے کہ حالیہ برسوں میں خشک سالی کے سال میں پیداوار میں ہونے والی کمی کثیر پیداوار والے گذشتہ سال کے مقابلے میں اُس سے کافی کم رہی ہے جتنی کہ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ہوا کرتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اب ہمیں وسیع علاقوں میں قحط کا، فصل میں کیڑے لگنے کا اور کم یا ناقص تغذیہ کے سبب بیماریوں یا وباؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جیسا کہ اس صدی کے اوائل میں کرنا پڑتا تھا۔

یہ سب بڑی حد تک آب پاشی کی سہولیات میں توسیع کی وجہ سے ممکن ہوا ہے جو اب کل زیر کاشت رقبے کے ۳۲ فی صد حصے پر محیط ہیں۔ زرعی ترقی کے عمل میں اس بات سے بھی مدد ملی ہے کہ کاشت کاروں کی ایک بڑی تعداد کھیتی باڑی کے جدید طریقے اختیار کر چکی ہے اور سرکاری، نجی اور کوآپریٹو سیکٹروں میں کاشت کاروں کی ضرورتیں پوری کرنے والے اداروں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

چیلنج

تاہم ہندوستانی زراعت کو کئی بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے جو صرف زراعت کو ہی درپیش نہیں ہیں بلکہ مجموعی اقتصادی صورت حال کا ایک حصہ ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہندوستان میں زرعی معیشت عام

معیشت کے دوسرے شعبوں سے منسلک ہے اور اس پر ان شعبوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا زرعی معیشت کو سب سے الگ تھلگ اور غیر متعلق ایک ایسا شعبہ نہیں سمجھا جا سکتا جو مجموعی اقتصادی صورتِ حال کے دائرے سے باہر ایک آزاد اور متوازی وجود رکھتا ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں کی زرعی منڈیاں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی جا رہی ہیں۔

درپیش چیلنجوں میں سے کچھ بڑے چیلنج حسبِ ذیل ہیں:۔

بے روزگاری

ہندوستانی معیشت نے اب تک جو ترقی کی ہے اس کے باوجود ہم بے روزگاری کے بڑے مسئلے کے حل کے نزدیک بھی نہیں پہنچ سکے ہیں اور نہ ہی کم روزگاری کے شدید تر مسئلے کو حل کر پائے ہیں۔ ہندوستانی

یہ کہ روزگار یا پیشہ تسلی بخش ہو۔ ایسا ہو جس سے اتنی آمدنی ہو جس سے رہن سہن کے معیار کو بہتر بنایا جا سکے۔ نیز اس میں خصوصی مہارت حاصل کی جا سکے اور انسان مزید ترقی کر سکے۔

شرحِ ترقی

ہمارے سامنے دوسرا بڑا چیلنج یہ ہے کہ شرحِ ترقی اتنی بلند ہو جس سے زیادہ دولت پیدا کی جا سکے اور [illegible] دولت کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے معیارِ زندگی میں [illegible] یقینی بنایا جا سکے۔ چونکہ آبادی میں اضافہ برابر جاری ہے [illegible] آبادی میں بھی آبادی میں [illegible] فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا اور آئندہ چند سالوں میں بھی بڑھتی ہوئی آبادی میں [illegible] کا امکان نہیں ہے۔ اس لیے [illegible]

ہندوستان میں زرعی معیشت عام معیشت کے دوسرے شعبوں سے منسلک ہے اور اس پر ان شعبوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا زرعی معیشت کو سب سے الگ تھلگ اور غیر متعلق ایک ایسا شعبہ نہیں سمجھا جا سکتا جو مجموعی اقتصادی صورتِ حال کے دائرے سے باہر ایک آزاد اور متوازی وجود رکھتا ہو۔

زراعت کی جدید کاری کے لیے مقامی طور پر دستیاب اشیاء کے علاوہ صنعتی شعبے میں تیار ہونے والی چیزوں پر بھی انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کیمیکل انڈسٹری اور آٹوموبائل اور مشینیں بنانے کی صنعت کو ہی لیجئے جن میں تیار ہونے والی کھاد اور ٹرکوں، ٹریکٹروں اور دیگر زرعی مشینوں کی ضرورت جدید زراعت میں پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں زرعی ترقی انہی خطوط پر چل رہی ہے جن پر کہ دنیا کے دوسرے حصوں اور خاص کر ترقی یافتہ ملکوں میں ہو رہی ہے۔ ہندوستانی زراعت کو درپیش چیلنجوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا جہاں کچھ چیلنج صرف اسی شعبے تک ہی محدود ہیں وہاں کچھ ایسے چیلنج بھی ہیں جو دوسرے اقتصادی شعبوں کے ساتھ مشترک ہیں۔ ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی کے میدان میں

لیبر فورس کی حرکت پذیری ملکوں کے مقابلے میں بہت [illegible] ہے جس کی وجہ سے عدم توازن ہے۔ وہ اس معنی میں کہ زرعی کا[illegible] کے ساتھ کرنے کی اہلیت رکھنے والے دو تہائی یا تو کم ہو جاتی ہے یا زیادتی۔ قومی فلاح و بہبود کی کسی بھی کوشش میں جو ایک کیرالے اور بنگال کے ساتھ لوگوں کی بڑی تعداد کو فائدہ مند روزگار کی ابھی بھی ضرورت ہے۔ سماجی و اقتصادی نقطۂ نگاہ سے روزگار نہ صرف سماج میں ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے بلکہ افراد کی ذاتی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ آج ہمیں جس چیلنج کا سامنا ہے وہ ہے معیشت کو اس ڈھنگ اور اس رفتار سے ترقی دینا کہ عوام کی ایک بڑی تعداد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جا سکیں۔ اس میدان میں ہمیں کئی سوالوں پر غور کرنا ہوگا مثلاً

[illegible] ہم اسے برقرار رکھ سکیں [illegible] سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل کا استعمال [illegible] سے جڑا ہوا ہے۔ قدرتی وسائل کے استعمال میں اگر بڑے پیمانے پر کوئی [illegible] اس سے ترقی [illegible] نسل کے لئے آئندہ نسلوں کو بھی نقصان پہنچے گا [illegible] آنے والی نسلوں کو کہیں زیادہ نقصان [illegible] ماحول [illegible] انسانی [illegible] درپیش [illegible] مسئلوں کو حل کر [illegible] آج ہمارے سامنے [illegible] سوال یہ ہے کہ کیا ہم [illegible] وسائل کے استعمال میں [illegible] کر رہے ہیں اور کیا اس [illegible] عوام میں [illegible] بیداری پیدا کر سکے ہم

قدرتی وسائل کے ضیاع اور فضول خرچی کو روک سکتے ہیں، ان کے باصلاحیت استعمال سے بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ صلاحیت استعمال میں بہتری لانے کا مقصد ہے وسائل کے استعمال کی موجودہ سطح سے معاشرے کے لیے زیادہ دولت پیدا کرنا اور ایسے انتظامات میں موجود سرمایہ کاری سے زیادہ نفع حاصل کرنا۔ تحفظ ماحولیات اور قدرتی توازن برقرار رکھنے کے لیے ان باتوں پر عمل کیا جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ان سوالوں پر اب معیشت کی بہتری کے لیے ہی نہیں بلکہ ... کی ترقی کے لیے بھی غور کیا جا رہا ہے۔

مناسبات

اب یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور مواصلات کی سہولتوں کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصے ایک دوسرے سے بہت نزدیک آگئے ہیں۔ اور دنیا تیزی سے ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ طرز زندگی میں یکسانیت کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ انسان کی ضروریات اور خواہشات میں بھی مشابہت پیدا ہو رہی ہے۔ چنانچہ اب ایک ایسا معاشرہ جو دوسری سوسائٹیوں سے یکسر مختلف ہو، پیدا کرنا مشکل ہوگا۔ مختلف معاشروں کے سیاسی اور سماجی فلسفے ایک عام معیار پر آتے نظر آ رہے ہیں اس کے نتیجے میں ایک ایسے مال اور خدمات کی مانگ پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ملک میں دستیاب نہیں ہوتیں اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے انھیں کسی دوسرے ملک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کے پاس مطلوبہ مال و خدمات دوسرے ممالک سے درآمد کرنے کے لیے وسائل موجود ہوں۔ لیکن اگر درآمدات و برآمدات کے درمیان مناسب توازن نہ ہو گا تو ادائیگیوں کا توازن بگڑ جائے گا۔ جس سے ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ ہندوستانی معیشت کے عالمی معیشت میں انضمام اور برآمدات بڑھانے کی ضرورت کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے معیشت کے تمام شعبوں کو اس اہم مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرنا ہوگی خصوصاً زرعی سیکٹر کو جو زرعی اشیا بڑی مقدار میں دوسرے ممالک کو برآمد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

معیشت کے دوسرے شعبوں کی طرح ہندوستانی زراعت کو بھی ان میں سے بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے موٹے طور پر یہ چیلنج یہ ہیں :

۱۔ خوراک کی صورت حال یقینی اور اطمینان بخش بنائے رکھنے کے لیے ملک کی صلاحیت۔

۲۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور آمدنیوں میں ہونے والے اضافے کی وجہ سے زرعی اجناس کی بڑھتی ہوئی مانگ اور سماج کے جو طبقے ماضی میں قوت خرید کم ہونے کی وجہ سے اپنی زرعی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتے تھے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ملک کی اہلیت۔

۳۔ باوجود اس کے کہ اندرون ملک مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) میں ثانوی اور سروسز سیکٹر کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ زراعت پر انحصار رکھنے والی آبادی میں اس کی نسبت سے بہت کم کمی واقع ہوئی ہے۔ اس لیے دیہی علاقوں میں بے روزگاری اور کم روزگاری کے مسائل پہلے سے بھی زیادہ شدید صورت اختیار کر گئے ہیں۔ زراعت پر زیادہ آبادی کے انحصار کا مطلب یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں فی کس آمدنی میں اضافہ دوسرے شعبوں کی فی کس آمدنی میں اضافے کی ٹکر کا نہیں ہوگا۔ اس کا لوگوں کی تعلیم اور صحت جیسی کئی سماجی سہولیات تک رسائی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سماج میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ کسانوں کے کھیتوں کا سائز بھی کافی کم ہو گیا ہے۔ زمین کے ٹکڑوں میں بٹ جانے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سامنے آ رہے ہیں۔ لہٰذا بیشتر کاشت کار اپنے چھوٹے اور غیر معاشی کھیتوں پر گذارہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بہت سے چھوٹے اور کم ترین حیثیت کے کسانوں کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ پیداواریت کو یقینی بنانے والی ٹکنالوجیاں استعمال کر سکیں اس لیے انھیں اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے اتفاقی مزدوری کی کمائی پر دار و مدار رکھنا پڑتا ہے چاہے اس کے لیے اپنے کھیت کا کام کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ ایک بار یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چھوٹے اور کم ترین حیثیت کے کسانوں کو اپنی محدود زمین پر زیادہ آمدنی دلانے والے کام، جیسے باغبانی، اور مویشی پروری وغیرہ شروع کرنے میں کوئی مدد دی گئی ہے۔ ہم کھیتی باڑی کے لیے کھیت کا کم سے کم ایسا سائز مقرر کرنے کے بارے میں بھی غور کر سکتے ہیں جو معاشی اعتبار سے فائدہ مند ہو اور جس میں مزید کمی نہ کی جا سکے۔ ہمارے سامنے چیلنج یہ ہے کہ ہم اس بارے میں

غور کریں کہ وہ فلسفہ جس پر ہم پچاس
کی دہائی میں کاربند رہے آج
کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا
ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے
کہ کیا فی نصہ زرعی ترقی کو بڑھانے
پر زور دیا جانا چاہیے۔

۵۔ ہندوستانی زراعت کے سامنے نوے
کی دہائی میں ایک اور چیلنج زراعت
میں سرمایہ سازی اور سرمایہ کاری

> بہت سے چھوٹے اور کم تر حیثیت کے کسانوں کی حالت
> ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ پیداوار کو یقینی بنانے
> والے ممکنہ وسائل استعمال کر سکیں۔

کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اسی
کی دہائی میں زراعت میں سرمایہ کاری
پر معاملتاً ایک جمود سا طاری رہا
ہے۔ یقینی طور پر اس سے ہماری
پیداوار اور پیداوار بڑھانے
کی اہلیت پر اثر پڑے گا۔ پبلک
سیکٹر میں کی گئی سرمایہ کاریوں کا کسی
حد تک زراعت میں پرائیوٹ سیکٹر
کی سرمایہ کاریوں پر بھی پڑتا ہے۔
مثال کے طور پر اس بات کو لیجئے کہ
آب پاشی کی سہولیات فراہم ہو
جانے پر زمین کی اصلاح پر بھی سرمایہ
لگایا جاتا ہے جس سے زمین کی قیمت و
افادیت بڑھتی ہے۔ آب پاشی
کی سہولیات دستیاب ہو جانے پر
فصلوں کی کاشت اور فارمنگ کے
نظام میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ جن
کے لیے کاشت کاروں کو پیداواری
اثاثوں میں سرمایہ لگانا پڑتا ہے مثال
کے طور پر پھل دار باغات لگانے

پر، کھیتوں میں مشینوں کے استعمال
پر، ڈیری اور مرغی پالن
شروع کرنے اور ایسے ہی دوسرے
کاموں پر۔ اس قسم کی سرمایہ کاری
کے لیے ایک بڑا سوال یہ ہے کہ
زراعت سے خرچ کو نکال کر اتنی
زیادہ آمدنی ہو کہ مذکورہ بالا پیداواری
اثاثے پیدا کرنے پر سرمایہ لگایا جا
سکے۔ یہ تو تبھی ممکن ہوگا جب

ہ ... کار کو اپنی پیداوار
... مناسب دام
... لانے کے بعد
... حاصل ہو
منڈی تک پہنچائے
بھی بہتر بنایا جانا چاہیئے ... ں
کسان کو اس کی محنت، سرمایہ کاری

> ہندوستانی زراعت کے سامنے نوے کی دہائی میں ایک
> اور چیلنج زراعت میں سرمایہ سازی اور سرمایہ کاری کو
> بڑھانے کی ضرورت ہے۔

اور اخراجات کو دیکھتے ہوئے پیداوار کی
بہتر قیمت مل سکے۔ اس مسئلے کا ایک
اور پہلو یہ ہے کہ پیداوار کے کھیت
سے بھیجے جانے اور صارفین تک
پہنچنے کے دوران جو مقدار ضائع ہو
جاتی ہے اسے کم کرنے کی تدابیر اختیار
کی جائیں۔ بہت سی چیزوں خصوصاً
جلد خراب ہو جانے والی اشیاء کے

ضمن میں تو یہ نقصان کافی زیادہ ہوتا
ہے۔ پیداوار کو منڈیوں تک
پہنچانے ... بہتر انتظامات ... سہل
کی کٹائی کے بعد اس کے بہتر رکھ رکھاؤ
کا بندوبست اور پیداوار کی پراسسنگ
کچھ ایسے اقدامات ہیں جن سے زیاں
کو کم کیا جا سکتا ہے اور کسان کو اس
کی محنت کا زیادہ معاوضہ دلایا جا سکتا ہے۔ اس
کے ساتھ ساتھ صارفین کے مفاد کو بھی
معقول حد میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ صارفین
کی مانگ بھی معقول حد تک ... سکے۔

۶۔ تقسیم ... ۔ ... زرعی ... ۔
... کی ... ۔ ... میں
... ۔

انتظام ... کرنے ... ت

بہتر ... ۔
بارانی زمین پر کھیتی کرنے والے کسانوں
کی بہت سے مسائل میں سرمایہ لگانے کی اہلیت
کم ہوتی ہے کیونکہ بارش کے وقت پر
نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے ان کی فصلیں
اکثر خراب ہو جاتی ہیں۔ اور چونکہ ان کے
پاس وسائل کی قلت ہوتی ہے اس لیے وہ
ذرائع پیداوار پر کافی سرمایہ نہیں لگا پاتے۔

انھیں کھیتی کے کام بروقت کرنے کے لیے کرائے پر خدمات کی بہم رسانی کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جارہی ہے اور یہ واقعی ایک اہم ضرورت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انھیں کرائے پر خدمات کی بہم رسانی کو کیسے یقینی بنایا جا سکتا ہے اور ہم کس حد تک بارانی کاشت کاروں کو ان جوکھموں سے بچا سکتے ہیں جو انھیں وقت پر کافی بارش نہ ہونے کی وجہ سے اٹھانی پڑتی ہیں۔

> بارانی زمین پر کھیتی کرنے والے کسانوں کی بہتر تکنالوجیوں پر سرمایہ لگانے کی اہلیت کم ہوتی ہے کیونکہ بارش کے وقت پر نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے ان کی فصلیں اکثر خراب ہو جاتی ہیں اور چونکہ ان کے پاس وسائل کی قلت ہوتی ہے اس لئے وہ زرعی پیداوار پر کافی سرمایہ نہیں لگا پاتے۔

یہ اہم مسائل ہیں جن کے حل کے لئے موزوں پالیسی وضع کرنا ضروری ہے تبھی کاشتکاروں کی مدد کے لیے ضروری اقدامات کیے جا سکیں گے

صلاحیت کا استعمال

ان میں سے بہت سے چیلنجوں کی کلید یہ ہے کہ ہم پانی اور زمین جیسے قلیل قدرتی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے کیسے پیداوار کی سطح زیادہ سے زیادہ بلند کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ زرعی پیداوار کے مختلف نظاموں کو، خواہ وہ موسمی حالات پر مبنی ہوں یا سالانہ یا استمراری بنیاد پر فصلیں اگانے کے طریقے پر یا دوسری قسم کی فارمنگ یعنی مویشی پروری، کھیت پر جنگل اگانے، ریشم کے کیڑے پالنے اور ماہی پروری وغیرہ پر، انھیں اس طرح منظم کیا جائے کہ مختلف علاقوں کے زرعی حالات اور آب و ہوا کی روشنی میں پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھایا جا سکے۔ مجموعی قومی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر علاقے میں زرعی پیداوار کے ایک ایسے نظام کو فروغ دیا جانا چاہیئے جس سے اس صلاحیت کا پورا استعمال کیا جا سکے جو پیداوار اور آمدنی بڑھانے کے لیے علاقے میں موجود ہے۔ مختلف علاقوں کے لیے مختلف قسم کے پیداواری نظام مخصوص کیے جا سکتے ہیں لیکن ان سب کا مقصد کاشت کار کو اس کی محنت کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ دلانا اور ماحولیات کو بہتر بنانا ہونا چاہیئے

لہذا ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے لیے ایک الگ پیداواری نظام مخصوص کرنے کے منصوبے میں مرکز نگاہ کاشت کار کی بہتری ہونی چاہیئے نہ کہ کوئی خاص زرعی جنس۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کے مختلف حصوں کی آب و ہوا، زرعی حالات اور مٹی کی خصوصیات مختلف ہیں اس لیے کسی ایک خطے سے دوسرے خطے تک یا کسی ایک ریاست سے دوسری ریاست تک کے علاقوں کا موازنہ کرنا مناسب ہوگا تاوقتیکہ پیداوار پر اثر انداز ہونے والے عناصر کو بھی ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دو جنسوں کو چھوڑ کر باقی اجناس کے معاملے میں ملک کی موجودہ کارکردگی اتنی اچھی نہیں ہے جتنی کہ زراعتی طور پر ترقی یافتہ ان ملکوں کی ہے جہاں کاشت کاری کم و بیش ہندوستان کے جیسے زرعی حالات اور قریب قریب یہاں کی جیسی آب و ہوا میں کی جاتی ہے۔ دیکھیے گوشوارہ نمبر ا۔ جس میں ہندوستان اور زراعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی چنی ہوئی فصلوں کی کارکردگی کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

بڑی فصلوں کی پیداوار

(پیداوار کلوگرام/ہیکٹیر)

فصل	سال	ممالک									
		ہندوستان	چین	جاپان	انڈونیشا	ایشیا	شمالی امریکہ	جنوبی امریکہ	یوروپ	افریقہ	دنیا
چاول	۸۱ – ۱۹۷۹ء	۱۵۵۸	۴۲۴۴	۵۵۸۱	۳۵۲۷	۲۸۰۷	۴۳۹۷	۱۸۳۲	۵۱۳۲	۱۷۱۱	۲۷۵۷
	۱۹۸۹ء	۲۶۳۵	۵۵۰۰	۶۱۶۸	۴۲۴۷	۳۵۷۱	۵۱۵	۲۵۱۷	۵۰۸۰	۱۹۷۲	۳۴۸۸
	۱۹۹۰ء	۲۶۹۱	۵۷۲۸	۶۳۲۸	۴۳۱۹	۳۶۴۱	۵۰۷۵	۲۴۲۲	۵۲۳۷	۱۹۹۲	۳۵۵۷

گیہوں	۱۹۷۹-۸۱ء	۱۵۴۵	۲۰۴۷	۳۱۰۰	–	۱۷۰۲	۲۱۷۴	۱۳۱۵	۳۶ ۰	۱۰۸۷	۱۸۸۶
	۱۹۸۹ء	۲۲۴۴	۳۰۴۳	۳۴۶۸	–	۲۳۱۶	۲۱۱۲	۱۸۹۲	۴۶۰۵	۱۴۴۸	۲۳۹۹
	۱۹۹۰ء	۲۱۱۷	۳۱۷۹	۳۶۶۲	–	۲۳۵۶	۲۵۶	۱۷۲۴	۴۸۲۹	۱۵۵۴	۲۵۷۰
کُل دالیں	۱۹۷۹-۸۱ء	۴۶۱	۶۳۵	۱۲۵۴	۸۸۲	۶۲۶	۹۶۲	۵۲۰	۱۰ ۶	۵۷۲	۶۷۴
	۱۹۸۹ء	۵۷۸	۹۳۲	۱۵۵۵	۱۲۸۲	۶۷۵	۸۹۲	۴۸۴	۱۹۶۴	۵۷۱	۸۰۹
	۱۹۹۰ء	۵۵۳	۹۵۶	۱۵۶۲	۱۲۹۹	۷۲۸	۹۰۸	۵۱۶	۲۱۱۲	۵۶۳	۸۶۳
مونگ پھلی	۱۹۷۹-۸۱ء	۸۳۸	۱۴۸۷	۱۸۵۴	۱۴۶	۱ ۲۲	۲۲۵۳	۱۵۱۱	۲۱۴۶	۷۲۹	۹۹۵
	۱۹۸۹ء	۹۲۹	۱۸۲۱	۱۸۵۰	۱۴۳۶	۱۱۶	۲۴۲۷	۱۵۷۹	۱۷۸۹	۸۱۰	۱۱۱۴
	۱۹۹۰ء	۹۰	۲۱۲۷	۲	۱۴۶۲	۱۲۳۸	۲ ۴۸	۱۷۸۵	۱۶۷۶	۸۱۱	۱۱۵۷
ریپ سیڈ سرسوں	۱۹۷۹-۸۱ء	۴۹۹	۹۲۷	۱۶۹۲	–	۶۹۱	۱۱۷۱	۱ ۶۶	۲ ۹۷	۹۹۹	۹۶۹
	۱۹۸۹ء	۹۰۶	۱۰۸۹	۲	–	۹۸۲	۱۰۷۶	۱۶۶۱	۲۰۸۴	۱۵۹۶	۱۳۱۸
	۱۹۹۰ء	۸۲۶	۱۳۱۷	۲	–	۱ ۷۰	۱۲۷۴	۱۴۱۹	۲۰۶	۱۳۴۰	۱۴۰۹
بنولا (روئی)	۱۹۷۹-۸۱ء	۴۹۵	۱۶۱۳	–	۷۱۰	۱۰۲	۱۶۲۴	۶۳۰	۲۴۰	۹۹۷	۱۲۵۲
	۱۹۸۹ء	۷۶۶	۲۱۸۶	–	۵۳۰	۱۴۴۲	۱۸۱۰	۱۹۰	۲۶۹۷	۱۲۱	۱۸۸۱
	۱۹۹۰ء	۶۹۴	۲۲۹۵	–	۵۴۳						
آلو	۱۹۷۹-۸۱ء	۱۲۶۳۹	۱۰۸۸۸	۲۶۴۶۵	۸۷۰۱						
	۱۹۸۹ء	۱۵۸۷۰	۱۱۰۶۷	۲۹۸۹۲	۱۲۹۷۵						
	۱۹۹۰ء	۱۵۸۷۳	۱۱۵۸۸	۲۹۶۶۱	۱۲۳۰۸						
گنا	۱۹۷۹-۸۱ء	۵۲۱۵	۵۴۱۷۰	–	۱۰۴۲۵۲						
	۱۹۸۹ء	۶۶۰۶۲	۵۴۰۰۳	–	۸۰۵۲۶	۶۳۲۱	۶۰۴۱	۶۲۰۲۰	–	۵۹۹۰۹	۶۲۰۷۱
	۱۹۹۰ء	۶۴۱۴۰	۵۹۸۹۷	–	۶۹۱۱۴	۵۸۹۳	۶۴۱۴۶	۶۲۳۲۲	–	۶۰۷۱۰	۶۱۳۲۹

پیداوار میں فرق

ہندوستان کی پیداوار کے دوسرے ملکوں کی پیداوار سے کم ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں پیداوار کا یہ فرق ایک بڑی حد تک تو اُن ٹکنالوجیوں کے فرق کی وجہ سے جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں استعمال کی جارہی ہیں۔ یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ ہندوستان کی مجموعی پیداوار میں مختلف ریاستوں کی کروڑوں کسانوں کی محنت سے حاصل ہوئی پیداوار شامل ہے اور بعض ریاستوں کی کارکردگی قومی اوسط پیداوار سے زیادہ ہے۔ اسی طرح اگر ہم ضلع اور

ذریعہ عالمی ادارۂ خوراک کی ۱۹۹۰ء کی اٹرنک سب ڈسٹرکٹ کی پیداوار کے الگ الگ اعداد و شمار کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ

طور پر ہمارے سامنے نتیجہ یہ ہے کہ ہم ملکوں اور گاؤں کی طرح کے ایک مقررہ علاقے میں بھی کاشت کار برادری کے مختلف طبقوں

> ان میں سے بہت سے چیلنجوں کی کلید یہ ہے کہ ہم پانی اور زمین جیسے قلیل قدرتی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے کیسے پیداواریت کی سطح زیادہ سے زیادہ بلند کرسکتے ہیں۔

جن ریاستوں کی پیداوار کافی زیادہ ہے ان میں بھی کاشت کاروں کے بعض طبقے ضلع یا سب ڈسٹرکٹ کی اوسط پیداوار سے کہیں زیادہ پیداوار حاصل کررہے ہیں میادی

کے ذریعے حاصل کی جانے والی پیداوار میں کتنا اضافہ کرسکتے ہیں۔ کاشت کار برادری کے ہر طبقے کو زیادہ پیداوار دینے والی ٹکنالوجی اختیار کرنے کے قابل بنائے بغیر

[illegible]
پیداوار میں کافی اضافہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔
ایک جیسی آب و ہوا اور زرعی حالات والے خطے کے کسانوں کی پیداوار میں نمایاں فرق کے نتیجے کا مقابلہ کرنے کے اقدامات کا استعمال کر کے [illegible] باتوں پر غور کیا جا رہا ہے۔

(۱) کسان محدود مالی امکانات اس خطے سے [illegible] میں جن کے لئے ان کی [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

سفارشوں کی ضرورت ہے یا کیا وہ اُس خطے کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں۔

(۲) کیا ایکسٹنشن مشینری اتنی موثر ہے کہ ٹکنالوجی سے متعلق سفارشات کو وسیع پیمانے پر کسانوں تک پہنچایا جا سکے۔

(۳) پبلک سیکٹر سے باہر ٹکنالوجی تیار کرنے کا کام شروع ہو رہا ہے اور صنعتوں، رضاکار اداروں اور کاشت کاروں کی تنظیموں کے ذریعے توسیعی کوششیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ کسانوں کی ٹکنالوجی کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور انھیں فائدہ مند جانکاری دینے کے لیے اُن تمام ایجنسیوں کی کوششوں میں تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴) کسانوں کو سفارش کردہ ٹکنالوجی کو قبول کرنے پر رضامند کرنے کے لیے محض معلومات بہم پہنچانا کافی نہیں ہوگا کئی اور رکاوٹیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے کسان کو کاشت کاری میں ٹکنالوجی کی سفارشوں کو قبول کر کے ان پر عمل نہیں کر پاتے۔ کچھ بڑے عناصر جو رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، یہ ہیں۔

(۱) کھیتی میں کام آنے والی چیزوں اور خدمات کی دستیابی۔

(ب) کسانوں کے پاس وسائل کی کمی اور بازار سے حاصل کی ہوئی اشیاء اور خدمات کی قیمت ادا کرنے کے لئے کافی مقدار میں مالیات کی عدم دستیابی

(ج) مزارعین اور مالکان اراضی کے درمیان جیسا زرعی رشتہ ہوتا ہے اس کا اثر بھی ٹکنالوجی سفارشات کے قبول کیے جانے پر پڑتا ہے۔ پیداوار اور پیداواریت کو بڑھانے کے لیے مزارع (یعنی کھیت بونے اور جوتنے والے) کی فاضل سرمایہ کاری کے لیے آمادگی اس بات سے متاثر ہوتی ہے کہ مزارعہ کو فصل اُگانے سے کیا ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستانی زراعت کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ ایک پالیسی پروگرام پیکیج کے مربوط اقدام کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایکسٹنشن یا مارکٹنگ یا کھیتی کے لیے درکار سامان کی بروقت ڈیلیوری یا مالکان اراضی اور مزارعوں کے باہمی رشتے جیسے مسائل میں سے کسی ایک یا دوسرے مسئلے پر زور دینے سے نصب العین کی تکمیل ممکن نہ ہوگی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف خطوں کے موسمی و زرعی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح کے مختلف پروگرام بنائے اور زیر عمل لائے جائیں جن سے ایک دوسرے پروگرام پر اچھا اثر پڑتا ہو اور جو کاشت کار برادری کے مختلف طبقوں کو ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد دیتے ہوں جو کم پیداوار یا کم منافع کے مسئلوں کو حل کرنے کی راہ میں آڑے آتی ہیں۔ چیلنجوں کا مقابلہ صرف ایک یا دو مہمیں چلا کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام رکاوٹوں کا مسلسل مفصل جائزہ لیا جائے اور اس جائزے کے نتائج کی روشنی میں کاشت کاروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے موجودہ پالیسیوں اور پروگراموں میں ترمیم اور اصلاحات کی جائے۔ اس عمل کو ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل سمجھنا ہوگا اور زیر نظر مقاصد کے حصول کے ہر نئے قدم کے ساتھ پہلے اٹھائے گئے اقدامات کو مضبوط و مستحکم بنانا ہوگا ●

ڈاکٹر روہنی نیر

اصلاحاتِ اراضی : آج بھی ایک اہم موضوع ہے

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ جامع اصلاحاتِ اراضی آج بھی زرعی ترقی کے لیے [illegible]
بہت [illegible] اور زرعی ترقی دونوں کے لیے ایک لازمی [illegible]
بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ [illegible]
لیے ایک جامع تقسیمِ زمینوں کی ایک بنیادی
کچھ ایسے اقدامات ہیں جن کے ذریعے فوری طور پر
دونوں مقاصد حاصل کیے جا سکیں گے۔

برطانوی دورِ حکومت میں دیہی بھارت میں زمین کے ڈھانچے میں قابلِ ذکر تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور کاشت کاروں کے طبقے میں کئی امتیازات روا رکھے گئے ہیں۔ زمین داروں اور اُن کے ملازموں کی جگہ دیہات میں کئی نئے طبقے پیدا ہوئے ہیں جن میں بے زمین ساہوکار، مزارعے، ادھیارے، بٹائی پر کاشت کرنے والے اور کھیتوں پر کام کرنے والا مزدور طبقہ شامل ہیں۔ آزادی کے وقت ملک میں زرعی زمینوں کے انتظام کا یہی ڈھانچہ موجود تھا۔

قومی تحریک کا مقصد عوام کے ان تمام طبقوں کو اقتصادی ترقی کے پروگرام میں شامل کرنا تھا۔ چنانچہ قومی تحریک کو دیہات میں رہنے والے عوام کی بڑے پیمانے پر حمایت حاصل ہوئی۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ غیر حاضر مالکانِ زمین کی وجہ سے زراعت میں رکاوٹ کا وجود آیا ہے۔ مالکانِ زمین کرایۂ زمین پر نظریں [illegible] ہیں اور اپنی آمدنی کو پھر زراعت میں نہیں لگاتے۔ زمین کے حقیقی کاشت کاروں کے پاس نہ تو ذرائع ہیں اور نہ انہیں زمین پر سرمایہ کاری کی کوئی ترغیب ہے کیوں کہ وہ زمین کے مالک نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ محسوس کیا گیا کہ زرعی پیداوار میں اُسی صورت میں اضافہ ہو گا اگر زمین کی ملکیت حقیقی کاشت کاروں کو منتقل کی جائے۔

آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے مخالف جماعتوں کی طرف سے دباؤ کو محسوس کیا کہ زمین چند ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ چنانچہ اُسے دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا کہ یا تو زمین [illegible] یا مالکانِ زمین کو ترغیب دی جائے کہ وہ دلالوں یا بٹائی پر کاشت کرنے والوں کے ذریعے کاشت کاری کی جائے بلکہ اپنے ملازموں کے ذریعے زمین خود کاشت کریں لیکن اس نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا جس کا مقصد زمین داری کو ختم کرنا اور مالکانِ زمین اور کسانوں کے اعلیٰ طبقے مالک کاشت کاروں کا ایک طبقہ قائم کیا جائے اور دیہات کے عوام میں زمین کی ہیئت تقسیم کا کوئی انقلابی قدم نہ اٹھایا جائے۔

حکومت نے آزادی کے بعد جو پہلے اقدامات کیے اُن میں سے ایک زمین داری کا خاتمہ تھا لیکن زمین داری کے خاتمے کی وجہ سے خود کاشتی کا تعلق [illegible] طبقے یعنی عمومی [illegible]

کے کاشت کاروں، بٹائی پر کاشت کرنے والوں اور زرعی مزدوروں سے نہیں تھا تاہم اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ آئین کے تحت زراعت ریاستوں کے دائرہ کار کا موضوع ہے ہر ریاست نے اپنے طور پر خیال رکھا کہ وہ جاگیرداری لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لیے قانون وضع کرے۔ اکثر ریاستوں میں یہ کام کرنے میں چار سے پانچ برس لگ گئے جس سے مالکان زمین کو زمین کے ریکارڈوں میں اپنے موافق ہیرا پھیری

کا موقع مل گیا۔ اس کے نتیجے کے طور پر اصل کو بڑے پیمانے پر بے دخل کیا گیا۔ مالکان نے ساری زمین کو ایک ایک رکن کے نام درج کرا دیا۔ پرانی اسامیوں کا اندراج کرایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ بیشتر کے خاتمے کے قانون کے مطابق درمیانہ داروں کو ہٹا دیے گئے جس سے زمین داروں کی طرف سے کرایہ زمین یا لگان کی وصولی ختم ہو گئی لیکن عملی طور پر اس قانون سے زمینوں کی ملکیت کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس قانون میں ایک اہم خامی یہ بھی کہ چور کاشت زمینوں کی تقسیم نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ ایسی زمینوں کے بارے میں مالکان زمین درمیانہ دار شمار نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی زرعی مزدوروں نے

مالکان نے زمین کرایہ پر دینے کے طریقے بدلے ہیں اور اب وہ آمدنی کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں۔ زمین کے حقیقی کاشت کاروں کے پاس نہ تو اپنی زمین ہے اور نہ ہی مالکان نے انھیں تحریری کرایہ نامہ دیا ہے کہ وہ ملکیت کے مالک ہیں۔ اس لیے یہ مطالبہ کیا گیا کہ زمین پیداوار میں اضافے کی بہت ضرورت ہے اگر زمین کی ملکیت حقیقی کاشت کاروں کو منتقل کی جائے۔

ذریعہ کاشت کرانے کی اجازت تھی۔ چوں کہ اس قسم کی کاشت پر نگاہ رکھنے کے لیے ادنیٰ سرکاری انتظام نہیں تھا اس لیے بٹائی پر کاشت کرانے کا سلسلہ خوب چلتا رہا۔ کچھ ریاستوں میں جہاں مزارعوں کو زمین کے حقوق ملکیت مل گئے وہاں انھیں مالکان زمین کو معاوضہ ادا کرنا پڑا جو مختلف ریاستوں میں الگ الگ تھا۔ لہٰذا ان حالات میں بھی مزارعوں کی حالت میں کوئی نمایاں بہتری نہیں ہوئی۔ مطالبہ یہ ہے کہ زمین داری کے

خاتمے کا اور ریاست کے نظام کے تحت ان لوگوں پر کوئی ... نہیں ہوا۔

پانچ سالہ منصوبوں میں اصلاحات اراضی پر زور دیا گیا ہے۔ آخری تین منصوبوں

میں زیادہ زور یکسانیت پر نہیں بلکہ پیداوار میں اضافے پر دیا گیا ہے۔ لہٰذا زمین کی ملکیت کی حد کا مسئلہ زیر بحث نہیں آیا۔ کچھ ریاستوں میں ایسے قانون ضرور بنائے

آزادی کے بعد جو پہلے اقدامات کیے گئے ان میں سے ایک زمین داری کا خاتمہ تھا۔ لیکن زمین داری کے خاتمے سے بجائے خود کوئی تعلق غریب ترین طبقے یعنی معمولی درجے کے کاشت کاروں، بٹائی پر کاشت کرنے والوں اور زرعی مزدوروں سے نہیں تھا۔

گئے ہیں لیکن خاتمہ زمین داری کے قانون کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۱ء سے ہی تمام ریاستوں میں زمین کی حد ملکیت کے قوانین بھی رائج ہیں۔ زمین کی حد ملکیت مختلف ریاستوں میں مختلف ہے لیکن یہ قوانین بالکل غیر موثر ثابت ہوئے ہیں کیوں کہ قانونا اور در پردہ انتقال آراضی بڑے پیمانے پر ہوتا رہا ہے۔ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ زمین کی دوبارہ تقسیم کے عمل میں کوئی زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ۱۹۷۰ء میں یہ سوال پھر سے اٹھایا گیا ۱۹۷۲ء میں ریاستی سرکاروں سے بات چیت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ حد ملکیت کے قانون کو پھر سے بنایا جائے اور ایک مالک کی زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اب بھی قانون کے مندرجات سے بچ نکلنے کی کافی گنجائش موجود تھی۔ مثال کے طور پر (۱) سال بھر آب پاشی ہونے والی زمینوں کے لیے جس میں دو فصلیں اگائی جاتی ہوں ملکیت کی حد دس سے اٹھارہ ایکڑ رکھی گئی لیکن کافی آب پاشی اور زمین کے معیار دونوں کے بارے میں غلط بیانی کی گئی (۲) ایک فصل والی زمین کے لیے یہ حد ۲۷ ایکڑ تھی اور کوئی بھی شخص کہہ سکتا تھا

کہ وہ تو صرف ایک فصل کاشت کرتا ہے۔ (۳) مالکان زمین چوں کہ سیاسی و سماجی طور پر طاقتور تھے اور وہ ناجائز انتقال کرا سکتے تھے اور اس طرح زمین پٹے پر دے سکتے تھے۔

(۴) پانچ سے زیادہ افراد پر مشتمل کنبے کو ۱۸ برس سے زیادہ عمر کے ہر بالغ رکن کے لیے زیادہ زمین رکھنے کی اجازت تھی اس لیے ریاستوں کا رجسٹر نہ ہونے کی صورت میں نابالغوں نے بھی دعویٰ کر دیا کہ اُن کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ ہے اور اس طرح ایک کنبہ مقررہ حد سے زیادہ زمین رکھ سکتا تھا۔ اور ملکیت زمین کے لیے معاوضہ ادا کرنا ہماری سیاست غریب لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا [illegible] سے قانوں کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔ معاوضہ دینے کے لیے رقم بابت رہن یا ساہوکار سے اُدھار لی گئی اور رقم واپس نہ کرنے کی صورت میں زمین پر دخل کی رقم کے عوض ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی زمین کی ملکیت سے قانون میں ان خامیوں کی وجہ سے زمین کی ملکیت کے نظام میں ناہمواری قائم رہی۔ چنانچہ آج بھی اصلاحات آراضی قومی سطح پر تشویش کا ایک مسئلہ ہیں اصلاحات آراضی کی ایک جامع پالیسی زمین کے انتظام کی اصلاحات اور زراعتی ترقی کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ اصلاحات آراضی کا جو مجموعہ ہو اُس میں درج ذیل امور کا شامل کیا جانا ضروری ہے۔

(الف) درمیانہ داروں کو ختم کر کے مزارعوں کا براہِ راست رابطہ حکومت سے قائم کیا جائے۔

(ب) پٹے داری کے نظام میں اصلاح کے لیے زمین کے حقیقی کاشت کار کو پٹے داری کی مدت کے تحفظ اور اسے اٹھائے جانے سے روکنے کی غرض سے ہونی چاہیے۔

(ج) ملکیت زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر کے زمین کی پھر سے تقسیم کی جائے

(د) زمینوں کا استعمال کیا جائے۔

(ہ) زمینوں کے اندراجات کی تجدید کی جائے

درمیانہ داروں کا خاتمہ

آزادی کے فوراً بعد [illegible] درمیانہ داروں کو ختم کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی [illegible] [illegible] [illegible] سے فائدہ ہوا [illegible] [illegible] پر اسی [illegible] میں [illegible] بھی پٹہ [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] کی تقسیم کے عمل میں [illegible]

[illegible] بی۔ کمال، کرناٹک اور کیرل میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مغربی بنگال میں [illegible] کاشت کرنے والے ۱۴ لاکھ کسانوں [illegible] [illegible] لیے [illegible] کرناٹک میں لینڈ ٹریبونل نے تین لاکھ [illegible] کو ۱۱ لاکھ ایکڑ زمین پر آباد کیا ہے۔ کیرل میں ۲۴ لاکھ مزارعوں کو حق ملکیت [illegible] [illegible] پٹے [illegible] اصلاحات کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی تعداد [illegible] حقیقت کا علم زمینوں کی تقسیم کے [illegible] [illegible] [illegible] ملکیت کے

[illegible]

اندازہ لگایا جاسکتا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جاری ہے [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] ظاہر ہے کہ [illegible] [illegible] قائم ہے۔

پٹے داری کی اصلاح

پٹے داری کی اصلاحات کا قانون [illegible] میگھالیہ اور [illegible] کے سوا تمام ریاستوں میں بنایا گیا۔ ان قوانین کے مطابق ریاستی سرکار کو مزارعوں کو زمین کی ملکیت عطا کرنی [illegible] زمینداروں کو معقول معاوضہ ادا کر کے زمین کی ملکیت کا اندراج اپنے نام کرانا تھا۔ پٹے داری کی مدت کا تحفظ ہونا تھا اور [illegible] کی رقم مقرر کی جانی تھی لیکن ان قوانین پر یکساں عمل نہیں ہوا۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

زمین کی پھر سے تقسیم

[illegible] میں تمام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تمام ریاستوں میں زمین کی زیادہ سے زیادہ حد کے قوانین بنائے گئے [illegible] [illegible] ریاستوں میں [illegible] قانون [illegible] زیادہ سے زیادہ حد [illegible] [illegible] میں فاضل قرار دی گئی اس کا کل رقبہ [illegible] لاکھ [illegible] ہزار ایکڑ تھا اس میں سے ۴۶ لاکھ [illegible] ایکڑ زمین [illegible] پانچ سال [illegible] [illegible] تقسیم کی جا چکی تھی [illegible] باقی

ناموزوں زمین کی تقسیم [illegible]
[illegible] زمین کی مقدار محدود
[illegible] ملکیت مالکان
کے پاس سے [illegible] اس امر کے پیش نظر کہ
[illegible] تقسیم کے نتیجے میں [illegible]
عمل میں [illegible]
[illegible] زیادہ ملکیت [illegible]
کیا جاسکتا ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھنے
کے ساتھ ملکیت اراضی کی اوسط کم ہو رہی
ہے لہٰذا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ملکیت کی حد
مزید کم کی جائے۔

استعمال اراضی ملک کی [illegible] استعمال [illegible] حاصل [illegible] استعمالات [illegible] مختلف علاقوں میں [illegible] استعمال اراضی میں [illegible] زرعی پیداوار [illegible] بٹائی [illegible] کرنے والوں اور چھوٹے مالکان زمین میں [illegible] استعمال اراضی [illegible] تاہم استعمال اراضی کے کام کو [illegible] ملکیت [illegible] اکٹھا کیا جاسکے اور [illegible] دیگر ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔

زراعت مستقل کی جائے۔ ضروری ہے کہ زمین کے ریکارڈوں کی تجدید کی جائے۔ اور ان پر [illegible] مالک یا مزارعہ کے نام [illegible] ریاستی حکومت کے پاس اس مقصد کے لیے ایک مخصوص اسکیم ہے لیکن [illegible] کی حیثیت اطمینان بخش نہیں ہے اور ضروری ہے کہ انتظام اراضی میں کوئی تبدیلی کر کے [illegible] ریکارڈوں کو [illegible] کیا جائے۔

اصلاحات اراضی میں کامیابی کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ زمین ابھی بھی بھارت میں سب سے اہم پیداوار

> زمین ابھی تک بھارت میں سب سے اہم جائیداد ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کھیت کو بھی ایک کنبے کے لئے روزگار اور آمدنی کے لحاظ سے منافع بخش بنایا جا سکتا ہے۔

ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کھیت کو بھی ایک کنبے کے لئے روزگار اور آمدنی کے لحاظ سے منافع بخش بنایا جا سکتا ہے۔ ہماری دو تہائی آبادی کا انحصار ابھی بھی زمین پر ہے۔ اگر اصلاحات اراضی پر کامیابی سے عمل کیا جائے تو غریبی دور کرنے اور زراعت میں زیادہ سرمایہ کاری کرنے میں [illegible] مدد ملے گی۔

> زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھنے کے ساتھ ملکیت اراضی کی اوسط کم ہو رہی ہے لہٰذا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ملکیت کی حد مزید کم کی جائے۔

اراضی کے ریکارڈ کی تجدید

مقررہ حد سے زیادہ زمین کی تقسیم ہو یا سابق بے زمین مزارعوں کو مالکانہ حقوق ملیں یا زمین جانشینی فروخت یا عطیہ کے

جس سے پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے

آٹھویں منصوبے میں اصلاحات اراضی کے منصوبے پر کامیابی سے عمل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ منصوبے میں اس کے درج ذیل مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

(i) انتظام میں کے تعلقات کی پھر سے ترتیب تاکہ سماجی برابری کا ڈھانچہ بنایا جا سکے۔

(ii) زمین پر باہمی تعلق کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کیا جاسکے۔

(iii) کاشت کار کے لیے زمین کے نصب العین کو حاصل کیا جائے۔

(iv) دیہات کے غریب لوگوں کی زمین کی میعاد کو وسیع کر کے ان کے سماجی و اقتصادی حالات کو بہتر بنایا جائے۔

(v) زرعی پیداوار اور پیداواریت میں اضافہ کیا جائے۔

(vi) دیہات کے غریبوں کی حالت زمین کی بنا پر سدھاری جائے

(vii) مقامی اداروں میں یکسانیت کا اور زیادہ عنصر داخل کیا جاسکے۔

اصلاحات اراضی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ حقیقی کاشت کاروں میں اُن کے حقوق کے بارے میں زیادہ بیداری پیدا کی جائے اور انھیں فائدہ اٹھانے میں مدد دی جائے۔ حد سے زیادہ زمین کا پتہ لگایا جائے اور اسے تقسیم کیا جائے۔ اس کے علاوہ بنجر اور خراب زمین بھی غریب اور بے زمین لوگوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ اس بات کا اہتمام کرنے کے لیے کہ جو زمین تقسیم کی گئی ہے وہ زیر کاشت لائی جائے زراعت کے لیے درکار ضروری اشیاء انھیں مہیا کی جائیں۔

(باقی صفحہ ۸۱ پر)

ڈاکٹر جی۔ ایل۔ کول

باغبانی کا فروغ — نئے رجحانات

مصنف کا کہنا ہے کہ [illegible] انقلاب [illegible] کی
پیداوار میں انقلاب برپا کیا [illegible]
کے طور پر پانی کی سطحوں، مٹی کی صحت اور زرعی [illegible] نظام پر برے اثرات [illegible]
ہے جو کاشتکاروں اور ملک دونوں کے لئے
کسی ایسی زراعت کو فروغ دینے کی ضرورت تھی
مصنف پُر امید ہے کہ باغبانی کی پیداوار کے وسیع تر
نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے

ہندوستانی زراعت نے گزشتہ ۴۰ برسوں میں اپنی عام ڈگر سے کئی قدم آگے بڑھایا ہے جس کی وجہ سے وہ ملک کے مستقبل کی منصوبوں میں شامل ہونے لگی ہے۔ ملک کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ موسم کی ستم ظریفیوں سے ہونے والے نقصانات کو برداشت کرنے اور دوبارہ اٹھنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس کی اس طاقت سے ان تباہیوں کے اثرات کو دور رکھنے میں مدد ملی ہے جو عموماً سالانہ پیداوار میں دفعتاً رونما ہونے والی کمیوں کے بعد نازل ہوتی ہیں۔

سبز انقلاب کو اکثر دنیا میں منصوبہ سازوں، کاریگروں اور پالیسیوں کی بدولت حاصل ہونے والی عظیم کامیابی کی ایک انوکھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ سبز انقلاب سے ملک اپنی اناج کی ضرورتوں کو خود پورا کرنے کے قابل ہو گیا۔ اناج کی دستیابی ۱۹۵۱ء میں ۳۵۰ گرام سے بڑھ کر ۹۰-۱۹۸۹ میں زائد از ۶ گرام یومیہ ہو گئی اور لطف تو یہ ہے کہ اس مدت میں ملک کی آبادی دوگنی ہو گئی تھی لیکن ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ ملک میں سبز انقلاب کا اثر زیادہ تر گیہوں اور دھان کی پیداوار تک ہی محدود رہا۔ تاہم جہاں ان دو بڑی اجناس کی پیداوار بڑھی وہاں پیداوار کی لاگت (یعنی ان اشیاء کی جن کی کھیتی میں ضرورت پڑتی ہے) اور مجموعی پیداواری اخراجات میں بھی اضافہ ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ زراعت سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے [illegible] تمام اعلیٰ اخراجات ادا کرنے کے لئے تیار رہنے والا کاشتکار، ہمارے [illegible] سہولیات اور اناج کی سرکاری خریداری کی پالیسی سے آنے والی یقینی قیمتوں کے باوجود [illegible] قابل کاشت اراضی کا استعمال [illegible] ہندوستان میں زیادہ تر بارانی زمین سے گیہوں اور دھان کی کاشت کے [illegible] ایک [illegible] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی سطحوں، مٹی کی صحت اور حیاتیات مجموعی طور سے زرعی قدرتی نظام میں گراوٹ آئی۔ زیر زمین پانی کا بے دریغ استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے پانی کی سطح گھٹ گئی ہے اور بہت سے علاقوں میں مٹی کھاری ہونے لگی ہے۔ اس میں اور بھی کئی کمیاں پیدا ہو گئیں

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

اور فصلی کیڑوں اور فصلی بیماریوں کی شکایات ہو گئی۔ یہ صورت حال کاشت کاروں، منصوبہ سازوں اور پالیسی تیار کرنے والوں کے لئے باعث تشویش بن گئی۔ چنانچہ زراعت کو متنوع بنانے کی بات سوچی گئی کیونکہ روایتی زراعت سے ملنے والے ... میں ... والی ... کا ... ظاہر تھا

زراعت کو متنوع بنانا

زمین کے روایتی استعمال کو زیادہ ... فصلیں اگانے ... زیادہ ... زمین ... لئے استعمال ... متنوع ... روایتی زراعت ... ایک ... بنایا جا سکتا ...

اب ... متنوع ... باغبانی زمین کے استعمال کا ایک ... اور معاشی اعتبار سے فائدہ مند متبادل ہے۔ اس کے ساتھ ملک کے زرعی منظرنامے میں ایک نیا باب کھل رہا ہے۔ مثال کے طور پر ... جہاں ... کی پیداوار اور قابل ... تک پہنچ گئی تھی۔ ... زراعت سے ہونے والی آمدنی کو برقرار رکھنے کے لیے زراعت میں تنوع کو ایک بڑے ... تیار ہوا ... اس نے ۱۹۷۶ء میں قائم کی گئی ... کی سفارشات تسلیم کر لیں جن میں اس ... قابل کاشت اراضی کے تقریباً ۲۵ء۶ فی صد رقبے پر ... باغبانی کی فصلیں اگانے کی ... کی گئی تھی کہ ۱۹۷۶ء میں اس ریاست میں صرف ۵ء۱ فی صد رقبے پر باغبانی کی جاتی تھی۔ ... ان سفارشات پر عمل درآمد شروع بھی کر دیا۔ اور آج موصولہ اطلاعات کے مطابق وہاں تیس فی صد سے زیادہ رقبے پر باغبانی کی فصلیں اگائی جا رہی ہیں۔

خشک زمین والے علاقے

ملک کے خشک زمین والے علاقوں کے جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں باغبانی ... پایا جاتا ہے۔

ملک میں کل قابل کاشت اراضی کا ۶ فی صد سے زیادہ رقبہ خشک علاقوں پر مشتمل ہے جن کا ملک کی مجموعی زرعی پیداوار میں صرف ۴۵ فی صد حصہ ہے۔ اس میں سے خشک زمین کا رقبہ ملک کے کل قابل کاشت رقبے کا ۲ فی صد ہے جو تقریباً ۳۱ ملین ہیکٹر بنتا ہے لیکن اس میں سات ملین ہیکٹر کا سرد ریگستانی علاقہ شامل نہیں ہے جو جموں و کشمیر کے لداخ ڈویژن میں واقع ہے۔ گرم اور خشک خطے میں بارش کی اوسط ... اور صرف ۱۶۰ ملی میٹر سے ۴۵۰ ملی میٹر کے درمیان ہے۔ وہاں کی فضا میں نمی کم ہے۔ پانی کے بخارات بن کر اڑ جانے سے پانی کا نقصان بہت ہوتا ہے۔ اس خطے کی مٹی میں کافی زیادہ شوریت ہے۔ اس میں نمی کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت بھی بہت کم ہے۔ ایسی حالت میں وہاں اناج یا دیگر اجناس کی فصلیں اگانا ایک جوکھم بھرا کام ہے۔ وہاں تو باغبانی ہی زیادہ بہتر رہے گی اور بیر، انار، کھجور، انجیر کے درخت لگانا مناسب ہوگا۔

اسی طرح نیم خشک اور خشک اور کم مرطوب علاقوں میں، جو آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، گجرات، ہریانہ، تمل ناڈو وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، پیداوار غیر مستحکم رہی ہے کیونکہ وہاں غلط وقت پر بارش ہونے یا وقت پر کافی بارش نہ ہونے سے اکثر فصلیں خراب ہو جاتی ہیں۔ ان علاقوں میں زمین اور مویشیوں دونوں کی پیداوار کم ہے۔ بارش کا زیادہ تر پانی یوں ہی بہہ جاتا ہے اور آب پاشی کے لیے پانی ذخیرہ کرنے کا زیادہ انتظام بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں آم جیسے پھلوں کا لاگت اور فائدے کا تناسب ۳ء۲۵ ہے جب کہ مونگ پھلی وغیرہ کا ۲ سے بھی کم۔ لہٰذا ان علاقوں میں دوسری فصلوں کی بجائے پھلوں کی فصلیں اگانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور روایتی فصلوں کی جگہ آم، امرود، بیر، کاجو اور ایک خاص قسم کے سیب کے پودے بڑے پیمانے پر لگائے جا رہے ہیں۔

> زراعت کو متنوع بنانے کی حکمت عملی کے تحت باغبانی زمین کے استعمال کا ایک بہترین اور معاشی اعتبار سے فائدہ مند متبادل ہے۔ اس کے ساتھ ملک کے زرعی منظر نامے میں ایک نیا باب کھل رہا ہے۔

> ملک کے خشک زمین والے علاقوں کے جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں باغبانی کے لیے موافق رجحان پایا جاتا ہے۔

دیگر ریاستیں

دوسری ریاستیں جہاں روایتی فصلوں

باغبانی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ مہاراشٹر اور گجرات ہیں۔ مہاراشٹر میں گذشتہ دس برسوں میں باغبانی کی فصلوں کے رقبۂ کاشت اور پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے — ۸۲-۱۹۸۱ء میں باغبانی کی فصلیں جن میں مصالحہ جات بھی شامل تھے ۲،۶ لاکھ ہیکٹیئر میں پیدا کی گئی تھیں۔ لیکن ۹۲-۱۹۹۱ء میں ان فصلوں کا رقبۂ کاشت بڑھ کر ۴،۶ لاکھ ہیکٹیئر ہو گیا۔ اس طرح باغبانی کی فصلوں کے رقبۂ کاشت میں تقریباً ۱۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ توسیعی پروگرام میں زیادہ حصہ انگور، آم اور کاجو وغیرہ کی فصلوں کا تھا۔ گجرات میں ساٹھ کی دہائی تک بیر کی کاشت کا نام و نشان نہیں تھا لیکن آج وہاں ۴۵ ہیکٹیئر اراضی پر بیر کی کاشت کی جا رہی ہے۔ آم، کھجور وغیرہ کے پیڑ بھی وسیع پیمانے پر لگائے جا رہے ہیں، اتر پردیش، آندھرا پردیش، پنجاب، ہریانہ، تمل ناڈو اور گجرات وغیرہ کے خشک علاقوں میں آملہ اور بیر کے پیڑ لگائے جا رہے ہیں۔ کیرالہ زراعت کو متنوع بنا کر باغبانی اختیار کرنے کی ایک اور مثال پیش کرتا ہے۔ اس ریاست میں دھان کا رقبۂ کاشت گذشتہ بیس برسوں میں تقریباً ۲۲ فی صد کم ہو گیا ہے جب کہ باغبانی کے رقبے میں ۶۶-۱۹۶۵ء سے ۳۳ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس میں چائے، قہوہ اور ربڑ کے باغات بھی شامل ہیں۔ زراعت کو متنوع بنانے کے لیے ربڑ کی کاشت سب سے زیادہ رقبے پر کاشت کی گئی ہے اور اس کے بعد قہوہ، کاجو، الائچی اور ناریل کا نمبر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ برآمداتی امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ قیمت دلانے والی فصلوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

روغنی پام کی کاشت :- زراعت کو متنوع بنانے کے لیے باغبانی کو اور باغبانی میں سب سے زیادہ ترجیح روغنی پام کی کاشت کو دی جا رہی ہے۔ سرخ روغنی پام ہمیں دو اہم ترین نباتی تیل، ریڈ پام آئل اور پام کرنیل آئل فراہم کرتا ہے۔ یہ دونوں تیل اس درخت کے پھل سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ایک سال میں ایک ہیکٹیئر اراضی پر اس کی فصل سے ۶ تا ۸ ٹن تیل حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہنے کو تو روغنی پام کی کاشت بھارت میں ۱۸۳۴ء میں شروع کی گئی تھی لیکن اس کی باقاعدہ کاشت کا آغاز کیرالہ میں ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ تاہم اس فصل پر زیادہ زور تیل نکالنے کے بیجوں سے متعلق ٹکنالوجی مشن کے تقرر کے بعد ہی دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ مشن ملک کو خوردنی تیلوں کی ضروریات میں خود کفیل بنانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔

روغنی پام کو ملک کی خوردنی تیل کی ضرورت کو طویل مدتی بنیاد پر پورا کرنے کا ایک سب سے اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مختلف ریاستوں میں پانچ لاکھ ہیکٹیئر سے زیادہ اراضی جہاں زیادہ تر چاول اور گنے کی کاشت کی جاتی تھی اس فصل کے لیے موزوں

> روغنی پام کو ملک کی خوردنی تیل کی ضرورت کو طویل مدتی بنیاد پر پورا کرنے کا ایک سب سے اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مختلف ریاستوں میں پانچ لاکھ ہیکٹیئر سے زیادہ اراضی جہاں زیادہ تر چاول اور گنے کی کاشت کی جاتی تھی اس فصل کے لیے موزوں قرار دی گئی ہے۔

قرار دی گئی ہے۔ یہ ریاستیں ہیں تمل ناڈو، کرناٹک، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال، اڑیسہ، گجرات، تری پورہ اور آسام۔ بہت سی پرائیویٹ کمپنیوں نے بیرون ملک سے بہتر قسم کے مخلوط بیج درآمد کر کے ... ۵۲-۱۹۵۱ء میں ۱۱،۲ ملین ہیکٹیئر تھا۔ لیکن ۱۹۹۰ء تک یہ بڑھ کر ۲،۳ ملین ہیکٹیئر ہو گیا۔ اسی طرح پیداوار جو ۲،۸ ملین ٹن تھی بڑھ کر ۲۱،۲ ملین ٹن ہو گئی ہے۔ لوبیا میں تو کے رقبۂ کاشت میں اسی مدت

سرگرمیوں میں وسیع باغات لگوائے ہیں۔ ابتدائی فصل لگانے کے لیے مرکزی حکومت کاشتکاروں کو مالی تعاون فراہم کرتی ہے بلکہ پیداوار نی حلقوں کے ہر ایک تیل نکالنے کے اجتماعی یونٹ قائم کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔

اہمیت

اگرچہ پھلوں، سبزیوں، پھولوں، مصالحہ جات، خوشبودار پودوں اور جڑی بوٹیوں جیسی باغبانی کی فصلیں کل زیر کاشت علاقے کے ۷ فی صد یا اس سے کچھ زیادہ رقبے پر ہی اگائی جاتی ہیں تاہم ملک کی کل زرعی پیداوار کی قیمت میں ان کا حصہ ...

اس فصلوں کے رقبۂ کاشت اور پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر پھل مہیا کرنے والے باغات کے تحت

میں ۳۴۴ فی صد کا اور آلو کی پیداوار میں ۸۸ از ۴۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ باغباتی فصلوں میں کاجو کے رقبۂ کاشت میں ۱۳۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔

جہاں یہ فصلیں ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ کرتی ہیں۔ وہاں وہ کاشت کاروں کو اناج کی فصلوں کی بہ نسبت زیادہ آمدنی دلانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ پھل اور سبزیاں فی یونٹ رقبۂ کاشت پیداوار سے ۲۰ تا ۳۰ فی صد زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ دلاسکتی ہیں۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے معاملے میں بھی یہ فصلیں دوسری فصلوں سے بہتر ثابت ہوتی ہیں۔ پھلوں کی کاشت کے لیے ایک ہیکٹیئر اراضی پر اوسطاً ۱۶۹۰ روپے کی لیبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب کہ اناج کی

حاصل ہوتی ہے اور وہ وٹامن اے اور سی اور کیلشیم، مینگنیشیم اور لوہا وغیرہ حاصل کرنے کا سب سے سستا ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی محکمۂ زراعت کے خوراک کا انتخاب کرنے میں مدد دینے والے کتابچوں میں ۱۹۲۰ء سے پھلوں اور سبزیوں کو سب سے اہم مقام دیا جاتا رہا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی خوراک اور سبزیوں کی کھپت بڑھ رہی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں پھلوں اور سبزیوں کی سالانہ کھپت میں اضافے کی شرح ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲.۵ فی صد سے بڑھ کر حالیہ برسوں میں ۶.۵ فی صد ہوگئی ہے۔ شہری علاقوں میں پھلوں اور سبزیوں کی کھپت مقابلتاً زیادہ ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سن دو ہزار تک صرف

> پھل اور سبزیاں فی یونٹ رقبۂ کاشت پیداوار سے ۲۰ تا ۳۰ فی صد زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ دلاسکتی ہیں۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے معاملے میں بھی یہ فصلیں دوسری فصلوں سے بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

فصلوں کے لیے ۱۴۰ نفری ایام کا کام درکار ہوتا ہے۔ انگور، کیلے اور اناس جیسی فصلیں اس سے بہت زیادہ روزگار فراہم کرتی ہیں۔ موٹے طور پر دہ فی ہیکٹیئر ۱۰۰۰ تا ۲۵۰ نفری ایام کا روزگار مہیا کرسکتی ہیں۔

غذائی پہلو

علاوہ ازیں باغبانی کی فصلیں عوام کے صحتی معیاروں کو بہتر بنانے میں بھی معاون ہوتی ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ پھلوں اور سبزیوں سے ہمیں زیادہ وٹامن اور معدنیات ملتے ہیں جو جسمانی صحت کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ پھل اور سبزیوں سے ہمیں زیادہ غذائیت بخش

ملک کے اندر ہی پھلوں کی مانگ ۵۴ ملین ٹن سے زیادہ اور سبزیوں کی مانگ تقریباً ۱۱۵ ملین ٹن ہوجائے گی۔ اتنی زیادہ پیداوار پھلوں اور سبزیوں کے زیر کاشت علاقے میں بھاری توسیع کرکے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں میں اس بات کا احساس پیدا ہوگا کہ انھیں اچھی تندرستی کے لیے بہتر خوراک لینی چاہیے ویسے ویسے پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے دباؤ بڑھے گا۔

ترقیاتی پروگرام

زمین کی پیداواریت بڑھانے، سبز کاشت کاروں کی اقتصادی حالت اور ملک

کی مجموعی معیشت کو بہتر بنانے میں باغ کی فصلوں کے مسلّمہ رول کو ملحوظ رکھتے ہو حالیہ برسوں میں ان فصلوں کی توسیع و کافی زور دیا گیا ہے۔ ان فصلوں پر چوت منصوبے تک زیادہ توجہ مبذول نہیں کی جس کے نتیجے میں ان فصلوں کے بارے میں اور توسیعی خدمات اور ذیلی سہولیات میں بہت محدود رہا۔ تاہم ساتویں منصوبے میں سرگرمیوں کے لیے ۲۴ کروڑ روپے مخصوص کئے جب کہ ماقبل منصوبے میں صرف ۶ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ موجودہ منصوبے میں باغبانی کی فصلوں کے لیے کروڑ روپے مختص کرکے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے ہیں۔

لہذا آٹھویں منصوبے کو ملک میں کی ترقی کے لیے ایک اہم سنگ میل قرار

> موجودہ منصوبے میں باغبانی کی فصلوں کے لیے ۱۰ کروڑ روپے مختص کرکے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے ہیں۔

جاسکتا ہے۔ اب پہلی مرتبہ پھولوں، س مال، جڑی بوٹیوں، خوشبودار پودوں مشروم جیسی فصلوں کی ترقی کی اسکیمیں کی جارہی ہیں۔ ان فصلوں سے پیدا ہا رکھنے والے امور کے لیے بھاری اخراجا والے خصوصی پروگرام تجویز کیے جارہے یہ امور ہیں باغبانی میں پلاسٹکس کا استع کاٹی ہوئی فصل کے رکھ رکھاؤ اور فروخ وغیرہ کے لیے ذیلی ڈھانچے کی سہولیات برآمدات کی حوصلہ افزائی۔ ان پروگرام مقصد اصلی اور عمدہ کوالٹی کے بیج/ پودا کا

کے سامان کی بہم رسانی بہتر بنایا اور بہتر ٹکنالوجی جس میں پانی کا بندوبست، مچھلی کیڑوں اور بیماریوں کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں، کے استعمال کو اس طرح بڑھانا ہے کہ محنت یا مال کی کوئی تضیع نہ ہو اور صنعتوں اور برآمدات کے لیے فاضل پیداوار دستیاب ہو سکے۔

نئے رجحانات

ملک کے موجودہ زرعی منظر میں باغبانی کو دی جانے والی اہمیت کی وجہ سے کچھ نئے رجحانات دیکھنے میں آئے ہیں۔ پرائیویٹ (نجی) سیکٹر باغبانی کے شعبے میں شمولیت کر رہا ہے اور پروڈیوسر باغبان کو فصلیں اگلے کی صلاحیت کا پورا استعمال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حکومت کی قواعد وضوابط کو نرم بنانے کی پالیسی سے باغبانی کی ترقی میں کافی مدد ملی ہے۔ ایک برس پہلے نئی بیج پالیسی لاگو کی گئی ہے۔ جس کے تحت ہندوستانی کاشتکار بیرونی ملک سے باغبانی کی فصلوں خصوصاً پھلوں، سبزیوں اور پھولوں کے بیج یا پودے درآمد کرنے کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ملک میں زیادہ پیداوار دینے والے بیج اور پودوں کا استعمال شروع کرنے اور پیداوار بڑھنے کے لیے ہندوستانی اور غیرملکی کمپنیوں کے درمیان کئی مشترکہ پروجیکٹ شروع کئے گئے ہیں۔ پرائیویٹ پروڈیوسروں نے بہتر ساز وسامان یا ٹکنالوجی درآمد کرنے اور/یا اپنی پیداوار دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کے لیے بین الاقوامی رابطے قائم کرنے میں دلچسپی لی ہے۔ باغبانی رفتہ رفتہ ملک کے برآمدی پروگراموں کا ایک بڑا جزو بنتی جا رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زرعی اشیا ر

اور بڑا بس شدہ انسانے خوراک کی ضروریات بڑھانے سے متعلق اهارنڈ کے مطابق دنیا کی پھل منڈی [illegible] فی صد سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی ہے جب کہ ہندوستان کی سالانہ پیداوار میں ۲۵ تا ۳۰ فی صد اضافہ کرنے کی گنجائش موجود ہے کیوں کہ یہاں کی آب و ہوا میں مختلف قسموں کی فصلیں اگائی جا سکتی ہیں

> باغبانی رفتہ رفتہ ملک کے برآمدی پروگراموں کا ایک بڑا جزو بنتی جا رہی ہے۔

یہاں کافی دھوپ بھی دستیاب ہے اور لیبر بھی سستی ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ میں بھارت سے ۵۴ر۴۱ کروڑ روپے کے پھول او [illegible] یا پودے روانہ کیے گئے [illegible] جب کہ ملک میں موجودہ [illegible] رکھتے ہوئے اگلے [illegible] کروڑ روپے کا نشانہ [illegible] نشانے کو پورا کرنا کوئی مشکل [illegible]

ملک میں نئی اقسام کی بڑے پیمانے پر [illegible] اور ٹشو کلچر کی سہولیات مہیا ہیں۔ پھولوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے محدود خطہ کاشت یا دوسرے خطوں میں "گرین ہاؤسوں" کا استعمال بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ حکومت گرین ہاؤس اور ٹشو کلچر یونٹ قائم کرنے کے لیے امداد فراہم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پھولوں کی کٹائی کے بعد پھولوں کے محفوظ رکھ رکھاؤ کے لیے کئی یونٹ قائم کرنے کی منظوری دی جا چکی ہے۔

زیادہ محاصل کی کوشش

کئی علاقوں خصوصاً جنوبی ہندوستان [illegible] میں کم مقدار سے زیادہ قیمت دلانے والی فصلوں [illegible] زیادہ [illegible] جا رہا ہے جیسے کالی مرچ، [illegible] کوکو، الائچی اور دیگر مسالوں کی فصلیں [illegible] جا رہی ہے جو ملکی اور بین الاقوامی منڈیوں میں اونچے داموں پر فروخت ہوتی ہیں۔ کاجو کی پیداوار [illegible] اور زیادہ پیداوار دینے والی اقسام [illegible] پودے لگانے پر زور [illegible] حاصل [illegible]

[illegible] تجارتی [illegible] اور [illegible] پیداوار [illegible] کی جائیں۔

اسی طرح کوکو کی کاشت بھی اب پہلے سے زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ کیوں کہ اب کوکو یا چاکلیٹ اور چاکلیٹ سے بننے والی مٹھائیوں میں زیادہ استعمال ہونے لگا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً دس برس پہلے کاشتکاروں نے کوکو کی کاشت ترک کر دی تھی اور اس کے پیڑ اکھاڑ پھینکے تھے کیوں کہ اس کی مانگ کم ہو گئی تھی اور قیمت بھی گر گئی تھی۔ آج اس کی پیداوار [illegible] ٹن ہے اور اس میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان مصالحہ جات کا ایک بہت بڑا برآمد کار تھا اور مصالحہ جات کی عالمی تجارت میں ۸۵ فی صد حصہ بھارت کا

ممالک سے یہ حصہ کافی کم ہو گیا ہے۔ اس لئے اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ممالک [illegible] کی کوالٹی بہتر بنا کر ان کی برآمدات میں اضافہ کیا جائے اور ہندوستان کو مسالحہ جات کی تجارت میں [illegible] اس کا [illegible] مقام دلایا جائے۔ اس [illegible] کی اسکیموں نے [illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible] کاشت [illegible] ہے [illegible] کافی حاصل [illegible] اس کی [illegible] لیے مارکیٹ سے [illegible] ان [illegible] اس کی کاشت [illegible] بہت [illegible] مختلف حصوں میں [illegible] کاشت [illegible] اور [illegible] نقصان سے [illegible] جاتی ہے۔ حالیہ برسوں میں [illegible] (کولڈ سٹوریج) زیادہ [illegible] میں اگائے جاتے ہیں کیونکہ ان کے اگنے کے لئے ایک خاص درجۂ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج اس طریقے سے اگائے جانے والے [illegible] کی پیداوار ۲۶ ایم۔ ٹی ہے جب کہ دس سال پہلے یہ قریب قریب نہیں کے برابر تھی۔ [illegible] حالات میں [illegible] کی کھیتی دھیرے دھیرے وسعت اختیار کر رہی ہے۔ حال ہی میں ایسے مشروم کی پیداوار اور [illegible] کے لئے بڑے پیمانے کے دو مربوط پروجیکٹ شروع کئے گئے ہیں ان میں سے ایک مدراس کے نزدیک اور دوسرا دیہرہ دون میں شروع کیا گیا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں تقریباً بیس اسکیموں کا رجسٹریشن کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سی اسکیمیں غیر ملکی ٹکنالوجی اور مالی اشتراک سے شروع کی جائیں گی۔ مرکزی سیکٹر کے پروگرام کے تحت ہر ریاست میں [illegible] کی کھیتی کے لیے [illegible] الگ الگ قسموں کے [illegible] مالی امداد دی جاتی ہے۔

بے مثال کامیابی

پھلوں میں آم، انگور، لیچی اور [illegible] اور [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اضافہ [illegible] آیا ہے۔ انگور کی برآمدات میں [illegible] اضافہ ہوا ہے اور اس کی وجہ [illegible] انگور [illegible] والوں نے انگور کی کاشت کے لئے [illegible] استعمال [illegible] اور [illegible] [illegible] کی [illegible] فصل کی [illegible] انگور [illegible] کی [illegible] حال [illegible] اور [illegible] انگور کی کاشت [illegible] اضافہ ہوا ہے [illegible] انگور کی پیداوار [illegible] ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

انگور اور آم کی برآمدات میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ re-cooling [illegible] کی سہولیات مہیا کر دی گئی ہیں۔ اور [illegible] اور [illegible] میں [illegible] کے لئے [illegible] اور [illegible] مہیا کی گئی ہے۔ [illegible] کئی سال تک ان [illegible] میں [illegible] ہوئے ہیں [illegible] نہیں [illegible] سکے۔ [illegible] موسم انگور کی فراہمی کافی زیادہ قیمت دلاتی ہے۔ [illegible] کی برآمدات میں بھی قیمت اور مقدار دونوں ہی لحاظ سے اضافہ ہوا ہے اور ایک حوصلہ افزا رجحان یہ ہے کہ غیر ممالک کی تازہ پھلوں کی تجارت میں اب [illegible] کے علاوہ آم کی دوسری قسمیں بھی داخل ہو گئی ہیں۔

برآمدی تجارت میں لیچی نئی نئی داخل ہوئی ہے لیکن اس کی سالانہ برآمدات دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے۔ چوں کہ کوالٹی اور وسائل کے بہتر [illegible] پر آج کل زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس لیے باغبانی کی فصلوں میں پلاسٹکس کے استعمال میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔

ٹپکاؤ کا طریقۂ آب پاشی ملک میں آج سے دس سال پہلے شروع کیا گیا تھا۔ چونکہ اس طریقے سے پانی کی بچت ہوتی ہے اور پیداوار کی کوالٹی بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ پیداوار بھی بڑھتی ہے اس لیے پرائیویٹ اور [illegible] دونوں ہی سیکٹر اس پر کافی زیادہ [illegible] رہے ہیں۔ چنانچہ ٹپکاؤ کے طریقۂ آب پاشی (The drip irrigation Systems) کے تحت رقبہ کاشت ۱۹۸۵ء میں [illegible] ہیکٹیئر سے بڑھ کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں [illegible] ہیکٹیئر ہو گیا۔ اس طریقے سے [illegible] فی صد تک پانی کی بچت ہوتی ہے اور باغبانی کی کئی فصلوں کی پیداوار بھی ۲ تا [illegible] فی صد بڑھ سکتی ہے۔ اس طریقے سے کیمیاوی کھاد اور [illegible] کی بچت کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ یہ طریقہ پہاڑی اور کم پانی والے علاقوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ پلاسٹک کا استعمال گرین ہاؤس (Poly houses) میں عمدہ کوالٹی اور زیادہ قیمت دلانے والی فصلوں کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔ گرین ہاؤس کی کاشت میں اتنا سریع اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ ٹپکاؤ والے طریقہ آب پاشی میں ہوا ہے۔ لیکن گرین ہاؤسوں کو برآمدات کے لیے بے موسم پھولوں اور سبزیوں کی کاشت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور اچھا رجحان یہ دیکھنے میں آیا ہے

یہ جلد خراب ہو جانے والی فصلوں کی پیداوار کی کٹائی کے بعد رکھ رکھاؤ کے لیے بہتر طریقے استعمال کرنے پر زور دیا جا رہا ہے اور حکومت بھی ملک میں مناسب ذیلی سہولیات پیدا کرنے کے لیے کھلے دل سے امداد دے رہی ہے جیسا کہ سبھی جانتے ہیں ہندوستان میں جلد خراب ہونے والی فصلوں کی ۲۵ تا ۳۰ فی صد مقدار ہر سال کٹائی کے بعد کے رکھ رکھاؤ کے دوران ضائع ہو جاتی ہے جس سے قریباً ۳۰۰ کروڑ روپے

> ایک اور اچھا رجحان یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جلد خراب ہو جانے والی فصلوں کی پیداوار کی کٹائی کے بعد رکھ رکھاؤ کے لیے بہتر طریقے استعمال کرنے پر زور دیا جا رہا ہے، اور حکومت بھی ملک میں مناسب ذیلی سہولیات پیدا کرنے کے لیے کھلے دل سے امداد دے رہی ہے۔

کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی فصلوں کی کٹائی کے بعد کے رکھ رکھاؤ کے لیے بہتر طریقے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ اس سلسلے میں ایک امید افزا رجحان یہ ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر فصل کی کٹائی کے بعد پیداوار کے بہتر رکھ رکھاؤ کی سہولیات فراہم کرنے اور پری کولنگ یونٹوں جیسی بہتر ٹکنالوجیوں کے استعمال، انگوروں کی پیکنگ کے لیے پیپر گارڈ کے استعمال، پلاسٹک کی کریٹوں کے استعمال اور لکڑی کی پیٹیوں کے بجائے بہتر پیکنگ کے استعمال کو فروغ دینے اور پیداوار کی منظم مارکیٹنگ وغیرہ کا انتظام کرنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔

●

بقیہ: زرعی ترقی کے لیے موزوں ٹکنالوجیاں تیار کرنے کی ضرورت

متعین کرنے اور ریسرچ اور ڈیولپمنٹ میں خود کفالت حاصل کرنے کے لیے سبز انقلاب کی ٹکنالوجی کی بہ نسبت زیادہ رول ادا کرنا پڑے گا۔ چوں کہ بھارت میں زیر کاشت رقبے کا کافی بڑا حصہ ایسا ہے جہاں زرعی، موسمی حالات کھیتی کے لیے ناموافق ہیں اس لیے ترقی اور انصاف کے [illegible] عین مناسب ہوگا کہ ناموافق کاشت کے لیے موزوں ٹکنالو[illegible] کرنے کے کام پر سرمایہ لگایا جا[illegible]۔

جدید بایوٹکنالوجیوں سے [illegible] امکانات روشنی میں آئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے بھی اس طرح کی سرمایہ کاری فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اس لیے بھی کہ مشرقی ہندوستان جیسے ناموافق خطوں میں اصل پیداوار اور ممکنہ پیداوار میں کافی فرق ہے اور اس فرق کو دور کرنا ضروری ہے۔

چوں کہ بایوٹکنالوجیوں نے ہمارے لیے بہت سے راستے کھول دئے ہیں اس لیے ہمارے ماہرین معاشیات اور سماجی سائنس دانوں کو موزوں ٹکنالوجیوں کا انتخاب کرنے کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ ماہرین معاشیات اس وقت تک زیادہ تر سبز [illegible] کھاد ٹکنالوجی کے نتائج کا تجزیہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں [illegible] زرعی سائنسدانوں یا پالیسی سازوں کے اشتراک سے موزوں ٹکنالوجیاں تیار کرنے کے معاملے میں ان کا رول محدود رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زرعی ٹکنالوجی سے متعلق پالیسی کی تشکیل اور موزوں ٹکنالوجیاں تیار کرنے کے لیے زرعی ماہرین معاشیات اور زرعی سائنسدانوں کو یکجا کرکے ان کے درمیان اشتراک عمل بڑھایا جائے۔

●

— اداریہ

علاقوں کی [illegible] زرعی ترقی، زرعی پیداوار کے [illegible] طریقے اور مناسب ٹکنالوجیوں کی تلاش، تحقیق [illegible]

[illegible]

زرعی [illegible] کی [illegible] مکمل [illegible] میں [illegible] سے کچھ اور حکمت عملی کے خاطر [illegible] کے تحت رکھا جا سکتا ہے لیکن ہماری فوری ضرورت [illegible] کی [illegible] [illegible] کی [illegible] میں [illegible] کی بھی [illegible] متحمل نہیں ہو سکتے۔

[illegible] ہونا چاہیئے [illegible] پیداوار بڑھانے اور پیداواریت کی [illegible] ترقی کو برقرار رکھنے

اے۔ این۔ پربھو

ڈنکل تجاویز اور بھارت

ڈنکل مسودے کی بھارت سے متعلقہ تجاویز کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مصنف نے کہا ہے کہ بھارت زراعت کے بارے میں یقینی طور پر اپنی پالیسی پر عمل کرے گا کیونکہ ہمارے لیے زراعت تجارت نہیں بلکہ طرز زندگی ہے۔ تاہم مصنف کا خیال ہے کہ [illegible] خود کفالت ایسے معاملے نہیں ہیں جن پر کوئی سمجھوتہ کیا جا سکے۔

شاید کبھی کسی رپورٹ پر اتنی وسیع اور عمیق تبادلۂ خیال نہیں کیا گیا جتنا ڈنکل مسودے کے متن پر کیا گیا ہے۔ تجارت اور محاصل پر معاہدے (GATT) کے سابق ڈائرکٹر جنرل سر آرتھر ڈنکل نے ستمبر ۱۹۸٦ء میں شروع کیے گئے اورو گوئے بات چیت کی بنا پر تجاویز کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے۔ یہ بات چیت دسمبر ۱۹۹۰ء میں ختم ہو جانی تھی لیکن متنازعہ امور میں اُلجھ کر رہ گئی۔

بات چیت میں یہ جمود زراعت، ذہنی املاک کے حقوق اور کپڑے کی تجارت کے امور پر ممبروں میں اختلاف رائے سے پیدا ہوا۔ ڈنکل تجاویز میں اُس مرحلے کو مدنظر رکھا گیا ہے، جہاں بات چیت میں رکاوٹ پڑی ہے اور اُن اختلافات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد متن میں تجاویز کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا ہے جن میں بات چیت میں شریک تمام ملکوں کے مفادات کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح اس مسودے کا مقصد اس بات چیت کو ایک قدم آگے بڑھانا ہے اور اس طرح بات چیت میں شریک ممالک کو اظہارِ خیال کے لیے نئے نکات مہیا کرنا ہے۔

بھارت میں ڈنکل مسودے کا متن بحث کا موضوع بن گیا ہے جیسا کہ عام طور پر تجویز بن جاتی ہے۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس مسودے میں بات چیت میں شریک ممالک کی مختلف آراء میں مصالحت کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کسی ملک کے لیے موافق حال تمام نکات کو تجاویز میں شامل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ اس لیے بہت سے پیچیدہ مسائل پر ایک عمومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسودے کے متن پر زیادہ تر نکتہ چینی زراعت، ذہنی املاک کے حقوق اور تجارت سے متعلقہ سرمایہ کاری کے اقدامات کی بنا پر کی گئی ہے۔ دیگر امور کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

مسودے کا متن اور زراعت

زراعت میں زیادہ تشویش گھریلو مالی امداد، سرکاری نظام تقسیم، غیر ملکی فروخت کنندگان کی بھارتی منڈیوں تک رسائی اور بیجوں کو پیٹنٹ کرانے جیسی تجاویز ظاہر کی گئی ہیں۔

مسودے کے متن میں دو اقسام کی مالی امداد کی وضاحت کی گئی ہے۔ پیداواری سبسڈی اور غیر پیداواری سبسڈی یا مالی امداد۔ غیر پیداواری مالی مدد وہ ہے، جو کیمیائی کھاد، پانی، بیجوں، کیڑے مار دوائیوں اور تمام فصلوں کے لیے دستیاب قرضوں کے خرچ کے بارے میں ہے۔ مسودے کے متن میں ترقی پذیر ملکوں کے لیے اس مالی مدد میں کوئی کمی تجویز نہیں کی گئی اگر اُس کی مالیت ۱۹۸٦ء سے ۱۹۸۹ء کے برسوں میں

زراعت کی کل پیداوار کی مالیت کے دس فی صد سے کم ہو۔ یہاں بھی غریب اور چھوٹے کسانوں کو دی جانے والی امداد تجاویز سے مستثنیٰ رکھی گئی ہے۔

وزارت تجارت نے اندازہ لگایا ہے کہ بھارت میں ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک غیر پیداواری مقاصد کے لیے جو سب سڈی دی گئی، وہ پانچ اعشاریہ دو فی صد سے زیادہ نہیں تھی اور اگر چھوٹے اور غریب کسانوں کو دی گئی مالی امداد بھی شامل کر لی جائے جن کی تعداد ۸۰ فی صد ہے تو یہ تناسب اور بھی کم ہو جائے گا۔

وزارت نے یہ بھی شمار کیا ہے کہ اگر پیداواری اور غیر پیداوار پر دو قسم کی مالی امداد کو جمع کر لیا جائے تو بھارت میں اکثر اقسام کی پیداوار کے لیے یہ مجموعہ منفی ہوگا اور ایک یا دو اشیا کے لیے دس فی صد سے کم رہے گا۔

ڈنکل مسودے کے متن میں صارفین کے تئیں ملک کی ذمہ داریوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تقسیم کے سرکاری نظام کو مسودے میں شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ ایک سب سڈی ہے جو کسانوں اور صارفین کو دی جاتی ہے۔

بھارت کو یقین دلایا گیا ہے کہ اگر ڈنکل مسودے کا متن منظور کر لیا گیا تو فوڈ کارپوریشن یا سرکاری تقسیم کی دوکانوں میں کیا گیا اناج کا ذخیرہ کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوگا۔

وزارت میں کیے گئے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۳ میں سے ۲۰ اشیا میں سب سڈی میں بھارت میں کمی ہو سکتی ہے کیوں کہ بین الاقوامی منڈی میں قیمتوں سے زیادہ ہیں۔ صرف تین اشیا ایسی ہیں جیسے کہ گنا، مونگ پھلی کا تیل اور تمباکو جہاں یہ مالی امداد دس فی صد کی حد سے تجاوز کر جانے کا امکان ہے۔ تاہم دس فی صد کی حد کا اطلاق کسی ایک چیز پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر کیا جائے گا خلاف رہے یا اُسے اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑے۔ تجارت کے بارے میں معاہدہ جو نو برس کے لیے ہے جس کے آخر میں اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس دوران میں بھارت کو ادائیگی کے توازن کا مسئلہ درپیش رہے۔ کم از کم فی الحال بھارت کو درآمدات کی کمی کم از کم مقدار کے لیے تجارتی ملکوں کو کسی ضمانت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ نو برس کے بعد کیا ہوگا اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

> بھارت میں ڈنکل مسودے کا متن بحث کا موضوع بنا ہے جیسا کہ عام طور پر تجویز بنے جاتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس مسودے میں بات چیت میں ۱۰۷ گیٹ ممالک کے مختلف آرا میں مصالحت کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زرعی درآمدات

ڈنکل مسودے کے متن

کہ بھارت کی منڈیوں کی ضرورت کی ... کا کم از کم تین فی صد حصہ درآمد کرنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق بھارت پر نہیں ہوگا کیوں کہ گیٹ معاہدے میں یہ ملک ادائیگیوں کے توازن میں خسارے میں چل رہا ہے۔ ادائیگیوں کے توازن کے مسئلہ کی وجہ سے بھارت درآمدات پر پابندی یا درآمدات کی قاعدہ بندی کر سکتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ادائیگیوں کے توازن ہمیشہ ہی بھارت کے

بیجوں کا پیٹنٹ نہ کرانا

عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ بھارت کو بیج پیٹنٹ کرانے ہوں گے جس کا نظام

... نظام کا انتخاب خود کر سکتا ہے۔

حکومت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ آج بھارت میں بیج پیٹنٹ نہیں ہو سکتے اور اس کا موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ حکومت نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ پودوں کی اقسام کے تحفظ کے لیے اپنا نظام ہی اختیار کرے گی۔ جس کے تحت پودے تیار کرنے والوں کو اُن کے حقوق کی اسناد دی جا سکتی ہیں۔ بھارت نے واضح

> بھارت کو یقین دلایا گیا ہے کہ اگر ڈنکل مسودے کا متن منظور کر لیا گیا تو فوڈ کارپوریشن یا سرکاری تقسیم کی دوکانوں میں کیا گیا اناج کا ذخیرہ کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوگا۔

کردیا ہے کہ پودوں کے تحفظ کے اس نظام میں "کسانوں کے حقوق" اور "محققوں کے حقوق" کا اہتمام ہوگا۔ کسانوں کے حقوق کا مطلب ہوگا کہ کسان اپنا بیج خود استعمال کرسکیں گے یا اپنی روایات کے مطابق گاؤں کے لوگوں سے تبدیل کرسکیں گے۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ چونکہ اس کے اپنے نظام کے تحت کسانوں کے حقوق کا پورا تحفظ ہوگا۔ اس لیے اس الزام میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ کسان اپنے استعمال کے لیے بیج نہیں رکھ سکیں گے اور انھیں ہر برس کثیر ملکی کمپنیوں سے بیج خرید کرنا ہوگا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پودے تیار کرنے والوں کے حقوق کے اس نظام سے بازار میں بہتر اقسام کے بیج آسکیں گے اور اس کا زیادہ فائدہ بھارت کے زرعی تحقیق کے اداروں کو ہی حاصل ہوگا۔

> ڈنکل مسودے کا متن کسی ملک کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ بیج یا پودوں کی اقسام کو پیٹینٹ کرائے۔ بلکہ ہر ایک ملک پودوں کی اقسام کے لیے اپنے نظام کا انتخاب خود کر سکتا ہے۔

کوئی لین دین نہیں ہوسکتا

مذکورہ بالا امور سے ظاہر ہے کہ اس امر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ بھارت اپنی زرعی پالیسی پر عمل نہیں کرسکے گا — بھارت کے لیے زراعت تجارت نہیں طرزِ حیات ہے۔ ۸۵ کروڑ باشندوں میں سے دو تہائی کا انحصار زراعت پر ہے اس لیے اس سے اُن کی آزادی پر کسی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خوراک کی سلامتی اور خوراک کے لحاظ سے خودکفالت ایسے معاملات ہیں جن پر کوئی سمجھوتہ یا لین دین نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سبسڈی کا سوال صنعتی ممالک کے لیے بھاری اہمیت رکھتا ہے۔ جھگڑا امریکہ اور یورپی اقتصادی برادری کے درمیان ہے دونوں زراعت پر بھاری مالی مدد دیتے ہیں۔ انھیں آپس میں کوئی سمجھوتہ کرکے اوروگے بات چیت کو پھر سے شروع کرانا ہوگا۔ اگر وہ زرعی پیداوار پر سبسڈی کم کردیں تو اُن کی قیمتیں ضروری ہے کہ چڑھ جائیں گی اور ترقی پذیر ملکوں سے یہ اشیاء وہاں برآمد کی جاسکیں گی۔

ذہنی املاک کے حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ اس کے سات حصے ہیں: کاپی رائٹ، ٹریڈ مارک، حقیقی نمونے، انٹیگریٹیڈ سرکٹ، جغرافیائی علامات اور پٹینٹس۔ پٹینٹس کو چھوڑ کر باقی چھ شعبوں میں بھارتی قوانین پالیسیاں اور قواعد اور انتظامیہ و عدالتی انتظامات باقی دنیا کے ممالک جیسے ہی ہیں۔ لیکن پٹینٹس کے بارے میں مباحثہ باقی بچھ مدوں پر غالب آجاتا ہے۔ جس سے دنیا کو یہ تاثر ملتا ہے کہ بھارت ذہنی املاک کے حقوق میں یقین نہیں رکھتا اور بھارت میں ان حقوق کی چوری یا جعل سازی معاف کردی جاتی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ صرف پٹینٹس کے شعبے میں اور وہ بھی دوائیوں کے فارمولوں میں ڈنکل مسودے کے متن کے اصولوں اور بھارت کے پٹینٹس کے قانون ۱۹۷۰ء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

> اس الزام میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ کسان اپنے استعمال کے لیے بیج نہیں رکھ سکیں گے اور انھیں ہر برس کثیر ملکی کمپنیوں سے بیج خرید کرنا ہوگا۔

بھارتی قانون میں طریقۂ عمل کو نہ کہ پیداوار کو پٹینٹ کرانے کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن ڈنکل مسودے میں ہر قسم کے پٹینٹس جس میں ٹکنالوجی کی پیداوار کی تمام اقسام بھی شامل ہیں۔ ۲۰ برس کے لیے حقوق کی بات کہی گئی ہے۔ بھارت میں خوراک اور دوائیوں کے لیے پٹینٹ کی معیاد سات برس اور باقی تمام شعبوں کے لیے ۱۴ برس ہے۔ ڈنکل مسودے میں کہا گیا ہے کہ تمام ترقی پذیر ملکوں کو ذہنی املاک کے حقوق کے معاہدے کو اختیار کرنے کے لیے پانچ برس کی عبوری مدت دی جائے گی۔ اور اگر وہ اوروگے معاہدے پر عمل درآمد کی تاریخ کو ٹکنالوجی کی پیداوار پر پٹینٹ کا حق نہ دے رہے ہوں تو انھیں معاہدے میں شامل ہونے کی درخواست دینے کے لیے مزید پانچ برس کی مہلت دی جائے گی۔ اس لیے بھارت کو ٹکنالوجی کی اس پیداوار کے لیے جہاں پر پٹینٹ کی سہولت

(باقی کور صفحہ پر)

سریندر سُود

زرعی مال کی برآمد کو فروغ

ہندوستان کے زرعی مال کی عالمی سطح پر برآمدات سے نہ صرف کسانوں
کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ دیہی شعبے کے
کی کافی عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی
برآمد میں اضافے کو اس لیے بھی زیادہ اہمیت
سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے اور زراعت کو

اگرچہ ہندوستانی زرعی مال کی برآمد کی تاریخ کافی پرانی ہے البتہ اس پر اتنی توجہ مرکوز نہیں کی گئی جتنی اب کی جا رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گذشتہ کئی دہوں میں سارا زور اس بات پر رہا کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اجناس کی ضرورت پوری کی جائے۔ یہ ضروری بھی تھا کیوں کہ ایک نو آزاد ملک کے لیے بعد دیگرے ہر سال کثیر مقدار میں اناج درآمد کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں اناج کی برآمد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ایک قدرتی امر تھا۔

اب صورتِ حال بڑی حد تک بدل چکی ہے۔ اناج کا مسئلہ کم و بیش حل ہو چکا ہے اور زرعی شعبے میں استحکام آگیا ہے۔ اناج کی جو فاضل مقدار ہوتی ہے اس کی کوئی مقررہ حد نہیں ہے اس کے باوجود ملک اس برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہے حالیہ دنوں میں یہ نظریہ عام ہو رہا ہے کہ زیادہ آمدنی والا زرعی مال برآمد کر کے غیر ملکی زرِ مبادلہ کمایا جائے اور ضرورت پڑنے پر مقابلتاً ارزاں مال درآمد کیا جائے۔ ملک میں حال ہی میں جو اقتصادی اصلاحات کی گئیں ان میں زرعی مال کی برآمد کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔

زرعی مال کی برآمد سے ملک کی ادائیگیوں کے توازن کو بہتر بنانے کی غرض سے نہ صرف غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل ہوگا بلکہ مجموعی طور پر زرعی فروغ کی رفتار بھی برقرار رکھی جا سکے گی۔

عالمی سطح پر ہندوستانی اجناس کی برآمد سے کسانوں کی آمدنی میں تو اضافہ ہوگا ہی

مال ہوگا جس کی کافی عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ ہندوستان روایتی طور پر جو مال برآمد کرتا ہے اس کے لیے نئی نئی منڈیاں تلاش کی جا رہی ہیں ساتھ ہی بین الاقوامی بازار کی ضروریات کے مطابق برآمد کے لیے نئی نئی چیزوں کی بھی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

روایتی طور پر ہندوستان دنیا کے متعدد ملکوں کو بہت سی اشیاء برآمد کرنے والا ایک اہم ملک ہے۔ ان اشیاء میں چائے، مونگ پھلی، تمباکو، چینی، مصالحے اور خام کپاس وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستان پٹ سن کی مصنوعات، سوت، کپڑا اور چمڑے وغیرہ جیسا زراعت پر مبنی تیار مال فراہم کرنے والا ایک بڑا ملک ہے۔ تاہم ۱۹۶۰ء تک زرعی مال کی برآمد میں کوئی خاص پیش رفت

نہیں ہوئی۔ برآمدات کی آمدنی میں اس کے بعد سے کچھ اضافہ ہونا شروع ہوا اس کی وجہ کسی حد تک عالمی معیشت میں افراطِ زر اور ہندوستانی مال کی مانگ میں اضافہ تھا اس کے باوجود اس شعبے کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں تھی اور برآمدی صلاحیت و امکانات کا جو پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ گذشتہ چند برسوں سے ہی زرعی مال کی برآمد میں اصلاح کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ مالی ترغیبات نے اس برآمد کاروں کی سلسلہ […] کی جا رہی ہے نیز ان کی کوششوں میں ہاتھ بٹایا جا رہا ہے۔ برآمد کے لیے درکار اہم بنیادی ڈھانچے پر بھی اب ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اب اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بین الاقوامی معیار کے مطابق مال تیار کیا جا سکے اور درآمد کاروں کی مانگ پوری کی جا سکے۔ نتیجے کے طور پر روایتی اشیاء کے مقابلے میں نئی نئی چیزوں کی برآمد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جب کہ بعض روایتی اشیاء کی برآمد میں تو کمی تک آ رہی ہے۔

زرعی مال کی برآمد اور درآمد کے سلسلہ میں حکومت کی پالیسی میں دو اہم مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ اندرونِ ملک عوام کو زرعی مال کی مناسب قیمت پر دستیابی کو یقینی بناتے ہوئے (i) زرعی مال کی زیادہ سے زیادہ برآمد اور غیر ملکی زرمبادلہ کمانا نیز کسانوں کو اپنے مال کی منافع بخش قیمت دلانا اور (iii) حقیقت پسندانہ درآمدی پالیسی جس کے تحت حکومت مانگ رسد کی صورتِ حال، اندرونِ ملک پیداوار اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر وغیرہ جیسے عوامل کو ذہن میں رکھتی ہے۔

اب اس بات کا احساس کیا جا رہا ہے کہ زرعی مال کی برآمد روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے علاوہ زراعت کو بھی متنوع بناتی ہے۔ زرعی شعبے میں درآمد میں کمی کی وجہ سے زرعی مال کی برآمد کی اور بھی زیادہ اہمیت بڑھ گئی ہے۔

> زرعی مال کی برآمد سے ملک کی ادائیگیوں کے توازن کو بہتر بنانے کی کوشش ہے۔ صرف غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہو گا بلکہ مجموعی طور پر زرعی فروغ کی رفتار بھی برقرار رکھی جا سکے گی۔

اپریل ۱۹۹۲ء سے مارچ ۱۹۹۷ء تک کی برآمدی اور درآمدی پالیسی میں زرعی مال کی برآمد کے لیے نئی نئی گنجائشیں نکالی گئی ہے۔ تلہن، خوردنی تیل، دالوں، صاف کی ہوئی دالوں، ناریل اور کھوپرا اور گنے جیسی اشیاء کی برآمد پر عائد پابندی ختم کر دی گئی۔ اب لائسنس کے تحت ان چیزوں کی برآمد کی جا سکتی ہے۔ پیاز وغیرہ جیسی اشیاء کی برآمد کو باضابطہ بنا دیا گیا۔ ان چیزوں کی برآمد ہندوستان کی قومی زرعی امداد باہمی مارکیٹنگ فیڈریشن (NAFED) اور ہندوستان کی قبائلی امداد باہمی مارکیٹنگ فیڈریشن (TRIFED) کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ سمندر سے حاصل ہونے والی اشیاء، کاجو، مصالحوں، تازہ پھل اور سبزیاں اور پھولوں وغیرہ کی برآمد آزادانہ طور پر کی جا سکتی ہے۔ باسمتی اور دوسرے اقسام کے چاول کی برآمد کم از کم برآمدی قیمت کے مطابق جب کہ تلہن کی برآمد متعلقہ ادارے کے ساتھ ٹھیکے کے مطابق کی جا سکتی ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران زرعی مال کی برآمد میں قابلِ قدر اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ان چیزوں میں چاول، تلہن، پھل اور سبزیوں نیز سمندری مصنوعات کی برآمد بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران برآمدی رجحان کافی حوصلہ افزا رہا ہے۔ چاول، تلہن اور سمندر سے حاصل ہونے والی چیزوں کی برآمد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری اندازوں کے مطابق ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران زرعی مال کی برآمد ۷,۶۰۰ کروڑ روپے سے تجاوز کر گئی ۹۲-۱۹۹۱ء کے مقابلے میں یہ تقریباً ۲۳ فی صد زیادہ ہے جب کہ ۶۲۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کا مال برآمد کیا گیا تھا۔

> روایتی اشیاء کے مقابلے میں نئی نئی چیزوں کی برآمد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جب کہ بعض روایتی اشیاء کی برآمد میں تو کمی تک آ رہی ہے۔

زرعی پیش رفت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران زرعی مال کی برآمد ۸۵۰۰ کروڑ روپے تک پہنچنے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ البتہ چاول، کپاس اور کچھ دوسری اشیاء کی برآمدی پالیسیوں میں فرق کی وجہ سے ۳۰ فی صدی

اضافہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

کرسٹی بھون کا خیال ہے کہ پالیسیوں میں معقولیت لا کر صرف چاول کی برآمد کو ہی بڑھا کر ایک ارب ڈالر تک پہنچایا جا سکتا ہے جب کہ اس وقت اس کی مالیت محض ۳ کروڑ ڈالر ہے۔

غیر حقیقت پسندانہ کم از کم برآمدی قیمت اور ضروری اشیا سے متعلق قانون کے مطابق ذخیرہ کرنے کی حد چاول کی برآمد بڑھانے میں دو اہم رکاوٹیں ثابت ہو رہی ہیں البتہ غیر باسمتی چاول کی برآمد پر عائد پابندی پہلے ہی ختم کی جا چکی ہے۔ باسمتی چاول کی کم از کم برآمدی قیمت ۵۵ روپے فی ٹن

اس میں ہندوستان کا بہت کم حصہ ہوتا ہے۔ پاکستان جیسے ملک اپنی پیداوار کا تقریباً ۵۰ فی صدی چاول برآمد کرتے ہیں۔ امریکہ بھی جہاں چالیس پچاس لاکھ ٹن چاول کی پیداوار ہوتی ہے لگ بھگ ۵۰ فی صدی چاول برآمد کرتا ہے۔

عمدہ قسم کے باسمتی چاول کی پیداوار کے معاملے میں ہندوستان ایک اہم ملک ہے۔ ہر سال عالمی منڈی میں اس چاول کی ۰ ، ڈالر فی ٹن سے ۰ ا ڈالر فی ٹن کے حساب سے تجارت ہوتی ہے۔ اس چاول کی منڈی میں برابر مانگ رہے گی یہی حالت باسمتی کی دوسری اقسام کا ہے جن کی قیمت تو کم

قسم کا باسمتی چاول (تقریباً ۴ کروڑ ڈالر کی مالیت کا) دس لاکھ ٹن اوسط قسم کا باسمتی چاول اور (۲۰ کروڑ ڈالر کی مالیت کا) لگ بھگ اسی مقدار میں عام قسم کا چاول برآمد کر سکے گا۔ اس برآمدی چاول کی مجموعی مالیت ایک ارب ڈالر ہوئی

گندم کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو ہندوستان عالمی منڈی کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر سکتا ہے عالمی منڈی میں ڈیوم قسم کے گیہوں کی (یہ ایک سخت قسم کا گیہوں ہوتا ہے جو سویاں وغیرہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے) اچھی مانگ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس گیہوں پر دوسرے گیہوں کے مقابلے میں [illegible]

اپریل ۱۹۹۲ء سے مارچ ۱۹۹۰ء تک کی برآمد اور درآمد پالیسی میں زرعی مال کی برآمد کے لئے نئے راستے نکالے گئے ہیں۔ بہت سے چھوٹے دانے والے، دلی ہوئی دالوں، ناریل اور کھوپرا اور گڑ جیسی اشیا کی برآمد پر عائد پابندی ختم کر دی گئی۔ اب لائسنس کے تحت ان چیزوں کی برآمد کی جا سکتی ہے۔

اور غیر باسمتی چاول کی قیمت ۲۷۵ روپے فی ٹن، غیر حقیقت پسندانہ ہے اوسط قسم کے باسمتی چاول کی عالمی قیمت جس کی اچھی خاصی مانگ رہتی ہے لگ بھگ ۴۰۰ ڈالر فی ٹن ہے۔ لہذا کم از کم برآمدی قیمت کے ضابطوں کے مطابق اوسط قسم کے باسمتی اور اسی طرح کے بعض دوسرے چاول باسمتی کے برابر مانے جاتے ہیں۔ اس لیے برآمد کار ایسے غیر ملکوں میں فروخت نہیں کر سکتے۔ اس طرح ملک بیش بہا غیر ملکی زر مبادلہ سے محروم ہو رہا ہے۔

ہر سال بین الاقوامی منڈی میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن چاول کا کاروبار ہوتا ہے۔

ہے لیکن عالمی سطح پر اس کی اچھی خاصی مانگ رہتی ہے۔

وزارت زراعت کا خیال ہے کہ اگر کم از کم برآمدی قیمت کا اصول ختم کر دیا جائے یا پھر اس میں خاطر خواہ کمی

کرسٹی بھون کا خیال ہے کہ پالیسیوں میں معقولیت لا کر صرف چاول کی برآمد کو ہی بڑھا کر ایک ارب ڈالر تک پہنچایا جا سکتا ہے جب کہ اس وقت اس کی مالیت محض ۳۰ کروڑ ڈالر ہے۔

کر دی جائے تو ہندوستان (اندازاً ۴۰ کروڑ ڈالر کی مالیت کا) پانچ لاکھ ٹن عمدہ

کی طرح ہی زیادہ ہوتی ہے لیکن کہ اس کی خاص دیہاتی روٹی تیار ہوتی ہے وہ بھی اچھی نہیں ہوتی اگر ڈیوم گیہوں کے لیے منڈی کی اچھی سہولیات مہیا کر دی جائیں تو کسان اس گیہوں کی بڑے پیمانے پر کاشت شروع کر سکتے ہیں کیوں کہ آج کل اس کی کئی نئی اقسام دستیاب ہیں جن سے پیداوار بھی زیادہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ گیہوں کی مصنوعات کی برآمد پر عائد پابندی کو بھی ہٹانا ہوگا

کیوں کہ گیہوں کے معاملے میں اس کی مصنوعات کی مانگ زیادہ ہے۔ آج کل دنیا بھر میں تیار غذا بہت مقبول ہو رہی ہے۔

خلیج کے اور دوسرے ممالک میں جہاں ہندوستانی کثیر تعداد میں آباد ہیں استعمال کی دالوں کے کنزیومر پیکس (Consumer packs) کی بہت زیادہ مانگ ہے اس لیے وزارت زراعت نے تجویز رکھی ہے کہ اس کی برآمد پر عائد شدہ پابندی اٹھالی جائے۔ اس طرح جو آمدنی ہوگی اُسے وزارت بڑے پیمانے

قیمت دینے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ ارہر، مسور اور موٹھ جیسی ہندوستانی دالوں کی اُن علاقوں میں جہاں ہندوستانی اور پاکستانی کثیر تعداد میں آباد ہیں بہت زیادہ مانگ رہتی ہیں اور ان سے آمدنی بھی اچھی رہتی ہے۔ ان دالوں کی برآمد سے جو غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوگا اُسے بین الاقوامی بازار میں بہ آسانی دستیاب "ٹر" اور "مونگ" جیسی دالوں کو کثیر مقدار میں درآمد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وزارت زراعت کے اندازوں کے مطابق عام دالوں کے

نفیس قسم کی باسمتی چاولوں کی پیداوار کے معاملے میں ہندوستان ایک اہم ملک ہے۔ بین الاقوامی منڈی میں اس چاول کی ۵۰۰ ڈالر فی ٹن سے ۱۰۰۰ ڈالر فی ٹن کے حساب سے تجارت ہوتی ہے۔ اس چاول کی منڈی میں برابر مانگ رہے گی بشرطیکہ باسمتی کی دوسری اقسام کا بھی جن کی قیمت تو کم ہے لیکن عالمی سطح پر اس کی اچھی خاصی مانگ رہتی ہے

قسم کے خوردنی تیل درآمد کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح عام دالوں کے مقابلے میں جنھیں روایتی طور پر عام آدمی استعمال کرتے ہیں عمدہ اقسام کی دالوں کی بہت زیادہ مانگ ہے۔ ہندوستان کا شمار دنیا میں نہ صرف سب سے زیادہ دال پیدا کرنے والے ملکوں میں ہوتا ہے بلکہ یہاں دالوں کو صاف کرنے اور انھیں ڈبہ بند کرنے کی بھی بہترین سہولیات موجود ہیں۔ بیرونِ ملک آباد ہندوستانی عمدہ قسم کی ہندوستانی دالیں خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ اس کی زیادہ

مقابلے میں دیگر دالیں ۵۰ ٹن اور ایک لاکھ ٹن کے درمیان برآمد کی جا سکتی ہیں۔

'I SED' اور اس کے معاون اداروں نے ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ۱۸۳،۲۴ کروڑ روپے کی مالیت کی ۶ء۱۶ لاکھ ٹن دالیں برآمد کیں۔ جو کہ ایک نیا ریکارڈ ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران گذشتہ ستمبر تک ۵ء۲ لاکھ ٹن دالیں برآمد کی گئیں۔

کپاس کی پیداوار بھی حالیہ برسوں میں نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ تاہم اس رفتار سے برآمد میں اضافہ نہیں ہوا جس کی کئی وجوہات ہیں۔ رواں سال کے دوران

کپاس کی برآمد کا کوٹہ بہت کم رکھا گیا اور یہ بہت تاخیر سے جاری کیا گیا۔ اس کے اجرا میں تاخیر سے نہ صرف ملک کو بلکہ کسانوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر بروقت ایک دو لاکھ گانٹھیں برآمد کر دی جاتیں تو ملک کو ۱۳۰۰ کروڑ روپے کا غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوتا۔ اگرچہ سال کے لیے مجموعی برآمدی کوٹے میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وزارتِ زراعت کپاس کی کاشت کرنے والے کسانوں کے مفاد میں مزید اضافے کی کوشش کر رہی ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو منڈی میں پیر جمانے کے لیے کپاس کی برآمد کو مستحکم کرنا ہوگا اور یہ برآمد باقاعدگی سے کرنی ہوگی۔ ہمارے ملک کی کپڑے کی صنعت کپاس کی مخصوص کچھ ہی اقسام استعمال کر پاتی ہے۔ لہذا دوسری اقسام کی طویل مدتی بنیاد پر برآمد کی جا سکتی ہے۔ کپاس کو برآمد

گیہوں کی مصنوعات کی برآمد پر عائد پابندی کو بھی ہٹانا ہوگا کیوں کہ گیہوں کے مقابلے میں اس کی مصنوعات کی مانگ زیادہ ہے۔ آج کل دنیا بھر میں تیار غذا بہت مقبول ہو رہی ہے۔

کرنے سے پہلے اسے دھاگے میں تبدیل کر کے اس کی برآمدی قدر و قیمت بڑھائی جا سکتی ہے۔

سمندر سے حاصل ہونے والی مصنوعات کی برآمد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور یہ غیر ملکی زرمبادلہ کمانے

کا ایک بڑا ذریعہ بنتا جارہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ برسوں میں یہ شعبہ اور زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا کیوں کہ سمندری اشیاء خوردنی کو ڈبہ بند کرنے کی صنعت کو کھلے عام لائسنس کے تحت لانے اور اس پر محصول کم کردینے کی وجہ سے اسے تیزی سے جدید رنگ میں ڈھالا جارہا ہے۔

علاوہ ازیں ان چیزوں کی برآمد میں تیار ہو رہی ہے اور برآمد کے لیے فاضل چینی مہیا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔

تازہ اور ڈبہ بند پھل اور سبزیاں، پھول، گوشت اور گوشت کی مصنوعات ایسی دوسری اہم چیزیں ہیں جن کی برآمد کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اس وقت ان کی برآمد بہت ہی کم ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ان چیزوں کی برآمد کے لیے درکار بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر سرد خانوں کا نہ ہونا اور مناسب سہولیات کا فقدان ہے۔ اس کے باوجود ان چیزوں کی برآمد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

پھلوں کے معاملے میں ملک میں مختلف آب و ہوائیں قدرتی عطیہ ہیں۔ سال کے مختلف مہینوں میں ملک بھر میں ہر قسم کے پھل، سبزیاں اور پھول پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح سال بھر برآمدی آرڈر پورے کیے جا سکتے ہیں۔ دراصل ہندوستانی مال کی نئی منڈیوں کا پتہ چلانے کے لیے پہلے ہی کوشش جاری ہے۔

زیادہ قیمتی اور ڈبہ بند پھلوں اور سبزیوں کی برآمد کے بھی بہتر امکانات پائے جاتے ہیں۔ پھلوں کے جوس، گودے جام، اچار، چٹنی ڈبہ بند پھل اور سبزیوں پھلوں کے گودے، خشک سبزیاں، منجمد پھلوں اور منجمد ... کی طور ...

ہندوستان کا شمار دنیا میں نہ صرف سب سے زیادہ دال پیدا کرنے والے ملکوں میں ہوتا ہے بلکہ یہاں دالوں کو صاف کرنے اور انھیں ڈبہ بند کرنے کی بھی بہترین سہولیات موجود ہیں۔ بیرون ملک آباد ہندوستانی عمدہ قسم کی ہندوستانی دالیں خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ اس کی زیادہ قیمت دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

سمندر ...
میں بتد...
کا ایک بڑا
آئندہ برسوں میں بہتر ...
کرے گا کیوں کہ سمندری اشیاء خوردنی کو ڈبہ بند کرنے
کی صنعت کو کھلے عام لائسنس کے تحت لانے اور اس
پر محصول کم کردینے کی وجہ سے اسے تیزی سے جدید رنگ میں
ڈھالا جارہا ہے۔

مزید اضافے کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچہ مہیا کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ پیش رفت ہو رہی ہے۔

گذشتہ دو دہوں میں بین الاقوامی بازار میں چینی کی قیمت اور اندرون ملک اس کی فاضل مقدار کے پیش نظر اس کی برآمد میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ اب یہ بات سوچی جارہی ہے کہ عالمی بازار میں اپنا مقام بنانے کے لئے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ غالباً اس وقت یہ قدم اٹھانے کا بہترین موقع ہے کیوں کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ چینی ہندوستان

پھلوں اور سبزیوں کو ڈبہ بند کرنے اور ان کی پیکنگ کی سہولیات میں بہتری لانا نہایت ضروری ہے۔ •

ملک کی مجموعی برآمد میں زرعی اور سمندری مصنوعات کا حصہ

(کروڑ روپے میں)

سال	ہندوستان کی مجموعی برآمدات	سمندری مصنوعات سمیت زرعی برآمدات	سمندری مصنوعات کے بغیر زرعی برآمدات
۸۸-۱۹۸۷ء	۱۵۶۷۴	(۱۵.۱۰) ۲۳۵۴	(۱۲.۰۳) ۱۹۲۱
۸۹-۱۹۸۸ء	۲۰۲۳۲	(۱۲.۱۱) ۲۵۹۱	(۹.۰۱) ۱۹۶۶

۱۹۸۹-۹۰ء	۲۷۶۸۱	۳۴۸۶ (۱۲٫۶)	۲۷۹۹ (۱۰٫۱)
۱۹۹۰-۹۱ء	۳۲۵۵۳	۴۶۹۶ (۱۴٫۴)	۳۷۳۶ (۱۱٫۵)
۱۹۹۱-۹۲ء	۴۳۸۲۸	۶۱۹۶ (۱۴٫۱)	۴۸۲۲ (۱۱٫۰)
۱۹۹۲-۹۳ء (فروری ۹۳ء تک)	۴۷۲۳۴	۶۳۵۶ (۱۳٫۴)	۴۸۰۰ (۱۰٫۲)

ذرائع: کلکتہ میں واقع تجارتی سراغ رسانی اور اعداد و شمار سے متعلق ڈائرکٹوریٹ جنرل۔
نوٹ: بریکٹ میں ٪ سے مجموعی برآمدات میں حصہ کا اظہار ہوتا ہے۔

سمندری مصنوعات اور زرعی مال کی برآمد

مصنوعات	۱۹۸۷-۸۸ء	۱۹۸۸-۸۹ء	۱۹۸۹-۹۰ء	۱۹۹۰-۹۱ء	۱۹۹۱-۹۲ء
۱۔ چائے	۶۰۱ (۳٫۸۳)	۶۰۹ (۳٫۰۱)	۹۱۷ (۳٫۳۱)	۱۰۷۰ (۳٫۲۹)	۱۱۳۲ (۲۰٫۵۸)
۲۔ کافی	۲۶۲ (۱٫۶۷)	۲۹۸ (۱٫۴۵)	۳۴۰ (۱٫۲۵)	۲۵۲ (۰٫۷۷)	۳۱۰ (۰٫۷۱)
ایک اور دو کا میزان	۸۶۳ (۵٫۵۱)	۹۰۳ (۴٫۴۶)	۱۲۶۴ (۴٫۵۷)	۱۳۲۲ (۴٫۰۶)	۱۴۴۲ (۳٫۲۹)
۳۔ تمباکو	۱۳۵ (۰٫۸۶)	۱۲۵ (۰٫۶۲)	۱۷۵ (۰٫۶۳)	۲۶۳ (۰٫۸۱)	۳۷۷ (۰٫۸۶)
۴۔ مصالحے	۳۳۰ (۲٫۱۵)	۲۷۵ (۱٫۳۶)	۲۷۷ (۱٫۰۰)	۲۳۴ (۰٫۷۲)	۳۷۰ (۰٫۸۴)
۵۔ کاجو	۳۱۱ (۱٫۹۸)	۲۷۶ (۱٫۳۶)	۳۶۸ (۱٫۳۳)	۴۴۷ (۱٫۳۷)	۶۷۲ (۱٫۵۳)
۶۔ سبزیاں اور پھل اور ڈبہ بند مصنوعات	۳۰۴ (۱٫۹۴)	۳۵۲ (۱٫۷۴)	۴۲۰ (۱٫۵۲)	۴۳۴ (۱٫۳۳)	۶۹۵ (۱٫۵۹)
۷۔ گوشت اور اس کی مصنوعات	۸۸ (۰٫۵۶)	۹۴ (۰٫۴۶)	۱۱۴ (۰٫۴۱)	۱۴۰ (۰٫۴۳)	۲۳۱ (۰٫۵۳)
۸۔ سمندری مصنوعات	۵۳۳ (۳٫۴۰)	۶۳۰ (۳٫۱۱)	۶۸۷ (۲٫۴۸)	۹۶۰ (۲٫۹۵)	۱۳۷۴ (۳٫۱۳)
۳ سے ۸ تک کا میزان	۱۷۰۸ (۱۰٫۹۰)	۱۷۵۲ (۸٫۶۶)	۲۰۴۱ (۷٫۳۷)	۲۴۷۸ (۷٫۶۱)	۳۷۱۹ (۸٫۴۹)

۱ سے ۸ تک کا میزان	۲۵۷۱ (۱۶٫۴۰)	۲۶۵۵ (۱۳٫۱۲)	۳۳۰۵ (۱۱٫۹۴)	۳۸۰۰ (۱۱٫۶۷)	۵۱۶۱ (۱۱٫۰۸)
۹۔ چاول	۳۳۹ (۲٫۱۶)	۳۳۱ (۱٫۶۴)	۴۲۷ (۱٫۵۴)	۴۶۲ (۱٫۴۲)	۷۵۵ (۱٫۰۲)
۱۰۔ تیل کی غذا	۲۱۳ (۱٫۳۶)	۴۰۹ (۲٫ ۲)	۶۱۰ (۲٫۲۰)	۶ ۹ (۱٫۸۷)	۸۷۱ (۱٫۹۹)
۹ سے ۱۰ تک کا میزان	۵۵۲ (۳٫۵۲)	۷۴۰ (۳٫۶۶)	۱ ۳۷ (۳٫۷۵)	۱۷۱ (۳٫۲۹)	۱۶۲۶ (۳٫۰۱)
ملک کی مجموعی برآمدات	۱۵۶۷۴	۲ ۲۳۲	۲۷۶۸۲	۳۲۵۵۳	۴ ۳۸۲۹

نوٹ :- بریکٹ میں دی گئی شرح ملک کی مجموعی برآمدات کے فی صد کا اظہار کرتی ہے۔

بقیہ: بھارت کی بنجر زمین کی اصلاح

مرکزی اخراجات کی اسکیم ہے اور اس اسکیم کا مقصد ایسے پراجیکٹوں کے لیے مرکزی امداد کے اقتصادی طور پر قابل عمل معیار میں آتے ہوں مرکزی امداد دے کر کھیتی کے طور پر جنگل بانی کے کام کے لیے ادارہ جاتی مالی امداد مہیا کرنا ہے۔

درج ذیل تنظیمیں اور ادارے اس امداد کے مستحق ہیں :۔

(الف) سرکاری اور نیم سرکاری (مرکزی و ریاستی) کارپوریشنیں۔

(ب) شہری ترقی کے ادارے، میونسپل کارپوریشنیں اور سرکاری خود مختار ادارے۔

(ج) رجسٹرڈ کوآپریٹو انجمنیں

(د) رجسٹرڈ کمپنیاں اور انجمنیں اور ٹرسٹ

اس اسکیم کے تحت پراجیکٹ کا ۲۵ فی صد خرچ مرکزی سرکار اپنی گرہ سے خرچ کے عطیہ کے طور پر دیتی ہے بشرطیکہ

(۱) اتنی ہی رقم مستحق ادارہ یا ادارے اپنی گرہ سے بھی لگائے کے پروگرام سے مالی امداد حاصل ہو گرہ سے لگائی جائے کر لیا جائے گا۔

(۲) متعلقہ منصوبے کا کم از کم ۵۰ فی صد خرچ کوئی مالی ادارہ ادا کرے گا۔ گرانٹ کی رقم اتنی ہوگی جس سے یہ پراجیکٹ کسی بنک سے مالی مدد حاصل کر سکے امداد کا مستحق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اُدھار دینے والے بنک کو اس پراجیکٹ کے بارے میں علم ہونا چاہیئے اور جب بنک اصولی طور پر پراجیکٹ کو منظور کرے گا تب بورڈ اسے اپنی گرہ سے رقم دینے کے بارے میں غور کرے گا۔

مختصراً یہ کہ بنجر زمینوں کی بالعموم اور خاص طور پر جنگلاتی علاقوں میں بحالی کے لیے تاکہ اُنھیں لگاتار کام میں لایا جاسکے ضروری ہے کہ ایک مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر نئیں

اور سائنس و ٹیکنالوجی کے بہتر استعمال کی ضرورت ہے۔ ●

بقیہ: نئی زرعی پالیسی

زراعت کے معاملے میں حکومت اور ملک کو جانا ہے۔

یہ پالیسی ٹھوس حقائق اور عملی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ عوام جہاں تک ممکن ہے اس پالیسی پر تبصرے کریں تاکہ پوری طرح غور و خوض اور بحث کے بعد ایک پالیسی مرتب کی جاسکے۔ حکومت یہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ خواہ مسودے کو قطعی شکل دینے میں مزید وقت لگ جائے لیکن یہ مشق مہنگی نہیں پڑے گی ●

اربند گھوش

زرعی پالیسی کی قرارداد کا مسوّدہ اور زرعی ترقّی

زیر نظر مضمون میں مصنف نے زرعی پالیسی کی قرارداد کے مسودے کے مقاصد واضح طور پر بیان کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس مفروضہ کی بنا پر کہ سن ۲۰۰۰ تک ہمارے ملک کی ضرورت ۲۱۰ ملین ٹن سالانہ ہوگی اناج کی پیداوار بڑھانے کی حکمت عملی میں کوئی ڈھیل نہیں آنی چاہئے کیوں کہ مصنف کا خیال ہے کہ مستقبل میں نہ صرف زیادہ خوراک کی ضرورت ہوگی کیوں کہ ملک میں رونما ہونے والی عظیم سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کی وجہ سے عوام کی توقعات بلند ہوتی جا رہی ہیں۔

ہر سیاستداں، ہر ماہر معاشیات دونوں ہی جب بھی زراعت اور اس کے متعلق کسی پہلو پر اظہار خیال کرتا ہے تو وہ عوام کو یہ یاد دلانا نہیں بھولتا کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور اس کی معیشت زراعت پر مبنی ہوتی ہے، جیسے اس بنیادی حقیقت کو بار بار دہرانا ضروری ہو۔ میں بھی ایک اخبار نویس ہونے کے ناطے ان حضرات سے جدا نہیں ہوں۔

بہرحال "زراعت" کا لفظ ہمارے دلوں میں ملے جلے جذبات پیدا کرتا ہے۔ پہلے تو ہمیں اس بات پر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے کاشتکاروں، زرعی سائنس دانوں اور پالیسی سازوں نے اناج کی پیداوار کو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۵۰.۸۲ ملین ٹن سے بڑھا کر ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱۸۰.۳ ملین ٹن کی سطح پر پہنچا کر ایک عظیم کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر جب ہم سوچتے ہیں کہ اس صدی کے اختتام تک ہندوستان کی آبادی ۱ کروڑ ہو جائے گی تو ہمیں یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ کیا ہندوستان اتنا زیادہ اناج پیدا کر سکے گا کہ کوئی بھی ہندوستانی بھوکا نہ سوئے۔

ساٹھ کی دہائی کے آخر میں ملک میں سبز انقلاب آیا تھا جو ٹکنالوجی کے میدان میں نمایاں پیش رفت کا مرہونِ منت ہے۔ یہ انقلاب اس لیے لایا جا سکا کہ ملک میں اور زیادہ پیداوار دینے والے بیج تیار کیے گئے، آب پاشی کی سہولیات میں وسیع اضافہ ہوا اور کیمیاوی کھاد اور جراثیم کش ادویہ کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے اور اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ واحد نکتہ جس پر زور دینے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ اس ترقی کے باوجود ہندوستانی زراعت کا انحصار ابھی تک مون سون، خصوصاً جنوب مغربی مون سون پر ہے۔

سبز انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد

سبز انقلاب کی رفتار میں اسی کی دہائی کے وسط سے فرق آگیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اناج کی مجموعی پیداوار میں سال بہ سال اتنا اضافہ نہیں ہو رہا ہے جتنا کہ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہوا تھا۔

۶۱ - ۱۹۶۰ء میں اناج کی پیداوار ۸۲ء۱۱
ن ٹن تھی جو ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں ۴۲ء۱۰۸
ں ٹن ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ نمایاں اضافہ
ر انقلاب کا نتیجہ تھا۔ سرکاری اعداد و شمار
ے مطابق ۶۴ - ۱۹۶۳ء تک پیداوار
دہیں ایک ہی سطح پر برقرار رہی تھی لیکن
۔ ۱۹۶۳ء میں یہ گھٹ کر صرف ۰ء۷۰
ں ٹن رہ گئی۔ ۶۵ - ۱۹۶۴ء میں حالت
دھری اور پیداوار ۰ء۸۹ ملین ٹن ہوگئی۔

کافی خراب تھا۔ ان خراب سالوں میں پیداوار
سبز انقلاب کے ابتدائی سالوں کی پیداوار
سے بھی کم کیوں نہ ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ
سبز انقلاب کی بدولت پیداوار میں ناموافق
بارشوں کے باوجود قدرے استحکام آگیا تھا۔
۱۹۷۵ء میں مون سون بہت اچھا رہا جس کی
وجہ سے ہندوستان ایک بار پھر بحالی کی راہ
پر آگیا اور آئندہ چار برس میں پیداوار
۷۶ - ۱۹۷۵ء میں ۰ء۱۲۱ ملین ٹن سے بڑھتے

پالیسیوں سے جن کے تحت ۱۴ جنوری ۱۹۶۵ء
کو فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا قیام عمل میں
لایا گیا۔ ہر سال اناج کی سرکاری خرید کے لئے
کشش انگیز قیمتوں کا اعلان کیا گیا۔ کھیتی
کو فروغ دینے میں بہت مدد ملی۔ ساتویں دہائی
تک ملک اناج کی ضرورتوں میں خود کفیل ہوگیا۔
لیکن اناج کی پیداوار کے لحاظ سے
آٹھویں دہائی کو زیادہ اہم قرار نہیں دیا جا سکتا
آٹھویں دہائی کے پہلے سال ۸۱ - ۱۹۸۰ء میں
ہی اچھے مون سون کی بدولت پیداوار میں
ایک ہی سال میں گذشتہ سال کی بہ نسبت
۲ ملین ٹن کا اضافہ ہوا ... ملین ٹن
ہو ... ۸۴ - ۱۹۸۳ء ... سے ... [illegible]
[illegible]

جب ہم سوچتے ہیں کہ اس صدی کے اختتام تک ہندوستان
کی آبادی ... کروڑ ہو جائے گی تو ہمیں یہ سوال پریشان
کرتا ہے کہ کیا ہندوستان اتنا زیادہ اناج پیدا کر سکے گا کہ کوئی
بھی ہندوستانی بھوکا نہ سوئے۔

س کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں لگاتار
سال مون سون کے دغا دے جانے کے
سبب حالت خراب ہوگئی۔ چنانچہ پیداوار
۱۹۶۶ء میں صرف ۳ء۷۲ ملین ٹن اور ۶۷-۱۹۶۶ء
ں ۰ء۷۴ ملین ٹن کے بقدر ہوئی۔
یہی وہ سال تھے جن میں بیرون ملک
سے بھاری مقدار میں اناج منگانا پڑا۔ صرف
۱۹۶۶ء میں ہی تقریباً ۱۰ ملین ٹن اناج درآمد
کیا گیا۔ اس کے بعد سبز انقلاب آیا اور
۶۸ - ۱۹۶۷ء میں پیداوار ۲۳ ملین ٹن کے
اضافے کے ساتھ ۰ء۹۵ ملین ٹن کی سطح پر
پہنچ گئی۔ ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں پیداوار ۰ء۹۴
ملین ٹن رہ گئی لیکن ۷۰ - ۱۹۶۹ء میں وہ پھر
بڑھ کر ۵ء۹۹ ملین ٹن ہوگئی۔ ۷۱ - ۱۹۷۰ء
کے اعداد و شمار صرف ایک سال میں مزید ۹
ملین ٹن کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔
لیکن بعد کے پانچ سالوں میں پیداوار
پھر گھٹ گئی۔ اس کی وجہ مون سون کی خراب
بارشیں تھیں۔ ۱۹۷۲ء کا سال تو خاص طور سے

بڑھتے بڑھتے ۷۹ - ۱۹۷۸ء میں
اور پھر ۱۹۷۹ء میں قحط
کی وجہ سے پیداوار گھٹ کر
ٹن رہ گئی۔ اس طرح صرف ایک ...
پیداوار میں ۲۲ ملین ٹن کی کمی واقع ہوئی۔ لیکن
اس کمی کے باوجود باہر سے اناج منگانے کی
ضرورت نہیں پڑی اور ملک کے لئے یہ ایک
بڑی بات تھی۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا اور

... جو ... تھی ...
تھا ان تمام برسوں میں ... رہی تھی ... ایک
اور حلقے ... ہندوستانی ... بات ... تقویت
ملی ... ہندوستانی ... مسئلہ ... مناسب

سبز انقلاب کی رفتار میں آٹھویں دہائی کے دوران
سے فرق آگیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اناج کی
پیداوار میں سال بہ سال اتنا اضافہ نہیں ہو رہا تھا کہ
گذشتہ پندرہ سالوں میں ہوا تھا۔

سرکار کے لئے اناج کی خریدنے والی دیگر
ایجنسیوں کی کوششوں کی بدولت مرکزی ذخیرہ
میں اناج کا اسٹاک یکم جولائی ۱۹۷۹ء تک
۳ء۲۱ ملین ٹن ہوگیا تھا۔ اس طرح ایک طرف
تو سبز انقلاب سے اور دوسری طرف سرکاری

... کے حصول ... سال ... کے بارے
میں ... ایک ...
... نکالا ... پہلے سال
۱۹۸۸ء ہی میں ملک کی سب سے اچھی مون سون
کی بارشیں ہوئیں اور ان کے نتیجے میں اناج کی

پیداوار ۱۶۹٫۹۲ ملین ٹن کی بلند سطح پر پہنچ گئی جو گذشتہ سال کی پیداوار سے ۲۹ ملین ٹن زیادہ تھی۔

لیکن ۱۹۸۳-۸۴ء کے مقابلے میں ۱۵ صرف ۵۵٫۱۷ ملین ٹن زیادہ تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان دو عمدہ سالوں کے درمیان پیداوار میں اوسط سالانہ اضافہ صرف ۳٫۵۱ ملین ٹن کا ہوا۔ بعد کے سال بہت تسلی بخش نہیں رہے۔ کیونکہ ۱۹۸۹-۹۰ء میں ۱۷۱٫۰۳ ملین ٹن، ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۱۷۶٫۳۹ ملین ٹن اور پھر ۱۹۹۱-۹۲ء میں ۱۶۷٫۰۶ ملین ٹن کی پیداوار حاصل ہوئی۔ ان سالوں میں مون سون گو نارمل رہی لیکن غلط وقت میں ہوئی اور شروع میں بھی بہت کم ہوئی۔

۱۹۹۲ء میں کم و بیش نارمل مون سون کے باوجود ۱۹۹۲-۹۳ء میں پیداوار اندازاً ۱۸۰٫۳۰ ملین تک ہی پہنچ پائی اور مقررہ نشانے سے تین ملین ٹن کم رہی۔

ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۸۰-۸۱ء سے ۱۹۹۰-۹۱ء تک کے دس سالوں میں اناج کی پیداوار میں سالانہ اضافہ ۴٫۶۸ ملین ٹن کا ہوا۔ اگر یہ شرح اضافہ برقرار رہے تو امید ہے کہ اس صدی کے اختتام تک اناج کی پیداوار ۲۲۳٫۲۰ ملین ٹن ہوگی۔ لیکن ۱۹۹۳ء میں ختم ہوئے گذشتہ تین سال کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان سالوں میں سالانہ شرح اضافہ صرف ۳٫۹۰ ملین ٹن ہی رہی ہے۔ اس شرح سے تو موجودہ صدی کے آخری سال میں پیداوار صرف ۲۰۶٫۴۰ ملین ٹن ہوگی۔

سن ۲۰۰۰ء تک اناج کی متوقع ضرورت

یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ ان دونوں ہی منظرناموں میں پیداوار ۲۴۰ ملین ٹن سے کم رہے جب کہ بہت سے سائنسدانوں اور علم معاشیات کے ماہروں کا اندازہ ہے کہ ملک کو سن ۲۰۰۰ء میں ایک سال میں ۲۴۰ ملین ٹن اناج کی ضرورت ہوگی تاہم کچھ اور اندازوں کے مطابق سن ۲۰۰۰ء میں ملک کی اناج کی مانگ قریباً ۲۱۰ سے ۲۲ ملین ٹن ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاشتکاروں اور سائنس دانوں کو اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ اناج کی پیداوار اس وقت کی سالانہ شرح اضافہ کی بنیاد پر سن ۲۰۰۰ء تک ۲۱۰ ملین ٹن کی سطح پر پہنچ جائے گی۔

لیکن کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کمتر تخمینہ اس سال کے لیے فی کس کم ضرورت کی بنیاد پر لگایا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ملک میں اناج کی فی کس دستیابی ۱۹۹۰ء تک ۴۷۵ گرام یومیہ ہو چکی ہے، تو بھی کیا ہم اس معمولی فی کس دستیابی پر قناعت کر کے بیٹھ سکتے ہیں؟ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ اس صدی کے آخر تک اس ملک کے غریب لوگ فی کس نصف کلوگرام یومیہ سے بھی کم مقدار پر ہی گذارہ کرتے رہیں گے۔ لیکن اگر سن ۲۰۰۰ء تک اناج کی فی کس دستیابی بڑھ کر ایک کلوگرام یومیہ ہو جاتی ہے تو ۱۰۰۰ ملین (ایک ارب) آبادی کے لیے سالانہ ۳۶۵ ملین ٹن اناج کی ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ ہم اس مضمون میں آگے چل کر دیکھیں گے، یہ مقدار ہم حاصل بھی کر لیتے اگر ہم نے ستر اور اسی کی دہائی میں کچھ مثبت اقدامات کیے ہوتے۔ لیکن سن ۲۰۰۰ء تک سالانہ پیداوار کا نشانہ ۲۱۰ ملین ٹن مقرر کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری حلقے یہ سوچ رہے ہیں کہ ملک اپنے عوام کی وسیع اکثریت کو فی کس چھ سو گرام روزانہ سے بھی کم اور گذارے لائق خوراک ہی فراہم کر سکتا ہے۔

قومی زراعتی کمیشن نے اندازہ لگایا تھا کہ سن دو ہزار تک ملک میں اناج کی سپلائی ایک ہلکے تخمینے کے مطابق ۲۳۰ ملین ٹن ہوگی جب کہ مانگ ہلکے تخمینے کے مطابق ۲۰۵ ملین ٹن اور بھاری تخمینے کے مطابق ۲۲ ملین ٹن ہوگی۔ لیکن جن مفروضات کی بنا پر یہ اندازے لگائے گئے ہیں ان میں ۱۹۹۳ء میں ہی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ملک میں جو عظیم سماجی و اقتصادی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں ان کے نتیجے میں عوام کی توقعات بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کی رائے میں ۲۱۰ ملین ٹن کا نشانہ مقرر کرنے سے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس سیاق و سباق میں ڈاکٹر سی۔ ایچ۔ شاہ کا حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا جن کا کہنا ہے کہ سن ۲۰۰۰ء تک ہندوستان میں اناج کی مجموعی پیداوار ۲۵۹٫۴۰ ملین ٹن ہوگی۔ اسے ہم اندازہ نمبر ۳ کہیں گے۔ اندازہ نمبر ۲ کے مطابق اس سال کی پیداوار ۲۳۳٫۲۰ ملین ٹن اور اندازہ نمبر ۱ کے تحت ۱۸۶٫۶۰ ملین ٹن ہوگی۔ اندازہ نمبر ۱ ہندوستانی زراعت کے رجحانات کے مشاہدے پر مبنی تھا جب کہ اندازہ نمبر ۲ میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ملک میں آب پاشی کی توسیع زیادہ سے زیادہ جس حد تک ممکن ہے کی جا چکی ہے۔ اندازہ نمبر ۳ میں ڈاکٹر شاہ نے اس مفروضہ کی بنا پر رائے مرتب کی ہے کہ آب پاشی کی ممکنہ حد تک توسیع کے ساتھ ساتھ زراعت میں بہتر ٹکنالوجیوں کا بھی استعمال کیا جائے گا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آج یقینی آب پاشی کے تحت رقبے میں کافی زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور زرعی ٹکنالوجی کے میدان میں اتنی ترقی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے جس کا ۱۹۷۰ء میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان میں بایو ٹکنالوجی اور جنیٹک انجینئرنگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اگران پیش رفتوں کی بنیاد پر تخمینہ لگایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی صلاحیت پیداوار ۴ ملین ٹن سمجھی جانی چاہیئے نہ کہ ۲۵۰ ملین ٹن۔

کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اب تک جن اعداد و شمار کا حوالہ دیا گیا ہے وہ "پرانے" وقتوں کے ہیں اور آج ان کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ لیکن پرانے اعداد و شمار کا حوالہ اس خیال سے دیا گیا ہے کہ اناج کی پیداوار بڑھانے میں کوئی ڈھیل نہ آنے پائے۔ آج سے سات سال بعد سوائے امریکہ کے دنیا کے زیادہ تر ملک اس پوزیشن میں نہ ہوں گے کہ ہندوستان میں بارش میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اناج کی قلت کو پورا کر سکیں۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت بھاری مقدار میں اناج درآمد کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی زرمبادلہ بھی موجود نہ ہو۔

زرعی پالیسی کا مسوّدہ

مرکزی کابینہ نے زرعی پالیسی کی قرار داد کا جو ترمیم شدہ مسوّدہ منظور کیا ہے اس میں کوئی نئے نشانے شامل نہیں ہیں، جس کی وجہ شائد یہ ہے کہ وہ پالیسی کے دائرے میں نہیں آتے۔ تاہم اس پالیسی کا سب سے خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس میں یہ بات دُہرائی گئی ہے کہ "زرعی ترقی اپنی جامع تشریح کے ساتھ ہندوستان کے منصوبہ بند سماجی و اقتصادی ترقی کی تمام حکمتِ عملیوں میں ایک مرکزی مقام رکھتی ہے" یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ حکومت آج بھی جب کہ ہندوستانی معیشت کے عالمی معیشت میں انضمام کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور صنعتوں کو نجی ہاتھوں میں سونپنے پر زور دیا جا رہا ہے، زراعت کو اتنی ترجیح دیتی ہے۔

مسوّدے میں ہندوستانی زراعت کو درپیش ۱۷ بڑی چنوتیوں کو تسلیم کیا گیا ہے جن میں سے میری نگاہ میں دو چنوتیاں زراعت کے میدان میں مزید ترقی کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ہیں "بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے زرعی پیداوار اور زمین کی پیداوار یت کو بڑھانا" اور "غیر استعمال شدہ ... کو استعمال کرنا تاکہ مشرقی خطے، بارانی علاقوں اور خشک سالی کے والے علاقوں کی ترقی میں پائے جانے والے عدم توازن کو درست کیا جا سکے۔"

مسوّدہ میں بیان کی گئی دوسری چنوتیوں میں سے کچھ چنوتیاں یہ ہیں :۔

زرعی اراضی کا سائز، زرعی اراضی کا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنا، آبی وسائل کم یا ناقص تغذیہ کے مسائل، زرعی پیداوار کی پراسیسنگ، کوآپریٹو یا امدادِ باہمی کی انجمنوں کو پھر سے فعال بنانا، زرعی تحقیق، ٹکنالوجی کی منتقلی، بہتر قسم کے بیجوں کی تیاری و فراہمی، زراعتی مشینری اور دیگر آلاتِ زراعت کا استعمال اور شرائط تجارت کو کاشت کاروں کے لیے موافق بنانا۔

پیداوار بڑھانا

پیداوار اور پیداواریت بڑھانے کے پہلے مسئلے کو ہمارے سائنس داں اور کاشت کار ساٹھ کی دہائی کے وسط سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن اگر اندرونِ ملک تحقیقی سرگرمیوں کو نہیں بڑھاتے اور غیر ممالک میں کی جانے ... پیداوار ... [illegible]۔ لہذا اس میدان میں اور خاص کر چاول کی مخلوط قسم کے بارے میں، جو فی ہیکٹیر دس ٹن پیداوار دے سکتی ہے، تحقیق کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں چاول کی اوسط پیداوار ۱۷،۴ ٹن فی ہیکٹیر اور گیہوں کی پیداوار ۲،۴۰ ٹن فی ہیکٹیر کی سطح سے بہر صورت بڑھانی ہوگی۔ جوار، باجرہ اور مکئی کے ضمن میں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔

دوسرا پہلو پیداوار کے سلسلے میں عدم توازن کا ہے۔ اگرچہ سبز انقلاب زیادہ تر شمالی مغربی ہندوستان میں آیا ہے اور یہ خطہ ملک کا "اناج گھر" بن گیا ہے تاہم ایک لمبے عرصے میں دوسرے علاقوں خصوصاً مشرقی اور شمالی مشرقی خطے کو بھی اعلیٰ کارکردگی دکھانی ہوگی۔

آج سے سات سال بعد سوائے امریکہ کے دنیا کے زیادہ تر ملک اس پوزیشن میں نہ ہوں گے کہ ہندوستان میں بارش میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اناج کی قلت کو پورا کر سکیں۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت بھاری مقدار میں اناج درآمد کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی زرمبادلہ بھی موجود نہ ہو۔

وقت آ گیا ہے کہ مشرقی اور شمالی مشرقی خطے پر زیادہ توجہ دی جائے اس خطے کے کاشتکاروں نے کچھ خصوصی پروگراموں کے تحت انفرادی طور پر اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔ راقم الحروف نے خود ان کی شاندار کارکردگی دیکھی ہے کچھ ہی بھارت کے مشرقی صوبے اور خاص کر شمال مشرق میں واقع علاقوں پر زیادہ توجہ دیا جانا ضروری ہے کردہ سائنس دانوں نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ زراعت میں کافی سرمایہ نہیں لگایا گیا ہے خاص کر دستکاری میں ، باغبانی، کھیتوں کی کاشت، ماہی پروری، ڈیری فارمنگ، مویشی پروری اور مرغی پالن پر۔ زراعت کے ان تمام شعبوں نے قابل تعریف ترقی کی ہے لیکن ان شعبوں میں مزید ترقی کی جو صلاحیت موجود ہے اس کا اور زرعی پیداوار بڑھانے کے امکانات سے پورا فائدہ اٹھایا جانا باقی ہے۔ زرعی پالیسی کی قرارداد کے مسودے میں اس کا خیال رکھا گیا ہے۔

مسودے میں کاشت کاروں کو قرضے، لاگت کی اشیاء، توسیعی خدمات، پراسیسنگ اور مارکیٹنگ کی سہولیات کی فراہمی کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں کو پھر سے فعال بنانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ لیکن مسودے میں اس کلاز کا شامل کیا جانا اگرچہ مناسب ہے لیکن وہ صرف رسمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر حکومت اس کے لیے ناطرفداری اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرتی ہے تو ہر شخص اس کی کامیابی کی دعا کرے گا۔

پالیسی کے مسودے میں فصلوں کے بیمے، اصلاحات اراضی اور زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

تاہم پالیسی کا سب سے دوررس پہلو یہ ہے کہ حکومت نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ زراعت کے لیے تجارت اور سرمایہ کاری کا ایک مثبت ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے گی جس سے کہ زراعت میں صنعت کے برابر سرمایہ کاری کی جا سکے اور زراعت کو صنعتوں کی جیسی تجارتی سہولیات حاصل ہو سکیں۔

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ملک ... آج ہم سب کہ ہندوستانی معیشت کے مالک ہیں۔ معیشت میں انتظام نے کوشش کی بارے میں اور ... کو نئے ہاتھوں میں سونپ کر ... دیا جا رہا ہے۔ زراعت کو اتنی ترجیح دی گئی ہے۔

مسودے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زرعی پالیسی کا مقصد صنعت کی طرح زراعت کو بھی ویسے ہی فائدے دلانا اور اس کے لیے موثر نظام قائم کرنا ہے۔" اس کلاز میں یہ انتباہ بھی دیا گیا ہے کہ اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیئے کہ کاشت کاروں کو ضوابط اور ٹیکس اکٹھا کرنے کی مشینری کے تابع نہ کیا جائے۔

پالیسی کا سب سے دوررس پہلو یہ ہے کہ حکومت نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ زراعت کے لیے تجارت اور سرمایہ کاری کا ایک مثبت ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے گی جس سے کہ زراعت میں صنعت کے برابر سرمایہ کاری کی جا سکے اور زراعت کو صنعتوں کی جیسی تجارتی سہولیات حاصل ہو سکیں۔

اس کے علاوہ مسودے میں یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ "مخصوص میونسپل حدود کے اندر کاشت کاروں کو زرعی اراضی کے لازمی حصول پر 'Capital Gains Tax' کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا جائے گا"۔ یہ ایک نہایت حوصلہ افزا فیصلہ ہے اور امید کرنی چاہیئے کہ جب پارلیمنٹ میں زرعی پالیسی کے مسودے پر بحث کی جائے گی تو اس کلاز کو سب کی متفقہ حمایت حاصل ہوگی۔

بڑی سرمایہ کاری

ہم پہلے ہی یہ بتا چکے ہیں کہ زرعی سائنسدانوں اور ایڈمنسٹریٹروں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ گذشتہ برسوں میں زراعت پر بڑی سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوئی ہے یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اس کمی کے نتیجے میں ایک طویل عرصے میں کاشت کار طبقے کے پاس فاضل سرمائے کی کمی ہو جائے گی۔ اور جب تک کاشت کار طبقے کے، جو اس ملک میں کروڑوں افراد پر مشتمل ہے، پاس فاضل روپیہ نہ ہوگا۔ وہ صنعتی سامان نہ خرید سکیں گے اور جب صنعتی سامان کی مانگ نہ بڑھے گی تو صنعتوں میں روزگار گھٹنے لگے گا۔ اس بات کا احساس ہم اخبار نویسوں کو چند سال پہلے نہایت خوشگوار طریقے سے کرایا گیا۔

کھادی اور گرام اُدیوگ کمیشن نے مارچ ۱۹۸۰ء میں ہمیں راجستھان کے دُور دراز سرحدی علاقوں میں لے گیا۔ ان علاقوں میں لوگ مویشی پروری اور ڈیری فارمنگ کے علاوہ کمیشن کی فراہم کی ہوئی کچی اُون کات کر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ اس سے انھیں اچھا پیسہ مل جاتا تھا۔ کمیشن ان کی کاتی ہوئی اُون سوئٹر بُننے کے لیے ایک مرکزی مقام پر لے جاتا تھا۔

اس طرح جو سستے سوئٹر تیار ہوتے تھے انھیں خریدنے والے بھی زیادہ تر اترپردیش اور بہار کے غریب لوگ اور کمترین درجے کے کسان ہی ہوتے تھے۔ اب ایسا ہوا کہ ۱۹۷۹ء میں مون سون نے دغا کی اور ملک کو اس سال تباہ کن خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے ان دونوں ریاستوں کے کسانوں کے پاس بیچنے کے لیے اناج نہیں رہا۔ پھر ان کے پاس فاضل روپیہ کہاں سے آتا۔ پس ان میں سے بہت ہی کم کسان راجستھان سوئٹر خرید سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھادی اور گرام اُدیوگ کمیشن کے گوداموں میں کروڑ روپے کے اَن بکے سوئٹر جمع ہو گئے۔ کمیشن حیران تھا کہ وہ کیا کرے۔ لہٰذا رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے اس نے اخباری نمائندوں کی ایک پارٹی کو مدعو کیا۔

ٹکنالوجی کی منتقلی

ہندوستانی زراعت کی سبز انقلاب کے بعد کی داستان اس ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی کہ ملک نے اچانک خوردنی تیلوں میں قریب قریب خودکفالت کیسے حاصل کر لی۔ اسّی کی دہائی کے وسط تک ہندوستان، امریکہ، برازیل اور خصوصاً ملائیشیا سے بڑی مقدار میں خوردنی تیل درآمد کیا کرتا تھا (ایک سال میں تقریباً دس لاکھ ٹن) ۹۲-۱۹۹۱ء تک یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہندوستان خوردنی تیلوں میں خودکفالت حاصل کرنے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ خودکفالت ۹۳-۱۹۹۲ء میں حاصل کر لی گئی جب کہ ملک میں ۲۱ ملین ٹن تلہن (تیل نکالنے کے بیج) پیدا ہوا۔

ریپ سیڈ اور سرسوں کی پیداوار میں لگ بھگ دوگنا اضافہ ہوا اور ان کی پیداوار ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۲،۶ ملین ٹن سے بڑھ کر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۴،۵ ملین ٹن ہو گئی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ان کی پیداوار کے چھ ملین ٹن سے بھی زیادہ ہونے کا اندازہ ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ اضافہ کیسے ممکن ہوا۔ راقم الحروف نے انڈین ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ کا وہ ریکارڈ دیکھا ہے جس کے نتیجے میں صرف پانچ چھ سال میں تلہن کی پیداوار دوگنی سے زیادہ ہو گئی۔

انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ٹکنالوجی کی منتقلی کے شعبے میں کام کرنے والے سائنس دانوں نے اترپردیش کے فتح پور ضلع میں سرسوں کی "پوسا بولڈ" قسم کو مقبول بنانے کا کام ہاتھ میں لیا۔ پہلے تو انھیں کاشت کاروں کو اس بات کا یقین دلانا تھا کہ ان کے لیے جمنا کے سیلاب سے متاثر ہونے والے علاقوں میں جہاں ستمبر کے آخر تک سیلاب کا پانی اتر جانے کے بعد بھی زمین میں کچھ نمی باقی رہ جاتی تھی، گیہوں کی بجائے سرسوں کی کاشت کرنا کیوں مناسب ہوگا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کاشت کاروں کو انسٹی ٹیوٹ مذکور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مائیکل اور دوسرے سائنس دانوں پر کتنا بھروسہ تھا۔ چنانچہ جمنا کے کنارے واقع کوراکنک علاقے کے گاؤں لاہولی کے کاشت کار سرسوں کی کھیتی کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر کیا تھا کوراکنک علاقے میں ۸۹-۱۹۸۸ء میں سرسوں کی بہت عمدہ فصل ہوئی اور اس کامیابی کی داستان بہت جلد سبھی کسانوں تک پہنچ گئی۔ جب دسمبر ۱۹۸۹ء میں اگلی فصل بونے کا وقت آیا تو میں نے فتح پور ضلع کا دورہ کیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارے ضلع میں سرسوں کی پیلی فصل لہلہا رہی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کے جو سائنس داں دہلی سے فتح پور کے گاؤوں کا دورہ کرنے گئے وہ بھی ہر طرف سرسوں کی لہلہاتی ہوئی فصل دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کارنامے کی تفصیل ہم اخبار نویسوں نے اپنے اخباروں میں شائع کی جس کا اتنا اثر ہوا کہ سارے ملک میں سرسوں کی کھیتی شروع ہو گئی۔ افسوس کی

(باقی کور صفحہ ۲ پر)

اسّی کی دہائی کے وسط تک ہندوستان، امریکہ، برازیل اور خصوصاً ملائیشیا سے بڑی مقدار میں خوردنی تیل درآمد کیا کرتا تھا (ای
۹۲-۱۹۹۱ء تک
ملوں میں
یہ خودکفالت ۹۳
ملک میں ۲۱
پیدا ہوا۔

کے لیے معاشی لحاظ سے بامعنی ہو سکے۔

- اور الگ الگ علاقوں کی خصوصیات کے مطابق منصوبہ بندیاں تیار کرنے کے لیے تحقیق پر زور دینا اور کاشتکاروں کو کاشتکاری کی تربیت دینے والے اداروں کو مضبوط بنانا۔
- کاشتکاری کی تمام لاگتوں سے سائنسی اور تکنیکی بنیاد پر ترتیب دی جائے تاکہ تحقیق سے بامعنی فائدہ اٹھایا جا سکے۔
- اہمیت کا حامل یہ کام کرنے والی جو تکنیک دیہی علاقوں میں ہے وہ اسے کسانوں کو دستیاب بنانا اور کم لاگتوں کو بہتر بنانے کی ترغیب دینا اور کھیتی کے لیے کاشتکاری کا استعمال کرنا تاکہ ان کے بوجھ اور ان کی زندگی کو ہلکا کیا جا سکے اور ان کی آمدنی کو بڑھایا جا سکے۔
- بارانی اور آب پاشی کی سہولت والے علاقوں کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے پھلوں، خوشبودار پودوں اور جڑی بوٹیوں کی کاشت اور باغاتی فصلوں کو فروغ دینا اور کھیتی باڑی اور برآمدات دونوں کے لیے پروسیسنگ اور مارکیٹنگ کی مکمل سہولیات فراہم کرنا۔
- بنجر زمینوں (یعنی ایسی زمینیں جن کی زرخیزی گھٹتے گھٹتے بہت کم ہو گئی ہے) کے اہل استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا اور کھیت اور جنگل پر مشتمل بالی کے ذریعے بایو ماس کی پیداوار بڑھانا۔
- آب پاشی کے لیے پیدا کی گئی صلاحیت کا استعمال بڑھانا اور پانی کا اہل بندوبست کرکے پانی کو ضائع ہونے سے بچانا۔
- کاشتکاروں کو بہتر قسم کے بیج، زرعی مشینوں اور آلات زراعت اور کھیتی کے لیے ضروری دوسری چیزیں ان کے گاؤں میں یا ان کے گاؤوں کے نزدیک فراہم کرنا۔
- کاشتکاروں کے مقامی اداروں کو زیادہ مضبوط بنایا اور مستحکم کیا جائے تاکہ وہ عوام کی پوری حمایت کے ساتھ کام کریں اور ان اداروں کے ذریعے کام کر سکیں۔
- زرعی ترقی اور بہبود کے پروگراموں میں کاشتکاروں کی تنظیموں کی شمولیت کو بڑھانا۔
- تجارت کی شرائط کو درست کرکے کھیتی زراعت کے لیے زیادہ بامعنی ہوں تاکہ زراعت کو زیادہ وسائل مل سکیں اور زراعت میں کافی زیادہ سرمایہ کاری ہو سکے۔

زرعی ترقی و تحقیق کے پروگراموں میں ایسی اصلاحات کی جائیں گی جس سے وہ ان ضرورتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

۴۔ اب جو تکمیل اور اپنی ترقی کو برقرار رکھ سکنے والی زرعی معیشت کے حصول کے لیے پالیسی کو نئی سمتیں دینا ضروری ہوں گی۔ زراعت میں سرمایہ کاری کے گھٹنے کے رجحان کو روکنا ہوگا۔ زرعی شعبے میں وسائل کی تقسیم کے نظام پر نظر ثانی کی جائے گی تاکہ دستیاب وسائل کا استعمال موجودہ امدادی اقدامات سے ہٹ کر سرمایہ کاری اور دیہی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے کیا جا سکے۔ بہتر قیمتوں اور موافق شرائط تجارت کے ذریعے ایسا معاشی ماحول پیدا کیا جائے گا جس میں کاشتکاروں کی خود اپنی سرمایہ کاری بڑھ سکے اور ان کی کوششوں کو مدد ملے۔

۵۔ پبلک انوسٹمنٹ کے ذریعے دیہی ڈھانچے کی تعمیر اور دیہی ترقی کی رفتار تیز کی جائے گی۔ تحقیق، دیہی ڈھانچے کی ترقی اور پراسیسنگ جیسے شعبوں کو ترجیح دی جائے گی۔ زراعت میں اور خاص کر آبی وسائل کے تحفظ کے لیے پلاسٹک کے استعمال جیسے نئے طریقوں کو بروئے کار لانے پر زور دیا جائے گا۔ آب پاشی اور دیگر زرعی مقاصد کے لیے توانائی کے متبادل اور قابل تجدید وسائل کے استعمال کے لیے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ دیہی ڈھانچے پر سرمایہ کاری میں علاقائی عدم توازن کو کم کرنے اور برآمد کے لیے زیادہ قیمت والی فاضل پیداوار کے حصول پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

۶۔ زرعی ترقی میں بنیادی امداد پروگراموں میں تبدیل کیے گئے فراہمی قرضوں کے نظام سے ملی ہے۔ زرعی ترقی کا ایک اہم پہلو اس شعبے کے لیے اور زیادہ قرضوں کی فراہمی کو یقینی بنانا ہوگا۔ جو کوآپریٹو سوسائٹیاں معاشی لحاظ سے فائدہ مند کاموں میں مصروف ہیں اور جنھیں بیشہ ور اہلیت کے ساتھ جمہوری طریقوں سے چلایا جا رہا ہے حکومت ان کی تمام کوششوں میں پوری مدد دے گی۔ تعاون عمل کو مستحکم بنانے کے لیے کوآپریٹو قانون میں اصلاح کی جائے گی اور کوآپریٹو تحریک کو سرکاری کنٹرول سے آزاد کر دیا جائے گا۔ تاہم حکومت ایسے علاقوں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو مالی اور توسیعی امداد فراہم کرنا جاری رکھے گی

جہاں کہ آبپاشی تحریک [illegible] نہیں پہنچ سکی ہے

۷ ملک کے مختلف [illegible] اور [illegible] میں زرعی پیداوار کی ناکافی [illegible] کے ساتھ ساتھ فصل کی کٹائی کے بعد [illegible] رکھنے وغیرہ کے لیے مناسب سہولتیں [illegible] کافی [illegible] جائے تا [illegible] اکٹھا [illegible] علاقوں میں قائم کیے جائیں [illegible] پیداوار کے [illegible] قیمت بڑھا دینے والی [illegible] پیداوار کے [illegible] دیا جائے تاکہ [illegible] بہتر قیمت مل سکے

۸ فصلوں کے خراب ہو جانے [illegible] خصوصاً بارانی علاقوں میں [illegible] بارش پر ہی انحصار ہوتا ہے اور کسانوں کے اندر پیداوار کے گھٹنے [illegible] کے جوکھم کو برداشت کرنے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر [illegible] سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے زرعی قرض [illegible] اور فصل اور مویشیوں کے [illegible] کی اسکیمیں [illegible] تاکہ کسانوں کو بارش نہ ہونے یا دیگر قدرتی آفات کے نازل ہونے پر پیدا ہونے والی مالی پریشانیوں سے بچایا جا سکے۔

۹ حکومت کاشتکار [illegible] کو زرعی پیداوار کی مناسب قیمتیں دلانے کے لیے اپنی ذمہ داری بدستور پوری کرتی رہے گی۔ زراعت کے لیے مناسب معاشی ماحول بنانے کے لیے حکومت

[illegible]

۱۲ [illegible]

ڈاکٹر وی۔ کے۔ پاٹل

زرعی ترقی: کچھ اہم خصوصیات

زرعی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے زرعی پیداوار اور پیداواریت میں کافی اضافے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مضمون نگار نے یہ مقصد حاصل کرنے کی غرض سے کچھ اقدامات تجویز کیے ہیں۔ ان میں بشمول بارانی خطوں کے لیے مخصوص رقوم کا سائنسی طریقوں سے انتظام، چھوٹے چھوٹے آبی گذرگاہوں کا انتظام، پودوں کو لگنے والے کیڑوں سے مربوط انتظام، بینک قرضوں کے تقاضا جات کی وصولی، گاؤں اور تعلقہ کی سطح پر امداد باہمی سطح پر مال کی خرید و فروخت کی سہولت مہیا کرنا، خوراک کی مصنوعات تیار کرنے کی صنعت کی حوصلہ افزائی اور کسانوں کو ان کی پیداوار کے لیے مناسب قیمتیں دلانا شامل ہیں۔

خوراک پیدا کرنے والے ملک کی دو تہائی محنت کشوں کو روزگار مہیا کرنے والے اور غیر زراعتی اشیائے صرف و خدمات کے لیے قوت خرید مہیا کرنے والے ذریعہ کے طور پر زراعت اب بھی ملکی معیشت کی ترقی کے لیے ایک اہم اور ضروری شعبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا تیز تر زرعی ترقی کی ضرورت پر اس سے زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔

اگرچہ بھارت کی اناج کی کل پیداوار میں ۵۵-۱۹۵۰ء سے ۹۰-۱۹۸۵ء کے درمیان دو اعشاریہ چھ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا ہے لیکن آبادی میں بھی ۲٫۲ فی صد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بھارت نے اناج کی پیداوار کے لحاظ سے خود کفالت حاصل کر لی ہے جو کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے لیکن اگر خوراک کی فی کس دستیابی کو مد نظر رکھا جائے تو یہ کسی خوش فہمی کا سبب نہیں ہے۔ ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۱۷ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن کی پیداوار کے شاندار ریکارڈ کے باوجود خوراک کی فی کس دستیابی جو ۱۹۷۱ء میں ۴۶۹ گرام تھی اب گر کر [illegible] گرام ہو گئی ہے۔ یہ امر باعث تشویش ہے۔ جب ملک کی ۳۷ فی صد آبادی غریبی کے خط سے نیچے گذر بسر کرتی ہو اور اس کے پاس ضروری قوت خرید نہ ہو تو اناج کی پیداوار کے اعداد و شمار کو کیسے موثر یا شاندار کہا جا سکتا ہے؟ اس لیے زراعت کی تیز تر ترقی اور بھارت کی اقتصادی طاقت بنانے کے لیے سیاسی عزم کے ساتھ ہمہ گیر کوششوں کی ضرورت ہے۔

کچھ شعبوں کا ذکر جہاں فوری توجہ کی ضرورت ہے حسب ذیل ذکر کیا جا رہا ہے

الگ الگ مقامات پر زراعت کے لیے درکار موسمی حالات اور کیمیائی کھاد، کھیتی کے لیے درکار اشیا کے استعمال کا زمین کے خواص کی بنا پر فصلوں کی پیداوار پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہر سال ایک جیسی کھاد اور دیگر اشیاء کے استعمال سے بھی پیداوار ایک جیسی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ ملک کے ایسے خطے بنائے جائیں جہاں ایک خطے اور دوسرے خطے میں پیداوار کا فرق کم ہو۔ ماضی میں زراعت کے قومی کمیشن اور زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے ملک کو مختلف خطوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی تھی۔ منصوبہ بندی کمیشن نے طبعی و جغرافیائی حالات

ادارس آب پاشی اور ملک کے معدنی وسیلوں کی بنا پر ملک کو ۱۵ خطوں میں تقسیم کیا ہے۔ زراعت اور موسم کی بنا پر خطوں کی منصوبہ بندی کا مقصد خطوں میں دستیاب وسیلوں کا سائنسی ڈھنگ سے انتظام ہے جس سے وسیلوں اور ماحول پر کوئی منافی اثر ڈالے بغیر خوراک، ریشے، چارے اور ایندھن کی بڑھتی ہوئی مانگ پوری کی جاسکے، اس کے علاوہ ان خطوں کی تشکیل میں زرعی و موسمی یکسانیت منصوبہ بندی اور عمل آوری کی سہولیات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ تاہم بعد ازاں یہ محسوس کیا گیا کہ اگرچہ یہ ۱۵ خطے ایک خصوصی زرعی و موسمی صورت حال کے نمائندہ ہیں لیکن عمل آوری کی غرض سے بالتفصیل منصوبہ بندی

چھوٹے پیمانے کے آبی طاس کا انتظام

بھارت میں قابل کاشت (۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ہیکٹیر) اراضی کا ۷۰ فی صد حصہ بارانی ہے۔ لہٰذا وہاں کاشت کا انحصار موسم پر ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملک میں آب پاشی کی کل صلاحیت کو کام میں لانے کے بعد بھی جو ۲۰۲۰ء تک ممکن ہے۔ ۵۰ فی صد قابل کاشت رقبہ بارانی ہی رہے گا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بارانی علاقوں میں ناموافق موسم اور کم زرخیزی کی وجہ سے پیداوار کم رہتی ہے۔ اس لیے زرعی ترقی کی جو حکمت عملی تیار کی جائے اس میں آبی طاس کے نوعیت کی بنا پر زمین ا

چارے کے لیے کاشت اور چراگاہیں تیار کرنے کے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ پروگراموں پر کٹاؤ زمین کو روکنے، آبی طاسوں کی ترقی، روزگار کی ضمانت کی اسکیم، دیہی مزدوروں کے روزگار کی ضمانت کی اسکیم اور ڈی پی اے پی وغیرہ کے تحت عمل کیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ اسکیمیں آپس میں اتنی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ وہ عمل درآمد کے سبب نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس طریقہ کار میں عوامی تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہے دیہات کے رضاکار اداروں کے تعاون کا تجربہ اس سلسلے میں ایک اچھی ست ... اگر ...

> زراعت اور موسم کی بنا پر خطوں کی منصوبہ بندی کا مقصد خطوں میں دستیاب وسیلوں کا سائنسی ڈھنگ سے انتظام ہے جس سے وسیلوں اور ماحول پر کوئی منافی اثر ڈالے بغیر خوراک، ریشے، چارے اور ایندھن کی بڑھتی ہوئی مانگ پوری کی جاسکے۔

کی جائے گی تو چھوٹی سطح کی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ منصوبہ بندی یکسانیت کی آزمائش پر پوری نہیں اتر سکے گی۔ لہٰذا ان ۱۵ خطوں کو ۷۳ چھوٹے خطوں میں تقسیم کیا گیا اس طرح مقامی وسیلوں کا جو خاکہ حاصل ہوا اسے ترقی کی موجودہ سطح اور ٹکنالوجی کے علم کی بنا پر ترقیاتی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے استعمال کیا گیا زرعی و موسمی لحاظ سے خطہ وار منصوبہ بندی کے عملی پہلو کے طور پر خطوں میں منصوبہ بندی کرنے والی جماعتیں ضلع کی سطح پر منصوبہ بندی کا کام کر رہی ہیں۔ اس کام کے لیے الگ الگ ریاستی سرکاروں کو منصوبہ کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے

پانی کے انتظام کو شامل کیا جائے چھوٹے آبی طاسوں کے انتظام میں وسیلوں کا پورا بچاؤ شامل ہے جس میں زمین، پانی، جنگلات، چراگاہوں، باغبانی اور فصلوں کی دیکھ بھال کو شامل کیا جاتا ہے جس زمین سے پانی بہہ کر گزرگاہ میں آتا ہے اس کی زینہ بندی، زمین کو ہموار کرنا، کٹاؤ زمین کو روکنے اور پانی کو بہہ جانے سے روکنے کا انتظام شامل ہیں۔ اسی طرح غیر کاشت شدہ زمین جس میں ناقابل کاشت اور دیگر اقسام کی بنجر زمین بھی شامل ہے اور مشترکہ چراگاہوں کے لیے مختلف قسم کے انتظام کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سماجی جنگل بانی، زراعت کے طور پر جنگل بانی، بارانی باغبانی کی فصلیں،

... دیہات ... ہے ... پیداوار ...
جو نقصان پہنچ رہا ہے اسے کم کر کے اناج کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے فصل کو کئی قسم کے کیڑوں اور بیماریوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ اندازہ ہے کہ بھارت میں بیماری اور کیڑوں سے ہر سال ۶ سے ۷ ہزار کروڑ روپے کی فصلوں کا نقصان ہوتا ہے اگرچہ بھارت میں کیڑے مار دوائیوں کا فی ایکڑ استعمال دیگر ترقی یافتہ ملکوں سے کم ہے لیکن کچھ ایسے علاقے بھی ہیں جہاں یہ دوائیاں زیادہ مقدار میں استعمال کی جاتی ہیں چونکہ کیڑے مار دوائیاں فصل اور ماحول میں اپنا مضر اثر چھوڑ جاتی ہیں اور خوراک میں آلودگی پیدا کرتی ہیں اس لیے کیڑے مار دواؤں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ماحول کے لیے ایک امکانی خطرہ ہے لہٰذا ان دوائیوں کا استعمال جدید علم کے مطابق

[illegible]

کیڑوں کی روک تھام ... [illegible]

[illegible] استعمال ہے جس سے کیڑوں کی [illegible]
کی [illegible] اقتصادی طور پر قابل برداشت
[illegible] بڑھ جاتے ہیں۔ متبادل طریقوں میں
سب سے اہم طریقے معاشیاتی روک تھام
اور کیڑوں کی پیدائش کو روکنے کی ادویہ کا استعمال
ہے۔ کیڑوں کی روک تھام کا یہ پروگرام اسی
صورت میں ممکن ہے اگر اس بارے میں فیصلہ کرنے
کے معیار مقرر کیے جائیں۔ اس جانب ترقی یا
[illegible] کا انحصار اقتصادی طور پر قابل برداشت
طریقوں کے استعمال کے تصور پر بڑے پیمانے
پر عمل درآمد ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ کیڑوں
کی موجودگی، اُن کی تعداد کے بارے میں

[illegible] تعاون

[illegible]
[illegible] استعمال کی جاتی ہیں [illegible]
[illegible] بہت زیادہ اہمیت
رکھتی ہے۔ ریزرو بینک نے دیہات میں
قرضوں کے سروے کے لیے جو کمیٹی قائم کی تھی
اس کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے دیہات
میں قرضوں کی ایک مربوط اسکیم ملک میں
رائج کی گئی تاکہ دیہات میں سرمایہ کی فراہمی
کے لیے امداد باہمی کے تصور کو پھیلایا جاسکے۔
اس اسکیم کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۵۴ء میں
دیہات میں امداد باہمی قرضوں کے نظام میں
کافی ترقی ہوئی۔ کمیٹی اس اہم نتیجہ پر پہنچی تھی
کہ ہندوستان کے حالات کے مطابق زرعی
قرضے دینے کے لیے کوآپریٹو طریقہ کار بہترین
راستہ ہے۔ کوآپریٹو کریڈٹ اداروں کی مرکز

اور ریاستی سرکاروں نے بھی حوصلہ افزائی کی
[illegible] کوآپریٹو انجمنوں کے
اداروں کی تشکیل اور [illegible] کے زرعی
قرضے دینے کے لیے ملک میں اداروں کا
[illegible] نظام قائم ہو گیا ہے۔ اس [illegible]
[illegible] سہولت کے باوجود زرعی قرضے
میں امداد باہمی اداروں کا حصہ ۱۹۶۹ء
میں [illegible] فی صد تھا جو گھٹ کر ۱۹۸۰ء میں ۴۲ فی
صد رہ گیا اور آئندہ پانچ برسوں میں [illegible]
[illegible] ۳۴ فی صد رہ جانے کا امکان ہے۔
زرعی قرضوں میں امداد باہمی اداروں کے
حصے [illegible] قسم کے ادارے
[illegible] پر عمل [illegible] میں [illegible]
[illegible] اور علاقائی دیہی بینک بھی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ان بینکوں کی ساخت [illegible]
[illegible] سہولت [illegible]
[illegible] نا خوش [illegible] قسم [illegible]
بینکوں کے قرضوں کے بقایاجات کی [illegible]
کا مسئلہ درپیش ہے۔ ۱۹۷۶ء میں کمرشل
بینکوں کے بقایاجات کا تناسب ۴۳ فی
صد تھا۔ علاقائی دیہی بینکوں کے بقایاجات
کا تناسب ۵۱ فی صد اور زرعی قرضہ
[illegible] کے بقایاجات کا تناسب ۱۹۸۶ء
میں ۴۱ فی صد تھا۔ امداد باہمی اداروں کے
بقایاجات کی بڑھتی ہوئی سطح کھاد [illegible]
[illegible] کا باعث ہے جس کی وجہ سے
کوآپریٹو قرضوں کا نظام مفلوج ہو گیا ہے۔
قرضے کی درخواستوں کے ناقص جائزے
اور قرضے کے استعمال کی ناکافی نگرانی کے
علاوہ موجودہ حالات کے لیے کچھ دیگر
عناصر بھی ذمہ دار ہیں جیسے کہ قدرتی آفات
دیدہ و دانستہ نادہندگی، قرضوں کا غلط

استعمال اور وصولی کے طریقہ کار کی خامیاں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو جلد از جلد پختہ ارادے سے حل کیا جائے۔ قرضوں کی وصولی کے عمل میں اصلاح نہ صرف پھر سے مالیہ کاری قرضے دینے والے کوآپریٹو نظام کی مالی صحت کو بہتر بنانے اور قرضوں کے نقصان کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ کوآپریٹو قرضوں کی دیدہ دانستہ نادہندگی کو نہ صرف دیوانی بے ضابطگی بلکہ ایک فوجداری جرم سمجھا جائے نادہند اور نامہ انہ جانے دیا جائے اور تعزیرات ہند کے تحت اس کے لیے تجویز کی گئی سزا دی جانی چاہیے۔ اس تجویز پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قرضے دینے والے اداروں کی صلاحیت کے کام میں اضافہ کیا جا سکے اور کسانوں میں قرضے واپس کرنے کے لیے ذمہ داری پیدا کی جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان اداروں کا کاروبار میں سیاسی مداخلت نہ ہو اور نہ ہی ان پر کوئی دباؤ ڈالا جائے۔ حکومت نے دس ہزار روپے تک کے قرضے معاف کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ اس پالیسی میں زراعت کے لیے سرمایہ کی فراہمی پر طویل المدت اثرات کا بغور جائزہ لیا گیا ہے۔

مارکیٹنگ

مال کی فروخت کسانوں کی خوشحالی کی گئی ہے۔ زیادہ پیداوار حاصل کر لینا ہی ضروری نہیں بلکہ ٹھیک وقت اور جگہ پر مال کی فروخت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ جب بازار میں کسی مال کی بہتات ہو جاتی ہے تو قیمتیں گر جاتی ہیں جس سے کسانوں کو نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ کسان اور کھپت کار کے درمیان کئی لوگ موجود ہیں اور کھپت کرنے والا جو قیمت ادا کرتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ درمیانہ دار کھا جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ گاؤں اور تعلقہ کی سطح پر مال فروخت کرنے والے کوآپریٹو اداروں کا نظام قائم کیا جائے جو درمیانہ داروں کی ضرورت ختم کرے اور فاضل مال کی فروخت سے کسانوں کے لیے مناسب دام حاصل کرے گا۔

بہتر زراعتی آلات

زرعی پیداوار بڑھانا ... کام کاج کم کرنے کھیتی میں ... دیگر چیزوں کے مناسب اور بر وقت ... سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے، کھیتی میں محنت کو کم کرنے اور آمدنی بڑھانے کے لیے بہتر قسم کے آلات اور مشینوں کا استعمال ضروری ہے۔ بھارت میں کسانوں کی اکثریت چھوٹے اور درمیانہ قسم کے کسانوں کی ہے۔ اُن کی زمین دو ہیکٹیئر سے بھی کم ہے اور وہ بھی کئی جگہ پر بٹی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہاں مشین سے کھیتی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ فصلوں سے گھاس پھوس وقت پر نہیں نکالا جاتا جس سے فصلوں کی پیداوار ۲۰ سے ۲۷ فی صد کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زرعی آلات کے وسیع پیمانے پر استعمال کے لیے درج ذیل اقدامات کئے جائیں۔

(۱) کسانوں کو مشینوں کے استعمال کے بارے میں تعلیم دی جائے۔

(۲) کسانوں، دیہی کاریگروں اور دستکاروں کو مشینیں چلانے کی تربیت دی جائے اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے تربیتی پروگرام تیار کیے جائیں۔

(۳) کسانوں کو مشینوں کی خریداری کے لیے ... [illegible]

(۵) فاضل پرزے آسانی سے دستیاب ہونے چاہئیں۔

خوراک کی مصنوعات

ملک میں خوراک کی مصنوعات تیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے اور اس شعبے میں بھارت دنیا کا رہنما بن سکتا ہے۔ بھارت کے ساتھ ساتھ وسیع سمندر اور سمندری پیداوار کے وسیلے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر پھل اور سبزیاں اور اناج پیدا کرنے کے لئے موافق آب و ہوا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گوشت پیدا کرنے کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ مویشی بھارت میں ہیں۔ پھلوں کی پیداوار کے

> کیڑوں کی روک تھام کے مربوط پروگرام کا مطلب ہر قسم کی دستیاب دوائیوں کا ایسا دانشمندانہ استعمال ہے جس سے کیڑوں مکوڑوں کی تعداد اقتصادی طور پر قابلِ برداشت سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

لحاظ سے بھارت دنیا میں دوسرے درجے پر ہے اور سبزیوں کی پیداوار کے لحاظ سے چین کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر وسیع پیمانے پر خوردنی مصنوعات برآمد کے لیے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ جس سے بیش قیمت زرِ مبادلہ کمایا جا سکتا ہے اور بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ فی الحال ملک میں جو خوردنی مصنوعات تیار ہوتی ہیں ان کی پیداوار ملک میں صلاحیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس شعبے کی ترقی کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جائیں :-

(i) خوردنی مصنوعات پر براہِ راست اور بالواسطہ ٹیکس کم کیے جائیں یا ختم کردیے جائیں جس سے ان اشیا کی مانگ پیدا ہوگی
(ii) مال کے لیے معیار مقرر کیے جائیں۔
(iii) ڈبہ بندی کی صنعت کی جدید کاری کے لیے قدم اٹھائے جائیں۔
(iv) سرد خانوں کی سہولت وسیع پیمانے پر مہیا کی جائے۔
(v) فروخت کو فروغ دینے کے کام کو ترجیح دی جائے۔
(vi) نقل و حمل کی کافی اور مخصوص قسم کی سہولیات مہیا کرنے کی فوری ضرورت

منافع بخش قیمتیں

بھارتی زراعت کے خدوخال میں تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔ پہلے کھیتی گذر بسر کے لیے کی جاتی تھی اب فروخت کے لیے فاضل پیداوار حاصل کی جارہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کسانوں کو اُن کی پیداوار کے لیے اچھے دام دلاکر انھیں ترغیب عمل دی جائے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ زیادہ مال پیدا کریں اور اس کاروبار میں لگے رہیں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زرعی پیداوار اور پیداواریت میں کافی اضافے کے لیے قیمتوں

> اتنے مضبوط اور موثر سہولت کے باوجود زرعی قرضوں میں امداد باہمی کے اداروں کا حصہ جو ۱۹۶۹ میں ۸۰ فی صد تھا کم ہو کر ۱۹۹۰ میں ۴۱ فی صد رہ گیا اور آئندہ پانچ برسوں میں مزید کم ہو کر ۴۰ فی صد رہ جانے کا امکان ہے۔

کے تعین کی پالیسی کے لیے منافع بخش قیمتوں کا تعین رکھا جائے۔ اس پالیسی کا کسانوں کی آمدنی پر اور پیداوار کے لیے جدید ٹکنالوجی کے استعمال، پیداوار میں اضافے اور دیہات میں سرمایے کی پیداوار پر نمایاں اہم اثر پڑے گا۔ پالیسی ایسی ہونی چاہیے جس سے کسان قیمتوں میں بھاری اتار چڑھاؤ سے

> قرضوں کی وصولی کے عمل میں اصلاح نہ صرف پھر سرمایہ کاری سے قرضے دینے والے کوآپریٹو نظام کی مالی صحت کو بہتر بنانے اور قرضوں کے نقصانات کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔

محفوظ رہ سکیں۔ اور انھیں کاشت کے خرچ پر کافی منافع مل سکے۔ قیمتوں کو اُس سطح پر برقرار رکھنے کی کوششوں کی بھی ضرورت ہے۔ جس سے فاضل استعمال وسیلوں کی اہلیت کار میں اضافہ کیا جاسکے کھیتی کی پیداوار کی قیمت کم کرنے کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چوں کہ کھیتی کی پیداوار میں اضافہ ہوگیا ہے جس کے لیے سرکاری خزانے سے کافی مالی امداد دی جاتی ہے تو زیادہ پیداوار کا فائدہ کھیتی نہ کرنے والوں یعنی صارفین کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن اس بارے میں ایک تجربہ سے بالکل واضح ہوگیا ہے کہ اگر افراطِ زر میں اضافے کو بھی شامل کرلیا جائے تو کسان پہلے سے غریب ہوگیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کھیتوں کی پیداوار اور کھیتی میں کام آنے والی اشیا کی قیمتوں کی پالیسی کے بارے میں کوئی قابلِ عمل طریقہ کار اپنایا جائے جس سے کسان کچھ بچا سکیں اور وہ رقم پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے پھر زمین پر لگا سکیں۔

جنگلات کی دولت گرم ممالک کی اہم ملکیت ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ حال ہی میں ہمارے ملک میں جنگلات کے رقبے میں کمی ہوئی ہے جس سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں جن میں ماحولی آلودگی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ بھارت میں جنگلات کا رقبہ کُل جغرافیائی رقبے کے ۲۰ فی صد کے برابر ہے۔ لیکن مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ تناسب ۳۳ فی صد ہونا چاہیے۔ لہٰذا زراعت کے طور پر جنگل بانی کو ترجیح دینی چاہیے جس سے ایندھن، عمارتی لکڑی، چارے، حیوانات و نباتات کے نظام اور جنگلات کی پیداوار کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اگر اس شعبہ میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جائے تو وہ حق بجانب ہوگی۔

نئی دہلی

یوجنا

جلد ۱۳ — شمارہ ۱۱-۱۲

نمبر ۱۰-۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ء : ۱۰ بھادر تا ۸ آسوں ساکا ۱۹۱۵

قیمت ۳ روپے . ٹیلی فون ۶۱۸۱۸

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر : توحید خان

معاون : وسیم حیدر

کتابت : سجاد علی خاں

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۴۵ روپے، سہ سالہ ۶۰ روپے۔ فی کاپی ۳ روپے۔
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴
لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (میں) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن . سدرشن موہن جہل

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے
مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی
محدود نہیں ہیں۔

ماحولیات کا تحفّظ — ہر ایک کا فرض

کرۂ ارض وہ واحد سیارہ ہے جہاں ایک ایسا ماحول پایا جاتا ہے، جو زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ زمین، پانی، ہوا، پودے اور جانور عالمی ماحولیات کے اہم اجزاء ہیں۔ پائیدار ترقی سماجی اور اقتصادی بہبود کا ایک عمل ہے لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہمیں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ماحولیات کی مانگ موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے مانگ پوری کرنے کی اس کی صلاحیت سے تجاوز نہ کرے۔

بھارتی روایت

بھارت میں جغرافیائی، موسمی اور حیاتیاتی گوناگونی پائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بھارت کے پاس ایک بے مثل ماحولیاتی ورثہ بھی ہے۔ بھارت کے عوام کے لیے ماحولیاتی تحفظ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ تاریخی اعتبار سے، فطرت اور جنگلی جانوروں کے تحفظ کا معاملہ عقیدہ کا ایک جوش انگیز حصہ رہا ہے، جس کا اظہار عوام کی روزمرہ زندگی میں ہوتا ہے نیز جو قصوں، عوامی روایات، مذہب، فن اور ثقافت میں بھی پایا جاتا ہے۔ جدید دور میں بھی، جیسا کہ آئینی دفعات، ماحولیاتی قوانین اور منصوبہ بندی کے مقاصد سے عیاں ہے، ترقیاتی پیش قدمیوں کے ساتھ ساتھ، ماحولیاتی تحفظ اور سلامتی برقرار رکھنے کے لیے بھی شعوری کوششیں کی گئی ہیں۔ ماحولیات اور ترقیات کے بارے میں پالیسی بیان اور تحفظ کی قومی حکمت عملی اس سلسلے میں رہنما خطوط وضع کرنے کی ضرورت کے پیش نظر تیار کی گئی ہے، جس سے قومی زندگی اور ترقیاتی عمل میں ماحولیات کا خیال رکھنے میں مدد ملے گی۔

چیلنج

بھارت کے عوام کی ایک بڑی اکثریت کا براہِ راست انحصار ملک کے قدرتی وسائل پر ہے، جن سے وہ خوراک، ایندھن اور مکان کی اپنی بنیادی ضروریات پوری کرتی ہے اور اپنے مویشیوں کے لیے چارہ حاصل کرتی ہے۔ مٹی کے کٹاؤ کی روک تھام اور درحقیقت، بھارت کے زمینی وسائل کی بحالی کے چیلنج کا گہرا تعلق زمین، پانی اور جنگلاتی علاقے کے انتظام کی حکمتِ عملیوں سے ہے۔ عوام کی شرکت سے جنگل بانی اور پودکاری کے ذریعہ بنجر زمینوں کو بروئے کار لانے کا ایک وسیع پروگرام ۱۹۸۵ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں معدوم حیوانات کے تحفظ نیز ایندھن اور چارے کے لیے گاؤوں کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے قدرتی پیداوار نو یا مناسب مداخلت کے ذریعہ ملک کے جنگلات اور درختوں کے علاقے کی بحالی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس پروگرام میں غیر جنگلاتی اور غیر سرکاری بنجر زمینوں پر سبزہ اگانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، تاکہ جنگلاتی علاقوں پر دباؤ کو کم کیا جائے۔

جنگلات کی بحالی اور تحفظ کے کام میں جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے کردار کی اہمیت کو اب زیادہ سے زیادہ تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جنگل بانی کے شعبے میں جدید معلومات اور ہنر کو مقامی لوگوں کی روایتی معلومات اور تجربات کے ساتھ مربوط کیا جائے نیز جنگلات کے مشترکہ انتظام کے لیے مزید موثر حکمتِ عملیاں وضع کی جائیں۔

دریاؤں، ندیوں، جھیلوں، وغیرہ میں مسلسل طور سے شہری اور صنعتی گندگی ڈالے جانے سے بیشتر دریاؤں، ندیوں، جھیلوں وغیرہ کا پانی آلودہ ہو گیا ہے۔ ان سب کے پانی کے معیار کی بحالی بھارت کو درپیش ایک اور اہم ماحولیاتی چیلنج ہے۔

دریائے گنگا کے پانی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ایک بڑا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں کل ۲۶۱ اسکیمیں شامل ہیں، جو صنعتی گندگی اور گندے پانی کو روک کر دوسری طرف لے جانے، گندے پانی کو صاف کرنے کے پلانٹ، صفائی ستھرائی کے کم اخراجاتی کام، نیز دریاؤں کے کناروں پر پودکاری سمیت، دریاؤں کے کناروں پر سہولیات میں بہتری و اضافے پر مشتمل ہیں۔ ملک کے دیگر بڑے دریاؤں کے لیے بھی ایک قومی منصوبۂ عمل، وضع کیا جا رہا ہے۔

زیادہ سے زیادہ استحصال اور جنگلوں کی تباہی کی وجہ سے بھارت کی حیاتیاتی گوناگونی کو لاحق خطرہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کہ جانوروں اور پودوں کی بہت سی اقسام کو خطرہ لاحق ہے، ان کے تحفظ کے لیے بھارت میں مؤثر اقدامات کئے گئے ہیں۔

آج بھارت میں ۶۹ قومی پارک، جانوروں اور پرندوں کی ۳۹۲ پناہ گاہیں اور ۷ حیاتیاتی ذخائر ہیں، جو ملک کے مختلف حصوں میں واقع ہیں۔ جن اقسام کو خطرہ لاحق ہے، اُن کے تحفظ کے لیے شروع کئے گئے خصوصی پروجیکٹوں میں سے پروجیکٹ ٹائیگر کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گِر کے ببر شیروں، مگرمچھوں، کشمیری بارہ سنگوں، ہمالیائی مشک ہرنوں، بھارتی دلدلی ہرنوں، بھوؤں جیسے سینگوں والے ہرنوں اور تیندوؤں کے لیے علیحدہ پروجیکٹ بھی قائم کیے گئے ہیں۔ کچھ چڑیا گھروں میں کامیابی کے ساتھ افزائش نسل کے پروگرام بھی چل رہے ہیں۔ بھارت میں ماحولیاتی انتظام کو اب قومی ترقی کا ایک اہم رہنما عنصر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ماحولیاتی مسائل معیشت کے ہر ایک شعبے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ ہر شعبے کو اپنے مسائل کے حل خود نکالنے

چاہئیں۔ ماحولیاتی امور کو ترقیاتی سرگرمیوں میں مربوط کرنے کے اس عمل کو منظوری سے قبل پروجیکٹ کے ماحولیاتی اثرات کے جائزے کے نظام کے ذریعے فروغ دیا جا رہا ہے۔

رسمی تعلیم کے شعبے میں، تعلیم سے متعلق قومی پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ماحولیات کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بات سماج کے تمام طبقوں اور تمام عمر کے لوگوں میں پیدا کی جانی چاہیے اور اس کام کی شروعات بچوں میں یہ بات پیدا کر کے ہی کی جانی چاہیے۔ مذکورہ پالیسی میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے نیز تعلیم کے معیار میں کافی بہتری لانے کو غیر مشروط ترجیح دی گئی ہے۔ تعلیمی تحقیق اور تربیت کی قومی کونسل (این سی ای آر ٹی) لو نمونہ جاتی نصاب تعلیم اور ہدایتی پروگراموں میں ایک مضمون کے طور پر ماحولیات کو ترجیح دینے کا کام سونپا گیا

بقیہ، اقتصادی و سماجی
برآمدات بڑھانے وا...

کی ہے۔

بجٹ میں مخصوص کردہ وسائل ہی دیہی ترقی اور ابتدائی تعلیم، صحت کی ابتدائی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی اور پینے کے لیے صاف پانی کی فراہمی جیسے سماجی کاموں کے شعبے کی رفتار ترقی کا تعین کرتے ہیں۔ اگرچہ ان شعبوں میں ریاستی حکومتوں کی ایک خاص ذمہ داری ہے تاہم بجٹ میں ریاستوں کو اس بات کا واضح اشارہ دیا گیا ہے کہ بھارت کی معیشت کے ڈھانچے میں جو تبدیلیاں کی جا رہی ہیں انھیں دیہی علاقوں تک بھی پہنچنا چاہیے۔

زراعت کے بارے میں حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ کاشت کاروں کو ان کی فصلوں کے لیے منافع بخش قیمتیں دلائی جائیں اور زراعت کو اناج کے نقل و حمل پر عائد پابندیوں اور دیگر بندشوں سے آزاد کیا جائے اور کاشت کاروں کو بروقت کافی قرضے مہیا کئے جائیں تاکہ وہ صنعتوں کی طرح عالمی منڈی میں داخل ہو سکیں اور مقابلے کے ماحول میں اپنی محنت کا پھل پا سکیں۔

بجٹ میں مالی سیکٹر اور غیر ملکی سرمایہ کاری دونوں ہی شعبوں میں اصلاحات کی رفتار کو برقرار رکھا گیا ہے۔ مالی سیکٹر میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا اور قومی ملکیت کے دوسرے بنکوں کی رسائی سرمایہ بازار تک ممکن بنائی جا رہی ہے تاکہ وہ ... [illegible]

زیادہ سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ بجٹ میں مالی سیکٹر اور غیر ملکی سرمایہ کاری دونوں ہی شعبوں میں اصلاحات کا سلسلہ اس لیے اور بھی جاری رکھا جائے گا کہ شاہراہ ترقی پر ملک کی پیش قدمی میں ذیلی ڈھانچے کی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے خاص کر ایسے وقت جب چین اور مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملک مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ

بھارت کے لیے اہم مواقع

پوری دنیا نے اب اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ بھارتی پروگرام مطابقت اور ڈھانچہ جاتی تبدیلی کا آسان ترین چالو پروگرام ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ملکوں کے برخلاف، ہم نے افراطِ زر کی پریشانی، بے روزگاری، نیز سماجی اور اقتصادی افراتفری سے گریز کیا ہے۔

حوصلہ افزا نتائج

ڈھانچہ جاتی مطابقت کے پہلے ہی سال میں قومی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن دوسرے سال میں، اس بات کو یقینی بنایا گیا ہے کہ قومی آمدنی میں سالانہ ۴ فی صد کا اضافہ ہو۔ موجودہ سال میں اگر موسم حسبِ معمول رہا تو معیشت میں کم سے کم پانچ فی صد کا اضافہ ہوگا اور اس کے بعد یہ اس سے کہیں تیز رفتار سے ترقی کرے گی۔

تھوک قیمتوں کے عدد اشاریے کی بنیاد پر افراطِ زر کی شرح، جو عدد سے عدد کی بنیاد پر ۱۷ فی صد تک پہنچ گئی تھی اب کم ہو کر تقریباً ۶ فی صد ہو گئی ہے۔ ہر ایک واحد عدد اشاریے میں اضافہ، صنعتی کارکنان کے لیے ہو یا زرعی مزدوروں کے لیے ہو، بہت زیادہ کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ قیمتوں کی صورتِ حال میں جو بہتری آئی ہے، وہ زندگی کی حقیقت ہے۔ بجٹ پیش ہونے کے بعد متعدد اشیا، کی قیمتوں میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر سات ارب ڈالر کی اطمینان بخش سطح تک پہنچ گئے ہیں۔

مقاصد

حکومت ایک لچکدار، جدید اور ترقی پسند معیشت تیار کرنا چاہتی ہے۔ خود اعتمادی، مالی نظم وضبط، غریبی کے خاتمے کے پروگراموں نیز تعلیم اور صحت جیسے سماجی شعبوں میں سرمایہ کاریوں میں اضافہ کرنے، زرعی اور دیہی ترقیات، برآمداتی فروغ اور صنعتی بحالی کے مقاصد کے حصول کے لیے پالیسیاں وضع کی جائیں گی، جن کے نتیجے میں آٹھویں منصوبے کے بقیہ برسوں میں صنعتی انقلاب آسکتا ہے

حکومت نے مالی خسارہ ۱۹۹۱ء میں ۸٫۵ فی صد سے کم کر کے گزشتہ سال تقریباً ۵ فی صد کر دیا تھا۔ اس خسارے کو مزید کم کر کے ۱۹۹۳-۹۴ء میں مجموعی اندرونِ ملک پیداوار کا ۴٫۷ فی صد کرنے کی تجویز ہے۔ مالی خسارے میں یہ کمی ہماری پالیسی کے افراطِ زر مخالف رویّے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں مالی خسارہ کم کر کے جو مالی استحکام حاصل کیا گیا ہے، اس کا استعمال معیشت میں سرمایہ کاری کی شرح، نیز غریبی کے خاتمے کے اہم پروگراموں اور تعلیم اور صحت جیسی سماجی خدمات کے لیے رقوم میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔

خطرات

معیشت کی کارکردگی بہت اچھی رہی ہے۔ بھارت کو اہم مواقع فراہم ہوئے ہیں۔ لیکن اگر ہم سب مل کر کوشش نہیں کرتے ہیں تو ہمیں بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم یہ بات فرض نہیں کر سکتے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں اور لاقانونیت کے ماحول میں، ہم ہمارے ملک کی اقتصادی اور سماجی بہبود میں پائیدار بہتری کے فوائد حاصل کرتے رہیں گے نومبر، ۱۹۹۲ء میں ہمارے ٹیکس مالیات اور برآمدات میں ایک اچھی شرح سے اضافہ ہو رہا تھا لیکن دسمبر سے، فسادات کے بعد مالیہ کی وصولی میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔ اگر ہمیں

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

مرکزی وزیر خزانہ۔

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ، "بھارت چھوڑو تحریک" گولڈن جوبلی تقریبات

جاں نثار کرنے والے ہزاروں لوگوں کے خوابوں کو پورا کر پائیں گے۔

وزیر داخلہ ایس۔ بی چوہان نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے تمام مذہب و ملت کے لوگوں میں اتحاد و آزادی کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس جذبے کو دیکھ کر انگریزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ہندوستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ مذہب و ملت کے نام پر تفریق پیدا کرنے کی کوشش شرمناک ہے۔ ملک کی آزادی میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کا برابر کا حصہ ہے

جلسے میں سابق ممبر پارلیمنٹ شری بھوشن اور مرکزی وزیر برائے شہری ترقیات مسز شیلا کول نے بھی اپنی تقریروں میں فرقہ پرستی اور انتشار پسندی کے خلاف لگاتار جنگ جاری رکھنے کے عزم کو دہرایا۔

"ہندوستان چھوڑو تحریک" کی گولڈن جوبلی تقریبات کے اختتام پر نائب صدر جمہوریہ کے۔ آر۔ نارائنن نے کہا کہ ہماری سماجی و سیاسی زندگی پر انتشار، فرقہ پرستی، نسل پرستی اور علاقائی تنازعوں نے بہت خراب اثر ڈالا ہے۔ یہ ہمارے اتحاد اور ہماری آزادی کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ اس خطرے کو دور کیے بغیر ہماری آزادی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

پارلیمنٹ کے سنٹر ہال میں منعقد ایک جلسے میں وزیر اعظم پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ دوران جنگ آزادی بے لوث خدمت اور وطن پرستی کا جذبہ کافی گہرا تھا۔ اسی جذبے کی آج بھی ضرورت ہے۔

شری راؤ نے کہا کہ بڑی جدو جہد اور مشکلوں سے حاصل ہوئی آزادی کے تحفظ کی خاطر قربانی و نظم و ضبط دونوں ہی لازمی ہیں۔ ہماری اپنی آزادی کو تمام لوگوں کے لیے بامعنی بنانا ہوگا اور یہ ایثار و نظم و ضبط سے ہی ممکن ہوگا۔

اس سے قبل اندرا گاندھی اسٹیڈیم میں ایک جلسے کے دوران وزیر اعظم پی۔ وی نرسمہا راؤ نے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بھارت چھوڑو آندولن کی اسپرٹ کو برقرار رکھیں اور اسے ماند نہ ہونے دیں۔ انھوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ مجاہدین آزادی کی عظیم قربانیوں سے تحریک لیں۔

اس موقع پر شری راؤ نے ۱۰۰ روپے، ۵۰ روپے، دس روپے اور ایک روپے کے مخصوص یادگار سکے جاری کیے۔ وزیر اعظم نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان پر ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔

ممبئی کے ایک لوک برادری گروپ نے ناچ کا پروگرام کیا۔ اس موقع پر بچے اور مرکزی وزرا موجود تھے تقریب میں مرکزی وزرا مسز شیلا کول، شری موہن سنگھ، شری مکل واسنک اور کماری شیلجا سینئر افسران اور مجاہدین آزادی موجود تھے۔

وزیر اعظم نے زور دے کر کہا کہ "بھارت چھوڑو" آندولن کا جذبہ نئی نسل کے لیے از حد ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت برطانیہ نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگادی تھی۔ لیکن اس سے تحریک کو مزید جوش ملا تھا۔

انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر ارجن سنگھ نے کہا کہ ۱۹۴۲ء میں جب یہ تحریک شروع کی گئی تو لوگوں نے اس میں "بھرپور" حصہ لیا تھا۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ اب ہندوستانی شہری ہندو، مسلمان، سکھ اور کرسچین بن کر رہ گئے ہیں۔ انھوں نے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ انتشار پھیلانے والی طاقتیں سرگرم ہیں اور امید ظاہر کی کہ "بھارت چھوڑو" تحریک کے جذبہ سے لوگوں کو موجودہ حالات پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔

اس موقع پر مجاہد آزادی مسز ارونا آصف علی کو اعزاز سے نوازا گیا۔

انسیٹ ۲۔ بی مصنوعی سیارے کے بارے میں وزیر اعظم کا بیان

وزیر اعظم شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں انسیٹ ۲۔ بی مصنوعی سیارے کے بارے میں ایک بیان دیا۔ انھوں نے کہا۔

مجھے ایوان کے معزز اراکین کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اندرون ملک ...

۲۲ جولائی ۱۹۹۳ء کو ایرین لانچ وہیکل سے کامیابی کے ساتھ چھوڑا گیا تھا اور اسے ایک جیو اسٹیشنری تبادلے والے مدار میں داخل کیا گیا تھا۔ مصنوعی سیارے کو خلا میں چھوڑنے کے فوراً بعد کرناٹک میں ہلسن میں انسیٹ ماسٹر کنٹرول سہولیات کے ذریعے مصنوعی سیارے کے نظاموں کو استعمال کرتے ہوئے متعدد اہم کوششیں کی گئیں۔ مصنوعی سیارے کو لکوڈ موٹر، ایوجی کو تین مراحل میں داغ کر پہلے زمین سے تقریباً ۳۶ ہزار کلومیٹر اوپر مدار میں رکھا گیا۔ اس کے بعد مصنوعی سیارے کو مدار میں اپنے قطعی مقام کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے دیا گیا اور تمام چیزوں کو صحیح طرح عمل میں لایا گیا۔ انسیٹ ۲۔ بی تمام نظاموں کی عمدہ کارکردگی کی وجہ سے مقررہ

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

ایس سیتھو رامن

اقتصادی و سماجی ترقّی اور برآمدات بڑھانے والا بجٹ

۹۴-۱۹۹۳ء کے مرکزی بجٹ میں بجٹوں میں بھاری تخفیف کرکے معیشت کو ٹھہراؤ کی حالت سے نکالنے اور زراعت، دیہی روزگار نیز تعلیم اور صحت جیسی اہم سماجی خدمات کے لیے پہلے سے کافی زیادہ رقوم مخصوص کرکے ایک بے مثال اور جرأت مندانہ کوشش کی گئی ہے۔ وزیر مالیات ڈاکٹر منموہن سنگھ نے معیشت کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کی جرأتمندانہ کوشش کی ہے گو مالی اصلاح اور اجمالی اقتصادی استحکام کے اس عمل کو بھارت کے ڈھانچہ جاتی تطبیق اور اصلاحات کے پروگرام کے تیسرے سال میں بھی جاری رکھنا پڑ سکتا ہے

انھوں نے ۱۹۹۱ء میں کہا تھا کہ درد سہے بغیر بیماری کا علاج نہیں ہو سکتا لیکن ان کی کوشش ہوگی کہ غریبوں پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ پچھلے دو سالوں کے مالی انضباط سے وسائل کی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں یقیناً مدد ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر منموہن سنگھ کسی قدر جلد ہی غریبی کم کرنے اور سماجی شعبے کے پروگراموں پر زیادہ توجہ مبذول کر سکے ہیں۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں افراطِ زر تشویش کی ایک بڑی وجہ تھی کیوں کہ افراطِ زر کا سب سے زیادہ اثر غریبوں پر پڑتا ہے۔ تطبیقی پالیسیوں اور سرکاری اخراجات میں تخفیف کی بدولت افراطِ زر کی شرح بانداز ۱۶ فی صد سے گھٹا کر لگ بھگ ۶ فیصد تک لائی جا چکی ہے اور بیرونی ادائیگیاں بھی ایسی سطح پر لے آئی گئی ہیں جس کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں، جو معیشت میں کسی قدر توازن بحال کرنے کے لیے درآمدات اور قرضوں پر بندشوں کا سال تھا، اندرونِ ملک مجموعی پیداوار (جی۔ڈی۔پی) کی شرحِ ترقی گھٹتے گھٹتے صرف ۱.۲ فی صد ہو گئی تھی۔ لیکن مختلف اقدامات کے نتیجے میں یہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۴ فی صد کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔ اگر تمسکات کا گھپلہ (جس سے سرمایہ کاری متاثر ہوئی) اور ایودھیا کا واقعہ (جس سے پیداوار اور برآمدات پر خراب اثر پڑا) نہ ہوتا تو معیشت اپنی بحالی کی راہ پر اور بھی زیادہ تیز رفتار سے گامزن ہوتی۔

عجیب و غریب

۹۴-۱۹۹۳ء کا بجٹ کئی باتوں کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب بجٹ ہے۔ اس میں اقتصادی و سماجی ترقی کو مصمم ارادے کے ساتھ قومی ایجنڈے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملک میں اس بات پر عام اتفاق رائے ہے کہ بھارت بسرعت انضمام پذیر عالمی معیشت میں ایک کنارے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ بھارت کو آج جس بات کی ضرورت ہے وہ ہے اشیاء کی پیداوار اور خدمات دونوں میں مسلسل اور پُرزور ترقی اور کروڑوں غریب و نادار لوگوں کی حالت میں بتدریج بہتری۔

بجٹ کی ترجیحات ہیں مالی خسارے کو ۱۹۹۲ء میں جی۔ڈی۔پی کے زائد از ۵ فی صد کی شرح سے گھٹا کر جی۔ڈی۔پی کے چار فی صد کی شرح پر لانا، ایک پُرزور صنعتی احیا، ٹیکسوں کا سادہ نظام رائج کرنے کی طرف بڑھنا، دیہی علاقوں میں روزگار اور آمدنی بڑھانے کے لیے زراعت اور زرعی پیداوار کی پروسیسنگ کی صنعتوں کو پوری طرح امداد دینا، تعلیم اور صحت جیسی سماجی خدمات کو بڑھانا اور مستحکم کرنا اور برآمدات میں تیزی سے اضافہ کرنا تاکہ ادائیگیوں کے توازن کو غیر ممالک سے غیر معمولی قرضوں پر انحصار کے بغیر بہتر بنانا۔

تجارتی پالیسی کو نرم بنانے کی حکمت عملی کے تحت درآمدی محصولات اور ایکسائز ڈیوٹیوں میں جو بھاری کٹوتیاں کی گئی ہیں ان سے صنعتی احیا میں مدد ملے گی اور ہندوستانی مال غیر ملکی

منڈیوں میں غیر ملکی مال کا مقابلہ کر سکے گا۔ تیز تر اقتصادی بحالی میں مدد دینے کے لیے زائد از ۴۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم وقف کرنے کے بعد وزیر مالیات کو کارپوریٹ ٹیکس میں اصلاحات کو اگلے سال کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔ اگر وہ ایک ہی بجٹ میں براہِ راست اور بالواسطہ دونوں قسم کے ٹیکسوں کے ڈھانچے میں تبدیلی کرنے کی کوشش کرتے تو بلّاں کے مصارف جن میں ۳۲ فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے، خطرے میں پڑ جاتے۔ انھیں اُمید ہے کہ کسٹمز اور ایکسائز محصولات میں کی گئی کمی سے جو نقصان ہوگا وہ ان دونوں سے وسیع تر پیمانے پر ہونے والی وصولیوں سے پورا ہو جائے گا۔ ایکسائز محصولات اور سود کی شرحوں میں کمی کئے جانے سے صنعتوں کے لیے چیزوں کی لاگت اور صارفین کے لیے قیمتیں کم کرنے میں بھی مدد ملنی چاہیئے۔

اگرچہ تجارتی اور صنعتی حلقوں میں بجٹ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے تاہم ان حلقوں کو اس بات سے مایوسی بھی ہوئی ہے کہ کارپوریٹ ٹیکس کی شرح زیادہ نہیں گھٹائی ہے لو کم سے کم ۴۵ فیصد بھی نہیں کی گئی ہے۔ وزیر مالیات کو اس امر کا احساس ہے کہ سرمایہ کاری سے متعلق بچتوں کو بڑھانے کے لیے کافی کچھ کرنا ضروری ہے۔ فی الحال انھوں نے تنخواہ سے ہونے والی آمدنی میں معیاری کٹوتی (Standard Deduction) کی حد ۱۲ ہزار روپے سے بڑھا کر ۱۵۰۰۰ روپے کی ہے۔

وزیر مالیات نے غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کو بازار کی شرح تبادلہ پر سو فی صدی قابلِ تبدیل بنا کر یقیناً ایک بہت بڑا قدم اٹھایا ہے اس سے برآمدکاروں کو بڑی ترغیب ملے گی۔ بنکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ روپے کی شکل میں دیے جانے والے برآمدی قرضوں پر سود کی شرح کم کردیں۔ اس کے بدلے میں وہ ٹیکس ختم کر دیا جائے گا جو انھیں برآمدی قرضوں پر ملنے والے سود پر دینا پڑتا ہے۔ غیر ملکی کرنسی کو روپوں میں تبدیل کرانے کے لیے گزشتہ سال جو دوہری شرح تبادلہ رائج کی گئی تھی اس کی جگہ پر اب ایک ہی شرح تبادلہ (یعنی بازار کی شرح تبادلہ) کے رائج کئے جانے سے غیر ملکی زرمبادلہ کے حصول میں اضافہ ہوگا لیکن روپے کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے سے شرح تبادلہ کے استحکام، ادائیگیوں کے توازن اور اندرونِ ملک قیمتوں پر اثر پڑے گا۔

پیداوار اور برآمدات کے علاوہ بجٹ میں دیہی ڈھانچے کی سہولیات بڑھانے، غریبی کم کرنے اور دیہات کو ترقی دینے کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات پر ہونے والے ترقیاتی اخراجات میں کافی زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ [illegible] مزدوروں اور سماج کے دوسرے [illegible] پر تصفیق کا بوجھ نہ پڑے، اس [illegible] نے کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ [illegible] پالیسی میں تمام تر انقلابی تبدیلیوں [illegible] ملازمین کی تعداد میں کوئی بڑی تخفیف نہیں ہوئی ہے۔

حکومت نے صنعتی مزدوروں پر "ماہر جاؤ" قسم کی کوئی پالیسی من مانے ڈھنگ سے لاگو نہیں کی ہے۔ اس نے قومی تجدیدی فنڈ (National Renewal Fund) جیسے ادارے سماجی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قائم کر دیے ہیں تاکہ اُن کارخانوں کے، جن کی حالت پتلی ہے اور جن کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے، مزدوروں کو کافی معاوضہ مل سکے اور انھیں تربیت دلا کر جہاں کہیں ممکن ہو دوبارہ ملازمت دلائی جا سکے۔ قومی تجدیدی فنڈ کا استعمال روزگار پیدا کرنے والی اسکیموں کے لیے بھی کیا جائے گا کیوں کہ اس وقت ملک کو جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے روزگار اور اس کے ساتھ ساتھ برسر ملازمت مزدوروں سے اور زیادہ پیداواریت حاصل کرنا، جنھیں ہر وقت اپنے حقوق و مراعات کا ہی احساس رہتا ہے۔ صنعتوں کی کسی وسیع پیمانے پر نجکاری (Privatisation) نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر بے روزگاری پیدا ہو گئی ہو، جیسا کہ بعض سیاسی طور پر حساس طبقے فرض کر رہے ہیں

تحفظ :

خوراک پر سبسڈی گھٹائے جانے کے بجائے ۹۲-۱۹۹۱ء سے بڑھائی ہی جاتی

[illegible] کافی معاوضہ دیا گیا ہے۔

اخراطِ زر میں کمی اور خاص کر اناج اور خوردنی تیلوں کی قیمتوں میں گراوٹ سے لوگوں کے سبھی طبقوں کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ صحیح ہے کہ مالی کساد اور سرکاری اخراجات میں کمی سے ترقی اور روزگار کی رفتار میں کچھ سستی آ سکتی ہے۔ خاص کر سرکاری سیکٹر کے صنعتی اداروں میں۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے دیگر ترقی پذیر ملکوں کے، جو اسی طرح کی تطبیق کے عمل سے گذر رہے ہیں، تجربے کی روشنی میں غریبوں کی مدد کے لیے بنائے گئے براہِ راست مداخلت کے پروگراموں کو مستحکم بنانے کے لیے بروقت کارروائی

(باقی صہ ۳ پر)

بقیہ، معذور افراد کے بہبود کی اسکیمیں

روزگار میں معقول نمائندگی دلائی جاتی ہے ۔ فی الحال ۱۱ ضلع باز آبادکاری مراکز مصروف عمل ہیں ۔ یہ مراکز بھوانی (ہریانہ)، بلاسپور (مدھیہ پردیش)، چینگل پٹو (تامل ناڈو)، جگدیش پور (اتر پردیش)، کھڑگاپور (مغربی بنگال)، وجے واڑہ (آندھرا پردیش)، وردھا (مہاراشٹر)، بھوبنیشور (اڑیسہ)، کوٹہ (راجستھان)، میسور (کرناٹک) اور سیتاپور (اتر پردیش) میں واقع ہیں۔

منصوبہ بندی کے مشورے سے اس اسکیم کے نظریے میں کچھ تبدیلی لائی گئی ہے ۔ نظر ثانی شدہ اسکیم کے تحت ریاستوں میں باز آبادکاری کاموں کو صحت کے محکمے سے وابستہ کرنا ہے ۔ بنیادی سطح کے کارکنان کو باز آبادکاری پروگراموں کے سلسلے میں ابتدائی زمرے کی تربیت بھی دی جائے گی ۔

معذور افراد کے تئیں سماج کا نظریہ بدلنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ معذور افراد خود کو عام انسانی معاشرے سے الگ تھلگ نہ محسوس کریں ۔ سماج میں معذور افراد کے تئیں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے معذور افراد کے تئیں لوگوں کا رویہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ۔ ایک ردعمل جو عام طور پر نظر آتا ہے، وہ اُن پر ترس کھانے کا ہوتا ہے ۔ دوسری طرح کا ردعمل اُن کے تئیں کراہیت برتنے کا دکھائی دیتا ہے، گویا معذور افراد جان بوجھ کر معذور بن گئے ہیں یا ان کی معذوری از خود ایک طرح کا جرم ہے ۔ مذکورہ دونوں ہی طرح کے رجحانات اور ردعمل غلط ہیں ۔ اس کے لیے سماج کے عام تندرست لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس کام میں رضاکار ادارے بہت حد تک مددگار ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ رائے عامہ ہموار کرنا کسی فرد واحد یا کسی سرکاری ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ابلاغ عامہ سمیت سماج کے ہر بیدار مغز شہری کو کوشش کرنی ہوگی۔ معذور افراد کے تئیں عوامی نظریہ بدلنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ معذور افراد کو مختلف ہنروں سے آراستہ کرکے خود کفیل بنایا جائے ۔ اقتصادی خود کفالت کے حامل معذور افراد کے تئیں سماج یا گھر والوں کا نظریہ ہرگز ویسا نہیں ہو سکتا جیسا بے روزگار یا دست سوال دراز کرنے والے کسی عام معذور شخص کے لیے ہوتا ہے ۔ معذور افراد کو روزگار فراہم کرانے کے لیے حکومت نے حسب ذیل انتظام کیے ہیں :۔

معذور افراد کے لیے روزگار کی فراہمی

ملک بھر میں کام کر رہے بے روزگار دفاتر میں خصوصی شعبوں کے ذریعہ معذور افراد کو روزگار اور نوکریاں فراہم کی جاتی ہیں ۔ جسمانی طور پر معذور افراد کو ملازمتیں دلوانے کے لیے خصوصی کوششیں کی جا رہی ہیں ۔ تمام روزگار دفاتر بھی معذور افراد کا نام معقول ملازمتوں اور کاموں کے لیے درج کرتے ہیں ۔ پیشہ ورانہ باز آبادکاری مراکز بھی اس سمت کوشاں ہیں ۔ حکومت ہند نے عام سرکاری دفاتر اور مرکزی سرکاری دائرہ کار کے اداروں میں معذوروں کے لیے تین فی صد اسامیاں مخصوص کی ہیں ۔ وزارت بہبود تمام وزارتوں اور محکموں کے ذریعہ معذوروں کو فراہم کی جانے والی ملازمتوں کی نگرانی کرتی ہے ۔

گذشتہ تین برسوں کی مدت میں ۴۲ خصوصی روزگار دفاتر اور عام زمرے کے روزگار دفاتر کے ۵۵ خصوصی شعبوں کے ذریعہ ۱۱۹۴۰ افراد کو سرکاری و سرکاری دائرہ کار کی صنعتوں میں روزگار اور ملازمتیں فراہم کرائی گئی ہیں ۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء کے عرصے میں ہر برس بالترتیب ۳۰۳۹، ۴۵۹۹ اور ۴۳۰۲ معذور افراد کو روزگار فراہم کرایا گیا۔

۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں بھرتی کی خصوصی مہمات چلائی گئیں تاکہ خالی پڑی ہوئی آسامیوں پر معذوروں کا تقرر عمل میں لایا جائے ۔ یہ اسامیاں گروپ 'سی' اور گروپ 'ڈی' میں تھیں جو بصری اور سمعی طور سے معذور افراد کے لیے مخصوص تھیں ۔ ان مہمات کے ذریعہ ۱۰۳۶ افراد کو روزگار فراہم ہو سکا ۔

باز آبادکاری کونسل کا قیام

رواں برس کے دوران ملک میں معذور افراد کی باز آبادکاری سے متعلق پیشہ ور افراد کی تربیت کے لیے اعلیٰ سطح باز آبادکاری کونسل تشکیل دی گئی ہے ۔ یہ خود مختار باڈی ہے اور پیشہ وروں کی کم از کم تعلیم اور تربیت کی حدود کا تعین کرتی ہے ۔ یہ کونسل کچھ ایسے اداروں کو منظوری بھی دیتی ہے جو تربیتی پروگراموں کی تعلیم دیتے ہوں اور باقاعدہ اس کی سند بھی جاری کرتے ہوں ۔ کونسل غیر ممالک سے حاصل کردہ ڈگریوں اور ڈپلوما کو بھی اہمیت دیتی ہے ۔ اور فارغ التحصیل افراد کا ریکارڈ بھی رکھتی ہے ۔ اس کونسل کو ۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ قانونی باڈی کی شکل دے دی گئی

ہے۔ یہ باڈی معذوروں کے علاج سے متعلق مختلف النوع کورسیز کے لیے داخلہ جاتی امتحانات کا بھی انعقاد کرتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ معذور افراد کی بازآبادکاری کے کام کو جوش و خروش کے ساتھ چلایا جارہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ معذور افراد کی جسمانی کمیوں کو مختلف مصنوعی اعضاء اور ساز و سامان کے ذریعہ ممکن حد تک دور کیا جائے۔

باہمی معاہدوں کی اسکیم کے تحت راحت اور امداد

وزارتِ بہبود، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور سویڈن سے باہمی طور پر معاہدہ کر کے معذوروں کی بہبود کے پروگراموں کے لیے عطیہ کی شکل میں ساز و سامان حاصل کرتی ہے۔ معاہدوں کے تحت بہت سی راحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ معاہدوں کے تحت بیرونِ ملک سے خوراک، دودھ کا پاؤڈر، ڈبہ بند خوردنی اشیاء، ادویہ، ایمبولینس، چلتی پھرتی ڈسپنسریوں سمیت زرعی ساز و سامان جیسی اشیاء بھی حاصل ہوتی ہیں جن پر کوئی محصول نہیں عائد ہوتا۔ ان اشیاء کو بندرگاہ سے مخصوص مقامات تک پہنچانے کی لاگت وزارتِ بہبود کے ذمہ ہوتی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے بجٹ تجاویز ۵۰۰،۴۹ لاکھ روپے کی ہیں۔

جسمانی طور سے معذور افراد کو وظائف

مرکزی حکومت جسمانی طور سے معذور افراد کو درجہ نہم اور اس سے آگے کی تعلیم اور پیشہ ورانہ/تکنیکی تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظائف دیتی آئی ہے۔ یکم اپریل ۱۹۹۲ء سے یہ اسکیم ریاستی حکومتوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کی حکومتوں کو دے دی گئی ہے۔ خیال رہے کہ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ ان معذور طلباء کو بھی ترقی کرنے، تعلیم حاصل کرنے اور سماج کا کارآمد شہری ہونے کا پورا موقع ملے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جسمانی طور سے معذور افراد میں ذہنی صلاحیت، عام لوگوں کے برابر بلکہ زیادہ ہوتی ہے، ایسی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے یہ اسکیم بے حد مفید ثابت ہو رہی ہے۔

مصنوعی اعضاء لگانے اور حاصل کرنے کے لیے امداد

اس اسکیم کے تحت معذور افراد کی بہبود میں مصروف اداروں کو معذور افراد کے لیے امدادی ساز و سامان اور مصنوعی اعضاء وغیرہ فراہم کرانے کے لیے پچیس روپے سے ۳،۶۰۰ (تین ہزار چھ سو) امداد دی جاتی ہے۔ جن معذور آمدنی ۱۲۰۰ روپے سے کم ہ اس طرح کے ساز و سامان جاتے ہیں۔

ممتاز آجروں اور جابکدست معذور ملازمین کے لیے قومی ایوارڈز

معذور افراد کی خدمات اور کاوشوں کے اعتراف کی علامت کے طور پر صدر جمہوریہ ہر برس وزارت کے ذریعہ شروع کیے گئے ایوارڈز تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ایوارڈز معذور افراد کو روزگار دینے والے بہتر آجروں اور سرکاری اور سرکاری دائرہ کار نجی شعبوں میں سے خود روزگار کے شعبے میں بہترین معذور ملازمین کو دیے جاتے ہیں۔ معذوروں کو اُن کی صلاحیت کے لحاظ سے صحیح مقام دلانے والے افسران بھی ایوارڈ پانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ سمعی/بصری، جسمانی و ذہنی لحاظ سے معذور افراد کے لیے علیحدہ علیحدہ ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔

معذور افراد کی بہبود کے لیے قومی ٹکنالوجی ایوارڈ

معذور افراد کی بہبود کے لیے قومی ٹکنالوجی ایوارڈ وزارتِ بہبود نے ۸۸-۱۹۸۷ء میں شروع کیا تھا۔ یہ ایوارڈ معذور افراد کے لیے بہترین ٹکنالوجی ایجاد کے لیے دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں بیس ہزار روپے کے تین ایوارڈز دیے گئے تھے۔

معذوروں کا عالمی دن

ہر برس مارچ کے مہینے میں تیسرے اتوار کو "معذ [illegible]

جنوری ۱۹۸۷ء سے ملک کے مختلف حصوں سے معذور افراد کو یوم جمہوریہ کی پریڈ کا نظارہ کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ معذوروں کے قیام و طعام اور اُن کے معاونین کے قیام و طعام اور سفر خرچ کے اخراجات مرکزی حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں۔

معذوروں کے لیے مصنوعی اعضاء بنانے والے بھارتی کارپوریشن والے ایل آئی ایم سی او) کانپور نے ۱۹۷۵ء میں اپنے ایک معاون ادارے کے طور پر نوی فصوصی تربیتی ادارہ (این آئی پی او ٹی) قائم کیا۔ اس ادارے کو بعد از اں "قومی ادارہ برائے باز آباد کاری تربیت و تحقیق" کا نام دیا گیا

اور اسے وزارتِ بہبود کے زیرِ انتظام دیا گیا۔ یہ واحد ادارہ ہے جو اڑیسہ میں کٹک سے ۳۵ کلومیٹر دور اولیٹلپور میں دیہی علاقے میں واقع ہے۔ ادارہ معذوروں کے لیے مصنوعی اعضا، تیار کرنے اور مختلف النوع تربیتی و معالجاتی کورس چلاتا ہے۔

مذکورہ اداروں کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں مثلاً دلی، سکندرآباد، بمبئی، کلکتہ، اُدے پور، لکھنؤ، گوہاٹی، دھوسیتھر، حیدرآباد، مدراس، رانچی، تری وینڈرم، والی (مہاراشٹر) بھوپال میں واقع ہیں اور بھی ادارے خواہ وہ کلیدی ادارے ہوں یا معاون، معذوروں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف پروگرام، ورکشاپ چلاتے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ تمام معذوروں کو جسمانی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ خودکفیل بنا کر ان میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔

معذور افراد کے لیے حکومت کے ذریعے جو بہبودی اسکیمیں چلائی جارہی ہیں ان کی پوری کامیابی عوام کے تعاون اور رضاکار اداروں کی حمایت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بھارت جیسے گھنی آبادی والے ملک میں حکومت اپنے محدود وسائل کے ساتھ جو کچھ کر سکتی ہے وہ کر رہی ہے۔ تاہم معذور افراد کی بہبود کے لیے رضاکار انجمنوں اور اداروں کو آگے آنا ہوگا۔ اس کے لیے باقاعدہ مہم چلانی ہوگی۔

معذوروں کی کامیاب بازآبادکاری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سماج میں معذوروں کے تئیں بیداری پیدا کی جائے۔ لوگ سماج کے معذور افراد کو سماج کا ایک فعال طبقہ تسلیم کریں، اُن پر ترس نہ کھائیں بلکہ اُن کے حقوق انھیں دیں اور دلائیں۔ اس کام میں ابلاغِ عامہ بہت موثر اور مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ چوں کہ ہمارے ملک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے موثر اور قومی ذرائع ابلاغ سرکار کے ہاتھوں میں ہیں لہٰذا سرکار کو معذوروں کی بہبود کے لیے باقاعدہ پروگرام وضع کرنے ہوں گے، تب کہیں جاکر رائے عامہ ہموار ہوگی۔ معذور افراد کو لوگ ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنا چھوڑیں گے اور معذور افراد قومی دھارے میں شامل ہوکر ملک کی ترقی میں سبھی کے شانہ بہ شانہ کام کر سکیں گے۔ معذوروں کی تعلیم اور تربیت کے لیے اب بہت سے اداروں کے قیام کی ضرورت ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کی ابھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سمت ابھی طویل مسافت طے کرنی ہے اور ہمیں اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہے ●

بقیہ کپڑے کی صنعت

اہم بات یہ ہے کہ دھاگے کی بنائی کا تقریباً تمام تر کام ملوں کے منظم شعبے میں کیا جاتا ہے، جب کہ تقریباً ۸۵ فیصد کپڑا ہتھ کرگھا، بجلی کرگھا اور ہوزری کے لامرکزی شعبوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ کپڑے کی کل تیاری میں منظم ملوں کا حصہ صرف ۱۵ فی صد ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران بھارت میں خام ریشم کی کل پیداوار ۱۱۸۶۳۰ لاکھ ٹن رہی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے ریشم کی پیداوار کا نشانہ ۱۴۴۶۵ میٹرک ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ مرکزی ریشم بورڈ نے ۱۲ غیر روایتی ریاستوں میں ریشم سازی کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔

کپڑے کی صنعت کی جدید کاری سے متعلق فنڈ کی اسکیم اگست ۱۹۸۶ء میں شروع کی گئی تھی تاکہ کپڑے کی صنعت میں جدید کاری کے عمل کی رفتار میں تیزی لائی جائے۔ اپریل ۱۹۹۲ء تک ۳۵۷ ملوں کے لیے مذکورہ اسکیم کے تحت ۱۳۶۷ر۳۹ کروڑ روپے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء تک ۸۶۵ر۹۰ کروڑ روپے کی رقم تقسیم کی جا چکی ہے۔ اسکیم کے تحت شروع کردہ جدید کاری کے پروگرام سے یونٹوں کی تکنیکی کارکردگی میں بہتری آئی ہے۔

کپڑے کی صنعت کے کارکنان کی بازآبادکاری سے متعلق فنڈ کی اسکیم بھی ۱۹۳۶ء میں شروع کی گئی تھی تاکہ ملوں کے مستقل طور سے بند ہوجانے کی وجہ سے متاثرہ کارکنان کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اس اسکیم کے تحت ۲۴۰۹۲ کروڑ کارکنوں کو مجموعی طور سے ۴۴ر۰۱ کروڑ روپے کی رقم ادا کی جا چکی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے اس سلسلے میں ۶۰ کروڑ روپے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسکیم کے تحت مجاز اُجرت کی حد ۱۶۰۰ روپے ماہانہ سے بڑھا کر ۲۵۰۰ روپے ماہانہ کر دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کارکنان کو راحت مل سکے۔

حکومت نے ۱۹۹۲ء میں کپڑے سے متعلق قومی کارپوریشن (این ٹی سی) اور برٹش انڈیا کارپوریشن (بی آئی سی) کی سوتی کپڑا ملوں کے سلسلے میں ایک زبردست حکمتِ عملی کی منظوری دی ہے۔ اس نئی حکمتِ عملی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ این ٹی سی اور بی آئی سی کے اُن سابق ملازمین کو جو بجلی کرگھا یا رلینگ یونٹ قائم کرنے کے سلسلے میں اپنے ہُنر اور تجربے کو استعمال کرنے کے خواہاں ہوسکتے ہیں۔ از سرِ نو کام پر لگانے کے سلسلے میں ۵۰ کروڑ روپے کا ایک بازآبادکاری فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ ●

اے۔ کے۔ بھٹاچاریہ

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے بجٹی رعائتیں

گذشتہ مسلسل تین بجٹوں میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی شعبے کو خصوصی ترغیبات دی گئی ہیں۔ مالی بل ۱۹۹۳ء میں بھی، جو لوک سبھا میں پیش کیا گیا ہے، چھوٹے پیمانے کے صنعتی شعبے کو مزید رعائتیں دی گئی ہیں۔ اس موقع پر اعلان کردہ چند مزید راحتوں میں ایک راحت یہ بھی شامل ہے کہ چھوٹے پیمانے کے غیر اندراج شدہ یونٹوں کے لیے ایکسائز محصول میں چھوٹ کی حد مزید بڑھا کر ۳۰ لاکھ روپے کر دی جائے گی۔ یہ اضافہ غیر اندراج شدہ یونٹوں کے لیے ایکسائز میں چھوٹ کی حد میں اضافے کے علاوہ ہے یہ حد ۷۵ لاکھ سے بڑھا کر ۱۰ لاکھ روپے کر دی گئی ہے، جس کا اعلان موجودہ مرکزی بجٹ میں کیا گیا ہے۔ اس طرح، صرف ایک سال میں چھوٹے پیمانے کے غیر اندراج شدہ یونٹوں کے لیے ایکسائز محصول کے سلسلے میں دی جانے والی چھوٹ میں چار گنا اضافہ ہوا ہے، جو ۷۵ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۳۰ لاکھ روپے ہو گئی ہے۔

چھوٹ کی حد میں ... سے زیادہ اضافے سے بڑی تعداد میں چھوٹے پیمانے کے اُن یونٹوں کو فائدہ ہوگا، جنھیں حکام کے پاس اندراج کرانے کا معاملہ ایک دُشوار طریقہ لگتا ہے۔ درحقیقت، چھوٹے پیمانے کے بہت سے ایسے غیر اندراج شدہ یونٹ ہیں، جنھیں خام مال، آسان شرائط پر قرضہ اور بجلی کی سپلائی جیسی رعایتی سہولیات نہیں مل رہی ہیں۔ اب یہ تمام فوائد حاصل کرنے

...پیمانے کے غیر اندراج

لاکھ روپے تک کی اید

محصول میں چھوٹ کی ا

غیر اندراج شدہ یونٹوں ...

اندراج شدہ یونٹوں کو دی جانے والی رعایا کے لحاظ سے عدم مساوات ختم ہو جائے گی، جن کا اندراج چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ڈائریکٹوریٹ میں ہے۔

اس قدم کا ایک نتیجہ سامنے آئے گا۔ اندراج کرانے کے سلسلے میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹ کے لیے ترغیب میں مزید کمی واقع ہوگی۔ اس وقت ایک اندراج شدہ یونٹ کو ۳۰ لاکھ روپے تک کی پیداوار پر ایکسائز میں چھوٹ بھی حاصل ہے۔ اس سلسلے میں بھی ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں ایک اہم تبدیلی کی گئی ہے۔ اس سے قبل، ایکسائز محصول کی ایک فہرست کے تحت ساز و سامان تیار کرنے والے یونٹوں کے لیے کاروبار کے پہلے ۲۰ لاکھ روپے سے ایکسائز محصول کی مکمل چھوٹ تھی اور اگر محصول کی ایک سے زیادہ فہرست کے تحت ساز و سامان تیار کیا جاتا تھا تو چھوٹ ... اکو ...

چھوٹے پیمانے کی نئی یونٹوں کے لیے کہیں کم ترغیب رہے گی۔ اس سے ٹیکس حکام مقابلتاً بڑے یونٹوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ بھی دے سکیں گے۔

چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں میں چھوٹے اور بڑے یونٹوں کے درمیان واضح فرق تھا۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے مرکزی بجٹ میں ایکسائز کی ادائیگی کے قواعد و ضوابط میں چھوٹی سی تبدیلی کی گئی ہے، جس سے یہ بات ... ہوئی ہے کہ بڑے یونٹ سرکاری خزانے کے لیے تھوڑا زیادہ تعاون دے سکتے ہیں۔ اس سے قبل ۷۵ لاکھ روپے تک قابلِ ادائیگی ایکسائز محصول حسبِ معمول تھا، جس میں ۱۰ فی صد نکات شامل نہیں

تھے بشرطیکہ کم سے کم ۵ فی صد بلحاظ قیمت محصول ہو۔ موجودہ بجٹ میں صرف ایک مالی سال میں ۷۵ لاکھ روپے تک ایکسائز منظوریوں کے لیے یہ فارمولہ برقرار رکھا گیا ہے۔ ۵۰ لاکھ روپے سے اوپر اور ۷۵ لاکھ روپے تک منظوریوں کے لیے رعایتی شرح بڑھا کر حسب معمول محصول کردی گئی ہے جس میں ۵ فی صد زکات شامل نہیں ہیں، بشرطیکہ کم سے کم ۵ فی صد بلحاظ قیمت محصول ہو۔

ایکسائز میں ایک اور راحت کاسمیٹکس ریفریجریٹروں اور ائیر کنڈیشننگ کے ساز و سامان کے لیے دی گئی ہے۔ گذشتہ برسوں میں قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر مذکورہ سامان تیار کرنے والے چھوٹے یونٹوں کے لیے ایکسائز محصول کے سلسلے میں رعایتوں میں نرمی کی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۵ لاکھ روپے تک کی منظوریوں کے لیے ایکسائز کی مکمل چھوٹ دی گئی ہے۔ ایک مالی سال میں ۳۰ لاکھ روپے تک ان منظوریوں سے ۵۰ فی صد حسب معمول محصول حاصل ہوگا۔ چھوٹ کی یہ آسان اسکیم صرف اُن یونٹوں کے لیے دستیاب ہوگی جن کی منظوریوں کی بابت ایک مالی سال میں ۷۵ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔

چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں کے سلسلے میں مالی پالیسی میں یہ تمام تبدیلیاں اُن یونٹوں کو چھوٹ اور ترغیبات کے پیچیدہ نظام سے باہر نکالنے کی ایک کوشش ہے جو قیمتوں میں اضافے اور موجودہ آسان و نرم اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے پُرانے ہوگئے ہیں۔ اختیار کردہ نظریہ یہ ہے کہ اگر عمومی طور سے صنعت کو کنٹرولوں سے آزاد کردیا جاتا ہے، تو چھوٹے پیمانے کے ۲۰ لاکھ سے زیادہ صنعتی یونٹوں کو بھی اس نرم پالیسی سے فائدہ ہونا چاہیے۔

گذشتہ دو برسوں میں، چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں کو زیادہ مستحکم، زیادہ مقابلہ جاتی اور ٹکنالوجی کے لحاظ سے زیادہ موثر بنانے کے لیے متعدد دیگر پالیسیاں شروع کی گئی ہیں تاکہ وہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ مثال کے طور پر، یکم اپریل، ۱۹۹۱ء سے اُس صنعتی یونٹ کی توضیح چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹ کے طور پر کی گئی ہے، جس میں پلاسٹ اور یونٹ اور مشینری کے سلسلے میں سرمایہ کاری کی رقم ۶۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے قبل توضیح یہ تھی کہ چھوٹے پیمانے کا صنعتی یونٹ قرار دئے جانے کے لیے مذکورہ سرمایہ کاری کی رقم ۳۵ لاکھ روپے سے کم ہونی چاہیے۔

مزید برآں، جو یونٹ پیداوار شروع کرنے کی تاریخ سے تیسرے سال کے اختتام تک سالانہ کاروبار کا کم سے کم ۳۰ فی صد حصّہ برآمد کرتے ہیں، اُن کے معاملے میں پلانٹ اور مشینری کے سلسلے میں سرمایہ کاری کی رقم کی حد ۷۵ لاکھ روپے ہے۔ اس طرح، چھوٹے پیمانے کے برآمداتی یونٹوں کے لیے پلانٹ اور مشینری کے سلسلے میں اپنی بنیادی سرمایہ کاری میں اضافہ کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے باوجود بھی انھیں چھوٹے پیمانے کا صنعتی یونٹ ہونے کی سہولت حاصل ہے۔

چھوٹے پیمانے کے صنعتی شعبے میں ایک اور انقلابی تبدیلی وہ فیصلہ ہے، جس کے تحت بھارتی اور غیر ملکی بڑی کمپنیوں کے ذریعے چھوٹے پیمانے کے یونٹوں میں ۲۴ فی صد ایکویٹی شرکت کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ بات ماضی میں ناقابلِ تصور تھی یہی نہیں بلکہ چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں کے ساتھ بڑے بھارتی یونٹوں کا کبھی بھی کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے بڑے بھارتی یونٹوں نے چھوٹے پیمانے کے بے نامی یونٹوں کو فروغ دیا تھا اور اُن سے اپنے لیے حصّے پُرزے تیار کرائے تھے۔ نئی اقتصادی پالیسی میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ بڑے یونٹ چھوٹے یونٹ کے اقتصادی کام کاج کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور چھوٹے یونٹوں کو بھی ایک بڑی کمپنی کی ظاہرا کائی اور تکنیکی امداد کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ دونوں شعبوں کے درمیان تعلق پہلے ہی سے قائم ہوچکا ہے۔

چھوٹے پیمانے کے یونٹوں کے انتہائی اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ اُن کی نقد ادائیگیوں میں تاخیر ہے۔ اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے ایک ضمنی قدم اُٹھایا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے بلوں کی بروقت ادائیگی میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے ایک بل اب پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظور کیا جا چکا ہے۔ اس سے آگے چل کر چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اپنی چھوٹی مالی بنیاد کے باوجود چالو رہیں گی نیز وقت، تعداد اور معیاری مصنوعات کے ان کے وعدے پورے ہوں گے۔

●

ایس۔ ایس۔ تاراپور

تجارتی بنک کاری کی اصلاحات کے مسائل

۱۹۶۹ء میں بڑے بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد سے تجارتی بنک کاری نظام میں دور رس تبدیلیاں آئی ہیں اور خاص طور سے ان بنکوں کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں کاروباری بنکوں کی تعداد ۸۳ تھی جو مارچ ۱۹۹۲ء میں بڑھ کر ۵۰۰ تک جا پہنچی۔ سال بہ سال منصوبے کے لیے درکار وسائل اور افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے دباؤ بڑھتا گیا جس کے حصول کے لیے ٹھوس اقدامات کرنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔ قرضوں کے لیے ایک ٹھوس پالیسی مرتب کی گئی اور قرضوں کا ایک بڑا حصہ ترجیحی شعبے کو جاتا تھا۔ بنکوں کی شاخوں میں تیزی سے اضافہ ہونے سے کنٹرول اور ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں اور ایسے صنعتی اور دوسرے اداروں کو قرضہ دینے سے جہاں خطرہ رہتا ہے بنکوں کی حالت خراب ہو گئی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء کو سرکاری شعبے کے تمام بنکوں نے ۱۴٫۵ فی صد (ہیلتھ کوڈ ۸۔۴ کے مطابق) ایسا قرضہ دے رکھا تھا جس کا منافع بخش استعمال نہیں ہو سکا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے وسط سے بنک کاری کی خراب ہوتی گئی حالت پر تشویش بڑھتی گئی

اور پھر بنکوں کی توسیع کی بجائے پہلے سے موجودہ بنک کی شاخوں اور بنک کاری کے نظام کو مستحکم بنانے پر زیادہ زور دیا گیا۔ ہندوستان کی بنک کاری کی صنعت ایک نازک گھڑی سے گزر رہی ہے اگر واضح اور ٹھوس اقدامات کیے جائیں تو آیندہ برس
میں بہتری آنے کی اُمید
۱۹۹۱ء ۔ ۹۲
ہے کیوں کہ اسی سال
نرسمہم (NARASIMHAM)
کے مطابق اصلاحات پر عمل کرنے کی غرض سے ایک جامع پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اگرچہ اس کمیٹی کی سفارشات کا بھی علم ہے تاہم اس رپورٹ کی بعض اُن اہم سفارشات پر توجہ مرکوز کرنا غالباً مفید ہوگا جن کے اثرات تجارتی بنکوں پر مرتب ہوں گے۔ مالی شعبے کے لیے ایک ٹھوس اور مسلسل پالیسی اپنائے جانے کی ضرورت ہے کیوں کہ ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ اصلاحات کا عمل پائیدار ثابت نہیں ہوگا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اسی سلسلے میں اصلاحات سے وابستہ مختلف عوامل کا جائزہ لیا جائے۔

اصول: نرسمہم کمیٹی نے سرمایہ، آمدنی،

آمدنیوں اور ٹیکے کھاتے کو پورا کرنے کے لیے انتظام سے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں ریزرو بنک آف انڈیا ان میں کچھ ردّوبدل کے بعد پہلے ہی عمل کر رہا ہے۔ حالیہ
تحمی۔ ۔ے ۔طالق ر ۔ ۔ ک ۔ ۔

درکار ہوں گے۔ اس رقم میں سے ۴۰۰۰ کروڑ روپے بنک فاضل فنڈ سے اگلے دو برس میں حاصل کر سکیں گے جب کہ ۱۰۰۰ کروڑ روپے اضافی وسائل سے مہیا کرنا ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا کہ آیندہ کی کاروباری ضروریات پوری ہو سکیں اور اضافی ضروریات پورا کرنے کے لیے بھی بندوبست ہو سکے۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری میں ٹھہراؤ آ گیا ہے تاہم اس کی تفصیل میں جانا کارآمد ثابت ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ کافی بڑا ہے لیکن اتنا بڑا بھی نہیں ہے کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ مجموعی سرمایہ کاری

کی مختلف اشکال ہوسکتی ہیں۔ مثلاً سرمایہ بازار میں براہِ راست رسائی ہونی چاہیئے اور بنک ملازمین بھی پیسہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح سرکاری شعبہ اور سرکاری شعبے کے بنک بھی مساوی طور پر سرمایہ کاری کے لیے رقوم جاری کر سکتے ہیں۔ حکومت قومی ملکیت کے بنکوں کی ایک طرح سے آجر ہے لہذا یہ اس کی ذمّہ داری ہے کہ وہ سرکار کے بجٹ پر پڑنے والے بار کا اندازہ لگائے اور اس سلسلہ میں ضرورت پڑنے پر کثیر القومی اداروں سے وسائل حاصل کرنے کے امکان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ بنکوں کے بار کو کم کرنے کے لیے درحقیقت سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ بجٹ میں کچھ رقم مخصوص کی جائے اور جب بنکوں کو حکومت کی امداد ملے گی تو وہ یہ پیسہ سرکاری تمسکات خرید کر اُن میں لگا سکتے ہیں۔ اس طرح بجٹ پر کوئی خاص اثر بھی نہیں پڑے گا جب کہ سود کی ادائیگی اور بانڈ کو بھُنانے کی صورت میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک سرمایہ کو دوبارہ قابلِ استعمال بنانے کا سوال ہے اس کا انحصار ہر بنک پر الگ الگ ہے۔ کچھ بنکوں کی سرمایہ بازار میں براہِ راست رسائی ہوسکتی ہے جب کہ کچھ دوسرے بنک اثاثے کے حساب کتاب کے بعد اپنا سرمایہ بڑھانے کے لیے بعد میں سرمایہ بازار سے رجوع کریں گے۔ اس سب کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ بعض بنک سرمایہ بازار تک پہنچ ہی نہ سکیں اور اسی طرح کے بنکوں کے لیے اثاثوں کی ازسرِنو تشکیل میں کچھ ردّوبدل ضروری ہے۔

فنڈ :-

نرسمہم کمیٹی نے اثاثوں کی ازسرِنو تشکیل سے متعلق فنڈ (اے۔آر۔ایف) کے قیام کی سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس پر عمل کیے جانے سے قبل بنکوں اور مالی اداروں کے مشکوک اثاثوں کا حساب طے کر لیا جائے اور یہ بات بھی واضح طور پر طے کر لی جائے کہ اس کے لیے رقوم کہاں سے حاصل ہوں گی اور پھر اس کے کیا اثرات مرتّب ہوں گے۔ اگر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق رقوم کی واپس ادائیگی سے متعلق ٹرائی بیونل کے قیام پر عمل کیا جائے تو بنکوں کے بہت سے دعووں کا تیزی سے تصفیہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اے آر ایف کا مناسب ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے تو لازمی طور پر کافی رقم حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر اسی رقم کا بندوبست حکومت یا ریزرو بنک کرے تو اس سے کثرتِ زر کو فروغ حاصل ہوگا اور جس کا نقصان دہ اثر معیشت پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ لہذا بنکوں کے ذریعہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کی حکمت عملی نہایت احتیاط سے بنائی جانی چاہیئے۔ رقوم کی وصولی کی غرض سے اے آر ایف کا طریقہ اپنانے سے قرضہ دینے والے کی اخلاقی اعتبار سے حوصلہ شکنی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وصولی کا یہ بہترین طریقہ ثابت نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے جوابدہی کے جذبے میں کمی آئے گی اور اس طرح رعایت دینے سے آئندہ کے لیے ایک غلط نظیر قائم ہوگی۔ البتّہ ایسے چھوٹے بنکوں کے لیے جن کی سرمایہ بازار تک رسائی ممکن نہ ہو اے آر ایف کے محدود استعمال پر غور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ کوئی اور متبادل نہ ہو اور آئندہ بٹّے کھاتے کی صورتِ حال پیدا نہ ہونے کی یقین دہانی کرائی گئی ہو۔ ان بنکوں کو نقصان پورا کرنے کی یقین دہانی کرائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ انھیں اثاثوں کے فروغ پر کنٹرول اور انتظامیہ کی طرف سے قربانی دیگر دوررس تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اپنا کاروبار بڑھا کر شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ سب تفصیل ایک عرضداشت میں واضح طور پر طے کی جائے اور اس پر مسلسل نظر رکھی جائے۔ اب اس طرح کے اے آر ایف نظام اور بنکوں کے مقابلے میں قرضہ جات کی بہتر طور پر وصول کرنے کی ان اداروں کی اہلیت پر بھی غور کیے جانے کی ضرورت ہے۔ جب ایک مرتبہ ان پہلوؤں کو طے کر لیا جائیگا تب محدود طریقے پر اے آر ایف کا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے۔ اے آر ایف کا راستہ صرف اُن ہی بنکوں کے لیے کھولا جائے جو دوسرے متبادل کے ذریعے ردّوبدل نہ کر سکتے ہوں۔ یہاں پیدا شدہ کچھ مسائل کو حل کرنے کی غرض سے اے آر ایف میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے تاکہ رقوم کی وصولی میں بنکوں کو بھی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ تبدیل شدہ اے آر ایف کے مطابق بنکوں کو وصولیابی کا ذمّہ دار بنایا جا سکتا ہے اور اس وصولیابی میں سے کچھ حصّہ انھیں ترغیبات کے طور پر دیا جا سکتا ہے اس طریقے کی بدولت جو رقم حاصل ہوگی اس کے ایک حصّہ کو بانڈ کو بھُنانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں سوچی سمجھی ماہرانہ رائے یہ ہے کہ اسکیم کے تحت نقدی کا پھیلاؤ دانشمندی نہیں ہے۔

بنکوں کی گھٹتی ہوئی مخصوص ضروریات کے اثرات اور حکومت کا تمسکات کا سرگرم بازار۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں بنکوں کی مخصوص ضروریات کی سطح ساڑھے ترےسٹھ (۶۳٫۵) فی صد تھی اور اگر یہ مسلسل جاری رہی تو اس کا بنکوں کے

استحکام پر سنگین اثر پڑے گا۔ بنکوں کی مخصوص ضروریات کے بہت زیادہ ہونے کے مُضر اثرات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس ضرورت میں بہت زیادہ کمی آجانے سے زر سے کنٹرول ہٹ جائے گا اور پھر افراط زر بڑھے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اصلاحات کا عمل خطرے میں پڑ جائے گا۔ ۹۳ - ۱۹۹۲ء میں مخصوص ضروریات میں جو کمی آئی اس کو آسانی سے تبھی سمجھا جا سکتا ہے جب کہ سی آر آر اور ایس ایل آر کا مشترکہ طور پر حساب لگایا جائے۔ ۹۲ - ۱۹۹۱ء میں مخصوص ضروریات کی سطح ۶۳٫۵ تھی، جو ۹۳ - ۱۹۹۲ء کے پہلے نصف میں کم ہو کر ۵۴ فی صد ہو گئی اور دوسرے نصف میں یہ ۲۵ فی صد رہ گئی۔

۹۳ - ۱۹۹۲ء کی مالی پالیسی سے اس بات کی جھلک ملتی ہے کہ اس میں مخصوص ضروریات کو کچھ کم کر دیا گیا ہے۔ بلکہ مالیاتی کنٹرول کے ایک اہم ہتھیار کے طور پر سرکاری تمسکات میں کھلی منڈی کو فروغ دینے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ابھی ایک بہتر اور مؤثر سرکاری تمسکات کی منڈی کو فروغ دینے کے لیے کافی کچھ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن سرکاری تمسکات پر شرح سود کا رجحان اب بازار کی شرح سود کی جانب ہو رہا ہے۔ اندرونِ ملک قرضوں کے انتظام کی پالیسی کو سرگرم کرنے اور ثانوی منڈی کو بڑھاوا دینے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ بنک زیادہ جوکھم والے اور کم جوکھم والے سرکاری تمسکات میں پونجی لگاتے وقت توازن پیدا کریں۔ آئندہ چند برسوں میں یہ رجحان اُبھر سکتا ہے کہ بنک ریزرو ضروری تقاضوں کی بجائے خود اپنی مرضی سے سرکاری تمسکات اپنی تحویل میں رکھنے لگیں۔

شرح سود :

منضبط شرح سود کے ڈھانچے کے بارے میں نرسمہم کمیٹی کی ان بنیادی تجویزوں کا کہ حقیقی شرح سود مثبت نوعیت کی ہونی چاہیئے اور رعایتی شرح سود کو دست نگر بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ عام طور پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اور کئی اصلاحی اقدامات شروع کیے گئے ہیں جیسا کہ (۱) بنکوں کی شرح سود کو معقول بنایا گیا ہے جس کے تحت کئی رعایتی زمروں میں کمی اور کچھ میں اضافہ کیا گیا ہے اس وجہ سے امداد کا عنصر کم ہو گیا ہے (۲) جمع شدہ رقوم پر متوسط شرح سود کی بجائے ایک واحد زیادہ سے زیادہ شرح سود مقرر کی گئی ہے۔ جو ۴۶ دن یا اس سے زیادہ مدت والی جمع رقوم پر دی جائے گی (۳) سرکاری تمسکات کی شرح سود بڑھا دی گئی ہے۔ (۴) کچھ دستاویزات جیسا کہ جمع رقم کے سرٹیفکٹ "منی مارکیٹ میوچول فنڈ" اور غیر مقیم (واپس ... کے قابل) افراد کے لیے ڈپا... شرح سود کا تعین بنک آزا... گئے۔ اس وجہ سے شرح ... لانے کی ضرورت ہے خاص طور ... کی ایک حوالہ شرح سود مقرر کی جائے جس کی بنیاد پر باقی سبھی شرحیں طے کی جا سکیں۔ اس طرح کی حوالہ شرح کے مؤثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مارکیٹ میں اپنا مقام بنائے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ خصوصی مقام حاصل کرے۔ ان اقدامات کو جاری رکھنا ضروری ہے لیکن پھر بھی نظام میں تمام شرح سود کو تیزی سے ہٹانے کی بجائے بہ احتیاط کارروائی کی جائے کیونکہ بہت سے ملکوں کے تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ تیزی سے اقدامات عدم استحکام کا موجب بنتے ہیں اور ہندوستان کا بنک کاری نظام اس مرحلہ پر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ترجیحی قرضے :

ترجیحی شعبے کے قرضوں کا سوال کافی عرصہ سے زیر غور ہے۔ اکثر یہ غلط دلیل دی جاتی ہے کہ تجارتی بنکوں کا مسئلہ ترجیحی شعبے کو دیا جانے والا بڑا قرضہ ہے جس کی خدمات مہنگی پڑتی ہیں۔ جب کہ وصولی بہت کم رہتی ہے اور یہ باعث پریشانی ہوتا ہے۔ اس بات کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا کہ چھوٹے قرضوں کی نسبت بڑے قرضوں کی واپسی کی شرح بہتر ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اور زراعت قومی پیداوار میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور ان شعبوں کو قرضوں سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ ترجیحی شعبے کے قرضوں کی حقیقی ضروریات پورا کرنے کے لیے [illegible]

...ھی تو ترجیحی شعبے کے لیے ۴۰ فی صدی رقم کا مطلب تھا کہ اس شعبے کے لیے ۱۴٫۶ فی صدی اضافی جمع شدہ رقم۔ لیکن اگر مؤثر اضافی مخصوص ضروریات ۲۵ فی صدی ہو تو ۴۰ فی صدی ترجیحی رقوم کی بنیاد پر دستیاب اضافی ڈپازٹ ۲۲٫۵ فی صدی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ریزرو (مخصوص) ضروریات میں زیادہ تبدیلیوں کے لیے ترجیحی سیکٹر کی خاطر اضافی رقوم کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ترجیحی شعبے کے لیے قرضوں کے نشانوں پر نظر ثانی مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ترقیاتی عمل کے لیے کچھ مخصوص قرضے فراہم کرنا ضروری ہیں۔

دیہی قرضے :

مختلف پالیسی اقدامات اور محکمہ جاتی تبدیلیوں کے ذریعے زرعی پیداوار زیادہ حاصل کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اس کے تحت دیہی قرضوں کے معیار کو بہتر بنانے کی غرض سے زرعی قرضہ اداروں کی کارکردگی وسیع اور متنوع بنانے کی ضرورت ہے۔ مالی شعبے کی کامیاب اصلاحات کے لیے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ دیہی قرضہ نظام کو از سرِ نو مرتب دیا جائے اور اس کی جگہ ایک پائیدار محکمہ جاتی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ دیہی قرضہ ڈھانچے کو قابلِ عمل بنانے کے سوال پر مختلف کمیٹیوں نے توجہ تو دی ہے لیکن یہ ابھی تک کوئی عملی شکل نہیں دے سکی ہیں۔ ایک ایسا دیہی قرضہ نظام وضع کرنا ضروری ہے جس میں زیادہ پیچیدگیاں نہ ہوں۔ اس سلسلے میں شرح سود میں بہتر تال میل اور ملے جلے نشانے پر غیر نشانہ جاتی قرضوں پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ دیہی قرضہ نظام کے ایسے کئی شعبے ہیں جہاں کی کارکردگی قطعی طور پر غیر اطمینان بخش ہے اور دیرپا و دائمی بہتری لانے کے لیے فوری طور پر بعض قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

نجی بینک :

نرسمہم کمیٹی نے نجی شعبے کے بینکوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ نئے نجی بینکوں کے قیام پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے اس کے باوجود کسی بھی نجی بینک کے لیے کوئی لائسنس جاری نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اب وقت کا تقاضا ہے کہ نجی شعبے میں نئے کچھ بینک قائم کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ مقابلہ کا عنصر پیدا ہو سکے۔ اس ضمن میں بہت سے امور پر غور کرنا ہوگا۔ نجی شعبے میں بینکوں کے قیام کے لیے ایک اچھی بات یہ ہوگی کہ ابتدائی کم از کم سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ مقرر کیا جائے تاکہ یہ آئندہ ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر کام کر سکے نیز سرمایہ کے جوکھم کو برداشت کرنے کی شروع سے ہی صلاحیت رکھ سکے۔ اس طرح کے بینکوں کی گاؤں میں قائم کی جانے والی شاخوں اور ترجیحی شعبے کے قرضے کے سلسلے میں غور و خوض کی ضرورت ہے۔ انفرادی/ گروپوں کی طرف سے کثیر تعداد میں حصص خریدنے کی حد اور ووٹ دینے کے اختیار کی حد پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ معاملہ بھی سامنے آیا ہے کہ آیا مالی کمپنیوں کو بینک قائم کرنے کی اجازت دی جائے یا نہیں اور اسی صورت میں کمپنیوں کے آپس میں حصص خریدنے کے سوال کو بھی طے کیا جانا چاہیئے۔ جن اہم پہلوؤں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ان میں کنٹرول کرنے والے گروپ اور کمپنیوں کی طرف سے شروع کیے گئے یا اُن کے زیرِ انتظام پراجیکٹوں کے لیے بینکوں کی طرف سے قرضہ دینے کا سوال بھی شامل ہے۔ صنعتی گروپوں اور بینکوں کے آپس میں مل جانے سے اقتصادی قوت کا ارتکاز ہو سکتا ہے اور یہی سب سے بڑا ایک اعتراض تھا جس کی وجہ سے بینکوں کو قومی ملکیت میں لینا پڑا۔ نجی بینکوں کے قیام کے سلسلے میں بہت سے پہلو ہیں جن کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور یہ بذاتِ خود ہی ایک ایسا علیحدہ موضوع ہے جس پر ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

نگرانی :-

قواعد اور ضوابط نیز نگرانی کے آپس میں بالکل ہی مدغم ہو جانے کی وجہ سے کچھ اختلافات سامنے آئے ہیں۔ حالیہ برسوں میں اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ نگرانی اور قواعد کو الگ کر دیا جائے۔ قواعد و ضوابط دراصل مختلف اصولوں، قاعدوں اور روایات کو ایک ٹھوس شکل دینے کا نام ہے جب کہ نگرانی کا مطلب اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ بینک ان قاعدے قانونوں پر عمل بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگرچہ موثر نگرانی سے قانون کی ضرورت کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ زیادہ موثر قانون بنا کر نگرانی کا کوئی متبادل نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نگرانی کا ایک ٹھوس اور موثر نظام وضع کیا جائے۔ اصلاحات کے عمل کے دوران نت نئے خطروں اور جوکھم کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور پھر اس کے لیے زیادہ عمدہ قسم کے نگرانی نظام کی ضرورت ہوگی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اصلاحات کے عمل کی کامیابی کے لیے ایک موثر نگرانی نظام ہونا اشد ضروری ہے۔ بینک کاری نظام، لین دین، کاروبار سے رابطوں اور نئے اداروں سے تعلق وغیرہ کی بنا پر سرگرمیاں بڑھ جائیں گی جن کے بڑھنے سے بعض پیچیدگیاں اور نئے مسائل بھی سامنے آئیں گے۔ لہٰذا اس حالت میں نگراں کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے۔ نگرانی کا اصل مقصد اس نظام کی بہتری، اور تحفظ ہونا چاہیئے۔ محض مختلف قاعدوں اور قوانین، منضابط ہدایات اصولوں نیز ہدایات پر عمل آوری کی جانچ پر زیادہ توجہ دینے کی بجائے بینک کے اندر ہی داخلی کنٹرول اور خطرے سے متعلق دوسرے نظاموں پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کی جائے۔ نگرانی کا عمل برسرِ موقع اور باہر تیزی کے ساتھ پورا کیا جانا چاہیئے۔ نگرانی کرتے وقت قرضوں کے معیار، طریقہ کار، سرگرمیوں اور بینک کاری کے دوسرے شعبوں پر بھی توجہ دی جانی چاہیئے کیوں کہ بینکوں کی اچھی کارکردگی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ نگرانی سے متعلق پالیسیوں اور

طریقوں کو مالی ایجنڈے کا ایک اہم جزو بنایا جانا چاہیئے۔ نگرانی کی پالیسیاں اور طریقہ کار قانون کے دائرے میں ہونے چاہئیں۔ نیز ان ہی کے مطابق نگہداشت اور جانچ پڑتال کی جائے اور غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کر کے تقریری کارروائی کی جانی چاہیئے۔ نگرانی کے نظام کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت سے زیادہ نگرانی نہیں کی جائے اور نہ ہی بنکوں پر قاعدے قانون کا زبردست بوجھ لادا جائے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ نگرانی موثر انتظامیہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نگرانی کے عمدہ نظام کے ساتھ ساتھ بنکوں کا خود اپنا اندرونی کنٹرول نظام بھی عمدہ معیار کا ہونا چاہیئے اگر نگرانی کو بنک کاری نظام کا ایک معاون پہلو تصور کیا جائے تو نگرانی کا بار کم از کم ہوگا اور یہ بہت موثر ثابت ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ بنکوں کے لیے بعض قوانین ضروری ہیں اور ہونے بھی چاہئیں اس کے باوجود بعض موجودہ قوانین پر نظر ثانی کی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ بنکوں پر قوانین کا ضرورت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ علاوہ ازیں اس وقت ماضی کی تاریخی روایات کے مطابق نامناسب قوانین کی نہیں بلکہ بامعنیٰ قانون کی ضرورت ہے۔ تجزیہ کی بنیاد پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مناسب قوانین کے نہ ہونے یا ضرورت سے زیادہ قوانین کا بوجھ بنک جانے والوں کو ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

جائزہ :

لہٰذا مذکورہ بالا تمام عوامل کو اصلاحات کے عمل میں یک جا کر دیا جائے کیوں کہ اس کا اثر تجارتی بنکوں پر بھی پڑتا ہے۔ مناسب اور محتاط قانون کی موجودگی میں بنکوں کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنا کام انجام دیں اور اپنے جوکھم کا احتیاط کے ساتھ تخمینہ لگائیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس کارروائی سے بنکوں کے اثاثے کے معیار میں قابلِ قدر بہتری آئے گی۔ اگرچہ بنکوں کی سرمایہ کی ضرورت اور بٹہ کھاتے کو پورا کرنے کے لیے بہت زیادہ وسائل کی ضرورت ہوگی تاہم اگر دیانت داری کے ساتھ کام انجام دیا جائے تو بنکوں کی حالت خراب نہیں ہوگی اور نہ ہی پھر بنک کا دیوالیہ ہونے کا امکان رہے گا۔ اوپر بیان کیے گئے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنے اور اُن پر عمل کرنے سے بنکوں کی مجموعی حالت میں بہتری آئے گی۔ احتیاطی تدابیر اور قوانین سے بنکوں کے کھاتہ داروں کو کسی بھی طرح بنک میں جمع شدہ رقم کے بارے میں کوئی فکر اور تشویش نہیں ہونی چاہیئے بلکہ تمام ضابطوں اور قوانین
سے ان کی جمع شدہ رقوم
ہونا چاہیئے۔ مخصوص ہ
سرکاری تمسکات سے ا
جوکھم کے بخوبی پورا ہو
کے مفادات کا تحفظ ہو
بتدریج کمی کرتے وقت بنکوں کو مالی حکام کے اشارے کا انتظار کرنا ہوگا اور شرح سود طے کرنے کی ذمہ داری خود اُن کو ہی اٹھانی ہوگی۔ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول میں تجارتی بنکوں کی دیکھ ریکھ اور بنکوں کو اپنے داخلی کنٹرول نظام کو مستحکم کرنا چاہیئے قانون اس طرح مرتب کیے جائیں کہ اُن بنکوں پر قوانین کا زیادہ بار نہ پڑنے پائے جو مختلف قواعد و ضوابط پر پوری طرح عمل کرتے ہوں۔ قوانین کو تیزی سے ختم کر دینے کا سوال بھی باعثِ اہمیت ہے کیوں کہ اچانک اور تیزی سے قاعدے قوانین کے ختم کر دینے سے ایک ایسی بدنظمی پیدا ہو سکتی ہے جس سے بچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بعض مرتبہ اصلاحات میں میانہ روی اپنانا اُتنا ہی اہم ثابت ہوتا ہے جتنا کہ خود اصلاحات۔ ●

بقیہ: بھارت کے لیے اہم مواقع

بھارت کی مکمل اقتصادی صلاحیت کو بروئے کار لانا ہے تو ہمیں فرقہ وارانہ تناؤ کے اس ماحول سے باہر نکلنا چاہیئے، جس کی وجہ سے حالیہ مہینوں میں ملک میں ابتری کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے لیے یہ بات مفید نہیں ہے کہ مالی نظم و ضبط پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔ ہم ایک ایسی صورتِ حال برداشت نہیں کر سکتے، جس میں سرکاری دائرہ کار کے اداروں اور صنعتوں کو ہر سال نقصان ہوتا رہے ہمر

ملک پی بی اور دانان کا شعبہ موثر طور کام کرے۔ نیز یہ کہ ریاستی بجلی بورڈوں کے نقصانات میں کمی واقع ہو۔

چیلنج

بھارت ریاستوں پر مشتمل ہے۔ وہ تمام سرمایہ کاریاں جو ہم کرنا چاہتے ہیں، بالآخر ریاستوں میں کی جاتی ہیں اور اگر ریاستی انتظامیہ پانی، زمین اور دیگر سہولیات فراہم کرنے میں مستعد نہیں ہے تو نئی اقتصادی پالیسی کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ اس معاملے میں ایک ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے مرکز اور ریاستوں سمیت تمام متعلقین کے سامنے ایک چیلنج ہے۔ ●

کپڑے کی صنعت

بھارت میں کپڑے کی صنعت سب سے بڑی واحد صنعت ہے، جس کا حصہ کل صنعتی پیداوار میں تقریباً ۲۰ فی صد ہے اور اس سے تقریباً ایک کروڑ ۵۰ لاکھ افراد کو روزگار فراہم ہو رہا ہے۔ یہ صنعت ملک کی کل برآمدات میں سب سے بڑی واحد حصہ دار بھی ہے، جس کا حصہ کل برآمدات میں ۳۰ فیصد سے زیادہ ہے۔

کپڑے کی صنعت بجلی کرگھا اور ہتھ کرگھا دستوں کے علاوہ ہاتھ سے تیار کردہ کپڑے کے شعبے سے لے کر جدید ترین سرمایہ جاتی مل کے شعبے پر مشتمل ہے۔ کپڑے کی صنعت سے متعلق پالیسی ۱۹۸۵ء میں پیداواریت میں اضافہ کرتے ہوئے صنعت کے تینوں شعبوں کی مربوط و ہم آہنگ ترقی و فروغ کے لیے بنیادی ڈھانچہ فراہم کیا گیا ہے۔

کپڑے کی صنعت کے شعبے میں برآمداتی کارکردگی قابل تعریف رہی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران اپریل سے دسمبر ۱۹۹۲ء تک دستکاریوں، پٹ سن اور کوائر سمیت بھارتی کپڑے کی برآمدات کی مالیت ۱۳۰۵۵ کروڑ روپے (یا ۴۵،۳۰ لاکھ امریکی ڈالر) رہی ہے، جس میں گزشتہ سال کی اسی مدت کے مقابلے میں روپے کے لحاظ سے ۳۳،۹ فی صد اور ڈالر کے لحاظ سے ۱۳،۳ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ مذکورہ سال کے پہلے نو مہینوں میں کل نشانہ کا ۴۲ فی صد حاصل کیا گیا ہے۔

حکومت نے کپڑے کی برآمدات کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ ان اقدامات میں نرم شرح تبادلہ کے نظام کی شروعات، لائسنس کے بغیر کپڑے اور ملبوسات کی نئی مشینری کی درآمد کے لیے سہولت مہیا کرنا، مالیت پر مبنی پیشگی لائسنس کی خصوصی اسکیم کی شروعات وغیرہ شامل ہیں۔ غیر کوٹے والی برآمدات اور بجلی کرگھے کی مصنوعات کی برآمدات کو فروغ دینے کی غرض سے دو نئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔

ہاتھ سے بنے ہوئے قالینوں سمیت بھارت سے دستکاریوں کی برآمدات کی مالیت اپریل ۱۹۹۲ء سے جنوری ۱۹۹۳ء کے دوران ۱۹۴۳،۶۵ کروڑ روپے رہی ہے، جس میں ۹۲-۱۹۹۱ء کی اسی مدت کے مقابلے میں ۲۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ توقع ہے کہ سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں برآمدات کی کل مالیت ۲۴۰۰ کروڑ روپے رہے گی۔ یہ اضافہ ۹۲-۱۹۹۱ء کے مقابلے میں تقریباً ۲۳ فی صد ہوگا۔ پٹ سن کی مصنوعات کو گوناگوں بنانا ایک اور نیا شعبہ ہے، جس پر حکومت توجہ مرکوز کر رہی ہے۔ یہ قدم پٹ سن کی برآمدات کو فروغ دینے اور پٹ سن کی زوال پذیر منڈی کی مدد کرنے کی غرض سے اٹھایا گیا ہے۔

گھریلو سروے کے مطابق کپڑے کی فی کس کھپت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ کھپت اس وقت اندازاً ۱۴،۸۰ میٹر ہے۔ غیر سوتی کپڑے کے حصے میں معمولی سا اضافہ ہوا ہے جب کہ آمیزش والے کپڑے کے حصے میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے، جو نویں دہے کے دوران ۱۵ فی صد سے بڑھ کر ۲۰ فی صد ہو گیا ہے۔

۹۳-۱۹۹۲ء میں اسپن سوتی دھاگے، آمیزش والے اور سو فی صد غیر سوتی دھاگے کی کل تیاری کا تخمینہ ۱۸۲۰۰ لاکھ کلوگرام لگایا گیا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران کپڑے کی کل تیاری کا تخمینہ ۲۳۱۴۰۰ لاکھ مربع میٹر لگایا گیا ہے، جبکہ ۹۲-۱۹۹۱ء میں یہ تیاری ۲۲۵۸۰۰ لاکھ مربع میٹر تھی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران کپڑے کی کل تیاری میں بجلی کرگھے کے شعبے کا حصہ ۱۶۶۳۰۰ لاکھ مربع میٹر، ہتھ کرگھے کے شعبے کا حصہ ۴۲۵۵۰ لاکھ مربع میٹر اور مل کے شعبے کا حصہ ۲۲۵۵۰ لاکھ مربع میٹر ہے۔ یہ بات

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

محمد رضی الدین معظم

ناریل کی کاشت : ایک تعارف

ناریل کا درخت انسان کے لیے نہایت مفید لذیذ ارزاں صحت بخش عطیہ ہے۔ پتوں سے لے کر تنے تک اس کا ہر حصہ کسی نہ کسی کام میں آتا ہے۔ ممتاز سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں رقم طراز ہیں "میں نے بنگال کے علاقہ میں ایک ایسا پھل دیکھا ہے جس میں دو روٹی اور ایک گلاس پانی ہوتا ہے"۔ پکے ہوئے ناریل کے اگر دو حصے کردئے جائیں تو اس میں سے ایک گلاس پانی برآمد ہوتا ہے اور دونوں حصے روٹی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کثیر الفوائد درخت کے کئی گھریلو اور تکنیکی مصرف بھی ہیں۔ اس سے خوش ذائقہ مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں اگر تازہ ناریل کھرچ کر اس کا عرق نچوڑ لیا جائے اور جھینگے یا مچھلی میں پکایا جائے تو اس کا ذائقہ نہایت لذیذ اور سوندھا ہوجاتا ہے۔ اس قسم کا سالن بنگال میں مخصوص مواقع پر ضرور اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچا ناریل (کچا کھوپرا) مفرح القلب یعنی دل کو راحت و سکون بخشتا ہے۔ پیٹ کے کئی امراض میں اکسیر ہے، خاص طور پر بچوں کے پیٹ کرم ہوجاتی ہے انھیں کچا کھوپرا کھلائیں تو تمام کرم نکل جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب چیچک Small Pox کا خاتمہ ہوگیا ہے ورنہ اس بیماری میں اس کا پانی نے دنعمٔ اکسیر تھا۔ اس کے پتوں کے تنکوں سے جھاڑو بنتی ہے جس کو عرف عام میں ناریل کی جھاڑو کہا جاتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ جھاڑو کئی کے عوض برآمد ہوتی ہے۔ جب نکالا جاتا ہے تو بالوں کی افزا مفید ہے۔ اس سے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ اگر خود ناریل سے تیل کریں ورنہ ملاوٹ کے باعث خطرہ رہتا ہے تاجر لوگ بعض اپنی تجارت کی خاطر فرسودہ تیل خوبصورت پیکنگ میں فروخت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ بطور غذا کے بھی اس کا تیل استعمال ہوتا ہے اس کے لیے بھی تازہ ناریل بہتر ہے کھوپرا سالن میں مختلف مسالوں میں سے ایک اہم ترین تیزہ ہے مثلاً "کھارے بیگن" ماہی خلیہ قورمہ، بریانی وغیرہ ناریل کے چھلکے کو خشک کرکے اس سے ریشہ نکالا جاتا ہے جس سے رسیاں بنتی ہیں۔ خام (کچی) حالت میں یہ چھلکا بطور پیالہ، گدّے، صوفوں تکیوں کشتوں گاڑیوں میں استعمال ہونے والے سیٹوں میں بکثرت استعمال ہوتا ہے اس قسم کے گدّے کم لاگت اور بے ضرر ہوتے ہیں۔ ناریل کے درخت کا تنا لکڑی کے شہتیر کا کام دیتا ہے اور دیہاتوں اور قصبات میں جھونپڑیاں اور مکانات کی تعمیر میں کثرت استعمال کیا جاتا ہے جو ہر موسم میں آرام دہ رہتا ہے۔

... جغرافیائی لحاظ سے دیکھیں تو دنیا کے مختلف علاقوں میں کاشت کے اعتبار سے ناریل کے درخت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ تیل فراہم کرنے والا درخت ہے۔ ۹۰ سے زائد ممالک میں ناریل کی کاشت ہوتی ہے اور معاشی اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے اہم ترین درختوں میں ہوتا ہے چند گنے چنے درختوں میں ناریل کا درخت ہی ایک ایسا درخت ہے جس کی اوّل تا آخر کوئی چیز بے کار نہیں جاتی بلکہ ارزاں بھی ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے گرم آب و ہوا کاشت کے لیے درکار ہے جس میں بہت زیادہ تغیر نہ ہو ایسے علاقے جن کا اوسط

"محافظ الخاشعین" ۸۶۶۔ رحیم منزل شاہ گنج، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲۔

یوجنا، نئی دہلی

سالانہ درجۂ حرارت ۲۲ درجہ سنٹی گریڈ یا اس سے زائد ہو وہاں ناریل کا درخت خوب پھلتا پھولتا ہے ہاں درجۂ حرارت گر جائے تو صرف نشو ونما متاثر ہوتی ہے جب کہ زیادہ درجۂ حرارت رہے تو نقصان صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ ہوا میں نمی یا رطوبت کا تناسب بھی کم ہو جائے۔ عموماً اس کی کاشت ۱۳۰۰ تا ۲۳۰۰ ملی لیٹر سالانہ بارش میں نہایت بہتر ہوتی ہے لیکن کئی علاقے ایسے ہیں جہاں بارش کا اوسط سالانہ ۵۰ انچ سے کم ہے یعنی ۱۳۰۰ ملی لیٹر سے کم ہے وہاں بھی اس کی کاشت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ناریل کا درخت مختلف قسم کی مٹی میں اُگ سکتا ہے لیکن زرخیز مٹی مناسب ہوتی ہے۔ اس درخت کے لیے ہوادار اور پانی کی نکاسی کی صلاحیت رکھنے والی زمین موزوں ہوتی ہے۔ ناریل کا درخت ریتیلی زمین میں زیادہ مفید رہتا ہے۔ ٹھہرا ہوا پانی اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں ضروری ہیں جنھیں ہر وقت صحیح حالت میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ پانی ٹھہرنے نہ پائے بلکہ بہہ جائے۔ اس طرح پودے کی جڑیں محفوظ رہتی ہیں۔ ناریل کی جڑیں کم سے کم سات فٹ گہرائی تک جا سکتی ہیں۔ پانی کی سطح تین فٹ سے نیچے ہو تو بہتر ہے۔ باغات میں لگانے کے لیے ناریل کے پودے کو تین فٹ لمبے، تین فٹ چوڑے اور تین فٹ گہرے گڑھے میں رکھا جاتا ہے۔ گڑھوں کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ وسیع پیمانے پر ناریل کی کاشت کے لیے فی ہیکٹیر (۱۵۴) پودے لگائے جاتے ہیں جو مربع طریق میں ۲۶ فٹ کے فاصلے سے اور مستطیل طریق میں ۲۸ فٹ اور ۲۴ فٹ پر ہوتے ہیں۔ ناریل کے پودے کے گڑھے میں ۲ حصے اچھی مٹی اور ایک حصہ کھیت کے گوبر کی کھاد دی جاتی ہے۔ ملی جلی کھاد کو کھیت کے فضلے کی کھاد کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گڑھے کو سطحِ زمین سے تقریباً ۲۲ سنٹی میٹر یعنی ۹ انچ تک کی مٹی اور کھاد کے آمیزے سے بھر دیتے ہیں۔ نو عمر پودوں کو گڑھوں کے درمیان میں اس طرح لگاتے ہیں کہ پورا کا پورا ناریل مٹی میں دب جائے۔ شجرکاری مانسون یا پھر موسم بہار میں بہتر ہوتی ہے۔

ناریل کے پودوں کی دیکھ بھال کے لیے ابتدائی دو سال نہایت امتحانی ہوتے ہیں۔ نئے لگائے گئے پودوں کو ابتدائی تین ماہ تک ہفتہ میں کم از کم تین بار پانی دیتے رہیں۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو بار پانی دینا کافی ہو جاتا ہے جب پودا ایک سال کا ہو جائے تو ہفتہ میں صرف ایک بار پانی کافی ہو جاتا ہے۔ ہر پودے کے گرد ۴ فٹ قطر کی جگہ تمام خودرو پودوں سے صاف رکھیں ورنہ ناریل کے پودے کی بڑھوتری میں اثر پڑے گا۔ نلائی اور گڑائی کا کام سال میں تین چار مرتبہ ضرور کریں۔ حشرات الارض کیڑے مکوڑے، دیمک، مویشی اس پودے کے بدترین دشمن ہیں۔ پودوں کو مویشیوں سے بچانے کے لیے ان کے گرد خاردار تار یا لکڑی کا جنگلا لگایا جاتا ہے اور دواؤں کے ذریعہ دیمک اور دیگر کیڑے مکوڑوں کا سدّباب ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نوعمر اور نوجوان پودوں کا وقتاً فوقتاً معائنہ کیا جاتا ہے۔ پودوں کو ہر چھ ماہ بعد کھاد دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ناریل کا درخت پھل دینے لگے تو اس وقت بھی تھوڑی سی دیکھ بھال ضروری ہے۔ نائٹروجن کھاد کی فراہمی اچھا اثر ڈالتی ہے۔ پوٹاشیم کا اثر نہ صرف پیداوار میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بلکہ درخت تادیر بار آور رہتا ہے۔ ناریل کے درخت میں منجملہ کئی خوبیوں کے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ناریل کے فروخت کے لیے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں بلکہ خریدار درخت دیکھ کر خود آپ کے گھر آتا ہے۔ اور فصل کا سودا بلا تامل کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کام خواتین کے لیے بھی نہایت موزوں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دفعہ نرسری سے جاکر اچھے اچھے پودوں کا انتخاب کریں اور چار پانچ سال گھر میں رہ کر ان کی ضروری دیکھ بھال کریں تو گھر بیٹھے ہر درخت سے سال میں اوسطاً آٹھ تا دس ہزار روپے کی آمدنی لازمی رہتی ہے۔ یہ خالص آمدنی یا منافع ہے اس میں اخراجات شامل نہیں رہتے ہیں جو برائے نام ہوتے ہیں۔ ●

ڈاکٹر نیلا مکرجی

دیہی زندگی میں خواتین کا کردار

زیرِ نظر مضمون میں تجربے اور مطالعہ کی بنیاد پر دیہی زندگی میں مردوں اور خواتین کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تجزیہ کا اصل موضوع دیہی عورتوں اور مردوں کے تصور کا فرق ہے جس سے دیہی مسائل کو سمجھنے میں بھی مختلف نظریات کا اظہار ہوتا ہے۔

دیہی خواتین کے تصور کی اہمیت کو جتنا بھی بیان کیا جائے کم ہے۔ سماج میں ان کا کردار ان کے مسائل پر ترجیحات اور صلاحیتیں اگر اچھی طرح سمجھ لی جائیں تو گذشتہ دہوں کے مقابلے میں دیہی ترقی کی جنس پر مبنی حکمتِ عملی زیادہ مضبوط اور تعمیری بنیادوں پر قائم ہوسکتی ہے۔ گاؤں کی عورت بہ حیثیت ماں دیہی گھرانے کی شریک کار کی حیثیت سے اور دیہی معاشرے کے رکن کی حیثیت سے اور پھر مجموعی طور پر قوم کے رکن کی حیثیت سے ایسے ایسے کام انجام دیتی ہے جو نہ صرف بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بلکہ مشکل بھی ہوتے ہیں جن پر بہ ظاہر نظر نہیں پڑتی اور اقتصادی اعتبار سے اہم معلوم نہیں ہوتے۔ تھوڑے سے باہری سہارے سے اگر دیہی خواتین کے مرتبہ کو مستحکم کیا جائے تو اس کی صلاحیتیں اور کارکردگی بھی بہتر ہوگی جس کی جھلک خاص طور سے دیہی زندگی میں اور مجموعی طور پر قوم کی ترقی میں نظر آئے گی۔

گاؤں کی عورت کا تصور، مردوں سے مختلف کیوں ہے؟ اس کی بعض وجوہات حسبِ ذیل ہیں۔

دیہی خواتین کی پرورش
اور رسم و رواج مردوں کے مقا
ایک مختلف اندازِ نظر فراہم کر
خواتین کی کام کی نوعیت اور تجربہ ...
کے مقابلے میں ان کے تصور پر کافی حد تک اثرانداز ہوسکتا ہے۔ معاشرے میں ان کا کردار مختلف ہے۔ لہٰذا مردوں کے مقابلے میں ان کے مسائل اور ترجیحات بھی مختلف ہیں۔ براہِ راست شرکت کے ذریعے ان کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت ان کے مسائل ترجیحات نیز ان مسائل کو حل کرنے کے طور طریقوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

دیہی زندگی کے مختلف شعبوں میں جنس کے پہلوؤں کو عورتوں اور مردوں کی شرکت کے ذریعے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ شرکت جس کی نوعیت رضاکارانہ نوعیت کی ہوتی ہے اس کا تعلق اپنے خیالات و افکار کے اظہار اپنی معلومات اور عقائد اپنی ترجیحات اور پسند ان کے مسائل اور ان کو حل کرنے کے طریقے سے ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ ایسا خود کریں یا دوسروں کے ساتھ کریں۔ اعتماد اور دوستی کی بنیاد پر گاؤں و ... ں سے تبادلہ خیال انھیں آزادی اور ...

... کاج میں، اور کھیت کے کام میں مشغول ہوتی ہیں اور انہیں شرکت کا کافی وقت نہیں مل پاتا۔ بعض خواتین دوسری وجوہات سے مثلاً اعتماد کی کمی، کنبے کے دباؤ رسم و رواج وغیرہ کی بنا پر پس و پیش کرتی ہیں جب کہ کچھ دوسری خواتین اظہارِ خیال کا حوصلہ پیدا کرنے میں زیادہ وقت لیتی ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مردوں کی بالادستی کی وجہ سے ان کی آواز دب کر رہ جاتی ہے اس طرح وہ اپنے خیالات پیش کرنے میں خود کو زیادہ پُراعتماد نہیں سمجھ پاتی۔

اوپر بیان کی گئی وجوہ کی بنا پر فوری طور پر خواتین کی دیہی سرگرمیوں میں بڑے پیمانے پر شمولیت کی اُمید کرنا آسان نہیں۔ گاؤں کی

عورتوں کے ساتھ ملنے جلنے اور بات کرنے میں حائل دشواریوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ انھیں نظرانداز کردیا جائے یہ راستہ آسان ضرور ہے لیکن دیہی تصور کو سمجھنے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملے گی ۔ اقتصادی سرگرمیوں میں گاؤں والوں کی شرکت کے خواہش مند لوگوں کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ وہ دیہی خواتین اور مرد دونوں سے ہی رابطہ قائم کریں تاکہ شرکت میں ان کی دلچسپی پیدا کی جاسکے ۔ کارکنوں کی ایک ایسی جماعت جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں زیادہ بہتر ثابت ہوگی۔

موثر شرکت کے لیے زبانی اور تصاویر کے طریقے اہم ہیں۔ گاؤں والوں سے زبانی بات چیت کے لیے پہلے سے تیار کیے گئے کچھ سوالات کا سہارا لیا جا سکتا ہے اور کچھ سوال موقع کی مناسبت دیکھتے ہوئے کیے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے انٹرویو گاؤں والوں کو جاننے اور ان کا تعاون حاصل کرنے میں مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ خود گاؤں والوں کے اپنے حالات بیان کرنے سے بھی ان کے مسائل اور پس منظر کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ تصاویر اور فلم وغیرہ کا طریقہ بھی گاؤں والوں کے خیالات و نظریات، پسند ناپسند اور ترجیحات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر گاؤں کے ایک نقشہ پر انفرادی یا گروپ کی شکل میں بحث و مباحثہ کیا جا سکتا ہے جو اس طرح کے تبادلۂ خیال کی ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے اس طریقے سے معیار، ترجیحات، پروگرام اور فیصلہ وغیرہ کرنے کی صلاحیت کا بخوبی علم ہو سکتا ہے جو بہ صورت دیگر سامنے ہی نہیں آتے۔

نیچے مہاراشٹر کے تھانے ضلع کے ایک قبائلی گاؤں زاہادگھر کی مثال دی جارہی ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مرد اور خواتین مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ یہ گاؤں ۴۸ ہزار افراد پر مشتمل ہے جن میں سے بیشتر بہت چھوٹے اور معمولی کاشت کار اور بے زمین مزدور ہیں۔ گاؤں کو دو گروپوں میں منقسم کردیا گیا ہے۔ ہر گروپ میں ۱۲ سے ۱۵ تک افرادوں پر مشتمل ایک گروپ مردوں کا اور دوسرا خواتین کا' ان سے کہا گیا کہ وہ گاؤں کا ایک نقشہ تیار کریں جس میں مختلف گھر، سڑکیں، پانی سے متعلق ادارے اور دوسرا ڈھانچہ دکھایا گیا ہو۔ مردوں کے گروپ نے رنگین چاکوں سے نقشہ بنانا شروع کیا لیکن خواتین کا گروپ اتنا تیز نہیں تھا۔ شروع میں تو اس گروپ نے پس و پیش سے کام لیا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے زمین پر گاؤں کا نقشہ بنانا شروع کیا۔

تقریباً ۹۰ منٹ کے بعد مردوں اور خواتین نے زاہادگھر گاؤں کا زمین پر ایک ایک نقشہ بنادیا تھا۔ ان نقشوں میں پانی کے وسائل، سڑکیں اور گھر وغیرہ دکھائے گئے تھے، ہر گھر کے افراد کی تعداد (بالغ + بچے) اس کے نیچے لکھ دی گئی تھی۔ یہ نقشے کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتے تھے اس کے باوجود یہ کئی اعتبار سے مختلف تھے۔ ان میں سب سے اہم فرق تو یہ تھا کہ مردوں کے نقشے میں فٹ پاتھ ہی نہیں دکھائی گئی جبکہ خواتین کے نقشے میں یہ بہت واضح تھی مردوں کے نقشے میں گاؤں کی سڑکوں کو بہت واضح طور پر دکھایا گیا تھا۔ فٹ پاتھ کو دیہی خواتین، لکڑی، چارہ اور پانی لانے کے لیے روزانہ استعمال کرتی ہیں۔ اگرچہ مرد ان سے فٹ پاتھ سے واقف ضرور تھے لیکن انھوں نے انھیں اتنا ضروری نہیں سمجھا جتنا خواتین نے سمجھا۔ ظاہر ہے کہ ان خواتین کے لیے فٹ پاتھ کی کس قدر اہمیت ہے اس لیے انھوں نے انھیں نمایاں طور پر پیش کیا۔

مردوں اور خواتین سے نقشے کی تیاری کے بعد کہا گیا کہ وہ اب ایسے گھروں کی نشاندہی کریں جن کی حالت سماجی و اقتصادی اعتبار سے سب سے زیادہ خراب ہو۔ خواتین کے گروپ نے گاؤں کی دو بیواؤں کے گھروں کی نشاندہی کی۔ ان میں سے ایک بیوہ ایک آنکھ سے نابینا تھی اور دوسری بھیڑ بکریوں کی پرورش اور ان کی فروخت پر گذر بسر کرتی تھی۔ خواتین کے گروپ کے مطابق ان دونوں گھروں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔

دوسری طرف مردوں کے گروپ نے مردوں کی سربراہی والے دو گھروں کی نشاندہی کرکے یہ بتانے کی کوشش کی کہ گاؤں میں سب سے زیادہ خراب حالت ان دو گھرانوں کی ہی ہے۔ ان میں سے ایک گھر میں ۵ بالغ اور ۳ بچے تھے لیکن ان کے پاس آراضی نہیں تھی بیشتر اوقات یہ لوگ بے روزگار رہتے تھے۔ اور نہ ہی گاؤں کی ٹوکری بنانے کی روایتی دست کاری سے واقف تھے۔ جس دوسرے گھر کی مرد گروپ نے نشاندہی کی اس کے پاس ایک سرکاری پروگرام کے تحت جھگی تھی لیکن زمین نہیں تھی۔ ان کے کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔

مرد اور خواتین کے ان دونوں گروپوں سے مزید گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں گروپ سماجی، اقتصادی حالت کے سلسلے میں کس حد تک مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ مردوں کے گروپ کے مطابق روزگار کے مواقع اور زمین کی ملکیت خوشحالی کا ثبوت ہے۔ جب مردوں کے اس گروپ سے خواتین کی طرف سے نشاندہی کردہ دو بیواؤں کے

گھروں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ان دونوں بیواؤں کے پاس کچھ نہ کچھ زمین ہے۔ ایک آنکھ سے نابینا بیوہ کے پاس تھوڑی سی زرعی زمین ہے جو اس نے کچھ اور افراد کو کھیتی باڑی کے لیے دے رکھی ہے۔ دوسری بیوہ عورت کے پاس بھی کچھ جنگلاتی زمین ہے جس پر اس نے پہلے ناجائز طور پر قبضہ کیا تھا۔ لہٰذا مردوں کے اس گروپ کے مطابق خواتین کے گروپ نے گاؤں کے خستہ ترین جن گھروں کی نشاندہی کی تھی وہ بہتر حالت میں ہیں۔

خواتین کے گروپ کے مطابق فلاح و بہبود کے لیے زمین کی ملکیت اور روزگار کے مواقعوں کے مقابلے میں سماجی مرتبہ اور جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر ان خواتین نے دو بیواؤں کے گھروں کی نشاندہی کی تھی۔ گاؤں کی خواتین کی رائے میں یہ دونوں پیدائشی معذور، بیوگی اور بیوگی کی وجہ سے ہی سماجی اور اقتصادی اعتبار سے کوئی مرتبہ حاصل نہیں کر سکی ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین معاشرے کو کس قدر اہمیت دیتی ہیں۔ جب کہ مردوں کا گروپ سماجی مرتبے اور حیثیت کے مقابلے میں اقتصادی عوامل کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مذکورہ بالا جائزے سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک ہی گاؤں کے مرد اور خواتین فلاح و بہبود کے لیے الگ الگ پیمانے رکھتے ہیں۔ دیہی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی غرض سے مردوں اور خواتین کی رائے جاننے کے لیے گفتگو اور تصاویر والے دونوں ہی طریقے اپنائے گئے۔ گاؤں والوں کے ساتھ گفتگو کرنے کی بدولت ان سے براہِ راست رابطہ قائم ہو سکا ہے اور ان سے کھل کر اور بڑی بے فکری کے ساتھ تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ ان کے گاؤں، روایتی دستکاری اور دوسری روزانہ کی مشغولیت وغیرہ سے متعلق سوال کرنے سے گاؤں والوں میں دیہی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے دلچسپی پیدا کرنے میں کافی مدد ملی۔

نقشہ سازی وغیرہ سے گاؤں اور وہاں کے رہنے والوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی پر مردوں اور خواتین کی مختلف آراء کا بھی علم ہو سکا۔ اگر یہ نقشے نہیں بنوائے جاتے تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ مرد سڑکوں اور خواتین ہینڈ پائپ کو کس قدر اہم تصور کرتی ہیں۔ ان ہی نقشوں کی بدولت یہ بھی معلوم ہو سکا کہ خواتین اور مرد سماجی و اقتصادی مرتبے کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں۔ دونوں گروپوں کے نظریات کا نہ صرف نقشوں کے ذریعے بلکہ بات چیت سے بھی بہتر طور پر علم ہو سکا اور اُ ...

اختتامی کلمات

ملک ... میں ...
کیا جارہا ہے وہ سطحی اور ... ہے۔ اس پروگرام میں جو ترجیحات اور ضوابط رکھے جاتے ہیں اُن میں وقت، جنس، درجے اور عمر وغیرہ کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور ایک عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ انھیں نظرانداز نہیں کیا جانا بلکہ وقتاً فوقتاً انھیں بھی اہمیت دی جاتی ہے جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ بعض منتخب گروپوں، جیسے ضعیف العمر افراد یا خواتین کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے جائیں اور اس طرح کے پروگراموں کو خامیوں اور پیچیدگیوں سے دور کیا جائے۔ تاہم تجربے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان پروگراموں کے متوقع نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ مختلف مقامات کے مختلف جغرافیائی حالات، ماحول اور اس طرح کی دیگر پیچیدگیاں ہیں۔

بنیادی سطح پر کام کرنے والے ترقیاتی کارکنوں کے تجربے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت، عمر، جگہ اور مردوں و خواتین کے مختلف نظریات کسی بھی پروگرام کو کامیاب یا ناکام بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان نظریات اور عوامل و اثرات کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب یہ لوگ بنیادی سطح پر ان پروگراموں میں سرگرم حصہ لیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ دیہی ترقیات کے پروگراموں کو مقامی مسائل اور ضروریات کو مدنظر رکھ کر بنایا جائے اور عوام کے سرگرم اشتراک و شمولیت سے دیہی ترقی کا ایک ٹھوس اور مثالی عمل شروع کیا جائے ●

بقیہ ... صفحہ ...

ریڈیو میٹر، ایک اعداد و شمار کا ریلے ٹرانسپونڈر پیر ایک تحقیق اور بچاؤ کا پے لوڈ ہے۔ تمام پے لوڈس کی سلسلے وار زبردست جانچ کی گئی ہے۔ خلائی طیارہ ۱۵ اگست ۱۹۹۳ء سے باقاعدہ کام کرنے لگا ہے۔

انسیٹ ۲۔ بی زیادہ طویل مدت کے ٹیلی مواصلات کاروباری نیٹ ورک، دور دراز کے علاقوں میں مواصلات، ٹیلی کانفرنس، قومی اور علاقائی ٹی۔وی نیٹ ورک، سیٹلائٹ ٹی وی چینل، پیغام بھیجنے اور اعداد و شمار کے نظام کی صلاحیت میں اضافہ کرے گا۔ تحقیق اور بچاؤ پے لوڈ جو کہ انسیٹ ۲۔ بی میں ایک نئی خوبی کے طور پر جوڑی گئی ہے بھارت کے آس پاس کے بڑے علاقے پر آنے والی آفات کا یہ فوراً پتہ لگائے گا تاکہ حفاظتی اقدامات کیے جا سکیں ●

ڈاکٹر اشوک کمار سنگھ

صارفین میں بیداری کی تحریک

عمدہ کوالٹی کی چیز کیسے خریدیں؟

بھارت قدرتی دولت سے مالا مال ملک ہے معدنیات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ یہاں معتدل گرم آب و ہوا میں اگائی جانے والی بہت سی فصلوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں بہت سی قسموں کا اناج، دالیں، تیل نکالنے کے بیج، پھل، سبزیاں، مسالے اور صنعتی خام مال پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سی چیزوں کی اندرون ملک اور دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت ہوتی ہے۔ بھارت کی برآمدات میں زرعی اور زراعت پر مبنی اشیاء کا نمایاں حصہ ہے۔

مینو فیکچرڈ مصنوعات کے برعکس زرعی پیداوار زمین اور آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے مختلف قسموں کی ہوتی ہے اور ان کی کوالٹی بھی مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا مسلمہ معیاروں کی بنیاد پر زرعی پیداوار کی درجہ بندی ضروری گردانی گئی جس سے کاشت کاروں، مقامی تاجروں اور برآمد کاروں کو ان اشیاء کی تجارت میں بہت مدد ملتی ہے۔ درجہ بندی کی وجہ سے چیز کی کوالٹی کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ درجہ بند مال آسانی سے منڈیوں میں پہنچ سکتا ہے۔ اور ناقص بخش یا غیر معمولی معیاری مال کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے

مصنف ڈی۔ڈی کالج بلبیا میں سینیئر لیکچرار ہیں۔

درجہ بندی

ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن کا ایک بڑا کام اشیاء کی درجہ بندی اور معیار سازی ہے۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر "ایگ مارک" کا نشان کافی مقبول ہو چکا ہے۔ کیوں کہ یہ زرعی اشیاء کی کوالٹی اور ان کے خالص ہونے کی ضمانت ہے۔ زرعی اشیاء کی درجہ بندی تین مقاصد سے کی جاتی ہے اول تو اس لیے کہ یہ کاشت کار یا تیار کنندہ کو استحصال سے بچاتی ہے کیونکہ جب اسے اپنے مال کی کوالٹی اور گریڈ معلوم ہو جاتا ہے تو وہ اس کا بہتر سودا کر سکتا ہے اور اس کے ٹھگے جانے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ درجہ بندی کی وجہ سے خریدار اور فروخت کنندگان ملک بھر میں اطمینان کے ساتھ درجہ بند اشیاء خرید اور بیچ سکتے ہیں۔ کیوں کہ کوالٹی کا پتہ لگانے کے لیے انھیں کسی طرح کی تردد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تیسرے یہ کہ درجہ بندی سے صارف کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ صارف اپنی پسند کی کوالٹی کی چیز درجہ بندی کا نشان دیکھ کر خرید سکتا ہے۔ اور دوکاندار اسے گھٹیا چیز خریدنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ کوالٹی کے تسلیم شدہ معیاروں کی وجہ سے درجہ بند اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنے کا کام بھی زیادہ درست طریقہ سے کیا جا سکتا ہے اور ان قیمتوں میں ہیر پھیر ممکن نہیں ہوتا۔

زرعی پیداوار کی گریڈنگ اور مارکیٹنگ کے قانون مجریہ ۱۹۳۰ء میں ۱۹۸۸ء میں کی گئی ترمیمات سے مرکزی حکومت کو زرعی اور مویشیوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کے لیے درجہ بندی کے معیار مقرر کرنے، کوالٹی کی تشریح، اشیاء پر کوالٹی کا نشان لگانے اور انھیں پیک اور درجہ بند کرنے اور اشیاء کی درجہ بندی کا کام کرنے کی اجازت کے لیے شرائط کے تعین کے بارے میں قواعد وضع کرنے کا آئینی اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ مقررہ تصریحات کو "ایگ مارک" معیار کہا جاتا ہے۔ لفظ "ایگ مارک" مخفف ہے زرعی مارکیٹنگ کا، چیز کی کوالٹی اور اس کے خالص ہونے کی ضمانت ہے۔ یہ نشان ملک کے اندر اور ملک سے باہر عمدہ کوالٹی کی چیزیں خریدنے والوں میں کافی مقبول ہو چکا ہے۔ اس قانون کی دفعات کے تحت ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن نے ملک زرعی اشیاء کی تجارت کے لیے گریڈ یا درجوں کے معیار مقرر کر دیے ہیں۔ اس وقت تک ۱۴۲ زرعی یا زراعت

پر مبنی اشیاء کے گریڈ اسٹینڈرڈ مرتب کیے جا چکے ہیں۔ سال ۹۲ - ۱۹۹۱ء کے دوران آسام اور سنتوگا کی ادرک، الیپی کی ہلدی، بلبوں، سورج مکھی کے تیل، سویا بین کے تیل، سرسوں کے ریفائنڈ تیل، جموں کے باسمتی چاول، سویا بین کے بیجوں، کوکوآ کی پھلیوں، کوکوآ کے سفوف اور پسے ہوئے مصالحوں کے معیار مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ ۱۸، اہم اشیاء کے معیاروں پر نظرثانی کی گئی۔

اندرونی تجارت کے لیے درجہ بندی

اندرونی تجارت کے لیے زرعی اشیاء کی درجہ بندی رضاکارانہ ہے اور یہ زرعی پیداوار کی درجہ بندی اور مارکیٹنگ سے متعلق قانون ۱۹۳۷ء کے تحت فروخت کنندگان کی درخواست پر کی جاتی ہے۔ اندرونِ ملک تجارت کے لیے "ایگ مارک" کے تحت اشیاء درجہ بندی دو گروپوں میں کی جاتی ہے۔ ایک گروپ مرکزی درجہ بندی کا ہے اور دوسرا غیر مرکزی درجہ بندی کا۔

(۱) مرکزی درجہ بندی۔

مرکزی درجہ بندی کے زمرے میں گھی، مکھن، بناسپتی تیل، تیل نکالنے کے بیج، پسے ہوئے مصالحہ جات، شہد وغیرہ کو رکھا گیا ہے کیوں کہ ان کی جانچ اور آزمائش زیادہ باریکی سے کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ان اشیاء کی درجہ بندی مرکزی سطح پر ڈائرکٹوریٹ آف انسپکشن اینڈ مارکیٹنگ خود کرتا ہے۔

(۲) غیر مرکزی درجہ بندی

اس زمرے میں گیہوں کا آٹا، چاول، دالیں وغیرہ آتی ہیں جن کی جانچ نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں کی درجہ بندی ریاستی سرکاروں کے مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن کی براہِ راست نگرانی میں کرتے ہیں۔

سال ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران ۳۳۸۱ کروڑ روپے کی مالیت کی اشیاء کی درجہ بندی اندرونِ ملک تجارت کے لیے کی گئی۔

تاجر کی سطح پر "ایگ مارک" کے تحت اشیاء کی درجہ بندی خاص کر صارفین کی رہنمائی کے لیے کی جاتی ہے۔ اس سے کاشت کاروں کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لیے ۶۴-۱۹۶۳ء میں کاشت کار کو کافی فائدہ دلانے کی غرض سے کاشت کاروں کی سطح پر اجناس کی درجہ بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہ سلسلہ ریاستی محکمہ جاتِ مارکیٹنگ کی وساطت سے شروع کیا گیا۔ اس کا منشا یہ ہے کہ پیداوار کے برائے فروخت پیش کیے جانے سے پہلے اس کی کوالٹی کی جانچ کی جائے
کیوں کہ بازار میں کسی چیز کی قـ
کوالٹی کے لحاظ سے ہی کم
فروخت سے قبل اس قسم کی
اپنی پیداوار کی قیمت اپنی
کے لحاظ سے حاصل کرنے تـ
لہٰذا ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں منضبط منڈیوں اور مارکیٹنگ کی کوآپریٹو سوسائیٹیوں میں اجناس کی درجہ بندی کی اکائیاں قائم کردی گئی ہیں۔ ایسی ۱۰۵۱ اکائیوں میں سے تقریباً پچاس اجناس کی قبل از فروخت درجہ بندی کی جاتی ہے۔

برآمدات کے لیے جانچ پڑتال

غیر ممالک کو اچھی کوالٹی کی زرعی اجناس کی برآمدات کو یقینی بنانے کے لیے ۱۹۴۲ء میں لازمی کوالٹی کنٹرول اور جہازوں پر لادے جانے سے قبل ان اجناس کے معائنے کا سلسلہ انڈین سی کسٹمز ایکٹ ۱۹۷۸ء کے تحت شروع کیا گیا۔

منصوبہ بندی کمیشن نے پہلے منصوبے میں اہم زرعی اجناس پر "ایگ مارک" کے تحت کوالٹی کنٹرول کا اہتمام کرنے کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں ایکسپورٹ (کوالٹی کنٹرول اینڈ انسپکشن) ایکٹ پاس کیا گیا اور دوسرے ملکوں کو برآمد کی جانے والی زرعی اجناس پر لازمی کوالٹی کنٹرول لاگو کرنے کے لیے ایکسپورٹ انسپکشن کونسل تشکیل دی گئی۔ اس وقت ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن ایکسپورٹ انسپکشن کونسل کی طرف سے برآمداتی معائنہ کی ایجنسی کے طور پر کام کر رہا ہے۔

رفتہ رفتہ اور زیادہ اشیاء کو برآمد سے قبل کوالٹی کنٹرول کے دائرے میں لے آیا گیا۔ اس وقت ایسی زرعی اجناس
کی درجہ بندی کی گئی۔

"ایگ مارک" کا نشان کوالٹی کا مظہر ہے اور درآمد کاروں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ "ایگ مارک" کے تحت اشیاء کی درجہ بندی کرتے وقت غیر ملکی خریداروں کی مانگ اور تقاضوں کا خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے مطابق گریڈ کے معیاروں پر نظرثانی کی جاتی ہے۔ "ایگ مارک" بھارت کے برآمد کاروں اور غیر ملکی درآمد کاروں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے اور تجارتی تعلقات کو بڑھاتا ہے اور خریدار کو زرعی اشیاء کی کوالٹی اور ان کے خالص ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ یہ نشان دیکھ کر خریدار گھٹیا مال سے بچ سکتے ہیں۔ ●

حکیم محمد جنید صدّیقی

خاندانی منصوبہ بندی ۔ یونانی اطباء کی نظر میں

آج آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، وہ پوری دنیا کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ آبادی میں اس متواتر اضافے سے جس طرح وسائل میں کمی اور مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے ہر ذی ہوش اچھی طرح واقف ہے۔ اقوام متحدہ کے مختلف تخمینوں کے مطابق اس وقت دُنیا کی آبادی پانچ ارب پچاس کروڑ ہے اور توقع ہے کہ یہ آبادی اس صدی کے اختتام تک چھ ارب اور ۲۰۵۰ء تک اس وقت کی آبادی کی دوگنا ہو جائے گی۔ آبادی میں یہ مسلسل اضافہ مسئلہ نہیں بلکہ مادرِ مسائل ہے۔ کیا غریبی ہٹاؤ کی بات آبادی پر کنٹرول نہ پانے کی صورت میں ممکن ہے۔ ہرگز نہیں! کیوں کہ افلاس و غربت اور آبادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے

اس بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہندوستان کے لیے اور بھی سنگین ہے کیوں کہ یہاں پر آبادی میں اضافہ کی شرح بہت زیادہ ہے نیز رقبہ کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کے رقبہ کا ۲ر۴ فی صد ہے، جب کہ آبادی ۱۶ فی صد ہے۔ آزادی کے وقت ہندوستان کی آبادی ۳۴ر۲۰ کروڑ تھی لیکن ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق، آبادی اب ۸۴ر۴۰ کروڑ ہوئی ہے۔ اس وقت بھی ہندوستان کی آبادی میں سالانہ اضافہ ۲٫۰۲ فی صد ہے، جو کہ بہت زیادہ ہے۔ اگر یہ شرح جاری رہی تو ۲۰۰۰ء تک ہندوستان کی آبادی ایک ارب تک پہنچنے کا امکان ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان نہ صرف یہ کہ دُنیا کا پہلا ملک ہے، جس نے ۵۲ - ۱۹۵۱ء میں خاندانی منصوبہ بندی کو قومی پروگرام کی حیثیت سے اختیار کیا تھا، بلکہ اس سے بہت پہلے ہی ہندوستان نے اس مسئلہ کی سنگین نوعیت کو پہچان لیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں مہاراجہ میسور نے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ایک بیت الہدایہ (کلینک) قائم کیا تھا اور اسی سلسلہ میں چالیس سال قبل (International Planned Parenthood Federation) قائم ہوئی تھی۔

آج اس ترقی یافتہ دور میں انتہائی آسان طریقوں کے رائج ہونے اور اس سے واقفیت ہونے نیز جدید ترین ٹکنالوجی کے فوائد کی آسانی سے دستیابی کے باوجود، ہندوستان میں ابھی تک صرف ۴۵ فی صد جوڑے ہی خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو اختیار کرتے ہیں، جب کہ ۵۵ فی صد اس سے غافل ہیں۔ ہمارا ملک گو کہ مختلف میدانوں میں ترقی کر رہا ہے، لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب بیشتر اثرات محسوس نہیں ہوتے اور متعدد مسائل، جیسے صحت بخش غذا کی کمی، عام صحت کے معیار میں گراوٹ، مناسب رہائش کے مسائل، ماحولیات کی خرابی اور دیگر سماجی مسائل میں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔

سر ایکیں کاسٹو کے مطابق 'ضبطِ تولید کا نظریہ غیر فطری نہیں ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ "جانوروں کو دیکھو جو قدرتی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اُن کی تعداد کبھی نہیں بڑھتی، کیوں کہ قدرت کا یہ سبق نہیں ہے کہ صحبت کیے جاؤ اور آبادی بڑھاتے جاؤ۔ قدرت نے تمام بڑی چھوٹی مخلوق کی مجامعت کے واسطے ایک خاص وقت مقرر کیا ہے۔ سوائے انسان کے، جو کہ قدرت کے قاعدے کی پابندی کرنے کے بجائے، زیادہ پر اصرار کرتا ہے اور آبادی کو بڑھانے میں مشغول ہے اور یہ پریشانی اس نے خود اپنے سر اپنی حماقت سے مول لے رکھی ہے۔

ضبطِ تولید کا مقصد فعلِ مجامعت جاری رکھتے ہوئے مناسب وقت تک استقرارِ حمل

پر قابو پانا ہے، تاکہ پیدا ہونے والی اولاد دماغی و جسمانی اعتبار سے تندرست اور صحیح سالم ہو۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اگر خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں پر عمل کیا جائے تو ملک کی معاشی اور سماجی مشکلات دور ہونگی اور ملک و قوم کی فلاح و اصلاح ہوگی، جس کی زندہ مثالیں یوروپ اور ایشیا کے چند ممالک بالخصوص فرانس ہے۔

ضبطِ تولید کا نظریہ نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ قدیم طبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اطبا قدیم نے ضبطِ تولید کے سلسلے میں مختلف مانع حمل جیبن کے سیکڑوں نسخے تجویز کئے ہیں۔ اور تدابیر بتائی ہیں اپنی برسوں کی تحقیقات اور تجربات کے بعد، ایسی دواؤں کی معلومات قلم بند کی ہیں، جو استعمال میں آسان اور بے ضرر ہیں۔ وقتی طور پر مانع حمل اثر کرنے والی ایسی تدابیر بھی تحریر کی ہیں، جو یا تو کرم منی (**Sperms**) کو ختم کر دیتی ہیں یا رحم تک اُن کی رسائی نہیں ہونے دیتیں۔

پہلی صدی عیسوی کے فاضل طبیب وسیقوریدس نے جڑی بوٹیوں سے متعلق اپنی کتاب "الحشائش" میں کم سے کم تنوا ایسی دواؤں کو قلم بند کیا ہے، جو کسی نہ کسی طرح ضبطِ تولید سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری صدی عیسوی میں سورانوس مشہور رومی طبیب گذرا ہے، اس کا خیال ہے کہ ان دنوں میں مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیئے جن میں حمل کے قرار پانے کا امکان بہت زیادہ ہو۔ بیشتر اطبا نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ مباشرت اُن ایام میں نہیں کرنی چاہیئے، جن کا انجام حمل ہو۔ نیز مباشرت سے پرہیز کیا جائے یا عزل کی عادت ڈالنی چاہیئے اور عورت کا مباشرت کے بعد سات سے نو بار پیروں پر پیچھے کی طرف اچھلنا بھی بطور مانع حمل مفید ہے۔

مانع حمل دواؤں کے بارے میں جالینوس، علی ابن عباس المجوسی، ابنِ سیطار، ابنِ سینا اور اسمٰعیل الجرجانی جیسے مشہور اطبا نے بہت کچھ لکھا ہے جس کو خلاصہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ :-

۱۔ روغن کنجد اور روغن بلسان، اگر مرد جماع سے قبل اپنے عضوء مخصوص پر لگائے تو استقرارِ حمل نہیں ہوتا۔ روغن بلسان عورت بطور فرزجہ بھی استعمال کر سکتی ہے۔

۲۔ عورت مباشرت کے بعد پھٹکری اور انار کا گودا بطور شافہ استعمال کرے۔ کاغذ سوختہ بھی بطور شافہ استعمال کرنا مفید ہے

۳۔ مرد اگر مباشرت سے قبل اپنے عضوء مخصوص پر قطران کی مالش کرے تو بھی بطور مانع حمل مفید ہے

۴۔ خوردنی طور پر بارروت [illegible] بھی استقرارِ حمل سے تحف [illegible]

۵۔ جماع کے بعد روغن م [illegible] سے بھی کرم منی ہلاک ہو جا [illegible]

۶۔ پیاز کو نچوڑ کر اس کے پانی کا طلاء کرنے پر بھی حمل نہیں ٹھہرتا۔

۷۔ حیض شروع ہونے پر ابتدا سے ایک ہفتہ تک ۳ گرام پسی ہوئی ہلدی نہار منہ کھائی جائے تو مانع حمل ہے۔

۸۔ تخم گزر (۱۰ گرام) یا پوست بیخ املتاس (۱۰ گرام)، کا جوشاندہ صبح ایک ہفتہ تک استعمال کیا جائے، تو یہ حمل سے حفاظت کرتا ہے۔

۹۔ ایلوا (½ گرام) سفوف صبح نہار منہ حیض کی ابتدا سے ایک ہفتہ تک استعمال کرنے پر مانع حمل کے طور پر کام انجام دیتا ہے۔

۱۰۔ ابتدائے حیض سے پانچ یوم تک فلفل سیاہ (ایک گرام)، فلفل دراز (ایک گرام)، سہاگہ بریان (ایک گرام) اور بابُڑنگ کا سفوف (ایک گرام) تازہ پانی کے ساتھ ۲ گرام استعمال کریں، تو حمل سے حفاظت رہتی ہے۔

کچھ دوائیں دوامی مانع حمل کے اثر بھی رکھتی ہیں، یعنی ان کے استعمال سے عورت میں بانجھ پن پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے اگر کالی زیری، تخم ہلیلہ کابلی، ناگ کیسر، کچور، کلونجی کا ستے چھیل ہم وزن لیں اور ہار تاک کوٹ پیس لیں۔ سادہ مدد گولیاں بنالیں اور صبح ہار منہ ایک گولی حیض کے پہلے دن سے سات دن تک استعمال کریں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں مانع حمل [illegible]

جھلکو یا کہا ہو کریم کا استعمال، یا جیلی کا استعمال، جو کہ مقامی طور پر استعمال کی جاتی ہیں، شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، اسٹرا یوٹیرائن ڈیوائسز (I.U.D.) بھی وقتی طور سے مانع حمل فعل انجام دیتی ہیں۔

خوردنی طور پر ہارمونس کی گولیاں، مالاڈی وغیرہ عارضی طور پر مانع حمل اثر رکھنے میں مشہور ہیں۔

مردوں میں کرم منی کی پیدائش کو روکنے یا اُن کی حرکت کو محدود کرنے کے لئے بھی خوردنی طور پر استعمال ہونے والی کچھ گولیاں مروج ہیں، جو بہت زیادہ موثر نہیں ہیں۔ نیز عزل، مباشرت سے پرہیز یا سیف پیریڈ (**Safe Period**) کا استعمال ہمیشہ سے ہی

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

بقیہ، آپ سب کے لیے

فراہم کرانے والے پروگراموں کے تحت لانا، مزدوری کرنے والے بچوں کی رسمی و غیر رسمی تعلیم، تعلیم بالغان کا انتظام ۔ کام کرنے والے بچوں کے والدین کے لیے ۔ کارکن بچوں کے والدین کے لیے، مزدور بچوں کے لیے خصوصی اسکولوں کا قیام جہاں تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت، امدادی غذائیت، صحت وغیرہ کا انتظام ہو، سماجی سرگرمیوں کے ذریعہ بیداری پیدا کرنا، بچہ مزدوری کے مسئلے کے ضمن میں مشرقی اترپردیش کی قالین بافی کی صنعت کے خطے میں عملی اقتصادی تحقیق کی قومی کونسل کے ذریعے مطالعے کا اہتمام، متعلقہ قوانین کے نفاذ کے لیے مشرقی یوپی کے تین اضلاع میں ہینڈلوم کمشنر کے ذریعے قالین بافی کے لوم کی محدود گنتی ۔

شری سوامی نے بتایا کہ حکومت قالین بافی کی صنعت میں ہنرمند افراد کی دستیابی کے لیے ایک جامع قالین بافی پروگرام چلایا جارہا ہے ۔ •

نیل گری کی حفاظت کے لیے پروگرام

ماحولیات و جنگلات کے وزیر مملکت شری کمل ناتھ نے بتایا کہ حکومت نے نیل گری پہاڑوں کو بچانے کے لیے متعدد اقدامات شروع کیے ہیں ۔ اس کے تحت نیل گری بایو حیاتیاتی ذخائر پروگرام بھی شامل ہے جو ۵۲۰۰ مربع کلومیٹر میں واقع ہے ۔ اس پروگرام کے تحت اب تک ۲۹۱٫۱۸ لاکھ روپے کی رقم نیل گری بایو حیاتیاتی ذخائر کے تحت جاری کی جاچکی ہے ۔ اس کے تحت عمل میں لائی جانے والی سرگرمیوں میں جائزے و نشان لگانے کا کام، تحفظ، معیشت حیوانات کی ترقی، مظاہرہ جاتی پروجیکٹ تعلیم و تربیت شامل ہیں۔

شری کمل ناتھ نے بتایا کہ پہاڑی علاقہ ترقیات پروگرام کے تحت مٹی اور پانی کے تحفظ کا وسیع کام شروع کیا گیا ہے نیل گری نجی استحصار تحفظ ایکٹ نے نجی زمینوں پر کھڑے تمام درختوں کے کاٹنے کے کام کو منظم بنایا ہے ۔ •

کپاس اوٹنے اور دبانے کے کام میں بہتری لانے کے لیے منصوبۂ عمل

کپڑے کی صنعت کے وزیر مملکت شری جی وینکٹ سوامی نے بتایا کہ حکومت نے کپاس اوٹنے اور اسے دبانے کی صنعت میں بہتری لانے کی غرض سے ایک منصوبۂ عمل وضع کیا ہے ۔ اس ضمن میں تعلیم، انتظام کی تربیت طریقۂ کار، قواعد وضع کرنے انھیں ضابطے کی شکل دینے کا کام شروع کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح کپاس کی گانٹھ باندھ بنانے اور اوٹنے کے بہتر نظام وضع کرنے اور اس کی جدید کاری کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے ۔ اس سے کپاس صنعت کو اپنی اثر انگیزی بڑھانے اور مصنوعات کی کوالٹی بہتر ترین بنانے میں مدد ملے گی ۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے کوئی مخصوص مدت مقرر نہیں کی گئی ہے ۔ •

درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے بہبودی فنڈز کو منتقل نہ کریں

شری کیسری نے ریاستی سکریٹریوں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

وزیر بہبود شری سیتا رام کیسری نے ریاستوں سے کہا ہے کہ وہ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی بہبود کے لیے مقررہ فنڈز کو دیگر مقاصد کے لیے منتقل نہ کریں ۔ انھوں نے ریاستوں سے گزارش کی ہے کہ وہ مرکز کے ذریعہ فراہم کرائے جانے والے فنڈز کے ذریعہ درج فہرست ذاتوں کے طلبا کو وظائف فراہم کرائیں اور مرکزی امداد کا استعمال کرکے بک بینک کھولیں ۔ شری کیسری نے مذکورہ خیالات کا اظہار درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے معاملات کے انچارج ریاستی و مرکزی انتظام کے علاقوں کے سکریٹریوں کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کیا ہے ۔

وزیر موصوف نے سکریٹریوں سے کہا ہے کہ وہ ان رضاکار اداروں کے ناموں کی سفارش کریں جو بہت کم خواندگی والے علاقے میں خواتین کے لیے تعلیمی کمپلیکس قائم کرسکیں ۔ انھوں نے توقع ظاہر کی ہے کہ درج فہرست ذاتوں کے لیے ایسی اسکیمیں جلد ہی شروع کی جائیں گی ۔

شری کیسری نے سکریٹریوں کو تعلیمی اداروں میں داخلوں و تقرر کے معاملے میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے ریزرویشن کی پالیسی پر عمل درآمد پر خاص توجہ دینے کی ہدایت کی ہے ۔ •

ڈسٹلریوں کی ٹکنالوجی کو جدید ترین بنانے کی ہدایت

ماحولیات و جنگلات کے وزیر مملکت شری کمل ناتھ نے ڈسٹلری صنعت سے کہا ہے کہ وہ ماحولیاتی کثافت و آلودگی پر قابو پانے کے لیے بہترین ٹکنالوجی اپنائے اور اپنے پلانٹوں کو لگاتار جدید بنانے کے لیے کوشاں رہے ۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق و ترقی اقدامات ڈسٹلری اور شراب کی بھٹی کے فضلے کو صاف کرنے کے لیے درکار ہیں اور اس کام میں آبی جانوروں بایو ٹکنالوجی کی مدد لی جاسکتی ہے ۔ •

عبدالحمید

مغربی بنگال میں تعلیمی فروغ

اس جدید اور تیز رفتار دنیا میں اگر کسی چیز کی اہمیت ہے تو وہ تعلیم کی ہے۔ تعلیم کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ زمانہ قدیم میں بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اگر تعلیم حاصل کرنے کے لیے چین جانے کی بھی ضرورت پڑے تو جاؤ۔

آزادی کے بعد اگرچہ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے لیکن ابھی تک یہ اضافہ خوش آئند نہیں رہا ہے۔ اس لیے آنجہانی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے نئی تعلیمی پالیسی کا مسودہ تیار کروایا تھا لیکن اسے ابھی تک تمام ریاستوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ آنجہانی راجیو گاندھی نے نوکری سے ڈگری کو ختم کرنے کی بھی تجویز رکھی تھی لیکن یہ بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

مغربی بنگال کا بھی حال تعلیم کے میدان میں کم و بیش یہی رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں رجسٹرڈ بے روزگاروں کی تعداد ۴ لاکھ ۴۴ ہزار ۸ سو ۱۳ سے بڑھ کر ۷۷،۱۹ء میں ۱۳ لاکھ ۱۳ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس تیزی سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت مغربی بنگال نے نوکری سے منسلک تعلیم کی شروعات کی اور اس طرح چھوٹے پیمانے پر ہی صحیح بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے رجحان کو روکنے میں کامیاب ہوئی۔ حکومت مغربی بنگال اپنے بجٹ میں تعلیم کی مد میں ہمیشہ ہی اضافہ کرتی رہی ہے اور اس نے ۹۱-۱۹۹۰ء کے بجٹ میں تعلیم کی مد پر تقریباً ۱۶۱۰ کروڑ روپیہ مختص کیا ہے جو کل بجٹ کا ۲۸ فیصد ح

مغربی بنگال ود

اپنے مالی وسائل پر انحصار

ٹیوشن فیس کو معاف

حکومت مغربی بنگا

کے لیے شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی پرائمری اسکول کی تعداد میں کافی اضافہ کر رہی ہے۔ اب تک مغربی بنگال کے ۹۷ فی صد گاؤوں میں پرائمری اسکول کھولے جا چکے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر دو اسکول کے درمیان ۲ کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہ ہو۔

ریاست میں ابتدائی تعلیم مکمل طور پر فیس سے مبرا ہے۔ حکومت درجہ یکم سے لے کر درجہ پنجم تک کی نصابی کتابیں بھی مفت تقسیم کرتی ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب طلبا، خاص طور پر دیہی علاقوں کی لڑکیوں کو بلا معاوضہ اسکول ڈریس بھی دیا جاتا ہے۔ غریبی کی وجہ سے بیچ میں اسکول چھوڑ جانے والے طلبا و طالبات کی تعداد میں کمی لانے کے مقصد سے حکومت دوپہر کا کھانا بھی دیتی ہے۔ ایسے طلبا و طالبات کی تعداد ہر سال ۲۸ لاکھ ہے۔

پرائمری اسکولا

میں ۳۶،۹۷ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ سکنڈری اسکولوں میں اس دوران تعداد بڑھ کر ۱۰٫۶۲ لاکھ سے ۱۲٫۸۳ لاکھ اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں ۴٫۰۱ لاکھ سے بڑھ کر ۴٫۴۷ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

مغربی بنگال میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے فروغ کے لیے بھی کوششیں جاری ہیں۔ کلکتہ یونی ورسٹی کا قیام ۱۸۵۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ ابھی مغربی بنگال میں نو ۹ یونی ورسٹیاں ہیں۔ ۳۰۲ کالج ہیں ان میں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے ۹، میڈیکل کے ۱۰ اور ٹیچرس ٹریننگ کالج ۴۳ ہیں۔ یہاں ۵۰ ہزار ۸ سو گیارہ پرائمری، ۳ ہزار ۹ سو ۳۲ مڈل اور ۶ ہزار ۷ سو

کیئرآف محمد حنیف ۴۹/۱۱/۱۳، میور بھنج روڈ۔ کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۳۔

۴۔ ہائی اور ہائی سکنڈری اسکول میں ضلع وار اسکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی فہرست چارٹ نمبر ۳ میں درج ہے۔

چارٹ نمبر ۱
پرائمری اسکولوں میں طلباء وطالبات کی شرکت (لاکھ میں)

عمر کا گروپ		۸۸-۱۹۸۷ء	۸۹-۱۹۸۸ء	۹۰-۱۹۸۹ء
۶ تا ۱۰ (درجہ اول تا پنجم)	کل	۸۶٫۳۸	۸۷٫۰۲	۸۸٫۲۰
	لڑکے	۴۸٫۹۴	۴۹٫۲۶	۵۰٫۰۵
	لڑکیاں	۳۷٫۴۴	۳۰٫۷۶	..٫۱۵

چارٹ نمبر ۲
مختلف سطح پر طلباء طالبات کی تعداد

	۸۸-۱۹۸۷ء	۸۹-۱۹۸۸ء	۹۰-۱۹۸۹ء
درجہ ششم تا ہشتم	۳۲٫۹۷	۳۶٫۹۷	۳۷٫۶۷
درجہ نہم تا دہم	۱۰٫۶۲	۱۱٫۸۳	۱۳٫۰۰
درجہ یازدہم تا دوازدہم	۴٫۱۰	۴٫۴۷	۴٫۵۰

مغربی بنگال کی ۹ یونیورسٹیاں مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ کلکتہ یونی ورسٹی —— کلکتہ
۲۔ جادو پور یونی ورسٹی —— جادو پور، کلکتہ
۳۔ رابندرا بھارتی —— کلکتہ
۴۔ نارتھ بنگال یونی ورسٹی —— سلی گوڑی، دارجلنگ
۵۔ بردوان یونی ورسٹی —— بردوان
۶۔ کلیان یونی ورسٹی —— کلیان، ندیا
۷۔ بدھان چندر کرشی وشو ودھیالیہ —— موہن پور، ندیا
۸۔ ودیا ساگر یونی ورسٹی —— مدنا پور
۹۔ وشوا بھارتی —— بول پور

تکنیکی اداروں کی فہرست (ڈگری سطح)

۱۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی —— کھڑگ پور
۲۔ ریجنل انجینئرنگ کالج —— درگا پور
۳۔ فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی، جادو پور یونی ورسٹی —— جادو پور کلکتہ
۴۔ بنگال انجینئرنگ کالج —— شب پور، ہوڑہ
۵۔ جلپائی گوڑی گورنمنٹ انجینئرنگ کالج، نارتھ بنگال یونی ورسٹی —— جلپائی گوڑی نارتھ بنگال
۶۔ ڈپارٹمنٹ آف اپلائیڈ فزکس، یونیورسٹی آف کالج آف ٹکنالوجی کلکتہ یونی ورسٹی —— کلکتہ
۷۔ ڈپارٹمنٹ آف اپلائیڈ کیمسٹری، یونیورسٹی کالج آف ٹکنالوجی کلکتہ یونی ورسٹی —— کلکتہ
۸۔ انسٹی ٹیوٹ آف ریڈیو فزکس اینڈ الیکٹرونکس، یونیورسٹی کالج آف ٹکنالوجی کلکتہ یونی ورسٹی —— کلکتہ
۹۔ کالج آف ٹکسٹائل ٹکنالوجی، سیرام پور —— سیرام پور، ہوگلی
۱۰۔ کالج آف ٹیکسٹائل ٹکنالوجی —— برہم پور، مرشد آباد
۱۱۔ کالج آف لیدر ٹکنالوجی —— ساؤتھ کنال روڈ کلکتہ ۱۵-
۱۲۔ کالج آف سیرامک ٹکنالوجی —— ۷۳، ابنیاشی سرجی لین، کلکتہ ۱۰

میڈیکل کالج کی فہرست

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ —— کلکتہ
۲۔ کلکتہ میڈیکل کالج —— کلکتہ
۳۔ این آر ایس میڈیکل کالج —— کلکتہ
۴۔ آر جی کار میڈیکل کالج —— کلکتہ
۵۔ نیشنل میڈیکل کالج —— کلکتہ
۶۔ بانکوڑا اسمیلانی میڈیکل کالج —— بانکوڑا
۷۔ بردوان میڈیکل کالج —— بردوان
۸۔ نارتھ بنگال میڈیکل کالج —— سسرو تی نگر، (نزد سلی گوڑی)

باقاعدہ تعلیم کے علاوہ یہاں تعلیم بالغان

چارٹ نمبر ۳
ضلع وار تعلیمی اداروں کی تعداد

ضلع کا نام	ڈگری کالج	پالی ٹیکنیک	معذوروں کے لیے ادارے	پرائمری اسکول	مڈل اسکول	سکنڈری اسکول	ہائر سکنڈری اسکول	جونیر ٹیکنیکل اسکول
کلکتہ	۶۶	۱۰	۳	۱۴۰۹	۹۱	۲۷۰	۱۴۷	–
شمالی ۲۴ پرگنہ	۳۳	۱	–	۳۶۸۹	۳۳۲	۴۸۱	۱۱۶	۳
جنوبی ۲۴ پرگنہ	۲۰	–	۱	۳۷۲۹	۳۵۷	۴۱۴	۸۸	۲
ہوڑہ	۱۶	۲	–	۲۲۰۸	۱۶۰	۲۷۵	۶۲	۱
ہوگلی	۲۲	۱	–	۲۹۷۶	۲۱۴	۳۴۰	۱۰۲	۲
بردوان	۲۳	۴	–	۳۸۲۹	۲۴۵	۴۱۵	۱۰۵	۴
بیربھوم	۱۰	۱	۱	۲۲۷۷	۱۰۱	۲۰۱	۴۳	–
بانکوڑا	۱۲	۱	–	۳۳۷۰	۱۴۴	۲ ۲	۵۹	۱
پرولیا	۱۵	۱	۱	۲۹۱۷	۱۰۶	۱۲۰	۵۰	۱
مدناپور	۳۱	۲	۱	۷۶۵۲	۵۹۳	۶۲۰	۱۴۱	۲
ندیا	۱۳	۱	–	۲۴۶۱				
مرشدآباد	۱۳	۱	۱					
مالدہ	۵	۱	–					
مغربی دیناج پور	۷	۱	–					
دارجلنگ	۱۱	۱	–					
جلپائی گوڑی	۱۰	۱	–	۱۹۲۲	۱۰۸	۱۲۲	۳۶	۱
کوچ بہار	۸	۱	–	۱۷۱۶	۱۰۰	۱۰۳	۲۳	–

اور عوامی تعلیم کا پروگرام بھی چلایا جا رہا ہے۔

۱۹۸۸ء میں یہاں عوامی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک نیا محکمہ کھولا گیا۔ جسے ۸۹-۱۹۸۸ء کے دوران ۱۵۰ لاکھ روپے اور ۹۰-۱۹۸۹ء کے دوران ۷۰۰ لاکھ روپے دیے گئے۔ تعلیم بالغان کے تحت ۹۰-۱۹۸۹ء کے دوران ۶۵۰ لاکھ لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا گیا جب کہ تعلیم دینے والے مرکزوں میں مرکزی پروگرام کے تحت ۶۰۸۱، ریاستی پروگرام کے تحت ۸۲۰۸ رضاکار اداروں کی طرف سے ۹۴۰ اور دیگر پروگراموں کے تحت ۸۱۵۴ مراکز قائم کیے گئے۔

مغربی بنگال میں عوامی تعلیمی پروگرام کی شروعات مدناپور سے کی گئی کیوں کہ یہیں بنگال کے مشہور ماہر تعلیم ایشور چندر ودیا ساگر پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد بردوان میں اور اس کے دو سال بعد بیربھوم، بانکوڑا، کوچ بہار، ہوگلی اور شمالی ۲۴ پرگنہ میں عوامی تعلیمی پروگرام کی شروعات کی گئی۔ اب یہ پروگرام پوری ریاست میں [illegible]

مغربی بنگال کا سب سے پہلا [illegible] خواندہ ضلع ہے کا اعزاز بردوان کو حاصل ہوا۔ ہندوستان بھر میں بردوان کو خواندہ ضلع کی فہرست میں دوسرا مقام ملا۔ اس کا سرکاری اعلان نائب صدر نے بردوان کے ایک رسمی تقریب میں کیا۔ بردوان میں خواندہ بنانے کا نشانہ ۹،۸۶ لاکھ کا رکھا گیا تھا جو مکمل ہوا۔ یہ کل آبادی کا ۸۲،۲۲ فی صد ہے۔ یہاں تعلیم بنگلہ، ہندی، اردو اور اڑیہ زبانوں میں دی گئی۔

مغربی بنگال کا دوسرا مکمل خواندہ ضلع ہونے کا اعزاز ضلع ہوگلی کو ملا، یہاں نشانہ ۸ لاکھ کا رکھا گیا تھا جس میں اب تک

۶٫۳۸ لاکھ لوگوں کو خواندہ بنادیا گیا ہے۔

بردوان اور ہوگلی کے علاوہ مدناپور میں عوامی تعلیم زور شور سے جاری ہے۔ یہاں خواندہ پروگرام میں تقریباً ۱۵٫۶۰ لاکھ ناخواندہ افراد حصہ لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بیر بھوم، کوچ بہار اور شمالی ۲۴ پرگنہ میں بھی کام تیزی سے جاری ہے۔ کوچ بہار میں اب تک ۴٫۴۵ لاکھ ناخواندہ افراد ان مرکزوں میں پڑھنے جا رہے ہیں۔ جب کہ نشانہ ۸٫۰۲ لاکھ کا ہے۔ بانکوڑا میں نشانہ ۷٫۲ لاکھ کا ہے جب کہ ۳٫۷۹ لاکھ لوگ خواندہ پروگرام میں حصہ لے رہے ہیں۔ شمالی ۲۴ پرگنہ میں نشانہ ۱۰ لاکھ کا ہے اور ابھی ۷٫۰۲ لاکھ لوگ ان مرکزوں پر پڑھنے جا رہے ہیں۔

حال ہی میں باقاعدہ طور پر ہوڑہ، جنوب ۲۴ پرگنہ اور مرشد آباد میں بھی خواندگی پروگرام کی شروعات کی گئی ہے۔ ان تینوں اضلاع میں نشانہ بالترتیب ۶٫۴۰ لاکھ، ۱۵٫۰۸ لاکھ اور ۱۱٫۳۷ لاکھ کا ہے۔ عوامی تعلیمی پروگرام کے تحت حکومت کا منصوبہ ہے کہ دس اضلاع کے تقریباً ۱۲ لاکھ افراد کو خواندہ بنایا جائے گا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں رواں شرحِ تعلیم سے مغربی بنگال کی شرحِ تعلیم زیادہ ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی شرحِ تعلیم ۵۲٫۱۱ فی صد ہے۔ اس کے مقابلے میں بنگال میں یہ شرح ۵۷٫۹۲ فی صد ہے۔ اگر اسے الگ الگ زمرے میں تقسیم کریں تو مردوں کی کل ہند شرحِ تعلیم ۶۳٫۸۶ فی صد کے مقابلے بنگال میں ۶۷٫۲۴ فی صد اور خواتین کے زمرے میں ۳۹٫۴۲ کے مقابلے ۴۷٫۱۵ فی صد ہے۔

حکومت کی متعدد پالیسیوں اور مختلف پروگراموں کے باوجود اب تک ۴۲ فی صد

چارٹ نمبر ۴
ہندوستان میں تعلیم کا منظر نامہ

سال	مرد	خواتین	کُل
۱۹۸۱ء	۵۶٫۳۷ فی صد	۲۹٫۷۵ فی صد	۴۳٫۴۹ فی صد
۱۹۹۱ء	۶۳٫۸۶ فی صد	۳۹٫۴۲ فی صد	۵۲٫۱۱ فی صد

چارٹ نمبر ۵
مغربی بنگال میں تعلیم کا منظر نامہ

سال	مرد	خواتین	مکمل
۱۹۸۱ء	۵۹٫۹۳ فی صد	۳۶٫۰۷ فی صد	۴۸٫۶۴ فی صد
	۶۷٫۲۴ فی صد	۴۷٫۱۵ فی صد	۵۷٫۹۲ فی صد

آبادی ناخواندہ ہے اور عورتوں کی تعداد تو ۵۰ فی صد سے بھی زیادہ ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق مغربی بنگال میں تقریباً ۳۵۲۶۳۳۹۲ افراد ناخواندہ تھے۔ ●

بقیہ، خاندانی منصوبہ بندی
یونانی اطباء کی نظر میں

سود مند رہا ہے۔

لیکن موجودہ دور میں جس قدر اہمیت اور مقبولیت کنڈوم کو ملی ہے وہ اس کی افادیت کا ثبوت ہے۔ کنڈوم نہ صرف یہ کہ بہترین مانع حمل طریقہ ہے بلکہ متعدد جنسی بیماریوں جیسے سوزاک، آتشک، گنوریا اور مہلک مرض ایڈس سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہماری سرکار کی بھی زیادہ توجہ اسی پر مرکوز ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے، جس کے مضر اثرات نہیں ہیں اور جس کا استعمال بھی آسان ہے اور اس کی دستیابی بھی برائے نام قیمت پر ہر جگہ ہے اور جب حمل مقصود ہو تو اس کا استعمال ترک کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ وہ اس کے استعمال سے مکمل طور پر لطف اندوز نہیں ہو پاتے کیوں کہ یہ حساسیت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کے استعمال میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کا استعمال، اور آخر میں اس کا اخراج صحیح طور پر کیا جانا چاہئے۔ کیوں کہ اکثر اس کے پھٹ جانے یا باہر نکلتے وقت منی کے گر جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ اگر احتیاط کے ساتھ کنڈوم کا استعمال کیا جائے تو مندرجہ بالا فائدوں کی وجہ سے یہ سب سے بہتر مانع حمل طریقہ ہے۔

نئی دہلی

یوجنا

جلد ۱۳ شمارہ ۱۳ - ۱۴

یکم تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء : ۹ آسوں تا ۹ کارتک تک ۱۹۱۵

قیمت : ۳ روپے ٹیلی فون ۶۱۸۱۸

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر توحید خان

معاون وسیم حیدر

کتابت : سجاد علی خاں

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی : ۳ روپے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ ۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶۔

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن : سدرشن موھن چھل

ترسیلِ زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

کمل ناتھ

ماحولیاتی اثرات کا جائزہ : ہم آہنگ ترقیات کی کلید

قدرتی ماحول، جو انسان کا انتہائی بیش قیمت ورثہ ہے، ناعاقبت اندیشانہ ترقیاتی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت زیادہ متاثر ہوتا رہا ہے۔ ابھی حال ہی تک بیشتر ترقیاتی منصوبے تکنیکی عمل پذیری اور اقتصادی فائدے کے دوہرے اصول پر مبنی تھے۔ لیکن اس بات کو سمجھتے ہوئے کہ تمام انسانی سرگرمیوں سے قدرتی ماحول متاثر ہوتا ہے، دنیا کی توجہ قدرتی دولت کے تحفظ اور بچت کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی تحریک شروع کرنے کی جانب مبذول کرائی گئی تھی۔ بہت سے روایتی مفروضوں کو توڑا گیا ہے اور اب اس بات کو سمجھ لیا گیا ہے کہ ماحولیاتی تحفظ اور آبادی کی روک تھام کے اقدامات کے سلسلے میں سرمایہ کاریوں سے ترقیات کی راہ میں بڑی رکاوٹ کی بجائے آگے چل کر پیداواریت میں اضافہ ہوتا ہے۔

مستقل بنیاد پر وسائل کے استعمال کو یقینی بنانے کے لیے تین اہم اصولوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ مساوات اور سماجی انصاف، ایک موثر اقتصادی نظام اور ماحولیاتی ہم آہنگی۔ آج، ماحولیاتی اثرات کا جائزہ (ای آئی اے) پائیدار ترقیات میں ایک بنیادی جزو بن گیا ہے۔

ماحولیاتی اثرات کے جائزے کے تحت، ہر ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں پالیسی کے اثر اور ماحولیاتی اثر کا اندازہ لگایا جاتا ہے تاکہ شعبہ جاتی ترقیاتی منصوبوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ہر ایک ترقیاتی پروجیکٹ کے لیے درکار ماحولیاتی انتظام کا منصوبہ تیار کیا جائے۔ مذکورہ جائزے کے تحت مختلف اثراتی زمروں مثلاً اقتصادی اثرات، ماحولیاتی اثرات اور سماجی اثرات کے لحاظ سے ہر ایک ترقیاتی پروجیکٹ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

حالیہ برسوں میں بھارت کی اہم کوششوں میں سے ایک کوشش نئی صنعتی پالیسی کو جنگلات سے متعلق پالیسی کے مقاصد سے ہم آہنگ بنا رہی ہے۔ بھارت کا مقصد ۳۳ فی صد زمینی علاقے کو جنگلاتی علاقے کے تحت لانا ہے۔ یہ علاقہ اس وقت تقریباً ۱۲ فی صد ہے۔ اس سے موجودہ جنگلات کا تحفظ ہوگا اور قومی مفاد میں سرمایہ کاری کے کچھ اہم فیصلوں کو چھوڑ کر غیر جنگل بانی کے کسی بھی کام کے لیے منتقلی کی روک تھام ہوگی۔ بڑے پیمانے پر صنعت کاری سے حیاتیاتی گوناگونی کا نقصان ہوتا ہے، جس سے صنعت کاری کے فوائد رائیگاں جا سکتے ہیں۔

ماحولیاتی اثرات کے جائزے میں ترقیاتی پروجیکٹوں کا جائزہ لیتے وقت مختلف ماحولیاتی اثرات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ بہت سے ترقیاتی حکام کے ذہنوں میں یہ غلط خیال پایا جاتا ہے کہ ماحولیاتی تحفظ سے مراد صرف درختوں کے لیے پود کاری یا فضائی اور آبی آلودگی کی روک تھام ہے۔ پروجیکٹ کے علاقوں سے ہٹائے گئے لوگوں کی صحت اور باز آباد کاری، دریائی وادی کے طاس کے پروجیکٹ میں پامال زمین کی بہتری، گندے پانی کی نکاسی کی مناسب سہولیات کے ساتھ کمان علاقے کی مناسب ترقی و بہتری، یادگاروں کا تحفظ اور بحالی، نباتات اور حیوانات نیز حیاتیاتی گوناگونی کے تحفظ جیسے پروجیکٹ قائم کرتے وقت دیگر اہم اثرات کو بھی مدِنظر رکھنا ہوگا، جو پائیدار ترقی کے لیے انتہائی اہم ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اثرات کے جائزے کے شعبے میں، بھارت ہمیشہ دنیا میں ہونے والی ترقیات کے دوش بدوش

ماحولیات اور جنگلات کے مرکزی وزیرِ مملکت

چلتا رہا ہے۔ "ریو اعلانیہ" میں ماحولیاتی اثرات کے جائزے کو ترقیاتی عمل میں ماحولیاتی تشویشات کو بین الاقوامی بنانے کے ایک ذریعے کی حیثیت سے استعمال کرنے کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ "ریو اعلانیہ" کے اصول نمبر ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ ایک قومی ذریعہ کے طور پر ماحولیاتی اثرات کا جائزہ اُن مجوزہ سرگرمیوں کے سلسلے میں کیا جائے گا، جس کی وجہ سے ماحولیات پر بہت زیادہ خراب اثر پڑ سکتا ہے اور جن کو انجام دینے کے لیے ایک با اختیار قومی ادارے کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے۔

آج ماحولیاتی اثرات کا جائزہ عالمی بنک، اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام، ایشیائی ترقیاتی بنک وغیرہ جیسے رقم فراہم کرنے والے بین الاقوامی اداروں سے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں ترقیاتی پروجیکٹوں پر غور و خوض کرنے کی اوّلین شرط ہو گیا ہے۔ ماحولیاتی اثرات کے جائزے کے نتائج تیار کرنے کے لیے عالمی بنک اور دیگر اداروں نے خصوصی رہنما خطوط مقرر کئے ہیں۔ یہ نتائج پروجیکٹوں کے سلسلے میں بین الاقوامی امداد حاصل کرنے کے موقع پر پیش کئے جاتے ہیں۔ درحقیقت، عالمی بنک کے مقرر کردہ رہنما خطوط بھارت میں وضع کردہ رہنما خطوط کے مطابق ہی ہیں۔ اس کی وجہ ماحولیاتی اثرات کے جائزے کا سلسلہ شروع کرنے کی غرض سے بھارت کی وہ پہل ہے، جو اُس نے ۱۹۷۷ء میں کی تھی۔

ماحولیاتی جائزے کا سلسلہ ابتدائی طور سے دریائی وادی کے، پروجیکٹوں پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ۱۹۷۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کے دائرۂ کار میں لائے گئے پروجیکٹوں میں اہم آب پاشی پروجیکٹ، تمام پن بجلی پروجیکٹ، دریائی وادی کے کثیر مقصدی پروجیکٹ، کان کنی، صنعتی، حرارتی بجلی کے پلانٹ، ایٹمی طاقت کے پلانٹ، بندرگاہیں اور گودیاں، ساحلوں پر سیاحتی پروجیکٹ، نقل و حمل اور مواصلات، انسانی بستیاں اور معیشتِ حیوانات کے لحاظ سے کمزور علاقوں میں واقع خصوصی پروجیکٹ شامل ہیں۔

بھارت کی یہ کوشش رہی ہے کہ اُن طریقوں کو استعمال کے مرحلے سے ہی آسان بنانا چاہیئے جو پروجیکٹ کی تیاری اور اس کو قطعی شکل دینے کے سلسلے میں پروجیکٹ کے جائزے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ماحولیات کی وزارت نے ترقیاتی پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی کے دوران غور و خوض کئے جانے کی غرض سے ماحولیاتی پہلوؤں کے بار... مفصل رہنما خطوط تیار کئے... ہیں مجموعی ماحولیاتی استطا... سلسلے میں عملی منصوبوں کی... جانے والی معلومات اور ا... پر بھی زور دیا گیا ہے۔ معا... شمار جمع کرنے کے کام میں سہولت ہم پہنچانے کے لیے جن اداروں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے اُن کے نام بھی رہنما خطوط میں موجود ہیں۔

ایک ہی جگہ پر منظوری، ماحولیاتی منظوری کے لیے وقت کی زیادہ سے زیادہ مدت کا معاہدہ اور معلومات نہ فراہم کرنے پر اس سے قبل مسترد کئے گئے معاملات کے سلسلے میں دوبارہ سے کارروائی شروع کرنا پروجیکٹوں کے تیزی سے تصفیئے کے سلسلے میں کئے گئے کچھ اقدامات ہیں۔ ماحولیات اور جنگلات کی وزارت ماحولیاتی اثرات کے جائزے کی شروعات سے لے کر اب تک تقریباً ۱۰۹۰ پروجیکٹوں کو منظوری دے چکی ہے۔ خوبیوں کی بنیاد پر یا مطلوبہ معلومات فراہم نہ کرنے کی وجہ سے مسترد کردہ تجاویز کی تعداد ۱۴۷ ہے۔

اب تک، قانونی سہارے کی عدم موجودگی میں، پروجیکٹوں کے جائزے اور منظوری کا کام ایک انتظامی اہتمام کے تحت انجام دیا جا رہا ہے۔ اور یہ کام غیر سرکاری شعبے کے پروجیکٹ کے لیے لاگو نہیں کیا جا رہا ہے۔ ترقیاتی پروجیکٹوں کے ماحولیاتی جائزے کا ایک یکساں مقصدی نظام قائم کرنے کی غرض سے ماحولیات کے تحفظ کے قانون ۱۹۸۶ء کے تحت گذشتہ سال ایک نوٹیفکیشن کا مسودہ جاری کیا گیا تھا۔ یہ نوٹیفکیشن مرکزی اور ریاستی حکومتوں صنعتی انجمنوں، غیر سرکاری تنظیموں نیز...

...مقصد یہ ہے کہ تجاویز کے ذریعہ اور ان تجاویز کا تفصیلی جائزہ لے کر زیادہ سے زیادہ خیالات اور آرا حاصل کی جائیں۔

تمام نئے پروجیکٹوں اور پرانے پروجیکٹوں کی توسیع یا جدید کاری کے لیے ماحولیاتی اثرات کے جائزے کو لازمی قرار دینے کے سلسلے میں قطعی نوٹیفکیشن جلد ہی جاری کیا جا رہا ہے۔ نوٹیفکیشن میں بڑے پیمانے پر مختلف اقسام کے پروجیکٹوں کو منظوری دینے کے سلسلے میں ریاستی حکومتوں کو اختیار دینے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ ریاستیں بھی کچھ صلاحیتوں تک بہت سے پروجیکٹوں کو منظوری دے سکتی ہیں۔ لیکن محفوظ کردہ جنگلات یا معیشتِ حیوانات

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

عادل صدیقی

ماحولیات اور ہندوستان

اس روئے زمین پر ہر سات آدمیوں میں سے ایک ہندوستان میں رہتا ہے۔ دنیا کی آبادی کا ۱۶ فی صد ہندوستان میں ہی آباد ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی ترقی کے لیے قدرتی وسائل کی بڑی مانگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ ایک اوسط ہندوستانی ترقی یافتہ دنیا کے شہری کے مقابلے بہت کم مقدار میں وسائل استعمال کرتا ہے۔ اگر جنوب میں اوسط درجے کا شخص اتنے ہی وسائل کام میں لاتا جتنا کہ ترقی یافتہ ملک کا کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو ترقیاتی مسائل شدید سے شدید تر نہ ہوتے، انھیں میں سے ایک مسئلہ ماحول کی آلودگی کا ہے۔ اگرچہ بڑی حد تک ہندوستان میں فی کس اوسط کھپت غریبی کی وجہ سے کم ہے تاہم یہاں کا طرزِ زندگی ماحولیات کے نقطۂ نظر سے بہت کچھ اصلاحات کا منتظر ہے۔ اگرچہ یہ وہی طرزِ زندگی ہے جو ہزارہا سال سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے۔

انچارج پبلسٹی ڈپارٹمنٹ، دارالعلوم،
دیوبند (یو۔پی)

آج ماحولیات کا مسئلہ اس لیے بھی شدت اختیار کرگیا ہے کیوں کہ عرصۂ دراز سے اپنایا گیا طرزِ زندگی بدل چکا ہے۔ مثال کے طور پر اب ہندوستان میں ادل بدل کرکے کاشت کا طریقہ چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں ہندوستان میں سبز انقلاب کے ذریعے سے ہندوستان کی خوراک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کیا گیا۔ بلاشبہ اس پروگرام نے حیرت انگیز طور پر خوراک کی پیداوار بڑھادی مگر اس نے ملک کے قدرتی وسائل پر بہت زیادہ بوجھ ڈالا، اس کے ساتھ ساتھ اس نے کیمیادی کھادوں اور جراثیم کش دواؤں پر ہندوستان کے انحصار کو بڑھادیا۔ اس سے مٹی کی صحت اور اس کی قوتِ نمو کے مسائل رونما ہوئے۔ مثلاً یہ کہ نامیاتی مادّوں کی کمی ہوگئی۔ مٹی میں کھاری پن بڑھ گیا۔ زمین کے طبیعاتی ڈھانچے کو بھی نقصان پہنچا کیمیاوی کھادوں پر انحصار بڑھ جانے سے اُن کی درآمد ضروری ہوگئی، اس لیے آج اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ان مسائل کا کوئی فوری حل تلاش کیا جائے،

مگر اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تقویت پارہا ہے کہ محض ٹکنالوجی سے مسائل کا حل تلاش کرنا دشوار ہے، اس لیے مسائل کے حل کے لیے قدیم زمانے کے بہترین طریقوں اور جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے فائدوں کو ایک ساتھ سمونا ہوگا۔ اگرچہ یہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے ایسے جدید طریقوں کو وضع کرنے پر زور ہے جن کے ذریعے سے تضیع اور وسائل کے غیر ضروری استعمال سے بچا جاسکے، ہندوستان میں ایسی ٹکنالوجیوں کو اپنانے پر زور ہے جن کے ذریعے ماحول کی آلودگی کے مسائل کم سے کم سامنے آسکیں۔ وسائل کے موثر استعمال اور بے کار ہوئی اشیار اور مادوں کو دوبارہ سے قابلِ استعمال بنانے پر زور ہے، اور یہ وہی پائیدار اصول ہیں، جن پر ہندوستان زمانۂ قدیم سے ہی کاربند ہے۔ اس انداز کی ترقی سے آبادی کا دباؤ کم ہوگا کیوں کہ ترقی اور آبادی میں کم شرح سے اضافہ لازم وملزوم ہیں۔ اس کے لیے شہروں کے بسانے، تعمیر مکانات، زراعت، صنعتی ترقی، ٹرانسپورٹ کے نظام وغیرہ شعبوں میں ایسے طریقوں سے بچنا ہوگا۔ جن کو ترقی یافتہ دنیا پہلے ہی مسترد کرچکی ہے۔

شمال میں ماحولیات کے مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان ملکوں میں اس خطرے کا پوری طرح احساس جاگ گیا ہے، لہٰذا انھوں نے خود کو اس خطرے سے محفوظ کرنے کے لیے آلودگی پھیلانے والی تمام فیکٹریوں کو جنوب کی طرف منتقل کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلے کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ نقصان دہ اور مضرت رساں نیم مصنوعہ مال پر جو کہ رنگوں کی تیاری وغیرہ کے لیے درکار ہوتا ہے جیسا کہ ایچ۔ ایسڈ، کے ایسڈ، گاما ایسڈ جن کی تیاری ۱۹۶۰ء کے دہے میں شروع کی گئی تھی، آج ہمارے ملک میں ۱۴ ہزار ٹن کے لگ بھگ تیار ہوتا ہے اور ۶ ارب روپے کا یہ سامان ترقی یافتہ ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔

ہندوستان اور بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کو مجبوراً کچھ ایسے ترقیاتی پروگرام اپنانے پڑے ہیں جو زیادہ تر مغربی ممالک کی نقالی پر مبنی ہیں لیکن اس طرح کے پروگرام ہندوستان کے لیے ہمیشہ ہی موزوں نہیں ہو سکتے۔ مہاتما گاندھی نے ۶۰ برس پہلے کہا تھا کہ خدا نہ کرے کہ ہندوستان کبھی اس طرح کی صنعت کاری پر گامزن ہو جو مغربی ملکوں کی نقالی پر مبنی ہو۔ مغربی اقتصادی نظام سے استحصال پسندی کی بُو آتی ہے۔ مغربی ملکوں نے جب صنعت کاری کا راستہ اپنایا تو شاید انھیں اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا کہ ان سے ماحولیات کے مسائل کس قدر سنگین انداز میں سامنے آئیں گے۔ آج یہ راستہ ان ملکوں کے لیے موزوں نہیں سمجھا گیا جہاں کے عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں متبادل تکنیک کی تلاش کا کام جاری ہے۔ اس کی بنیاد مبنی بر انصاف اقتصادی اور سماجی تکنیکوں پر رکھی جا رہی ہے۔ یہ تکنیک ترقی یافتہ ملکوں کے اس نظام سے مختلف ہے جہاں وسائل کا بے جا استعمال ہے اور جہاں اشیاء کی کھپت بہت زیادہ ہے۔

آج پوری دنیا کے سامنے ماحولیات کے مختلف مسائل ہیں۔ مثلاً یہ اوزون سے خالی دنیا، تیزاب کی بارش، سمندری آلودگی اور جانوروں، پودوں وغیرہ کے معدوم ہونے کے خطرات وغیرہ۔ یہ مسائل نہ صرف کسی ایک خطے کے لیے مخصوص ہیں بلکہ ان سے پوری دنیا کو خطرہ ہے۔

آج دنیا میں پائی جانے والی نا برابری سب سے بڑا خطرہ ہے، یہ نا برابری بڑی بھیانک ہے۔ مثال کے طور پر موزمبیق میں مجموعی قومی پیداوار کا فی کس اوسط صرف ۸۰ امریکی ڈالر ہے جب کہ سوئٹزر لینڈ میں یہ ۲۹۸۸۰ ڈالر ہے۔ اس طرح اوسط عمر کو
لے لیجیے۔ سیرالیون میں
ہے جب کہ جاپان میں
طرح شرح خواندگی صومالیہ
میں تقریباً ۱۲ فی صد۔
یہ ۹۵ فی صد ہے۔ اس سے
ہے کہ ترقیاتی مسائل عالمی سطح پر نابرابریوں کو واضح کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ غریبی دور کرنا ماحولیاتی مسائل کا ہی ایک بنیادی عنصر ہے، ہندوستان میں غریبی دور کرنے کے ایک پروگرام چلائے جا رہے ہیں، ان کو اسی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔

ہندوستان اپنی طبیعات، معاشیات، سماجی اور ثقافتی حالات، اور لسانیات کے اعتبار سے گونا گونی اور بوقلمونی کا مالک ہے۔ اس کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ ہے، جنوب میں بحرِ ہند ہے۔ جغرافیائی تنوع حد درجہ ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے بھی جُدا جُدا ہے۔

ہندوستان کی آبادی اس وقت ۸۴ کروڑ سے زیادہ ہے اور یہ ہر سال ۲ء۱۱ فی صد کی شرح سے بڑھ رہی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ آئندہ صدی کے وسط تک بڑھنے کے بعد ایک مستقل سطح پر ٹھہر جائے گی مگر اس وقت تک ہندوستان سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہوگا۔ آبادی میں ہر سال تقریباً ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کا اضافہ ملک کے وسائل پر بوجھ ڈالتا رہے گا جس سے ترقی کے نتیجے میں ہونے والے فائدے بے اثر ہو جائیں گے۔ اس لیے ملک میں اضافہ آبادی کی روک تھام کے مسائل پر سب سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے کیوں کہ اس کا ترقی سے براہِ راست تعلق ہے۔ یہ سمجھنا ٹھیک نہیں کہ اضافہ آبادی کی روک تھام سے ترقی ہو سکے گی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ترقی کے سبب آبادی

جہاں اضافہ آبادی کی شرح سب سے کم ہے۔ کیرالہ میں اضافہ آبادی کی شرح ۱ء۴ فی صد سے کم ہے اور تامل ناڈو میں یہ ۱ء۴ فی صد سے کچھ زیادہ ہے۔

آج ہندوستان میں ان رجحانات، حالات اور تقاضوں میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو نو آبادیاتی نظامِ حکومت کے تحت ہندوستانی عوام میں جڑ پکڑ گئے تھے اس کے لیے نظامِ تعلیم میں ضروری تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ البتہ ملک میں غریبی کی موجودگی کے سبب ماحول کی آلودگی کے مسائل پر قابو پانے میں دشواری محسوس کی جا رہی ہے، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ فی کس اوسط آمدنی بڑھ رہی ہے لیکن پھر بھی ابھی ملک کی

آبادی کا تقریباً ۴۰ فی صد غریبی کے خطے سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ اس لیے ملک میں نہ صرف ایسے پروگراموں کو ضروری سمجھا گیا ہے جس کا تعلق ماحول کی آلودگی کو دور کرنے سے ہے بلکہ سماجی انصاف لانے والے پروگراموں پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ ملک میں بیشتر لوگ وہ ہیں جو اپنے اردگرد کے ماحول میں پائے جانے والے وسائل پر انحصار رکھتے ہیں، غریبی کی وجہ سے ماحول میں گندگی اور آلودگی بڑھتی جا رہی ہے اور اسی آلودہ ماحول میں وہ اپنے گزارے کے لیے روزی تلاش کرتے ہیں اور آس پاس کے وسائل سے کام لے کر زندگی گزارتے ہیں۔ اسی واسطے غربت دور کرنے اور ماحول کی آلودگی دور کرنے کے مسائل ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں ہر مسئلہ کو مقامی حالات کے پس منظر میں حل کرنا ہے، اس کے لیے مستعار ٹکنالوجی کافی نہیں ہوگی۔ اس ضرورت نے تحقیقی امور کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ ملک کی آبادی اور صاحبِ اقتدار افراد کو مسائل سے باخبر رہنے اور ان پر نظر رکھنے کے کام کو مقدم سمجھنا ہے۔ اس کام کو تال میل کے ساتھ انجام دینے کی غرض سے ملک میں ۱۹۸۵ء میں ماحولیات اور جنگلات کی قومی وزارت قائم کی گئی تھی۔ زیادہ تر ریاستوں میں ان مسائل کے حل کے واسطے ایسے محکمے ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کی تکمیل کی غرض سے نئی اراضی پر کاشت شروع کی گئی چنانچہ زیر کاشت رقبہ جو ۱۹۵۱ - ۱۹۵۰ء میں ۱۱۸٫۷۵ ملین ہیکٹیر تھا، وہ بڑھ کر ۱۵۰ ملین ہیکٹیر تک پہنچ گیا۔

آب رسانی کی امکانی صلاحیت ۱۹۵۰ء میں ۲۲ ملین ہیکٹیر اراضی تھی مگر اب یہ بڑھ کر ۷۵ ملین ہیکٹیر تک پہنچ چکی ہے۔ نئے قسم کے بیجوں کی دریافت اور کیمیاوی کھادوں نیز جراثیم کش دواؤں کی مدد سے سبز انقلاب لایا جا سکا۔ ہندوستان میں خوراک کی پیداوار ۵ کروڑ ٹن سالانہ سے بڑھ کر ۱۷ کروڑ ٹن سالانہ تک پہنچ چکی ہے جو تقریباً ۲۳۵ فی صد اضافہ ظاہر کرتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ملک میں سماجی جنگل بانی کے پروگرام شروع کیے گئے۔ ان پروگراموں کے تحت ایسے درخت اُگانے پر زور رہا جن سے دیہات میں ایندھن مل سکے۔ اس کے علاوہ درختوں کی نرسریاں، پودوں کی مفت تقسیم، کھیتوں کی مینڈھوں پر درخت اگانے وغیرہ کے پروگرام شروع کیے گئے۔ ایسے خاص قسم کے چولہوں کا رواج بڑھا جن سے کم سے کم ایندھن کھپ سکے۔ ان کی مدد سے ایندھن کے طور پر درکار لکڑی کی مانگ میں ۴۰ فی صد کمی آسکی۔ دیہات میں بائیو گیس کا استعمال بڑھا۔ یہ کم خرچ انرجی دینے والی ایک جدید تکنیک ہے۔

اس کام کو منصوبہ بند ڈھنگ سے آگے بڑھانے کے لیے تحقیق اور تعلیم کے پروگراموں کو موثر بنایا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں بنگلور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کے لیے ایک سنٹر کا قیام اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ گجرات میں آنند کے مقام پر دیہی مینجمنٹ کا ادارہ دیہی ترقیاتی پروگراموں کی توسیع و ترقی کے لیے کام کرتا ہے۔ رانچی میں دیہی صنعت کاری کے لیے سوسائٹی کا قیام جدید ٹکنالوجی کی ترقی اور اسے عوام تک پہنچانے کے سلسلے میں بیش قیمت کام کر رہا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ: ملک کی تعمیر و ترقی کا منشور
آئین کے رہنما اصول

امن عالم کے لیے جدوجہد کرنا اور غریب اور نو آزاد ملکوں کے حقوق کا تحفظ تھا۔ آج دنیا کے بدلے ہوئے سماجی معاشی اور سیاسی حالات میں بھی ہمارا ملک امن و سلامتی کے اپنے مقاصد پر کاربند ہے۔

غرض آئین کا یہ چوتھا باب جو رہنما اصولوں پر مشتمل ہے اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ملک کی تعمیر و ترقی کے وسیع تر مقاصد کو واضح سمت اور مستقبل کا واضح تصوّر عطا کرتا ہے۔ اس باب کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی بھلے ہی دستیاب نہ ہو مگر عام شہریوں کے لیے یہ امید کی کرن ضرور ہے

۱۹۷۳ میں سپریم کورٹ میں ایک مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جسٹس کے۔ ایس۔ ہیگڑے اور جسٹس مکھرجی نے کہا تھا کہ بنیادی حقوق اور رہنما اصول ہمارے آئین کا ضمیر (Conscience) ہیں۔ رہنما اصولوں کا مقصد سماجی اور معاشی مقاصد کا تعین کرکے پر امن سماجی انقلاب لانا ہے۔ ان کا مقصد ہندوستان کو مثبت اعتبار سے ایک آزاد ملک بنانا ہے

بقیہ، ڈاکٹر اینی بسینٹ

ARLAK TC THE MODERN

WORLD)

پر ایک لیکچر دیا۔ یہ ۱۹۱۴ کا زمانہ تھا جب انھوں نے ہندوستانی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کا مقصد ہندوستان کو برٹش کامن ویلتھ میں وفاقی حیثیت دلانا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو اخباروں کی بنیاد بھی ڈالی جن کے نام ہیں، "دی کامن ویل" (THE COMMON WEAL) اور "نیو انڈیا"۔ (NEW INDIA)

انھوں نے ہندوستانی سیاست پر بہت سے لیکچر دیئے اور کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں "دی برتھ آف نیو انڈیا" (THE BIRTH OF NEW INDIA) (۱۹۱۷)، "ہاؤ انڈیا راٹ ہر فریڈم" (HOW INDIA WROUGHT HER FREEDOM) (۱۹۱۵)، "انڈیا اے نیشن" (A NATION INDIA) (۱۹۱۵)، انڈیا باؤنڈ آر فری" (INDIA BOUND OR FREE) (۱۹۲۶) اور "شیل انڈیا لو آور ڈائی" (SHALL INDIA LIVE OR DIE) (۱۹۲۵) قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۶ میں انہوں نے "ہوم رول لیگ" کی بنیاد ڈالی، جس نے انڈین نیشنل کانگریس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ۱۹۱۶ میں گورنمنٹ نے انھیں بمبئی سے جلاوطنی کا حکم دیا اس کے بعد ۱۹۱۷ میں گورنمنٹ آف مدراس نے انھیں تین ماہ کے لیے اوٹاکمنڈ میں محصور کر دیا۔

۱۹۱۷ میں ان کو انڈین نیشنل کانگریس کا صدر چنا گیا۔ اسی سال ان کو "ویمنز انڈیا ایسوسی ایشن" (Women's India Association) کا صدر بھی منتخب کیا گیا۔ یہ ۱۹۱۸ کا دور تھا جب انھوں نے "انڈین بوائے اسکاؤٹس" کو منظم کیا۔ بعد میں ۱۹۲۱ میں ان کو بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کا کل ہند اعزازی کمشنر بھی متعین کیا گیا۔ ۱۹۲۱ میں ہی بنارس ہندو یونیورسٹی نے ان کو "ڈاکٹر آف لیٹریچرس" کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ ۱۹۲۴ میں پچاس سالہ سماجی خدمات کے صلے میں انھیں کوئنس ہال لندن میں مدعو کرکے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ ۱۹۲۵ میں وہ "کامن ویلتھ آف انڈیا بل" پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے لندن گئیں۔ ۱۹۳۰ میں انھوں نے انگلینڈ اور یوروپ کا آخری دورہ کیا۔ ۱۹۳۲ میں لارڈ بیڈین پاول (LORD BADEN POWELL) نے ان کو سلور و ... (WOLF) کا ایوارڈ ... کا سب سے اعلیٰ اعز ...

اس ہمہ جہت ... ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ میں ادیار ...

ان کی خدمات کے لیے ہمیشہ ان کا مقروض رہے گا۔

ڈاکٹر اینی بسینٹ نے اپنے لیکچروں اور کتابچوں کے ذریعہ ہندستانیوں کو ان کے تاریخی اثاثے اور شاندار تہذیبی روایات کے سلسلے میں آگاہی عطا کی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے اس تعلیم یافتہ طبقے میں احساس کی ایک نئی لہر دوڑا دی جو برطانوی طرز تعلیم کی بدولت اپنی ہی تہذیب کے بارے میں احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سوامی وویکانند، سری اروبندو اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مسز اینی بسینٹ نے خود قائم کردہ سینٹرل ہندو کالج، بنارس کے ذریعے ہندوستانی نوجوانوں میں مدرسہ ... لگا ... اعا ...

جو ۳۳ کتابوں اور کتابچوں کی مصنفہ تھی۔ دوسروں کے اشتراک سے انھوں نے ۲۵ کتابیں لکھیں جب کہ ۲۱ کتابوں اور ۱۲ رسالوں کی یا تو ایڈیٹر رہیں یا ان کی شروعات کی۔ اس کے علاوہ ۶ جلدوں کا ترجمہ بھی ان کے تصنیفی کارناموں میں شامل ہے۔

سماجی خدمات : ایک نظر میں

۱۶ نومبر ۱۸۹۳ کو ٹوٹی کارن میں اپنی آمد کے بعد اور ۱۹۳۳ میں اپنے انتقال تک انھوں نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے انتھک جد و جہد کی۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بقول ہندوستان

ایک مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ انہوں نے بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں، نصابی کتابوں اور دوسری تحریروں میں تعلیم کے اصولوں کی ترجمانی کی۔ سینٹرل ہندو کالج اور سینٹرل ہندو اسکول کے علاوہ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں لگ بھگ چالیس دوسرے اسکول بھی قائم کیے۔ اس کام میں مس فرینکیسا ارنڈیل (FRANCESSA ARUNDALE) دوروتھی جنارا جاداسا (DOROTHY JINARAJADAS) اور دوسرے کارکن ان کے ساتھ تھے۔

ڈاکٹر اینی بسینٹ کا خیال تھا کہ ہندوستان کی ترقی خواتین کے ذریعے

بھی ممکن ہے۔ اس لیے ایک آزاد اور خودمختار زندگی گزارنے کی آزادی ہونا چاہیئے۔ وہ اس بات میں پختہ یقین رکھتی تھیں کہ ایک عورت ہی بطور ماں بچے کی کردار سازی میں معاون ثابت ہوسکتی ہے اور بطور بیوی، وہ چاہے تو شوہر کو بلندی کی آخری سیڑھی تک پہنچا دے، یا اس کو آسمان سے زمین پر گرا دے۔

بنارس میں طالب علموں کے لیے رامائن اور مہا بھارت پر اور ۱۹۲۵ میں کلکتہ میں تعلیم، مذہب اور فلسفہ اور آرٹ پر دیئے گئے ان کے لیکچروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ اور پُر مغز خیالات کو نوجوانوں تک پہنچانے میں کس قدر ماہر تھیں۔ وہ ایک ماہرِ تعلیم بھی تھیں۔ مادام مان ٹیسری نے ایک بار مانٹیسری طریقۂ تعلیم پر ان کا لیکچر سنا۔ اور ان کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ مضمون پر ان کے مقابلے میں ڈاکٹر اینی بسینٹ کی گرفت زیادہ مضبوط تھی جبکہ مادام مانٹیسری خود اس طریقۂ تعلیم کی موجد تھیں۔

سماجی خدمات کے علاوہ ڈاکٹر اینی بسینٹ نے اپنے دونوں اخبار "دی کامن ویل" اور "دی نیوانڈیا" اور اپنے لیکچروں کے ذریعے ہندوستان کی آزادی کے لیے بھی آواز اٹھائی۔

ان کی قائم کردہ "ہوم رول لیگ" کے بارے میں مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں لوگ "ہوم رول لیگ" کے بارے میں نہ جانتے ہوں۔ جواہر لال نہرو، سی۔پی۔ راماسوامی ائیر وغیرہ اس لیگ کے سیکریٹری رہے۔ درحقیقت یہ پہلی کل ہند تحریکِ آزادی تھی جس میں ہر ہندوستانی کو اس کے پیدائشی حق، سیاسی آزادی کے لیے ابھارا گیا۔ ان کی عرفِ عام کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے برطانوی حکومت حرکت میں آئی اور ان کو بمبئی سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہوں نے اپنی یہ مقبولیت کھو دی۔ یہ وہ دور تھا جب انہوں نے گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کی مخالفت کی تھی۔ اس مخالفت کے پیچھے انکا یہ خیال تھا کہ تشدد ہمیشہ اس جگہ ہی بھڑکتا ہے جہاں عوام الناس کی بھیڑ اکٹھی ہو۔ وہ شخصی ستیہ گرہ میں یقین رکھتی تھیں وہ یہ بھی سوچتی تھیں کہ لوگوں کو قانون توڑنا سکھانا تو بہت آسان ہے لیکن ان کو دوبارہ قانون کے احترام کی تعلیم دینا بہت مشکل ہے۔ وہ خاص طور پر طالب علموں کو سیاست میں ملوث کرنے کے بہت خلاف تھیں۔ آج کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کا یہ خیال بالکل درست محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بسینٹ نے ماضی میں انگلینڈ میں رہ کر جو کام کیا تھا اس سے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کی آزادی کی حمایت کے لیے کافی مدد ملی۔ جن دوستوں اور کارکنوں نے اس سلسلے میں ان کی حمایت کی ان میں لارڈ ہالڈین (LORD HaLDa-NE)، جوزیہ ویج ووڈ (JCdIaH HaIdC) ، فلپ سنوڈن وغیرہ (WEGWOOD) شامل ہیں۔ ۱۹۲۴ میں تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر انہوں نے کامن ویلتھ آف انڈیا بل تیار کیا۔ بعدازاں انہوں نے موتی لال نہرو کی صدارت میں کل پارٹی کانفرنس میں حصہ لیا اور نہرو رپورٹ تیار کرنے میں مدد کی۔ اس کوشش نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کی آزادی کی عوامی تحریک کو مزید تقویت بھی دی۔

ڈاکٹر بسینٹ انسانیت کے فلاح و بہبود میں پختہ یقین رکھتی تھیں وہ ۱۹۰۷ سے ۱۹۳۳ تک تھیوسافی کل سوسائٹی کی صدر رہیں جس کا فلسفہ بنا کسی تفریق کے عالمی بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ ڈاکٹر بسینٹ کی رہنمائی میں اس فلسفے کے ماننے والوں نے انتھک محنت اور لگن سے اس کاز کے لیے کام کیا۔ انہوں نے جس عظیم اور متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ہم سب کے سامنے ہے اور اس عظیم مقصد کے لیے انہوں نے جو جدوجہد کی اس کے عوض ہندوستان ہمیشہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔

●

دلی میں گداگر ہوم

مرکزی انتظام کے علاقے دلی میں فقیروں کی معقول باز آبادکاری کے لیے ۱۲ گداگر ہوم قائم کیے گئے ہیں۔ یہ ہوم بھیک مانگنے کی روک تھام کے بمبئی ایکٹ ۱۹۵۲ء کے تحت شروع کیے گئے ہیں۔ اس ایکٹ کی توسیع دلی کے لیے بھی کر دی گئی ہے۔ گداگر گھروں میں رہنے والوں کو مفت رہائش و کھانے، علاج و معالجے، پیشہ ورانہ تربیت کی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔

●

ڈاکٹر سید شرافت حسین

ہندوستان میں زراعت کی ترقی پر ایک طائرانہ نظر

ھندوستان میں زراعت ملک کی . . فیصدی آبادی کو کفاف مہیا کرتی ہے ۔ خالص قومی پیداوار میں ۳۵ فیصدی حصہ فراہم کرتی ہے اور ملک کی کل برآمداتی قدر مبادلہ کے خاطر خواہ حصہ کے لیے ذمہ دار ہے مختلف اقسام کی مٹی، جداگانہ موسمیاتی آب وہوا، اور ایک بڑے زمینی رقبہ کے زراعت کے قابل ہونے کے باعث ہندوستان ایک ایسی منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ یہاں تقریباً تمام ممکنہ فصلیں نمو پاتی ہیں ۔ چنانچہ ہندوستان میں اناج، اجناس، دالیں، تلہن کے بیج، مشروبی اشیاء، پھل، ترکاریاں، باغانی اشیاء، پودوں کے ریشے، غیر زرعی زمرہ کے لیے اُجرتی اشیاء ونیز صنعت کے ایک بڑے شعبہ کے لیے خام مال پر مشتمل زرعی فصلیں پیدا کی جاتی ہیں ۔ لہٰذا آزادی کے بعد سے ہی ہندوستانی زرعی زمرہ میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی غرض سے طے کردہ سرگرمیاں جاری رہی ہیں ۔ برطانوی حکومت کے دور سے رائج کردہ زمیندارانہ نظام ختم کرکے بیشتر معاملات میں کاشت کاروں کو زمین پر استمراری مالکانہ حقوق تفویض کیے گئے، جس کے باعث

زمین کی ملکیت غیر حاضر زمیندار کے ہاتھ سے کاشت کاری طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچی، آراضی کی حد بندی کا نفاذ ہوا، زرعی زمین کی انتشار اراضی پر ضبط لگایا گیا ونیز آ ا . . . کر بستہ و مستحکم کیا گیا۔

مسلسل پنجسالہ

اصلاحات کے مساعی ـ

جدید کاری کو ستدید ق ـ

۱۹۵۱ء میں اناج کے بڑـ

اور افزاری دباؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے پنجسالہ منصوبہ (۱۹۵۱ء ـ ۵۶) نے زرعی زمرہ کو مرتفع افضلیت عطا کی ۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ (۱۹۶۱ء ـ ۶۶) کا فوری مدعا ملک میں اناج کی پیداوار میں خود کفیلی اور زرعی پیداوار میں فروغ حاصل کرنا طے کیا گیا، تاکہ صنعت اور برآمدات کے تقاضے پورے ہو سکیں ۔ چوتھے پنجسالہ منصوبہ (۱۹۶۹ء ـ ۷۴) کا نشانہ زرعی فروغ کی رفتار میں سرعت پیدا کرنا نیز زرعی پیداوار میں تلوّن کو ضبط کرنا مقرر کیا گیا ۔ چھٹے پنجسالہ منصوبہ (۱۹۸۰ء ـ ۸۵) نے زراعت اور صنعت کے ہمہ وقت نمو کی حکمت عملی کو اختیار کیا ۔ چنانچہ سازگار موسمی حالات کی بناء پر، مختلف خصوصی پروگراموں پر عمل آوری کے سبب

سے، اور گورمنٹ ونیز کاشت کاروں کی متفقہ سرگرمیوں کے باعث ساتویں پنجسالہ منصوبہ (۱۹۸۵ء ـ ۹۰) کے دوران اناج کی پیداوار

. . .

دیہی زمروں کی جانب رجوع کیا جائے، کو حقیقی بنانے سے متعلق ایک ہدایت نامہ جاری کیا ہے

ملک کے شمال میں گنگا سندھ کے میدانی علاقہ کی ونیز جنوبی جزیرہ نما میں دریائی مثلث کی سیلابی مٹی زیادہ تر اناج اور اجناس کی کاشت کاری کے لیے موزوں ترین ہے، جب کہ جنوبی چٹان کے علاقہ کی خصوصی کالی مٹی کپاس کی کاشت کے لیے معیاری ہے ہندوستان میں کاشت کارانہ عمل مانسون کی آمد کے ساتھ خریف کی فصل سے شروع ہوتا ہے ۔ خریف کی فصلوں میں دھان، جوار، مکا، جوٹ اور کپاس شامل ہیں، کہ جو خزاں کے آخری زمانہ میں کاٹی جاتی ہیں ربیع کی فصلوں میں گیہوں، چنا، جَو، سرسوں اور رائی بارش کے بعد خزاں کے موسم، کہ جب ربیع

ہیڈ آف دی اکونامکس ڈپارٹمنٹ، جواہر لعل نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج ۔ بارہ بنکی (اتر پردیش)

کی فصل کی شروعات ہوتی ہے، میں بوئی جاتی ہیں۔ اور موسم بہار کے آخری ایام میں کاٹی جاتی ہیں۔ دنیا کی قابل کاشت زمین کے محض ۲۵ فیصدی رقبہ کے ساتھ مگر دنیا کی کل آبادی کے ۱۵ فیصدی کی پرورش کے لیے ہندوستان نے اپنے خالص زیر کاشت رقبہ کو ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۴۱٫۸ فیصدی سے اضافہ کر کے ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۴۶٫۱ فیصدی کرنے کے تئیں طے کردہ جدوجہد کی اسی مدت کے دوران کل زیر فصل رقبہ ۴۶٫۴ فی صدی سے بڑھا کر ۵۰٫۸ فی صدی اور جنگلات کے تحت ۱۴٫۲ فی صدی سے ۲۲٫۱ فی صدی کر لیا گیا۔ بہر نوع فصلوں کے اجمالی طرز سے عیاں، کل زیر فصل رقبہ کے اعتبار سے غیر اجناس کے مقابلہ میں اجناس کے زیادہ اہم ہونے کے باوجود، ان کا نسبتی حصہ ۱۹۵۱ء میں ۷۶٫۷ فی صدی سے کم ہو کر ۱۹۸۶-۸۷ء میں محض ۷۲٫۳ فی صدی رہ گیا۔

مرتفع زرعی پیداوار کے لیے بیج ایک اساسی فاضل درآیدہ ہے۔ قومی بیج کارپوریشن (این ایس سی) اور ہندوستان کے ریاستی فارم کارپوریشن (ایس ایف سی آئی) نے مختلف فصلوں کے مصدقہ بیجوں کی پیداوار اور تقسیم کی ہمت افزائی کی ہے۔ افزائشی بیجوں کی پیداوار سے ایک انضباطی طریق کار کے ذریعہ بہتر ماہیت کے بیج کی نشو و نما کی جاتی ہے، جنھیں، اجناس، دالوں، تلہن کے بیجوں، ریشوں کی فصلوں، وغیرہ کی پیداوار کے لیے تاسیسی بیجوں میں اور تجارتی فصلیں پیدا کرنے کی غرض سے مصدقہ بیجوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس جہت پر ملک میں تقریباً سب ہی فصلوں کے لیے اور خصوصاً اناج و اجناس کے لیے زیادہ پیداآور بیجوں کی تخلیق و تقسیم میں اضافہ کر کے زرعی پیداآوری میں فروغ دینے کی کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔

یوحنا، نئی دہلی

کیمیاوی کھاد ایک اور لازمی درآیدہ ہے کہ اکیلے جس کی تطبیق سے ہی زرعی پیداوار کو ۵۰ فی صدی کی حد تک فروغ دیا جا سکتا ہے چنانچہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۶۹ ہزار ٹن کے مقوی کے مساوی سے بڑھ کر ۱۹۸۹-۹۰ء میں کیمیاوی کھادوں کا استعمال تخمیناً ۱۱۵٫۶۸، لاکھ ٹن تک فروغ پا گیا۔ کیمیاوی کھادوں کی ماہیت، ان کی قیمتوں و نیز ان کی تجارت پر انضباط رکھا جاتا ہے تاکہ کاشت کاروں کو اعلیٰ ترین کیمیاوی کھادیں مناسب قیمتوں پر اور صحیح وقت پر دستیاب ہو سکیں۔ ۱۹۶۷-۶۸ء کے 'پہلے سبز انقلاب'، کی اساس دراصل بین الاقوامی چاول کی تحقیق کے ادارہ کے ذریعہ افشا نئے اور زیادہ پیداآور میکسیکن گیہوں اور پستہ قد چاول کے پودوں کی اقسام اور کیمیاوی کھادوں کے استعمال پر ہی تھی، کہ جنھیں پنجاب، ہریانہ اور مغربی اترپردیش میں بڑے پیمانہ پر رائج کیا گیا تھا۔ اس انقلاب کے بعد کی مدت، یعنی ۱۹۶۷-۶۸ء لغایۃ ۱۹۸۸-۸۹ء، کے دوران زرعی پیداوار کی شرح نمو تقریباً ۲٫۶۴ فی صدی سالانہ ظاہر کی گئی ہے، جو انھیں مساعی کی رہین منت ہے۔

۱۹۸۳-۸۴ء میں اناج کی کل ۱۵۲٫۴ ملین ٹن کی انتہائی پیداوار، ہندوستان کے لیے ایک دیگر کامرانی تھی۔ اس ضمن میں یہ امر خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ متذکرہ دور میں، کہ جو 'دوسرے سبز انقلاب'، کے نام سے موسوم ہوا، پیداوار میں اتنا زبردست اضافہ محض کاشت کاروں تک درآیدے اور خدمات کی توسیع و نیز بہتر تنظیم کا ہی نتیجہ تھا۔ کاشت کاروں کے لیے زیادہ پیدا آور بیجوں، کیمیاوی کھادوں اور کیڑے مار دواؤں کی ضروری مقدار میں اور بر وقت دستیابی کے ساتھ ساتھ ادارہ جاتی قرضوں کی فراہمی کو بھی یقینی بنایا گیا۔ ان تمام اقدامات کے سبب سے ہی ملک کی مشرقی اور وسطی ریاستوں، بشمول بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور اترپردیش میں، کہ جہاں سابق میں یہ نسبتی طور پر سست رو تھی، شرح نمو میں شدت سے اضافہ ظہور پذیر ہو سکا۔ ملک میں اناج کی پیداوار میں فروغ حاصل کرنے کی غرض سے زرعی ترقی کی مہم کی روح اکبر کی حیثیت سے ۱۹۶۶-۶۰ء سے زیادہ پیداآور بیجوں اور کیمیاوی کھادوں کی متواتر فراہمی کا آغاز کیا گیا تھا۔

جب کہ ملک میں ایک جانب گورنمنٹ نے اپنے تحقیقی اداروں میں مناسب ٹکنالوجی منکشف کی اور کاشت کاروں کو رعایتی درروں پر دقیقہ رس درآیدے فراہم کئے نیز ان سے منافع بخش قیمتوں پر ان کی فصلیں خریدنے کی پیش کش کی، تو دوسری جانب صنعت نے کیمیاوی کھاد اور پودوں نیز فصلوں کے تحفظ کے لیے کیڑے مار دواؤں، وغیرہ کی پیداوار اور فراہمی کو یقینی بنا کر زرعی ترقی و فروغ میں تیز روی و دلیسپ کی۔ کیمیاوی کھادوں کے صرفہ کے اعتبار سے ہندوستان، امریکہ، سوویت روس اور چین کے بعد، چوتھے نمبر پر آتا ہے۔

چنانچہ ۱۹۵۰ء کے عشرہ کے اوائل میں ملک میں اناج کی فی کس دستیابی ۳۹۵ گرام کے مقابلہ میں بڑھ کر ۱۹۸۹ء میں ۴۹۶ گرام ہو گئی، اور اناج کی پیداوار ۱۹۴۹-۵۰ء میں ۵۴۹٫۲ لاکھ ٹن سے خاطر خواہ متزائد ہو کر ۱۹۸۹-۹۰ء میں ۱۷۰۶٫۳، لاکھ ٹن ہو گئی۔ آزادی سے قبل کے زمانہ سے اب تک زراعتی زمرہ میں پیداواریت دوگنی ہو چکی ہے، جس کے باعث اب ملک میں گیہوں کی پیداوار سات گنی اور چاول کی تین گنی ہوتی ہے۔ کاشت کاروں کے لیے ان کی زرعی پیداوار کی منافع بخش قیمتوں کا وقفہ وار/ سالانہ تعین کرنا اور اس کی پبلک نظام تقسیم کے ذریعہ مناسب قیمتوں پر صارفین میں تسویق کرنا بھی گورنمنٹ کی

موجودہ زرعی پالیسی کے اہم عنصر ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ کاشت کاروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے اور ساتھ ہی ساتھ ان ضروری اشیاء کی قیمتوں میں افزونی کی تاکید کے لیے ان دونوں قیمتوں میں فرق کو گورنمنٹ اعانت کے طور پر خود برداشت کرتی ہے۔

دودھ اور مویشیوں سے ماخوذ پیداوار، زراعتی سرگرمیوں میں ایک ضمنی کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ افزائش مویشیان دیہی ترقی، مشمول زرعی فروغ، کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے، ہندوستان میں مسلمہ حارّہ کے ۲۶ نسلوں کے مویشی اور بھینسوں کی سین ۱۱ قوامی معیار کی ۲ نسلیں پائی جاتی ہیں۔ مختلف دیسی اور بدیسی نسلوں کی گائیں اور بکریاں نیز بھیڑیں بھی خاصی زیادہ تعداد میں پرورش ہوتی ہیں۔ دودھ اور مویشیوں سے حاصل دیگر پیداوار دیہی آبادی کے لیے فاضل آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ لہٰذا ۱۹۷۰ء میں مویشیوں کے فروغ کا ایک مربوط پروگرام آپریشن فلڈ کے نام سے شروع کیا گیا، جس کا پہلا مرحلہ ۱۹۷۰ء لغایۃ ۱۹۸۱ء کے درمیان جاری تھا۔ اس پروگرام کی مدد سے مویشیوں کی امداد باہمی انجمنوں کے تحت دودھ سے بنی اشیاء کی فروختگی کا عمل شروع ہوا۔ ملک کی مشہور "آنند ڈیری"، کے طرز پر اس کام کو وسعت دی گئی۔ ملک کے ۲۷ "ملک شیڈوں" کو ایک دوسرے سے مربوط کیا گیا، اور تسویق کے نظام کو منضبط کیا گیا۔ آپریشن فلڈ کا دوسرا مرحلہ ۱۹۸۱ء لغایۃ ۱۹۸۵ء کے درمیان رہا، جس کے دوران ملک گیر پیمانہ پر ۳۴۵۰۰ سے زائد امداد باہمی انجمنیں ۱۳۶ "ملک شیڈوں" کے تحت مربوط کی گئیں، اور ۳۶ لاکھ کاشت کار اس کے ممبر بنائے گئے۔ آپریشن فلڈ کا تیسرا مرحلہ ۱۹۸۵ء میں شروع کیا گیا۔ اس مرحلہ کے لیے ۶۸۱ کروڑ روپے کے مصارف مختص کئے گئے۔ اس مرحلہ کے دوران دودھ کی حصولی کے کام کو توسیع دی گئی نیز دودھ سے بنی اشیاء کی درجہ بندی اور فروختگی کو تیز روی عطا کی گئی۔ اس مرحلہ کی مختلف اسکیموں پر عمل آوری کے لیے عالمی بنک اور یورپ کی اقتصادی برادری نے ۳۶ کروڑ ڈالر کے بقدر امداد نیز یورپ کی اقتصادی برادری نے ۷۵ ہزار میٹرک ٹن ملائی اُترا پاؤڈر اور ۲۵ ہزار میٹرک ٹن مکھنی تیل بطور عطیہ دیا ہے۔ قومی مویشیان فروغ (این ڈی ڈی) بورڈ نے اس پروجیکٹ کے جملہ مصارف برداشت کئے ہیں۔ چنانچہ ۷۶-۱۹۷۵ء میں دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء کی درآمدات پر ضبط لگا دیئے جانے کے بعد سے ملک میں مکھن، پنیر، شیر خوار بچوں کے لیے ملک فوڈ، ملک پاؤڈر نیز ملک فوڈ کے شعبہ کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

باغاتی پیداوار [illegible]
دنیا کا متواتر سب سے [illegible]
مصارف اور برآمد کار رہا [illegible]
کی سطح پر چائے کی پیداوار [illegible]

کے علاوہ، چائے کی کاشت کے رقبہ اور اس کی فی ہیکٹیر پیداوار میں فروغ لانے کی مسلسل مساعی کے سبب سے بھی اس کی سالانہ پیداوار میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں چائے کی کاشت کا کل رقبہ ۳.۱۴ لاکھ ہیکٹیر تھا اور سالانہ پیداوار ۲۶.۵ کروڑ کیلوگرام تھی، لیکن اب اس کی کاشت ۴.۱۶ لاکھ ہیکٹیر زمین پر کی جاتی ہے اور ۸۹-۱۹۸۸ء میں اس کی سالانہ پیداوار بڑھ کر ۷۰.۲۸ کروڑ کیلوگرام ہوئی تھی، جب کہ ۷۶-۱۹۷۵ء میں سالانہ پیداوار محض ۴۸ کروڑ کیلوگرام ہوئی تھی۔ اس دوران چائے کی فی ہیکٹیر پیداوار بہت بھی بڑھ کر ۱۶۸۷ کیلوگرام سے ۱۱۰۰ کیلوگرام ہوگئی ہے۔ دنیا میں قہوہ کی کل پیداوار کا ۳ فی صدی اور برآمدات کا ۱۴۱۱ سے ۱۶۶۱ فی صدی ہندوستان فراہم کرتا ہے۔ فی الوقت ملک میں قہوہ کی کل پیداوار ۱۹ کروڑ کیلوگرام سالانہ سے بھی متجاوز ہے۔ دیگر باغاتی فصلوں میں ربڑ، مصالحہ جات اور تمباکو ہیں۔ جب کہ منصوبہ بند معاشی ترقی کی ابتدا میں ربڑ کی کاشت ۸۰۵ ہزار ہیکٹیر زمین پر ہوتی تھی، اب یہ رقبہ بڑھ کر ۲۶۸ ہزار ہیکٹیر ہوگیا ہے اور اس دوران ربڑ کی سالانہ پیداوار بھی ۱۴ سے بڑھ کر ۲۵ کروڑ کیلوگرام ہوگئی ہے۔ مصالحہ جات کی پیداوار میں بھی تقریباً دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ فی الوقت مصالحہ جات کی سالانہ پیداوار ۲۰ لاکھ ٹن ہوتی ہے اور اس اعتبار سے دنیا میں ہندوستان مصالحہ جات کا سب سے بڑا پیداکار نیز برآمدکار ہے۔ غیر مصنوع تمباکو کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان دنیا میں تیسرا اور [illegible]

ہندوستان میں ماہی گیری کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ہمالیائی سلسلۂ کوہ کے دامن میں ٹھنڈے پانی کے وسیلوں سے لے کر استوائی خطّوں تک اس کے امکانات بہم ہیں۔ تالاب، پوکھر، بہت سی ندیوں کا جال اور وسیع ساحل سمندر نیز ملک کا خالص اقتصادی حلقہ، یہ سب وہ مقامات ہیں جہاں ماہی گیری کے لیے زرد وسعت مواقع ہیں۔ ہندوستان میں آبی جانوروں کی مختلف اقسام اور حیاتیاتی پیداواری صلاحیت سے ماہی گیری کی توسیع کے امکانات روشن سے روشن تر ہیں۔ مچھلی صحت کے لیے تغذیہ بخش خوراک ہے۔ اس میں ۱۶ تا ۲۰ فی صدی لحمیہ (پروٹین) ہوتا ہے۔ اس میں وٹامن اور معدنیات بھی ہوتے ہیں۔ اس کے ایک کیلوگرام گوشت سے ۶۰۰ تا ۷۰۰

کیلوری تغذیہ دستیاب ہوتا ہے۔ اس کی صلاحیت افزائش بھی بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک کیلوگرام مچھلیوں سے ایک لاکھ انڈے ملتے ہیں۔ اور ہر انڈہ میں ایک سال میں ایک کیلوگرام مچھلی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ بارآوری کسی بھی دیگر غذا میں نہیں ہے۔ اس کو ایک لیٹر پانی کی ضرورت ہے کہ وہ اس میں پرورش پا سکے، لیکن مچھلی پانی کو زیادہ پیداواری صلاحیت بھی عطا کرتی ہے اور یہ پانی زراعت کے لیے بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔

ملک میں لحمیہ کی فراہمی کے لیے مچھلی کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ زیر آب رقبہ میں مچھلیوں کی پرورش کے پروگرام نے زبردست وقعت حاصل کرلی ہے۔ اس کے لیے رقبہ کو وسعت دی جارہی ہے درآنحالیکہ ہندوستان میں ماہی گیری کی تاریخ ۱۹۲۷ء سے ایک نیا موڑ لے چکی ہے، اور آبی جانوروں کی پرورش کے نظام اور اس کی اہمیت کو سمجھ لیا گیا تھا، تاہم یہ کام بس برائے نام تھا البتہ گذشتہ ۴۰ برسوں میں ہندوستان نے بہت سے پروگرام شروع کیے، جن سے ماہی گیری کو فروغ ملا ہے۔ ہندوستان میں زرعی تحقیق کی کونسل نے نئی ٹکنالوجی کے ذریعہ مویشی پروری اور ماہی گیری کو نئی نئی سمتیں عطا کیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد مرکزی اندرونِ ملک ماہی گیری کے تحقیقی ادارے نے مختلف ساحلی علاقوں میں آبی جانوروں، بالخصوص مچھلیوں کی پرورش کے لیے مختلف پروگرام بہ یک وقت شروع کیے مچھلی پکڑنے کے لیے تکنیکی اصلاحات روبہ عمل لائی گئی ہیں۔ گہرے سمندر سے مچھلی نکالنے کے وسیع امکانات ہیں۔ جدید قسم کی مشینی کشتیوں کے ذریعہ اب ۲۰۰ میٹر کی گہرائی پر مچھلی پکڑی جا سکتی ہیں۔ سمندروں سے مچھلی پکڑنے

یوجنا، نئی دہلی

کا اوسط ۵۶-۱۹۵۱ء کے دوران ۵ء۶۵ لاکھ ٹن تھا، جو ۸۵-۱۹۸۱ء کے دوران بڑھ کر ۱۵ء۲۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گیا۔ مچھلیوں کے لیے چارہ پیدا کرنے اور دیگر مختلف طریقوں سے مچھلی کی پیداوار بڑھانے کی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ملک میں خالص اقتصادی خطّہ کے اعلان نے ماہی گیری کے وسائل کا نظم و نسق ۲۰ء۲۰ لاکھ مربع کیلومیٹر تک وسعت دی ہے، جس میں ۵ء۴ لاکھ مربع کیلومیٹر کا براعظمی شیلف کا وہ رقبہ بھی شامل ہے جو پیداوار کے لحاظ سے نہایت امید افزا ہے۔ لیکن ماہی گیری کی سرگرمیاں فی الوقت اس خطّہ کے ۱۲ فی صدی حصّہ تک ہی محدود ہیں۔ اس خطّہ سے ۵ء۴۴ لاکھ ٹن مچھلی حاصل کی جارہی ہے ماہی گیری کی کفالت فروغ کی سمت کامیابی کے لیے گورنمنٹ نے ماہی گیروں اور ماہی گیری کی صنعت کو اندرونِ ملک، ساحل سمندر پر، اور گہرے سمندری خطّہ میں ماہی گیری کی سرگرمیوں کو ہر قسم کی امداد فراہم کرنے کی حکمت عملی پر عمل کیا ہے۔

چائے اور قہوہ کو چھوڑ کر ۹۰-۱۹۸۹ء میں ملک کی زراعتی پیداوار کی برآمدات سے ۲,۶۳۰ کروڑ روپے کی حاصل آمدنی، ۹۱-۱۹۹۰ء میں بڑھ کر ۳۰۰۰ کروڑ روپے کے بقدر ہوگئی۔ ۹۱-۱۹۹۰ء کی اپریل لغایتہ ستمبر کی مدّت کے دوران ہندوستان کی کُل برآمدات ۱۵۰۹ء۷ کروڑ روپے کے بقدر ہوئی جب کہ سال گذشتہ اسی مدّت کے دوران یہ محض ۱۲۳۱ء۱۲ کروڑ روپے کی مالیت کے تھے۔ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے، غذا اور زراعت کے تنظیم، نے ابھی حال میں یہ پیش گوئی کی ہے کہ روپے کی زرمبادلہ کی شرح میں حالیہ تعریف کے زیر اثر ہندوستان سے چاول کے برآمدات میں مزید اضافہ کا رجحان ظہور پذیر ہوگا، حالانکہ مقامی روپے میں چاول کی سابقہ کمترین قیمت کو منجمد رکھا گیا ہے۔ دیگر زرعی پیداوار میں کپاس کی برآمد ۹۰-۱۹۸۹ء میں محض ۸۰ کروڑ روپے سے دس گنا فروغ پاکر ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۷۵۳ کروڑ روپے کے بقدر ہوگئی۔ مچھلی اور مچھلیوں سے تیار شدہ اشیاء کی برآمدات میں بہ مقابلہ ۸۹-۱۹۸۸ء، ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۸ء۶ فی صدی کا اضافہ ہوا، لیکن ۹۰-۱۹۸۹ء کی اپریل لغایتہ ستمبر کی مدّت کے مقابلہ میں ۹۱-۱۹۹۰ء کی اسی مدت کے دوران اضافہ کی در بڑھ کر ۳۱ء۱ فی صدی ہوگئی ہے۔

حالیہ جامع معاشی اصلاحات کی بنا پر، چائے، قہوہ نیز مصالحہ جات کی پیداوار میں غیر معمولی اور وافر اضافے کا تخمینہ باغاتی صنعت کی برآمدات میں گرم بازاری کی بازگشت ہے۔ درحقیقت تاخیریں تعریف اور مشترک کمپنیوں میں ۵۱ فی صدی بیرونی حصص (اکیوٹی) کی شرکت کی اجازت، جیسے اصلاحات بیرونی تجارتی کمپنیوں کے ساتھ بہتر تعاون کے میلان کو وسعت دیں گے۔

۹۱-۱۹۹۰ء میں ہندوستان نے ۴۵ء۱۰ کروڑ روپے کے بقدر چائے کی برآمد کی اور بین الاقوامی سیلام میں دارجلنگ چائے کے لیے ۶۰۱۰ روپے فی کیلوگرام کی جو قیمت وصول ہوئی ہے، شاید دنیا کے کسی بھی دیگر ملک کی پیدا کی گئی چائے کی قیمت سے زیادہ ہے قہوہ پیدا کرنے والے ملکوں کے لیے قہوہ کی برآمد کا کوئی بین الاقوامی کوٹہ مقرر نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ہندوستان نے ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۳۵۹ کروڑ روپے کے بقدر ۱۷۲ء۳۰ ٹن قہوہ برآمد کیا۔ خلیجی جنگ کے سبب پیدا جہازرانی اور بیمہ کی دقتوں کے باعث ۹۱-۱۹۹۰ء میں مصالحہ جات کے برآمدات میں تقریباً ۳۰ کروڑ روپے کے بقدر جو تحدید پیدا ہوگئی تھی،

۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ان کی برآمدات کو بڑھ کر ۳۰۰ کروڑ روپے کے بقدر ہونے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ ملک میں فی الوقت کیڑے مار دواؤں کی سالانہ فروختگی تقریباً ۱۲ کروڑ روپے کے بقدر ہے اور اُس کی کل سالانہ پیداوار ۸۰ ہزار ٹن ہوتی ہے۔ ملک اس کی پیداوار میں نہ صرف خود کفیل ہے، بلکہ خاطر خواہ مقدار میں اس کی برآمد بھی کرتا ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں ہندوستان نے کل ۲۳۲ کروڑ روپے کی مالیت کی کیڑے مار دوائیں برآمد کیں۔ چوں کہ ان دواؤں کی برآمدات میں ۳۰ فی صدی سالانہ کا اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے اندازہ ہے کہ اگلے تین سال میں کیڑے مار دواؤں کی کُل برآمد اس وقت کے مقابلہ میں دوگنی ہو جائے گی۔ ملک کی کُل درآمداتی بل میں کیمیاوی کھادوں کا حصہ تقریباً ۵ فی صدی ہے۔ ان کی قیمتوں کی تعقیل کر کے اندرون ملک کیمیاوی کھادوں کی پیداوار میں اضافہ کر ان کے درآمد کے تناسب کو کم کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام تر امید افزا حالات کے باوجود ہندوستان اپنے زراعتی زمرہ کی ترقی و فروغ کے لیے اپنے بے حساب قدرتی وسائل کے مناسب ترین استعمال کرنے میں اب بھی منزل سے بہت دور ہے۔ چنانچہ زراعتی زمرہ کے مختلف حصوں میں پیداواریت کی پستی کمی پر موجودہ احتمالی وسائل کی روشنی میں غور کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ ملک کے بہت سے حصوں میں متواتر کاشت کاری کئے جانے کے باعث مٹی کی زرخیزی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ انتشار آراضی نیز جوت کی تقطیع نے بھی پیداواریت میں خاطر خواہ کمی کی ہے۔ کاشت کاری عمل اور دیگر دیہی اعمال میں استعمال کئے جانے والے اوزار و آلات قدیم وضع کے ہیں۔ عمومی طور پر بیج کمتر ماہیئت کے ہوتے ہیں۔ اور جدید کیمیاوی کھادوں کا استعمال بھی زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ سائنٹی فک زاویۂ نظر کی کمی کے ساتھ ساتھ فارم کے انتظام میں بدسلیقگی بھی ملکی زراعت کے احتمالی فروغ میں مانع ہوتی ہے۔ ملک کی تقریباً ۹۹۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین، یعنی ۱۴۱۰۶ لاکھ ہیکٹیئر خالص زیر کاشت رقبہ کا ۷۰ فی صدی، بارانی ہے۔ چنانچہ ایسے علاقوں میں پیدا کی گئی فصلیں اور مروّج فصل حاتی معمول، مکمل طور پر بارش پر ہی منحصر رہتے ہیں، جب کہ بارش اکثر متلون اور ناقابل پیش گوئی ہوتی ہے۔ مختلف زراعتی پیداوار کو بہ حفاظت ذخیرہ کرنے کی غرض سے، محض ضروری گودامی صلاحیت مفقود ہونے کی بنا پر ہی تقریباً ۳۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کی زرعی پیداوار کا سالانہ نقصان ہوتا ہے مزید برآں زمین اور آبی وسائل کے تحفظ او [illegible]
استعمال کے تئیں بھی کا [illegible]
اُن تمام علاقوں میں [illegible]
ہوتی ہے اور جہاں آ [illegible]
مہیا نہیں ہیں، نے بار [illegible]
پٹی دار (ناؤ بڑ نگ) [illegible]
اکا ٹور پلاؤ نگ) کی توسیع اور مروّج کیا جائے تو زرعی پیداوار میں مزید خاطر خواہ فروغ ممکن ہو سکتا ہے۔

●

بقیہ، الائچی : ایک خوشبودار دوا

ہو گا۔

جسمانی و دماغی کمزوری

الائچی چھوٹی بادام، جائفل، جاوتری برابر مقدار میں لے کر سفوف بنا لیں۔ اب جتنا سفوف تیار ہو اس کے برابر مصری ملالیں۔ نصف چمچہ کی مقدار میں اس سفوف کو دودھ کے ساتھ صبح و شام استعمال کرنے سے ہر طرح کی کمزوری دور ہو جائے گی۔

پیچش

اس مرض میں ۲۵ گرام الائچی کو ۱۰ گرام سینڈھا نمک کے ساتھ پیس کوٹ کر سفوف بنا لیں۔ آدھا چمچہ کی مقدار میں پانی کے ساتھ دن میں دو تین بار استعمال کرائیں۔

متلی قئے

اگر متلی کی شکایت ہو یا قئے ہو رہی ہو تو الائچی، پودینہ اور پیپل ایک ساتھ برابر مقدار میں لے کر سفوف کر لیں نصف چمچہ کی مقدار کو پانی کے ساتھ دو تین بار استعمال کرائیں۔

اگر کھانسی کے ساتھ بلغم آتا ہو تو الائچی چھوٹی اور سونٹھ برابر مقدار میں کوٹ پیس کر سفوف بنا لیں اور اس کا ½ چمچہ شہد کے ساتھ دو تین بار چٹا دیں۔

زکام اور سردی

الائچی چھوٹی، کالی مرچ (گول مرچ)، دار چینی، سونٹھ، دھنیا برابر مقدار میں لے کر موٹا کوٹ لیں۔ اس سفوف کے دو چمچ کے مقدار کو ۲۵۰ گرام پانی میں ڈال کر ابالیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو اتار کے چھان لیں اور نیم گرم استعمال کرائیں۔ زکام کے لیے مجرّب نسخہ ہے۔

●

ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ لاہری

اصلاحاتِ اراضی سے حاصل شدہ فوائد کی برقراری کا مسئلہ

ہندوستان کی ۸۰ فی صد سے زائد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ ان دیہی علاقوں کی آراضی ایک اہم اثاثہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس اثاثہ سے زیادہ سے زیادہ کاشت کاروں کو فائدہ پہنچانا، سماجی انصاف پیدا کرنا اور زرعی پیداوار میں اضافہ کے مقصد سے اصلاح آراضی کا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

کاشت کاروں اور لگان داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے وقتاً فوقتاً قوانین وضع کئے جا رہے ہیں۔ یہ قوانین برطانوی دور حکومت میں بھی تھے۔ معنی خیز آراضی اصلاحات پروگرام ہماری آزادی کی قومی تحریک کا ایک جز رہا ہے۔ موجودہ دور کی ہمہ گیر آراضی اصلاح پالیسی کی ترویج کانگریس زرعی اصلاح کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہے۔ یہ کمیٹی دسمبر ۱۹۴۷ء میں جے۔ سی۔ کمارپا کی نگرانی میں قائم کی گئی تھی۔ اس پالیسی کے چند اہم نکات اس طرح ہیں:

الف۔ لگان داروں اور حکومت میں براہ راست تعلق پیدا کرکے ثالثوں کو ختم کرنا

ب۔ لگان اصلاحات نافذ کرنا تاکہ اصل کاشت کاروں کو بے دخلی کے خلاف تحفظ فراہم کیا جا سکے۔

ج۔ زرعی اثاثہ کی حد پر پابندی عائد کرکے آراضی کی تقسیم نو کرنا۔

د۔ زرعی اثاثہ (زمین کے پارچہ جات) کو یک جا کرنا۔

س۔ ریکارڈ کی تکمیل کرنا۔

مندرجہ بالا پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو یعنی حد بندی قانون کے نفاذ کے بعد کی جانے والی تقسیم نو کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

۱۹۷۲ء کے قومی رہنما اصولوں پر مبنی حد بندی قوانین کو شمال مشرقی ریاستوں اور گوا کو چھوڑ کر تمام ریاستوں نے نافذ کر لیا۔ اس قانون کے نفاذ کے تحت ۷۲،۲ لاکھ ایکڑ آراضی فاضل قرار دی گئی۔ لیکن اس آراضی میں پہلے مارچ ۱۹۹۰ء تک صرف ۴۶،۵ لاکھ ایکڑ آراضی کی ہی دوبارہ تقسیم ہو سکی باقی ۲۵،۷ لاکھ ایکڑ زمین اب بھی فاضل پڑی ہے۔

اس غیر اطمینان بخش کارکردگی کے برعکس اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا آراضی اصلاح پروگرام دنیا کے چند بڑے آراضی اصلاح پروگراموں میں سے ایک ہے۔ اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ سماج واد نظام کے برعکس ان کا نفاذ آراضی کے کھلے بازار میں کیا جا رہا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے تہ دار لگان داری نظام جیسا کوئی دوسرا نظام دنیا میں نہیں ہے اس کے علاوہ دیگر مشکلات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر:

الف۔ جمہوریت میں جہاں اعتراضات پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ اعتراض کیا گیا صرف زرعی آراضی کی حد پر ہی پابندی کیوں عائد کی جائے جب کہ آمدنی پر یا دیگر اقتصادی شعبوں میں اثاثہ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ دستیاب آراضی تو کم و بیش مقرر ہے۔ اس میں بڑھوتری ممکن نہیں۔ اس ہی وجہ سے اس کی قلت ہے اور اس قلت سے نمٹنے کے لیے راشن کی ضرورت ہے جب کہ باقی اثاثوں میں ضرورت کے مطابق بڑھوتری کی جا سکتی ہے۔

ب۔ ہندوستان کے وفاقی نظام میں کچھ ریاستوں نے وضع قانون کے لیے ضرورت سے زیادہ وقت لیا۔ مثال کے طور پر اترپردیش میں اس سلسلے میں پہلی قرارداد پیش کرنے اور اس کو قانونی شکل دینے میں ساڑھے چار برس کا عرصہ لگا۔

عمر جانے کی قلیل شرح:

جائز حد سے زائد آراضی کو پہلے سے

طے شدہ شرح کے مطابق قیمت برداشت
برداشت کرنا پڑتا تھا اور یہ شرح کھلے بازار میں
اس وقت کی شرح سے کہیں کم ہوتی تھی۔
اُتر پردیش میں یہ قیمت دس برس کے کرایہ
کے برابر اور حیدرآباد میں آٹھ برس کے کرایہ
کے برابر تھی۔ دیگر پہلوؤں کے علاوہ ایک
یہ پہلو بھی ہے جس کی وجہ سے زمین داروں نے
طویل قانونی چارہ جوئی کے ذریعے آراضی کے
اس حد بندی قانون کے نفاذ میں رخنہ ڈالنے
کی کوشش کی۔

ان مشکلات کے پیش نظر آراضی کی تقسیم نو کے لیے
ریاستوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیے۔ فاضل قرار دی
گئی آراضی اور دوبارہ تقسیم کی گئی آراضی میں فرق ہے۔ قومی
مجموعی شرح ۸۲ء۴۳ فی صد ہے لیکن ہریانہ، پنجاب، اڑیسہ
تمل ناڈو میں شرح کہیں زیادہ ہے جب کہ
بہار، کیرالا، اور مدھیہ پردیش میں شرح مجموعی
قومی شرح سے کہیں کم ہے۔

اگرچہ تقسیم نو کے باقاعدہ عمل کے
بعد بھی زیر کاشت زمین کا تقریباً ۳۰ فیصد
حصہ اب بھی زبانی یا دیگر طرح کی بے قاعدہ
پٹہ داری میں گھرا ہے۔ اس امر کا انکشاف وزیر
منصوبہ بندی نے ۲۰ جون ۱۹۹۰ کو آراضی
اصلاحات پر منعقدہ ایک سیمینار میں کیا۔

اس پس منظر میں حد بندی قانون کے
نفاذ اور تقسیم نو سے پیدا شدہ زرعی آراضی
کے معاملات پر بحث کی ضرورت ہے۔ اس
کے متعلق چند بنیادی سوال مندرجہ ذیل ہیں:

مختلف آب و ہوا کے علاقوں میں خطۂ آراضی کا رقبہ
کتنا ہے جس میں:

الف۔ کم از کم ضروری آمدنی

ب۔ خاندان کے افراد نیز مویشیوں کی
پوری کھپت کی گنجائش ہو۔

آراضی کا رقبہ:
زرعی آراضی مینجمنٹ کے مطابق مجموعی
طور پر ایک خاندان کے لیے کھیت کا رقبہ
ساڑھے سات ایکڑ سے لے کر دس ایکڑ تک
ہوتا ہے۔ دانت والا کے مطابق کھیت کا
رقبہ ۵ ایکڑ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا
کہنا ہے کہ ۵ افراد پر مشتمل ایک خاندان کے
حصے کم از کم ۲ ہیکٹیر یا ۵ ایکڑ آراضی درکار ہے۔
اس سے کم زمین رکھنے والے کاشت کاروں
کے لیے کاشت پر آنے والے اخراجات
نکالنے کے بعد اتنی فاضل فصل پیدا کرنا مشکل
ہے جس کو وہ تجارت کے لیے استعمال کر
سکیں۔ گوشوارہ کے اعداد و شمار کے مطابق
ہر خاندان کو فراہم کردہ آراضی ضروری رقبہ
سے کہیں کم ہے۔ قومی سطح پر ایک خاندان
کے لیے مجموعی خطۂ آراضی ۷۰ء۱ ایکڑ ہے
جب کہ یہ راجستھان میں ۶۰ء۵ ایکڑ سے
لے کر کیرالا میں ۳۳ء۰ ایکڑ ہے
راجستھان میں۔
مجموعی قومی پیداوار سے
حالانکہ تقسیم نو سے مست
لوگوں کے پاس تقسیم نو
کی گئی آراضی نہیں ہے (مستفیض ہونے
افراد کا انتخاب پنچایت کی سطح پر کیا جاتا ہے)
زرعی مینجمنٹ کے مطابق اگر سب قطعوں کو
یکجا بھی کر دیا جائے تب بھی یہ سود مند ثابت
ہوگا کہ کرناٹک کی مثال سے صورت حال اور واضح
ہو جاتی ہے۔

کرناٹک میں آراضی کی تقسیم نو سے مستفیض
ہونے والے افراد میں ۶۴ فی صد شیڈول کاسٹ
اور شیڈولڈ ٹرائب ہیں جب کہ مستفیض ہونے
والوں کی مجموعی قومی شرح ۴۹ء۴۳ فی صد ہے جیسا
کہ گوشوارہ میں اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ کرناٹک
میں کاشت کاروں کو مجموعی طور پر آراضی کا ایک
بڑا خطہ (۹۲ء۴۳ ایکڑ) حاصل ہوا ہے جب کہ
قومی سطح پر یہ شرح ۷۰ء۱ ایکڑ آراضی فی خاندان
ہے۔ اس لیے کرناٹک میں مستفیض ہونے
والے کاشت کاروں کی حالت اچھی ہے اور
اسی لیے ان کو آراضی کی تقسیم نو کے بہتر نتائج
پیش کرنے چاہئیں۔ تاہم اس صورت حال کے
تجزیے سے قابل قدر ضمانت نہیں حاصل ہوئی۔

کرناٹک کی صورت حال کا جائزہ [illegible]
اور بیجاپور سے حاصل شدہ اعداد و شمار سے لگایا
گیا ہے۔ عام طور پر کرناٹک میں تقسیم کی گئی فاضل
آراضی کوالٹی کے اعتبار سے ناقص ہے جس کو
زرخیز بنانے کے لیے خاصہ سرمایہ درکار ہے۔ یہاں
اس زمین کا استعمال صرف تفریح کے لیے کیا جاتا
ہے۔ جب کہ جن لوگوں کو تقسیم نو کی یہ زمین
حاصل نہیں ہے ان کے یہاں معاملہ اس کے
بالکل برعکس ہے۔ ربیع کے لیے تقسیم نو آراضی
کا استعمال بہت کم ہے۔

ہونے والے افراد کی سالانہ آمدنی مستفیض نہ ہونے
والے افراد کی سالانہ آمدنی سے دو ہزار سے بھی
کم ہے۔ دوسری قابل ذکر بات ان کا ذریعہ
آمدنی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تقسیم
نو سے مستفیض ہونے والے افراد کو معاشی طور
پر بہت کم فائدہ ہوا ہے۔

الف۔ ترقی کے لیے درکار سرمایہ نہ ہونے کی
وجہ سے تقسیم نو اسکیم کے تحت حاصل کی گئی
آراضی کا استعمال بہت کم ہے۔

ب۔ یہ لوگ بیشتر تنخواہ دار بنے رہتے ہیں۔
اس سلسلے میں جناب بی۔ وی۔ کرشنا کا کہنا ہے
کہ غریب ترین لوگوں کو خراب ترین آراضی
فراہم کی گئی، درست ہے۔

مستفیضین: اگر رقبہ آراضی کو سماجی رقبہ کا

پیمانہ تصور نہ کیا جائے تو تقسیم نو سے مستفیض ہونے والے افراد کے لیے آراضی اصلاحات سے فائدہ اٹھانا مشکل ہوگا۔ اس انکشاف کے پیش نظر کہ زیر کاشت زمین کا ۳۰ فیصد حصہ ابھی تک زبانی اور دیگر ذرائع سے زیر لگان ہے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی کہ اس کے نتیجے میں آراضی سے مستفیض ہونے والے بھی چند افراد آجائیں۔ سیاسی طور پر بیدار مغربی بنگال میں جہاں اگرچہ یہ تعداد بہت کم ہے، اس طرح کے معاملات کا پتہ چلا ہے۔ اگرچہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ پھر بھی اس سے اس طرح کی منتقلی اور آراضی سے آمدنی حاصل کرنے کی کوششوں میں رخنہ ضرور پڑ جاتا ہے۔ (آراضی رجسٹریشن دفتر میں 'بارحیہ' کو مالکان حقوق کی ایک دستاویز تسلیم کیا جاتا ہے) گجرات میں گاندھی نیہ انسٹیٹیوٹ کے مطابق ترقی یافتہ دیہات میں اعلیٰ قسم کی کپاس کی پیداوار کے لیے بڑے کسان زمین پٹہ پر حاصل کرتے ہیں جب کہ چھوٹے کاشتکار زمین پٹہ پر دیتے ہیں۔ یہ بالکل مختلف عمل ہے۔

اس مسئلے کا جوکم و بیش محض بے بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تاہم خطہ آراضی کو یکجا کر کے کچھ حد تک اس مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے جو آراضی اصلاحات پروگرام کا ایک جز ہے۔ اس سمت اگرچہ بہت کم پیش رفت ہوئی ہے۔ مارچ ۱۹۹۰ء تک تقسیم شدہ ۴۶ لاکھ ایکڑ آراضی میں سے ۱۵ لاکھ ایکڑ یا تقسیم کی آراضی کا صرف ۳۲ فی صد ہی یکجا کیا جا سکا۔ اب تک ۱۵ ریاستوں نے خطہ آراضی کو یکجا کرنے کے متعلق قوانین پاس کر دیئے ہیں۔ آندھرا پردیش تمل ناڈو کیرالہ۔ یاٹہ یجری اور شمال مشرقی ریاستوں میں ابھی اس قانون کا نفاذ باقی ہے یہ طریقہ کار پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش کے علاقوں میں زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ آراضی یکجا کرنے کا یہ پروگرام ان علاقوں میں جہاں آب پاشی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے چوں کہ ان علاقوں میں مینجمنٹ اور پیداوار کے بہتر ذرائع فراہم ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ لگان دار، پٹہ دار اور چھوٹے کاشت کاروں کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس آراضی یکجا کرنے کے پروگرام سے بڑے کاشت کاروں کو زیادہ فائدہ ہوگا۔

حد بندی قوانین کے نفاذ کا تعلق

صرف زرعی اصلاحات کے فوائد سے نہیں ہے۔ درحقیقت اس کا تعلق انسداد غربت کے لیے وضع کیے گئے تمام پروگراموں سے ہے ملک بھر میں پھیلی اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے خاطر خواہ تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ ●

مارچ ۱۹۹۰ء تک کچھ ریاستوں میں نافذ کیے گئے آراضی سے متعلق حد بندی قوانین

ریاست	فاضل قرار دیا گیا رقبہ آراضی (۰۰۰) ایکڑ میں	حاصل کی گئی آراضی (۰۰۰) ایکڑ میں	تقسیم کی گئی آراضی ( ) ایکڑ میں	کالم ۳ و کالم ۴ کا تناسب	مستفیضین کی کل تعداد ( ) میں	تقسیم کی گئی آراضی کا مجموعی رقبہ ایکڑ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
آندھرا پردیش	۶۹۸٫۱	۵۳۳٫۳	۴۱۲٫۸	۷۷٫۳	۳۵۲٫۳	۱٫۱۷
آسام	۶۰۵٫۶	۵۴۵٫۱	۴۰۰٫۲	۷۳٫۴	۳۷۰٫۰	۱٫۰۸
بہار	۴۷۴٫۶	۲۷۶٫۲	۲۵۳٫۶	۹۷٫۳	۲۹۳٫۴	۰٫۸۶
گجرات	۲۴۸٫۸	۱۵۲٫۷	۱۰۷٫۹	۷۰٫۴	۲۴٫۵	۴٫۴۰
ہریانہ	۱۲۱٫۳	۱۱۳٫۴	۱۱۲٫۹	۹۹٫۶	۳۷٫۹	۲٫۹۸
ہماچل پردیش	۲۱۴٫۱	۲۸۱٫۵	۳٫۳	۱٫۰۷	۱۴٫۴	۰٫۷۵
جموں کشمیر	۴۵۶٫۰	۴۵۰٫۰	۴۵۰٫۰	۱۰۰٫۰	۴۵۰٫۰	۱٫۰۰
کرناٹک	۲۸۴٫۹	۱۵۶٫۹	۱۱۴٫۱	۷۲٫۶	۲۸٫۸	۳٫۹۲
کیرالہ	۱۳۰٫۰	۹۲٫۳	۶۲٫۲	۶۷٫۴	۱۳۱٫۸	۰٫۴۷
مدھیہ پردیش	۳۱۵٫۳	۲۵۷٫۹	۱۶۸٫۹	۶۵٫۵	۶۴٫۱	۲٫۶۳

مہاراشٹر	۶۰۴٫۳	۶۲۴٫۱	۵۲۴٫۹	۸۴٫۰	۱۳۲٫۳	۳٫۹۷
اڑیسہ	۱۰۳٫۷	۱۵۸٫۹	۱۴۲٫۱	۹۱٫۲	۱۲۳٫۶	۱٫۱۸
پنجاب	۱۳۹٫۱	۱۰۳٫۷	۱۰۱٫۲	۹۷٫۱	۲۶٫۱	۳٫۸۸
راجستھان	۶۱۹٫۱	۵۴۷٫۷	۴۲۰٫۳	۷۶٫۶	۷۴٫۲	۵٫۶۸
تمل ناڈ	۱۷۳٫۱	۱۶۶٫۸	۱۳۵٫۹	۸۱٫۴	۱۱٫۸	۱٫۲۳
اتر پردیش	۵۲۳٫۱	۴۶۵٫۶	۳۵۵٫۴	۷۱٫۷	۲۱٫۵	۱٫۱۸
مغربی بنگال	۱۲۵۹٫۱	۱۱۴۲٫۹	۸۶۹٫۱	۷۶٫۰۳	۱۸۲۹٫۳	۰٫۴۹
کل	۷۲۲۶٫۲	۶۲۱۳٫۲	۴۶۴۹٫۲	۷۴٫۸۳	۴۲۶۰٫۵	۱٫۰۷

ربیع فصل میں استعمال ہونے والی زمین کا فیصد

رقبہ	آراضی مستفیضین	آراضی غیر مستفیضین
بیجاپور ضلع	٪ ۳٫۱	٪ ۲۰٫۸
دھارواڑ	٪ ۱۴٫۴ چند ممتاز میں سے ایک	٪ ۱۵٫۰
کرناٹک مجموعی تناسب	٪ ۵٫۳	٪ ۱۵٫۱

	ذرائع آمدنی	مستفیضین	غ
آراضی	بیجاپور	۲۱٫۱	
	دھارواڑ	۳۹٫۶	۶۲٫۱
	کل ریاست	٪ ۲۹٫۰	٪ ۴۷٫۵
تنخواہ	بیجاپور	٪ ۶۷٫۹	٪ ۳۴٫۷
	دھارواڑ	٪ ۵۷٫۳	٪ ۲۸٫۶
	کل ریاست	٪ ۶۳٫۴	٪ ۳۱٫۹

قرضہ پر حاصل کیے گئے مویشی	مستفیضین	غیر مستفیضین
	٪ ۴۰٫۹	٪ ۱۹٫۱

ریاستی حکومت کے ذریعہ کسی پروجیکٹ کو دی گئی منظوری کا جائزہ لے سکتی ہے۔
پروجیکٹوں کے ۲۴ زمروں میں منظوری حاصل کرنے کے لیے تجاویز مرکزی حکومت کو پیش کرنی ہوں گی۔ ان میں نیوکلیائی طاقت اور متعلقہ پروجیکٹ، دریائی وادی کے کثیر

بہار کی طرف ایک بڑھتا قدم

یہ ادارے ہمارے بچوں میں ان اعلیٰ سماجی اخلاقی اور انسانی قدروں کو فروغ دیں گے جو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے سرمایۂ ناز رہی ہیں اور ان نونہالوں میں وہ انسانی صفات پیدا کریں گے جو آج ملک کے لیے بہت ضروری ہیں خصوصاً جب کہ ملک کو ترقی کی رفتار تیز کر کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہونا ہے اور اس عظیم ملک کو پوری کامیابی کے ساتھ ۲۱ویں صدی میں لے جانا ہے۔ ●

بقیہ: ماحولیاتی اثرات کا جائزہ

کے لحاظ سے نامزد کردہ حساس علاقے کی حد کے پانچ کلومیٹر کے اندر قائم کئے جانے والے مجوزہ بہت سے پروجیکٹوں پر ریاستی حکومت مرکزی حکومت کے جاری کردہ رہنما خطوط کے مطابق غور و خوض کرے گی۔ ماحولیات کی وزارت

اصلاحات کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے نئے اقدامات

اس بات کو دو برس گزر چکے ہیں، جب بھارت نے اپنی معیشت کو عالمی معیشت کے ساتھ مربوط کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ بھارت کے کروڑوں شہریوں کے معیارِ زندگی میں تیزی سے اور مستقل بہتری لائی جائے۔ صنعت تجارت، شرح تبادلہ اور غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا اور انھیں آسان بنایا گیا تھا۔ اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا تھے۔

لیکن یہ فرض کر لینا قطعی غلط ہوگا کہ اصلاحات کے پروگرام کے پہلے دو برسوں میں حاصل ہوئی کامیابیوں سے اقتصادی اصلاحات کے کام کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ان فوائد کو آئندہ برسوں میں مستحکم نہیں بنایا جاتا ہے تو یہ فوائد رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔ بہت سے شعبوں میں نئے اقدامات کیے جانے کی بھی ضرورت ہے۔

مالی استحکام

مالی استحکام میں ان اقدامات کی کامیابی کی کلید مضمر ہے۔ بہت زیادہ ملی خسارہ پیداواری سرمایہ کاری سے عوام کی بچتوں کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ ریزرو بنک آف انڈیا سے زیادہ سے زیادہ پیسہ لینے سے مالی افراطِ زر میں اضافہ ہوتا ہے اور مالی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ مالی خساروں کے لیے رقم فراہم کرنے کی غرض سے غیر ملکی قرضے پر زیادہ انحصار میں بہت زیادہ غیر ملکی ممنونیت کے مدِ نظر بین الاقوامی معیشت میں معاملہ کرنے کا اختیار کھو دینے کا شدید خطرہ ہے۔ ان وجوہات کے پیشِ نظر مالی خسارہ میں مسلسل کمی لانا لازمی ہے تاکہ افراطِ زر پر قابو پایا جائے، پیداوار اور سرمایہ کاری کے لیے قرضے کی مناسب دستیابی کو یقینی بنایا جائے اور درمیانی سطح پر بیرونی شعبہ میں استحکام حاصل کیا جائے۔

چنانچہ مستقبل قریب میں نشانہ یہ ہونا چاہیئے کہ مالی خسارہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں مجموعی اندرونِ ملک پیداوار کے تقریباً سات فی صد سے کم کر کے ۹۷-۱۹۹۶ء تک تقریباً ۵ فی صد کیا جائے۔ آئندہ برسوں میں مجموعی مالی خسارہ کم کرنے کے لیے یہ نظریہ اختیار کیا جائے گا کہ پانچ موضوعات پر زور دیا جائے یعنی مالی امداد میں کمی، کنٹرول شدہ قیمتوں کے لیے ایک نظریے پر عمل درآمد، سرکاری دائرہ کار کے اداروں اور صنعتوں کے لیے بجٹ میں رقم مختص کیے جانے میں مزید کمی، اخراجات پر کنٹرول کو سخت کرنے کے لیے اقدامات اور ٹیکس اصلاحات سے متعلق ایجنڈے کی تکمیل۔

مالی امداد کا کردار

اگرچہ مالی امداد کا ایک اہم کردار ہے لیکن بھارت ایک ایسے نظام کو برداشت نہیں کر سکتا ہے جس میں مالی امداد کے بل پر مالی ذرائع سے ماورا ایک غیر کنٹرول شدہ انداز میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن غریب لوگوں کو مالی امداد کی انتہائی ضرورت ہے، اُن کو نشانہ بنا کر مالی امداد کو حد میں رکھنا ضروری ہے۔

کیمیاوی کھادوں کے سلسلے میں مالی امداد کے دو اہم جزو ہیں، جن میں سے ایک کسانوں کے حصے میں آتا ہے اور دوسرا کیمیاوی کھادوں کی صنعت اور اس کے ساز و سامان کے سپلائی کنندگان کے حصے میں آتا ہے۔ اول الذکر کو چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کے لیے مالی امداد کی بتدریج نشانہ بندی کے ذریعے حد میں رکھنا ہوگا اور موخر الذکر میں تبدیلی کیے جانے کی ضرورت ہے۔

سرکاری نظامِ تقسیم (پی ڈی ایس) کو ضرورت مند لوگوں کے قریب تر کر اور سرکاری خریداری کی ایجنسیوں میں مقابلہ کرنے

یوجنا، نئی دہلی

کا سلسلہ شروع کرکے خوراک کے سلسلے میں دی جانے والی مالی امداد کو، حد میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کو غریب لوگوں کے لیے زیادہ موثر طور پر مفید بنایا جا سکتا ہے۔ صارفین کے لیے کم چارجز سے بجلی، آب پاشی، پبلک روڈ ٹرانسپورٹ اور غیر پرائمری تعلیم جیسی بنیادی ڈھانچے کی خدمات فراہم کرنے کے اخراجات کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی وصول ہوتا ہے۔ ان چارجز کی وجہ سے مالی امداد پر زیادہ بار بھی پڑتا ہے۔ اس قسم کی اہم عوامی خدمات کے لیے چارجز میں بتدریج اضافہ کیا جا سکتا ہے تاکہ ان خدمات کی فراہمی کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ غریب ترین طبقوں کے لیے فراہم کردہ خدمات کے ایک حصے کے سلسلے میں ملی جلی مالی امداد کا ایک عنصر ڈھانچے میں شامل کیا جانا چاہیئے۔

کنٹرول شدہ قیمتیں

ایسی صورت میں جب قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہو تو کافی عرصے تک کنٹرول شدہ قیمتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دینے کی وجہ سے نقصانات میں اضافہ ہوتا ہے جس سے بالآخر مالی خسارہ بڑھتا ہے اور معیشت میں عام افراطِ زر میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی قیمتیں کنٹرول شدہ ہیں، ان میں اکثر تبدیلی ہوتی رہنی چاہیئے تاکہ نقصانات میں اضافے کی روک تھام ہو سکے۔ قیمتوں میں چھوٹی تبدیلیاں کوئی خرابی پیدا نہیں کرتیں اور اُن سے ایک ایسی صورتِ حال سے بچا جا سکتا ہے، جس میں عرصے سے چلی آ رہی بڑی خرابیاں اصلاح کو دشوار بنا دیتی ہیں۔

بجٹی وسائل کی کمی نیز غریبی کے خاتمے اور سماجی شعبے کے اہم پروگراموں کے لیے ان وسائل کی ضرورت کے زمانے میں سرکاری شعبے کے خستہ حال یونٹوں (پی ایس یو) کی امداد کے لیے ہر سال یہ وسائل فراہم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

معیشت کو ایک ایسا ٹیکس نظام بھی وضع کرنا ہے، جو آسان ہے، ٹیکس کی مناسب شرحوں کے ساتھ جس کی وسیع بنیاد ہے اور جو بہت ہی کنٹرول شدہ ہے۔ اس کے علاوہ، اس کو اقتصادی کارکردگی، ارتقا اور اکویٹی کو فروغ دینا چاہیئے۔ موڈویٹ (MODVAT) کو نئے شعبوں میں لاگو کرکے، کسٹم محصولات میں مرحلہ وار کمی کرکے، کسٹمز اور ایکسائز میں فضول اور پیچیدہ امور کو ختم کرکے تمام اہم ٹیکسوں کے انتظام کو بہتر اور جدید بنانے کے اقدامات کے نیز مکما

کو بتدریج فروغ دے

کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ، ا،

بتدریج کمی، صارفین کی سہولت

محصولات اور درآمدات کی پالیسیوں کو معقول بنانے وغیرہ سے بین الاقوامی منڈی میں مقابلہ جاتی صلاحیت میں اضافہ کرنے میں مدد ملے گی۔

مالی شعبے میں اصلاحات کا رخ عام طور سے قرضہ جات معاف کرنے والوں پر مکمل پابندی اور حقیقی ضرورت مند لوگوں کو رعایتی قرض دینے کے لیے بااحتیاط نشانہ بنانے کی سمت ہے۔ قانونی لکویڈیٹی شرح (ایس ایل آر) میں مرحلہ وار کمی کرکے ۲۵ فی صد کرنے اور نقد ریزرو شرح (سی آر آر) میں مرحلہ وار کمی کرکے دس فی صد کرنے سے تجارتی شعبہ کو قرضہ دینے کے سلسلے میں بنکوں کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ نئے محتاط ضوابط، زیادہ مقابلہ جاتی ماحول اور سرکاری شعبے کے بنکوں کی وسیع بنیاد والی ملکیت سے اس بات کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی کہ ان کی نئی قائم کردہ مالی صحت برباد نہ ہونے پائے۔ وسیع تر مالی شعبہ جاتی اصلاح کے لیے مجموعی حکمتِ عملی یہ ہے کہ عوام اور تیار کنندگان کے لیے قابلِ رسائی ذرائع کا ایک وسیع انتخاب کیا جائے۔ اس سے آمدنیوں، میچوریٹی، رسک اور لکویڈیٹی کے لحاظ سے، بچت کرنے والوں کی مانگوں اور تیار کنندگان کی مانگوں میں بہتر طور سے توازن رکھا جا سکے گا۔

●

بقیہ: شہر میں جنگل

میں ں نا میابی میں حکام اور عوام کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے کوئی شک و شبہ نہیں ہے تو اس تجربے کو بھارت کے تمام شہروں میں دہرایا جا سکتا ہے

●

نوین چندر جوشی

بھارتی معیشت کے روشن امکانات

آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بھارتی معیشت کے مستقبل کے امکانات روشن ہیں کیونکہ گذشتہ دو برسوں میں ملک نے جس سنجیدگی اور مستعدی سے معاشی ترقی کی کوشش کی ہے وہ پہلے کبھی نہیں کی۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ بھارتی معیشت کی تاریخ میں پچھلے دو برس سنہری دور کے طور پر یاد کیے جائیں گے، جن کے دوران معیشت کو مستحکم بنانے کے لیے اہم پالیسی اقدامات کیے گئے۔

متعدد شعبوں کے لیے درکار صنعتی لائسنس کے خاتمے کے ذریعہ آزادانہ معاشی پالیسی کے عمل کی شروعات کی گئی۔ برآمدات کی حوصلہ افزائی کرنے اور صنعتی پیداوار کی رفتار بڑھانے کی غرض سے اہم اشیاء کی درآمد کو آسان بنانے کے لیے برآمدات اور درآمدات کی ایک قابل عمل پالیسی بنائی گئی۔ دیہی ترقی کے لیے زیادہ رقومات مختص کرنے سے دیہی معیشت میں از سرنو بہتری آئی۔ معیشت کے مختلف شعبوں میں مالی ڈسپلن لاگو کیا گیا اور غیر ترقیاتی اخراجات کو کافی حد تک کم کیا گیا۔

درحقیقت موجودہ معاشی اصلاحات کی پالیسی اس حقیقت کے اعتراف کا نتیجہ ہے کہ مرکزی سطح پر منصوبہ بندی اور سرکاری دخل اندازی تباہ کن ہے لہٰذا معیشت کی صحت کو بحال کیا گیا اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا جہاں دیہی اور شہری علاقوں میں معاشی سرگرمیوں کے معاملے میں پہل کی جا سکے۔

حکومت نے مالی خسارے کو ۹۱-۱۹۹۰ء کے کل ملکی پیداوار کے ۴ء۸ فی صد سے کم کر کے ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۵ء۶ فی صد تک گھٹایا ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں مالیہ کو درست کرنے کا عمل جاری رہا۔ اس میں اس خسارے کو ۷ء۴ فی صد تک کم کرنا مقصود ہے۔ نئی حکومت نے ۱۹۹۱ء کے وسط کے ادائیگیوں کے توازن کے بحران پر بھی قابو پایا اور قرضوں کی عدم ادائیگی جیسی بھیانک صورت حال سے خود کو بچایا۔ اس وقت ملک میں غیر ملکی زر مبادلہ کا ذخیرہ ۶ء۶۷ ارب ڈالر ہے جو کہ جون ۱۹۹۱ء میں جب اس حکومت نے چارج سنبھالا تھا، ۱ء۱ ارب ڈالر تھا۔

جیسا کہ مرکزی وزیر خزانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا ہے کہ اگلے تین برسوں میں کرنٹ اکاؤنٹ خسارے میں کافی کمی آنے سے دیگر ممالک اور اداروں کی امداد پر انحصار کم ہو جائے گا۔ ادائیگیوں کے توازن میں موجودہ خسارہ اب بھی خاصا زیادہ ہے۔ اسے ۹۳-۱۹۹۲ء کے کل ملکی پیداوار کے ۸ء۲ فی صد سے کم کر کے ۹۶-۱۹۹۵ء میں ایک فی صد سے بھی کم کرنا ضروری ہے۔ دو برس پہلے تک یہ ۴ فی صد تھا۔ مالی خسارے کو کم کر کے اور برآمدات کی حوصلہ افزائی کر کے اس مسئلہ کو مؤثر طور پر حل کیا جا رہا ہے۔ حکومت نے بجا طور پر آزاد منڈی کے طریقہ کار کو خود کفالت کے مقصد کے حصول کا خاص ذریعہ بنایا ہے اب حکومت نے باہمی مقابلہ کرنے والی قوتوں کو بڑی حد تک آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اسی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ محفوظ منڈیوں سے نااہلی بدعنوانی اور جمود پیدا ہوا ہے۔ تمام پیداواری اداروں کو اپنے اندرونی نظام کو درست کرنا ہوگا ساتھ ہی انھیں بین الاقوامی طور پر مقابلے کا اہل رہنے کے لیے کم سے کم لاگت میں کام کرنا ہوگا۔

جولائی ۱۹۹۱ء کی نئی صنعتی پالیسی نے صنعتی ترقی کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸ صنعتوں کو چھوڑ کر تمام صنعتوں کے لیے لائسنس لینے کو غیر ضروری قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس پالیسی نے اجارے دار اداروں بڑے صنعتی و تجارتی اداروں کے اثاثوں کی حد بندیوں

کو ختم کر دیا۔ ان اداروں کے اثاثوں کی حد کو بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی غیر ملکی زرمبادلہ کی ضابطہ بندی کے قانون میں اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اور کمپنیوں میں غیر ملکی شیئروں کی حد ۴۰ سے بڑھا کر ۶۰ فی صد کر دی گئی ہے۔

جہاں تک غیر ملکی سرمائے کا تعلق ہے نئی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ اعلیٰ ترجیحی صنعتوں، براہ راست ۵۱ فی صد سرمایہ لگانے کی اجازت دی جائے گی۔ اگر تمام پیداوار برآمد کی جاتی ہے تو ایسے ادارے کو ۱۰۰ فی صد غیر ملکی سرمایہ کاری کی بھی اجازت ہوگی۔ اس کے علاوہ حکومت نے غیر مقیم ہندوستانیوں اور غیر ملکی تجارتی اداروں کو اعلیٰ ترجیحی صنعتوں میں ۱۰۰ فی صد تک غیر ملکی سرمایہ لگانے اور لگائے گئے سرمائے اور اس سے ہونے والی آمدنی کو واپس لے جانے کی بھی اجازت دے دی ہے۔

حکومت نے غیر مقیم ہندوستانیوں کی پورٹ فولیو سرمایہ کاری کی حد کو ۵ فی صد سے بڑھا کر ۲۴ فی صد کر دیا ہے۔ ان اقدامات سے غیر مقیم ہندوستانیوں کی ہچکچاہٹ دور ہو جائے گی۔

سرکاری صنعت و تجارت کے شعبے یعنی پبلک سیکٹر کا رول بھی کم ہوا ہے۔ ہرچند کہ آٹھ شعبوں میں اس کا دخل برقرار ہے۔ یہ ہیں اسلحہ سازی، ایٹمی توانائی، ریل، نقل و حمل، کان کنی اور کوئلہ۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سرکاری سیکٹر میں لگے حکومت کے سرمائے کے کچھ حصے کو میوچول فنڈ، مالی اداروں عوام اور ملازمین کو فروخت کیا جائے۔ مستقل طور پر مالی خسارے میں چلنے والے یونٹوں کے معاملے کو صنعتی اور مالی تعمیر نو کے بورڈ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ملازمین کے حقوق کے تحفظ کے لیے قومی تجدید فنڈ قائم کیا گیا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

حکومت نے غیر ملکی تجارت کی پالیسی کو مکمل طور پر نئی شکل دی ہے۔ ملک کی غیر ملکی تجارت پالیسی انتظامی کنٹرول، لائسنسوں اور بے شمار فہرستوں، ضمیموں کی زد میں تھی۔ اس کے نتیجے میں تاخیر، بربادی، نااہلی اور بدعنوانی پیدا ہوتی تھی۔ نئی اصلاحات سے ڈالر کے اعتبار سے شرح ترقی میں ۹ فی صد اضافہ متوقع ہے

قیمتوں پر بھی موثر ڈھنگ سے قابو پایا جا رہا ہے اس برس کے بجٹ کا اثر اچھا رہا ہے اور اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ افراطِ زر کی شرح کم ہو کر ۶٫۸ فی صد ہو گئی ہے۔ اگست ۱۹۹۱ء میں یہ ۱۷ فی صد تھی۔ افراطِ زر کے دباؤ میں کمی جزوی طور پر زراعت کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے ہے لیکن بڑی حد تک مرکزی حکومت کے مالی خسارے میں کمی بڑے پیمانے پر معاشی انتظام اور افراط ۔ ۔ ۔ اسباب تھے۔

دیگر نئے اقدامات

پر سونے کی درآمد کی اجا
کی اسکیم اور مالی لین دین
لیے سیکیورٹیز ایکسچینج بورڈ آف انڈیا کو قانونی

حیثیت دینا شامل ہے۔ معیشت میں ڈسپلن پیدا کرنے اور بچت کو بڑھاوا دینے کے لیے یہ سبھی چیزیں ضروری تھیں۔

اس طرح پچھلے دو برس میں معیشت میں نئی طاقت پیدا کرنے کے لیے نئے اور قابلِ عمل اقدامات کیے گئے۔ ان سبھی اقدامات کا اچھا اثر پڑے گا۔ کیوں کہ بھارت غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کے معاملے میں خودکفالت کے ساتھ معاشی ترقی میں اہم کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیار ہے جن کے نتیجے میں معاشی خوشحالی آئے گی۔ اندرونِ ملک تمام طرح کی پیداوار میں بہتری ہوگی جس سے بڑے پیمانے پر روزگار ملے گا اور غریبی کی سطح سے نیچے رہنے

والے افراد کی تعداد کم ہوگی اور اس طرح بین الاقوامی حالات کا مقابلہ پیدا کرنے کی صلاحیت مضبوط ہوگی۔ ●

بقیہ شہر میں جنگل

کھودے جا چکے ہیں۔

اس شہری جنگل میں تیزی سے بڑھنے والی ایسی اقسام لگائی جائیں گی جن کی اقتصادی اور صنعتی اہمیت ہے۔ شیشم، آم اور ارجن جیسی اقسام ایک قسم کی پودکاریوں میں لگائی جائیں گی اور سیرس، کانجی، بکائن، پیپڑی، جنگل جلیبی جیسی اقسام ملی جلی پودکاریوں میں لگائی جائیں گی۔ آرائش کے لیے کیسیا سمیہ، اکیشیہ اور کسوریتا کا انتخاب کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ آبپاشی کے لیے بنائے گئے ایک کنواں اور نالیاں ہوں گی۔ اس پروجیکٹ کے لیے آٹھ آٹھ ہارس پاور کے دو ڈیزل انجنوں اور آٹھ سوراخوں کی ضرورت ہوگی۔

پانچ ہیکٹیئر کے ایک بلاک کا انتخاب کیا گیا ہے، جسے 'اسمرتی ون' کے طور پر تیار کیا جائے گا، جس میں لوگ اپنے کسی عزیز یا اپنی زندگی کے کسی واقعہ کی یاد میں پودا لگا سکتے ہیں۔ اسکول، کالج اور غیر سرکاری تنظیمیں بھی اپنے اداروں اور تنظیموں کے نام پر پودے لگا سکتی ہیں۔ اسمرتی ون میں پودا لگانے کے لیے فی پودا سو روپئے ادا کرنے ہوں گے۔ اس طرح سے جمع ہونے والی رقم کا استعمال

باقی صفحہ ۱۹ پر

بھارتی ریلویز — جدید کاری کے عمل میں تیزی

بھارتی ریلویز کے نظام کا شمار اب دنیا کے بڑے ریلوے نظاموں میں ہوتا ہے۔ ملک کے سائز اور ٹرانسپورٹ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر، بھارتی ریلویز کو ٹرانسپورٹ کے ایک اہم ذریعہ کی حیثیت حاصل رہے گی۔ ریلویز بڑے پیمانے پر اشیاء کی نقل و حمل، لمبے اور درمیانہ فاصلے کے مسافروں کی آمد و رفت نیز بڑے شہروں کے اندر اور اطراف مسافروں کی بہت زیادہ آمد و رفت کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتہائی موثر اور کم اخراجاتی ذریعہ ہے۔ مال کی نقل و حمل کے سلسلے میں ریلوے میں سڑک کے مقابلے میں توانائی کی تقریباً چھ گنا زیادہ بچت ہوتی ہے، ریلوے میں زمین کا بہتر سے بہتر استعمال ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ماحولیات پر بہت معمولی سا اثر پڑتا ہے۔

گزشتہ چار دہوں کے دوران سڑک ٹرانسپورٹ کے مقابلے میں ریلوے کے ذریعے لے جائے گئے مال کی نقل و حمل کے حصے میں بتدریج کمی واقع ہوئی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ریل گاڑیوں کے ذریعے ٹن کلومیٹر کے حساب سے مال کی نقل و حمل کا حصہ ۸۸ فیصد اور مسافر کلومیٹر کے حساب سے مسافروں کی آمد و رفت کا حصہ ۶۸ فیصد تھا لیکن ۱۹۸۰ء میں یہ حصہ گھٹ کر بالترتیب ۶۵ فیصد اور ۳۲ر۲ فیصد رہ گیا اور آج کل یہ مال کی نقل و حمل اور مسافروں کی آمد و رفت کے لیے بالترتیب ۵۰ فی صد اور ۲۰ فی صد سے کم ہے۔ ملک کے مجموعی مفاد میں، موجودہ رجحان کو پلٹنا ریلوے کے آٹھویں منصوبے کا مطلوبہ مقصد ہے، جو اپریل ۱۹۹۲ء سے شروع ہو چکا ہے اور مارچ ۱۹۹۷ء تک ختم ہوگا۔

ریلویز نے ملک کے لیے لائنوں کے ایک جیسے نظام کی پالیسی اختیار کی ہے اور اس منصوبے کے تحت ۶۰۰۰ کلومیٹر لمبی چھوٹی لائنوں کو بڑی لائنوں میں تبدیل کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ہائیڈرو کاربن کی انحطاط پذیر قیمتی توانائی کی بچت کرنے کی غرض سے آٹھویں منصوبے میں ۳۰۰۰ کلومیٹر سے زیادہ ریل راستے کی برق کاری کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ آٹھویں منصوبے میں لائنوں کی تبدیلی اور برق کاری کے علاوہ، صلاحیت پیدا کرنا یعنی رولنگ اسٹوک کی حصولی اور دیگر متعلقہ لائنوں کی صلاحیت پیدا کرنے کا کام کچھ ایسے شعبے ہیں، جن پر توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔

ریلویز کے آٹھویں منصوبے کا سائز ۲۷۲۰۲ کروڑ روپے رکھا گیا ہے اور ۵۳۷۵ کروڑ روپے بجٹی امداد ہے جو منصوبہ جاتی اخراجات کا ۱۹ر۵۷ فی صد ہے۔ منصوبے کے اہم مقاصد میں مال کی نقل و حمل اور مسافروں کی آمد و رفت کی تخمینہ شدہ سطحوں کے لیے مناسب صلاحیت پیدا کرنا، پرانے اثاثوں کی بحالی اور تجدید نیز ان کو ہٹانے کے عمل کی تکمیل، کام کاج کے اخراجات کو کم کرنے اور خدمات کی معتبریت میں اضافہ کرنے کے لیے نظام کی جدید کاری اور بہتری شامل ہے۔ بھارتی ریلویز کے لیے بڑی لائنوں کے نظام نیز متبادل ریل راستوں کی ترقی و فروغ اور رابطے فراہم کرنے کے لیے نظام کی منتخبہ توسیع کا کام بھی ٹرانسپورٹ کی مجموعی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے شروع کیا جائے گا۔ بڑی لائنوں پر بھاپ سے چلنے والے ۹۸۶ ریل انجنوں اور چھوٹی لائنوں پر بھاپ سے چلنے والے ۱۰۴ ریل انجنوں کی موجودہ سطح سے ۹۷-۱۹۹۶ء تک بڑی اور چھوٹی لائنوں پر چلنے والے بھاپ کے انجنوں کو مرحلے وار مکمل طور سے ختم کرنے، ریل گاڑیوں کی بہت زیادہ آمد و رفت والے راستوں کی برق کاری اور ڈیزل پر انحصار کم کرنے، کنٹینروں پر مبنی کام اور افرادی قوت کی کارکردگی میں بہتری سمیت مربوط بین طریقہ جاتی

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر قمرالدین

نوودیہ ودیالیہ۔ قومی یک جہتی اور سماجی برابری کی طرف ایک ٹھوس قدم

آزادی کے بعد ہندوستان نے اپنے سارے وسائل عوام کی خوشحالی، ملک کے ہر باشندے کو بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے، ایک خوشحال اور معیاری زندگی جینے، قومی یک جہتی اور سماجی برابری کے فروغ اور ملک کو ایک مضبوط جمہوری ڈھانچہ دینے کی کوششوں پر صرف کیے ہیں۔ ہم نے بڑی حد تک ان مقاصد کی تکمیل میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ہماری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ہم اپنی عوام کو زندگی کے ہر میدان میں برابری کے حقوق سے روشناس کرائیں۔ واضح طور پر موثر اور معیاری تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ملک کے ہر باشندے کو زندگی کے ہر میدان میں وہ سب کچھ دے سکتا ہے جس کے سپنے ہم نے آزادی حاصل کرتے وقت دیکھے تھے۔ ایک موثر اور معیاری تعلیم ہی ہمیں دیگر ترقی یافتہ ملکوں کے شانہ بشانہ ترقی کی راہ پر آگے لے جا سکتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ ملک میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے دیہات جہاں ملک کی ۸۵

فی صد آبادی قیام پذیر ہے۔ خصوصاً اعلیٰ صلاحیتوں کے خزانے سے معمور ہیں۔ بلا شبہ ہم نے ملک کے ہر فرد کو تعلیم یافتہ بنانے کی غرض سے ملک کے کو
میں تعلیمی ادارے کھولے
اور رسمی تعلیم کے ہر و
میں تعلیم کی شمع روشن
ہے لیکن ابھی تک ہم
میں چھپے ہوئے جوہر قابل کی نشاندہی ... اور نشو ونما کرنے اور پروان چڑھانے میں شاید پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائے ہیں نیز ابتدائی عمر سے ہی اپنے بچوں میں قومی یک جہتی کے جذبات پروان چڑھانے کے لیے کتابی ذرائع کے علاوہ کوئی عملی ذرائع استعمال نہیں کر پائے ہیں۔

انھیں مسائل کے پیشِ نظر ہمارے رہنماؤں کی یہ شدید خواہش رہی کہ تعلیم کو قومی یک جہتی، معاشی ترقی، سماجی برابری نیز ملک کے مختلف حصوں کے لوگوں کو قریب لانے کے لیے زیادہ موثر طریقے سے استعمال کیا جائے اور یہ کام بچوں کی بالکل ابتدائی عمر سے ہی شروع کیا جائے۔

قومی یک جہتی کا ایک بہت موثر ذریعہ تو ہے 'Core-curriculum' یعنی بنیادی نصاب تعلیم، جو قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کا ایک اہم حصہ ہے ...

... مشکلات کو حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ اب تک اچھی معیاری تعلیم معاشی لحاظ سے خوشحال طبقے تک ہی محدود رہی ہے۔ اور سماج کا غریب طبقہ اس سے عموماً پوری طرح مستفید نہیں ہو سکا ہے۔ سماجی برابری، قومی یک جہتی اور معاشی خوشحالی کی رفتار کو تیز کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم دیہات میں رہنے والے بچوں کو بھی بہتر اور معیاری تعلیم کے مواقع فراہم کریں، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکیں اور ملک کی ہمہ جہت ترقی میں اور زیادہ موثر رول ادا کر سکیں۔

انھیں مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۹۶۴-۶۶ء

۲۳۶۵، نواب لین، تلک بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔
یوجنا ۱، نئی دہلی

میں ایجوکیشن کمیشن نے 'Pace Setter Institutions' کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ اس عرصہ میں اس تجویز کو چند وجوہات کی بناء پر عملی جامہ پہنایا جا سکا۔ لہٰذا ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں اس طرح کے اسکولوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی اور طے کیا گیا کہ ان کا نام "نوودیہ ودیالیہ" (Novodaya Vidyalayas) ہو۔ یہ ہمہ وقتی اسکول ہوں نیز اوسطاً ملک کی ریاستوں کے ہر ضلع میں ایک اسکول کھولا جائے۔ یہ اسکول مندرجہ ذیل مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں گے۔

۱۔ ملک کے ہر طبقے اور ہر علاقے کے بچوں کو معیاری تعلیم کے مواقع دئے جائیں جس میں ہندوستانی تہذیب، سماجی اور اخلاقی قدروں، ماحول سے واقفیت اور وابستگی، ہم خویانہ تربیت اور جسمانی تعلیم وغیرہ شامل ہوں۔ یہ تعلیم خصوصاً دیہات کے بچوں کو خواہ ان کا خاندانی معاشی اور سماجی مرتبہ کچھ بھی ہو مہیا کی جائے۔

۲۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچے لازمی طور پر ۳ زبانوں کا مطالعہ کریں جس کا ذکر 'Three Languages Formula' میں آیا گیا ہے۔

۳۔ ان اسکولوں میں دی گئی تعلیمی سہولتوں اور تجربات کی مدد سے اس ضلع کے دیگر تعلیمی اداروں میں بھی معیار تعلیم بلند ہو اور اس طرح یہ ادارے دوسرے اداروں کے لیے رہنمائی کا کام کریں۔

۴۔ ان اسکولوں کے ذریعہ قومی یک جہتی کی مہم کو تیز تر کیا جائے اور ملک کے مختلف علاقوں کے بچے دوسرے علاقہ کی زبان، رہن سہن، رسم ورواج، لباس، خوراک، اور روایات وغیرہ سے واقفیت حاصل کریں

۵۔ ملک کے مختلف علاقوں کے افراد کے درمیان اجنبیت ختم ہو اور وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

نوودیہ ودیالیوں میں تعلیم درجہ چھ سے شروع ہوتی ہے۔ امید یہ کی جاتی ہے کہ اس درجہ تک بچوں کی تعلیم مادری/علاقائی زبان کے ذریعہ ہوئی ہے۔ اس لیے آٹھویں درجہ تک اس زبان کو ذریعۂ تعلیم رکھا جائے گا اور ہندی/انگریزی کی تعلیم بھی جاری رہے گی۔ اس طرح آٹھویں کے بعد ہندی/انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اس کے بعد تمام ودیالیوں میں ہندی/انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانا ممکن ہو سکے گا۔

اس کا ایک اہم پہلو جو قومی یک جہتی کے لیے موثر ثابت ہوگا۔ یہ ہے کہ آٹھویں کے بعد غیر ہندی زبان والے علاقے کے ودیالیوں سے ۲۰ فی صدی بچوں کو ہندی زبان والے علاقوں میں بھیجا جائے گا اور اس طرح ہندی زبان والے علاقے کے بچوں کو غیر ہندی زبان والے علاقے کے ودیالیوں میں۔ اس طرح مختلف علاقوں کے ودیالیوں میں پڑھنے اور علاقائی زبان کی تدریس سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ ان کی زبان، لباس، خوراک، تہوار، روایات، عادات وخصائل سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اور اس طرح ملک کے مختلف حصوں کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں مدد ملے گی اس سے قومی یک جہتی کے جذبات کو فروغ حاصل ہوگا۔

ان اداروں میں داخلہ پانچویں درجہ پاس کرنے کے بعد داخلے کے امتحان میں کامیابی کی بنیاد پر ہوگا۔ ان میں شہر اور گاؤں کے بچے، لڑکے لڑکیاں، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے بچے شامل ہوں گے اس طرح سماج کے مختلف طبقات کے یکجا تعلیم پانے والے بچوں میں قربت پیدا ہوگی جو ہمیشہ کے لیے دوستی اور یگانگت کی بنیاد بن جائے گی۔ اور چوں کہ یہ اسکول مکمل طور پر رہائشی ہوں گے اس لیے تعلقات کی یہ بنیاد اور مضبوط ہو جائے گی۔

اعلیٰ انسانی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے ان اسکولوں میں تجربہ گاہیں، ٹی۔وی، ریڈیو، مائیکرو کمپیوٹر وغیرہ استعمال کیے جائیں گے۔ غرض یہ کہ بچوں کی ہمہ جہت نشوونما کے لیے جملہ ممکنہ وسائل استعمال کیے جائیں گے۔ محنت کی قدر اور ماحول سے واقفیت پیدا کرانے کے لیے خصوصی پروگرام مرتب کیے جائیں گے۔ تجربات کرنے اور نئے خیالات کو فروغ دینے کے لیے بچوں کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ جملہ تعلیمی مصروفیات کو ایسے خطوط پر مرتب کیا جائے گا تاکہ بچوں کی شخصیت کی تعمیر اور تعلیمی حصول میں وہ نفسیاتی اور سماجی رکاوٹیں دور ہو جائیں جو سماج کے بعض طبقات کے بچوں کے فروغ میں رکاوٹ بنی رہتی ہیں۔

حکومت پورے پرخلوص جذبے کے ساتھ ان ودیالیوں کے قیام میں کوشاں ہے۔ اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ ان ودیالیوں کا رول حقیقی طور پر 'Pace Setter Institutions' کی حیثیت کا ہوگا۔ ان کی مثال علاقہ کی تعلیمی زندگی میں ایک روشن مینار کی ہوگی جس کی روشنی پورے علاقے کے تعلیمی ماحول کو روشن کر دے گی اور اس طرح یہ ادارے معیار تعلیم کو بلند کریں، بچوں کی شخصیت کی صحیح خطوط پر تعمیر، صلاحیتوں کی تلاش اور ان کو آگے بڑھانے اور قومی یک جہتی کے احساس کو پیدا کرنے میں اہم رول ادا کریں گے اور ان کے بچوں کو پورے حوصلے، جرأت اور تیاری کے ساتھ ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لیے تیار کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی کی جاتی ہے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

شبانہ نذیر

بچّے ضِد کیوں کرتے ہیں؟

بچّے قوم کی سب سے بڑی جاگیر ہیں، بچے کسی بھی قوم کا، ملک کا مستقبل ہیں، ہم اکثر اس قسم کی باتیں کہتے اور سنتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ بچوں کی پرورش پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ انھیں خود رو پودوں کی طرح بڑھنے دیتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہی نہیں کہ بچوں کے پالنے کے لیے بھی کسی قسم کی پڑھائی یا جانکاری کی ضرورت ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہم معمولی مشینوں کو چلانے کے لیے تو ٹریننگ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر بچوں کو پالنے کے لیے کسی قسم کی ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت بچوں کی پرورش میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ والدین یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ مکمل طور پر نہ تو کوئی بچہ اچھا ہوتا ہے اور نہ ہی کلّی طور پر کوئی بچہ خراب۔ بچے کے برتاؤ کو سمجھنا کسی نازک مشین کو سمجھنے سے بھی مشکل کام ہے۔ ماں باپ کی ذرا سی کوتاہی کئی مرتبہ بچے کو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے لے جاتی ہے اور جب ہم اپنی اس کوتاہی کو بچے میں کمیوں کی شکل میں دیکھتے ہیں تو اس پر مختلف لیبل لگا دیتے ہیں جیسے بچہ ہکلاتا ہے، بچہ بدتمیز ہے یا بچہ ضدی ہے

سی۔۵۸، منظور روڈ کمپلیکس، نیو دہلی ۱۱۰۰ ۲۔
یوجنا، نئی دہلی

ضد کو ہی لیجئے، ضد کرنا یا ضدی ہونا کوئی عیب یا بیماری نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ایک احتجاج ہے اس ماحول کے خلاف جس میں بچہ رہ رہا ہے۔ ایک ماہر نفسیات ڈی من نے کہا تھا کہ "دراصل بچے [illegible] ضدی ہوتے ہیں ماں باپ [illegible] ماں باپ اپنے [illegible] کی شخصیت کو خراب [illegible] بچے [illegible] کہ ہو سکتا ہے کہ جب بھی ہم بچے میں کوئی غیر معمولی حرکت دیکھیں تو اس کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اور اکثر بیشتر یہ وجہ نکلتی ہے والدین کے برتاؤ میں یا گھر کے ماحول میں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ والدین سے زیادہ بچوں کا خیر خواہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل میں والدین بھی پریشان رہتے ہیں کیوں کہ ایک طرف تو کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ 'Spare the rod & spoil the child' یعنی بچوں کو سدھارنے کا واحد طریقہ مار ہے، جہاں ذرا ڈھیل دی کہ بچہ بگڑا۔ اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ بچوں کو روک ٹوک میں نہیں رکھنا چاہیے وہ جو چاہیں انھیں کرنے دینا چاہیے۔ مگر میرے خیال میں یہ دونوں باتیں بچوں کو مناسب راہ تک پہنچانے کے لیے کارگر نہیں ہیں۔ اب ماہرین [illegible]

[illegible] رکھتے ہوئے۔ اور یہ وہ نقطہ ہے جس کے بارے میں ہم اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے"۔ یہ توازن بہت اہم چیز ہے جب جب یہ توازن بگڑتا ہے اس کا نمایاں اثر بچے کی شخصیت پر نظر آتا ہے۔

ماں باپ کا بہت زیادہ سخت ہونا، بچے کو ہر وقت روک ٹوک کرتے رہنا، اس کو ضرورت سے زیادہ مہذب بنانے کی کوشش کرتے رہنا۔ بچے کے خیالات اور احساسات کو نظر انداز کرنا۔ اسے کبھی اظہارِ خیالات کا موقع نہ دینا یہ سب وہ باتیں ہیں جو بچے کو ضدی بنا دیتی ہیں۔ دراصل کوئی بچہ ضدی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ چیز بڑے اس پر لاد

دیتے ہیں۔ ماہر نفسیات Allman David کا کہنا ہے کہ "بچے شرمیلے تب ہوتے ہیں جب انھیں ضرورت سے زیادہ سوشل بنانے کی کوشش کی جائے اور بچے ضدی تب ہوتے ہیں جب انھیں ضرورت سے زیادہ فرمانبردار بنانے کی کوشش کی جائے۔"

بچے کو اپنے ماں باپ سے اکثر یہ سننے کو ملتا ہے کہ "جو ہم نے کہہ دیا وہی ہوگا۔" یا یہ کہ "جب منع کر دیا تو!" یا اس قسم کے اور بہت سے فرمان۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچہ ایک روبوٹ کی طرح ہمارا کہنا مانتا ہی چلا جائے اور بچہ ... بچہ یہ چاہتا ہے کہ جس طرح میں کہنا مانتا ہوں اسی طرح اور لوگ بھی میرا ایک بار کا کہنا مانیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ اَڑ جاتا ہے۔ ضد کرتا ہے، ناراض ہوتا ہے غرض اپنے غصے کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔ اور ہم ایسے میں اس بیچارے کو ضدی اور بدتمیز کہہ دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ ضد اس کو اس کے بڑوں نے دی ہے۔ بچہ محفل میں ضد کر کے اپنی طرف توجہ منتقل کروانا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ میرے ساتھ بھی اسی طرح زبردستی کی جاتی ہے۔ اور پھر وہ معصوم پریشان ہو جاتا ہے کہ جب بڑے زبردستی اپنی بات منواتے ہیں تب تو کوئی انھیں ضدی یا بدتمیز نہیں کہتا پھر مجھ پر یہ ظلم کیوں؟۔ American Medical Association کے ذریعے چھاپی گئی ایک کتاب "Today's Health Guide" میں لکھا ہے کہ جب والدین بچوں کی ضد کی شکایت کرتے ہیں تو وہ بالکل اس کارٹون جیسی ہے جس میں ایک آدمی اُسے گدھے کو کھینچ رہا ہے جو بری طرح اڑا ہوا ہے اور چلنے کو تیار نہیں ہے مگر وہ شخص مستقل زبردستی کر رہا ہے۔ اس کارٹون کا عنوان ہے "اوہ کتنا ضدی آدمی ہے!"

بچے کے ماں باپ اور دوسرے بڑوں کا یہ فرض ہے کہ بچوں کو ضرورت سے زیادہ دبا کر نہ رکھیں۔ ان کی باتوں کو غور سے سُنیں۔ ایسا نہ کریں کہ اگر بڑے بات کر رہے ہیں اور بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو ہم اسے فوراً روک دیں کہ بڑوں کے بیچ میں بچے نہیں بولتے، یا یہ کہ آپ لوگ یہاں سے جائیے۔ بلکہ ہمیں ان کی رائے کا احترام کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مناسب الفاظ استعمال نہ کر سکے یا اس کی بات سے بچپنہ اور نا تجربہ کاری جھلک رہی ہو، پھر بھی اس کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیئے۔ بلکہ اس کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے تاکہ وہ بھی اپنے آپ کو گھر کا ایک فرد سمجھ سکے۔ مگر یہاں بھی توازن کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ اگر بچے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت، دی گئی یا زیادہ ہی آزادی دے دی گئی تو بقول شخصے وہ سر پر چڑھ جائیں گے، اور اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ بڑا سمجھنے لگیں گے۔ اور اس سے پھر دیگر دشواریاں پیش آ سکتی ہیں، جیسے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ زیادتی کرنے لگتے ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑے بچے کو آزادی ہے اپنے خیالات کے اظہار کی اپنی بات منوانے کی مگر چھوٹے اس حق سے محروم ہیں۔ یہ بڑا بچہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو ضرورت سے زیادہ روک ٹوک میں رکھتا ہے، یہاں تک بھی دیکھا گیا ہے کہ کئی مرتبہ والدین سے بھی زیادہ رعب اس کا ہوتا ہے۔ اس طرح ان چھوٹے بہن بھائیوں کی شخصیت تو بالکل دب کر ہی رہ جاتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچہ مہمانوں کے سامنے زیادہ ضد کرتا ہے۔ اور شاید سب سے زیادہ شرمندگی بھی ہمیں اسی وقت ہوتی ہے اور ایسے میں ہم غصے سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو الگ لے جا کر بچے کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور کچھ اس کی ضد پوری کر دیتے ہیں۔ پہلی صورت میں تو بچہ سہم جاتا ہے اور والدین خوش ہو جاتے ہیں۔ دوسری صورت میں بچہ کھِل اٹھتا ہے کیوں کہ اس کی مراد بر آئی ہے۔ اور یہی نہیں آگے کے لیے بھی اس کا راستہ کھل گیا وہ یہ سمجھ گیا کہ اگر مہمانوں کے سامنے ضد کی جائے تو بات فوراً مان لی جاتی ہے، یا یہ کہ اگر میں روؤں گا تو ماں باپ تنگ آ کر میری بات مان لیں گے۔ اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔ والدین کو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیئے۔ اگر وہ بچے کو دس منٹ رُلانے کے بعد کوئی بات ماننے والے ہیں تو کیوں نہیں وہ پہلی بار میں ہی مان جاتے۔ اس سے ان کا وقار بھی قائم رہے گا اور بچہ مطمئن بھی رہے گا۔ پھر اگر چار باتیں فوراً مان لی گئیں اور ایک بات کو منع کیا گیا تو بچہ اس منع کو منع ہی مانے گا۔ رفتہ رفتہ بچہ یہ سمجھ جائے گا کہ غلط بات پر ہی منع کیا جاتا ہے اور پھر یہ منع، منع ہی ہوتا ہے۔ سہی بات تو ہمارے والدین مان ہی لیتے ہیں۔ اور جہاں بچے میں صحیح اور غلط کی تمیز آئی کہ آپ کی مشکل آسان ہوئی۔ پھر یہ بچہ آپ کا خوب صورت ساتھی بن جائے گا، آپ کا دوست ہوگا اور آپ کی ذرا سی توجہ پا کر اس قابل ہو جائے گا کہ اپنا بھلا برا خود سمجھنے لگے۔

بچوں کو اس منزل تک لانے میں واقعی دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے۔ بچوں کی پرورش ایک مشکل مسئلہ بھی ہے اور ایک خوشگوار فریضہ بھی۔ اگر بچے کی شخصیت میں کوئی اچھائی ہے تو وہ سماج پر اچھا اثر

ڈالتی ہے اور اسی طرح سے اگر یہ بری عادت، سماج میں برائی بڑھاتی ہے اور اگر بچہ ضدی ہے تو وہ بڑے ہوکر سماج میں اسی ضد کو پھیلائے گا۔ اور ضدی انسان ہر وقت اپنی بات پر اڑا رہتا ہے اس وقت وہ بھلے برے کی پہچان نہیں کر پاتا۔ اور یہ بھی بات واضح ہے کہ ایک ضد دوسری ضد کو جنم دیتی ہے اور اسی طرح سماج میں انتشار بڑھتا ہے۔ اور آج ضرورت ہے ایسے سماج کی جس میں ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات کی عزت کی جائے۔ جہاں اتنی سوجھ بوجھ ہو کہ بھلے برے کا فرق محسوس کر سکیں۔ اور یہ سب خصوصیات ہم کسی شخص میں ایک دن میں نہیں ڈال سکتے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی پرورش سے اس کے بچپن سے اور اس کے ماضی سے، اس لیے ہمیں یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ بچوں کی پرورش پر پوری توجہ دی جانی چاہیے۔ اسے ایسا ماحول مہیا کرنا چاہیے جس میں اس کی تمام چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آ سکیں۔ انسان فطرتاً شر پسند ہے۔ شر پسندی کے جراثیم اس میں موجود ہیں۔ اور جیسے ہی اسے موقعہ ملتا ہے یا یوں کہیں کہ ڈھیل ملتی ہے تو وہ پنپنے لگتے ہیں۔ ایسے میں والدین کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ بچے کی تربیت کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ اس کی شخصیت میں پائی جانے والی کمیوں کو دبایا جائے اور اچھائیوں کو ابھارا جائے صحت مند خیالات کو پھلنے پھولنے کا پورا موقعہ دیا جائے۔

ماں باپ بچے کے سامنے سب سے بڑی مثال ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کی شخصیت میں کوئی جھول ہے تو یہ کمی بچوں کے کردار میں بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم خود اپنے رویّے اور اپنی شخصیت پر ناقدانہ نظر ڈالیں۔ اگر کہیں کسی ترمیم کی ضرورت ہے تو وہ کریں۔ اور تب ہی ہم ایک ہنستے کھیلتے خوشحال اور صحت مند سماج کی تعمیر میں مدد کر پائیں گے۔

بقیہ: ہماری ریلویز۔ جدید کاری کے عمل میں تیزی

سرگرمیوں کی توسیع کا کام منصوبے میں شامل ہے

توانائی ریلویز کے عام چالو اخراجات کے ۲۰ فی صد سے کچھ زیادہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اخراجات میں بہتری لانے کے لیے توانائی کی بچت نہ کرنے والے ... انجنوں کے تیزی سے ... انجنوں میں ایندھن کی بچت ... ساماں لگانے نیز بجلی ... تھائیرسٹر لگانے کو ترجیح ... ڈیزل اور بجلی کے انجنوں میں ملیج بیو بر نیسیر لگائے جا رہے ہیں اور ڈرائیوروں کو اسیمو لیٹروں کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ہلکے وزن کے مسافر اور مال ڈبوں کی شروعات بھی کی جائے گی۔ سگنلوں اور لیول کراسنگ گیٹ پر سگنلوں میں روشنی کے لیے، جہاں کہیں ممکن ہے، شمسی توانائی کا استعمال کیا جائے گا۔

ریلویز میں نظر انداز شدہ شعبوں میں سے ایک شعبہ زیادہ شرح والی اشیاء رہا ہے، جو گزشتہ برسوں میں سڑک کے شعبے کو چلا گیا ہے۔ مناسب استحکام اور کنٹینروں پر مبنی کام کو فروغ دے کر اس رجحان کو پلٹنے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے وضع کردہ رہنما خطوط کے مطابق، مسافروں کی آمد و رفت (فی کلومیٹر) میں پانچ فی صد کا اوسط سالانہ اضافہ مضافاتی اور غیر مضافاتی دونوں ٹریفک کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

ریلویز سب سے بڑے محکمہ جاتی اداروں میں سے ایک ادارہ ہے، جس میں ۱۶ لاکھ سے زیادہ افراد ملازم ہیں۔ افرادی قوت کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے بہتر تربیت دے کر نیز جدید طریقوں اور ساز و سامان کے بارے میں معلومات فراہم کر کے ہنر میں اضافہ کرنا ہوگا اور اسے تازہ ترین بنانا ہوگا۔ افرادی قوت کو برقرار رکھنے اور کام کاج کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے کثیر درجے کے ہنر ... مناسب طور سے تشکیل دی جائے گی۔ مرحلہ وار ختم کی جانے والی سرگرمیوں سے وابستہ فاضل عملے کو مطلوبہ تربیت کے بعد مختلف شعبوں میں تعینات کیا جائے گا۔ خاص طور سے بھاپ کے انجنوں کو مرحلے وار ختم کئے جانے کی وجہ سے جو عملہ فاضل ہو گیا ہے، اس کو ڈیزل اور بجلی کے شیڈوں میں بار برداری اور مال ڈبوں کے ڈپوؤں میں تعینات کیا جائے گا۔

مناظر حسین

الائچی ــــــ ایک خوشبودار دوا

الائچی محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کا استعمال مصالحہ جات کے طور پر اکثر گھروں میں کیا جاتا ہے۔ الائچی دو قسم کی ہوتی ہے۔ اوّل بڑی الائچی۔ دوم چھوٹی الائچی۔ حالانکہ دونوں قسم کی الائچی کا استعمال بطور دوا ہوتا ہے۔ لیکن بڑی الائچی مصالحوں میں زیادہ اور چھوٹی الائچی دواؤں میں زیادہ کام آتی ہے۔ ہم یہاں چھوٹی الائچی کی صفات، اس کی خوبیاں اور اس کے گھریلو استعمال کا ذکر کریں گے۔

الائچی کی کاشت ہمارے ملک میں کیرل، میسور اور مالابار میں ہوتی ہے۔ خوشبودار ہونے کے باعث یہ منھ کی بدبو کو ختم کرتی ہے۔ یہ بدہضمی، دل کی کمزوری اور سردرد کے لیے مفید ہے۔ یہ ہاضم ہے لہٰذا معدہ کی تمام خرابیوں کو دور کر اس کی اصلاح کرتی ہے۔ الائچی کو آپ درج ذیل بیماریوں میں گھریلو نسخے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

منھ کی بدبو

جس شخص کے منھ سے بدبو آتی ہو یا سانس بدبودار ہو تو انھیں دن میں چار پانچ بار الائچی چبانا چاہیے۔ لہسن، پیاز کھانے کے بعد بھی الائچی چبا لینے سے منھ کی بدبو ختم ہو جاتی ہے۔

اگر منھ کی بدبو شدید ہو تو الائچی کو خس کے سفوف کے ساتھ پان میں رکھ کر کھانے سے بدبو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس کا مسلسل استعمال کم از کم چالیس دنوں تک ضرور کریں۔

پتّی اُچھلنا

کئی بار جسم کو کھجلا دینے یا پھر یوں ہی پتّی اُچھلتی ہے جو کبھی کبھی پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس مرض میں سب سے پہلے مریض کو ارنڈی کا تیل (دو سے چار چمچہ) پلا کر پیٹ صاف کروالیں اس کے بعد یہ نسخہ استعمال کریں:۔

الائچی چھوٹی ۱۰ گرام، دارچینی ۱۰ گرام، پیپل ۱۰ گرام۔ ان تینوں کو پیس کر سفوف بنالیں اس میں ۲۵ گرام مصری پیس کر ملالیں۔ نصف چمچہ کی مقدار دن میں دو بار تھوڑے مکھن کے ساتھ کھلائیں۔ ہر قسم کی پتّی رفع ہوگی۔

لیکوریا

(عورتوں کو سفید پانی آنا) عورتوں کے لیکوریا کے مرض میں مساو چین (نیلی دھاری والی) چھوٹی الائچی، ناگ کیشر ہر ایک ۰۵ گرام لیں۔ اسے کوٹ پیس کر سفوف بنالیں۔ اس میں ۱۵۰ گرام مصری پیس کر ملالیں اور کسی شیشی میں رکھ لیں۔ مریضہ کو اس کا ایک ایک چمچہ کی مقدار دن میں دو بار ملائی والے دودھ کے ساتھ کھلائیں۔ مسلسل دو ماہ کے استعمال سے پرانا لیکوریا بھی جڑ سے چلا جائے گا۔

منھ کے چھالے

اگر کوئی منھ کے چھالوں کے باعث پریشان ہو تو چھوٹی الائچی کباب چینی، کتھّہ اور سنگ راحت برابر مقدار میں لے کر سفوف بنالیں۔ اس سفوف کو دن میں تین چار بار منھ اور زبان میں مل کر تھوڑی دیر بعد کلّی کر لیں۔

سینے کی جلن

اگر گلے میں یا سینے میں جلن ہوتی ہو، تیزابیت میں اضافہ ہو گیا ہو تو بنسلوچن، چھوٹی الائچی، تیزپات، ہرڑ چھوٹا، ہرڑ بڑا، موتھا، آملہ، اقرقرہ سب کو برابر مقدار میں لے کر کوٹ پیس کر رکھ لیں۔ اس سفوف کو حسب ضرورت ایک چمچہ کی مقدار میں پانی کے ساتھ دو بار استعمال کریں۔ انشاء اللہ فائدہ

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

موضع ڈلوا، ڈاکخانہ بارا، ضلع گیا (بہار)
بوحبا، نئی دہلی

حسن ضیاء

ملک کی تعمیر و ترقی کا منشور

آئین کے رہنما اصول

ہندوستان کی تحریک آزادی کا دور نہایت طویل اور فکری اعتبار سے قدرے گوناگوں رہا ہے۔ آزادی کی یہ تحریک کم و بیش ڈیڑھ سو برس پر محیط ہے۔ اسی دوران خاص کر اس صدی کے دوسرے، تیسرے دہوں میں ہماری تحریک آزادی نے ایک واضح سمت اختیار کی اور یہ "آزادی کامل" کی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہوئی۔ اسی دور میں ہم نے مستقبل کے ہندوستان کو فلاحی ریاست بنانے، آزادی، مساوات اور بھائی چارے پر مبنی ایک نیا نظام تشکیل دینے، منصوبہ بند ترقی کی راہ پر چلنے اور سماجی اور معاشی برابری لانے کے خواب دیکھے۔

آزاد ہندوستان کا آئین دنیا کے تحریر شدہ آئینوں میں سب سے طویل اور ضخیم مانا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ ۳۹۵ دفعات پر مشتمل تھا۔

ایک نئی قومی مملکت کی تعمیر و ترقی اور اس کے عوام کے فلاح و بہبود کو مملکت کی ذمہ داری کے طور پر آئین میں شامل کرنا انوکھی سی بات تھی جس کی مثالیں دنیا کے آئینوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سلسلے میں آئین مملکت کو جو ہدایات دیتا ہے انہیں مملکت کی پالیسی کے لیے رہنما اصول (Directive Principles of State Policy) ...

ہمارے آئین سازوں کے آئین کے طرز پر مملکت کو پالیسی سا... کرنے کی سمت کا ... رہنما اصول (... Principles) درج ہیں۔ اصولوں کا یہ باب جو آئین کا چوتھا باب ہے دفعہ ۳۶ سے شروع ہوکر دفعہ ۵۱ پر ختم ہوتا ہے۔

ان رہنما اصولوں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ مملکت کے تینوں ستونوں یعنی انتظامیہ، قانون سازیہ اور عدلیہ تینوں سے ان اصولوں پر چلنے کو کہا گیا ہے مگر ایسا نہ ہونے کی حالت میں کسی شہری کو یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ وہ کسی عدالت کو رجوع کرے جب کہ آئین کے تیسرے باب یعنی بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی حالت میں کوئی بھی شہری عدالت سے چارہ جوئی کرسکتا ہے۔ دراصل ان اصولوں پر گامزن ہونا ہمارے آئین کے مطابق مملکت کا قانونی فریضہ نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری ہے مگر ان اصولوں کا آئین میں باقاعدہ و باضابطہ درج ہونا ان کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ نیز حکومت اور مملکت کے دیگر دو ادارے

دفعہ ۳۸ میں درج ہے۔ اس کے مطابق مملکت ایک ایسا سماجی نظام قائم کرے جو عوام کے فلاح و بہبود کو فروغ دینے پر مبنی ہو، جس میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف قومی زندگی کے تمام اداروں تک پہنچے اور جہاں آمدنی، منصب اور سہولتوں کے اعتبار سے تفریق کو کم کیا جائے۔ یہ دفعہ ان معنوں میں بہت اہم ہے کہ اسی اصول کی بنیاد پر ہماری مملکت فلاحی کہلاتی ہے۔ حکومت نے اس اصول کے نفاذ کے سلسلے میں متعدد قوانین بھی بنائے ہیں اور عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔

دفعہ ۳۹ کے تحت مملکت اپنی پالیسی

سی-۱۹۷، قدوائی نگر ایسٹ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۳

یوجنا، نئی دہلی

اس طرح بنائے کہ عورتوں اور مردوں کو روزگار کے یکساں حقوق حاصل ہوں۔ سماج کے مادی وسائل کی تقسیم اس طرح ہو کہ ان سے مجموعی فلاح کا مقصد پورا ہو سکے ۔ معاشی نظام، دولت اور پیداوار کے وسائل ملک کے اجتماعی مفادات کو نقصان نہ پہنچائیں ۔ عورتوں اور مردوں کو برابر کام کے لیے برابر اجرت دی جائے ۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو ایسا روزگار اپنانے پر مجبور نہ کیا جائے جو ان کی صحت کے لیے مضر ہو، بچوں کو نشو و نما کے صحت مند مواقع مل سکیں اور ان کا استحصال نہ ہو۔

مندرجہ بالا ہدایات میں سے اکثر روبہ عمل آ چکی ہیں ۔ بہبود کا محکمہ اور انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں خواتین اور بچوں کی ترقی کا محکمہ بالخصوص اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دیتے ہیں ۔ قانون سازی کے ذریعہ بھی متعدد فلاحی اقدامات اس سلسلے میں کیے گئے ہیں جن کا مقصد بچوں سے چھوٹی عمر میں نوکری کرانے جیسے امور پر پابندی عائد کی گئی ہے ۔

دفعہ ۳۹ ۔ اے جس کا اضافہ ۱۹۷۶ کی ۴۲ ویں آئینی ترمیم کی رو سے ہوا مملکت پر اس بات کی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ قانونی نظام کے ذریعہ سب کو انصاف دلائے اور غریبوں کو مفت قانونی امداد کے لیے قانون سازی اور دیگر اقدامات کرے ۔

پچھلے کئی برسوں سے مفت قانونی امداد فراہم کرنے پر خاص توجہ رہی ۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جون ۱۹۹۱ سے اکتوبر ۱۹۹۲ تک مختلف عدالتوں میں تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو قانونی امداد یا مشورہ دیا گیا ۔

دفعہ ۴۰ میں مملکت سے کہا گیا ہے کہ وہ دیہی پنچایتوں کی تنظیم کرے اور انہیں ضروری اختیارات دے ۔ یاد رہے کہ پنچائتی راج نظام کو موثر اور مضبوط بنانے کے سلسلے میں مرکزی حکومت اہم اقدامات کرنے پر غور کر رہی ہے ۔

دفعہ ۴۱ کے مطابق مملکت اپنی معاشی صلاحیت کے حدود میں بے روزگار، ضعیف العمر، بیمار اور محتاج افراد کیلئے کام تعلیم اور سرکاری امداد کا حق دلائے۔

حکومت معذور افراد کے بہبود کیلئے ایک قومی پالیسی تشکیل دے رہی ہے ۔ بہبود کا محکمہ تکنیکی اور مالی امداد دے کر سماجی خدمات کے کاموں میں رضاکار تنظیموں کی شرکت پر زور دے رہا ہے ۔

دفعہ ۴۲ کے مطابق مملکت عوام کو کام کاج کا اچھا ماحول فراہم کرے گی ۔ دفعہ ۴۳ کے تحت مملکت سے کہا گیا ہے کہ وہ مناسب قانون سازی یا معاشی تنظیم یا کسی دوسرے طریقے سے زرعی صنعتی اور دیگر شعبوں سے متعلق مزدوروں کے لیے گزارے کے لائق اجرت دلائے اور ان کے کام کاج کا ماحول ایسا ہو جس میں وہ اچھی زندگی بسر کر سکیں ۔ مملکت انفرادی یا امداد باہمی کی کوششوں سے چلنے والی گھریلو صنعتوں کو فروغ دے ۔ دفعہ ۴۳ اے جسے ۱۹۷۶ میں ۴۲ ویں آئینی ترمیم کے ذریعہ شامل کیا گیا مملکت کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ مناسب قانون سازی یا دیگر طریقوں سے صنعتوں کے انتظام و انصرام میں وہاں کے کارکنوں کو شرکت دلائے ۔

دفعہ ۴۴ کے مطابق مملکت اس بات کی کوشش کرے گی کہ سارے ملک کیلئے یکساں سول کوڈ بنایا جائے ۔ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ خاصا متنازعہ فیہ ہے ۔ اس سلسلے میں بعض حلقے بڑی شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ لیکن جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس سلسلے میں اس کی پالیسی واضح ہے ۔ اس کا موقف یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ عوام پر تھوپا نہ جائے بلکہ اس سلسلے میں عام اتفاق رائے ہونے پر ہی یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے ۔

دفعہ ۴۵ کے مطابق مملکت آئین کے نفاذ کے دس برس کے اندر ۱۴ برس تک کی عمر کے بچوں کو مفت تعلیم فراہم کرے ۔ ابتدائی تعلیم کا تعلق ریاستی حکومتوں سے ہے ۔ متعدد ریاستی حکومتوں نے اس سلسلے میں اقدامات کیے ہیں ۔ بعض ریاستوں میں تو ۱۲ ویں درجے تک بالخصوص لڑکیوں کے لیے مفت تعلیم کا بندوبست ہے ۔

دفعہ ۴۶ کے مطابق مملکت عوام، کمزور طبقات خاص طور پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے تعلیمی اور معاشی مفادات پر خاص توجہ دے ۔ اور سماجی ناانصافی نیز ہر قسم کے استحصال سے ان کی حفاظت کرے ۔

ہمارے آئین میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے لیے پارلیمنٹ ریاستی اسمبلیوں اور سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن سے متعلق دفعات موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ حکومتی سطح پر بھی ان ذاتوں اور قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے متعدد اسکیمیں چل رہی ہیں ۔ مخصوص شدہ اسامیوں کو پر کرنے

کے لیے ایک خصوصی مہم شروع کی گئی ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے مالی ترقیاتی کارپوریشن کا مخصص سرمایہ ۷۵ کروڑ روپیہ سے بڑھاکر ۱۲۵ کروڑ روپیہ کردیا گیا ہے۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر صدی تقریبات کے تحت ۵۰ء۸ کروڑ روپیہ کی رقم ڈاکٹر امبیڈکر فاؤنڈیشن کو دی گئی تاکہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے بہبود کی اسکیموں پر عمل ہو سکے۔

دفعہ ۴۷ میں مملکت پر یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ عوام کی غذائیت کی سطح اور معیار زندگی کو بلند کرنے کو اپنا بنیادی فرض سمجھے اور منشیات کے استعمال کی روک تھام کرے۔

دفعہ ۴۸ کے مطابق مملکت اس بات کی کوشش کرے کہ زراعت اور مویشی پالن کی جدید سائنسی طرز پر تشکیل کی جائے اور جانوروں کی نسلوں کی حفاظت اور بہتری کی کوشش کی جائے۔

ہندوستان میں آج بھی عوام کی اکثریت کا روزگار زراعت سے وابستہ ہے۔ آزادی کے بعد سے ہی زراعت ترجیحی شعبہ رہا ہے۔ زراعت کے سلسلے میں قومی پالیسی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ہے۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں زراعت پر خرچے کے لیے ۱۰۵ء۱۱ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں جو ساتویں منصوبے کے مقابلے ۵۸۱ کروڑ روپیے زیادہ ہیں۔ ساتویں منصوبے کے مقابلے اس منصوبے میں زرعی تحقیق و تعلیم پر آنے والے اخراجات میں بھی ۳۰۰ فی صد اضافہ کیا گیا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ کے دوران سرکاری اعداد و شمار کے مطابق زرعی شعبہ کو ۵۲۳۸ کروڑ روپیہ کا قرضہ تقسیم کیا گیا جو ۹۱-۱۹۹۰ میں دیئے گئے قرضے کی رقم سے ۱۸۳۰ کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔ زرعی پیداوار کے فروخت کی حوصلہ افزائی کی غرض سے بین ریاستی نقل و حمل کی اجازت دے دی گئی ہے۔

آئین کی دفعہ ۴۸۔ایف کا تعلق ماحولیات سے ہے۔ یہ بعد میں آئین کا حصہ بنی۔ اسے ۱۹۷۶ میں ۴۲ ویں آئینی ترمیم کے ذریعہ شامل کیا گیا اس کا نفاذ ۳ جنوری ۱۹۷۷ سے عمل میں آیا۔ اس کے مطابق مملکت اس بات کی کوشش کرے گی کہ ماحولیات کو بہتر کیا جائے اور ملک میں جنگلات اور جنگلی جانوروں کا تحفظ کیا جائے۔

بالخصوص گذ

ماحولیات پر حکومت

ہے۔ ماحولیات اور

وزارت تشکیل دی

حال ہی میں ماحولیات کے تحفظ کے قومی حکمت عملی اور آلودگی کم کرنے سے متعلق ایک پالیسی بیان جاری کیا ہے جس کی بنیاد پر حکومت کے مختلف شعبوں کی پالیسی اور پروگرام میں ماحولیات کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ حکومت نے ترجیحی سطح پر سخت نگرانی کرنے کی غرض سے صنعتوں کے ۱۷ زمروں کی نشاندہی کی ہے۔ عالمی بنک کی منظوری سے صنعتی آلودگی روکنے کی ۱۳۱ اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ جن پر کل ملاکر ۵۰ء۱ لاکھ ڈالر کی لاگت آئے گی۔ آس پاس واقع چھوٹی صنعتوں کے لیے گندگی صاف کرنے کے مشترکہ پلانٹ کھولے گئے ہیں۔ ۱۸ بڑے دریاؤں کے زیادہ آلودہ حصوں کی صفائی کے لیے ملک گیر سطح کا ایکشن پلان بنایا گیا ہے۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے قانون میں ترمیم کرکے ہر قسم کے شکار پر خواہ وہ تجارتی ہو یا تفریحی، پابندی عائد کردی گئی ہے۔

۵ جون ۱۹۹۳ کو عالمی یوم ماحولیات کے موقع پر دریائے جمنا کی صفائی کا ایک بڑا پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔

آئین کی دفعہ ۴۹، مملکت پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ فنی اور تاریخی دلچسپی کی عمارتوں اور قومی اہمیت کے مقامات کا تحفظ کرے اور ان کو خراب ہونے سے بچائے۔ دفعہ ۵۰ میں مملکت سے کہا گیا ہے کہ وہ عدلیہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے سے الگ رکھے ... اس اصول کا ...

کو فروغ دے، ملکوں کے درمیان منصفانہ اور باعزت مراسم بنائے، عالمی قوانین اور ملکوں کے مابین معاہدوں کے احترام کا جذبہ پیدا کرے اور عالمی تنازعات کے ثالثی کے ذریعہ فیصلے کی حوصلہ افزائی کرے۔

عالمی امن اور اخوت روز اول سے ہندوستان کا طریقہ رہا ہے۔ چھٹی دہائی کے شروع میں اس وقت کے یوگوسلاویہ کے دارالحکومت بلغراد میں ناوابستہ تحریک کی بنیاد ڈالنے والے تین عالمی رہنماؤں میں ہمارے آنجہانی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی شامل تھے۔ اس تحریک کا مقصد دو بلاکوں میں منقسم دنیا اور اس کی باہمی رقابتوں سے دور رہ کر

(باقی ص۶)

بقیہ: آپ سب کے لیے

میں ۱۲۹ ملیں بند تھیں جبکہ ۳۱ مئی ۱۹۹۳ کو سوتی کپڑے اور ہاتھ سے تیار ہونے والے فائبر کپڑے کی ۲۲ ملیں (جو کمپنی قانون کے تحت بند ہو رہی ہیں) بند ہیں۔ گیارہ سوتی کپڑے نیز ہاتھ سے تیار ہونے والے فائبر کپڑے کی ۱۰۶ ملیں مختلف وجوہات کی بنا پر عارضی طور پر بند ہیں۔

شری سوامی نے مزید بتایا کہ امداد باہمی شعبے کے تحت کپڑے کی جو ملیں بند ہیں انھیں دوبارہ شروع کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف تجاویز موصول ہو رہی ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ساتویں منصوبے کے دوران حکومت نے بھارتی ترقیاتی بینک کی سرپرستی میں کپڑے کی صنعت کی جدید کاری کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی اسکیم قائم کی تھی۔ فروری ۱۹۹۳ تک کپڑے کی ملوں کی جدید کاری کے لیے ۲۴ر ۸۷۵ کروڑ روپے کی رقم جاری ہو چکی ہے۔

علاوہ ازیں ساتویں منصوبے کے دوران حکومت نے ۱۴ر ۸۲۰ کروڑ روپے (منصوبہ جاتی۔ غیر منصوبہ جاتی) ہتھ کرگھے شعبے کو اور دو کروڑ روپے پاورلوم شعبے کو فراہم کیے۔

غذائیت سے متعلق پالیسی

حکومت نے آبادی کے ان طبقات کے لیے جو قلتوں کا شکار ہوتے ہیں، غذائیت کی سطح میں اصلاح و بہتری لانے کی غرض سے قومی غذائیت پالیسی وضع کی ہے۔ اس پالیسی کو خواتین و بچوں کی ترقی و فلاح و بہبود کے محکمے نے وضع کیا ہے اور اسے پارلیمنٹ کے گذشتہ اجلاس میں ایوان کے روبرو پیش کیا گیا۔ پالیسی ناقص غذائیت کے خاتمے کے اقدامات کی سفارشات کی حامل ہے اور اس کے لیے براہِ راست کارروائی اور طویل المدت ادارہ جاتی تبدیلیوں کی بات کرتی ہے۔ اس برس کا غذائیت کی اصلاح و بہتری کا ہفتہ یکم ستمبر سے ۷ ستمبر تک منایا گیا۔ خواتین و بچوں کی ترقیات کی وزیرِ مملکت شریمتی یاسورا جیشوری نے اپنے ایک پیغام میں امید ظاہر کی ہے کہ اس موقع پر ناقص غذائیت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نقائص کو دور کرنے کی جانب توجہ مبذول ہوگی۔

بھارت جاپان سائنس کونسل کا قیام

بھارت جاپان سائنس کونسل کا قیام عمل میں آیا ہے۔ پروفیسر سی۔ این۔ آر۔ راؤ اور پروفیسر ایس۔ ناگاکورا اس کونسل کے مشترکہ چیرمین ہوں گے۔ کونسل کی حالیہ میٹنگ نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔

ترجیحاتی شعبوں میں مولے کولر ڈھانچہ، نئے ساز و سامان، جدید حیاتیاتی سائنس، مینوفیکچرنگ سائنس، ستارہ شناسی پر مشترکہ تحقیق و سیمینار شامل ہیں۔ کونسل نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ سائنس کی ترقی و فروغ کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی سے قبل کی فیلوشپ بھی دی جائے۔

بنجر زمین کی ترقی

بنجر زمین ترقیات کے وزیر مملکت کرنل راؤ رام سنگھ نے کہا ہے کہ حکومت عوامی اشتراک و تعاون سے نیز کارپوریٹ سیکٹر کو ملوث کر کے بڑے پیمانے پر بنجر زمین کی ترقی کا کام انجام دے گی۔ موصوف نے ان خیالات کا اظہار دیہی ترقیات کی وزارت کی پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ محکمے نے پہلے ہی ناگالینڈ میں ان علاقوں میں جہاں روائتی طور پر چائے نہیں اگائی جاتی، چائے کے پودے لگانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کام میں ریاستی حکومت اور چائے بورڈ کا تعاون شامل ہے محکمہ بنجر زمین پر جوجوبا، سرخ آئیل، پام ربڑ اور کاجو کی شجرکاری کے امکانات پر غور کر رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جوجوبا شجرکاری محکمے کا محکمہ ایک تکنیکی اقتصادی رپورٹ کو حتمی شکل دے رہا ہے۔

بصارت سے محروم افراد کے لیے اسکول

بہبود کے وزیر مملکت شری کے وی تھنگکا بالو نے بتایا کہ ملک میں مربوط تعلیم کی مرکزا اسکیم کے تحت معذور بچوں کے لیے ۹۵۲۵ مربوط اسکول ہیں۔ یہ اسکول عام اسکولوں میں بصارت سے محروم بچوں سمیت معذور بچوں کو تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بصارت سے محروم بچوں کے لیے ۲۴۳ رہائشی اسکول بھی ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۱ میں ۴۷ر۳۴ لاکھ افراد بصارت سے محروم تھے۔ یہ انکشاف نیشنل سمپل سروے آف انڈیا کے ذریعہ منعقد کرائے گئے معذور افراد کے ایک جائزے سے سامنے آئی ہے۔

نئی دھلی

یوجنا

جلد ۱۳ — شمارہ ۱۵-۱۶

یکم تا ۳۰ نومبر ۱۹۹۳ء — ۱۰ کارتک تا ۹ اگرہائن تک ۱۹۱۵

قیمت: ۳ روپے

شرحِ چندہ: سالانہ ۳۰ روپے، دو سالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی: ۳ روپے

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ای صد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دھلی ۶۶ ۱۱-

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن: سُدرشن موھن چہل

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱ ۱۱

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

م۔ک۔مہتاب

بچوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کی بہبود

بچے ہر قوم اور ہر معاشرے کا مستقبل ہیں اور انھیں صرف قوم کے مستقبل کو نظرانداز کر کے ہی نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی یافتہ اقوام جتنی توجہ بچوں کے فلاح پر مرکوز کرتی ہیں اُتنی کسی اور شعبے کے حصے میں نہیں آتی۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے اقوام متحدہ میں بھی اس جانب ضروری توجہ دی جا رہی ہے۔

بچے دنیا کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہیں وہی نوع انسان کا مستقبل ہیں اس لئے اُن کی اچھی زندگی، صحت، تعلیم اور فلاح کے حق کی جانب بالغوں کی نسبت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۹۷۹ء کو بچوں کا سال قرار دیا تھا جس کے دوران بچوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کے ممالک کے پالیسی سازوں پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ملک میں بچوں کی فلاح کے منصوبے تیار کریں۔

۱۹۷۹ء میں ہی ماسکو میں بچوں کے لئے پُرامن اور محفوظ مستقبل کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس نے تمام ممالک سے اپیل کی کہ وہ بچوں کے حقوق کے بارے میں ایک کنونشن منظور کریں اور بچوں کو مناسب خوراک، رہائش، صحت، تعلیم، پرورش اور ہر قسم کے جسمانی یا ذہنی تشدد سے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ اس اپیل اور اقوام متحدہ کی کوششوں کے باوجود دنیا کے بہت سے ممالک میں بچے خوراک کی کمی، ناخواندگی، محنت اور جنس کے استحصال کا شکار ہیں۔ اقوام متحدہ کی طرف سے تمام ممالک کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے مستقبل کے تئیں اپنی ذمہ داری کو پورا کریں۔

بھارت میں عمل

بچوں کی بقا، سلامتی اور ترقی کے بارے میں ستمبر ۱۹۹۰ء کے عالمی اعلانیہ پر دستخط کرنے والے ایک ملک کے طور پر بھارت میں عالمی اعلانیہ کے مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ایک قومی منصوبہ مرتب کیا گیا ہے۔ منصوبے کے تحت ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کے لئے درج ذیل نشانے مقرر کئے گئے ہیں۔

- ایام طفولیت میں اموات کی شرح کم کر کے ایک ہزار پیدائش کے مقابلے میں ساٹھ سے بھی کم سطح پر لائی جائے گی۔
- زچگی کے دوران عورتوں کی اموات کی شرح میں پچاس فیصد کمی کی جائے گی۔
- پانچ برس تک کی عمر کے بچوں میں غذا کی کمی کے اعداد میں پچاس فیصد کمی کی جائے گی۔
- ہر بچے کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا جائے گا اور صفائی کا بہتر ماحول مہیا کیا جائے گا۔
- سب بچوں کو اسکول میں داخل کیا جائے گا۔ تعلیم کے معیار میں نابرابری کو کم کیا جائے گا اور اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہر بچے کو مہیا کی جائے گی۔
- ۱۸ سے ۳۵ برس کے ۸۰ فیصد بالغوں کو تعلیم دی جائے گی جس میں خاص طور پر خواتین کی خواندگی پر زور دیا جائے گا۔
- مشکلات میں زندگی بسر کر رہے بچوں کی بہتر حفاظت کے انتظامات کئے جائیں گے۔

ان نشانوں کے حصول کے لئے جو اسکیمیں بنائی گئی ہیں اُن پر عمل کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لئے قومی سطح پر ایک نگراں کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس میں متعلقہ وزارتوں محکموں اور حکومت کی ترقیاتی پالیسیوں اور بچوں کی فلاح کا کام کرنے والی رضاکار تنظیموں کے نمائندے شامل کئے گئے ہیں۔

بچوں کی فلاح و ترقی کے محکمے نے "بچوں کے تئیں ایک عہد" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں بچوں کے بارے میں قومی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

۱۔ ملک کے تمام بچوں کو صحت کے ایک جامع پروگرام کے مطابق طب اور صحت کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۲۔ بچوں کی غذا کی کمی دور کرنے کے لئے خوراک مہیا کرنے کے پروگراموں پر عمل کیا جائے گا۔

۳۔ بچوں کی عام صحت اور غذا اور حاملہ دودھ پلانے والی عورتوں کی دیکھ بھال اور غذا کے بارے میں تعلیم کے لئے پروگرام شروع کئے جائینگے۔

۴۔ حکومت ۱۴ برس تک کی عمر کے تمام بچوں کو لازمی تعلیم دلانے کے قدم اٹھائے گی۔

۵۔ جو بچے باقاعدہ اسکولوں میں تعلیم حاصل نہ کر سکتے ہوں انھیں ان کی ضروریات کے مطابق تعلیم کے دیگر ذرائع مہیا کئے جائیں گے۔

۶۔ اسکولوں، اجتماعی علاج کے مرکزوں اور دیگر اداروں میں بچوں کو جسمانی تعلیم، کھیلوں اور دیگر تفریحی سرگرمیوں کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۷۔ سب کے لئے یکساں سہولیات کو یقینی بنانے کی غرض سے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے بچوں اور اقتصادی طور پر کمزور افراد کے بچوں کو مرکزی سرکار کی طرف سے خصوصی امداد مہیا کی جائے گی۔

۸۔ جو بچے سماجی طور پر معذور ہیں، بگڑ گئے ہیں، جن سے جبراً بھیک منگوائی جاتی ہے یا جو بچے دیگر اسباب سے مشکلات میں مبتلا ہیں انھیں معاشرے کے مفید شہری بننے کے لئے تعلیم و تربیت اور بحالی کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۹۔ بچوں کو لاپرواہی، ظلم اور استحصال سے بچایا جائے گا۔

۱۰۔ ۱۴ برس سے کم عمر کے کسی بچے کو کسی خطرناک پیشے میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اُس سے بھاری مشقت کرائی جائے گی۔

۱۱۔ جسمانی طور پر معذور اور ذہنی طور پر پست بچوں کو علاج تعلیم اور بحالی کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔

۱۲۔ کسی تباہ کاری یا قدرتی آفات کی صورت میں تحفظ اور راحت کے کام میں بچوں کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۳۔ ہنرمند اور خاص طور پر سماج کے غریب طبقوں کے ذہین بچوں کا پتہ لگانے اور اُن کی مدد و حوصلہ افزائی کرنے کے لئے خصوصی پروگرام مرتب کئے جائیں گے۔

۱۴۔ موجودہ قوانین میں ترمیم کی جائے گی تاکہ والدین یا اداروں کے ساتھ کسی تنازعہ کی صورت میں بچوں کے مفادات پر خصوصی توجہ دی جائے۔

۱۵۔ بچوں کے لئے خدمات مہیا کرتے ہوئے خاندانی رشتوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ کنبے اور ہمسایہ ماحول میں ہی بچوں کی ترقی کی پوری پوری صلاحیتوں کو کام میں لایا جا سکے۔

حکومت کیا کر رہی ہے

بچوں کی دیکھ بھال اور ترقی پر انسانی وسیلوں
کے فروغ کے پروگرام کے ۔ ۔
سے لگاتار توجہ دی جار
خدمات مربوط صورت ۔
جارہی ہیں۔ اس اسکیم
طبقوں کے چھ برس تک
اور دودھ پلانے والی عورتوں کو ابتدائی تعلیم تک کی سہولیات مہیا کی جارہی ہیں۔ بچوں کے لئے مربوط خدمات کا یہ پروگرام دنیا کا سب سے بڑا پروگرام ہے جس کے تحت قریب ساڑھے تین لاکھ مرکزوں کے ذریعہ ۱۹۹۳ء کے آغاز میں ایک کروڑ ۵۳ لاکھ بچوں اور ۳۰ لاکھ عورتوں کو مدد دی جارہی تھی۔ اِس پراجیکٹ پر آئندہ ۵ برس میں ۳ ۳کروڑ روپئے خرچ کا اندازہ ہے جس میں سے ۹کروڑ ۶لاکھ ڈالر کی رقم عالمی بینک مدد کے طور پر دے گا۔

۱۸ برس تک کی اسکولی تعلیم چھوڑ جانے والی نابالغ لڑکیوں کو بہتر گھریلو خواتین بنانے میں مدد ۵۰۷ ترقیاتی بلاکوں میں ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس سے چار لاکھ لڑکیاں ہر برس مستفید ہو رہی ہیں۔

خواتین اور خاص طور پر دیہی علاقوں کی خواتین میں گھر اور بچوں کے تئیں بہتر آگاہی پیدا کرنے اور انھیں سماجی تبدیلی کا فعال رکن بنانے کے لئے اندرا مہیلا یوجنا شروع کی گئی ہے۔

بچوں کو اسکول جانے سے قبل تعلیم دینے کی ایک اسکیم بھی شروع کی گئی ہے تاکہ وہ تعلیم پانے کے لئے تیار ہو کر اسکولوں میں داخل ہوں۔ ایسی اسکیم پر ہر سال تین کروڑ روپیہ خرچ کیا جارہا ہے جس سے قریب ڈیڑھ کروڑ بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

غذا

چھ برس سے کم عمر بچوں اور حاملہ و دودھ
پلانے والی عورتوں کی [illegible]
کے بارے میں ایک قومی غذائی پالیسی مرتب کی گئی ہے۔ بچوں کے بین الاقوامی برس ۱۹۷۹ء میں بچوں کا ایک قومی فنڈ بھی قائم کیا گیا ہے جس کے تحت بچوں کی علاج کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے والی رضاکارانہ تنظیموں کو منظور شدہ پراجیکٹوں کے لئے مالی مدد دی جاتی ہے۔ ۱۹۹۳ء کے لئے ۱۶ پراجیکٹوں کی منظوری دی گئی ہے۔

آبادی کا بوجھ

بچوں کو اُن کی قدرتی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے قابل بنانے کے لئے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں اُن میں کامیابی ہی آئندہ صدی میں ملک میں انسانی وسیلوں کے فروغ کی کلید ہے۔ اس شعبے میں بھارت کو قابل تعریف کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ایام طفولیت میں اموات پا جانے

والے بچوں کے اموات کی شرح ایک ہزار پر ۸۰ رہ گئی ہے اور بچوں کو ضروری غذا مہیا کرنے کے کام میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن آبادی میں جس طرح اضافہ ہو رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ کوششیں بہت کم اور سست رفتار دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے پالیسیاں مرتب کرنے والوں کو یقین ہے کہ جدید ٹکنالوجی کا استعمال اس ضمن میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۹۱ء میں ملک میں ۱۵ برس سے کم عمر بچوں کی کل تعداد ۳۰ کروڑ تھی اور ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۶ برس سے کم عمر بچوں کی آبادی کا تناسب کل آبادی کے ۱۵ فیصد کے برابر ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ ہمارے ملک کی ۳۰ فیصد آبادی غریبی کے خط کے نیچے زندگی بسر کرتی ہے تو ہم اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غریب اور محروم طبقوں کے بچوں کی غذائی، طبی اور تعلیمی ضروریات پوری کرنے کا کام کتنا بڑا ہے جسے پورا کرنے میں کتنی بڑی رقم اور کتنی کوشش کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر بچوں کی ترقی ہی قومی مستقبل کی تعمیر کا عمل ہے تو اس کے لئے ملک کو کتنا کام کرنا ہوگا۔

بھارت کی آبادی ہی بڑا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہاں سماجی و اقتصادی نابرابری بھی اس مسئلہ کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے۔

ہم ملک کے بچوں کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں امیر اور فارغ البال لوگوں کے بچے جن کی غذا اور پرورش پر اتنا زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ بچے بہت سے حالات میں بگڑ جاتے ہیں سماج کا مفید جزو نہیں بن سکتے بلکہ اس کے لئے اپنی بے راہ روی سے کئی مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔

بچوں کا دوسرا طبقہ متوسط حال لوگوں کے بچوں کا ہے۔ یہ لوگ اپنے قلیل یا درمیانہ ذرائع سے اور اپنی محنت سے بچوں کو پالتے اور پڑھاتے ہیں کیونکہ یہ بچے ہی اُن کا مستقبل ہیں۔ ملک کا بیشتر تعلیم یافتہ، ہر میدان اور ملکی خدمتوں کو چلانے والا طبقہ ان کنبوں سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

لیکن بچوں کا تیسرا اور سب سے بڑا طبقہ اُن نادار اور غریب لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے بچوں کو نہ تو غذا دے سکتے ہیں نہ تعلیم۔ نہ کوئی کام دے سکتے ہیں نہ بہتر سرپرستی۔ اور یہی بچے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں۔ صرف حکومت کی کوششوں سے ان بچوں کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ اگر انہیں اسکول میں داخلہ مل بھی جاتا ہے تو وہ تعلیم چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ اُن کے والدین اُنھیں کسی کام میں لگا کر گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بچے گھروں سے بھاگتے ہیں سماج دشمن عناصر کے چنگل میں پھنس کر جرائم کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں یا گداگری کرتے ہیں۔

سرکار نے محنت کے کئی قوانین نافذ کر رکھے ہیں جن کے تحت چھوٹے بچوں کو روزگار پر نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اس قانون پر عمل نہیں کرتے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف اتر پردیش میں دو لاکھ چھوٹے بچے کانچ، قالین اور تالے بنانے والے کارخانوں میں خطرناک کاموں پر لگے ہوئے ہیں۔ یہی بچے گھروں سے بھاگتے ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں کام کی تلاش میں بے سہارا گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔

گلیوں میں رہنے والے بچے

بھارت سرکار نے ان بے سہارا اور گلی نادار میں آوارہ گھومنے والے بچوں کی بحالی کے لئے ایک اسکیم تیار کی ہے جو یکم اپریل ۱۹۹۳ء سے رائج کر دی گئی ہے۔ فی الحال یہ اسکیم ملک کے ۱۱ بڑے شہروں میں لاگو کی گئی ہے جہاں قریب ۳۰ سرکاری و غیر سرکاری ادارے اس اسکیم پر عمل کریں گے اور شروع میں قریب ۲۴ ہزار بچے اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

آٹھویں منصوبے میں اس اسکیم کے لئے آٹھ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے جو ان بچوں کی رہائش تربیت، غذا اور کام پر لگانے کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ تمام بڑے شہروں کے اسکولوں میں ان بچوں کے لئے رین بسیرے قائم کئے جا رہے ہیں۔

ان بے سہارا بچوں کی بحالی کا کام کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ دہلی میں کئے گئے ایک مطالعہ کی رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دہلی کی گلی بازاروں میں کم از کم ایک لاکھ بچے آوارہ گھوم رہے ہیں۔ ان کی بحالی اور دیکھ بھال کے لئے ایک جماعت عاملہ قائم کی گئی ہے۔ یہ جماعت جس میں مختلف وزارتوں اور رضاکار اداروں کے نمائندے شامل ہیں ان بچوں کی تعلیم، تفریح، غذا، علاج اور بہتر رہائش تربیت کے لئے کام کرے گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ دہلی کے تین اسٹیشنوں پر ہر روز قریب دو سو بچے گھروں سے بھاگ کر آتے ہیں۔ انھیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جائیں۔ یہ بچے قُلی بن جاتے ہیں، برتن صاف کرتے ہیں اور بوٹ پالش جیسے کام کرتے ہیں۔ محکمہ ریلوے سے کہا گیا ہے کہ وہ ان بچوں کی مدد کے لئے اسٹیشنوں پر بوتھ بنائے جہاں ان بچوں کو ضروری مشورہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ اسٹیشنوں کے گرد و نواح کی دکانوں اور ہوٹلوں پر بھی توجہ دی جائے گی جہاں یہ بچے مزدوری کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان بچوں کی امداد کے لئے حکومت سماجی سلامتی کی ایک اسکیم بھی نافذ کر رہی ہے۔ یہ اسکیم فی الحال بڑے شہروں میں نافذ کی جائے گی جن میں بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، حیدرآباد، پونہ، کانپور ناگپور، لکھنؤ اور سورت جیسے شہر شامل ہیں۔ یہ اسکیم اقوام متحدہ کے بچوں کے ہنگامی فنڈ کی ایما پر شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے لئے ۹۰ فیصد فنڈ اقوام متحدہ کا یہ ادارہ مہیا کرے گا اور باقی رقم مرکز ادا کرے گا۔

یہ دونوں اسکیمیں ایک بہت بڑی ضرورت

باقی صفحہ ۱۸ پر

نیلا مکر جی

جواہر روزگار یوجنا اور خواتین کی شرکت

مقامی پنچایتوں میں خواتین کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے مصنّفہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر دیہی خواتین کو مختلف ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی، عملی درآمد اور فیصلے لینے کے عمل میں شر[illegible] نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

جواہر روزگار یوجنا دیہی ترقی کا ایک پروگرام ہے جس کا خاص مقصد دیہی علاقوں کے بے روزگاروں اور جنھیں پورا روزگار میسّر نہیں ہے ان کے لیے فائدہ مند روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ یہ پروگرام خطِ افلاس سے نیچے گذر بسر کرنے والوں کے لیے ہے۔ اس کے تحت کوشش کی جائے کہ (۱) دیہات کے اقتصادی ذیلی ڈھانچے کو مضبوط و مستحکم بنا کر لگاتار جاری رہنے والا روزگار پیدا کیا جائے۔ (۲) عوام کے لیے سماجی اثاثے پیدا کیے جائیں۔ (۳) دیہات کے غریبوں کے لیے ایسے اثاثے پیدا کیے جائیں جن سے وہ لگاتار اور براہ راست مستفید ہو سکیں (۴) اجرتوں کی شرحوں کو بہتر بنایا جائے اور (۵) دیہی علاقوں میں معیارِ زندگی کو بہتر بنایا جائے۔

اس مضمون میں یوجنا کے دو منتخ[illegible] نمبر ۳ اور ۵ پر اظہار خیا[illegible] ہوں خاص کر خواتین کے حوالے سے۔ دیہی غرباء کے براہ راست اور مسلسل فائدے کے لیے اثاثے پیدا کرنے اور دیہی علاقوں میں زندگی کے حالات کو بہتر بنانے کے مقاصد پر دیہی خواتین کی بنیادی ضرورتوں اور ترجیحات کے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیئے کیونکہ دیہی خواتین کی تعداد جواہر روزگار یوجنا سے مستفید ہونے والوں کی کل تعداد کی تقریب قریب آدھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جواہر روزگار یوجنا کے سماجی جنگل بانی پروگرام کے تحت اثاثوں کے پیدا کیے جانے سے غریب خواتین کو براہ راست فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے رہن سہن کے حالات

[illegible] ہیں جس سے جو ایندھن اور چارہ اکٹھا کرنے اور اشیائے خوراک وغیرہ حاصل کرنے کے لیے جنگل اور دوسرے علاقوں تک طویل فاصلے پیدل طے کرتی اور ہر طرح کی جوکھم اٹھاتی ہیں۔

ایک مطالعاتی جائزہ

ذیل میں مہاراشٹر کے تھانے ضلع کی تحصیل مرباد کے گاؤں ادالے کا ایک جائزہ لیا گیا جہاں غریب قبائلی خواتین ایندھن، چارہ اور دوسری چیزیں اکٹھا کرنے کے لیے مشکل حالات میں گھنٹوں سخت محنت کرتی ہیں۔ اس کیلئے انھیں لمبے فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں جس میں ان کی کافی قوت صرف ہوتی ہے

جیسا کہ مقامی ڈاکٹر نے بتایا ان خواتین میں سے بیشتر خون کی کمی کے عارضہ میں مبتلا ہیں اور کافی کمزور ہیں پھر بھی انھیں گھریلوں ضرورتوں کو پورا کرنے اور روزی کمانے کے لیے بڑی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ بجا طور کہا جاسکتا ہے کہ گاؤں میں جواہر روزگار یوجنا کے تحت زیر عمل لائی گئی سماجی جنگل بانی کی اسکیم سے ان قبائلی خواتین کے رہن سہن اور کام کے حالات بہتر بنانے اور روزمرہ کے فرائض انجام دینے میں مدد ملنی چاہیئے تھی۔ لیکن اس بات کو اہم نہیں سمجھا گیا نہ ہی اس پر غور کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ان اسکیموں سے کس کو براہ راست فائدہ پہنچتا ہے، کس کے مسائل حل کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور کس کے رہن سہن کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ درست ہے کہ ایسی اسکیمیں سے گاؤں میں ایک ہی دور میں یا متعدد ادوار میں روزگار کے زیادہ مواقع پیدا ہوتے ہیں اور ایک طویل مدت میں پنچایتوں کی آمدنی بھی بڑھتی ہے۔ تاہم اس اسکیم میں زیادہ کچھ نہیں ہے جس سے روزگار کے مواقع بڑھانے کے علاوہ سماج کے کمزور طبقوں کی اہم ضرورتوں کی تکمیل بھی یقینی بنائی جا سکے۔ جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ گاؤں اوائلے میں جواہر روزگار یوجنا کی سماجی جنگل بانی کی اسکیم میں غریب قبائلی خواتین کی ضرورتوں پر توجہ نہیں کی گئی ہے اور وہ پہلے کی طرح ایک کٹھن زندگی گذار رہی ہیں جس کے بعض موسموں میں اور ابتر ہونے کا امکان رہتا ہے۔

ہم نے سماجی جنگل بانی کی اسکیم کے بارے میں جسے گاؤں والوں نے عملی جامہ پہنایا تھا، معلومات حاصل کرنے کے لیے جنوری ۱۹۹۱ میں اوائلے گاؤں کا دورہ کیا۔ شروع میں تو ہم نے گاؤں، اس کے عوام اور مضافات کے بارے میں اور زیادہ جاننے کی کوشش کی تاکہ سماجی جنگل بانی کی اسکیم کی اہمیت اور اس کے سیاق و سباق کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ ہماری درخواست پر گاؤں والوں کے دو الگ الگ گروپوں نے زمین پر اپنے گاؤں کا نقشہ بنانا شروع کیا۔ یہ درخواست ہم نے اس لیے کی تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ مردوں اور عورتوں کے دو مختلف گروپ گاؤں اور اس کے گرد و نواح میں خواتین کی حالت اور ضرورتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے جس سے ہمیں زیادہ معلومات حاصل ہو سکے گی۔ قبل اس کے کہ ہم سماجی جنگل بانی کو دیکھنے جائیں ہم نے دونوں گروپوں سے ان کے مسائل، ترجیحات اور نظریات جاننے کے لیے الگ الگ رابطہ قائم کیا۔

نقشہ کشی

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے مردوں اور عورتوں کے دونوں گروپوں سے اپنے گاؤں کا نقشہ بنانے کو کہا گیا۔ شروع میں تو خواتین کے گروپ نے آگے آکر گاؤں کا نقشہ بنانے میں پس و پیش کیا لیکن جب ہم نے وضاحت کی کہ نقشے کے ذریعہ ہم گاؤں کے بارے میں اور زیادہ واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کچھ تامل کے بعد ایک لڑکی جو سن بلوغت میں قدم رکھ رہی تھی، زمین پر چاک سے گاؤں کا نقشہ بنانے کو راضی ہو گئی۔ ایک منٹ تک تو وہ یہ دیکھتی رہی کہ مرد زمین پر کیسے نقشہ بنا رہے ہیں۔ پھر اس نے اپنے گرد بیٹھی ہوئی بڑی عمر کی خواتین سے مشورہ کیا اور زمین پر اپنے گاؤں کا نقشہ کھینچ دیا اس کے بعد ہم نے گروپ کی خواتین سے بات چیت کی۔ انھوں نے وہ راستے بتائے جن سے ہو کر وہ پانی، ایندھن اور چارہ لینے جاتی ہیں۔ وہاں موجود بزرگ خواتین نے نقشے میں راستے کو دکھانے میں ایک دوسرے کی مدد کی اگرچہ خود انھوں نے چاک اپنے ہاتھ میں نہ لیا۔ نقشے میں گھر اور وہ جگہیں دکھائی گئیں ہیں جہاں خواتین پانی لانے، جلانے کے لیے خشک پتے لکڑیاں چننے اور دوسری چیزیں لانے جاتی ہیں۔

خواتین کے گروپ نے اپنے روزمرہ کے کام بتاتے ہوئے کہا کہ جب فصلے کٹ جاتی ہے تو وہ کھیتوں میں سرکنڈوں وغیرہ کی جڑیں اکھاڑنے جاتی ہیں۔ وہ بانس کا کام بھی کرتی ہیں جس پر وہ فصل سے فراغت کے دنوں میں تین گھنٹے روز صرف کرتی ہیں۔ فصل کے دنوں میں ان کو بانس کا کام کرنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ خواتین لگ بھگ ایک گھنٹہ کھانا پکانے میں لگاتی ہیں جبکہ مرد مویشی چراتے ہیں۔

مردوں کے گروپ کا بنایا ہوا نقشہ جسے دوسرے بہت سے لوگوں نے بنتے ہوئے دیکھا تھا، واضح اور صاف ستھرا تھا۔ اس میں گاؤں کے اندر کے راستے اور باہر سے گاؤں تک آنے والی سڑکیں دکھائی گئی تھیں۔ اگرچہ یہ نقشہ بظاہر خواتین کے بنائے ہوئے نقشے جیسا ہی تھا لیکن کئی اہم باتوں کے لحاظ سے وہ اس سے مختلف تھا۔ اس میں گاؤں کے اندرونی راستوں اور باہر سے ملانے والی سڑکوں اہمیت دکھائی گئی تھی۔

دوسری طرف خواتین نے اپنے نقشے میں وہ راستے اور پگڈنڈیاں دکھائی تھیں

جن سے ہوکر وہ ایندھن، چارہ اور دوسری چیزیں لینے جاتی ہیں۔ گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جہاں وہ اتوار اور منگل کے سوائے روزانہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر تک ایندھن اور چارہ وغیرہ اکٹھا کرنے جاتی ہیں۔ اتوار اور منگل کو وہ عموماً گھر پر ہی آرام کرتی ہیں۔ وہ خشک پتیاں اور جلانے کی لکڑی گھر پر ہی جمع رکھتی ہیں اور برسات کے دن میں اس کا استعمال کرتی ہیں۔

مشاہدات

(۱) ایندھن اور چارہ اکٹھا کرنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ خواتین ہفتے میں کم از کم چار دن اس کام پر چار گھنٹے روز صرف کرتی ہیں

(۲) انھیں اپنی روزمرہ کی ضروریات کے علاوہ برسات کے لیے بھی ایندھن اور چارہ جمع کرنا پڑتا ہے۔

(۳) خواتین پانی درگا نالے سے لاتی ہیں جس سے جون سے نومبر تک کے چھ مہینوں میں کافی پانی رہتا ہے لیکن اس کے بعد پانی کم ہو جاتا ہے۔ پانی کی قلت کے مہینوں میں پانی کی مانگ کچھ تو کنوؤں سے اور کچھ ٹینکروں سے مہیا کیے جانے والے پانی سے پوری کی جاتی ہے۔

(۴) خواتین کو پانی لانے کے لیے پانچ کلومیٹر اور ایندھن اور چارہ جمع کرنے کے لیے اس سے کچھ کم فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کا بہت سا وقت ایندھن چارہ اور پانی لانے میں خرچ ہو جاتا ہے۔

(۵) خواتین کھانا پکانے اور گھر کے دوسرے کاموں پر روزانہ لگ بھگ ایک گھنٹہ صرف کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تین گھنٹے روز وہ کھیت کے اور بانس کے کام پر خرچ کرتی ہیں۔

لہٰذا منصوبہ بندی کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا ایندھن، چارہ اور پانی لانے پر صرف ہونے والی قوت بچائی جاسکتی ہے اور ان کاموں پر کم وقت صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو خواتین بچوں کی دیکھ بھال، آمدنی بخش کاموں اور دیگر سرگرمیوں کے لیے زیادہ وقت نکال سکتی ہیں۔

سماجی جنگل بانی

خواتین کے بنائے ہوئے نقشے اور ان کے روزمرّہ کے فرائض کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اوالے گاؤں میں سماجی جنگل بانی کی اسکیم پر آتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کیا خواتین کو اپنے ترجیحی مسائل کے حوالے سے اس اسک... ہے یا پہنچ سکتا... اسکیم کے مو... تحت اس قسم کے تناظ... نہیں ہے۔ تاہم اس نقص میں دو... دینے کی ضرورت ہے۔ اول تو یہ کہ کمیاب وسائل اور موقعوں کو دیکھتے ہوئے ترجیحات مقرر کرنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر خواتین کے روزمرّہ کے کاموں کے حالات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو اس سے ان کے کنبوں کو فائدہ پہنچے گا اور ان کا رہن سہن بھی بہتر ہوگا۔

گاؤں اوالے کی گرام پنچایت نے ۱۹۸۹ میں جواہر روزگار یوجنا کے تحت درخت لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے ۵ء۰ ہیکٹر رقبے میں کھیر کے ۲۵۰ پودے لگائے۔ اس کے لیے زمین ایک مقامی شخص نے دی اور پودے مقامی جنگل کی نرسری سے ایک روپیہ فی پودا کے حساب سے حاصل کیے گئے۔ سماجی جنگل بانی سے وابستہ کچھ لوگوں نے قلیل المدت اور طویل المدت فوائد بیان کیے جو درج ذیل ہیں:-

(۱) کھیر کی لکڑی جھونپڑیاں بنانے میں کھمبوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔

(۲) کھیر کے درختوں کی پتیاں جلائی جاسکتی ہیں اور ان کی راکھ دھان کی کاشت کے لیے بطور کھاد استعمال کی جاسکتی ہے۔

(۳) کھیر کے ہر درخت کی لکڑی آٹھ دس سال بعد ۲۵۰ روپے میں بک سکتی ہے کیونکہ کھیر کے درخت کی زندگی آٹھ دس سال ہوتی ہے اور اس کے بعد نئے درخت لگانے پڑتے ہیں۔

(۴) کھیر کے پودے لگانا آسان ہے ... اور انھیں زیادہ پانی یا کھاد کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

لیکن گاؤں والوں کے کہنے کے مطابق کھیر میں ایک نقص یہ ہے کہ اس کو ایندھن کے طور پر نہیں جلایا جاسکتا اور نہ ہی چارے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں پتیاں نہیں ہوتیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے سماجی جنگل بانی میں کون سے درخت لگائے جائیں اس کا فیصلہ اس بات کی بنا پر کیا گیا ہے کہ ان سے گاؤں کے لوگوں کو قلیل اور طویل دونوں ہی مدتوں میں کتنا فائدہ پہنچے گا۔ یہ بات زیادہ

رہنے والے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے بے روزگار اور کم روزگار والے مرد اور خواتین کے لیے روزگار کے مزید اور مفید مواقع پیدا کرنا ہے تاکہ پیداواری معاشی اثاثے تیار کیے جائیں اور ان لوگوں کا معیار زندگی بہتر بنایا جائے۔ یوجنا کی مختلف روزگار اسکیموں کے تحت ادا کی جانے والی اُجرتیں ایک ریاست میں کم سے کم اُجرتوں کے قانون کے مطابق ہوتی ہیں۔ گذشتہ دو برسوں کے دوران ۱۹۱۱٫۶۴ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مُہیا کیا گیا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے جواہر روزگار یوجنا کے تحت ۲۵۵۶٫۲۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے، جس میں ریاستوں کا حصّہ بھی شامل ہے اور ۷۷۶۲٫۵ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مُہیا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے والے آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں، درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لیے مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں ایک اور اسکیم اندرا آواس یوجنا (آئی اے وائی) شروع کی گئی تھی — ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران اس یوجنا کے تحت اخراجات کے لیے ۱۵۳٫۴۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور ۱٫۱۸ لاکھ مکانات کی تعمیر کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء سے اب تک ۱۲٫۲ لاکھ سے زیادہ مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں، جن پر ۱۲۹۶٫۵۲ کروڑ روپے کے اخراجات آئے ہیں۔

اس یوجنا کے تحت ایک اور ضمنی اسکیم لاکھوں کنوؤں کی اسکیم (ایم ڈبلیو ایس) ہے۔ اس اسکیم کے تحت درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے غریب نیز چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں اور آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں کے لیے آب پاشی کے کھلے کنویں مفت بنوائے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں جغرافیائی وجوہات سے کنویں بنوانا ممکن نہیں ہے وہاں مختص کردہ رقوم کا استعمال آب پاشی کے ٹینک، پانی کے ذخیرے سے متعلق ڈھانچے جیسی چھوٹی آب پاشی کی دیگر اسکیموں کے لیے اور زمینوں کو بہتر بنانے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ جواہر روزگار یوجنا کے وسائل کا ۲۰ فی صد حصہ لاکھوں کنوؤں کی اسکیم کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ اب تک ۱۷۷۲٫۷۷ کروڑ روپے کے اخراجات سے ۵٫۸ لاکھ کنوئیں بنوائے جا چکے ہیں — ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران کل ۸۳۹۲۲ کنوئیں بنوائے گئے تھے۔

پینے کا صاف پانی

دیہی علاقوں میں پینے کا صاف پانی فراہم کرنا حکومت کا ایک اور اعلیٰ ترجیحی شعبہ ہے اس پروگرام پر ریاستی شعبے کے کم سے کم ضروریات کے پروگرام کے تحت عمل درآمد کیا جاتا ہے مرکزی حکومت گاؤوں میں پانی کی سپلائی کے تیز رفتار پروگرام کی مرکزی اسکیم کے تحت تکنیکی رہنمائی اور مالی امداد فراہم کرتی ہے۔

گذشتہ سال ۲۹۶۸ گاؤں ایسے تھے جہاں پینے کے صاف پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مارچ ۱۹۹۳ء تک ان میں سے ۱۴۶۹ گاؤوں میں مکمل طور پر یا جزوی طور سے پینے کا صاف پانی مُہیا کرایا گیا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ان گاؤوں کی تعداد ۲۱۶۷۹ ہو گئی ہے، جہاں جزوی طور سے پینے کا صاف پانی فراہم کیا گیا ہے۔

آٹھویں منصوبے میں گاؤوں میں پانی کی سپلائی کے سلسلے میں ۴۹۵۴ کروڑ روپے اور گاؤوں میں پانی کی سپلائی کے تیز رفتار پروگرام کے سلسلے میں ۵۱۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات کی منظوری دی گئی ہے۔ اب تک پانی کے ذخیرے سے متعلق ڈھانچوں، پانی کے معیار کی جانچ اور نگرانی کے پروگرام پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ ضلعی سطح کی ۸۵ ساکن تجربہ گاہیں اور ۷ چلتی پھرتی تجربہ گاہیں، پانی سے کھارا پن دور کرنے کے ۱۵۵ پلانٹ، ۱۴۲ شمسی فوٹو وولٹائیک پمپنگ نظام، پانی سے فلورائیڈ نکالنے کے ۱۸۴ پلانٹ اور پانی سے لوہے کے ذرات نکالنے کے ۱۹۰۸ پلانٹ لگانے کے پروگرام پر عمل درآمد کر کے یہ کام انجام دیا گیا ہے۔ تمام تجربہ گاہوں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

گاؤوں میں صفائی ستھرائی

آٹھویں منصوبے میں گاؤوں میں صفائی ستھرائی کے مرکزی پروگرام کے لیے ۳۴۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور ریاستی شعبے کے تحت ۲۹۴٫۲۳ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی ہے۔ اس رقم سے آٹھویں منصوبے کے دوران تقریباً ۱٫۶۸ کروڑ دیہی آبادی کو مستفید کیا جائے گا۔

لوکل سیلف گورنمنٹ: تقریباً تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں پنچایتی راج ادارے موجود ہیں۔ جن کا ڈھانچہ کافی مختلف ہے۔ اس وقت ملک بھر میں ۲۱۷۳۰۰ گرام پنچایتیں، ۴۵۲۸ بلاک پنچایت سمیتیاں اور ۳۳۰ ضلع پریشدیں ہیں۔ پنچایتی راج اداروں کو مستحکم بنانے اور انھیں لوکل سیلف گورنمنٹ کا ایک سرگرم اوزار بنانے کے لیے پنچایتی راج کے بارے میں آئین میں ترمیم کا بل دسمبر ۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ میں منظور کیا گیا تھا۔ اس بل کے تحت گاؤں کی سطح پر نیز درمیانی اور ضلعی سطحوں پر تین سطحی پنچایتی نظام فراہم کیا گیا ہے جن کے انتخابات ہر پانچ سال میں لازمی قرار دئے گئے ہیں۔ پنچایتوں کی ترقی و فروغ سے

متعلق سرگرمیوں کے سلسلے میں اخراجات کے لیے ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۵.۰۰ کروڑ روپے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

زمینی اصلاحات اور زمینی ریکارڈ

زمینی اصلاحات سے متعلق پالیسی درمیانی لگان داری کے خاتمے جیسے پروگراموں، لگان داری سے متعلق اصلاحات جیسے کرائے کو باضابطہ بنانے، ساجھے داری میں فصلیں اگانے والوں اور لگان داروں کے لیے لگان داری کے تحفظ کے انتظام، جس کا قطعی مقصد ان کو مالکیت کے حقوق دلوانا ہے، زرعی زمین اثاثوں پر زمینی حد عائد کرنے، بے زمین زرعی کارکنان اور چھوٹے زمینی کارکنان کو فاضل زمین کی تقسیم، زرعی اثاثوں کو مستحکم بنانے، زمینی ریکارڈ کو صحیح بنانے اور اس کی مناسب دیکھ بھال پر مشتمل ہے۔

مختلف زمینی اصلاحات پر موثر طور سے عمل درآمد کے نتیجے میں فاضل قرار دی گئی ۷۲.۹۴ لاکھ ایکڑ زمین میں سے ۵۰.۰۵ لاکھ ایکڑ زمین ۸.۷۴ لاکھ افراد کو تقسیم کی گئی ہے۔ بھودان کی ۲۳.۲۳ لاکھ ایکڑ زمین اور ۶۱.۴۴ ۱۲ لاکھ ایکڑ نم زمین بھی تقسیم کی گئی ہے۔ ۲۱ اضلاع میں تجرباتی بنیاد پر زمینی ریکارڈ کا کام کمپیوٹر سے انجام دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء سے جنوری ۱۹۹۳ء تک تقریباً ۱.۰۲ لاکھ ایکڑ فاضل زمین تقسیم کی جا چکی ہے۔

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقے کے لیے پروگرام :-

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق پروگرام ۷۳-۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام تک تقریباً ۱.۰۲ لاکھ ایکڑ فاضل زمین تقسیم کی جا چکی ہے۔

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقے کے لیے پروگرام

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق پروگرام ۷۳-۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام ایک مرکزی اسکیم ہے جس کے لیے مرکز اور ریاستیں نصف نصف میعاد پر رقم فراہم کرتی ہیں۔ اس وقت اس پروگرام پر ۱۳ ریاستوں کے ۹۲ اضلاع کے ۶۱۵ بلاکوں میں عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ خشک سالی سے متاثر ہونے والے یہ علاقے ۵۳.۵ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق پروگرام کے لیے اس پروگرام کے آغاز سے ۱۵۶۶.۲۱ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ آٹھویں منصوبے میں اس پروگرام کے ... روپے کی رقم مخصوص ...

ریگستان کو ...

ریگستانی ...

زراعت سے متعلق قومی کمیشن (۱۹۷۴ء) کی سفارشات کی بنیاد پر ۷۸-۱۹۷۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس وقت اس پروگرام پر پانچ ریاستوں کے ۲۱ اضلاع کے ۱۳۱ بلاکوں میں عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ مکمل طور سے مرکزی اخراجات سے چلائی جانے والی اس اسکیم کے لیے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۵۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی۔ یہ رقم ۹۴-۱۹۹۳ء میں بڑھا کر ۱۱۰ کروڑ روپے کرنے کی تجویز ہے۔ ●

صفائی ملازمین کے لیے قومی کمیشن کی تشکیل

بہبود کے وزیر مملکت شری کے وی تھنگ کا بالو نے کہا ہے کہ صفائی ملازمین کے لیے قومی کمیشن کی تشکیل جلد ہی عمل میں آئے گی۔ پارلیمنٹ میں حال ہی میں اس امر کا ایک بل منظور ہوا ہے۔ یہ کمیشن ملک کے سات لاکھ غلاظت اٹھانے والوں کی نجات اور بازآبادکاری کی اسکیموں کی نگرانی کرے گا۔ شری تھنگ کا بالو آج یہاں وزارت بہبود کی مشاورتی کمیٹی سے خطاب کر رہے تھے۔ وزیر موصوف نے اراکین کو بتایا کہ وزیر بہبود نے ریاستوں کے وزرا اعلیٰ کو اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے مراسلات ارسال کیے ہیں تاکہ آٹھویں منصوبے کے اواخر تک انسانوں کے ذریعہ انسانی غلاظت اٹھانے کے پیشے کے خاتمے کے مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ شری بالو نے اراکین کو بتایا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے

میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر ایک خصوصی تقریب کی شکل میں منایا گیا اور اس تقریب میں بھارت کے سفیر شری جی پارتھا سارتھی، بھارتی سفارت خانے کے سینئر افسران نے اور مزار کے ذمہ داران اور کارکنان نے حصّہ لیا۔ سفیر موصوف نے بہادر شاہ ظفر اور ان تمام لوگوں کے لیے جنھوں نے بھارت کی آزادی کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، کے تئیں بھارتی حکومت اور عوام کے احترام وعقیدت کے اظہار کے طور پر مزار پر آٹھ کڑھی ہوئی چادریں چڑھائیں۔ اس موقع پر مرحوم کی روح کے لیے اور ان تمام لوگوں کی یاد میں جنھوں نے انتہائی جرأت کے ساتھ نوآبادیاتی بالادستی کے خلاف بھارت کی جنگ میں تعاون دیا تھا، دعائیں کی گئیں۔ ●

بقیہ: معذور افراد

کے ذریعہ لوگوں میں بیماری پیدا کرنے کے لیے مواد تیار کرتے ہیں۔

یکساں معیارات

بھارت میں بازآبادکاری کونسل معذور افراد کی بازآبادکاری کے شعبے میں پیشہ ور افراد کی تربیت کے سلسلے میں یکساں معیارات لاگو کرتی ہے۔ یہ کونسل ایک خود مختار ادارہ ہے، جو پیشہ ور افراد کی تعلیم اور تربیت کے کم سے کم معیارات متعین کرتی ہے نیز ڈگری اور ڈپلوما کے سلسلے میں تربیتی پروگراموں کا اہتمام کرنے کے لیے چند ترغیبات کو تسلیم کرتی ہے۔ مذکورہ کونسل جسمانی علاج، پیشہ ورانہ علاج، اضافی اور اور تھوپٹک، انجینئرنگ میں کورسیز نیز دماغی معذوری میں ڈپلوما کے لیے کل ہند بنیاد پر مشترکہ داخلہ امتحان کا اہتمام بھی کرتی ہے۔

یہ کونسل مختلف کاروبار میں روزگار کے لیے معذور افراد کو اہل بنانے میں مدد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ، معذور افراد کو بازآبادکاری کے لیے امداد اور ساز و سامان فراہم کرنے کی غرض سے دور دراز اور قبائلی اضلاع میں ضلعی حکام اور رضاکار تنظیموں کے اشتراکِ عمل سے بازآبادکاری کیمپوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

معذور افراد کی خدمات کے اعتراف کی ایک علامت کے طور پر حکومت نے قومی انعامات کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ حکومت میں یا سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں معذور افراد کے بہترین آجرین کو اور خود روزگار والے افراد کو ہر سال یہ انعام دیا جاتا ہے۔ جسمانی، بصری، سماعی اور دماغی طور سے معذور افراد نیز کوڑھ سے نجات یافتہ افراد کے زمروں میں علیحدہ انعامات دئے جاتے ہیں۔

جامع کوششیں

ملک میں تمام معذور افراد کو روزگار فراہم کرنا ایک کارِ عظیم ہے، جو تنہا حکومت انجام نہیں دے سکتی۔ اس کام کے لیے بڑے پیمانے پر ریاستی حکومتوں، سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں نیز سماج کی جامع کوششوں کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے بیشتر آجرین ابھی تک معذور افراد کی صلاحیتوں سے بے خبر ہیں اور وہ انھیں روزگار دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ بیشتر آجرین ابھی تک معذور افراد کو روزگار دینا اپنے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ کافی دیر سے ہی سہی، غیر سرکاری شعبے کی کچھ کمپنیوں نے معذور افراد کی صلاحیتوں کو سمجھا ہے اور انھیں روزگار دینا شروع کر دیا ہے۔ اس رُجحان میں تیزی لانے کی ضرورت ہے۔

بُنائی، کشیدہ کاری، مصوری، گدّے گڑیاں بنانے اور قالین سازی کی صنعت سے متعلق خود روزگار اسکیموں سے، جو حکومت نے شروع کی ہیں، مستقبل میں معذور افراد کی بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ معذور افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے پیداواری مراکز قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ ان مراکز سے معذور افراد کے لیے مفید روزگار کو یقینی بنانے اور انھیں خود کفیل بنانے میں مدد ملے گی۔ آج اس سلسلے میں ایک مثبت نظریے، صحیح پیشہ ورانہ رہنمائی اور خود روزگار پر توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سے معذور افراد کے لیے روزگار کے مواقع کی صورتِ حال میں بہت زیادہ تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا مزار مقدس

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو برطانیہ نے بھارت کی پہلی جنگ آزادی کے سلسلے میں ۱۸۵۷ میں جلاوطن کر دیا تھا۔ وہ ۱۸۶۲ میں رنگون میں فوت ہوگئے۔ ۳۰ برسوں تک برطانیہ نے کسی بھی فرد کو اس عمارت کی حدود میں قدم نہیں رکھنے دیا جہاں بہادر شاہ ظفر نے اپنے جلاوطنی کے دن گزارے اور انتقال کیا۔ جب اس طرح کی اجازت دی گئی تو اس مقام کے قریب جس کے متعلق یہ مانا جاتا تھا کہ وہاں بہادر شاہ ظفر کو دفن کیا گیا ہے، ایک مزار تعمیر کر دیا گیا تھا۔ مزار کے قریب ۱۹۹۱ میں کھدائی کے دوران ایک نئی قبر ملی۔ مزار کے ذمہ داران کے مطابق جس کے طول و عرض اور بناوٹ سے ایسا لگتا تھا کہ وہی اصل مقام ہے جہاں درحقیقت بہادر شاہ ظفر کو دفن کیا گیا تھا۔

وقتاً فوقتاً حکومت ہند نے مزار سے متعلق حکام کو اس کی مرمت وغیرہ کے لیے امداد فراہم کی ہے۔ آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لی اور بھارتی سفارت خانے نے مزار کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کے لیے امداد فراہم کی۔

جب آنجہانی وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۱۹۸۷ میں برما کے دورے پر گئے تو انہوں نے مزار کی زیارت کی اور مزار پر چادریں چڑھائیں اور قالین نذر کیے اور دو لاکھ کیاٹس جو بھارتی کرنسی کے لحاظ سے ۹۵ر۳ لاکھ روپے کے برابر ہوتے ہیں، کا عطیہ دیا۔

باقی ص۱۱ پر

ربڑ کی پیداوار

بھارت دنیا میں قدرتی ربڑ کی سب سے زیادہ پیداوار کرنے والا چوتھا ملک ہے۔ اس کی کھپت کا ۷۵ فی صد حصہ صرف قدرتی ربڑ سے حاصل ہوتا ہے۔ ملک میں قدرتی ربڑ کی پیداوار اور کھپت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں ملک میں قدرتی ربڑ کی پیداوار ۳۹۵۰۰۰ ٹن ہوئی ہے، جب کہ اس کی کھپت تقریباً ۴۱۴۰۰۰ ٹن رہی ہے۔ ۱۹۹۱-۹۲ء میں قدرتی ربڑ کی پیداوار ۳۶۶۷۴۵ ٹن ہوئی تھی، جب کہ اس کی کھپت ۳۹۰۰۰۰ ٹن رہی تھی۔ یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ سال کے دوران قدرتی ربڑ کی پیداوار ۴۴۰۰۰۰ ٹن رہے گی۔ ربڑ کی پیداواریت میں بھی مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۹۱-۹۲ء میں ایک ہیکٹیئر رقبہ میں قدرتی ربڑ کی اوسط پیداوار ۷۷۰ کلو گرام ہوئی تھی لیکن ۱۹۹۲-۹۳ء میں اس کی فی ہیکٹیئر اوسط پیداوار ۱۱۵۰ کلو گرام ہوئی ہے۔

بھارت میں ربڑ کی پیداوار کی شروعات کیرالہ میں اس صدی کے پہلے دہے میں معمولی طور سے ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں تقریباً ۱۵۰۰۰ ٹن کی پیداوار کی سطح سے، قدرتی ربڑ کی پیداوار ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۳۹۵۰۰۰ ٹن کی سطح تک پہنچ گئی ہے۔ اگرچہ روایتی علاقے کیرالہ اور تامل ناڈو میں ربڑ کی ۹۰ فی صد سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے۔ دیگر غیر روایتی علاقے مثلاً کرناٹک، تریپورہ، آسام، گوا اور انڈومان ونکوبار جزائر

زیر کاشت علاقے

اضافہ کرنے کے لیے

رہے ہیں۔

نئی حکمت عملی

بھارت میں ربڑ کی صنعت میں جس سے ۲٫۳ لاکھ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا ہوتا ہے، برآمدات کی زبردست صلاحیت ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں بھارت سے ربڑ کے ساز و سامان کی برآمدات کی مالیت ۲۶۷ کروڑ روپے رہی ہے۔ ملک کی معیشت میں اس کے اہم کردار کے باوجود، یہ صنعت بنیادی خام مال یعنی قدرتی ربڑ کی دستیابی کے مسئلے سے آزاد نہیں ہے۔

چنانچہ قدرتی ربڑ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے ربڑ سے متعلق بورڈ نے بڑے پیمانے پر سرگرمیاں شروع کی ہیں۔ اب کیرالہ اور تامل ناڈو کے روایتی علاقوں میں موجودہ پود کاریوں کی جدید کاری نیز غیر روایتی علاقوں جیسے شمال مشرقی علاقے، کرناٹک، اڑیسہ، گوا اور انڈومان و نکوبار جزائر میں زیر کاشت علاقے کی توسیع پر

[illegible] ۴۲ ہیکٹیئر رقبے میں پود کاری کے زیادہ پیداوار والے جدید ساز و سامان سے پرانے اور کم پیداوار والے علاقوں میں پھر سے پود کاری کرنے کا کام شامل ہے۔ پودوں کے تحفظ، کھاد ڈالنے، فصل کاٹنے اور اس کی پروسیسنگ کے کام میں جدید ٹکنالوجی کو مقبول بنا کر موجودہ پود کاری کی پیداواریت میں اضافہ کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اس صدی کے اختتام تک زیر کاشت علاقے کی فی ہیکٹیئر پیداوار بڑھ کر ۱۵۲۵ کلوگرام اور کل پیداوار ۶۷۵۰۰۰ ٹن ہو جائے گی۔ یہ مقصد بہتر زرعی انتظام اور بروئے کار لانے کی سائنسی تکنیک،

یوجنا، نئی دہلی

ربڑ کے زیر کاشت زمینوں اور علاقوں کے بارے میں تحقیق اور توسیع کے ذریعہ حاصل کیا جائے گا۔ اس سے رفتہ رفتہ برآمدات کی ضرورت پوری ہونے کے علاوہ ملکی صنعت کی بڑھتی ہوئی مانگ بھی پوری ہوگی۔

مزید برآں، ربڑ کی پود کاری کی ترقی و فروغ کی اسکیم کے تحت، نئی پود کاری اور پھر سے پود کاری کے لیے مالی اور تکنیکی امداد دستیاب کرائی جاتی ہے۔ اس اسکیم پر پانچ سال کی مدت میں عمل درآمد کیا جائے گا، جس کا آغاز آٹھویں منصوبے کی مدت کی شروعات سے ہوگیا ہے۔

ترغیبات

مذکورہ اسکیم کے تحت، روایتی علاقوں میں ۵ ہیکٹیر تک زمین رکھنے والے چھوٹے کاشت کاروں کو اور غیر روایتی علاقوں میں تمام کاشت کاروں کو فی ہیکٹیر ۵۰۰ روپے کی سرمایہ جاتی امداد فراہم کی گئی ہے۔ عام زمروں کے کاشت کاروں کو پولی تھیلوں والے اعلی معیاری پودوں کے استعمال کے لیے فی ہیکٹیر ۲۷۰۰ روپے تک بیر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے کاشت کاروں کو فی ہیکٹیر ۳۶۰۰ روپے تک کی مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے۔

نابارڈ یعنی زراعت اور دیہی ترقیات کے قومی بنک کے پھر سے رقم فراہم کرنے کے پروگرام کے تحت چلنے والے بنکوں سے سیچوریٹی تک پود کاری اور دیکھ بھال کی لاگت کی حد تک اسکیم کے تحت طویل مدتی قرضہ جاتی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ روایتی علاقوں میں چھوٹے کاشت کاروں کے ذریعہ نیز غیر روایتی علاقوں میں تمام کاشت کاروں کے ذریعہ اس قسم کے قرضوں کے سود پر تین فی صد مالی امداد بھی بورڈ ادا کر رہا ہے۔

ربڑ سے متعلق بورڈ پود کاری کے سلسلے میں جو گرانٹ دیتا ہے اسے موجودہ فی ہیکٹیر ۵۰۰۰ روپے سے بڑھا کر نئے پود کاری اور پھر سے پود کاری کے لیے فی ہیکٹیر ۸۰۰۰ روپے کرنے کی تجویز ہے۔ یہ قدم ڈویلپمنٹ کی لاگت میں بہت زیادہ اضافے کے پیش نظر اٹھایا گیا ہے، جو ۱۹۸۰ء میں فی ہیکٹیر ۱۵۰۰۰ روپے سے بڑھ کر اب فی ہیکٹیر ۴۰۰ روپے ہوگئی ہے۔ یہ اضافہ سات قسطوں میں ادا کیا جائے گا۔ اہلیت کی شرط میں بھی چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کے حق میں ترمیم کی جائے گی۔

یہ تجویز کیا گیا ہے کہ کیمیاوی کھادوں کے لیے قیمتوں میں رعائتوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے پود کاری، دیکھ بھال اور پیداوار کی تمام سطحوں پر مفت توسیعی امداد جاری رکھی جاتی ہے، جب کہ سات سال کی مدت کے لیے بیمہ جاتی تحفظ لازمی قرار دیا جائے گا۔

مناسب منافع

صارفین کو مناسب قیمتوں پر قدرتی ربڑ دستیاب کرانے اور ربڑ کے کاشت کاروں کے لیے معقول منافع کو یقینی بنانے کی غرض سے وافر ذخیرے کی ایک اسکیم مارچ ۱۹۸۶ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس اسکیم کے تحت بینچ نشان قیمت فراہم کی جاتی ہے، جو کاشت کاری کی تخمینہ شدہ لاگت کی بنیاد پر مقرر کی جاتی ہے۔ اس اسکیم میں کمی والے سیزن اور فراوانی والے سیزن کے دوران ربڑ کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

حکومت نے جنوری ۱۹۹۳ء میں آرایم اے ۴ گریڈ کے لیے ۲۳۴۵۰ روپے فی ٹن اور آرایم اے ۵ گریڈ کے لیے ۲۲۹۵۰ روپے فی ٹن کے حساب سے ربڑ کے لیے بینچ نشان قیمت کی نظر ثانی کی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۹۱ء میں بینچ نشان قیمت آرایم اے ۴ گریڈ کے لیے ۲۱۴۵۰ روپے فی ٹن اور آرایم اے ۵ گریڈ کے لیے ۲۰۹۵۰ روپے فی ٹن مقرر تھی۔

حکومت ربڑ کی قیمتوں پر قریبی نظر رکھ رہی ہے۔ ریاستی تجارتی کارپوریشن (ایس ٹی سی) جیسی سرکاری خریداری کی ایجنسیاں ضرورت پڑنے پر خریداری کا کام شروع کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہیں ●

فوج کے سرجنوں کا کارنامہ

کرکی کے فوجی اسپتال کے سرجنوں نے حال ہی میں ایک ۳۶ سالہ خاتون کی کہنی ELBOW کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ افواج کے کسی اسپتال میں اپنی نوعیت کی پہلی جراحی ہے۔

مریضہ شریمتی کملا سورج مل پچھلے گیارہ برس سے ریوماٹائڈ ارتھرائٹس کا شکار تھیں۔ یہ آپریشن ہڈیوں کے امراض کے شعبہ کے صدر اور سینئر سرجن کرنل ایس کے لبسو اس اور ان کی ٹیم نے کیا۔

کرکی کا فوجی ہسپتال ہڈیوں کے امراض کے علاج کا ایک اہم مرکز ہے۔ جہاں مختلف اعضاء کی تبدیلی کا کام اکثر عمل میں آتا ہے۔ ●

جی وینکٹ سوامی

کتائی کی روایت کا تحفظ

ہتھ کرگھا بنائی کے روایتی فن کو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ایک کروڑ لوگ ابھی تک اپنائے ہوئے ہیں۔ چونکہ اس فن میں حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی خوبی ہے اس لیے اس فن کی اس کی خوبی کی وجہ سے جدید دنیا کی بدلتی ہوئی مانگوں کے مطابق اس پیشہ کو برقرار رکھنے میں مدد ملی ہے۔ ہتھ کرگھا بنائی کا کام کرنے والے لاکھوں گھرانوں کے لیے یہ فن محض کپڑے تیار کرنے کے ایک طریقے کے بجائے ایک اندازِ زندگی ہے۔ اس صنعت کے پھلنے پھولنے کے لیے ضروری تحفظات فراہم کرنے کی غرض سے حکومت نے مسلسل کوشش کی ہے۔

رعائتی سازوسامان

اس شعبے کے لیے خام مال کی تیاری اور مسلسل سپلائی کو یقینی بنانے نیز ہتھ کرگھا شعبے کو ملوں اور بجلی کرگھوں کے شعبے کے ناواجب مقابلے سے تحفظ کیلئے مالی رعائتیں دینے کی غرض سے حصوصی اقدامات کیے گئے ہیں۔ مالی اقدامات میں سیدھے سادے لپٹے ہوئے لچھی دھاگے پر ایکسائز محصول کی مکمل چھوٹ اور آڑے ترچھے لپٹے ہوئے لچھی دھاگے پر رعایتی محصول، ہتھ کرگھا ایجنسیوں کے کچھ پروسسنگ یونٹوں کے تیار کردہ ہتھ کرگھا کپڑے کی پروسسنگ پر ایکسائز محصول کی مکمل چھوٹ اور غیر سرکاری تیار کنندہ کے ذریعہ پروسسنگ کے لیے رعائتی محصول ... اہا ...

لچھی دھاگے کی با...

وائی اوادا) میں یہ بات ...

کتائی ملیں کچھ مقدار میں ...

کی شکل میں تیار کریں تاکہ ...

کے لیے اس خام مال کی دستیابی کو ... بنایا جائے۔ اس حکم میں اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ دھاگے کے تیار کنندگان اور لچھی دھاگے کے تقسیم کنندگان پیداوار کم کر کے یا مصنوعی قلت پیدا کر کے ہتھ کرگھا شعبے کی پراگندہ صورتحال سے نامناسب فائدہ نہ اٹھائیں۔

ہتھ کرگھا (تیاری کے لیے اشیاء مخصوص کرنا) قانون، ۱۹۸۵ کے تحت کچھ اشیاء ہتھ کرگھا شعبے میں خصوصی تیاری کے لیے مخصوص کی جاسکتی ہیں اگرچہ لچھی دھاگے کی پابندی کے حکم کو وقتاً فوقتاً مختلف عدالتوں میں چیلنج کیا گیا ہے لیکن کتائی ملوں نے اور خاص طور سے غیر سرکاری شعبے کی کتائی ملوں نے اس پابندی پر کم وبیش عمل کیا ہے۔ اس سال تک طویل مقدمے بازی کی وجہ سے ہتھ کرگھا ریزرویشن قانون واقعتاً غیر مؤثر ہوکر رہ گیا تھا لیکن اب سپریم کورٹ نے ...

...

کی بنیاد پر آٹھویں منصوبے میں اس سلسلے میں کچھ ترامیم کی گئی ہیں ترمیم شدہ نظریے کا اہم پہلو یہ ہے کہ بے سود اسکیموں کی بجائے ایک لچکدار نظریہ اپنانے کے لیے اس شعبے کے بنکروں اور دستکاروں کی مختلف ضروریات پر مشتمل جامع اسکیمیں وضع کی جائیں۔ اس بنیاد پر دو اہم اسکیمیں یعنی پروجیکٹ کے پروگرام کی اسکیم اور ہتھ کرگھا کی مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم ۱۹۹۱-۹۲ کے دوران شروع کی گئی ہیں۔

پروجیکٹ کے پروگرام کی اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک مخصوص شعبے کی بہتری وفروغ کے لیے نیز ایک خاص منتخبہ گروپ

کپڑے کی صنعت کے مرکزی وزیر مملکت

یا ایک مخصوص علاقے سے تعلق رکھنے والے بنکروں کی ترقی و بہبود کے لیے امداد کی ضرورت پر مبنی پروگرام دستیاب کرایا جائے۔ ہتھ کرگھے کی مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت دیہی علاقوں میں بہترین دستکاری کے مراکز کی ترقی و فروغ نیز ان دستکاروں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے امداد فراہم کی جاتی ہے۔

آٹھویں منصوبے کے دوران فلاح و بہبود کی اسکیموں پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ کام کرنے کی جگہ اور مکان کی اسکیم ہتھ کرگھا بنکروں کے لیے ایک بڑی اسکیم ہے۔ اس اسکیم کو صد فی صد مرکزی امداد سے چلائی جانے والی اسکیم بنا دیا گیا ہے تاکہ ہتھ کرگھا بنکروں کے لیے مرکزی منصوبے سے زیادہ سے زیادہ امداد کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ قرض جاتی فنڈ کی اسکیم میں ترمیم کی گئی ہے تاکہ امداد باہمی شعبے کے علاوہ بھی بنکروں کو فوائد مہیا کرائے جائیں۔ نادار بنکروں سے متعلق اسکیم کے لیے زائد رقم کے سلسلے میں ایک خصوصی اسکیم حال ہی میں شروع کی گئی ہے جس کا مقصد مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت منتخبہ گروپ سے تعلق رکھنے والے بنکروں کی امداد باہمی میں اضافہ کرنا ہے۔ بنکروں کو گروپ بیمہ اسکیم کے تحت بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

صحت سے متعلق پروگرام کی ایک جامع اسکیم کے تحت مختلف قسم کی امداد فراہم کی جاتی ہے، جن میں چند اقسام کی بیماریوں کا علاج، ہتھ کرگھا بنکروں اور ان کے کنبے کے اراکین کے لیے زچگی کے سلسلے میں دی جانے والی سہولیات اور امداد نیز ہتھ کرگھا بنکروں کے گاؤں میں ابتدائی صحتی مراکز قائم کرنے کے لیے سرمایہ جاتی امداد شامل ہے۔

مربوط ترقی و فروغ

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، ٹرائی سیم، آئی اے وائی اور جے آر وائی کے چالو دیہی ترقیاتی اسکیموں کے تحت ہتھ کرگھا بنکروں کو مستفید کر کے گاؤں پر مبنی ہتھ کرگھا شعبے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مذکورہ چار اسکیموں کے تحت تین سال میں ایک مرحلے وار پروگرام میں ان ۳ر۲۷ لاکھ بنکروں کو، جن کے پاس کرگھے نہیں ہیں، کرگھے، کام کرنے کی جگہیں اور کام چلانے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ۵۲۳ر۲۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے، جن میں سے ۱۳۰ر۸۰ کروڑ روپے کی مرکزی امداد ہے اور بقیہ ۳۹۲ر۴۰ کروڑ روپے کی رقم رعایتی شرحوں پر بینک فراہم کریں گے جسے آر وائی اسکیم کے تحت درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے ۱ر۲۰ لاکھ بے گھر ہتھ کرگھا بنکروں کو مکان فراہم کرنے کے لیے ۱۳۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کرنے کی تجویز ہے۔ آئندہ تین برسوں میں ایک لاکھ بنکروں کو ٹرائی سیم کے تحت بنائی اور رنگائی کے بہتر طریقوں کی تربیت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ بنکروں کی اکثریت والے علاقوں میں ۲ر۵ لاکھ کی اوسط لاگت سے عام سہولیات کے ایک ہزار مراکز قائم کیے جائیں گے۔

پیداوار کی صد فی صد خریداری کے ساتھ ساتھ دھاگے کی یقینی دستیابی کے لیے نیز رنگائی کے بہتر طریقوں کو فروغ دینے کے لیے بھی ایک نئی اسکیم وضع کی جا رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت، چار سال کی مدت میں بنکروں کی اکثریت والے علاقوں میں ۳۰۰۰ ہتھ کرگھا ترقیاتی مراکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ہر ایک مرکز بہت غور و خوض کے بعد منتخبہ ایک ایجنسی کے ذریعہ چلایا جائے گا۔ اس ایجنسی کی نشاندہی ریاستی حکومتوں کے صلاح مشورے سے کی جائے گی۔ مرکز دھاگے اور دیگر ساز و سامان کے سلسلے میں ایک ہزار بنکروں کی ضروریات پوری کرے گی۔ یہ مرکز درکار دھاگہ سپلائی کرے گا نیز پوری پیداوار خریدے گا، جسے مرکز چلانے والی ایجنسی کے ذریعہ فروخت کیا جائے گا۔ ان تین ہزار مراکز میں سے، ۵۰۰ مراکز کو معیاری رنگوں کے استعمال کو فروغ دینے کے لیے مزید خدمات فراہم کی جائیں گی تاکہ برآمداتی معیار کی مصنوعات تیار کی جاسکیں۔ آئندہ چار برسوں میں اس کام کے لیے ۸۴۹ر۱۵ کروڑ روپے کی رقم خرچ کرنے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔

اندرون ملک اور غیر ممالک میں تیار کنندہ اور صارفین دونوں کی بدلتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہتھ کرگھا شعبے کی موروثی طاقت کے ساتھ ساتھ اس قسم کی مختلف ترغیبات کا جھکاؤ بھی ہتھ کرگھا صنعتوں کی طرف ہے۔

یو۔ آر۔ راؤ

بھارت کا خلائی پروگرام: ترقیات کے لیے وقف

بھارت نے جدید خلائی ٹیکنولوجی اور اس کے مختلف استعمال کے سلسلے میں مہارت حاصل کرنے میں موثر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آج ایسے گوناگوں شعبے ہیں جن میں بھارت میں خلائی ٹیکنولوجی کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً ٹیلی مواصلات، ٹیلی ویژن نشریات، موسم کی نگرانی اور وسائل کے بارے میں سروے۔ اس طرح اس میں قومی ترقیات کے تقریباً تمام پہلو شامل ہیں۔

اندرون ملک صلاحیت

گذشتہ سال اگست میں انسیٹ ۲۔اے کی شروعات سے لے کر اب تک اس کی بہترین کارکردگی عالمی معیار کے کثیر مقصدی مصنوعی سیارے تیار کرنے کی اندرون ملک صلاحیت کا واضح مظاہرہ ہے۔ غیر ملک سے حاصل کردہ پہلی نسل کے مصنوعی سیاروں میں سے آخری مصنوعی سیارہ انسیٹ۔ایک ڈی ۱۹۹۰ میں چھوڑا گیا تھا۔ یہ سیارہ اور انسیٹ ۲۔اے دونوں مل کر لمبے فاصلے والی ٹیلی مواصلات، ملک گیر ٹیلی ویژن نشریات، ریڈیو نظام، موسمیاتی زمینی معائنے اور آفات کے بارے میں اطلاع، اعداد و شمار جاری کرنے اور آفات کے سلسلے میں چوکنا کرنے کے شعبوں میں اہم خدمات فراہم کر رہے ہیں۔

انسیٹ ۲ سلسلے کے دوسرے مصنوعی سیارے سے ٹیلی مواصلات اور موسمیات کیلئے خلائی صلاحیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے کے مزید تین مصنوعی سیار… (انسیٹ ۲۔سی، ۲۔ڈی ا… کیے جا رہے ہیں۔ ان س… ٹرانسپونڈروں جیسے ز… ہوں گے۔ گذشتہ دو س… تعلیم کے لیے مواصلاتی… کے استعمال کے سلسلے میں متعدد مظاہروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان مظاہروں کے نتیجے میں دیہی ناخواندگی کے خاتمے اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا اہتمام کرنے کے سلسلے میں مصنوعی سیارے کے نظام کا بے مثل نظریہ سامنے آیا ہے۔ مصنوعی سیارے کے تفصیلی ڈیزائن کے سلسلے میں کارروائی شروع کردی گئی ہے۔ اس کا نام موزوں طور سے "گرام سیٹ"، رکھا گیا ہے۔

گوناگوں استعمال

دور سے اطلاعات حاصل کرنے والے دو بھارتی مصنوعی سیاروں میں سے ایک سیارہ آئی آر ایس۔ ایک اے مارچ ۱۹۸۸ میں اور دوسرا سیارہ آئی آر ایس ایک بی اگست ۱۹۹۱ میں چھوڑا گیا تھا۔ ان مصنوعی سیاروں نے یقینی اور مسلسل بنیاد پر …

… کے لیے استعمال کی جاتی ہیں مثلاً زرعی فصل کے رقبے اور پیداوار کا تخمینہ لگانا، خشک سالی پر نظر رکھنا اور اس کا اندازہ لگانا، سیلاب کی نقشہ بندی، زمینی استعمال اور زمینی احاطے کی نقشہ بندی، بنجر زمینوں کو بہتر بنانا، سمندری اور ساحلی وسائل کا سروے اور انتظام، شہری ترقیات، معدنیاتی امکانات جنگلاتی وسائل کا سروے اور انتظام وغیرہ۔ خاص طور سے آئی آر ایس سے موصولہ معلومات اور متوازی سماجی و اقتصادی معلومات کا استعمال کرکے پائیدار ترقی کے لیے بے مثل مربوط مشن (آئی ایم ایس ڈی) ملک کے چھ اضلاع میں شروع کیا گیا ہے تاکہ ترقیات کے سلسلے میں علاقے کے لیے مخصوص تجاویز

خلا، کے محکمے کے سیکریٹری

تب کی جائیں۔ آئی ایم ایس ڈی کے تحت
ل ملاکر ملک بھر میں ۱۴۹ اضلاع کی سے
شاندہی کی گئی ہے۔ گرام سیٹ کے ذریعہ
خواندگی کے خاتمے کے منصوبوں کے ساتھ
ساتھ آئی ایم ایس ڈی پر عمل درآمد
بھارت کے پورے دیہی سماج کی تبدیلی
کے لیے یقینی ہے۔

مصنوعی سیاروں کو داغنے کی
گاڑی آگمنیٹڈ سیٹلائٹ لانچ وہیکل (اے
ایس ایل وی) کو گذشتہ سال مئی میں
کامیابی کے ساتھ داغا گیا تھا۔ اس کامیابی
مصنوعی سیاروں کی آئی آر ایس اور انسیٹ
تمام کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے
سے سیارے داغے جانے کی گاڑیوں کی
اندرون ملک تیاری و فروغ کے کام میں
بہت زیادہ تیزی آئی ہے۔ پولر سیٹلائٹ
لانچ وہیکل (پی ایس ایل وی) کے تمام تر
مرحلوں کی جانچ کی جا چکی ہے اور اڑان کے
نظاموں کو مربوط کرنے کا کام ایس ایچ اے
ر مرکز، سری ہری کوٹا میں آئی ایس آر
و کے لانچ رینج میں شروع ہو چکا ہے۔
اس گاڑی میں ایک ہزار کلوگرام کے آئی آر
ایس مصنوعی سیاروں کو ۹۰۰ کلومیٹر
دور مدار میں چھوڑنے کی صلاحیت ہوگی۔
پی ایس ایل وی کی پہلی ترقیاتی اڑان موجودہ
سال کے دوران کی جائے گی۔ جیو سینکرونوس
سیٹلائٹ لانچ وہیکل (جی ایس ایل
وی) کے سلسلے میں کام میں مزید تیزی آگئی ہے۔

جی ایس ایل وی کی وجہ سے بھارت
۹۶-۱۹۹۵ تک مواصلاتی مصنوعی سیاروں کی انسیٹ
کلاس ملک کے اندر سے ہی داغ سکے گا۔

خلائی سائنس کے شعبے میں اے ایس
ایل وی سے داغے گئے ایس آر او ایس ایس۔
سی مصنوعی سیارے نے اپنے دو پے لوڈس
سے قابل قدر سائنسی معلومات فراہم کی ہیں۔
ان معلومات کے بارے میں اب سائنس داں
مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔ زمینی ماحول کے
بارے میں معلومات حاصل کرنے کے سلسلے
میں سائنسدانوں کے لیے ایک قومی سہولت
کے طور پر ترویتی کے نزدیک ایک
میسو اسفیر اسٹریٹو اسفیر اور ٹروپو اسفیر
(ایم ایس ٹی) راڈار لگایا گیا ہے۔

صنعتی شرکت

بھارتی صنعتیں بڑا ساز و سامان اور
خدمات فراہم کرکے ملک کے خلائی پروگرام
میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ خلائی پروگرام
کے تحت تیار کردہ ۲۰۷ سے زیادہ ٹیکنولوجیاں
تجارتی پیمانے پر فائدہ اٹھانے کی غرض سے
صنعت کو منتقل کی گئی ہیں۔ بھارتی خلائی
پروگرام نے اب جو پختگی حاصل کرلی ہے اس
کو مدنظر رکھتے ہوئے نیز عالمی منڈی میں
اعلیٰ خلائی ٹیکنولوجی سے تجارتی پیمانے پر فائدہ
اٹھانے کی غرض سے خلاء کے محکمے کے تحت
"انتریکس کارپوریشن لمیٹڈ" کے نام سے
ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ انتریکس کو
دیگر ممالک اور بین الاقوامی خلائی تنظیموں
سے کچھ اہم ٹھیکے مل چکے ہیں۔

بھارت دیگر ممالک کے ساتھ خلاء
کے شعبے میں تعاون کر رہا ہے نیز
بیرونی خلاء کے پرامن استعمال کے لیے
اقوام متحدہ کمیٹی بین الاقوامی آسٹرونوٹکس
فیڈریشن وغیرہ جیسے بین الاقوامی فوروں
میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ انسیٹ ۲۔اے
کی مدد سے تلاش اور بچاؤ پے لوڈس بھارتی
بحری علاقے میں دور دراز تک کی آگاہی
فراہم کر رہا ہے۔ مختلف ممالک کے بہت
سے سائنسی پے لوڈس آئی ایس آر او کے
راکٹوں پر اڑتے رہے ہیں۔ آئی آر ایس ایک
ای مصنوعی سیارہ جو اس سال کے دوران
پی ایس ایل وی سے داغا جائے گا، پے لوڈ
مونوکیولر الیکٹرو آپٹیکل اسٹریو اسکینر کو
شامل کرے گا، جسے جرمن خلائی ایجنسی
ڈی ایل آر نے تیار کیا ہے۔

موجودہ دہے کے لیے خلائی پروگرام
کا مقصد بنیادی طور سے دو اہم عملی خلائی
نظاموں یعنی انسیٹ اور آئی آر ایس کو
قائم رکھنا اور ان نظاموں کو مستقبل میں
اندرون ملک تیار کردہ مصنوعی سیاروں
کو داغ کر فروغ دینا ہے۔ طویل مدت
میں اسی کے مطابق داغے جانے کے
صلاحیتیں پی ایس ایل وی اور جی ایس
ایل وی کے ذریعے پیدا کرنے کی تجویز
ہے۔ خلائی پروگرام کو برقرار رکھنے نیز
زیادہ سے زیادہ اقتصادی اور ٹیکنولوجیکل
فوائد حاصل کرنے کے لیے صنعتی شرکت
میں بھی اضافہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ ملک
۲۱ ویں صدی میں داخل ہو رہا ہے، خلائی
پروگرام عوام کی زندگی میں تبدیلی لانے
کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرنے
کے لیے پوری طرح تیار رہے۔

●

بقیہ۔ بچوں کے حقوق کا تحفظ اوران کی بہبود

کو پورا کرسکتی ہیں کیونکہ یہ آوارہ اور بے سہارا بچے
ایک داغ کی صورت میں معاشرے کے چہرے پر
نمایاں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی مستقل علاج کی
بھی ضرورت ہے تاکہ ان آوارہ اور بے سہارا بچوں کا
مسئلہ پیدا ہی نہ ہو۔

●

شوک شرما

بھارت چین تعلقات۔ ایک نئے دور کا آغاز

اعلیٰ سطحی دوروں اور تبادلۂ خیالات کی وجہ سے ستہ پانچ برسوں کے دوران بھارت اور چین کے یاں تعلقات میں تیزی سے بہتری آئی ہے۔ وزیراعظم ، پی وی نرسمہا راؤ کا موجودہ دورۂ بیجنگ ایسے موقع ہوا ہے، جب ترقی پذیر ممالک ایک سے یک قطبی ، نظام سے مطابقت پیدا کر رہے ہیں۔

ترقی پذیر اور کثیر آبادی والے ممالک ہونے وجہ سے، بھارت اور چین کو ایک ہی طرح کے مادی اور سماجی و ثقافتی دباؤ درپیش ہیں۔ بہت ے امور کے سلسلے میں ان دو عظیم پڑوسیوں کے الات کچھ حد تک ملتے جلتے ہیں۔

دو طرفہ تعلقات کو مستحکم بنانے کا عمل سورگیہ ر اعظم شری راجیو گاندھی کے دورے سے شروع ا تھا۔ اس عمل میں دسمبر ۱۹۹۱ء میں چین کے وزیراعظم بیجنگ کے دورہ بھارت سے تیزی آئی تھی۔ ستہ سال مئی میں اُس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ی آر۔ وینکٹ رمن کے سرکاری دورہ بیجنگ سے مارت چین تعلقات میں مزید بہتری آئی تھی۔ یہ رہ چین کے لئے بھارت کے ایک صدر کا سب ے پہلا دورہ تھا۔

فاعی روابط

ایک اور اہم پیش رفت گذشتہ سال جولائی میں اس وقت کے وزیر دفاع شری شرد پوار کا دورۂ چین تھی، جس میں دونوں ملکوں کے دفاعی اداروں کے درمیان رسمی رابطے قائم ہوئے ہیں۔ وزیر دفاع کا یہ دورہ دونوں ممالک کی اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کا ایک حصہ تھا تاکہ باہمی مفاہمت او ا اضافہ کیا جائے اور تناؤ سے پاک طریقے سے اس بات کا اعاد کے پیچیدہ مسئلے کے سلسلے میں جا رہا ہے جس میں سب سے پہلے لائن آف ایکچوئل کنٹرول پر صورت حال کو مستحکم بنانے پر توجہ دی جائے۔ امور خارجہ کی وزارت سے وابستہ پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کی ایک میٹنگ میں، جس میں خاص طور سے چین کے ساتھ بھارت کے تعلقات پر تبادلۂ خیالات کیا گیا تھا، سرحد کے مسئلے پر بھارت کے موقف کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

کوشش یہ ہے کہ سرحد پر سکون اور امن و امان قائم کیا جائے اور اس کے بعد سرحد کا مناسب تعین کرنے کا کام کیا جائے۔ لیکن جیسا کہ وزیر خارجہ شری دینش سنگھ نے کہا ہے، اس کا مطلب کوئی علاقہ چھوڑنا نہیں ہے۔ وزیر موصوف نے سورگیہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان کا ذکر کیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحد تاریخی اور عملی لحاظ سے مشہور ہے اور مسئلہ صرف اس کے رسمی تعین کا ہے۔

اہم اقدامات

تاہم ۱۹۸۸ء میں سورگیہ راجیو گاندھی کے دورۂ بیجنگ کے وران جا ... جو ... ...

ں نو ن عتوں کی پیشگی اطلاع، نصابی مداخلت کی روک تھام اور حقیقی کنٹرول لائن پر فوج کی ازسرِ نو تعیناتی شامل ہیں۔

دیگر شعبوں میں بھی کچھ اہم اقدامات کئے گئے ہیں۔ بالترتیب شنگھائی اور ممبئی میں بھارت اور چین کے قونصل خانے کھولنے کے سلسلے میں معاہدہ ۱۹۹۱ء میں چینی وزیراعظم کے دورۂ بھارت کے دوران کیا گیا تھا۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کیا جا چکا ہے اور اب دونوں قونصل خانے کام کر رہے ہیں۔

گذشتہ سال ایک اہم پروگرام بھارت میں چینی میلے کا اہتمام تھا۔ بھارت کے گیارہ شہروں میں اس میلے کا زبردست جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا تھا۔ چین کے ایک سو سے زیادہ

دستکاروں اور دستکاروں نے ان پروگراموں میں حصہ لیا تھا۔ بھارتی میلے کا اہتمام مستقبل قریب میں چین میں کیا جائے گا۔

ایک اہم پیش قدمی دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی تجارت کی از سر نو شروعات تھی۔ گذشتہ موسم گرما میں، پہلا سرحدی تجارتی پوائنٹ اتر پردیش تبت سرحد پر گنجی میں کھولا گیا تھا۔ دو مزید تجارتی پوائنٹ سکم اور ہماچل پردیش میں ایک ایک کھولے جانے ہیں۔

تجارتی تعلقات

لیکن کچھ خلا کو پُر کرنے کے لئے دو طرفہ تجارت کی گنجائش محدود تھی کیونکہ بھارت اور چین تقریباً ایک سی ہی اشیا تیار کر رہے ہیں اور اُن کی تجارت کر رہے ہیں۔ ہانگ کانگ کے راستے بالواسطہ تجارت کو شامل کرنے کے بعد بھی ۳۶ لاکھ ڈالر کی مالیت کی دو طرفہ تجارت اہم ارب ڈالر کی کل بھارتی تجارت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ چین میں آج کل فولاد اور دیگر تعمیراتی ساز و سامان کی بہت زیادہ مانگ ہے اور بھارت ان چیزوں کی بڑے پیمانے پر سپلائی کر سکتا ہے۔

اس سال جون میں منصوبہ بندی کمیشن کے نائب چیئرمین شری پرنب مکھرجی کے دورۂ بیجنگ کے دوران خام دھات کو صاف کرنے کے شعبے میں اور ریلویز میں بھارتی ٹیکنولوجیوں اور مشاورت کی خدمات کی پیش کش کی گئی تھی۔ طرفین نے کھلی پالیسیوں کی روشنی میں بڑے پیمانے کے شعبوں کے مقابلے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے استحکام کی روشنی میں ملکی فرموں کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو یقینی بنانے کے طریقوں پر تبادلۂ خیالات کیا۔

اڑیسہ کی ایک کمپنی اور چین کے ایک فولاد تیار کنندہ نے ایک مشترکہ کارخانہ لگانے کے لئے معاہدہ کیا ہے۔ چین نے بھارت میں دیہی اور مقامی معیشت کے پروجیکٹوں کو فروغ دینے کے لئے ۵۰ لاکھ ڈالر کے قرضے کی پیش کش کی ہے۔

ٹیکنولوجی کا باہمی تبادلہ

دونوں ملکوں نے آفات کی آگاہی دینے والے ایسے نظاموں کی ترقی و فروغ پر تیل کے کنوؤں کا پتہ لگانے کے لئے خلائی ٹیکنولوجی کو مشترکہ طور سے استعمال کرنے کے امکان کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ خلائی تحقیق کی بھارتی تنظیم کے سربراہ پروفیسر یو۔ آر راؤ کی قیادت میں ایک بھارتی وفد نے خلائی ٹیکنولوجی اور اس کے استعمال کے سلسلے میں دو طرفہ تعاون کے بارے میں چین میں منعقدہ پہلے ایشیا بحرالکاہل ورکشاپ میں شرکت کی تھی۔ بھارت اور چین نے تعاون کے سلسلے میں ایجنڈا تیار کرنے کے لئے ایک مشترکہ کمیٹی قائم کرنے سے اتفاق رائے کیا ہے۔ طرفین نے ایک مصنوعی اپرچر راڈار کی ممکنہ تیاری کے لئے، جو بادلوں کے آر پار جا سکے، اشتراک عمل کرنے اور لاگتیں کم کرنے کے سلسلے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

دونوں ملک تعلیم، زراعت، محاسبے، شہری خدمات اور عملے کی تربیت کے شعبوں میں تعاون کو رفتہ رفتہ فروغ بھی دے رہے ہیں۔ چین کے آڈیٹر جنرل، کونسلر، تعلیمی کمیشن کے چیئرمین اور شہری امور کے وزیر ۱۹۹۲ء میں بھارت آئے تھے۔ بھارت کی طرف سے بہبود کے وزیر شری سیتارام کیسری اور انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے وزیر شری ارجن سنگھ گذشتہ سال چین گئے تھے۔

سرحد کے مسئلے سے علیحدہ سے نپٹنے کے لئے مشترکہ ورکنگ گروپ کے قیام سے، چین کے ساتھ بھارت کے تعلقات میں اقتصادی اور دیگر شعبوں میں دو طرفہ تعلقات کو فروغ دینے کے سلسلے میں لچک کی علامتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ کیونکہ سرحد کے مسئلے کو حل کرنے میں وقت لگے گا، اس لئے طرفین کا مقصد یہ رہا ہے کہ دو طرفہ تعلقات کو تیزی سے مستحکم کیا جائے اور باہمی اعتماد کا ایک ایسا سیاسی ماحول پیدا کیا جائے جس سے سرحد کا مسئلہ حل کرنے میں مدد ملے۔

●

وطن سے باہر جانے والے کارکنان کی شکایات سننے کے مزید دفاتر

روزی کی تلاش میں بیرون ملک جانے والے کارکنان کی شکایات سننے کے دفاتر کے نظام کی توسیع کی گئی ہے۔ بمبئی، کلکتہ، چنڈی گڑھ، کوچین، مدراس اور ترویندرم میں واقع امیگریشن دفاتر اب ہفتے میں دو مرتبہ منگل اور جمعہ کے دن ساڑھے گیارہ بجے سے ساڑھے بارہ بجے کے درمیان عوامی سنوائی کا اہتمام کریں گے۔ وزارت محنت کی جانب سے موصول ہونے والی ہدایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دنوں کو مقامی ضرورت کے لحاظ سے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔

ان دفاتر میں وطن سے باہر جانے والے شکایت کنندہ کارکن کے تمام ریکارڈ بھرتی کرنے والے ایجنٹوں کے تمام ریکارڈ رکھے جائیں گے۔ اس سے قبل نئی دہلی میں پروٹیکٹر جنرل امیگریشن دفتر میں شروع کی گئی عوامی سنوائی کو زبردست کامیابی ہوئی تھی۔ اس کامیابی کے بعد اس نظام کی توسیع دیگر دفاتر تک کر دی گئی۔

●

سنتوش موہن دیو

فولاد کا شعبہ: پائیدار ترقی و فروغ

جنوری ۱۹۹۲ میں فولاد کی قیمتوں کے تعین اور تقسیم کے سلسلے میں ضابطہ بندی ختم کیے جانے کے بعد سے فولاد کے شعبے میں پیداوار، سرمایہ کاری اور برآمدات میں جو اضافہ ہوا ہے وہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مربوط فولاد ساز کارخانوں میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں پیداوار میں ۸ر۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ برآمدات ۸۷ر۳ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۷ لاکھ ٹن سے زیادہ ہو گئی ہے جس سے ۷۰۸ کروڑ روپے کی مالیت کے غیر ملکی زرِ مبادلہ کی آمدنی ہوئی ہے۔ لوہے کے ڈلوں اور اسفنج لوہے کی زیادہ پیداوار حاصل کرنے کیلئے غیر سرکاری شعبے میں نئی سرمایہ کاریاں بھی کی جانے والی ہیں۔

سال ۹۳-۱۹۹۲ کے دوران تیار فولاد کی کل پیداوار تقریباً ۱۵۱ لاکھ ٹن رہی ہے، جس میں گذشتہ سال کے مقابلے میں ۴ر۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ فولاد کے اہم تیار کنندگان کے ذریعہ فولاد کی پیداوار میں ۸ر۵ فی صد اور ضمنی پیداوار میں ۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے، جبکہ ۹۲-۱۹۹۱ میں فولاد کی پیداوار میں ایک فی صد سے بھی کم کا اضافہ ہوا تھا۔ ۹۳-۱۹۹۲ میں لوہے کے ڈلوں کی پیداوار ۴ر۱۸ لاکھ ٹن رہی ہے، جس میں گذشتہ سال کے مقابلے میں ۷ر۱۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ پیداوار ۹ر۱۷ لاکھ ٹن کی نشانزد شدہ پیداوار سے ۲٫۸ فی صد زیادہ ۔

مانگ میں کمی کی و

فولاد کا ڈھیر لگ گیا ہے

مرحلہ ہے۔ توقع ہے کہ متد

نیز موٹر گاڑیوں اور انجینیر

کے احیاء کے نتیجے میں ۹۴-۱۹۹۳ میں فولاد کی مانگ میں بہتری آئے گی۔

توقع ہے کہ ۹۴-۱۹۹۳ کے دوران اہم تیار کنندگان کے ذریعہ تیار فولاد کی پیداوار ۹۶ لاکھ ٹن رہے گی۔ یہ ۱۴ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہوگا۔ توقع ہے کہ ضمنی شعبے کی پیداوار تقریباً ۶۷ لاکھ ٹن رہے گی جس میں ۱۳ فی صد کا اضافہ ہوگا۔ اس طرح ۹۴-۱۹۹۳ کے لیے مجوزہ ۱۷۲ لاکھ ٹن کی مجموعی پیداوار ۹۳-۱۹۹۲ کی پیداوار سے تقریباً ۲۰ لاکھ ٹن زیادہ رہے گی۔

بھارتی لوہا اور فولاد کمپنی (آئی آئی ایس سی او) کو ۱۹۷۲ میں قومی ملکیت میں لیا گیا تھا تاکہ اس کی پیداواریت کو بہتر بنایا جا سکے اور اس میں منصوبہ بند سرمایہ کاریاں کی جا سکیں۔ اس کمپنی کی کارکردگی میں گذشتہ برسوں میں کمی واقع ہوتی رہی ہے۔ اور اس کی پیداوار ۷۲-۱۹۷۱ میں تقریباً ۶ لاکھ ٹن ...

سفارشات پیش کر دی ہیں۔ ان سفارشات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

لوہے کے ڈلے انجینیرنگ کی صنعت کے لیے بنیادی خام مال ہیں۔ لوہے کے ڈلوں کی اندرونِ ملک پیداوار اب تک بنیادی طور سے مربوط فولاد ساز کارخانوں میں ہی ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۸۶ میں لوہے کے ڈلوں کے معاملے میں لائسنس کا سلسلہ ختم کیے جانے سے پالیسی کو مزید آسان اور نرم بنانے کے سلسلے میں جولائی ۱۹۹۱ میں اعلان کردہ اقدامات کے نتیجے میں متعدد غیر سرکاری پارٹیاں لوہے کے ڈلوں کی پیداوار کی سہولیات قائم کرنے کے سلسلے میں آگے آئی ہیں۔

مالی ادارے اب تک لوہے کے

ڈاکٹر پی۔ کے۔ بندوپادھیائے

انسانی حقوق کا فروغ — بھارتی تناظر میں

وزیر خزانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ جنھوں نے جون میں ویانا میں منعقدہ انسانی حقوق کی عالمی کانفرنس میں بھارتی وفد کی قیادت کی۔ ہندوستانی نقطۂ نظر کو پرزور انداز میں پیش کیا۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی قرار داد پر نظر ثانی کے پیش نظر انسانی حقوق کے معاملے کو ترقی پذیر دنیا میں اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ انسانی حقوق کا تصور ایک وسیع تر تصور ہے جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اس کی جڑیں تہذیبی گوناگونی اور کسی تہذیب کے اندر موجود مختلف النوع عناصر میں پیوست ہیں اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مختلف تہذیبی گروہ قانونی انصاف پانے کا حق رکھتے ہیں۔

انسانی حقوق کا بین الاقوامی تحفظ بین الاقوامی قانون کے تحت ہے جو ۱۹۴۸ کے اقوام متحدہ کے چارٹر کو تسلیم کرتا ہے۔ جس میں انسان کے بنیادی ناقابل تنسیخ اور فطری حقوق شامل ہیں۔

اس کے ابتدائیے اور مختلف قوانین میں بنیادی انسانی حقوق انسانی شخصیت کے وقار عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق اور بلا امتیاز نسل طبقہ زبان اور مذہب سب کو آزادی کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں بنیادی انسانی حقوق کا معاملہ کسی ملک کا اندرونی معاملہ نہیں رہ گیا ہے بلکہ اقوام متحدہ بھی اب اس سلسلے میں فکرمند ہے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر سے پہلے دنیا بھر میں مختلف اعلانیے انسانی حقوق کی فوقیت پر زور دیتے رہیں ہیں۔ ۱۹۷۶ کا ورجینیا کا حقوق کا اعلانیہ، امریکی آزادی کا اعلانیہ اور حقوق کا بل فرانس کی قومی اسمبلی کے ذریعہ پاس شدہ انسانوں اور شہریوں کے حقوق کا اعلانیہ اس سلسلے میں اوّلین کوششیں تھیں۔ برطانیہ میں اس کے غیر تحریر شدہ آئین سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے گو اس کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اس سلسلے میں ۱۲۱۵ عیسوی میں میگناکارٹا اور ۱۵۸۹ میں ایکٹ آف سیٹلمنٹ کی بھی مثال دی جاسکتی ہے۔

انسانی حقوق کے عالمگیر اعلانیے میں درج حقوق کے اجتماعی نفاذ کے لیے عالمی سطح پر مختلف اقدامات کیے گئے۔ ۲۵ برس قبل پہلی کانفرنس طہران میں منعقد ہوئی تھی۔ ان سبھی اقدامات کے مقاصد قابل تعریف ہیں۔ لیکن انسا[نی] حقوق سے متعلق ترقی یافتہ ممالک کے بڑ[ھتے] ہوئے سیاسی و سفارتی اقدامات اور ا[ن] کے نتیجے میں ان ممالک کا رویہ ترقی پذی[ر] ممالک کے لیے باعث تشویش بن گیا ہے۔ اب یہ کہا جارہا ہے کہ کسی ملک کو دی جا[نے] والی امداد کا انحصار اس ملک میں انسا[نی] حقوق کی صورتحال پر ہوگا۔ اس سے یور[پ] اور امریکا کی جارحانہ سوچ کا پتہ چلتا ہے۔

ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونو[ں] ہی ممالک میں اس رویہ کی مخالفت میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس برس مارچ م[یں] بنکاک میں ہوئی علاقائی میٹنگ میں ایش[یائی] حکومتوں نے اپنا موقف دنیا کے سا[منے] رکھا۔ اس میٹنگ میں منظور شدہ اعلا[نیے] میں انسانی حقوق کے فروغ کے لیے اس [ت] علاقے کی تاریخی ثقافتی اور مذہبی گوناگو[نی] کو مدِنظر رکھنے پر بھی زور دیا گیا۔ انسا[نی] حقوق کو ترقیاتی امداد سے جوڑنے کے خیا[ل] کی مخالفت کرتے ہوئے اس میں ممالک کی قومی خود مختاری کا احترام کرنے او[ر] کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخ[ل] نہ دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے سیاسی شہری آزاد[ی]

اور عوام کی سماجی اور اقتصادی امنگوں کے
درمیان توازن کی۔ کسی بھی منصفانہ سیاسی
نظام میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے
پر منحصر ہوتی ہیں۔ بھارت میں مختلف نسلیں
مذاہب اور زبانیں ہیں جو ایک جمہوری
نظام کے دائرے میں ترقی کی جانب رواں ہیں۔

بھارتی آئین میں شہریوں کو مختلف
بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں جن میں شہری
آزادیوں کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔
رہنما ہدایات میں ریاست کی حکمرانی کے
اصول درج ہیں۔ ترقی کی راہ پر چلتے ہوئے
آبادی اور معاشی دباؤ کی وجہ سے علیحدگی
کے جذبات بھی پیدا ہوسکتے ہیں بعض
قوتیں ان کا استحصال کرتی ہیں اور نسلی
مذہبی اور علیحدگی پسندی کے مسائل
پیدا کرتی ہیں۔ انتہا پسندانہ تشدد سے
جمہوری نظام پر دباؤ پڑتا ہے۔ مگر بھارتی
سیاسی نظام میں اس بات کی اہلیت
ہے کہ وہ ان مسائل سے نمٹ سکے اور
مختلف طبقات کی مرضی کے مطابق پرامن
طور پر مسائل کا حل کرسکے۔ اگر بڑے
پروجیکٹ شروع کرنے کے لیے آبادی
کو وہاں سے ہٹانے کا مسئلہ پیدا ہوتا
ہے یا دیگر رہائشی مسائل پیدا ہوتے
ہیں تو حکومت آئین کے اندر ان کو حل کرنے
کی کوشش کرتی ہے۔ مختلف طبقوں کو
سماجی اور معاشی انصاف دینے کی غرض
سے حال ہی میں انسانی حقوق کمیشن کے
قیام کی تجویز رکھی گئی ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ انسانی حقوق
کا نعرہ کہیں ان لوگوں کا ہتھیار نہ بن جائے
جو ملک کے سیاسی اتحاد اور علاقائی
سالمیت کو چیلنج کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔
اس کو جمہوری سماج کی صحیح کارکردگی کی
راہ میں حائل ہونے کی بھی اجازت نہیں
دی جانی چاہیئے۔

عالمی تناظر میں دیکھیں تو یہ ترقی کا
مسئلہ ہے۔ امداد کو انسانی حقوق سے
منسلک کرنے کا الٹا اثر پڑ سکتا ہے۔
یہ انسانی حقوق کی کسی آدرس تحریک کے
حق میں بھی نہیں ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ثقافتی
عوامل کی زیادہ بہتر تفہیم پیدا کی جائے۔
اور انسانی حقوق سے متعلق دفتری ادارہ
جاتی اور معاشی عوامل کے نتائج کے بارے
میں پہلے سے سوچا جائے۔

ایک بار جب یہ عمل سمجھ لیا جائے
گا تو مستقبل میں انسانی حقوق کے غلط
استعمال کو روکنے کی تدبیر کی جاسکے گی۔

جو چیز اہم ہے وہ یہ
اپنے طریقے سے
ساتھ ہم آہنگی
کو حاصل کرنے کا
اصل سوال کسی
کا ہے کہ وہ ترقیاتی عمل سے پیدا شدہ
مسائل کا حل کرے اور انسانی حقوق کے
قابل قبول معیار وضع کرے۔ بھارتی تجربہ
بتاتا ہے کہ ترقی کا حق بھی اتنا ہی اہم ہے۔
اس سلسلے میں کوئی باہری دخل اندازی
نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

بھارتی آئین میں انسانی حقوق
کا تحفظ موجود ہے۔ خواتین اور اقلیتوں
کے کمیشنوں کا قیام اور دیگر اقدامات نے
انسانی حقوق کے تحفظ کے طریقہ کار کو
مستحکم کیا ہے۔ ●

بقیہ: فولاد کا شعبہ: پائیدار ترقی و فروغ

ٹنوں کی ایسی متوقع صنعتوں سے متعلق
۱۳ تجاویز کو منظوری دے چکے ہیں، جن کی
کل صلاحیت تقریباً ۱۱ لاکھ ٹن سالانہ
ہے۔ غیر سرکاری شعبے میں لوہے کے ٹنوں
کے دو یونٹوں نے پیداوار کا کام شروع
کر دیا ہے اور دیگر پروجیکٹوں پر
عمل درآمد چل رہا ہے۔ اسی طرح سے
اسفنج لوہے کے شعبے میں بھی قابل ذکر
پیش رفت دیکھنے میں آئی ہے۔ اسفنج
لوہا دھات کی ایک شے ہے، جو اعلیٰ
قسم کے خام لوہے کو ٹھوس شکل میں ڈھال
کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ اسٹیل میلٹنگ
اسکریپ کے لیے ایک جزوی متبادل
شے ہے، جسے ضمنی اشیاء تیار کرنے
والے استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ

لی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲
کے دوران اسفنج لوہے کی پیداوار تقریباً
۱۵ لاکھ ٹن رہی ہے جبکہ گذشتہ سال
یہ پیداوار ۱۲ لاکھ ٹن رہی تھی۔ ●

بقیہ: تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں اور دیہی خواتین کے روزگار کی دو اسکیمیں

خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے تاکہ وہ اپنی ذاتی
بچت کو فروغ دیں۔ اس اسکیم کے تحت
ہر خاتون ایک برس میں ایم ایس والے
اکاؤنٹ میں ۳۰۰ روپے تک جمع کر سکتی
ہے۔ حکومت اس میں ۲۵ فی صد کا تعاون
دے گی یعنی ترغیب کے طور پر ۷۵ روپے
فراہم کرے گی۔ ●

بقیہ: یوجنا کے اڑیہ ایڈیشن کا اجراء

خرد کشں اور اشتراک سے موثر طور پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ سماج کے ان طبقوں کے لئے زندگی زیادہ آرام دہ بنائی جانی چاہیئے اور ہم یہ مقصد متعدد منصوبوں اور پروگراموں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ لوگ جن کی قوت خرید کمزور ہے کتابوں وغیرہ پر زیادہ خرچ نہیں کرسکتے۔ ان لوگوں کے لئے بھی کتاب کا مضمون اور اظہار کا طریقہ دوسرے طبقوں ہی جتنا اہم ہے۔ لہذا ہم جو کچھ شائع کریں اُس کا متن ایسا ہونا چاہیئے جو دیہات کے عوام اور نئے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی دلکش ہو۔ چنانچہ دیہی علاقوں کے لئے ہماری مطبوعات ایسی ہونی چاہئیں جس سے انھیں روزمرہ کی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے اور سوچ کا دائرہ وسیع کرنے میں مدد ملے۔ ان مطبوعات کے ذریعہ اُنہیں صرف یہ ہی نہیں بتایا جانا چاہیئے کہ وہ کس طرح کاشت کے جدید طریقے استعمال کرکے کھیتی کے لئے درکار بہتر اشیاء کام میں لاکر، مناسب تناسب میں کھاد کے استعمال اور کرم کش دوائیاں وغیرہ کام میں لاکر اپنی پیداوار بڑھا سکتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی بتایا جانا چاہیئے کہ دستیاب سہولیات سے وہ اپنی آمدنی میں کس طرح اضافہ کرسکتے ہیں اور دیہات میں صفائی ستھرائی، مویشیوں کی داشت و پرداخت سماجی جنگل بانی اور دیہی صنعتوں کے ذریعہ اپنا معیار زندگی بھی بلند کرسکتے ہیں۔ یہ "یوجنا" رسالہ کے مدیروں کا کام ہے کہ وہ یہ تمام معلومات دیدہ زیب شکل میں مہیا کریں۔ یہ سب طویل المدت مقاصد ہیں جنھیں حاصل کرنے کیلیے مسلسل کوششوں کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مدیران کی جانب مناسب توجہ دیں گے۔

قوم اس برس بھی ہر سال کی مانند بابائے قوم مہاتما گاندھی کا جنم دن منا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُڑیسہ کی انتہائی غربت کو دیکھ کر مہاتما گاندھی نے زندگی بھر غریبی کے خلاف جدوجہد کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ غریبی صرف حکومت کی کوششوں سے ہی نہیں ہٹائی جاسکتی بلکہ اُسی صورت میں دور کی جاسکتی ہے! جب ریاست کا ہر شخص غریبی دور کرنے کے پروگراموں اور پالیسیوں میں حصہ لے۔ ریاست میں بڑی تعداد میں آدی باسی اور دیہات کے لوگ ایسے ہیں جن پر ہماری قومی ترقی کے عمل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمارا فرض ہے کہ اُنہیں قومی دھارے میں لایا جائے اور ترقی کے راستے پر اپنا سرگرم شریک بنایا جائے۔ آیئے آج اس مقدس دن پر ہم سچے دل سے اُن قدروں اور مقاصد کے حصول کا عہد کریں جن کے لئے مہاتما گاندھی زندہ رہے اور جان دی۔

ان چند الفاظ کے ساتھ میں "یوجنا" کے اُڑیہ ایڈیشن کا اجراء کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ مستقبل میں یہ پھلے پھولے اور ترقی کرے۔ ●

بقیہ تلک۔ ایک عوامی شخصیت

تھیں، جن سے وہ عوام کو یہ دکھا سکیں کہ ان کی اپنی تہذیب برتر ہے۔ ان کے نزدیک برطانوی سیاسی ادارے، ان کے کھیل کے قواعد وضوابط اور ان کی زبان انسے چیزوں کو ان کے خلاف استعمال کرنے کے علاوہ کسی کام کے نہیں ہیں۔ ان کے مطابق سیاست کو آرام دہ کرسیوں تک ہی محدود نہیں رکھا جاسکتا، اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے، جہاں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں نیز قیادت میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے اور اسے ترسیل کے مختلف ذرائع برقرار رکھنے چاہئیں۔

یکم اگست ۱۹۲۰ کو مادر ہند کے اس عظیم سپوت نے اپنی آخری سانس لی۔ گاندھی جی نے ۴ اگست ۱۹۲۰ کو "ینگ انڈیا" میں تلک کو ملک کی جانب سے زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ●

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار فراہم کرنے کی اسکیم

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو باقاعدہ طور پر روزگار کی ایک نئی اسکیم "وزیر اعظم کی روزگار یوجنا" شروع کی جائے گی۔ یہ اسکیم ملک میں دس لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار فراہم کرے گی۔ یاد رہے کہ اس اسکیم کا اعلان وزیر اعظم نے ۱۵ اگست ۱۹۹۳ کو کیا تھا۔

اس اسکیم پر عمل درآمد میں آٹھویں پنجسالہ منصوبے کی باقی مدت کے دوران سرمایہ سبسڈی، تربیت اور انتظامی لاگت کو پورا کرنے کے لیے ۵۴۰ کروڑ روپے کی رقم صرف ہوگی۔

یہ اسکیم چھوٹی صنعتوں، مینوفیکچرنگ سروسز اور تجارتی اداروں میں تقریبًا ۱۴ لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے روزگار فراہم کرے گی۔ ایک لاکھ روپے تک کی رقم بطور قرض دی جائے گی جس میں ۱۵ فی صد سبسڈی شامل ہوگی لیکن سبسڈی کی یہ رقم ۷۵۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دسویں جماعت اور آئی ٹی آئی سے امتحان پاس کرنے والے نوجوانوں کے علاوہ وہ تمام نوجوان اس اسکیم سے استفادہ حاصل کرنے کے مجاز ہوں گے جنہوں نے حکومت کا اسپانسر کردہ کم از کم چھ ماہ کی مدت کا تکنیکی کورس کر رکھا ہو۔

یہ اسکیم ریاستوں میں ضلعی صنعتی مراکز کے ذریعے اور چار میٹروپولیٹن شہروں میں چھوٹی صنعتوں کے سروس اداروں کے ذریعہ لاگو کی جائے گی۔ ●

حاجی شمس الدین

جواہر لال نہرو ـــــ ایک حسّاس شخصیت

پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں کچھ لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ وہ بڑے گرم مزاج تھے، اور انھیں بہت جلد غصہ آجاتا تھا۔ ساتھ ہی نظم و نسق کے بارے میں وہ بڑے سخت تھے۔ لیکن جو ان کی قربت میں رہے ہیں نیز ہم نے بھی ان کے متعلق جو کچھ دیکھا پڑھا اور سنا ہے اس سے ان کے مزاج کی ایک علیحدہ تصویر سامنے آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں غصہ آتا تھا۔ لیکن جب کوئی غلط بات ہو جائے کوئی نظم و نسق کے خلاف بات کرے کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو یا جب ان کی حسب منشا کام نہ ہو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کا غصہ بہت جلدی ہی ختم ہو جاتا تھا۔

اسی طرح وہ اپنی عادات اور کاموں میں بھی بااصول تھے اور خود بڑے منضبط تھے اس لئے فطری بات ہے کہ دوسروں سے بھی اس کی امید رکھتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود نہرو جی بڑے سیدھے، سادہ مزاج، رحم دل اور حساس تھے۔ اوپر سے سخت دکھائی دیتے ہوئے بھی آخر کار بڑے نرم اور مہربان تھے۔ اس سیاق وساق میں ان کا مقابلہ ناریل سے کیا جاسکتا ہے۔ جو اوپر سے تو بڑا سخت ہوتا ہے لیکن اندر سے بڑا نرم اور میٹھا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کے کئی واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو نہرو جی نے کچھ ایسے حالات میں

پائی پر مسلسل ذمہ داریاں
کی زندگی کا سخت اور سنگین
لیکن باوجود اس کے ان کی
معاملوں میں بڑی تیزی سے

جواہر لال نہرو قدرت اور خوبصورتی سے بھی بڑے حساس تھے۔ اپنی مصروف ترین زندگی میں جب بھی فرصت کے کچھ لمحے ملتے تھے تو انھیں وہ قدرتی حسن کے درمیان گذارتے۔ اونچے نیچے برف سے ڈھکے پہاڑ شور شرابہ کرتی ہوئی بہتی ندیاں اونچی چٹانوں سے گرتے ہوئے آبشار اور پہاڑی جھرنے انھیں بہت راغب کرتے تھے۔ انھیں قدرت کی گود میں بڑا سکون بڑا آرام ملتا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں خود لکھا ہے کہ جیل کی سونی راتوں میں چاند ان کا غیر منقطع دوست اور ساتھی رہا ہے۔ اس میں وہ دنیا کی خوبصورتی اور زندگی کا اتار چڑھاؤ دیکھتے تھے۔

یہ ہی نہیں کوئی بھی فن چاہے وہ ڈرائنگ ہو، پینٹنگ موسیقی ہو یا رقص ہو، ڈرامہ ہو، یا تصویر کشی ہو ان کے دل کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نمائش میں جاتے پر وہ ایک ایک تصویر ماڈل یا مورتی کو

رقص انھیں جذباتی کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی آدی باسی فنکاروں کے اصرار پر نہرو جی ان کے روایتی ترنگ میں ان کے رقص میں شریک ہو جاتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں پوری آزادی کی مانگ کے ساتھ نہرو جی مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں جٹ گئے۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد آخر کار ۱۹۴۷ء کا سال آیا جب ہندوستان کو آزادی ملی۔ لیکن بہت بڑی قیمت پر، ہندوستان کو تقسیم کر کے۔ شروع میں کانگریس کے کوئی بھی رہنما اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن انگریزوں کی چال اور مسلم لیگ کی اڑیل پالیسی کے سبب آخر میں کانگریس کمیٹی کو مجبوری میں تقسیم کو قبول کرنا پڑا۔ گاندھی جی اس وقت ملک کی تقسیم کے حق

۱۵۰/۷ بیج ناتھ پاڑہ۔ رائے پور۔ ۴۹۲۰۰۱۔ ایم۔ پی

میں نہیں تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کے فوراً بعد جس طرح سے فرقہ وارانہ فسادات بھڑکے اور لوٹ کھسوٹ نیز قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ اس سے پنڈت نہرو کا حساس دل رو پڑا۔ انھیں اپنے ہی لوگوں پر غصہ آیا جو ان کے بڑے ہی خیر خواہ تھے نیز جنھوں نے فرقہ وارانہ دنگوں میں مخالف پارٹی پر ظلم و ستم کیئے، اس وقت نہایت دکھی دل سے انھوں نے کہا تھا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے خیر خواہ جانور تھے۔ میرا دل درد سے بھر گیا ہے میرا ان خوف ناک فسادات نے میرے ملک کا سر جھکا دیا ہے۔ میں باپو سے ملنے گیا لیکن ان کا سامنا کر سکا میں بہت شرمندہ تھا۔"

روپیہ پیسہ عیش و عشرت کے ماحول میں پیدا ہونے کے بعد بھی نہرو جی نے دور نوجوانی سے ہی حب الوطنی سے ایثار کی زندگی اپنائی۔ آزادی کی لڑائی میں طرح طرح کی ظلم و زیادتیاں برداشت کر کے اور برسوں جیل میں زندگی گذار کر وہ دل و جان دونوں سے مضبوط ہو گئے تھے۔ لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی میں کچھ مواقع ایسے بھی آئے جب ان کا حساس دل جذباتی ہوا تھا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو گئیں۔ اپنے والد کی موت کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ "مجھے یہ محسوس کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ تین ماہ بعد میں اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ سیلون (سری لنکا) میں تھا۔ وہاں فوارہ ایلیا میں ہم آرام و سکون سے کچھ دن گذار رہے تھے۔ مجھے مقام بڑا اچھا لگا اور اچانک میرے دل میں آیا کہ یہ والد محترم کیلئے مناسب ہوگا۔ کیوں نہ انھیں یہاں بلا لیا جائے۔؟ وہ بہت تھک گئے ہونگے۔ اور آرام سے یہاں انھیں فائدہ ہوگا۔ میں الٰہ آباد تار بھیج کر انھیں بلانے ہی والا تھا کہ۔۔۔۔۔۔" پنڈت جی کو یاد آیا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء میں اُن کی اہلیہ کملا نہرو کا انتقال ہو گیا۔ بیس سال کی ازدواجی زندگی میں ان کا زیادہ تر وقت جیل میں گذرا۔ اس درمیاں کملا نہرو اپنے شوہر کے نقش قدم پر چلتی ہوئی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں اپنا تعاون دیتی رہیں۔ ان کی موت پر نہرو نے محسوس کیا کہ کملا کا ان کی زندگی پر کتنا گہرا اثر تھا۔ اہلیہ کی موت پر نہرو جی کے حساس دل سے اپنی کی تنہائی پر نکلے یہ دلی خیالات پر غور کیجئے "میں نے خلاء اور بے مقصدی کا احساس کیا۔ میں اکیلا گھر واپس جا رہا تھا جو اب میرے لئے گھر نہیں رہ گیا تھا۔ اور میرے بازو میں ایک ٹوکری تھی جس میں ہڈیوں کی خاک کا برتن تھا۔ کملا اب نہیں میرا دل یہ ہی دوہراتا جا رہا تھا۔"

والد کی موت اور اہلیہ کی جدائی کے صدمے کے بعد جواہر لال کے لئے صلاح و مشورے، ترغیب اور جوش کا ایک ہی مرکز تھا، اور وہ تھا "باپو" مہاتما گاندھی۔ لیکن ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو نہرو جی کی زندگی کو سب سے بڑی ضرب پہنچی۔ قوم پر آئی مصیبت سے وہ لمحے بھر کے لئے مضطرب ہو گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انھوں نے بہت ہمت سے کام لیا۔ اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر چہ چراغ بجھ گیا ہے لیکن اس کی روشنی ہماری راہ ہموار کرتی رہے گی۔ اور اس طرح وہ ملک کی آزادی اور اس کے بعد اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

جواہر لال نہرو کے دل کی حساسیت کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے تین خاص تصانیف تحریر کیں۔ یہ ہیں "وشوا اتہاس کی ایک جھلک" (عالمی تاریخ کی ایک جھلک)، "آتم کتھا" (آپ بیتی) اور "ہندوستان ایک کھوج"۔ اس میں سے پہلی تصنیف "وشوا اتہاس کی ایک جھلک" میں ان ۱۹۶ خطوں کا مجموعہ ہے جو نہرو جی نے نینی سینٹرل جیل سے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے نہرو کے اندرونی جذبات اور ہمدردیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو اندرا گاندھی کی ۱۳ویں سالگرہ تھی۔ اس دن کے لئے ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو لکھے اپنے پہلے خط میں انھوں نے بڑی خوش اخلاقی سے لکھا تھا۔ "اپنے یوم پیدائش پر تحفہ اور مبارکباد پانے کی تمہیں عادت ہے۔ مبارکباد تو تمہیں ابھی بھی پوری طرح سے ملے گی۔ لیکن نینی جیل سے میں تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں۔"

نہرو جی کے دل میں اپنے ملک کے عام لوگوں کے لئے بڑا پیار تھا، بڑا رحم اور ہمدردی کا جذبہ تھا۔ جب بھی وہ دورے پر جاتے تو ہجوم غفیر ان کو دیکھنے کے لئے امڈ پڑتا۔ کبھی کبھی کوئی ضعیف یا ضرورت مند شخص ان سے کوئی فریاد کرنا چاہتا یا کوئی درخواست دیتا تو اپنی حفاظت کے سارے دائرے کو توڑ کر وہ خود اس کے پاس پہنچ جاتے۔

نہرو جی بیمار لوگوں کے تئیں بھی بڑے حساس اور ہمدرد تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے کانگریس کارکنان کے بیمار پڑنے پر نہرو جی ان کی تیمارداری بڑی دلچسپی اور مستعدی کے ساتھ کرتے تھے وہ رات میں جاگ کر مریض کی دیکھ بھال کرتے اور صبح سے پھر روز مرّہ کے کام میں مصروف ہو جاتے اور حفاظتی افیسر دیکھتے رہ جاتے۔ وہ عوام پر اعتماد رکھتے تھے۔ ایک بار ایک اینگلو انڈین پولیس افیسر نہرو جی کے استقبال میں جمع بھیڑ کو بڑے وحشیانہ طور پر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہرو جی یہ دیکھ کر تقریباً اپنی جیپ سے کود پڑے اور اس افیسر پر بگڑتے ہوئے بولے۔ "یہ تمہاری حکومت نہیں ہے۔ حکومت عوام کی، ان لوگوں کی ہے۔ یہ بیچارے مجھ سے ملنے دور دور سے آئے ہیں اور تم انھیں مجھ سے ملنے بھی نہیں دیتے تمہیں ان کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ ہم اور تم ان کے خدمتگار ہیں۔"

جواہرلال نہرو کا دل بڑا فراخ دل تھا۔ خاص طور پر غریب اور چھوٹے ملازمین کا وہ بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ آنند بھون کے اپنے نوکروں کے آرام و سہولیات کا خیال رکھتے تھے۔ نیز اپنی بہن وجئے لکشمی پنڈت کو خط لکھ کر کبھی ان کی تنخواہ تو کبھی ان کے کپڑے مکان وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے اور ضروری مدد کرنے کی ہدایت کرتے۔ ایک بار کچھ سبکدوش و ضعیف ملازمین نہرو جی کے پاس پہنچے اور گلوگیر آواز سے بولے۔ حضور چار سال سے پنشن نہیں ملی بھوکوں مر رہے ہیں۔

نہرو جی حیرت سے بولے۔

کیا۔؟

چار سال سے آپ لوگوں کو پنشن نہیں ملی۔؟

اور پھر انھوں نے فوراً افسران کو بلایا اور خوب پھٹکارتے ہوئے انھیں جلد کارروائی کرکے ان سبکدوش ملازمین کو پنشن دلانے کا بندوبست کیا۔ انتظامیہ کے تئیں بھی نہرو جی اتنے ہی حساس تھے۔

نہرو جی کے ساتھی ان کی قربت میں رہنے پر بڑے مطمئن اور خوش رہتے تھے۔ سب وہ جانتے تھے کہ نہرو جی نہ صرف ان کے مددگار تھے بلکہ محافظ بھی۔

نہرو جی جیل میں صبح جلدی اٹھتے اور کبھی باغیچے میں تو کبھی صفائی کے کاموں میں لگے رہتے۔ کبھی ناشتہ بنانے میں تو کبھی سبزی کاٹنے میں وہ باورچی کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمیشہ سرگرم رہنے اور محنت کرتے رہنے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خود کبھی بیمار نہیں پڑتے تھے۔

نہرو جی کے طعام کی عادت بھی بڑی سیدھی اور سادہ تھی۔ ان کا طعام بڑا محدود اور باضابطہ ہوتا تھا۔ کوئی ان سے بار بار اور زیادہ کھانے کے لئے اصرار کرتا تو وہ ناراض ہو جاتے تھے۔ اسی طرح بہت سی قسم کی چیزیں ایک ساتھ کھانا بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں روپئے پیسے اور سرمائے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ کچھ نجی چیزوں کے علاوہ مجھے کسی طرح کے سرمائے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سرمایہ رکھنا میرے لئے بوجھ کے مانند ہے۔ زندگی کے سفر میں انسان کو ہلکا چلنا چاہئے۔

نہرو جی کو گلاب کا پھول بہت پسند تھا اور اسے وہ ہمیشہ واسکوٹ کے بٹن کے ساتھ لگائے رکھتے تھے۔

انھیں ننھے منے بچے بھی بڑے پیارے لگتے تھے۔ کیونکہ بچے بھی گلاب کے مانند ہوتے ہیں۔ بچوں کے تئیں ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے یوم پیدائش ۱۴ نومبر یوم اطفال کی شکل میں ملک کو سپرد کر ...

یہ ہی نہیں نہرو جی کی حساسیت ...
عام لوگ تھے۔ وہ یہ محسوس ...
کی عوام انھیں بے حد پیار کر ...
کے مقابلہ میں وہ ان کی امید
کو پورا نہیں کر پا رہے تھے۔ اگرچہ اس ...
وہ ہمیشہ کوشاں اور سرگرم رہے۔ غالباً اسی لئے وہ رابرٹ فراسٹ کی یہ عبارت اپنی ٹیبل پر ہمیشہ آپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے۔

"جنگل خوبصورت گھنا اور خوبصورت
ہیں مگر کئی وعدے ہیں جنھیں
پورے کرنا ہیں۔ اور سونے
سے پہلے طویل مسافت طے
کرنا ہے۔"

ان عبارت سے ترغیب حاصل کرکے زندگی کی آخری سانسوں تک عوام کی خدمت کرتے رہنے کا عزم بھی غالباً نہرو جی کو اپنے محبوب ملک اور اس کی سرزمین کے تئیں محبت نمایاں کرنے کے لئے کافی نہیں لگا۔ اسی لئے تو اپنی وصیت میں یہ لکھ کر کہ میری راکھ کا زیادہ تر حصہ اونچے آسمان سے ملک کے کھیت کھلیانوں میں بکھیر دیا جائے، تاکہ اس کی مٹی میں مل کر وہ اس ملک کا غیر منقطع حصہ بن جائے۔ اس ملک ہندوستان کا حصہ جس سے نہرو جی کو بہت پیار تھا۔ اور جس نے نہرو کو اپنا بے پناہ پیار دیا تھا۔

ایسے تھے ہمارے حساس جواہرلال نہرو جی!

●

ریشم کے کیڑے پالنا اور ریشم سازی

- ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ریشم کی صنعت کے ذریعہ پیدا کردہ مجموعی روزگار بڑھ کر ۴۴ء۵۴ لاکھ افراد ...

... کام ہوتا ہے۔

- ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران سبز ریشم کے خام ریشم کی مجموعی پیداوار کا تخمینہ ۱۴ر۳۰۰ میٹرک ٹن لگایا گیا ہے۔
- ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران برآمداتی آمدنی کا تخمینہ ۷۰۰ کروڑ روپے کا ہے
- بھارت کو ریشم کی چاروں مشہور اقسام یعنی ملبیری، ٹسر، ایری اور موگا پیدا کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔
- بھارت دنیا بھر میں واحد ملک ہے جو سنہرے ریشم "موگا" کی پیداوار کرتا ہے۔
- بھارت نے ریشم کی اقسام ملبیری اور ٹسر پیدا کرنے میں دنیا میں چین کے بعد دوسرا مقام حاصل کرلیا ہے۔ ●

تلک ۔ ایک عوامی شخصیت

بال گنگا دھر تلک، جو عام طور سے لوک مانیہ کے نام سے مشہور ہیں، بھارت کی جدوجہد آزادی کی قد آور شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ وہ مہاراشٹر کے شہر رتناگری میں ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ قومیت کی تمام دستیاب طاقتوں میں تال میل پیدا کیا اور انھیں یکجا کیا نیز بھارت کے عوام کو آزادی کے تصور سے روشناس کرایا۔

جیسا کہ گرودیو ٹیگور نے کہا ہے کہ وہ طریقے کی بہ نسبت سچائی میں زیادہ یقین رکھتے تھے۔ بھارت کی تقدیر بنانے کے سلسلے میں ان کا تصور بہت وسیع تھا اور اسی لیے اس میں ہر ایک شخص کے لیے جگہ تھی۔ تلک یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ آزادی کے گوناگوں پہلو ہیں۔

ایک رہنما

مصمم عزم اور مضبوط ارادے کے خوبی، ایک کھلا اور صحت مند ذہن، محنت کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کی صلاحیت نیز باضابطہ و باسلیقہ کام کرنے کا انداز تلک کو اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ ریاضی، سنسکرت اور قانون میں تربیت حاصل کرنے کے سبب، جو سبھی سخت محنت والے مضامین ہیں، ان کا شمار بھارت کے بلند مرتبہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔

اپنی عملی زندگی کے آغاز سے ہی اپنے زمانے کے سیاسی کام کے روایتی طریقوں سے ان کا انحراف انقلابی نوعیت کا تھا۔ اپنے ابتدائی زمانے میں ان کے خیالات اپنے مذہب تک ہی محدود تھے لیکن موقع اور وقت کے لحاظ سے اپنے آپ کو بدلنے کی انکی صلاحیت نے انہیں ایک قومی رہنما بنا دیا تھا اور انہوں نے لوک مانیہ کے طور پر شہرت حاصل کی تھی۔ تلک نے ۱۸۸۰ میں نیو انگلش اسکول سے اپنی عوامی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ پونہ میں دکن ایجوکیشن سوسائٹی کے رہنماؤں میں سے تھے۔ یہ سوسائٹی اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھی، جس نے بھارتی عوام میں اعلیٰ تعلیم کی تشہیر کی۔ صحافت نوجوان رہنماؤں کی ایک اور کوشش تھی۔ مراٹھی میں "کیسری" اور انگریزی میں "ماہرٹا" تلک اور ان کے ساتھی محب وطنوں نے نکالے تھے۔

تلک اعلیٰ قومی اہمیت کے معاملوں کے سلسلے میں احتجاج کے ایک ذریعہ کے طور پر پریس کی طاقت سے بخوبی واقف تھے پریس کے ذریعہ حب الوطنی کے جذبات پیدا کرکے، نصب العین کی توضیح کرکے مسائل کے حل پیش کرکے اور اختیار کی جانے والی نئی سمتوں کے لیے رہنما خطوط فراہم کرکے انہوں نے بھارت کی از سر نو تعمیر کی کوشش کی۔

بے لوث خدمت

یہ صحافی جلد ہی احتجاج کرنے والا، تعلیم دینے والا اور منظم کرنے والا شخص بن گیا عوام نے ایک ایسے نئے رہنما کے ظہور کو تسلیم کر لیا، جو بغیر ڈر و خوف کے ان کے کاز کی حمایت کرے گا۔ تلک کی عقلیت ہمیشہ حب الوطنی کے جوش میں ڈوبی ہوئی تھی۔

لفظ "سوراج" کو تلک نے شہرت عطا کی۔ ثقافتی قومیت کے ایک حامی کے طور پر، انہوں نے تعلیم کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ ایک عوامی شخصیت کے طور پر تلک لوگوں کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انہوں نے بے لوث خدمت کے جذبے کے ساتھ بہترین انقلابی روایات کو اہمیت دی۔

تلک میں ایسی صلاحیتیں بخوبی موجود

(باقی صـ۲۴)

نظر برنی

جنگ آزادی کے ایک سپاہی

مولانا محمد علی جوہر اور ہندو مسلم اتحاد

مولانا محمد علی جوہر ان رہنماؤں میں سے تھے جو نابغۂ عصر کہلاتے ہیں اور جو کسی قوم میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخ عالم ایسے رہنماؤں کو غیر معمولی افراد میں شمار کرتی ہے۔

بیسویں صدی کا ابتدائی چوتھائی عرصہ وہ ہے جب سامراجی ممالک اپنے نوآبادیوں پر مکمل سیاسی اور معاشی تسلط رکھتے تھے۔ سامراجیت کا یہ انتہائی عروج اور ابتدائے زوال کا زمانہ تھا۔ سامراجیت کے مختلف گروہوں کو اپنی تجارتی منڈیوں کے تحفظ اور بٹوارے کے لیے ایک طویل اور تباہ کن جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ جو آزادی، جمہوریت اور تحفظ تہذیب کے نام پر لڑی گئی، درحقیقت ایشیا میں عام بیداری کا باعث بنی۔

محمد علی جوہر ۱۸۷۸ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا عبدالعلی ریاست رامپور میں ممتاز عہدے پر فائز تھے ان کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ محمد علی جوہر ابھی سن بلوغت کو نہ پہنچے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور تمام بار آپ کی والدہ محترمہ بی اماں کے سر آپڑا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں بریلی کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا، جہاں سے انہوں نے انٹر پاس کیا۔ بریلی سے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مشہور زمانہ درسگاہ علی گڑھ پہنچے۔ انہوں نے بی
کا امتحان دیا تو الہ آباد یونیو
آئے۔ اس کے بعد آپ لندن
اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں
وہاں چار سال تک تعلیم
سول سروس کے لیے امتحان دیا لیکن ا
میں ناکام رہے۔ یہ خدا کی مصلحت تھی کہ مولانا محمد علی انگریزوں کی ملازمت سے بچ گئے کیونکہ انہیں برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کرنا تھا۔ وہ ۱۹۰۲ء میں آکسفورڈ سے بی اے کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور رامپور میں افسر تعلیم مقرر ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد ہی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور بڑودہ میں جج مقرر ہوئے لیکن محمد علی ملازمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے آخر کار یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ ۱۹۱۱ میں وہ کلکتہ پہنچے اور وہاں سے انگریزی اخبار "کامریڈ" نکالا جب مرکزی حکومت کا دارالخلافہ تبدیل ہوا تو کامریڈ کا دفتر بھی دہلی پہنچ گیا — یہاں مولانا نے اردو کا روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا جو کچھ عرصہ میں خراج تحسین حاصل کرنے لگا۔

۱۹۱۳ میں وہ تحریک عدم تعاون

[illegible]

ہوئے وشاکاپٹنم پہنچے، یہاں مولانا محمد علی کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

مولانا محمد علی ہندو مسلم اتحاد کے ہمیشہ حامی رہے۔ اور انہوں نے اس زریں اصول پر ہمیشہ عمل کر کے دکھایا بھی۔ چنانچہ مولانا کو جب پانچ سال کی نظر بندی کے بعد رہائی نصیب ہوئی تو آپ سیدھے امرتسر پہنچے جہاں مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔ جب مولانا جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو گاندھی جی، مدن موہن مالویہ اور دیگر کانگریسی رہنماؤں نے انکا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ تمام حاضرین جلسہ نے کھڑے ہو کر کافی دیر تک تالیاں

بجائیں جس سے جلسہ کی کاروائی رک گئی۔ اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے فرمایا :۔

" میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہیئے۔ مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظر بند ہو جانا چاہیئے اور مسز بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیئے مگر اس قسم کے مظالم کا جیسا کہ جلیانوالہ باغ میں ہوا، ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جانا چاہیئے۔"

یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے خلاف بالعموم رائے عامہ بیدار کرنے اور برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی غرض سے ہندو مسلم اتحاد کو استوار کرنے کے لیے بالخصوص جو کلیدی رول رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے ادا کیا ہے وہ عدیم المثال ہے۔ انہوں نے مسلم سیاست کے وسیلے سے بین الاقوامیت کی نئی جہت قائم کی۔ انہوں نے اندرونی سیاست میں بھی پوری دلچسپی لی یعنی ہندوستان کو غیر ملکیوں کے چنگل سے آزاد کرانا اور ہندو مسلم اتحاد کو تقویت پہنچانا۔ دونوں الذکر مشن میں انہیں مہاتما گاندھی کا مکمل تعاون حاصل ہوا۔

مولانا محمد علی نے ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو نہ صرف ہندوستان میں تحفظ اسلام کی خاطر ضروری قرار دیا بلکہ اسے تحریک خلافت سے بھی مربوط کیا اور آزاد ہندوستان کو خلیفہ اور ترکوں کی مدد کے لیے ضروری سمجھا۔ "ہمدرد" کے ۳ مارچ ۱۹۲۸ کے شمارہ میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر فرمایا :۔

"چند لاکھ انگریزی خواندہ ہندوستانی اپنی خود غرضی اور ذات پات اور فرقہ وارانہ تعصبات اور تنگ دلی کے باعث مختلف ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹے رہیں گے، قوم کبھی بھی نہ بنے گی جب تک کہ یہ ولایتی کپڑے کا مقاطعہ نہ ہو سکے گا .... اگر ہم ولایتی لٹھے اور ململ کا بھی تیاگ نہ کر سکے، تو خاک آزاد ہوں گے"

مولانا محمد علی جوہر تحریک آزادی کی ایک نمائندہ شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی بے نظیر قوت عمل اور تدبر سے اس تحریک کی نشوونما میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اپنی گہری جذباتیت اور استقامت خیال سے اس تحریک کو چار چاند لگائے۔ اسلامی ملت اور ہندوستانی قومیت کی آمیزش سے انہوں نے اپنی ایک مخصوص شناخت بنائی۔ اپنے اخبار ہمدرد میں ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر رقم طراز ہیں :۔

"نسلاً بھی کل نوع انسانی ایک انسانی جوڑے آدم و حوا کی اولاد ہیں اور فطرتاً سب کو ایک ہی دین پر رہنا چاہیئے۔ موجودہ اختلافات رنگ ونسل وطن کی طرح عقائد کے اختلافات نہ مٹنے والے نہیں بلکہ صحیح طریقے، تبلیغ، نشرو اشاعت و تعلیم و تربیت سے مٹ سکتے ہیں اور سب انسان بھی بھائی بھائی ہو سکتے ہیں"

وہ آگے تحریر فرماتے ہیں :۔

"اسلام نے دنیا کو مسلم وکافر دو ملتوں میں ضرور تقسیم کیا ہے لیکن کیا اسلام نے اس کی اجازت دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہو جائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو یک قلم ترک کردے۔ ایک مسلمان اس قومیت کا ہرگز طرفدار نہیں ہو سکتا جو اس کو اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے باز رکھے۔ لیکن وہ اس ملت کا بھی طرفدار نہیں ہو سکتا جس کے طرف اس کو بعض مسلمان گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اسے ہمیشہ اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو بھی نہیں کہ اس کو اس ظلم میں مدد نہ دے بلکہ اسے اس ظلم سے باز بھی رکھے۔"

کیا قومیت کے دلدادہ اپنی قوم پرستی کے لیے اس سے بہتر کوئی اصول آج ایجاد کر سکتے ہیں۔

اسلامی اخوت اور ہندوستانی قومیت کا جو تصور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی (موسوم بہ علی برادران) کی زندگی کے پس منظر میں ابھرتا ہے وہ ایک صداقت پرست اور روادار مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے۔ علی برادران کے مزاج کی اسی خوبی نے گاندھی جی کو

ان کے قریب پہنچا دیا۔ انہوں نے ہندوستان کی بدیسی حکومت کے قہر و غضب کا مقابلہ کیا تھا اور جس استقلال سے قید و بند کی مصیبت جھیلی تھی۔ اس نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ چنانچہ ان کی رہائی کا مطالبہ کرنے والوں میں نہ صرف مسلمان بلکہ مہاتما گاندھی اور مسز بیسنٹ جیسے قومی لیڈر بھی شامل تھے۔

مہاتما گاندھی اور علی برادران نے ہندو مسلم اتحاد کے جذبہ کو بیدار کرنے کی جو مشترکہ کوششیں کیں، ان کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے تحریک خلافت کی تنظیم آل انڈیا خلافت کانفرنس کی تمام تر سرگرمیوں کو گاندھی جی کی ترک موالات کی تنظیم انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مکمل اشتراک سے چلانا شروع کر دیا اور دونوں سیاسی تحریکوں کا ایک ہی مطمع نظر تھا ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اخراج۔ چنانچہ ۱۹۲۳ میں مولانا محمد علی کو کاکی ناڈا (جنوبی ہند) کے کانگریسی اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا اور جب ۱۹۲۴ میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو مہاتما گاندھی نے دلی میں اپنا پہلا تاریخی برت مولانا محمد علی کے مکان میں شروع کیا۔ آخر ستمبر ۱۹۲۴ میں ہندو مسلم اتحاد کی بحالی اور گاندھی جی کے برت کو ختم کرانے کے لیے حکیم اجمل خان اور سوامی شردھانند نے اتحاد کانفرنس منعقد کی جس میں مختلف پارٹیوں کے ہندو مسلم لیڈروں نے ملکر فسادات روکنے اور دونوں بڑے مذہبی فرقوں میں مصالحت کی کوشش کی۔

ہندو مسلم اتحاد کے کاز کے لیے علی برادران نے عملی طور پر جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی اور علی برادران ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ خواہ خلافت کانفرنس کا جلسہ ہو یا کانگریس کا، امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا اجلاس ہو یا جمعیتہ علماء کا جلسہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کرنے کا مسئلہ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے ستیہ گرہ، ہر قومی و ملی اقدام کے وقت علی برادران اور گاندھی جی ایک روح دو قالب کی طرح ساتھ ساتھ رہے۔ ۱۹۲۳ میں کانگریسی اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے مولانا نے اسی نازک مسئلہ پر یوں اظہار خیال فرمایا:

"مجھے ایک زمانے سے تھا کہ ایسے ملک میں کروڑوں آدمیوں ہے اور ان میں سے ہر مذہب کا از حد شیدا ہے مگر ہر مذہب جدا۔ ہمارے لیے قدرت نے ایک اہم مسئلہ اور زبردست سوال کے حل کرنے کا بہت اچھا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔ یعنی مسئلہ اتفاق مذاہب ..... بیس برس سے بھی زیادہ میں ایک ایسی متحدہ جماعت کا خواب دیکھتا چلا آرہا ہوں جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ باعظمت زیادہ شریفانہ اور اس سے کہیں زیادہ روحانی ہو اور آج بھی جب کہ بہت سے سیاسی پیش گو ان ایام بد کے دوبارہ پلٹنے کی خبر سنا رہے ہیں جبکہ ہندو مسلمان آپس میں لڑا بھڑا کرتے تھے، میں ہنوز اپنے پرانے خواب یعنی 'اتحاد مذاہب ہند' کو دیکھ رہا ہوں۔"

مولانا مذہبی طور پر مسلمان تھے اور سیاسی طور پر ہندوستانی، وہ مذہب اور سیاست کو علیحدہ علیحدہ گردانتے تھے، مگر یاد رہے کہ محمد علی کا دین حب الوطنی یا دوسروں کے ساتھ رواداری، میل جول سے رہنے کے خلاف نہیں تھا بلکہ انھیں فرض دینداری سمجھتا تھا۔ مولانا محمد علی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[illegible] ہر مسلمان کو ملک پرور اور محب وطن بننا لازمی ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ مسلمانان ہند اپنی موجودہ غلامی پر راضی ہو جائیں یا اپنے غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کو اپنے دلوں میں جاگزیں ہونے دیں اور ان کے ساتھ ذرا سی بھی ناانصافی کو روا رکھنے لگیں۔"

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی مسلمانوں کے مسلم الثبوت لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے سیکولر طرز عمل کو بالائے طاق نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے جنگ آزادی میں کٹر ہندو پیشواؤں کو

پنا ہم خیال بنا لیا۔ ۱۹۱۹ میں علی برادران جیل میں تھے۔ ملک میں ہندو مسلم اتحاد اپنے پورے شباب پر تھا۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ۱۹۱۹ اور ۱۹۲۱ کے دوران ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو میل جول رہا، وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بقول شیخ محمد اکرام (ہندو مسلم اتحاد کے) ان مناظر کا تصور وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جنہوں نے ان کو خود نہیں دیکھا۔" ہندو اور مسلمانوں نے لغوی طور پر ایک ہی پیالہ سے پانی پیا۔" ایک طرف تحریک خلافت نے مسلمانوں میں حب الوطنی کے جذبہ کو استوار کیا اور انھیں اپنی قوت کے ساتھ انگریزی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے آمادہ کیا تو دوسری طرف انہیں یہ بھی احساس دلایا کہ یہ کام وہ تنہا نہیں کر سکتے بلکہ اپنے دوسرے ہم وطنوں یعنی ہندوؤں کے تعاون و اشتراک سے پورا کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے وہ دلکش نظارے دیکھنے کو ملے جن کو دیکھنے کے لیے آج ہماری آنکھیں ترستی ہیں۔ اس وقت ہر ہندوستانی کا ایک ہی مقصد تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دو۔ اس وقت صرف مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی زندہ باد کے نعروں سے پورا ملک گونج رہا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ میں انہوں نے گاندھی جی کے اشتراک سے اس ادارہ کو قائم کیا جس کا مقصد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب سے قریب تر لانا اور انگریزی نظام تعلیم سے انحراف تھا۔ مولانا نے جامعہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے زور دیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو حق پرست و خدا پرست ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بننا چاہیئے۔

مذہب اور انسانیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ تقدیس انسانیت پر زور دیا اور ہندوستان کو پنجۂ اغیار سے آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بنیادی عنصر قرار دیا۔ خلافت کانفرنس میں اپنی تقریر میں یوں فرمایا۔

" میں انسانیت کا قائل ہوں،
وطنیت کا نہیں۔ خدا نے
انسان کو بنایا اور شیطان
نے انسان کو مختلف جماعتوں
میں مستغرق اور منقسم کر دیا۔"

ہندو مسلم اتحاد کے لیے محمد علی کی کوششوں کو اس وقت دھکا پہنچا جب ۱۹۲۴ میں خود ترکوں نے خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور انگریزوں کی شہ پا کر ہندوستان میں بھی ہندو مسلم منافرت کا ماحول تیار ہونے لگا۔

ملک میں مختلف جگہوں پر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گاندھی جی اور محمد علی نے لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے دونوں فرقوں میں بہت بڑی خلیج پیدا کر دی اور اقبال جیسا حساس شخص بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے خیال سے اس طرح کے فسادات کی ایک اہم وجہ دونوں قوموں کے درمیان شدید قسم کی بے اعتمادی کا پیدا ہونا تھا۔ محمد علی نے اقبال کی اس رائے سے شدید اختلاف کیا۔ انھوں نے "ہمدرد" میں مسلسل مقالات لکھے اور واضح کیا کہ اس سے ہندوستان کی آزادی کے مطالبہ کو شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ انہوں نے اقبال پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"اب اگر غلامی سے نکلنا ہے
تو اس کا بھی طریقہ ہے
کہ ہم تم ایک دوسرے
کے ساتھ انصاف اور
رواداری کا برتاؤ کریں۔
ایک دوسرے کی طرف
سے جو اذیت زبان سے
یا ہاتھ سے پہنچتی ہے
اس پر صبر کریں مگر اس
غلامی کو ہرگز برداشت
نہ کریں جس میں تم بھی
سوڈیڑھ سو برس سے
مبتلا ہو اور ہم بھی اور
جو یقیناً ہندو راج سے بھی
زیادہ تکلیف دہ ہے اور
مسلم راج سے بھی۔"

گول میز کانفرنس کے دوران ہی انہیں دل کا دورہ پڑا اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح انہوں نے جو اعلان کیا تھا کہ وطن کی آزادی کے بغیر خالی ہاتھ ہندوستان واپس نہیں جائیں گے، پورا ہوا۔ ان کی تدفین ایک ایسے مقام یعنی بیت المقدس (یروشلم) میں مسجد اقصیٰ کے احاطے میں ہوئی جہاں کہ بیشمار انبیاء کرام ابدی نیند سو رہے ہیں۔

نئی دھلی

یوجنا

جلد، ۱۳ شمارہ، ۱۷-۱۸

یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء اگرہائن تا اپوش تک ۱۹۱۵

قیمت: ۳, روپے

چیف ایڈیٹر: ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر: محمد توحید خان

معاون: وسیم حیدر

شرح چندہ: سالانہ ۳۰ روپے، دوسالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی: ۳ روپے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دھلی ۱۱۰۰۶۶

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن: سُدرشن موھن چھل

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ایس۔ وی۔ سرن

پنچایتوں میں خواتین کی عملی شرکت

امیدواروں کی حیثیت سے انتخابات میں خواتین کی شرکت ایک انقلابی قدم ہے۔ اس سے ملک میں جدید کاری کی رفتار تیز ہوگی۔ مصنف کا خیال ہے کہ اس سے مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے اور انفرادی عزت و وقار کو بڑھانے میں مدد ملے گی۔

۷۳ واں آئینی ترمیمی بل ملک کی آئینی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بل پارلیمنٹ نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں پاس کیا اور بطور ایک قانون ۲۴ اپریل ۱۹۹۳ء سے نافذ ہوگیا ہے۔ اس کا مقصد سرکار کی ہدایتی پالیسی میں درج اس نصب العین کو جزوی طور پر ہی سہی، ایک ٹھوس شکل دینا ہے کہ گرام پنچایتیں "سیلف گورنمنٹ کی اکائیوں" کے طور پر کام کریں گی اور حکومت کو لازماً انھیں منظم کرنے اور انھیں ضروری اختیارات دینے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔ پنچایتوں کو منظم کرنے اور انھیں اختیارات تفویض کرنے کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے اس لیے ریاستی مجالس آئین ساز کو اس مقصد کے لیے ضروری قانون بنانے ہوں گے۔

بہار ہمارے ملک کی پہلی ریاست ہے جہاں ہمارا آئین لاگو ہونے سے بھی پہلے اس ضمن میں قانون بنایا گیا۔ اس ریاست میں بہار پنچایتی راج ایکٹ ۱۹۴۸ء سے نافذ العمل ہے۔ اب آئینی ترمیمی بل کے ذریعے جو تبدیلی لائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اب پنچایتوں کو آئینی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ آئینی ترمیم میں کچھ اہم دفعات بھی شامل کی گئی ہیں جنھیں کوئی بھی ریاستی سرکار اس مقصد کے لیے اپنے قوانین سازتے وقت نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ اس طرح کی ایک دفعہ یہ ہے کہ پنچایتی اداروں میں، خواہ وہ گاؤں کی سطح کے ادارے ہوں یا ضلعی یا درمیانی سطح کے ادارے، کل نشستوں میں سے ایک تہائی نشستیں خواتین کے لیے مخصوص کرنا ہوں گی۔ اگرچہ یہ اہم اور دور اندیش دفعہ لاگو ہو چکی ہے تاہم جب تک اسے سبھی سطحوں پر عوام کی تائید و حمایت حاصل نہ ہوگی اس سے کوئی بامعنی نتیجہ برآمد نہ ہوگا جیسا کہ کئی اور آئینی دفعات کے ضمن میں دیکھا گیا ہے۔

یہاں کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ کیا ہمارا سماج عوامی معاملات میں خواتین کو یہ درجہ دینے کو تیار ہے؟ کیا خواتین یہ ذمہ داریاں قبول کرنے پر رضامند ہیں؟ کیا اس کے لیے ان کے اندر ضروری قابلیت یعنی تعلیم، علم اور تجربہ موجود ہے؟ کیا پنچایتوں پر حاوی گروپ انھیں اپنی مطلب برآری اور اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے استعمال نہیں کریں گے؟ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ مفاد عامہ کے منافی ہوگا۔

چونکہ ہمارا سماج مدت سے کئی شعبوں میں خواتین کو مساوی حقوق دینے سے منکر رہا ہے اس لیے ایسے سوالات کو وہمی یا غیر حقیقی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ ملک میں خواتین کی تعداد مردوں کی تعداد کے لگ بھگ برابر ہی ہے۔ (ملک میں خواتین کی تعداد ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں ۹۲۳ اور بہار میں ۹۱۲ ہے) پھر بھی وہ تعلیم کے معاملے میں مردوں سے پیچھے ہیں۔ جب کہ ملک میں مردوں کی شرح خواندگی ۶۳ء۸۶ فیصد ہے، خواتین کی شرح خواندگی صرف ۳۹ء۴۲ فیصد ہی ہے اور بہار اور راجستھان میں تو صورت حال اور بھی ابتر ہے۔ بہار میں کل شرح خواندگی ۳۸ء۵۴ فیصد ہے اور اس میں مردوں کی شرح خواندگی ۵۲ء۶۳ فیصد ہے اور خواتین کی شرح خواندگی صرف ۲۳ء۱۱ فیصد ہے۔ اس ریاست کے کئی اضلاع میں تو صورت حال اور بھی بدتر ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ پنچایتوں کے لیے منتخب ہونے والی خواتین میں سے کچھ خواتین ناخواندہ ہوں۔ کیا یہ پنچایتی راج اداروں کے لیے ایک اچھا شگون ہوگا اور کیا وہ آئین کے مطابق "سیلف گورنمنٹ کی اکائیوں" کے

مصنف انٹر اسٹیٹ کونسل کے سابق مشیر ہیں

طور پر بطریق احسن کام کرسکیں گی ؟۔

آئینی ترمیمی ایکٹ کی دفعات میں واضح کردیا گیا ہے کہ پنچایتوں کو بنیادی طور پر ترقی کو اور بہتر بنانے کے ایک ذریعے کے روپ میں دیکھا گیا ہے۔

آرٹیکل ۲۴۳ (جی) میں کہا گیا ہے کہ :۔

گیارہویں شیڈول میں ۲۹ موضوعات کی فہرست شامل کی گئی ہے جو پنچایتی راج اداروں کی ذمہ داریاں ہوں گے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ سب ترقیاتی موضوعات ہیں۔ مثلاً تعلیم، صحت، صفائی، مواصلات اور زراعت، آبپاشی کی چھوٹی اسکیمیں، چھوٹی دستکاریاں وغیرہ۔ تاہم پنچایتوں کو جو ذمہ داریاں سونپی جارہی ہیں وہ ان کے "سیلف گورنمنٹ کی اکائیوں" کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ پنچایتوں کو تو صرف جزوی سیلف گورنمنٹ دی جارہی ہے۔ اگرچہ مالگذاری کا بندوبست، عدالتی نظام، شہری رسدات، انسداد جرائم وغیرہ مقامی عوام کے لیے پوری اہمیت کے موضوعات ہیں تاہم ترمیمی ایکٹ میں انھیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن مفصل قانون تو ریاستوں کو بنانے ہیں اس لیے وہ چاہیں تو ان سب موضوعات یا ان میں سے کچھ موضوعات کو جنھیں وہ ضروری سمجھیں، قانون میں شامل کرسکتی ہیں۔ مختلف سطحوں کے پنچایتی راج اداروں میں خاتون اراکین ان موضوعات پر غور کرنے اور ان پر ضروری فیصلے لینے میں اُسی قدر اہم رول ادا کریں گی جتنا کہ مرد اراکین۔

یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ دیہی علاقوں کی خواتین کو نہ جانے کتنے قدیم زمانے سے اپنے گھر اور گاؤں کے حالات کا علم رہا ہے۔ سماج کے سرگرم طبقے کا اِن خواتین کے بارے میں جو خیال ہے اس کے برخلاف یہ خواتین زیادہ تر گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہنے کے باوجود گھر اور گاؤں کی زندگی سے متعلق معاملات میں ایک اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔ انھیں آبپاشی اور بیجوں، صفائی ستھرائی، پینے کے پانی، صحت اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں اتنی ہی واقفیت حاصل ہے جتنی کہ دیہات کے مردوں کو ہے۔ اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد ایسے معاملات کو معقولیت پسندی کی نظر سے دیکھیں گے اور ٹھوس فیصلے کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواتین بھی ایسا نہ کرسکیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پردے کے رواج کی وجہ سے خواتین پبلک لائف میں آکر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتی رہی ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھیں صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب، عملی اور غیر عملی کی تمیز نہیں ہے۔ گھریلو معاملات کی دیکھ بھال تو اکثر و بیشتر خواتین ہی کرتی ہیں۔ وہ فیصلے لینے میں بھی شریک ہوتی ہیں اور فیصلوں کے نتائج کو بھی بھگت سکتی ہیں خواہ یہ کوئی اقتصادی مسئلہ ہو یا سماجی یا پھر باہمی تعلقات اور رشتوں کا ہی سوال کیوں نہ ہو۔ اس لیے پنچا
جو سوال آئیں گے وہ ان
اور وہ مقامی حالات میں
بخوبی آگاہ ہوں گی۔ پردے
وہ مردوں کی طرح اپنے خیالا
وہ ہر شعبے میں مردوں کی طرح اچھا کام کرسکتی ہیں بشرطیکہ انھیں موقع دیا جائے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں اور اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

شرکت

جن ریاستوں میں سابقہ پنچایتیں کام کررہی ہیں ان میں خواتین جہیز کے معاملات میں، گھریلو جھگڑوں کو نمٹانے میں اور جھگڑوں کا دوستانہ حل نکالنے میں ایک موثر رول ادا کرسکتی ہیں۔ جہاں تک ترقیاتی سرگرمیوں کا تعلق ہے پنچایتی راج اداروں کی خاتون اراکین گاؤں کے اسکولوں اور صحتی مراکز، ڈیری فارمنگ اور باغبانی، صفائی ستھرائی، پینے کے پانی کی فراہمی کے انتظامات گلی کوچوں میں روشنی کے بندوبست اور فلاحی پروگراموں پر عمل آوری کے کام کی بھی کوئی دیکھ بھال کرسکتی ہیں۔ اس لیے انھیں ان معاملات سے متعلق کمیٹیوں میں شامل کرنا فائدہ مند ہوگا۔

ضرورت تعلیم اور تربیت دینے کی ہے۔ تجربہ تو بلاشبہ وقت کے ساتھ ہی آئے گا۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سے آنے والی خواتین کا بالخصوص خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ریزرویشن کے بغیر خواتین کی ایک بڑی تعداد کو اپنے گھروں سے باہر نکل کر مقامی بندوبست میں حصہ لینے کی ترغیب دینا ممکن نہ ہوگا۔ ریزرویشن انھیں گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کردے گا اور جب ایک بار وہ اپنے خول سے باہر آجائیں گی تو ان کی تخلیقی قوت سے دیہی سماج کو بلاشبہ بہت فائدہ ہوگا۔ اس ضمن میں انتخابات

بہار اس ایک خاص اہمیت رکھتا ہے صرف اس لیے نہیں کہ پنچایتوں کا قانون سب سے پہلے اسی ریاست میں پاس کیا گیا بلکہ اس لیے بھی کہ اس موضوع پر اس کے قوانین کا دائرہ دوسری ریاستوں سے بڑا ہے۔ بہار کے پنچایتی راج ایکٹ ۱۹۴۸ء اور پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد ایکٹ میں ۱۹۹۰ء میں دور رس ترامیم کرکے ان میں نشستوں کے ریزرویشن، ہر پانچ سال بعد باقاعدہ چناؤ، ریاستی مالی کمیشن، ریاستی چناؤ کمیشن اور ریاستی چناؤ ٹریبونل وغیرہ کی تشکیل کے لیے اہم دفعات شامل کی گئیں۔ اس کے علاوہ ریاست میں گرام کچہری کے قیام کے لیے بھی ایک دفعہ شامل کی گئی جو کئی اور ریاستوں میں نہیں ہے۔ لہٰذا بہار میں

لوکل گورنمنٹ میں پنچوں کا رول بہت اہم ہے اور وہاں پر مختلف سطحوں پر خاتون پنچوں کو دوسری ریاستوں کی خاتون پنچوں کے مقابلے میں وسیع تر انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔

سرکار کا رول

سرکار اور سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی میں تعلیم و تربیت کے مناسب پروگراموں کے ذریعے خواتین کی مدد اور حوصلہ افزائی کریں۔ اس سیاق و سباق میں تعلیم بالغاں کے پروگراموں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ حکومت اور غیر سرکاری ایجنسیوں کو مختصر سے مختصر مدت میں مکمل خواندگی کے حصول کے لیے تمام ممکن اقدامات کرنے چاہئیں۔ جب خواتین پڑھ لکھ جائیں گی تو پنچایتی نظام کی کارکردگی کی راہ میں حائل تکنیکی اور دیگر مشکلات کو خود ہی سمجھ سکیں گی اور ان کا مداوا کر سکیں گی۔

پنچایتوں پر طاقتور گروہوں کے غلبہ کا خطرہ بے وجہ نہیں ہے۔ اس کی مثبت رائے عامہ پیدا کر کے ہی دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے سماجی اور سیاسی کارکناں اور خواتین کی انجمنوں کو بھی اپنا رول ادا کرنا ہوگا۔ ضروری ہے کہ وہ پنچایتوں کے ارکان میں بشمول خواتین کے، کافی اعتماد پیدا کریں تاکہ وہ اپنی فکر و عمل کی آزادی برقرار رکھ سکیں۔

اس پس منظر میں تربیت کی بھی کافی زیادہ اہمیت ہے۔ پتہ چلا ہے کہ مرکزی حکومت پنچایتی راج اداروں کے کاموں کی تربیت دینے کے لیے ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ ایک خوش آئند اقدام ہے۔ اگرچہ ملک بھر کے منتخب نمائندوں کے لیے اس انسٹی ٹیوٹ میں آنا ممکن نہ ہوگا تاہم اس کا علاج یہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ ایک مرکزی ادارے کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ریاستی انسٹی ٹیوٹوں کو تربیت یافتہ عملہ فراہم کر سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ریاستی انسٹی ٹیوٹوں میں مناسب ساز و سامان اور تربیت یافتہ عملہ موجود ہو اور یہ عملہ مناسب وقفوں سے باری باری سے مختلف ضلعوں کا دورہ کر کے پنچایتوں کے کارکنان کو ضروری تربیت دے۔ یہ انتظام جلد از جلد کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ پنچایتی راج اداروں کے سربراہوں کے عہدے کے لیے بھی ریزرویشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جب ان عہدوں میں سے ایک تہائی پر خواتین کام کر رہی ہوں گی تو واقعی یہ ایک بڑی تبدیلی ہوگی۔

بہرحال بجٹ بنانے، پروجیکٹ کی تیاریاں کرنے اور حساب کتاب رکھنے کی تربیت پر خاص توجہ دینی ہوگی۔

ابتدائی مراحل میں کلکٹروں کا رول بہت اہم ہوگا۔ انھیں ذاتی دلچسپی کے ساتھ پنچایتی راج اداروں میں جانا چاہیئے۔ اراکین سے ملنا چاہیئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ ایک بار خواتین کو تائید و حمایت کا یقین ہو جائے پھر ان کی شرم اور جھجک خود بخود دور ہو جائے گی۔ اور وہ کھل کر بحث مباحثوں میں شرکت کریں گی۔

ہمارا جمہوری نظام لائق مبارکباد ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی بآسانی رونما ہو رہی ہے۔ لیکن اصلی چنوتی تو عمل آوری میں پیش آئے گی۔ آس پاس نیک نیت مردوں اور عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر وہ متحد ہو جائیں اور اس تجربے کو کامیاب بنانے کا تہیہ کر لیں تو کامیابی مشکل نہیں ہے۔ جلسے جلوسوں اور بحث مباحثوں کے انعقاد اور پنچایتی راج کا دن یا یوم خواتین کے منائے جانے سے بیداری اور دلچسپی پیدا کرنے میں خصوصاً پنچایتی راج اداروں کی خواتین میں، بہت مدد ملے گی۔ اس کام میں رضاکار تنظیمیں ایک تخلیقی رول ادا کر سکتی ہیں۔

لیکن اس کی گنجائش نہیں ہے کہ خواندگی کے آنے تک تربیتی پروگرام شروع ہی نہ کیے جائیں۔ تربیت دینے کا کام تو فوراً ہی شروع کر دیا جانا چاہیئے۔ ناخواندہ خواتین کو بھی اگر خاص طور پر تیار کیے گئے نصابات کے ذریعے تربیت دی جائے تو وہ پنچایتی نظام سے متعلق قانون اور قواعد و ضوابط کی موٹی موٹی باتوں کو سمجھ سکتی ہیں۔

گاؤں پنچایتوں میں تو خواتین کے لیے معاملات کو نپٹانا مقابلتاً آسان ہو سکتا ہے مگر درمیانی اور ضلعی سطحوں پر انھیں پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس لیے تربیت جس قدر جلد شروع ہو جائے پنچایتی نظام کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے لیے ماہرین اور منتظمین کی وافر مدد بھی درکار ہوگی۔ تربیت یافتہ کارکناں کو سبھی سطحوں پر پنچایتوں کی مدد کرنا ہوگی۔ پہلے تعلیم یافتہ افراد کو کرنے ہوں گے اس بات سے تربیت یافتہ افسراں یا کارکناں کا رول ختم نہیں ہو جاتا۔ انھیں اپنے علم اور تجربے کی روشنی تو دکھانی ہی ہوگی۔ گرام پنچایتوں کی مدد کے لیے تو گاؤں کی سطح پر کام کرنے والے کارکناں بآسانی دستیاب ہوں گے، پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کو بھی تکنیکی اور دیگر ماہرین کی خدمات حاصل ہونی چاہیئے تاکہ وہ ان کے روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی میں مدد دے سکیں۔ انتظامیہ کو بھی اسی طرح اپنا رول ادا کرتے رہنا چاہیئے جس طرح کہ وہ ریاستی یا قومی سطح پر کرتا ہے۔

انتظامیہ کی مختلف سطحوں پر عوام کی شرکت ہی جمہوریت کی روح ہے۔ اس سے نظام کو قوت حاصل ہوتی ہے، عوام میں اعتماد اور کچھ کرنے اور کامیاب ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پنچایتی راج کے نظام میں خواتین کی شرکت اس سمت میں ایک بڑا قدم ہے۔ ایک ترقی پسند، منصفانہ اور مساوات پر مبنی معاشرہ کے قیام کی کوششوں میں سب کو اپنا مکمل تعاون دینا چاہیئے۔ ●

ڈاکٹر ایس۔ زیڈ۔ قاسم

سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے چیلنج

میں اپنے لیے یہ ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ ہند جرمن دوستی کی انجمن نے مجھے ڈاکٹر وائی نایوڈاما مرحوم کی یاد میں یہ لیکچر دینے کو کہا ہے اور اس دعوت کے لیے میں انجمن کے صدر سری وی پی وسنو مورتی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سب سے پہلے میں سائنسی و صنعتی تحقیق کی کونسل کے سابق ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر نایوڈاما کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں جن کی ذاتی دوستی اور خاندانی شفقت مجھے ر...

وفات سے دنیا بھر میں سائنس والوں کو مایوسی ہوئی

عقیدت ہے کہ ہند جرمن دوستی انجمن یہ اعزاز دیتی ہے ...

ہے کہ ۱۹۹۲ء کے لیے یہ اعزاز مجھے دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نایوڈاما طبعاً ایک نہایت بے باک اور شفیق ...

میں پورے سائنس داں طبقے کے دل جیت لیے تھے۔ اس ...

ٹیکنالوجی کے نئے چیلنج" کے عنوان سے یہ لیکچر وقف کیا جا رہا ہے اور ہم ان کی یاد منانے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ڈاکٹر نایوڈاما کو بہت عزیز تھا اور انھوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کے ہمت آزما مسائل کے فروغ کے لیے اتنا کچھ کیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا بھر میں انسان کی طرز زندگی کو ایک نئی شکل دینے کے عمل میں حیران کن اثر ڈالا ہے۔ انسانی سرگرمی یا انسانی کوششوں کے ہر دائرے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک اہم کردار ہے اور یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہی بدولت ہے کہ کرۂ ارض کو اکثر "عالمی گاؤں" کہا جانے لگا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب بھارت ایک آزاد اور خود مختار ملک بنا تو اکثر اشیا صرف درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ ہماری ترقیاتی کوششوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ ۱۹۵۱ء میں جب پہلا ۵ سالہ منصوبہ شروع کیا گیا ہمارا زور درآمد کردہ اشیا کی جگہ ملکی ساخت کی اشیا تیار کرنا تھا اور منصوبہ بند ترقی کے چالیس برس بعد یعنی ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے آخر میں ہم ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی ضرورت کی ہر چیز ملک میں ہی تیار کر رہے ہیں۔ اس طرح منصوبہ بندی کا دور جو چالیس برس پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن سے ابھرتے بھارت کے شاندار تصور سے شروع ہوا تھا وہ اب ترقی کے راستے پر ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں سائنس و ٹیکنالوجی کا ترقی اور سماجی تبدیلی کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ایک اہم حکمت عملی بن گیا ہے۔ لہٰذا محدود ذرائع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کو زراعت، صنعت اور خدمتوں کے شعبوں میں اقتصادی منصوبہ بندی کا خاص موضوع بنایا جانا چاہیے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی صلاحیتیں

ایٹمی اور خلائی علوم اور الیکٹرانکس و دفاعی

یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء

رکن پلاننگ کمیشن
یوجنا بھون دہلی

تحقیق میں اعلیٰ ٹیکنالوجی کے استعمال میں ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ انتہائی قابل تعریف ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعبوں میں بھی جیسے کہ زراعت، حیاتیاتی ٹیکنالوجی، سمندر کی نقشہ کشی، انجینئرنگ، طب اور بہت سے دیگر علوم میں ہم نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ صنعتی ترقی کے عمل میں ہم نے تحقیق و ترقی کے جو نتائج استعمال کیے ہیں وہ اگرچہ زیادہ حیران کن نہیں ہیں پھر بھی ہم نے تکنیکی علم کے کئی مجموعے تیار کئے ہیں جنھیں یا تو کاروباری طور پر استعمال کیا جا رہا ہے یا جو نئے انکشافات کی دہلیز تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے کلیدی شعبوں میں جیسے کہ مائیکرو الیکٹرانکس، انفارمیٹکس، ٹیلی میٹکس، نئے مادوں کے استعمال، پھر سے استعمال ہونے والے توانائی کے ذرائع میں ہماری کوششیں قابل تعریف ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے تمام میدانوں میں ایک وسیع بنیاد رکھ دی گئی ہے جس میں صنعتی تحقیق بھی شامل ہے جسے وسیع کیا جانا چاہئے جس کی جدید کاری ہونی چاہئے اور جسے پوری طرح استعمال کیا جانا چاہئے۔

آج عالمی برادری کی طرف سے شروع کی گئی کشادہ رو پالیسیوں اور اٹھائے گئے اقدامات کے باوجود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھارت ٹیکنالوجی کی اُن دیواروں کو توڑ سکے گا جو ترقی یافتہ ممالک نے کھڑی کر دی ہیں۔ ان پابندیوں کی وجہ سے بھارت صرف وہی تکنیکی علوم حاصل کر سکتا ہے جو مغربی ممالک میں فرسودہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے خلائی پروگرام میں بھی یہی کہانی دوہرائی جا رہی ہے۔ کرائیو جینک راکٹ کی مثال کو کون نہیں جانتا۔

ٹیکنالوجی کے انتخاب کیلیے معیار

ٹیکنالوجی کے ہمت آزما شعبوں کا انتخاب کرتے ہوئے صنعت اور خدمتوں کے تقاضوں پر مبنی واضح ضرورت کا معیار مقرر کیا جانا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صنعتیں بتدریج اعلیٰ ٹیکنالوجی کی جگہ کئی کام آنے والی ٹیکنالوجی کو اپنانے لگی ہیں۔ اُن شعبوں میں جہاں تکنیکی علم کے باہمی عمل میں تیزی سے ترقی ہو رہی ہے۔ مائیکرو الیکٹرانکس، فائبر آپٹکس لیسرز، حیاتیاتی ٹیکنالوجی کمپیوٹروں کی مدد سے نئے آلات کی تیاری اور اور نئے مادوں کی دریافت کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مائیکرو الیکٹرانکس

یہ ٹیکنالوجی دس برس کے عرصے میں ہی انتہائی جدید ہو گئی ہے۔ مائیکرو الیکٹرانکس ایک باہمی عمل کا تکنیکی علم ہے جس کا مادوں کی ٹیکنالوجی، آزمائشی آلات، باریک مصنوعات وغیرہ سے قریبی تعلق ہے۔ سرکٹوں کی یکجہتی بڑے پیمانے کی یکجہتی کی سطح پر پہنچ گئی ہے جو ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط میں فی چپ ایک لاکھ اجزا تک تھی اور ۱۹۹۰ء کی دہے میں یہ تعداد بڑھ کر دس کروڑ اجزا فی چپ تک ہو گئی ہے۔ یکجہتی کی اعلیٰ سطحوں کی ارتقا سے سرکٹوں کی قیمتوں میں بھاری کمی ہوئی ہے۔

کمپیوٹری نظام میں ایک اعلیٰ مائیکرو پروسیسر جس میں ایک یا کچھ بڑے پیمانے کے مربوط سرکٹ ہوتے ہیں، ریاضی کا تمام کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کنٹرول یونٹ بھی تیزی سے بہتر ہو رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے دہے میں ہی آپ دیکھیں گے ۲۵۶ اجزا کے مائیکرو پروسیسر اور بصری پروسیسر جو مواصلات اور حساب کتاب کے عمل کو حیران کن ڈھنگ سے یکجا کر سکیں گے۔

بھارت اور ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان مائیکرو الیکٹرانکس ٹیکنالوجی کا خلا بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں حصوں پرزوں کی تیاری اور نظاموں کی ساخت چپس پر ہے۔ ایس سی ایل اور بی ای ایل صرف دو بڑے ادارے ہیں جو مائیکرو الیکٹرانکس کا سامان تیار کر رہے ہیں۔

فائبر آپٹکس

گزشتہ پندرہ برس میں فائبر آپٹکس کی ٹیکنالوجی کی بدولت کاروباری پیمانے پر کئی نظام اور آلات دستیاب ہونے لگے ہیں۔ ان کی مدد سے آوازیں، اعداد و شمار، تصویریں اور دستاویزات کے متن دور تک پہنچانے کے نئے طریقے یا میدان کھل گئے ہیں۔

بھارت میں ساتویں منصوبے کے آخری برس سے آپٹیکل فائبر سسٹم پر مبنی ترسیلی نظام قومی پیمانے پر مواصلات کا ایک اہم راستہ بنتا جا رہا ہے۔ کم از کم تیس فیصد موجودہ ترسیلی پراجیکٹ اس سسٹم پر مبنی ہیں گزشتہ تیس برسوں میں اندرون ملک زمینی مواصلات کا رابطہ اعلیٰ درجے کا رہا ہے۔ روشنی ایک ترسیلی کارکن کے طور پر دس ہزار سیکنڈ کے وقفے کے اعداد و شمار لے جا سکتی ہے جو ایک ارب ٹیلیفون کالز کے برابر ہے۔ دیگر تمام مواصلاتی رابطوں کی مانند فائبر آپٹکس کے لیے بھی ٹرانسمیٹروں، ٹرانسمیشن کے ذرائع اور مواصلات موصول کرنے والے آلات کے نمونوں کی ایجاد اور ترقی کی ضرورت ہے۔ مقامی ٹیلیفون کے نظام میں بڑی تعداد میں ٹرانسمیٹر اور ریسیورز ہوتے ہیں جو مقابلتاً کم دوری کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان نظاموں کو بھی روشنی کی لہروں کی ٹیکنالوجی سے ملایا جا سکتا ہے جس کے لیے کم خرچ بصری باہمی رابطے کام میں لائے جا سکتے ہیں جب کہ طویل فاصلوں کے مواصلات کے لیے اعلیٰ طاقتی لیسر ذرائع کی ضرورت ہو گی۔

ٹیلی مواصلات کا شعبہ

نئے ٹیلیفون کنکشنوں کی مانگ گزشتہ کئی برس سے بڑھ رہی ہے اور کافی تعداد میں کنکشن مہیا کئے جانے کے باوجود ہر سال انتظاری فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے۔

ٹیلی مواصلات کی ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ کمپیوٹروں اور ٹیلی مواصلات کے ادغام سے نئی نئی خدمتیں حاصل ہو رہی ہیں جن کے بارے میں دس برس پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا جیسے کہ ویڈیو کانفرنسیں نئے ٹیلی مواصلات کے

نظام کی ترقی کا بڑا حصہ غیر مشینی سامان کی تیاری ہے اور ہمارے پاس اس شعبے میں کافی مہارت ہے۔ تاہم مشینی حصے میں ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔

لیسرز

۱۹۶۰ء کے دہے میں لیسرز کی ایجاد ٹیکنالوجی کی ترقی کے میدان میں ایک سنگ میل ہے۔ لیسر کا استعمال بصری مواصلات، آپٹیکل اسٹوریج آپٹیکل کمپیوٹنگ کے علاوہ طب اور جراحی کے لیے تمام کاموں میں کیا گیا ہے۔ استعمالات میں طب کا پہلا شعبہ تھا OFTHALMOLOGY جہاں لیسرز بہت مفید پائے گئے۔ آج طب کے کم و بیش تمام شعبوں خاص طور پر باطنی اور جراحی میں لیسرز کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ سرطان کے علاج میں تو لیسرز کا استعمال لازمی ہو گیا ہے۔

صنعت کے شعبے میں بھی لیسرز نے اپنی اہمیت نمایاں کی ہے اور انھیں سروے، ویلڈنگ، ڈرلنگ، دھاتوں کی کٹائی اور غیر تباہ کن آزمائشوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ لیسر کی رہنمائی سے چھپائی کرنے کی مشینیں شاید اس دور کی سب سے تیز رفتار مشینیں ہیں۔

حیاتیاتی ٹیکنالوجی

حیاتیاتی ٹیکنالوجی کا مطلب سائنس اور انجینئرنگ کے اصولوں کو مادوں کی مصنوعات تیار کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے جس کے لیے حیاتیاتی کارکنوں کو کم خرچ سامان اور خدمتیں مہیا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں حیاتیاتی ٹیکنالوجی اب بھی مفرد اور مرکب دوائیاں تیار کرنے اور حاصل مادوں کو صاف کرنے اور زراعتی کاموں میں استعمال کی جا رہی ہے وہاں جدید حیاتیاتی ٹیکنالوجی میں موجود طریقوں کو بہتر بنانے اور نئی اشیا کی پیداوار میں مدد دینے کی بھاری صلاحیت موجود ہے۔ اسی طرح انسانوں کے حفظان صحت کے متعدد شعبوں، زراعت، ٹیشو پالس، سمندری پیداوار، ایندھن، نباتات، توانائی اور توانائی و ماحولیاتی تحفظ کے لیے حیاتیاتی ٹیکنالوجی ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔

حفظان صحت کے شعبے میں حیاتیاتی ٹیکنالوجی میں کئی اقسام کے بکٹیریا اور جراثیمی امراض کے خلاف موثر ٹیکے تیار کرنے کی بھاری صلاحیت موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس ٹیکنالوجی سے کئی امراض کا جلدی اور بروقت پتہ لگایا جا سکتا ہے اور جسمانی حالت کے بارے میں اطلاعات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان امراض کی روک تھام کے لیے کئی ٹیکے بازار میں فروخت کے لیے بھی آ گئے ہیں۔ بھارت میں بھی ہیپاٹائٹس ٹیکہ فروخت ہو رہا ہے۔

نئے مادے

مادوں کے علم اور انجینئرنگ [illegible]

جو ترقی ہوئی ہے وہ تمام اقسا

سیاد ہے جن سے کم لاگت پر بیا

جا سکتا ہے۔ صنعتی ٹیکنالوجی، حیا

پر مبنی ہتھیاروں کے نظام نقل و

تبدیلی یہ تمام ایسے امور ہیں جو نئے مادوں پر [illegible] ان سے مادوں کی انوکھی یا جن کے بارے میں پہلے یقین نہیں کیا جا سکتا تھا خصوصیات اب ایک حقیقت بن گئی ہیں۔ لیکن اب تحقیق میں زیادہ زور موجودہ مادوں کی مصنوعات تیار کرنے پر دیا جا رہا ہے تاکہ ان مادوں کے خواص کو حاصل کیا جا سکے۔

اس کی ایک مثال دوسری جنگ عظیم میں جیٹ انجن کی ایجاد ہے۔ جب ہوائی جہاز کے لیے ۱۹۴۰ء کے قریب پہلا ٹربائن تیار کیا گیا تو یہ بمشکل چل سکا اور زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ اس انجن کو قوت عطا کرنے والا نظام بنانے کے لیے ضروری تھا کہ کچھ دیر مادوں کی ترقی کے پروگرام پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ جب زیادہ درجہ حرارت برداشت کرنے والے مادے تیار کر لیے گئے تو ہوائی جہاز کے قابل ٹربائن تیار ہو سکا اور اس ٹیکنالوجی کے سبب زمین پر بجلی تیار کرنے کے ٹربائن بنانا ممکن ہو سکا ہے۔

مادوں میں چھوٹے چھوٹے پرزے اور نظام تیار کرنے کے لیے بہت سی اصلاحات پر بھی کام جاری ہے۔ جس کی ایک مثال چینی مٹی کے بنائے ہوئے کمپنسٹر، جیسے کہ اکثر موٹر گاڑیوں میں استعمال ہوتے ہیں گیس سے چلنے والے بجلی کے ٹربائن سے خارج ہونے والی نائٹروجن اکسائڈ کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ چینی مٹی کے مسام دار فلٹر گرم گیس کو صاف کرنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں اور وہ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھروں میں ایک کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

خلا

انسیٹ سلسلے کے مصنوعی سیاروں اور

[illegible] اسطام وغیرہ کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اس ترقی کا ہماری سماجی و اقتصادی ترقی پر براہ راست اثر پڑا ہے۔

انسیٹ نظام کے مصنوعی سیاروں سے مواصلات میں جو انقلاب آیا ہے اُس سے ملک میں طویل دوری کی مواصلات، ملک گیر پیمانے پر ٹی وی، اعداد و شمار کی ترسیل، ریڈیو پیغامات، موسمیاتی خدمات اور کمپیوٹر پروگراموں کے لیے بھاری اور غیر معمولی مانگ پیدا ہوئی ہے۔ انسیٹ دو بی کی کامیاب اڑان نے مواصلات کے شعبے میں نئے میدان کھول دیئے ہیں جس سے دوردرشن کے نئے چینل اور کئی بیش قیمت خدمتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

ایٹمی توانائی

مسلسل تحقیق و ترقی کی کوششوں سے ایٹمی توانائی

کے شعبے میں کم وبیش مکمل صلاحیت حاصل کر لی گئی ہے جس میں ایٹم کی کھوج، کان کنی، کشید، صفائی ایٹمی مادوں کی تبدیلی بھٹیوں کے لیے ایندھن کی تیاری بجلی تیار کرنے کی بھٹیوں کی نمونہ سازی، ۲۳۵ میگا واٹ تک کی صلاحیت کے بجلی گھروں پر کنٹرول آلات کی تیاری، بھاری پانی کی پیداوار، صحت وسلامتی کے آلات، استعمال شدہ مادوں کو پھر سے کارآمد بنانے اور ریڈیو آئی سوٹوپس کی تیاری و استعمال شامل ہیں۔

بجلی کی تیاری کے علاوہ جیسے ایٹمی توانائی کے پرامن مقاصد کے لیے استعمال میں سب سے بڑی خدمت شمار کیا جاتا ہے اور بھی کئی استعمالات ہیں جو ادویہ، زراعت اور صنعت میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ریڈیو آئی سوٹوپس جالیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جنھیں نالیوں میں گیس یا پاؤڈر کے داخلے کو روکنے، زمین میں دبی ہوئی نالیوں سے رساؤ کا پتہ لگانے، بحری راستوں میں گاد کی حرکت اور راکٹوں میں ٹوٹ پھوٹ کا پتہ لگانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

سمندری تحقیق

بیسویں صدی کے باقی دس برسوں میں بنی نوع انسان کو جن بہت سی مشکلات کا سامنا ہے اُن میں سے دو انسان کی بقا کے لیے ہی بھاری اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک نباتات وحیوانات کے توازن کا مسئلہ ہے۔ یعنی کیا انسان اپنے ہی پیدا کردہ ماحول کا مقابلہ کر سکتا ہے جو اب اُس پر غالب آرہا ہے۔ دوسرا مسئلہ مستقبل میں سمندر کے استعمال کا ہے جسے لازماً دانشمندی سے استعمال کیا جانا چاہیے۔

جوں جوں وقت گذر رہا ہے ہمارا سمندر پر انحصار بڑھ رہا ہے۔ قدیم وقتوں سے انسان نے سمندر کو دو بڑے کاموں کے لیے استعمال کیا ہے، ماہی گیری اور جہاز رانی۔ لیکن حال ہی میں سمندر سے تیل کی تلاش، کیمیات، ادویہ، معدنیات اور توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت کے بارے میں جو کھوج ہوئی ہے اُس نے ہر ایک کو یقین دلا دیا ہے کہ دنیا کے کچھ نہایت بڑے خزانے سمندر میں چھپے پڑے ہیں۔ اس لیے سمندر کو ہماری "آخری پناہ" کہا جا رہا ہے۔ اور بنی نوع انسان مستقبل کی امیدوں کے لیے سمندر کی جانب دیکھ رہا ہے۔ قدیم محاورہ ہے کہ "جو سمندر پر قابو پاتا ہے وہ بالآخر دنیا پر حکومت کرتا ہے" بلاشبہ درست ثابت ہوا ہے۔

جن شعبوں میں انسان کی طرف سے حیران کن ترقی کی امید ہے اُن میں سے ایک سمندر کا ذخیرہ ہے۔ بھارت میں ساحل پر اور ساحل سے دور سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک نے گذشتہ بارہ برس میں سمندری کھوج میں قابل ذکر ترقی کی ہے جس سے دنیا کے دیگر ممالک میں ہمارے وقار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ سمندر سے خوراک، کیمیات، معدنیات توانائی نقل وحمل اور سیر وسیاحت کے وسیلوں کی کھوج اور اُن کا استعمال کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جا رہی ہے جس سے ہماری بھاری آبادی کی سماجی واقتصادی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ ساحل سے دور سمندر میں تعمیرات اور کارگاہ کی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کی بڑی وجہ تیل اور گیس کی تلاش اور برآمدگی ہے۔

اختتامی تبصرات

ترقی یافتہ ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں جو غیر معمولی دھماکہ ہوا ہے اُس سے غریب اور امیر ملکوں کے درمیان فاصلہ بڑھنا کم نہیں ہو رہا۔ ٹیلی مواصلات، مائیکرو الیکٹرانکس، لیسرز، فائبر آپٹکس، حیاتیاتی ٹیکنالوجی اور نئے مادوں کی تیاری میں جو ترقی ہوئی ہے اُن سے ایک نیا صنعتی انقلاب آرہا ہے۔ اُن اقوام کی پیداواریت، سماجی تنظیم، دولت اور طاقت پر جو اثر پڑے گا جتنا کہ بھاپ کے انجن کی ایجاد کا ہوا تھا یا پہلی نسلوں پر بجلی کی ایجاد یا داخلی حرارت سے چلنے والے انجنوں کی ایجاد سے ہوا تھا۔ اب جدید سائنسی علم اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا استعمال ہی ترقی یافتہ ملکوں کی اقتصادی ترقی کا بڑا ذریعہ ہے۔ عالمی منڈیوں میں مقابلے کے لیے نئی ٹیکنالوجی کے دوررس نتائج نکل رہے ہیں۔ جب نیا انقلاب صنعتی ملکوں پر چھا رہا ہے تو ترقی پذیر ممالک خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

اس امر کا سہرا ہمارے منصوبہ سازوں اور بھارت کی سائنس وٹیکنالوجی کی پالیسیاں تیار کرنے والوں کے سر ہے کہ انھوں نے افق پر دکھائی دے رہی ٹیکنالوجی کی تبدیلیوں کی دوررس اہمیت کو سمجھا ہے۔ ساتویں منصوبے میں ٹیکنالوجی کے نئے میدانوں میں اندرون ملک صلاحیتیں پیدا کرنے کے بہت حوصلہ افزا رجحانات شامل کیے گئے ہیں تاہم آٹھویں اور اس کے بعد بنائے جانے والے منصوبوں میں نئی ٹیکنالوجی کی اقتصادی صلاحیت کے پورے پورے استعمال کا پوری طرح احساس کیا جانا چاہیئے۔ ●

بقیہ: گرین ہاؤس اثرات اور ہندوستان

(Automatic Water Quality Monitoring Stations) کا قیام عمل میں آیا ہے۔

۸۔ گنگا ندی کے پانی کو کثافت سے بچانے کے لیے گنگا کی وادی میں قائم زیادہ کثافت پھیلانے والے ۵۹۰ صنعتوں کی نشاندہی کر لی گئی ہے۔

۹۔ زیادہ کثافت پھیلانے والے ۷ زمرے کی صنعتوں کی نشاندہی کر کے ریاستی حکومت کے مشورے سے کثافت کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔

۱۰۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں ڈیریوں، چمڑے کے کارخانوں، قدرتی ربر بنانے کے کارخانوں، بیگسی فائر بوائلر Bagasse Fired Boilers اور کیرامک Ceramic صنعتوں میں ماحولیاتی معیار کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ ●

عبدالحمید

گرین ہاؤس اثرات اور ہندوستان

کرۂ ارض گیسوں کا ایک ایسا مکسچر ہے جو تمام جاندار زندگی کی حفاظت کی علامت ہے اور اسے حیاتی ڈھال عطا کرتا ہے۔ کرۂ ارض میں سب سے زیادہ حصہ آکسیجن اور نائٹروجن کا ہے جو تقریباً ۹۹ فیصد ہے باقی کے ایک حصے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، آبی بخارات، میتھین، نائٹرس آکسائیڈ، اوزون اور دیگر بے نام گیس شامل ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی کو قائم رکھنے میں آکسیجن سے زیادہ معاون کاربن ڈائی آکسائیڈ اور اوزون گیس ہیں جو آپس میں مل کر فضا میں ایک ایسی سطح تیار کرتے ہیں جو اس زمین پر زندگی قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ بایو نظام کا پورا انحصار اسی پر ہے۔ اس کے تناسب میں معمولی سا فرق آنے سے ہماری زمین پر بہت خراب اثر پڑے گا۔

اس صدی کے خاتمے تک امید کی جا رہی ہے کہ زمین کے درجۂ حرارت میں ۵ء۰ سینٹی گریڈ تک کا اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۸۸۰ سال سے یعنی جب سے زمین کا درجۂ حرارت ناپنے کا کام شروع ہوا ہے سات دفعہ سب سے زیادہ گرمی پڑی ہے جس میں چھ دفعہ سخت گرمی صرف ۸۰ کی دہائی میں پڑی ہے۔ انٹرنیشنل کاؤنسل آف سائنٹفک یونین (International Council of Scientific Union) نامی ادارہ ماضی میں رونما ہونے والے درجہ حرارت کا جائزہ لے رہا ہے۔ ۴۵ کروڑ سال قبل زمین کے وجود میں آنے کے بعد سے متعدد بار اضافہ اور کمی واقع ہ... انسان کی ارتقائی گردش ... ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ ہم ... میں ۲ سیلسس تک کا اضافہ ... گریڈ تک کی کمی واقع ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے جسے ہم قدرتی تبدیلی میں کہہ سکتے ہیں۔

انٹارٹیکا اور گرین لینڈ میں ہزاروں برس سے جمی ہوئی برف کے تہوں میں پائے جانے والے بلبلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہمیں کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں جو اس سے قبل سائنسداں نہیں جانتے تھے۔ ۱۶ ہزار سال پرانی تاریخ اب آہستہ آہستہ کروٹ لے رہی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ خلاف توقع جن سالوں کے دوران درجۂ حرارت میں کمی یا اضافہ واقع ہوا ہے اس سال کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین کی مقدار میں بھی کمی یا اضافہ نوٹ کیا گیا ہے۔

بڑے پیمانے پر زیر مباحث گرین ہاؤس گیسوں کی کہانی آج کل اسی پر منحصر ہے۔ یہ سچ ہے کہ کرۂ ارض پر کم مقدار میں پائی جانے والی گیسوں میں بھی زمین کا درجۂ حرارت ... کو قابو کر رکھنے ... کی ...

کے نزدیک واقع دو سیاروں مشتری اور زہرہ سے تقابلی مقابلہ کر کے بھی سمجھ سکتے ہیں تینوں سیاروں کا درجۂ حرارت بالترتیب ۱۵، ۵۳- اور ۴۲۷ سینٹی گریڈ نوٹ کیا گیا ہے لیکن اگر زمین پر کاربن ڈائی آکسائیڈ نہیں ہوتا تو اس کا درجۂ حرارت ۱۸- سینٹی گریڈ اور مریخ کا ۵۶- سینٹی گریڈ ہوتا۔ زہرہ پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں زیادتی کی وجہ سے یہ آگ گولہ بنا ہوا ہے اگر اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا تو یہ خطرے کی بات ہے۔ آج ہماری حس کثافت سے بری طرح متاثر ہے۔ ہم لوگ کثافت پی رہے ہیں، کثافت کھا رہے ہیں، کثافت دیکھ رہے اور اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں اور اس سے ہماری حس اور ذہن بری طرح متاثر بھی ہو رہا ہے۔ ہم لوگ ہر سال تقریباً ہزار ملین ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس فضا میں ایندھن اور گاڑیوں کے دھواں

کیراف:۔ محمد حنیف ۹۴/۱ ایچ/۱۳ میور بیج روڈ کلکتہ ۲۳-۰۰۷

کے ذریعے بھیج رہے ہیں۔ ہم لوگ اپنے ریفریجریٹر اور ایئرکنڈیشنز میں Perild Choloro Fluoro Carbons(CFC) گیس استعمال کر کے کرہ ارض کو تبدیلی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ گیس اوزون کی سطح کو نقصان پہنچانے کی ذمہ دار ہیں۔ دنیا میں ۶۰ ۔ ۳۰ ملین ہیکٹر زمین پر چاول کی کاشت ہوتی ہے جو میتھین کی پیداوار کے ذمہ دار ہیں نیز ۲۔۱ بلین جاندار بھی اپنی ڈکاروں اور ہوا کے اخراج سے فضا میں میتھین کی مقدار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم لوگ بڑے پیمانے پر زمین کو بنجر بنا رہے ہیں۔ جنگلات کو کاٹ رہے ہیں اور ہزاروں ٹن زہر اور زہریلے کیمیکل دریاؤں اور سمندروں میں بہا رہے ہیں۔ ان سب وجوہات سے ہی زمینی درجۂ حرارت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان کو روکا نہیں گیا تو ۲۰۳۰ء تک زمینی درجۂ حرارت میں ۲ سے ۵ فیصد تک کا اضافہ ہو جائے گا جو ہمارے لیے مصیبت ہی مصیبت لے کر آئے گا۔

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ گرین ہاؤس گیسوں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین، نائٹروس آکسائیڈ، کلورو فلورو کاربن اور اوزون خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ریو میں منعقدہ Earth Summit میں ایک پروٹوکول پر دستخط کیا گیا ہے جس کے تحت ۲۰۰۰ء تک سی ایف سی CFC کی پیداوار کو بند کرنے کا شق شامل ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کو اس کے لیے مزید دس سال کی مہلت دی گئی ہے اب ہمیں گرین ہاؤس کی دوسری اہم گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین پر توجہ مذکور کرنے کی ضرورت ہے۔

فضا میں زیادہ تر کاربن ڈائی آکسائیڈ کوئلہ، تیل، رقیق گیس اور جلاون لکڑی سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم الگ الگ کر کے دیکھیں تو ہر سال کوئلہ، تیل اور رقیق گیس سے پانچ ہزار ملین ٹن اور جلاون لکڑی سے دو ہزار ملین ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے۔ صرف ہندوستان کا حصہ ہر سال دو سو ملین ٹن کا ہے جو فی شخص ۰.۲ ٹن ہے۔ اگر ہم دنیا پر نظر ڈالیں تو اوسطاً فی شخص ہندوستانی اوسط سے ۶ گنا زیادہ ہے اور صرف امریکہ میں ۲۵ گنا زیادہ ہے۔

ہندوستان سے بھی میتھین گیس کا اخراج بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ پوری دنیا سے ہر سال چاول کی کھیتی، بنجر زمینوں، جانداروں اور کوئلہ کے کانوں کی وجہ سے ۵۰ ملین ٹن میتھین کا اخراج ہوتا ہے۔ ایک مغربی جائزے کے مطابق ہندوستان ہر سال فضا میں ۳ سے ۴ میٹرک ٹن میتھین گیس شامل کرتا ہے لیکن ہندوستانی سائنسداں اس جائزے کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ مقدار بہت زیادہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مقدار مغربی اندازے کا دس فیصد تک ہونی چاہئے۔

گرین ہاؤس گیسوں میں اضافہ ایک تشویشناک حقیقت ہے اور ہم لوگ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ سے زمینی درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن کس رفتار سے، یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا ایک اثر تو ہم سمندر کی سطح میں اضافہ کی صورت میں دیکھیں گے جو ۲ سینٹی میٹر تک ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں دنیا کا ایک بڑا علاقہ زیر آب ہو جائے گا۔ اگر سمندر کی سطح میں ۱۰ سینٹی میٹر کا بھی اضافہ ہوا تو ہندوستان کے مشرقی ساحل کے تقریباً ۱۷۰۰ اسکوائر کلومیٹر علاقے زیر آب ہو جائیں گے۔ سات لاکھ لوگ بے گھر ہو جائیں گے۔ گرمی کی وجہ سے بارش کے نظام میں گڑبڑی واقع ہونے سے ایک بڑا زرعی علاقہ ریگستان میں تبدیل ہو جائے گا نیز خط استوا کے ممالک میں بیماریوں میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ بڑے پیمانے پر وبائی بیماریاں پھوٹ پڑیں گی۔ ہندوستان میں ملیریا اور آنکھوں میں چھالے کی بیماریوں میں کافی اضافہ ہوگا۔ درجۂ حرارت میں اضافہ کی صورت میں شمالی ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار میں کافی کمی آ جائے گی۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ دنیا ابھی خطرے سے گھری ہوئی ہے اس لیے ہمیں ابھی اس بات پر لڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ماضی میں کثافت پھیلانے کا ذمہ دار کون ہیں یا تھے۔ ریو کانفرنس نے ہمیں ایک راہ دکھائی ہے کہ ہم آگے بڑھ کر اپنے آنے والی نسل کو محفوظ کر لیں۔

ہندوستان بھی ایسی کوششوں میں پیچھے نہیں ہے۔ ہم اس سیارہ کو بچانے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اب تک کثافت کو کنٹرول کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات حکومت نے کئے ہیں۔

۱۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں ماحولیاتی جانچ کے لیے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا تھا جس کے تحت تمام صنعتوں کو سالانہ ماحولیاتی جانچ کی رپورٹ حکومت کو پیش کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

۲۔ مرکزی کثافتی کنٹرول بورڈ Central Pollution Control Board نے ۵۶ یونٹوں بشمول کثیر کثافت پھیلانے والے ۱۷ صنعتی سیکٹروں میں ماحولیاتی جانچ کا کام مکمل کر لیا ہے اور اس نے مزید ۹۰ یونٹوں کی نشاندہی کی ہے جس کی جانچ کی جائے گی۔

۳۔ سب سے زیادہ کثافت والے علاقوں کی نشاندہی کے لیے ایک کمپیوٹرائز نقشہ تیار کرنے کا بھی پروگرام بنایا گیا ہے۔

۴۔ ماحولیات کے دوست اشیا کے پیداوار اور اسکیم کے تحت ۱۶ اشیا کی پہچان کر لی گئی ہے اور صابن، ڈٹرجینٹ، کاغذ اور رنگوں کے لیے حتمی نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا ہے۔

۵۔ وزارت ماحولیات نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے 'صاف ستھری ٹیکنالوجی کا استعمال' نامی اسکیم جاری کیا ہے اور ان صنعتوں کو تکنیکی امداد دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

۶۔ ملک میں پانی کی جانچ کے لیے ۴۸۰ مراکز قائم کیے گئے ہیں۔

۷۔ گنگا ندی کے پانی کی کوالٹی کی جانچ کے لیے بھی چار جگہ خودکار واٹر کوالیٹی مونیٹرنگ اسٹیشن

باقی ص ۵ پر

بقیہ: خواتین کے لیے نئی زندگی

جو حکمتِ عملی تیار کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ترقی کے عمل میں جنس (مرد یا عورت) کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ چنانچہ جو پانچسالہ منصوبے تیار کیے جاتے ہیں ان میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ عورتیں ترقی کے فوائد سے محروم نہیں رہنی چاہئیں۔ ایسے پروگرام مرتب کیے جانے چاہئیں جن سے عورتوں کا سماجی مرتبہ بلند ہو اور حالاتِ زندگی بہتر ہو سکیں

ملک میں زیرِ عمل ترقیاتی منصوبوں میں تعلیم صحت اور روزگار کے شعبوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے کیونکہ یہ تینوں شعبے عورت کو قومی دھارے میں لانے میں بہت مدد دے سکتے ہیں۔

1991 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں عورتوں کی تعداد ۴۰ کروڑ ۶۵ لاکھ تھی۔ اگر ملک کی اتنی بڑی آبادی تک ترقی کے عمل کی رسائی نہ ہو یا اسے غلامی کے احساس سے نہ اٹھایا جائے تو یہ کسی ملک یا اس کی حکومت کے لیے فخر کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے ترقیاتی منصوبوں میں خواتین کے لیے منافع بخش روزگار کے مواقع پیدا کرنے، خود روزگاری کی صلاحیت پیدا کرنے، تعلیم و تربیت کے پروگرام، ان کی صحت کی دیکھ بھال حکومت کی ایک بڑی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔

جہاں گذشتہ کئی برسوں سے مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی سطح پر شہروں اور دیہات کی غریب اور مزدور عورتوں کی فلاح کے لیے بہت کچھ کیا جا رہا ہے وہاں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ پروگرام معمول بن کر رہ گئے ہیں اور صرف کچھ یا کسی خاص طبقے کی عورتیں ہی ان سے مستفید ہو رہی ہیں۔ بہر حال نتائج تسلی بخش نہیں ہیں۔ عورت آج بھی سر پر ٹوکری اور پہلو میں بچہ لیے چل رہی ہے پر کھڑی ہے۔ جہاں وہ مرد کی زیادتی اور کارخانے دار یا زمیندار کے استحصال کا شکار ہے۔ کسی فیصلے میں اسے کوئی دخل نہیں اور کسی منصوبے میں اس کی رائے شمار نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں اصلاحی اقدامات حکومت کی ذمہ داری ہو جاتے ہیں چنانچہ حکومت نے ملک میں عورت کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے پالیسی کے طور پر کئی قدم اٹھائے ہیں۔ خواتین کے لیے قومی کمیشن اور ۲۰۰۰ء تک کے لیے خواتین کے لیے منصوبہ اس سمت میں اہم قدم ہیں۔ مارچ ۱۹۹۳ میں راشٹریہ مہیلا کوش کے نام سے خواتین کو قرضے دینے کا ایک قومی فنڈ بھی قائم کیا گیا ہے جس سے مختلف سرگرمیوں کے شعبوں میں اقتصادی ط
عورتوں کو مدد ملے گی۔

خواتین کیلئے ق

عورتوں کی سماجی د

کا جائزہ لینے کے لیے ۳۱ جنوری ۱۹۹۲ کو خواتین کا ایک قومی کمیشن قائم کیا گیا جس کی صدر شریمتی جینتی پٹنائک ہیں۔ چھ ارکان پر مشتمل یہ کمیشن زندگی کے ہر شعبے میں جہاں عورت کا مرتبہ بلند کرنے کی ضرورت ہے سرکردہ اصحاب ممبران پارلیمنٹ اور افسران سے تبادلِ خیال کرتا ہے۔ کمیشن نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ کچھ ماہ پہلے حکومت کو پیش کی ہے۔ کمیشن نے کچھ جامع تجاویز بھی پیش کی ہیں جن سے عورتوں میں ناخواندگی دور کی جا سکتی ہے، اجرتوں کی ادائیگی میں امتیازی سلوک کو ختم کیا جا سکتا۔ ان کی پیداواریت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی صحت کی بہتر دیکھ بھال ہو سکتی ہے، بے روزگاری، محنت کے استحصال اور بڑے کنبوں کی پرورش کے بوجھ کی مجبوری کے مذموم چکر کو توڑا جا سکتا ہے۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ اکثر غریب عورتیں سماجی طور پر پیداوار کے قومی عمل میں برابر کی شریک ہیں حالانکہ ان کی حالت پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ مہیلا منڈل سرگرم کیے جائیں جو ایک جال کی صورت میں ملک بھر میں پھیلائے جا سکتے ہیں اور ان منڈلوں کے ذریعہ عورتوں کو مختلف کاموں کے لیے منظم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مہیلا منڈل خاص طور

ملک کے پچاس فی صد منصوبے خواتین کی ترقی کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنائے جانا چاہئیں۔

کمیشن نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ خواتین کی محنت مزدوری کے بارے میں جو قوانین بنائے گئے ہیں ان پر پوری طرح عمل نہیں ہوتا جس کا خواتین کی معاشی حالت اور حالاتِ کار پر برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ روزگار کے حق کو بنیادی حق مانا جائے جس کے ساتھ خواتین کے لیے معقول اجرت کا حق بھی شامل کیا جائے۔

کمیشن نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ

کنبے کی جو بھی جائیداد ہو اس میں عورت کا بھی برابر کا حق اور اختیار ہونا چاہیئے۔

کمیشن نے کہا ہے کہ عورتوں کو قرضے دینے کے لیے اختراعی پروگرام شروع کیے جائیں اور اس مقصد کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کیا جائے۔

کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ خواتین کو روزگار اور کام کے برابر کے مواقع دلوانے کے لیے ایک الگ کمیشن قائم کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ خواتین کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ تجاویز اہم ہی نہیں انقلابی نوعیت کی بھی ہیں اور حکومت کو بہت سی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔

لیکن کمیشن نے صرف رپورٹ پیش کرکے روایتی طور پر اپنا کام انجام نہیں دیدیا بلکہ وہ سفارشات پر عملدرآمد کا جائزہ لینے اور مزید ضروری اصلاحات تجویز کرنے کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ ۵ مئی ۱۹۹۳ کو کمیشن نے خواتین ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ ممبران پارلیمنٹ نے خواتین کے لیے ایک نئی زندگی کے آغاز کی غرض سے کمیشن کی سفارشات کا خیر مقدم کیا۔ کچھ خواتین ممبروں کا کہنا تھا کہ میڈیا میں خواتین کی صحیح زندگی کا عکس پیش کیا جانا چاہیئے جب کہ فلموں اور میڈیا میں اسے اشتہار بازی کا موضوع اور جنس کی علامت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ خواتین میں بڑھ رہے مجرمانہ حملوں پر بھی تشویش کا اظہار کیا گیا میٹنگ میں سفارش کی گئی کہ حکومت اس مقصد کی ہدایات جاری کرے کہ خواتین کے تشدد کی پُر نمائش نہ کی جائے اور خواتین کی اجتماعی عصمت دری اور خواتین کی بے حرمتی کا مظاہرہ کرنے والی فلموں کی نمائش کی اجازت نہ دی جائے۔

یوجنا، نئی دہلی

اسکیموں پر عملدرآمد

کمیشن کی طرف سے خواتین میں مالی خود اعتمادی اور مالی امداد کے لیے جو سفارشات کی گئی ہیں حکومت کے محکموں نے ان کے مطابق کام شروع کر دیا ہے۔ مہیلا کوش کے نام سے خواتین کو قرضے دینے والا ایک قومی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس کی ایک میٹنگ حال ہی میں منعقد کی گئی ہے۔ یہ فنڈ ۹۴-۱۹۹۳ میں غیر رسمی اور غیر منظم شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کو ۸ کروڑ روپے کے قرضے کم شرح سود پر دے گا۔

پردھان منتری نے عورتوں میں مالی خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ۱۳ اگست کو ڈاک خانوں میں خواتین کے بچت کھاتے کھولنے کی ایک اسکیم کا اعلان کیا۔ مہیلا سمردھی یوجنا کے تحت ہر عورت اپنے گاؤں کے یا نزدیکی ڈاک خانے میں اپنا کھاتہ کھول سکے گی جس میں وہ ایک روپے روز کے حساب سے اگر سال میں تین سو روپے بھی جمع کرائے تو اس پر سرکار اپنی گرہ سے ۲۵ فی صد رقم یعنی ۷۵ روپے کی ترغیبی مدد دے گی۔ اس اسکیم کا اجرا ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ سے کیا جا رہا ہے اور حکومت کو امید ہے کہ اس طرح عورتوں میں مالی لحاظ سے خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ وہ اپنی بچت کی اس رقم میں سے سال میں دو بار پیسہ نکلوا سکے گی۔ مرکزی سرکار نے اس اسکیم کے لیے ایک ہزار کروڑ روپیہ مخصوص کیا ہے۔ پردھان منتری نے اس اسکیم کو ایک انقلابی قدم قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے صنف نازک کو سماج میں اس کا حصہ دینے میں مدد ملے گی اور ان کا مرتبہ بھی بلند ہو گا۔

خواتین ممبران پارلیمنٹ نے اس اسکیم کو سوشل سیکورٹی کی جانب اہم قدم قرار دیا ہے جس کے تحت دیہات کی بے سہارا غریب عورتوں کو کچھ اقتصادی تحفظ کا احساس ہو گا۔ جب عورت کے پاس چار پیسے جمع ہوں گے تو سماج اور کنبے میں اس کی عزت بھی بڑھے گی۔

حکومت نے ڈی ڈبلیو سی آر اے کے نام سے دیہات میں عورتوں اور بچوں کی فلاح کی ایک اسکیم بھی شروع کی۔ یہ اسکیم ۹۶-۱۹۹۵ تک ملک کے تمام ۴۵۰ اضلاع میں رائج کر دی جائے گی۔ ہر سال یہ اسکیم ۵۰ اضلاع میں لاگو کی جائے گی۔ آٹھویں منصوبے میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والی خواتین کے ۵۰ ہزار گروپ بنائے جائیں گے۔ اب تک ۱۶۴۷۱ گروپ بنائے جا چکے ہیں جن سے ۳۱۲۰۵۹۷ عورتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

کمیشن کو شکایات

خواتین کا کمیشن خواتین سے متعلق ملک کے تمام قوانین کا پھر سے جائزہ لے رہا ہے۔ بہت سی خواتین اپنی شکایات لے کر کمیشن کے دہلی اور علاقائی دفاتر میں آ رہی ہیں اور ان شکایات پر متعلقہ حکام یا افراد کے خلاف مناسب کارروائی کی جا رہی ہے۔ حکومت نے اقتصادی اصلاحات کا جو نیا دور شروع کیا ہے خواتین کے کمیشن نے اس کے عورتوں پر اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کیا ہے۔

●

امیتابھ مکرجی

'اندرونی ترقی' کے لیے منصوبہ بندی

بہتر واں آئینی ترمیمی بل جس کا مقصد ڈسٹرکٹ اور سب ڈسٹرکٹ کی سطح پر منتخب پنچایتوں کا ایک کثیر سطحی نظام قائم کرنا ہے، اوپر سے نچلی سطحوں کو ترقی کے لیے اختیارات منتقل کرنے کا بھی اہم ترین ذریعہ ہے اور قلیل وسائل کے بہترین استعمال کا بھی، خصوصاً ایک ایسے وقت میں جبکہ ہمارے اقتصادی نظام کے عدم توازن کو درست کرنے کے لیے کیے گئے اقدامات کے سبب ترقی کے لیے اور بھی کم وسائل دستیاب ہیں۔

جب ہم بہترین استعمال کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کئی باتیں ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ صرف کیے گئے وسائل سے پیدا شدہ سہولیات کا اور زیادہ مؤثر استعمال کیا جانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر اگر وسائل کا استعمال پرائمری اسکول کھولنے کے لیے کیا گیا ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اساتذہ باقاعدگی سے اسکول آتے اور ان بچوں کی جنہیں ان کی نگرانی میں سونپا گیا ہے ان کی خوبی دیکھ بھال کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وسائل کا استعمال صحت عامہ کی خدمات مہیا کرنے کے لیے کیا گیا ہے تو ان کا کوئی مصرف نہ ہوگا اگر طبی عملہ یا دوائیں وقت پر دستیاب نہ ہوں۔ کیرالہ کو اپنی اضافی آبادی کی شرح ۲۳٫۵ کی قومی اوسط کے مقابلے میں ۱۳٫۹۸ پر محدود رکھنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اسے اس ریاست کو ابتدائی تعلیم اور ابتدائی صحت کی مؤثر خدمات فراہم کرنے سے حاصل

ہوئی کامیابی کا مرہون منت

ابتدائی تعلیم نے ریاست

خواندگی کو بڑھایا ہے وہاں،

خدمات کی فراہمی کی بدولت

منصوبہ بندی سے متعلق خدمات بروقت ہوتی رہی ہیں جس کی وجہ سے ان کے لیے اپنے کنبوں کو محدود رکھنا آسان ہوگیا۔

افسوس کی بات ہے کہ دوسری ریاستوں نے اس سے کوئی سبق نہیں لیا ہے اور ان کی ابتدائی تعلیم اور ابتدائی صحت کی خدمات باوجود اس کے کہ ان پر بہت روپیہ خرچ کیا گیا ہے ناقص ہیں۔ گذشتہ دہائی میں تمام ریاستوں نے منصوبائی اور غیر منصوبائی دونوں مدوں میں ابتدائی صحت اور ابتدائی تعلیم پر کل ملاکر ۶۵۰ کروڑ روپے کی کثیر رقم خرچ کی ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بہت سے اساتذہ اسکول نہیں آتے اور طلبا کو اس طرح نہیں پڑھاتے جس طرح کہ انہیں پڑھانا چاہیئے۔ اسی طرح صحتی کارکنان بھی ضرورت مندوں کو راحت نہیں پہنچاتے۔

ابتدائی تعلیم یا ابتدائی صحت سے متعلق

میں جہاں بعض اضلاع دنیا کے کچھ ملکوں سے بڑے ہیں۔ اس قسم کی نگرانی یا کنٹرول کافی دور واقع ریاست کے صدر مقام سے نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن جب پنچایتوں کو نگرانی کا اختیار مل جائے گا تو صورت حال بہتر ہو جائے گی جیسا کہ کرناٹک کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب وہاں کی منڈل پنچایتوں کو نگرانی کا اختیار مل گیا تو اسکولوں میں اساتذہ کی حاضری اور صحتی مراکز پر طبی عملے کی موجودگی میں راتوں رات باقاعدگی آگئی اور ان کی خدمات بھی بہتر ہوگئیں۔

وسائل کے بہترین استعمال کے دوسرے معنی دستیاب وسائل کا زیادہ مؤثر استعمال اور وسائل کے زیاں یا خرد برد کو روکنا ہیں۔ اب یہ بات وسیع پیمانے پر تسلیم کی جانے لگی ہے

مصنف ایل بی ایس نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن مسوری میں معاشیات کے پروفیسر ہیں

کہ صَرف کیے گئے وسائل کا بڑا حصہ ان لوگوں یا اس شعبے تک نہیں پہنچتا جہاں اسے پہنچانا مقصود ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رقوم اوپر سے ایک "غیر جوابدہ" اور بیوروکریٹک مشینری کی وساطت سے فراہم کی جاتی ہیں جسے عموماً لوگوں کی ضرورتوں کا احساس نہیں ہوتا اور جو صرف عددی نشانے پورا کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے اور اس مفروضہ کے تحت کام کرتی ہے کہ "عوام نہیں جانتے کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے"۔ ۷۲ ویں آئینی ترمیم کے تحت بندوبست، منصوبہ سازی اور منصوبوں پر عملدرآمد کے اختیارات نچلی سطحوں تک منتقل کیے جانے سے وسائل کا بہترین استعمال یقینی ہو جائے گا کیونکہ وسائل کو خرچ کرنے والوں پر جوابدہی کی ذمہ داری بھی عائد ہو گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ منصوبہ بندی "کاٹو اور چپکاؤ" کی طرح کی ایک مشق بن کر رہ گئی ہے نیز یہ کہ اس میں مقامی معاشیات پر جتنی چاہیے اتنی توجہ نہیں دی جاتی اور مانگ یا ضرورت سے کم وسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بہت ضروری ہے کہ دستیاب وسائل کو پوری احتیاط اور سمجھ بوجھ کے ساتھ انہی شعبوں میں خرچ کیا جائے جن میں کہ ان کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ وسائل کا اس طرح کا باحتیاط اور ذمہ دارانہ استعمال صرف عوام کی چنی ہوئی مقامی پنچائتیں ہی کر سکتی ہیں کیونکہ مقامی ضرورتوں کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ عوام کی رائے اور رضامندی کے ساتھ ان قلیل وسائل کا استعمال اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کر سکتی ہیں۔ اگر وہ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کریں گی تو عوام انھیں اگلے چناؤ میں دھتکار دیں گے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خسارے کو کم کرنے اور قرضوں کی بازوصولی کے لیے اکثر و بیشتر جو دباؤ ڈالا جاتا ہے اس کے باوجود یہ صحیح نہیں ہے کہ ہمارے پاس سبھی وسائل کی کمی ہے۔ ترقی کے لیے درکار وسائل میں مٹی، پانی، سورج کی روشنی اور بایوماس کا بھی شمار ہے اور سوائے بایوماس کے ہمارے یہاں باقی سبھی وسائل بہ افراط موجود ہیں اور اس افراط کی وجہ سے ہی ان قیمتی وسائل کا ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ وسیع تر نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ افراد، وسائل اور ٹکنالوجی میں مناسب تال میل اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں بیوروکریسی اور تکنیک کاروں کی ناکامی ہے جس کے سبب ہندوستانی معیشت میں اتنی محرومی، بھوک اور ٹھہراؤ ہے۔

ضرورت

ان وسائل کے مناسب استعمال، بچت اور تحفظ کے لیے سائنسی صلاحیتوں کی عظیم طاقت کا استعمال کیا جانا چاہیے مثال کے طور پر ریموٹ سینسنگ کے ذریعے زمین پر پانی، مٹی، نباتات اور معدنیات کے وسائل کے نقشے تیار کیے جانے چاہئیں جن کی مدد سے ترقی، منصوبہ بندی اور معاشی پروگراموں کی نوعیت یکسر بدلی جا سکتی ہے۔ تاہم ان وسائل کے استعمال، بچت اور تحفظ کے لیے مناسب منصوبہ بندی اور منصوبوں پر عمل درآمد کا کام مقامی سطح پر ہی کیا جانا چاہیے۔ یہ طریقِ عمل اوپر سے کی جانے والی شعبہ جاتی منصوبہ بندی سے، جس پر ہم ابھی تک انحصار کرتے آئے ہیں، یکسر مختلف ہے۔ مقامی علاقائی منصوبہ بندی کے دائرے سے باہر، اوپر سے کی جانے والی شعبہ جاتی منصوبہ بندی وسائل کی تضییع کا باعث بنتی ہے۔

اوپر سے کی جانے والی شعبہ جاتی منصوبہ بندی سے پیچھا چھڑانے کے لیے منتخب مقامی ادارے قائم کرنا ضروری ہے جس کا کہ بہترویں آئینی ترمیم میں اہتمام کیا گیا ہے۔ علاقائی منصوبے میں مقامی ترجیحات کو مدنظر رکھا جا سکے گا، جو سرمایہ کاری کی جا چکی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی (مثلاً پرائمری اسکولوں کے اساتذہ اور صحتی مراکز کے طبی عملے کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے گا۔ جیسے کرناٹک میں منڈل پنچایتوں نے کیا تھا۔) اور مقامی وسائل کو حرکت میں لایا جائے گا۔ یہ کام منتخب مقامی تنظیم کو انجام دینا ہو گا۔ یہ مقامی تنظیمیں عوام کی مدد و تعاون سے ترقی لا سکیں گی اور افراد، وسائل اور ٹکنالوجی کو بہتر تال میل کے ساتھ ترقی کے لیے استعمال کر سکیں گی۔

تھیم

۷۲ ویں آئینی ترمیمی بل میں ایسے منتخب اداروں کے قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو "اندر سے ترقی" لا سکیں۔ یہ بات تو اب سبھی جانتے ہیں کہ اقتصادی کوششوں کا مقصد کس طرح آمدنی میں "اضافے" سے بدل کر "استحکام کے ساتھ اضافہ" اور پھر "ترقی" (رہن سہن کے حالات میں بہتری) اور اس کے بعد "برقرار رہنے والی ترقی" اور اب یہ "اندر سے ترقی" ہے۔ ۷۲ ویں ترمیمی بل کے تحت مقامی سطح کے منتخب ادارے "اندر سے ترقی" کا دور شروع کرنے کے لیے سب سے موزوں ہوں گے۔ "اندر سے ترقی" کے لیے منصوبہ بندی کا عمل کیسے شروع کیا جا سکتا ہے اس کے لیے ذیل میں ایک اسکیم تجویز کی جا رہی ہے۔

مجوزہ منصوبہ بندی کے چار بڑے گوشے یہ ہیں۔ (۱) اُن کاموں کی نشاندہی جو گاؤں کے لوگ خود ہی انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ گرام پنچایتوں کے گرد منظم ہو جائیں اسے ہم پیپلز سیکٹر یا عوامی سیکٹر کا نام دے سکتے ہیں۔

۲۔ ایسے کاموں کی شناخت جو گاؤں میں قرضوں کی مدد سے تجارتی بنیاد پر کیے جا سکتے ہیں۔ اسے بنک سیکٹر یا بنک کا شعبہ کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ اُن کاموں کی نشاندہی جو ہر گاؤں میں سرکاری سبسڈی کی مدد سے ہی سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اسے سرکاری سیکٹر کہا جا سکتا ہے۔

۴۔ اس بات کا جائزہ لیا کہ کون سے کام ہیں جو ان سیکٹروں کا اشتراک سرانجام دے سکتا ہے۔ اسے مشترکہ سیکٹر کہا جاسکتا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم ان میں سے ہر سیکٹر پر اظہار خیال کریں یہ بتادینا ضروری ہے کہ چونکہ ترقیاتی اسکیموں کی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی مدت ضرور مقرر ہوتی ہے اس لیے یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی ایک اسکیم یا اسکیموں کا کتنا کام ایک سال میں پورا کیا جاسکتا ہے۔ جتنا کام ایک سال میں پورا ہوسکے اسے سالانہ منصوبے میں شامل کرنا چاہئے۔ جن کاموں کے لیے پانچ سال تک کی مدت درکار ہے انھیں پنجسالہ منصوبے میں شامل کیا جانا چاہئے، پھر جن کی تکمیل میں پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ لگنے کا امکان ہو انھیں تناظری منصوبوں میں شامل کرنا چاہئے۔

آئیے اب مذکورہ بالا تینوں سیکٹروں کی علیحدہ علیحدہ وضاحت کی جائے۔

۱۔ **عوامی سیکٹر**: اس سیکٹر کے ذمہ یہ کام لگائے جاسکتے ہیں۔

الف۔ گاؤں میں پانی کے ایک یا ایک سے زیادہ ذریعوں مثلاً تالابوں وغیرہ کو پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے مخصوص کرنا تاکہ انھیں نہانے دھونے، کپڑے اور برتن صاف کرنے اور مویشیوں کو نہلانے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

ب۔ رفع حاجت کے لیے گڈھے کھودنا اور فضلے کو مٹی یا راکھ سے ڈھکنا۔ ایسا کرنے سے صحت کی بھی حفاظت ہوسکے گی اور ان گڈھوں میں زراعت کے لیے مرکب کھاد بھی تیار کی جاسکے گی۔

ج۔ ہر گھر میں مرکب کھاد تیار کرنے کے لیے گڈھے کھودنا۔

د۔ گاؤں کی سڑکوں اور باندھوں کی مرمت و دیکھ بھال کرنا۔

ہ۔ حفظان صحت کی تدابیر کو سمجھنا اور زیر عمل لانا خصوصاً زچہ و بچہ کی دیکھ بھال کے ضمن میں۔

و۔ گاؤں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ناخواندہ افراد کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی ترغیب دینا۔

ز۔ گاؤں کے لوگوں میں مقامی طور پر تیار کیا گیا کپڑا، تیل اور دیگر اشیاء استعمال کرنے کی تحریک پیدا کرنا کیونکہ اس سے دیہی صنعت کو زندہ کرنے اور روزگار پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

ح۔ منصوبہ بندی کے لیے بنیادی اطلاعات حاصل کرنے اور ترقیاتی منصوبوں کی عمل آوری پر تنقیدی تحت مباحثہ کے لیے گاؤں والوں کی میٹنگیں منعقد کرنا اور

ط۔ گاؤں کی سطح پر غریبوں اور ناداروں، سماج کے کمزور طبقوں، مزدوروں، [illegible] تنظیمیں بنانا تاکہ وہ [illegible] فائدہ لے سکیں اور [illegible] کے لیے پورے کا [illegible] فائدہ اٹھایا جاسکے [illegible] کا لب لباب ہے۔

۲۔ **بنک سیکٹر**: بنک کے قرضوں سے کیے جاسکنے والے کاموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مختصراً یہ بتایا جاسکتا ہے کہ درج ذیل مقاصد کے لیے کئی اسکیمیں چل رہی ہیں۔ (الف) فصل کے لیے قرضوں کی فراہمی (ب) آبپاشی کے لیے چھوٹی تعمیرات کے واسطے امداد (ج) ہر گرام پنچایت میں اجتماعی گودام بنانے کے لیے امداد (د) دیہی صنعتوں کے لیے امداد (ہ) زراعت کے لیے مالیات کی فراہمی اور (و) چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے، سائیکل گاڑی چلانے، سائیکل مرمت کی دوکان کھولنے اور اشیاء صرف کی پھیری کرکے تجارت کے لیے مالی امداد دینا۔

اگرچہ یہ اسکیمیں کامیابی سے چل رہی ہیں تاہم ان کی عمل آوری میں کچھ اصلاحی اقدامات کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو گاؤں کے اُن خاندانوں کی ایک جامع فہرست تیار کی جانی چاہئے جو بنک کی مالی امداد سے کوئی کام دھندہ شروع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کے بعد پنچایتیں گاؤں کی ضرورتوں کے مطابق خصوصی اسکیمیں بنکوں کی مدد سے تیار کرکے بنکوں کو آگے کی کارروائی کے لیے پیش کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ پنچایتوں کو کچھ ایسا انتظام بھی کرنا چاہئے جس سے کہ وہ قرضوں کی تقسیم اور بامقصد استعمال اور وقت پر [illegible] وہ آسان ہوجائے گی اور اس میں وقت بھی کم لگے گا۔ پنچایتوں کو اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ سرکاری سبسڈی کا صحیح اور پورا استعمال کیا جائے۔

۳۔ **سرکاری سیکٹر**: سرکاری امداد کے لیے منصوبے بناتے وقت یہ احتیاط برتی جانی چاہئے کہ سرکاری امداد پر انحصار رکھنے کی عادت نہ پڑ جائے۔ یہ ایک بہت مشکل کام ہے لیکن "اندر سے ترقی" لانے کی اسکیمیں بناتے وقت اسے دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

گاؤں کے لوگ جو کام اکیلے یا بنک کی مدد سے نہیں کرسکتے ان کی شناخت کی جانی چاہئے۔ اس سلسلے میں "زمین ہموار کرنے کے

کام کی مثال دی جاسکتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کام کے لیے صرف مزدوروں اور پھاوڑے جیسے آلات کی ضرورت ہوتی ہے جو گاؤں کے لوگوں کے پاس موجود ہوتے ہیں لیکن ان وسائل کا ذاتی حق ملکیت کی وجہ سے براہ راست استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ وہ افراد جن کے پاس جائداد ہے اور اس جائداد کے حق ملکیت کی گارنٹی ملک کا آئین اور قانون دیتا ہے، ان کے پاس مزدوروں کی مطلوبہ جمعیت نہیں ہوتی جس کی مدد سے وہ اپنی زمین جوت سکیں۔ مزدور انھیں بے زمین زرعی مزدوروں اور ان حصہ داروں سے مل سکتے ہیں جو دوسروں کی زمین ہموار کرنے کے لیے افرادی قوت مہیا کرسکتے ہوں بشرطیکہ مزدوروں کو ان کے کام کی اجرت دی جائے۔ اس لیے موجودہ حالات میں منصوبہ بندی اس طرح کی جائے کہ مالکان اراضی کو اس بات کی ترغیب ملے کہ وہ علاقے کے تمام مالکانِ اراضی کو منظم کرکے انھیں زمین کو ہموار کرنے پر راضی کریں جو ان کی اپنی ملکیت ہے۔

اس طرح کے مسائل اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ زمین کی ملکیت اور لیبر کی ملکیت الگ الگ ہاتھوں میں ہے۔ اگر زمین کی ملکیت مزدوروں کو ہی حاصل ہوتی تو مسئلہ خود بخود حل ہوجاتا۔ لیکن ایسا ہے نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین کو ہموار کرانے جیسی سرگرمیاں جن سے اثاثہ اراضی میں مستقل بہتری آتی ہے، عام نہیں ہیں۔ اس طرح اونچی نیچی اور غیر مسطح زمین پر کاشت نہیں کی جاتی یا کی جاتی ہے تو اُس طرح نہیں جس طرح کی جانی چاہیے۔ اس سے جہاں پیداوار کم ہوتی ہے وہاں بے زمین کھیت مزدوروں کو کام بھی کم ملتا ہے اور دیہی معیشتوں کی آمدنی بھی کم ہوتی ہے۔ ان حالات میں پنچایتوں کو منصوبہ بندی اس طرح کرنی چاہیے کہ زمین ہموار کرانے کا کام اجرتوں اور دوسرے چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے ملنے والی سبسڈی سے کرایا جاسکے اور ایک پروجیکٹ کی شکل اختیار کرلے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے پروجیکٹوں مثلاً آبی ذرائع کو دوبارہ قابل استعمال بنانے، زمین کو دوبارہ قابل کاشت بنانے، آبپاشی کے لیے نہریں بنانے، دیہی سڑکیں بنانے، پرائمری اسکول کھولنے، صحتی مراکز قائم کرنے وغیرہ کو "اندر سے ترقی" کے منصوبوں میں شامل کیا جانا چاہیے ان کے لیے سرکاری سبسڈی کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اور انھیں لاگت کے مقابلے میں فائدے کی بنیاد پر مکمل کیا جانا چاہیے۔

مذکورہ بالا تینوں سیکٹروں میں سرکاری سیکٹر کے وسائل کی پوزیشن سب سے خراب ہے۔ اس وقت اس سیکٹر سے ضلعی منصوبے کے لیے فنڈ کی فی کس سالانہ دستیابی صرف نوّے روپئے کے لگ بھگ ہے جب کہ بینک سیکٹر سے فی کس فی سال تقریباً ۲۰۰ روپئے حرکت میں لائے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح عوامی سیکٹر میں وسائل کے موثر استعمال کی موجودہ سطح اُس سے بہت کم ہے جتنی کہ ہونی چاہیے، جیسا کہ حقائق سے ظاہر ہے۔ کم از کم ایک ریاست میں ۱۹۸۵ء میں فی گاؤں اوسطاً ۱۵۰ مزدور ایسے تھے جنھیں ایک سال میں کم از کم ۱۰۰ دن کام میسر نہیں تھا۔ روپیوں کی شکل میں اس غیر استعمال شدہ لیبر کی کل قیمت فی کس ۱۵ روپئے یومیہ کے حساب سے ۲،۲۵۰،۰۰ روپئے فی گاؤں فی سال تھی۔ آج کل اس قوت کا بہت کم حصہ ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ "اندر سے ترقی" کے منصوبے بناتے وقت دیہی معیشتوں کی اس صورتحال کو مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

آخر میں مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اسکیمیں گاؤں والوں کو پہلے خود اُن کاموں کی ایک جامع فہرست کے ساتھ تیار کرنی چاہییں جنہیں وہ چاہتے ہیں کہ پنچایتیں گاؤں کے لیے کریں۔ یہ پہلا مرحلہ ہوگا۔

عوامی سیکٹر میں شامل اور زیرعمل لائی جانے والی اسکیموں کی تصدیق دوسرے مرحلے میں کی جائے گی۔ اس کے بعد جو اسکیمیں بچیں گی ان میں سے ایسی اسکیمیں جو بینکوں کی مدد سے تجارتی بنیاد پر مکمل کی جاسکتی ہیں انھیں تیسرے مرحلے میں ہاتھ میں لیا جائے گا۔ باقی ماندہ اسکیموں کی جانچ پڑتال چوتھے مرحلے میں یہ پتہ لگانے کے لیے کی جائے گی کہ کیا ان میں کچھ اسکیمیں ایسی ہیں جنھیں ان حلقوں پر جہاں سرکاری سبسڈی دستیاب ہے، کچھ تو بینکوں کی مالی امداد سے اور کچھ پبلک فنڈس سے مکمل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو اسکیمیں باقی بچیں گی ان کو پانچویں اور آخری مرحلے میں ہاتھ میں لیا جائے گا۔ ان میں ایسے پروگرام بھی شامل ہوں گے جنھیں صرف سرکاری مالیات سے ہی مکمل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے بطور سرکاری سیکٹر کی اسکیموں کے ترجیحات مقرر کی جائیں گی اور ان ترجیحات کے مطابق ہی انھیں زیرعمل لایا جائے گا۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جب کہ "اندر سے ترقی" کے لیے پلاننگ کے تحت عوامی سیکٹر پر زور دینے کی تجویز ہے، آج کل زور سرکاری سیکٹر پر دیا جارہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے سرکار پر انحصار رکھتے اور اسے "مائی باپ" سمجھتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے مجوزہ عمل میں اس طرز فکر کو بدلنا ہوگا۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس میں جتنی دیر لگے گی اس رجحان کو بدلنا اتنا ہی مشکل ہوجائے گا۔ بہترویں آئینی ترمیمی بل نے ہمیں جو موقع فراہم کیا ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں سرکاری مالیات پر انحصار کو کم کرنے اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے کے لیے "اندر سے ترقی" کی خاطر بلاتاخیر نئے نقطۂ نگاہ سے منصوبہ بندی شروع کردینی چاہیے۔

ادتیہ راج داس

قالین کی صنعت

قالین کی صنعت کو بھارت کے برآمداتی فروغ کے پروگرام میں ایک قابل فخر مقام حاصل ہے۔ اس صنعت نے اپنے پیچیدہ اور دلکش ڈیزائنوں کے لیے دنیا بھر میں صاحب ذوق اور صاحب پرکھ لوگوں سے داد تحسین حاصل کی ہے۔ یہ صنعت بنیادی طور سے گاؤں پر مبنی صنعت ہے۔ اس صنعت سے تقریباً ۵،۷۰۰۰ ۳ لوگوں کو روزگار مل رہا ہے۔

مختلف اقسام کے قالینوں اور فرش پوشوں کی تیاری ۸۸ ـ ۱۹۸۷ میں ۴ لاکھ مربع میٹر سے بڑھ کر ۹۱-۱۹۹۰ میں تقریباً ۸ لاکھ مربع میٹر ہوگئی ہے۔ ان کی برآمدات کی مالیت ۹۱ـ۱۹۹۰ میں ۵۲، ۶۷۰ کروڑ روپے تھی، جو ۹۲-۱۹۹۱ میں بڑھ کر ۴۱، ۱۲۳۸ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ اس طرح برآمدات کی مالیت میں ۷، ۸۴ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اپریل سے نومبر ۱۹۹۲ کی مدت کے دوران قالینوں کی برآمدات کی مالیت ۷۰، ۹۹۸ کروڑ روپے رہی ہے، جبکہ اپریل سے نومبر ۱۹۹۱ کی مدت کے دوران یہ مالیت ۳۰، ۷۳۴ کروڑ روپے تھی۔ اس میں ہاتھ سے تیار کردہ قالینوں کی برآمدات کی مالیت اپریل سے نومبر ۱۹۹۲ کی مدت کے دوران ۹، ۷۹۶ کروڑ روپے ہے، جبکہ یہ مالیت اپریل سے نومبر ۱۹۹۱ کی مدت کے دوران ۵۰، ۵۹۲ کروڑ روپے تھی اس طرح اس مالیت میں ۵، ۳۴ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ مذکورہ مدت کے دوران ملوں کے تیار کردہ قالینوں کی برآمدات کی مالیت میں ۴، ۴۲۴ فی صد کا اضا

بھارت سے قالینوں کی برآمدا

اور جرمنی کو جاتا ہے۔ بھارت

ان دونوں ممالک کا حصہ

ہے اور بقیہ تقریباً ۴۰ ف

یوروپی ممالک کا حصہ ہے۔

بڑے پیمانے پر صلاحیت ہونے کے باوجود، قالین کی صنعت آج کل دوہرے مسئلے کا سامنا کر رہی ہے۔ ایک مسئلہ بھارتی قالینوں کے لیے دنیا میں کم ہوتی ہوئی مانگ کا مسئلہ ہے اور دوسرا مسئلہ اس کے ساز و سامان کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مسئلہ ہے۔ اونی قالینوں سمیت ہاتھ سے تیار کردہ قالینوں کی عالمی درآمدات کی مالیت ۱۹۸۳ میں ۴۰، ۱۱ لاکھ ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۹۲ میں ۲۲۰۰۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ ہوگئی ہے۔ لیکن بھارت سے برآمدات کے حصے میں اسی حساب سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ بھارت اب تک اس معاملے میں سب سے آگے تھا۔ لیکن اس کے اس مقام کو اب خطرہ لاحق ہے۔ مقابلہ کرنے والے دیگر ممالک مثلاً چین، ایران، پاکستان اور نیپال بھی سبقت لے جانے کے لیے زبردست کوششیں کر رہے ہیں۔

بھارت سے برآمدات کی مالیت میں

[illegible]

امریکہ کا حصہ گذشتہ پانچ برسوں میں ۳۱ فی صد سے ۳۴ فی صد کے درمیان رہا ہے. اس کی وجوہات کا پتہ لگانا مشکل کام نہیں ہے۔ خام مال کی قیمتوں اور اجرتوں میں اضافے کی وجہ سے بھارتی قالینوں کی برآمداتی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ سے یہ قالین کم مقابلہ جاتی ہوگئے ہیں۔

ہاتھ سے تیار کردہ قالینوں کی صنعت کو ہر سال کافی مقدار میں قالینوں میں استعمال ہونے والے اون کی درآمدات کرنی پڑتی ہے، کیونکہ ملک میں قالینوں میں استعمال ہونے والے معیاری اون کی کمی ہے۔ معیار برقرار رکھنے کے لیے نیوزی لینڈ کے اون کے ساتھ بھارتی اون کی آمیزش اور

بھارتی قالینوں کے لیے بہتر قیمتیں وصول کرنے کے نظریے کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

قالینوں میں استعمال ہونے والے اون کی اندرونِ ملک پیداوار صرف ۱۶۰ لاکھ کلوگرام ہے جبکہ صنعت کی موجودہ ضرورت کا تخمینہ تقریباً ۲۸۰ لاکھ کلوگرام لگایا گیا ہے۔ خام مال کی اندرونِ ملک دستیابی میں اس کی کمی کی وجہ سے خاص طور سے نیوزی لینڈ سے قالینوں میں استعمال ہونے والے اون کی درآمدات پر انحصار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صدی کے اختتام تک قالینوں میں استعمال ہونے والا ۶۲۰ لاکھ کلوگرام مناسب معیاری اون فراہم کرنا ضروری ہوگا۔ اس میں سے ۴۲۰ لاکھ کلوگرام اون اندرونِ ملک تیاری سے حاصل کرنا ہوگا اور ۲۰۰ لاکھ کلوگرام اون درآمدات سے حاصل کرنا ہوگا۔ اب نئی برآمداتی و درآمداتی پالیسی کے تحت درآمدات پر پابندیاں نرم کر دی گئی ہیں۔ توقع ہے کہ قالینوں کی صنعت کو قالین تیار کرنے کے لیے کافی مقدار میں خام اون ملے گا۔

بھارتی قالینوں کی برآمدات پر اثر انداز ہونے والا ایک اور مسئلہ یہ الزام ہے کہ یہ صنعت اجرتوں کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے مزدور بچوں کو بڑے پیمانے پر ملازم رکھتی ہے۔ انسانی حقوق سے متعلق سرگرم کارکنان نے ایک مہم شروع کی ہے۔ مزدور بچوں کو مرحلہ وار قالین سازی کے کام سے نکالنے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

آج بھارتی قالینوں کی صنعت کو بین الاقوامی منڈی میں بڑھتے ہوئے مقابلے کا سامنا ہے۔ چنانچہ روایتی منڈیوں میں اپنی صورتِ حال کو مستحکم بنانے اور لاطینی امریکہ اور مشرقی یوروپ کے ممالک میں نئی منڈیاں تلاش کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ برآمدات کو فروغ دینے کے لیے تشہیر، فروخت اور جائزے سے متعلق ٹیموں اور نمائشوں جیسے ترقی و فروغ کے مختلف اقدامات باقاعدہ طور پر کیے جانے چاہئیں۔ کچھ مستقل منڈیوں میں بھارتی قالینوں کے کچھ زمروں کی مانگ میں کمی کا رجحان صرف ایک عارضی مرحلہ ہے اور مارکیٹنگ کی ایک زبردست حکمتِ عملی اختیار کر کے اس معاملہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لاطینی امریکہ اور مشرقی یوروپ میں وسیع منڈیوں کے ہونے سے اس صنعت کا مستقبل مزید تابناک ہو جاتا ہے۔ توقع ہے کہ قالینوں کی عالمی مانگ کی مالیت اس صدی کے اختتام تک بڑھ کر دو ارب ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ بھارتی قالینوں کی صنعت کو بڑھتی ہوئی مانگ سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ: معمر لوگوں کی دیکھ بھال سے

مصائب کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ سبکدوشی کی قانونی عمر کا تعین ہو جانے کی وجہ سے، جسمانی طور سے تندرست بہت سے لوگوں کو روزگار سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انھیں زندگی کے ایک ایسے دور میں اپنی آمدنی میں اچانک کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس دور میں انھیں اپنے علاج معالجے کے اخراجات اور کنبے کے غیر تصفیہ مسائل کے سلسلے میں زیادہ آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن وہ معمر لوگوں کی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ نفسیاتی طور سے وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بھارتی حالات میں، وہ اپنے وطن سے کہیں اور جانا پسند نہیں کرتے ہیں۔ بہت سے معمر لوگ بوڑھے لوگوں کے لیے بنائے گئے گھر (اولڈ ایج ہوم) پسند نہیں کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی تندرستی اور صحت برقرار رکھنے کے لیے مصروف رہنا چاہتے ہیں۔

بہبود کی وزارت نے معمر لوگوں کے فائدے کے لیے فلاح و بہبود کی کچھ اسکیمیں تیار کی ہیں۔ وزارت ایسے رضاکار تنظیموں کو ۹۰ فیصد خصوصی مالی امداد دیتی ہے، جو معمر لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام کر رہی ہیں۔ جن میں دیکھ بھال کے مراکز، بوڑھے لوگوں کے لیے گھر، معمر لوگوں کی دیکھ بھال کے پروگرام، طبی و سماجی خدمات شروع کرنے کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔ معمر لوگوں کے لیے اسکیمیں ۸۴-۱۹۸۳ء سے چل رہی ہیں۔ اس شعبے میں سرکاری امداد کی رقم ۸۴-۱۹۸۳ء میں تقریباً ۴۰ لاکھ روپئے سے بڑھ کر ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱٫۶ کروڑ روپئے ہو گئی ہے۔ جن تنظیموں کی امداد کی گئی ہے ان کی تعداد بھی اس مدت کے دوران ۵ سے بڑھ کر ۱۴۸ ہو گئی ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران معمر لوگوں کی بہبود کے لیے ۳ کروڑ روپئے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگست ۱۹۹۳ء تک، ۱٫۲ کروڑ روپئے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ لیکن معمر لوگوں کا بہت چھوٹا سا حصہ ہی ان اسکیموں سے مستفید ہوتا ہے۔

اب تک معمر لوگوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں یہ نظریہ رہا ہے کہ انھیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کی دیکھ بھال کی جائے۔ انھیں ہمیشہ کمزور، غیر محفوظ، منحصر، بے یار و مددگار، بیمار اور خستہ حال کے طور پر ہی دیکھا گیا ہے۔ بہت سے آجرین معمر لوگوں کی صحت کی صورتحال یا ان کا ہنر اور مہارت پرانی ہو جانے کی وجہ سے انھیں روزگار نہیں دینا چاہتے۔ قدرے سست ہونے کی وجہ سے ان پر نوجوان لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

لیکن معمر لوگوں کی اس بڑی آبادی کی خدمات سے استفادہ نہ کرنا ناانصافی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم معمر لوگوں کے تئیں اپنے نظریے میں تبدیلی لائیں۔ سماج کے مفاد کے لیے بوڑھے لوگوں کے تجربات سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ یہ لوگ بڑی اہمیت کے حامل قومی وسیلہ ہیں۔ اب تمام ممالک اس لحاظ سے سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں کی معلومات، ہنر اور تجربے کو بروئے کار لایا جائے نیز انھیں ترقیاتی عمل میں شامل کیا جائے۔ ●

یاسمین صدیقی

بارش

ہمارے دیس میں موسم کی سب سے زیادہ فکر کسان کو ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی روزی کا دارومدار موسم پر ہے۔ بارش وقت پر نہ ہو تو فصل کو نقصان، ضرورت سے کم بارش ہو تو فصل کو نقصان۔ بارش حد سے زیادہ ہو اور سیلاب یا باڑھ آجائے تو اس کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔

یہاں ہم تفصیل سے تذکرہ کریں گے کہ بارش کیوں اور کس طرح ہوتی ہے؟ موسم کس طرح تبدیل ہوکر بارش کا موسم لے آتا ہے۔

فضا کی حالت یا کیفیت کو موسم کہتے ہیں۔ ایک دن یا ایک ہفتہ تک فضا کی جیسی کیفیت ہو گی اُسے اس دن اور اس ہفتے کا موسم کہیں گے۔

موسم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کو دھیان میں رکھیں۔

۱۔ درجۂ حرارت
۲۔ ہوا کا دباؤ
۳۔ ہوا کی رفتار
۴۔ ہوا کی سمت
۵۔ نمی
۶۔ بادل
۷۔ بارش یا برف باری

یہی سب باتیں مل جل کر موسم کہلاتی ہیں۔

زمین پر ہوا کا دباؤ ہر جگہ ایک سا نہیں ہے۔ یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہ گھٹنا بڑھنا کہیں زیادہ، کہیں کم ہوتا ہے اور ہوا ہمیشہ زیادہ دباؤ سے کم دباؤ کی طرف چلتی ہے۔ جہاں زیادہ ہوتا ہے ہوا بھاری اور وہ زمین کے آس پاس جہاں دباؤ کم ہوتا ہے ہوا اور اوپر اٹھنے کی کوشش کر

ہوا کے اوپر اٹھنے سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے خالی جگہ کو بھرنے کے لئے بھاری اور ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ غرض یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔

ہوا کے دباؤ میں فرق پڑنے سے ہوا کی رفتار تیز اور ہلکی ہوتی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں برسات میں پُروا ہوا چلتی ہے اور جاڑے میں پچھوا۔

ہوا میں نمی تو ہر وقت کچھ نہ کچھ رہتی ہے یہ نمی بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ گرمی میں ہوا کے اندر نمی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن برسات میں بڑھ جاتی ہے۔ جب نمی زیادہ ہوتی ہے تو عموماً آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں۔ اگر فضا بالکل ابر آلود ہے تو بارش کا امکان رہتا ہے۔

دراصل ندی، نالوں اور سمندروں کے جمع پانی میں برابر بھاپ بنتی رہتی ہے اور اوپر فضا میں جاکر ملتی رہتی ہے۔ اوپر فضا میں جاکر جب یہ بہت سی اکٹھا ہو جاتی ہے تو ہمیں

ہو جاتے ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے کبھی کبھی برف باری بھی ہو جاتی ہے۔

بارش کبھی بہت تیز، کبھی موسلا دھار اور کبھی پھوار والی ہوتی ہے۔ دراصل جب گرم مرطوب ہوا ٹھنڈی ہوا سے ملتی ہے تو بارش زور کی ہوتی ہے۔ فضا میں نمی زیادہ ہے اور بادل بہت گہرے چھائے ہوئے ہیں اور ابھی اور نمی اور بادل سمندر کی طرف سے آرہے ہیں تو اوپر ٹھنڈک کی وجہ سے بارش موسلا دھار ہو گی۔

اس کے برخلاف بادل اگر تھوڑے ہیں اور نمی زیادہ نہ آرہی ہو تو ہوا کے الٹ پلٹ ہونے سے ہلکی بارش یا پھوار والی بارش ہو گی۔

موسلا دھار بارش

۱۔ موسلادھار بارش: عام طور سے

کیراف سہیل احمد نیم چوک اردو بازار دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

گرم علاقوں میں ہوتی ہے۔ خطِ استوا کے ساتھ ساتھ اور خط سرطان و خط جدی کے درمیان دوپہر کے بعد دھوپ بہت تیز ہوتی ہے اور بخارات خود بخود بڑی مقدار بنتے ہیں دوپہر میں دو بجے کے بعد تو یہ اور زیادہ بننے لگتے ہیں اور شام کو چار بجے اور آٹھ بجے کے درمیان یہاں بارش زوروں کی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں برسات میں جب مانسونی ہوائیں چلتی ہیں تو اُن سے بارش موسلادھار ہوتی ہے۔ پہاڑ ہوا کو روکتے ہیں اور ہوا جب اوپر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو ٹھنڈک ملتے ہی پہاڑوں کے دامن میں بہت زور کی بارش ہوتی ہے۔ میدان میں بھی پانی تیز برستا ہے۔

۲۔ پھوار والی بارش

پھوار والی بارش زیادہ تر معتدل خطے کے ملکوں میں ہوتی ہے۔ مغربی ہوا کے ساتھ سائکلون اور مخالف سائکلون آتے رہتے ہیں اور ان کے تال میل سے پھوار والی بارش ہوتی ہے۔ یورپ اور انگلستان میں عام طور سے پھوار والی بارش ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بھی سردی کے موسم میں پنجاب، یوپی اور دہلی میں عموماً پھوار والی بارش ہوتی ہے۔

۳۔ بارش ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی

مرطوب ہوا جب سمندر سے آتی ہے تو جو حصے اس کے بالکل سامنے پڑتے ہیں وہاں بارش زیادہ ہوتی ہے اور جو حصے ہوا کے پیچھے پڑتے ہیں وہاں بارش کم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جولائی اور اگست کے مہینہ میں بمبئی کے ساحل پر اور کیرل میں آسام کی پہاڑیوں پر اور ہمالہ کے دامن میں ۸۰ انچ سے زیادہ بارش ہوتی ہے اس لیے کہ یہ سب حصے ہوا کے رخ پر پڑتے ہیں۔ دکن کے پٹھار یا پلیٹوں میں بارش کم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہوا کے پیچھے ہے۔

۴۔ مصنوعی بارش

پچھلے دنوں امریکہ میں ایک سال موسم بہت گرم ہو گیا تھا۔ اس سال امریکہ کے سائنسدانوں نے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اپنے ساتھ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لئے اور اوپر جا کر فضا میں انھیں بکھیر دیا۔ برف بکھرتے ہی بارش شروع ہو گئی اور اچھی خاصی بارش ہوئی۔

فضا میں سلور آئیوڈائڈس چھڑکنے سے بھی بارش ہوتی ہے۔ اس طرح موسم خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں یہ تجربہ ابھی کامیاب نہیں ہوا ہے۔ سنا ہے روس میں اس سلسلے میں تجربے ہو رہے ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ مصنوعی بارش کا کوئی سستا ذریعہ ڈھونڈ نکالا جاسکے۔

عام طور پر بارش کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ سائکلون کی بارش۔
۲۔ پہاڑوں کی بارش۔
۳۔ بھاپ والی بارش۔

سائکلون کی بارش اس جگہ ہوتی ہے جہاں سائکلون آتے ہیں جیسے ساحلی علاقوں میں گنگا کے میدان میں۔

پہاڑوں کی بارش پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سمندر سے آنے والی ہوا سیدھی پہاڑ تک پہنچ جاتی ہے اور وہاں اوپر اٹھ کر اسے پار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس دوران میں اُسے ٹھنڈی ہوا مل جاتی ہے اور اس کی نمی بارش کی شکل میں گرنے لگتی ہے۔ چیراپونجی میں جو بارش ہوتی ہے وہ پہاڑی بارش ہے۔ چیراپونجی بالکل ہوا کے سامنے پہاڑ کی اونچائی پر ہے اس لئے وہاں بہت کثرت سے بارش ہوتی ہے سال میں ۴۴۸ انچ کا رکارڈ ہے اور ایک دن میں ۴۸ انچ کا رکارڈ ہے۔ ●

سیب کی پیداوار

سیب ہمالیائی خطے میں پیدا کیا جانے والا اہم پھل ہے۔ زیادہ پیداوار اور برآمدات کے مقصد سے حکومت کی توجہ اب اس طرف مبذول ہوئی ہے۔ سیب ان ۳۴ "خصوصی توجہ والی اشیاء" کی فہرست میں داخل ہے جن کی نشاندہی وزارت تجارت کے تحت ایک بورڈ نے کی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں قائم کردہ زرعی اور ڈبہ بند خوراک برآمدات اتھارٹی (اے پی ای ڈی اے) نے کم وقت میں تازہ پھلوں کی برآمدات کو فروغ دینے کے اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔

بھارت میں سیب برآمدات کے زبردست امکانات ہیں کیونکہ بھارت، شمال مشرق ایشیاء، آسٹریلیا، مشرق وسطیٰ اور جنوب ایشیاء کو سیب نہایت آسانی سے برآمد کرسکتا ہے۔ اتنی آسانی سے امریکہ اور آسٹریلیا سیب برآمد نہیں کرسکتے بھارت یوروپی منڈی میں بھی سیب کی قسم کی بنا پر مقابلہ کرسکتا ہے کیونکہ گھریلو منڈی میں خواہ اس کی قیمت کم ہی کیوں نہ ہو، مغرب میں یہ قسم بہت مقبول ہے۔ سیب برآمدات کی نقد معاوضہ امداد (سی سی ایس) بہم رسانی لائسنس (آر ای پی) کی سہولیات حاصل ہیں۔

آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران باغبانی ترقیات شعبے کے لیے ایک ہزار کروڑ روپئے کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ اس رقم میں ۸۵ کروڑ روپئے کی وہ رقم بھی شامل ہے جس کی تخصیص گرم آب و ہوا والے علاقے اور خشک و نیم رطوبت والے علاقوں میں اس طرح کے پھلوں کے لیے مربوط ترقی لانے کے لیے کی گئی ہے۔ گذشتہ ۲۰ برسوں میں سیب کی صنعتوں میں تیز رفتار ترقی عمل میں آئی ہے۔ حکومت نے سیب کی پیداوار و ترقی کیلیے بڑے پیمانے پر اقدامات کیے ہیں۔ ●

ڈاکٹر قمر الدین

آزاد ہندوستان اور منصوبہ بند تعلیمی ترقّی

تقسیم ملک کے بعد جمہوری نظام کو چلانے اور آئین کی دی ہوئی آزادی اور بنیادی حقوق کے نشے میں سرشار عوام کی عظیم قوت کو تعمیری کاموں میں لگانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ملک کو جہالت، غریبی اور بے روزگاری کے غار سے نکال کر تعلیم کی روشنی سے روشناس کرایا جائے اس مقصد کی تکمیل کے لیے پانچ سالہ منصوبوں میں خصوصی رقم اور مخصوص پروگرام رکھے گئے۔ ملک کے رہنماؤں کو پہلے منصوبے کے پانچ سالوں میں جو کچھ حاصل ہوسکا اس پر اکتفا کیا اور پھر دوسرے منصوبوں میں باقی کام کو پورا کرنے کا تہیہ کیا۔ اس طرح بقول شاعر:۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھ آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں اک پل نہ ہو

اس طرح زندگی کے دوسرے ترقیاتی کاموں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی ملک آگے بڑھتا رہا۔ اگر تعلیمی ترقی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں تو یہ دیکھ کر خوشی، حیرت اور اپنی قوت کارکردگی پر فخر ہوتا ہے کہ جو ملک حصول آزادی کے وقت تعلیم کے میدان میں کسی شمار میں نہیں تھا آج وہی ملک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد آزاد ہونے والے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں اس کا شمار

کے ملکوں میں ہوتا ہے اور یہ

یں جب کہ آزادی کے وقت

سینکڑوں مسائل منھ پھاڑے

تقریباً نہ ہونے کے برابر تھ

ٹکنالوجی میں ہماری حیثیت تقریباً برا

بے روزگاری اور غریبی کا دیو منھ پھاڑے کھڑا تھا۔ ایسے حالات میں تعلیمی ترقی کے لیے ہر ممکن وسیلہ اپنایا۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کمیشن اور کمیٹیاں بٹھائیں۔ ۱۹۶۸ء میں پہلی قومی تعلیمی پالیسی متعین کی۔ واردھا اسکیم کے تحت بیسک تعلیم کی ابتدا کی۔ ملک کے آئین میں ۶ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کے لیے تعلیم کو لازمی اور مفت کردیا گیا۔ تعلیم کو عام آدمی تک پہنچانے کے لیے رسمی اور غیر رسمی ہر وسیلے کو اپنایا۔ عورتوں اور سماج کے غریب طبقوں تک تعلیم کی روشنی کو پہنچانے کے لیے خصوصی انتظام اور رعائتیں مہیا کی گئیں حتّٰی کہ ۱۹۵۱ء میں جن ابتدائی اسکولوں کی تعداد محض ۲،۲۲ لاکھ تھی وہ ۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ۱۰،۷ لاکھ تک پہنچ گئی ۱۹۵۱ء میں جن اساتذہ کی تعداد ابتدائی اسکولوں کے لیے ۶،۲۴

اسی تناسب سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ کالجوں کی تعداد تقریباً ...۷ اور یونیورسٹیز کی تعداد تقریباً ۱۸۰ ہوگئی اور اس عظیم ملک کے تقریباً ہر گاؤں میں ایک کلومیٹر کے اندر اندر اسکول مہیا کردیا گیا۔ اس کے علاوہ کیندریہ ودیالیہ۔ نوودیہ ودیالیہ۔ سینک اسکول ٹکنیکل اسکول کھلے۔ غرض یہ کہ تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔ ایسے لوگوں کے لیے تعلیم میں خصوصی رعایت رکھی گئی جو اب تک تعلیم کے مواقع اور برابری کے حقوق سے محروم تھے۔ انسان کو ایک Positive asset اور ایک قیمتی قومی سرمایہ تصور کیا گیا۔ مجموعی طور پر اس کثیر الادیان۔ کثیر

الزبان ملک کی سالمیت اور ترقی کے لیے قومی یک جہتی، آزادی، سوشلزم اور جمہوری طرزِ زندگی کو مقصدِ حیات تصور کیا گیا بغرض یہ کہ معاشی ترقی اور سماجی بیداری و سماجی انصاف کے لیے تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ نظر آیا تاکہ ہم زندگی کے میدان میں خود کفیل ہو کر ترقی یافتہ ملکوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ خواتین چوں کہ زندگی کے ہر میدان میں بہت پیچھے تھیں، اس لیے سماج میں انھیں باعزت مقام دلانے کے لیے انھیں Vocational, Professional اور Technical تعلیم کے مواقع فراہم کیے گئے۔ SC اور STS کے لیے برابری اور سماجی انصاف مُہیا کرنے کے لیے انھیں زندگی کے ہر میدان میں خصوصی رعایت دی گئی اسی طرح اقلیتوں کے لیے خصوصی مواقع مہیا کیے گئے جن میں ایک اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی شامل ہے۔

۱۵ سال سے ۳۵ سال کی عمر کے لوگوں میں ناخواندگی دُور کرنے کے لیے ہر سطح پر مختلف وسائل اپنائے گئے اس کام میں تعلیمی اداروں کے ساتھ اخبار، ریڈیو، فلموں اور ٹی وی نے بھی اہم رول ادا کیا اور یہ علم محض برائے علم ہی مہیا نہیں کیا گیا بلکہ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ انھیں ملک کے جملہ ترقیاتی کاموں میں شریک کیا جائے۔

ہمہ جہت پروگرام

دوسری طرف تعلیم کو زیادہ مُوثر، مفید اور زندگی کے مسائل سے قریب تر لانے کے لیے ایسے Activity Board اور Child Centred بنایا گیا جس میں ہمت افزائی اور درس و تدریس کے پورے عمل میں بچّے کی شرکت کو اہمیت دی گئی اس کے لیے ماہرینِ تعلیم نے بہت غور و فکر کے بعد Every Childhood Care & Education (ECCE) کے تصور کو عملی شکل دینے کے لیے، مختلف اقدامات کیے۔ اور سیکھنے کے عمل کو بچّے کے لیے زیادہ دلچسپ، مُوثر اور بامقصد بنایا گیا۔ تعلیم کو زندگی کے قریب تر لانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ بچّے کی شخصیت کے مکمّل ارتقاء کے لیے اس کی شخصیت کے تینوں پہلوؤں یعنی Cognitive, Affective اور Psychomotor Domains پر توجہ دی گئی۔ اس میں First generation Learners کے سیکھنے کے عمل کو آسان اور ان کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا۔ ان کے Cognitive learning کو دھیرے دھیرے بڑھایا گیا۔ بچّوں کی صلاحیتوں کے مطابق سیکھنے کے عمل کو آسان بنانے کے لیے دیگر کئی اقدامات کیے گئے۔ خصوصی سہولیات بہم پہنچائی گئیں۔ تدریس کے مختلف طریقوں پر تحقیقی کام ہوئے۔ بچّوں کے لیے کتابوں اور تدریسی aids پر خاص توجہ دی گئی۔

مرکزی سطح پر NCERT صوبائی سطح پر SCERTS اور ضلعی سطح پر DIETS کا قیام عمل میں آیا۔ اُستادوں کی تربیت کے ہمہ گیر اور ملک گیر پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے ملک کے کونے کونے میں اساتذہ کی تربیت کے ادارے کھلے۔ تدریس کو موثر، مفید، دلچسپ اور زندگی سے قریب تر لانے کے لیے تحقیق کی گئی۔ اساتذہ کے لیے ملازمت سے پہلے اور دورانِ ملازمت تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک سے تعلیم کے میدان میں روابط بڑھے۔ ایک National Council of Teacher Education کا قیام عمل میں آیا۔ ہر سال ٹیچرز ڈے منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اساتذہ کی ہمت افزائی کے لیے نیشنل اور اسٹیٹ اوارڈز رکھے گئے انھیں سماج میں ایک باعزّت مقام دلانے کے لیے ان کی معاشی خوش حالی کو بھی مدِ نظر رکھا گیا۔ آگے بڑھنے کے لیے مختلف مواقع فراہم کیے گئے اور قدیم ہندوستانی روایات کے مطابق تدریس کے پیشے کو ہر پہلو سے ایک باعزت اور پُروقار مقام عطا کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔

لڑکیوں کی تعلیم

خواتین کو سماج میں ایک باعزت مقام دلانے اور انھیں ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر کا شریک بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے۔ مثال کے طور پر خواتین اور بچّوں کی ترقی کے مختلف پروگراموں کے لیے ۹۳ - ۱۹۹۲ء کے بجٹ میں ۴۵۰ کروڑ روپیہ کا انتظام کیا گیا۔ ان کی صحت، تعلیم اور زندگی کے مختلف میدانوں میں تربیت کے لیے متعدد اسکیمیں چلائی گئیں۔ خصوصی طور پر تعلیم میں ۱۱ سے ۱۸ سال کی لڑکیوں کا Drop out rate کم کرنے کے لیے اس وقت ملک کے ۵۰۷ بلاکوں میں خصوصی پروگرام چل رہے ہیں جن سے تقریباً ساڑھے چار لاکھ لڑکیاں مستفید ہوں گی۔ ان میں زیادہ تر وہ لڑکیاں ہیں جن کا تعلق سماج کے کمزور اور غریب طبقات سے ہے۔ تعلیم کو عام شخص تک پہنچانے اور انھیں مختلف سہولیات فراہم کرنے کے لیے ملک بھر میں Integrated Child Development Service (ICDS) کے تحت آنگن واڑی کے کارکنان مقرر کیے گئے۔ خواتین کی ترقی، ان کے خلاف سماجی

جرائم کو کم کرنے کے لیے National Commission for Women, اور National Credit Fund for Women, Indira Mahila Yojana کی ابتداء کی گئی۔ نیز خواتین کو قانونی امداد بہم پہنچانے کے لیے Legal Literacy Manual for Women کا اجراء عمل میں آیا۔ لڑکیوں کو سماج میں بہتر مقام دینے کے لیے A National Plan For the SAARC Decade کی ابتداء کی گئی۔

قومی یک جہتی

قومی یک جہتی کے تصور کو مضبوط بنانے، ملک کے دیہات میں موجود عظیم صلاحیتوں کو تلاش کرنے اور انھیں بڑھاوا دینے نیز ملک کے غریب اور کمزور اور تعلیم سے محروم طبقات تک معیاری تعلیم کو پہنچانے کے لیے نوودیہ ودیالیہ شروع کئے گئے اور یہ طے کیا گیا کہ ملک کے ہر ضلع میں ایک ایسا نوودیہ ودیالیہ قائم کیا جائے جو مکمل رہائشی ہو اور جس میں تعلیم مکمل طور پر مفت دی جائے۔ ان اداروں میں زیرِ تعلیم طلبا اور طالبات کی ایک خاص تعداد کا تبادلہ ملک کے ایک حصہ کے ودیالیہ سے دوسرے حصے کے ودیالیہ کو کر دیا جائے جس سے قومی یک جہتی کے تصور کو عملی شکل دی جا سکے۔ ایک Common Core Curreculum کا تصور بھی پیشِ نظر رکھا گیا تاکہ ملک میں یکساں نصاب تعلیم و تدریس کے تصور کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ تعلیم کو عام کرنے اور ہر فرد تک اس کی برکتوں کو پہنچانے کے لیے ایک Minimum Level of Learning کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔

امتحان کی اصلاح

پورے تعلیمی نظام میں امتحان کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ بچے کی سیکھنے کی رفتار کیا ہے، بچہ تدریس کے عمل میں کتنا حصہ لیتا ہے اور اگر کم حصہ لیتا ہے یا بالکل نہیں لیتا تو ایسا کیوں ہے اس کی سیکھنے کی رفتار میں کن اقدامات کے ذریعہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ امتحان کن کن طریقوں سے لیا جا سکتا ہے۔ نیز امتحان سے خوف والے پہلو کو دور کر کے اسے کس طرح دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ ان اور ایسے متعدد اہم سوالوں پر غور کیا گیا اور تقریباً ۳۰ سال پہلے NCERT کے قیام کے ساتھ ساتھ امتحان کی اصلاح کا شعبہ وجود میں آیا۔ اس و... surement Education and Data Processing کے نہایت اہم خدمات انجام ... کے کل سیکنڈری اور سینیئر سکنڈری بورڈوں کے طریقہ امتحان کی اصلاح میں اس شعبے نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اس حد تک کہ اس نے اسکولوں، کالجوں اور ملک کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو بڑے پیمانے پر تربیت دی ہے ملک میں Air Force، Army، Navy اور پولیس کے مختلف شعبوں کو امداد بہم پہنچائی ہے حتیٰ کہ اس سلسلے میں ترقی پذیر ممالک کے اساتذہ اور تعلیم کے شعبہ میں مختلف عہدوں پر کام کرنے والے افراد کی تربیت کی ہے۔ اس شعبہ نے ملک کے کونے کونے میں امتحان کی اصلاح کے پیغام کو عام کیا ہے اور ملک کے طول و عرض میں تعلیمی اداروں اور افراد کے ساتھ ملک بڑے پیمانے پر لٹریچر کی تیاری میں مدد دی ہے جن میں کتابیں۔ تحقیقی مقالات۔ تحقیقی مضامین Unit Tests امتحان کے مثالی پرچے وغیرہ نہ صرف خود شعبہ میں تیار کئے ہیں بلکہ ملک بھر میں ان کی تیاری میں مدد دی ہے۔

ملک میں تعلیم کے مختلف پہلوؤں، اسکولوں، کلاس روم، اساتذہ اسکول میں موجود سہولیات وغیرہ وغیرہ مسائل کا جائزہ لینے کے لیے Educational Surveys کرائے گئے ہیں۔ ان میں تعلیم کے ہر پہلو کو مدِنظر رکھا گیا ہے اس کی رپورٹیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ جن کی روشنی میں حکومتِ ہند نے اپنے اقدامات، تعلیم کے میدان میں اپنی [illegible]

میڈیا کا رول

تعلیم کو عام آدمی تک پہنچانے کے لیے Media کا رول اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا NCERT دہلی میں سب سے پہلے Centre of Educational Technology کی ابتداء کی گئی۔ جس میں تعلیم کو بہتر، مفید، موثر، زیادہ کارآمد اور زندگی سے زیادہ قریب کرنے کے لیے T.V. فلم اور ریڈیو کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا اور اس طرح Self Distance Learning، Continuing Education learning کے ساتھ ساتھ فلم وغیرہ کو استعمال کر کے تعلیم کو نہ صرف دلچسپ اور مفید بنایا گیا بلکہ اسے عام آدمی تک زیادہ بہتر، موثر اور

آسان طریقے سے پہنچا دیا گیا جس سے نہ صرف عام آدمی کی معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ اس سے ملک میں جمہوری زندگی میں لوگوں کی شرکت بڑھی اور مجموعی طور پر جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ کھیتی کی پیداوار میں اضافہ ہوا اس حد تک کہ ملک اس میدان میں خود کفیل ہو گیا۔ صنعتی ترقی ہوئی اور اس سے ملک کا ہر فرد و بشر مستفید ہوا اور ملک کی تعمیر و ترقی میں عام آدمی کی شرکت میں اضافہ ہوا۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں چھپے ہوئے Talent کو جلا ملی۔ درسی کتابوں کے تعلیمی مواد کو رٹنے کا رجحان گھٹا اور حقیقی معنی میں صلاحیتوں کو ابھرنے، چمکنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا اور ان غیر معمولی صلاحیتوں سے نہ صرف ملک کو غیر معمولی فائدہ ہوا بلکہ متعدد ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک نے بھی ان سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا اور فائدہ اٹھانے کا یہ عمل آج بھی جاری ہے اور ملک کے ان نونہالوں نے دنیا کے کونے کونے میں ملک کا نام روشن کیا ہے۔

موجودہ صورتِ حال

غرض یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ ۱۹۴۷ء سے آج تک کی تعلیم کے میدان میں ہماری جہدِ مسلسل اور اس کے نتائج کا۔ اس میدان میں حکومت ہند کا حصول ہر لحاظ سے قابلِ ستائش اور قابلِ مبارکباد ہے اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں اس صدی میں آزاد ہونے والے ممالک میں ہم شاید کسی سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں بلکہ ہم بعض معاملات میں تو ترقی پذیر ممالک سے آگے نہیں تو ان کے برابر تو ہیں بلکہ ہم آج انھیں کچھ دینے کی پوزیشن میں بھی آ گئے ہیں۔ اور اندرونِ ملک زندگی کے ہر میدان میں آج ہمیں نمایاں ترقی نظر آتی ہے۔ تعلیم کے نتیجے میں کمزور طبقات آگے بڑھے ہیں۔ ان کا معیارِ زندگی بہتر ہوا ہے ان میں Awarness بڑھی ہے اور اب عام آدمی ملک کی تعمیر و ترقی کے ہر میدان میں عملی حصّہ لے رہا ہے۔ خواتین میں تعلیم بڑھی ہے۔ بیداری آئی ہے۔ وہ مقابلتاً زیادہ خود کفیل اور ملک کی ترقی میں زیادہ مفید اور مؤثر رول ادا کر رہی ہیں آج انھیں زندگی کے مشکل سے مشکل میدان میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ بعض معاملات میں تو وہ مردوں سے کافی آگے نکل گئی ہیں۔ غریبی کم ہوئی ہے۔ سماجی نابرابری اور چھوت چھات تقریباً آخری حدوں کو چھو رہی ہیں۔ روزگاروں میں اضافہ ہوا ہے اور غریب امیر کا فرق بہت کم ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر زندگی کے ہر میدان میں تعلیم کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

اب کیا کریں

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اپنی منزل پالی بلکہ ہم نے اب تک جتنا کچھ کیا ہے اس سے کہیں زیادہ کرنا باقی ہے۔ تبھی ہم فخر کے ساتھ اپنا سر اونچا کر کے ۲۱ویں صدی میں داخل ہو سکیں گے اور باپو کے حسین خواب کو پورا کر سکیں گے۔ خصوصاً اس خواب کا وہ پہلو جس میں روحانی اور اخلاقی ترقی شامل ہے جس میں ہم کچھ پیچھے ہوتے نظر آ رہے ہیں یا شاید اس پورے منصوبہ بند ترقی کے عمل میں ہم سے کچھ بھول ہو گئی ہے۔ شاید ہم نے معاشی ترقی کو روحانی اور اخلاقی ترقی سے زیادہ اہم تصور کر لیا ہے یا شاید ہم محض معاشی ترقی کو ہی ترقی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس مسئلے کی تفصیلات میں جانے کا تو یہ موقع نہیں ہے لیکن یہ مسئلہ اصحاب فکر کے لیے قابلِ غور ضرور ہے اس لیے کہ وہ اخلاقی، سماجی اور انسانی قدریں جن پر ہماری قدیم تہذیب کو ناز تھا شاید کہیں گم ہوتی نظر آ رہی ہیں اور بقول شاعر:

جنونِ زر یونہی بڑھتا رہا تو یہ دنیا
فنِ لطیف کو شعر و سخن کو ترسے گی
یونہی بگڑتا رہا نظمِ زندگی تو حیات
کبھی خلوص کبھی بانکپن کو ترسے گی

اس لیے کہ اس ترقی کے باوجود آج ہمارے ذہن روز افزوں کھچاؤ کا شکار ہو رہے ہیں۔ لالچ، ہوس، احساس ذمہ داری کی کمی، خلوص، ایمانداری اور بڑوں کی عزّت و توقیر کا وہ احساس کہیں گم ہوتا نظر آ رہا ہے جس کی ہمیں آج سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جس کی طرف اگر ہم نے فوری توجہ نہ دی تو ہم بہت بڑے نقصان سے دو چار ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ Character Formation تعلیم کے حصول کا ایک اہم پہلو ہے جس میں چند اخلاقی، سماجی اور روحانی قدروں کا ارتقا ضروری ہے۔ ●

عظیم اقبال

پانچ دوست، پانچ دشمن

آج ہی نہیں، ہمیشہ سے ہی ایسے افراد کی افراط رہی ہے جو کسی دوست کے نہ ہونے کا شکوہ کر کے سارے زمانے کو اپنا دشمن ٹھہراتے ہیں۔ دوست کا ہونا خوش بختی کی علامت سہی ہے تو دشمن کے وجود کو بدبختی تصور کیا گیا ہے۔ ذرا سوچئے، اگر آپ کے ایک نہیں، پانچ دوست ہوں تو لوگ کیا آپ کی قسمت پر رشک نہیں کریں گے؟ دوسری طرف، اگر کسی کے پانچ دشمنوں کا سراغ ملے تو اُس شخص کے لئے کیا آپ افسردہ خاطر نہ ہوں گے؟

آپ کے لیے اپنے پانچ دوستوں سے واقفیت ضروری ہے تو کسی اور کے پانچ دشمنوں کا علم بھی اہم ہے۔ اپنے پانچ دوستوں کو خوش آمدید کہیئے لیکن کسی کے ۵ دشمنوں سے پناہ بھی مانگیے۔

آئیے، آپ کے پانچ دوستوں سے آپ کا تعارف کرائیں۔ آپ کے پانچ دوست ہیں —— ہنسی، پیار، امید، رجائیت اور خود اعتمادی۔ کسی کے پانچ دشمن جو خدانہ کرے کبھی آپ کے بھی دشمن ہو جائیں۔ اس طرح ہیں۔ غصہ، خوف، جرم، اکتاہٹ اور اُداسی۔

آپ کے مثبت رجحانات آپ کے حلیف ٹھہرے تو منفی رویے کو حریفوں کے جانے میں ڈال کر آپ کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ آپ کے ہم نوا قدم بہ قدم سازگار ہوں گے تو آپ کے مخالف بہر طور زیاں کار ثابت ہوں گے۔

آپ کی ہنسی نہ صرف آپ کی ہے بلکہ یہ دوسروں کے۔ بقول شاعر؎

سب سے ہنس کر ملنے والے
دنیا ہے محبوب ہمیں، اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

چارلس ویگر کے بقول —— خوشی، خارجی نہ ہو کر داخلی ہوتی ہے۔ اِس لئے خوشی کی تلاش باہر نہیں، اپنے اندر ہونی چاہیئے جو رنج کے مقام پر بھی خوشی کا دامن نہیں چھوڑتے، دراصل وہی جینے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ ہر مَن میلول کے بقول —— ساری ناپسندیدہ چیزوں کا آسان ترین جواب، بس ایک ہنسی ہے!

لہٰذا، عجیب اور انوکھی باتوں پر دل برداشتہ ہونے کی بجائے ہنسنا سیکھیے اور معروف شاعر داغؔ کی دُعا آپ بھی دُہرائیے۔

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی میں خوشی میں گزار دے

ہنسی کی ہم نوائی کے ساتھ پیار کو بھی اپنائیے چلیے۔ اپنوں سے پیار کیجیے، غیروں سے پیار کیجیے، سب سے پیار کیجیے۔ پیار دیجیے گا تو پیار پائیے گا۔ پیار سے لوگوں کا دل جیتیے۔ پیار کا جذبہ آپ کی آ[illegible]

اور دوسروں سے پیار درخت کے تنے کا سے ہیں۔ مذہب ہو یا فلسفہ، سب نے پیار کا درس دیا ہے۔ پیار آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد دوست ہے۔

ہنسی اور پیار کی صف میں امید کو بھی جگہ دیجیے۔ امید نہ ہو تو زندگی بے لطف بن جائے گی۔ امید وہ وسیلہ ہے جس سے ناکامی کو کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اُمید سے محرومی زندگی سے محرومی کے مترادف ہے۔ آئے کوکا (IACCOCA) اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہے۔

"میں نے اپنی زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ آدمی چلتا رہے۔ حتیٰ کہ برے وقتوں میں بھی۔ آدمی مایوس نہ ہو، حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب کہ اس کی دنیا منہدم ہو رہی ہو۔"

جہاں اُمید ہے، وہیں منزل ہے۔ اُمید

گیج-۱، بتیا، بہار

اچھی چیزوں کی ہوتی ہے۔ یہ رنج و غم کا مداوا ہے۔ بقول ڈی، ایس، ایلیٹ۔

"وقت سارے رنج والم کی شدت میں کمی لاتا ہے۔"

اُمید سے رجائیت پیدا ہوتی ہے۔ رجائیت، فکر کی ایک ہیچ ہے، جس سے تاریکی میں بھی روشنی نظر آتی ہے۔ فرانسیسی ادیب اور فلسفی ژاں پال سارتر کے الفاظ ہیں۔

"سب کچھ ضائع ہونے کے باوجود مستقل نا وجود برقرار رہتا ہے۔"

رجائیت کی تدریس کے لیے ڈیل کارنیگی سے رجوع کریں تو اُس کا مشورہ ہوگا۔

"سویرے بیدار ہو کر بستر سے چھلانگ لگاتے ہوئے چیخیے، ایک دوسرا شاندار دن! آپ کامیاب ہوں گے۔"

اُمید اور رجائیت سے زندگی میں خود اعتمادی آتی ہے۔ اس سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد ملتی ہے۔ آپ کی خود اعتمادی آپ کو اپنے نشانے کے قریب لائے گی۔ تھامس ایکسٹن کے خیال میں۔

"معمولی صلاحیت لیکن غیر معمولی استقلال سے ہر چیز کا حصول ممکن ہے، موقع ملے تو آزمودہ کار پانچ دوستوں کو آپ بھی آزمائیے۔"

جن پانچ ممکنہ دشمنوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی ہے، ان میں غصہ کو اوّلیت حاصل ہے۔ شرعاً اسے ناروا اور ناجائز ہی نہیں، حرام بھی ٹھہرا گیا ہے۔ ماہرین کا اتفاق ہے کہ جملہ جرائم کا ارتکاب غصہ کی حالت میں ہی ہوتا ہے۔ خفگی کے عالم میں آدمی کی سوچ، سمجھ کُند ہو جاتی ہے، صحیح یا غلط کی تمیز نہیں رہتی، بھلے، بُرے کی پہچان نہیں ہو پاتی۔ انجام کار، غصہ سے تباہی اور بربادی آتی ہے۔ اسی لیے چینی مفکر کنفیوشس نے خبردار کیا ہے کہ "جب برافروختہ ہوں تو اس کے نتائج پر بھی غور فرمالیں۔"

غصہ سے آپ کچھ نہیں پاتے، لیکن بہت کچھ کھو دیتے ہیں۔ غصہ کوئی استدلال نہیں۔ اسی لیے ڈینیل ویبسٹر (DANIEL WEBSTER) ذہنی توازن سلامت رکھنے کی رائے دیتا ہے۔

"غصے میں مبتلا شخص ذہنی طور پر صحت مند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر کیرول ٹیوریس (CAROL TAVRIS) نے اپنی تصنیف: "ANGER, THE MISUNDERSTOOD EMOTION" میں تحریر کیا ہے۔

"صحت مند لوگ ذہنی توازن برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ متوازن ہونے تک وہ ایسا خیال ہٹا دیتے ہیں، وہ اپنے غصے کی کیفیت کو تسلیم کرتے ہیں اور کُھلے عام جسمانی طور پر یا باتوں سے وہ مخالفت پر آمادہ نہیں ہوتے۔"

جامعہ کینٹکی (KENTUCKY) میں عصبیاتی سائنس داں فلپ ڈبلو لینڈ فیلڈ کے بقول حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ مخالفانہ رویے سے عارضۂ قلب کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

غصہ کے اظہار سے، اڈرینل غدود دونوں (ADRENAL GLANDS) کے ذریعے CORTISOL اور ADRENALINE جیسے ہارمونوں کے خون میں مسلسل اخراج کے زیر اثر زائد خون کے دباؤ سے لے کر سرطان جیسے مہلک امراض کے لاحق ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس ضمن میں فلپ لینڈ فیلڈ گویا ہیں۔

"PROLONGED EXPOSURE TO THE HORMONES HAS PREVIOUSLY BEEN LINKED TO HIGH BLOOD PRESSURE, OSTEOPOROSIS, CORONARY ARTERY DISEASE AND PERHAPS EVEN CANCER"

ظاہر ہے، غصہ آپ کا ایک زبردست دشمن ہے۔ اس کی عتاب سے بچنے کی کوشش جاری رکھیے۔

غصہ کے بعد خوف کی عداوت سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ خوف بھی ایک عصبی رجحان ہے جو آپ کو اپنی نظر میں بے وقعت بنا دے گا، آپ کی خود اعتمادی جاتی رہے گی اور خود ترسی کا شکار ہو کر آپ ہر وقت رنجیدہ خاطر رہیں گے۔

خوف کی مختلف صورتیں ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

بے یاری سے مدارات سے جی ڈرتا ہے
حال کیا بات ہے، ہر بات سے جی ڈرتا ہے
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
اتنا رویا ہوں غم دوست، ذرا سا ہنس کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

خوف سے ہزار ہا واہموں اور وسوسوں کا جنم ہوتا ہے۔ یہ واہمے اکثر بے بنیاد ہوتے ہیں۔ خوف، موت کا ہو یا مستقبل کا، بیماری کا ہو یا بیکاری کا، حقیقی ہو یا تصوراتی — آپ کے لیے ضرر رساں ہے۔ خوف سے نجات پانے کی خاطر اپنی سوچ میں تبدیلی لانے کے لیے کوشاں رہیے۔

بیشتر جرائم کو خفگی یا خوف سے تحریک ملتی ہے۔ جرم کا ارتکاب بدبختی کا جتنا پیش خیمہ بنتا ہے، احساس جرم بھی اتنا ہی پریشان کن ہوتا ہے۔ قانون کی نظر میں مجرم معصوم بن سکتا ہے، لیکن اپنے ضمیر سے آنکھ ملانے کی جرأت وہ نہیں کر سکتا۔ وہ بے خوابی کا شکار ہو سکتا ہے اور اس میں خودکشی کا میلان بھی پروان چڑھ سکتا ہے۔ ایک ضرب المثل ہے۔

"آپ برائی سے دست بردار ہوں تو برائی بھی آپ سے دست بردار ہو جائے گی۔"

یاد رکھیں، جرم جیسے حریف سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے۔

اُکتاہٹ (BOREDOM) بھی ایک رقیب روسیاہ سے کم نہیں۔ اسے اپنی زندگی میں

باقی صفحہ ۳۱ پر

ڈاکٹر اقبال محی الدین

شہید اُدھم سنگھ

۱۳ مارچ ۱۹۴۰ کے دن لندن کے کیکسٹن ہال میں مائیکل اوڈائر شان کے ساتھ ہندوستان میں کیے گئے اپنے کارناموں کی خود تعریف کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک ہندوستانی نوجوان نے اپنی ریوالور نکال کر اوڈائر پر گولی داغ دی۔ وہ نوجوان سردار ادھم سنگھ تھا۔

سردار ادھم سنگھ شہید اپنے دوستوں کے حلقہ میں کئی ناموں سے موسوم تھے یعنی شیر سنگھ، اودے سنگھ، رام محمد سنگھ آزاد اور فرینک بریزل وغیرہ۔ انھوں نے ہندوستان کے مجاہدینِ آزادی کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا تھا۔ ہر ہندوستانی ان کے کارناموں پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔ ہماری مادرِ وطن کا ہونہار بیٹا ۲۸ دسمبر ۱۸۹۹ کو پنجاب کے سنگرور ضلع کے سُنام قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ان کے والد ٹہل سنگھ کمبوج ایک غریب کسان تھے۔ ان کے پاس تھوڑی زمین تھی جس میں کھیتی کر کے بہت مشکل سے ان کا اور ان کے بال بچوں کا گذر ہوتا تھا۔ مجبوراً انھیں ریلوے میں چوکیداری کی نوکری کرنی پڑی جو ریلوے کراسنگ اپالی گاؤں میں تھی۔ وہیں وہ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ قلیل آمدنی میں ان کا بہت مشکل سے گزر ہوتا [illegible]

ان مشکل مالی حا[illegible]

ریلوے کراسنگ گیہ[illegible]

چھوڑ کر اچھے مستقل کی[illegible]

چلے گئے۔ ان کے ساتھ ان[illegible]

بیٹے سادھو سنگھ جس کی عمر سات سال تھی اور ادھم سنگھ جن کی عمر پانچ سال تھی وہ بھی امرتسر چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ٹہل سنگھ سخت بیمار ہو گئے اور بیماری کا سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ آخر کار وہ موت کی آغوش میں سو گئے۔ اب یہ دونوں بچے سادھو سنگھ اور ادھم سنگھ یتیم اور بے سہارا رہ گئے۔

یہ دونوں بے سہارا بچے اِدھر اُدھر ہیتیوں کے ساتھ گھومتے رہتے تھے۔ ایک روز چندر را سنگھ نے جو سُنام قصبہ کے مذہبی رہنما تھے انھیں پہچان لیا اور اپنے رسوخ سے ان بچوں کو سکھوں کے یتیم خانہ پتلی گھر، امرتسر میں داخل کرا دیا۔ کچھ روز کے بعد ادھم سنگھ کے بڑے بھائی سادھو سنگھ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب چھوٹا بچہ ادھم سنگھ اکیلا ہی زندگی سے جدوجہد کرنے کے لیے رہ گیا۔ یتیم خانہ [illegible]

[illegible] ان کو انگریز حکمرانوں سے نفرت پیدا ہونے لگی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور ہندوستان میں سودیشی تحریک بڑھتی گئی اور ہندوستانیوں کا غصہ انگریزی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف بڑھتا ہی گیا۔ اُدھر انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مراعات سے محروم کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ذاتی شہری آزادی تک چھیننا شروع کر دیا اور ناقابلِ قبول رولٹ ایکٹ کا نفاذ بھی شروع کر دیا جس سے سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

ملک کے ان سیاسی حالات کے پیشِ نظر قومی رہنما جیسے ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دوسرے رہنماؤں نے بیساکھی کے تہوار کے موقعہ پر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کو جلیانوالہ باغ، امرتسر

۵۲- بی (ڈی)۔ ڈی۔ اے فلیٹ فیس ۱۔ قطب انکلیو، اپوزٹ قطب ہوٹل۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

میں لوگوں کو اکٹھا ہونے کی اپیل کی تھی تاکہ وہیں بیساکھی کا تہوار بھی مِل جُل کر منایا جائے اور لوگوں کو انگریزوں کے مظالم کی داستان بھی سُنائی جائے اور آزادی حاصل کرنے کی راہ پر بھی غور وخوض کیا جائے ۔ اس عظیم مجمع کو مخاطب کرنے کیلئے مشہور شعراء، تاریخ داں اور مشہور سیاسی رہنما پہلے سے طے کر دیئے گئے ۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی نے انگریزی حکومت سے چھٹکارا پانے پر متفقہ رائے کا اظہار کیا تھا۔ جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں جھنڈ کے جھنڈ جلیانوالہ باغ کی طرف آنے لگے ۔ نقاروں کی چوٹ پر اعلان کیا گیا کہ مذہبی رہنما اور دوسرے سیاسی نوجوان بھی اس عظیم مجمع کو مخاطب کریں گے ۔ اس اعلان کے بعد ہی جُوق در جُوق لوگوں کا تانتا جلیانوالہ باغ کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا ۔

لیکن مائیکل اوڈائر جو اس وقت پنجاب کے گورنر تھے اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ہندوستانیوں کو بیساکھی کا تہوار جلیانوالہ باغ میں نہیں منانے دیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ مذہبی جلسہ نہیں تھا بلکہ سیاسی جلسہ تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جو اس جلسہ میں شریک ہوگا اس کو موت کی سزا دی جائے گی ۔ انھوں نے بریگیڈیر جنرل ہنری ڈائر (جو جالندھر میں مقیم ملٹری کمانڈر تھا) کی خدمات حاصل کیں اور حکم دیا کہ اس مجمع سے سختی سے نپٹا جائے کیوں کہ یہ ہندوستانی جلیانوالہ باغ میں بیساکھی کا تہوار منانے نہیں جمع ہو رہے ہیں بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے جمع ہو رہے ہیں جس کو حکومت برطانیہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی ۔

لوگ آتے گئے، مجمع بڑھتا گیا۔ جلیانوالہ باغ کا کونا کونا لوگوں کی بھیڑ سے بھرتا گیا۔ ادھر مائیکل اوڈائر کے غصّہ کا پارہ بھی چڑھتا گیا۔ اس نے مجمع پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس زمانے کا انگریز تاریخ داں RUPERT FURNEAUX لکھتا ہے۔

امرتسر میں قتل عام ۔ "گولی چلاؤ" کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے نہتے مجمع پر ۱۶۵۰ راؤنڈ گولیاں دس منٹ کے اندر چلادیں جس سے ۳۷۹ آدمی، عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے اور ۱۵۰۰ سے زیادہ لوگ بُری طرح زخمی ہو گئے لیکن مجمع کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی ۔ نہ تو ایک بھی پتھر پھینکا گیا اور نہ ہی لاٹھی چلائی گئی۔ کئی روز تک میدان اور سڑکیں لاشوں کے ڈھیر سے بھری رہیں اور سڑتی رہیں۔ پورے جلیانوالہ باغ میں خون کی ندی بہہ گئی۔ جانوروں اور چیل کوؤں نے انسانی گوشت سے پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔ کتّے اور گیدڑ ہر طرف گھومتے دکھائی دیتے تھے ۔ اور نوچ نوچ کر انسانی گوشت کھاتے تھے ۔ سردار اُدھم سنگھ بھی ان ہی زخمی ہونے والے ہندوستانیوں میں سے ایک تھا۔ اس واقعہ سے انھیں بیحد تکلیف پہنچی تھی ۔ مائیکل اوڈائر سے بدلہ لینے کا جذبہ اس میں کسی آتش فشاں کی طرح دھکنے لگا۔

کسی سیاسی پاداش کی وجہ سے اُدھم سنگھ کو حکومت برطانیہ نے قید کر دیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ اپنے آبائی وطن سُنام گئے لیکن وہاں بھی ان کو انگریزی حکومت کے سپاہیوں نے بیحد پریشان کیا ۔ مجبوراً انھوں نے طے کیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور باہری ملک میں چلے جائیں گے ۔ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ وہ یورپ اور امریکہ گئے ۔ امریکہ کے لوگوں کی وطن پرستی سے اُدھم سنگھ بہت متاثر ہوئے تھے۔ ہندوستان آکر وہ آزادی کے متوالے چندر شیکھر آزاد اور سردار بھگت سنگھ کے ساتھ ملک کی آزادی کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے ۔ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ ان کے پیچھے پڑ گیا اور آخر کار ایک روز حراست میں لے کر پانچ سال کے لیے قید کر دیا۔ قید سے رہائی کے بعد سردار اُدھم سنگھ انگلستان چلے گئے۔

۱۹۳۷ سے وہ انگلستان میں اس امید پر رہے کہ کبھی نہ کبھی ان کو مائیکل اوڈائر کو مار ڈالنے کا موقعہ ضرور ملے گا۔ جس نے جلیانوالہ باغ میں قتل عام کروایا تھا۔ سردار اُدھم سنگھ نے کاؤنٹی آف ڈیون شائر کے تھرسٹن نامی مقام کا پوری طرح جائزہ لیا جہاں مائیکل اوڈائر ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے لگا تھا۔ انھوں نے گھر کے نوکر اور ڈرائیور کا بھیس بدل کر تھرسٹن کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اوڈائر کے روزانہ کے پروگرام، آنے جانے، سونے جاگنے کے اوقات وغیرہ کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا تاکہ کسی موقعہ سے اس کو موت کے گھاٹ آسانی سے اتارا جا سکے۔

۱۳ مارچ ۱۹۴۰ کو مائیکل اوڈائر نے اپنا Kensington Home چھوڑا اور Royal Central Asian Society اور East India Association کی میٹنگ میں شرکت کے لیے Caxton ہال، لندن روانہ ہوا ۔ اس میٹنگ کو Sir Percy Sykes افغانستان پر تقریر کرنے والے تھے۔ اس میٹنگ کے چیرمین لارڈ ذیٹ لینڈ تھے۔

سـردار اُدھم سنگھ نے میٹنگ سے ایک شام پہلے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ "لندن کے لوگ کل شام ایک زبردست کارنامہ دیکھیں گے اور وہ کارنامہ اور عجیب واقعہ پوری حکومتِ برطانیہ کی بنیادوں کو ہلاکر رکھدے گا"۔ اس وقت ان کے دوست اُدھم سنگھ کی بات کو سمجھ نہ سکے ۔ میٹنگ کے صدر لورڈ زیٹ لینڈ نے اپنی تقریر ابھی شروع بھی نہیں کی تھی، کہ اُدھم سنگھ ہال کی بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے صف اوّل کے نزدیک اور ڈائس سے بہت قریب پہنچ گیا ۔

Sir Percy Sykes

نے اپنی تقریر ختم کی تو لوگوں نے ان کی تقریر پر تبصرہ شروع کردیا۔ اسی درمیان سر مائیکل اوڈائر اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے ہندوستان میں کیے گئے اپنے کارناموں کی خود تعریف شروع کردی۔ اور بہت سخت الفاظ میں ہندوستانیوں کے خلاف تقریر کی۔ جیسے ہی وہ اپنی نشست پر بیٹھنے لگے سردار ادھم سنگھ نے اپنا پستول نکال کران پر فائر کردیا۔ گولی لگتے ہی مائیکل اوڈائر زمین پر ڈھیر ہوگئے۔ اس طرح ۲۱ سال کے بعد یعنی ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ کو سردار اُدھم سنگھ نے جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کا بدلہ ہندوستانی عوام کے قاتل مائیکل اوڈائر سے لے لیا۔ Lord Lamington اور Sir Louis Dane بھی زخمی ہوئے۔ سردار اُدھم سنگھ اپنی جگہ کھڑے رہے اور برطانوی پولیس نے ان کو حراست میں لے لیا۔

سردار ادھم سنگھ کو جیل میں سخت اذیتیں پہنچائی گئیں لیکن ان کے اندر ہندوستان کی عظمت کا جذبہ قائم رہا جس نے ان کی ہمّت وعزم کو بلند رکھا۔ برٹش سرکار نے کہا کہ اگر وہ برطانوی حکومت کی عظمت کا سکّہ مان لیں تو انھیں رہا کردیا جائے گا۔ لیکن ملک کی عظمت کو قائم رکھنے والے عظیم آزادی کے متوالے ادھم سنگھ نے حکومت برطانیہ کی اطاعت کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے برٹش عدالت میں بیان دیا کہ " جنرل اوڈائر کا قتل کرکے ہم نے اپنے ہزاروں بھائیوں کے جیل، کالا پانی اور پھانسی کی سزا کا بدلہ لیا ہے۔ ہم نے جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی آہ و بکا کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔ انگریز دشمن سے بدلہ لینا ہی ہندوستانی نوجوانوں کا اب فرض بن گیا ہے۔ ہم نے جنرل ا... کو مارکر قوم کی خودی وعظ... کی ہے۔ میں نے اسے اس ... دل میں اوڈائر سے بدلہ ... کی طرح دھدھک رہا ... نہیں کہ مجھے دس سال، بیس سال ... کی سزا دی جائے یا پھانسی دے دی جائے۔ موت کا انتظار ہم ضعیفی تک کیوں کریں؟ مرنا ہے تو ملک کے لیے نوجوانی میں ہی کیوں نہ مریں؟ ہم نے برطانوی حکومت کے ظلم وستم کو ہندوستان میں دیکھا ہے۔ وہاں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ اور حکومت کی زیادتیوں سے مر رہے ہیں۔ مجھے جنرل اوڈائر کی موت کا کوئی غم نہیں ہے کیوں کہ ایسے ظالم کو تو بہت پہلے مار دینا چاہئے تھا جس نے نہتّے عوام پر جلیانوالہ باغ میں گولی چلوائی تھی اور سیکڑوں کو مروادیا اور ہزاروں کو زخمی کروادیا تھا۔

سردار ادھم سنگھ کو لندن کی اولڈ بیلی سینٹرل کرمنل کورٹ نے سزائے موت سنائی۔ جولائی ۱۹۴۰ کی " لاء رپورٹ" کے مطابق " بالآخر ادھم سنگھ، ایک شریف اور ہونہار مادرِ وطن کی آزادی کے متوالے کو ۳۱ جولائی ۱۹۴۰ کو سر مائیکل اوڈائر کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی"۔ اس طرح سردار اُدھم سنگھ کو وطن پر نچھاور ہوکر شہادت کا درجہ ملا۔

شہید اُدھم سنگھ نے اپنے کارنامے سے ہندوستان کی عظمت کو بہت بلند کردیا اور حکومتِ برطانیہ کو دکھادیا کہ ہندوستانیوں کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ جس کا جب جی چاہے ان پر گولی چلاکر آرام کی نیند سوئے۔ شہید ادھم سنگھ نے جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام ... ہوئی۔

آفریں ہے ایسے نہالِ وطن پر جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور اپنے بھائیوں کے جلیانوالہ قتل عام کا بدلہ انگلستان میں جاکر اوڈائر سے بھری محفل میں لے لیا۔ اس طرح ہندوستان کی عظمت میں چارچاند لگاکر وہ شہید وطن کہلائے اور مجاہدینِ آزادی کے متوالوں میں عظیم بنے۔ ملک کے ایسے شہیدوں پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

●

محمد رضی الدین معظم

مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی

تاریخی اوراق کے آئینہ میں

۱۸۸۱ — مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی یوپی کے ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۳ — سرسید کے کالج علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ماہ جولائی میں شہر علی گڑھ سے ماہنامہ رسالہ "اردوئے معلیٰ" جاری فرمایا جو اردو صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

۱۹۰۴ — بمبئی میں منعقدہ کانگریس کے ۲۰ویں اجلاس میں بحیثیت ڈیلیگیٹ شرکت فرمائی۔

۱۹۰۸ — اردوئے معلیٰ کے اپریل کے شمارے میں "انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کے موضوع پر شائع شدہ مضمون جس پر مضمون نگار کا نام نہ دینے کی پاداش میں ۲۳ جون کو مولانا کو علی گڑھ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور اردوئے معلیٰ بند ہو گیا۔

۱۹۰۹ — مولانا نے دوبارہ "اردوئے معلیٰ" جاری فرمایا۔

۱۹۱۵ — بمبئی میں منعقدہ آٹھویں مسلم لیگ کے اجلاس میں بحیثیت ڈیلیگیٹ شرکت فرمائی۔

۱۹۱۶ — دوسری بار ۱۳ اپریل کو مولانا پھر گرفتار کیے گئے اور ہمت پورہ جیل بھیج دیئے گئے، گرفتاری کی وجہ بتلانے سے انکار کیا گیا۔

۱۹۱۷ — مولانا انقلاب روس سے بیحد متاثر تھے اور ستیا بھگت کے ساتھ مل کر انڈین کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۸ — ۲۱ مئی کو مولانا جیل سے رہا کیے گئے اور وسط دسمبر مولانا اپنے وطن موہان تشریف لائے۔

۱۹۱۹ — مولانا نے "تذکرۃ الشعراء" کا ضخیم مجموعہ شائع فرمایا۔

۱۹۲۱ — احمد آباد میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں مولانا نے "آزادیٔ کامل" کے نعرہ کے ساتھ انقلاب آفریں اور تاریخ ساز اجتماع میں حاضرین محفل کو گرما دیا جس سے لوگوں میں جذبۂ آزادی پروان چڑھا۔ ۳۰ دسمبر کو احمد آباد میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی حاضرین محفل میں آزادیٔ کامل کے نعرے کے ساتھ جذبۂ آزادی کی تڑپ پیدا کی۔

۱۹۲۲ — ۱۴ اپریل کو تیسری بار مولانا پھر بغاوت کے الزام میں کانپور میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور احمد آباد جیل لائے گئے پھر عدالتی فیصلے تک سابرمتی جیل میں محصور رہے۔ ۱۱ جولائی کو بمبئی ہائی کورٹ نے مولانا کو تعزیرات ہند کے جرم سے بری کر دیا اور دفعہ ۱۲۴ کے تحت جرم کو برقرار رکھ کر ۱۱ نومبر کو مولانا بڑودہ جیل منتقل کیے گئے۔

۱۹۲۳ — ۱۱ اگست کو مولانا کو بڑودہ جیل سے رہا کر کے بمبئی لایا گیا پھر وہاں انھیں اپنے وطن جانے کی اجازت دی گئی۔

۱۹۲۵ — کانپور میں پہلی کیمونسٹ کانفرنس منعقد کی اور اپنے خطبہ استقبالیہ میں ہندوستان میں سوراج یعنی آزادیٔ کامل کے نعرہ کو بنیاد بنا کر جدوجہد آزادی کے عزم مصمم کو دہرایا۔

۱۹۲۶ — مولانا کا کانفرنس میں پیش کردہ گرانقدر خطبہ استقبالیہ "اردوئے معلیٰ" کے اپریل۔ مئی۔ جون کے شماروں کی زینت بنا اور عوام نے اس گرانقدر تحریری دستاویز سے والہانہ جذبات کے ساتھ خیرمقدم کیا۔

۱۹۲۷ — کانگریس کے مدراس میں منعقدہ اجلاس میں مولانا کی تجویز "آزادی کامل" کو خوب تقویت پہنچی۔

" محافظ الناشعین" ۸۶۲۔۳۔۲۰، رحیم منزل۔ شاہ گنج، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲ آندھرا پردیش

۱۹۲۸ــــ مولانا نے ایک اور اخبار "مستقبل" جاری فرمایا جو اپنے وقت کا عظیم سرمایہ تھا۔ قاری اس پر ناز کرتے تھے۔

۱۹۲۹ــــ لاہور میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں کثرتِ آراء سے مولانا کی تجویز "آزادیِ کامل" کو منظور کیا گیا۔ بالآخر اسی تجویز نے انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۳۱ــــ ۸ اگست کو الٰہ آباد میں منعقدہ جمعیۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور "آزادیِ کامل" کے ارادے پر اٹل رہے۔

۱۹۳۳ــــ نامساعد حالات کے باعث روزنامہ "مستقبل" آہستہ آہستہ دو روزہ، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ کے بعد ماہنامہ میں تبدیل ہو گیا۔

۱۹۳۶ــــ اپریل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں جسکی صدارت پریم چند، مشہور افسانہ نگار کر رہے تھے، پرزور طریقہ پر تحریک آزادی کو متحد و مستحکم بنانے پر سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

۱۹۳۸ــــ قاہرہ میں فلسطینی کانفرنس میں شرکت کر کے اپنی جدوجہد آزادیِ کامل قرارداد کو منظور کروا کر آزادی کے متوالوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔

۱۹۳۹ــــ حکومت برطانیہ کی دعوت پر لندن تشریف لے گئے وہاں بھی پھر "آزادیِ کامل" کے نعرہ کو دہراتے ہوئے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ انھیں صرف اور صرف آزادیٔ ہند کے بارے میں ہی فیصلہ قبول ہو گا۔

۱۹۴۶ــــ عام انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کانپور یو پی کے رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ ۹ دسمبر کو جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو مسلم لیگ نے ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں بنانے کے لیے مطالبہ کیا تو مولانا بے انتہا برہم و برافروختہ ہوئے اور شدت سے ملک کی تقسیم کی مخالفت کی۔

۱۹۴۷ــــ ۱۵ اگست کو جب ملک کی تقسیم ہو گئی اور ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں بنیں تو مولانا نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن عزیز قرار دیا اور یہیں کے ہو رہے۔ انہی دنوں میں مولانا ممبر پارلیمنٹ رہے اور رکن پارلیمنٹ کو ملنے والا یومیہ بھتّہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر پنڈت جواہر لعل نہرو کو تشویش رہی اور اس وقت کے پاکستانی گورنر جنرل غلام محمدؐ جو مولانا کے چہیتے رفیق و شفیق تھے رکنیت کا معاوضہ حاصل کرنے کے لیے سفارش کر
مولانا جیسے نیک نفس
نہ صرف صاف صاف ا
روپیہ کو آنکھ اٹھا کر د
کیا اور فرمایا کہ یہ پیسہ
ناجائز ہے، اللہ رب العزت یوم آخرت میں میری خدمات کا مجھے پورا صلہ دے گا۔ اس طرح مولانا کی تحریک آزادیِ ہند کیلئے بلا معاوضہ خدمات قوم کے لیے نعمت عظمیٰ تھیں۔ ان کا دل حب الوطنی سے سرشار تھا۔ آزادی سے قبل مولانا انگریزوں کے طرح طرح سے کیے گئے مظالم کو مردانہ وار برداشت کرتے رہے اور صرف اپنے نعرے "آزادیٔ کامل" پر اٹل رہ کر ملک کو آزادی کی آغوش میں پہنچا دیا۔

۱۹۵۰ــــ مولانا حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔

۱۹۵۱ــــ ۱۳ مئی اتوار کے دن ۱۲ بجکر ۳ منٹ پر مجاہد آزادی محبِ وطن مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی نے وصال فرمایا۔ اسی روز بعد مغرب لکھنو کے قبرستان "انوار باغ" میں سپرد خاک ہوئے ●

بقیہ: پانچ دوست، پانچ دشمن

آپ رد دیں۔ اکتاہٹ سے آپ کی ذہنی یکسوئی متأثر ہوگی اور آپ کی کامیابی پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ آپ جو کچھ کریں، اس میں دلچسپی لیں اور اکتاہٹ کو پاس پھٹکنے نہ دیں۔

اکتاہٹ سے اُداسی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کی اُداسی ایک لمحاتی مرحلہ سے کی بجائے کُل وقتی مسلہ بن سکتی ہے۔ بقول شاعر۔

اُداس لمحوں کا رہ سارا مری رگوں میں ...

بات یہی ہے۔

"LIFE IS A SERIES OF PROBLEMS. DO WE WAIT TO MOAN ABOUT THEM OR SOLVE THEM ?"

یعنی، زندگی مسائل سے عبارت ہے۔ کیا ہم صرف ان کا ماتم کریں یا ان کا حل تلاش کریں؟ یہ درست ہے کہ مسائل کا ماتم، مسائل کا حل نہیں ہے۔

اب حتمی فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا کہ پانچ دوستوں پر پانچ دشمنوں کو ترجیح دیں گے یا آپ کی ترجیح مخالف رُخ سے ہوگی؟ ●

بقیہ آپ سب کے لئے

پس ماندہ طبقات کے مصنفین کی نویں قومی کانفرنس

وزیر بہبود شری سیتارام کیسری نے بھارتی پس ماندہ طبقات ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ پس ماندہ طبقات کے مصنفین کی نویں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرا ماننا ہے کہ لکھنے کی صلاحیت اس شخص میں ہوتی ہے جس میں سماج کی حالت اور اس کے پس منظر کو سمجھنے کی صلاحیت اور اس صلاحیت کو الفاظ میں ڈھالنے کی قوت ہوتی ہے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ ادب کو سیاسی شکل دی جائے یا ادب کی تخلیق کسی خاص گروہ یا مخصوص طبقے کے لیے ہو۔

انہوں نے کہا کہ ادب سماج کو راہ دکھانے والا ہوتا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ دانشور طبقے کا کوئی ہندو، مسلم یا برہمن گروہ بندی کرے۔

شری کیسری نے کہا کہ لیکن بھارتی پس منظر میں طبقات کی بری رسم کو دیکھتے ہوئے میں یہ تسلیم کروں گا کہ یہاں نچلے طبقے میں آج بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ یہ میں اس لیے چاہتا ہوں کہ یہاں اس مخصوص طبقے کو سماج کے بااثر طبقے کے ذریعہ کچلنے کی ہمیشہ کوشش رہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے اور اعلیٰ طبقے کے طور طریقے گواہ ہیں کہ یہاں پس ماندہ طبقات کو ہمیشہ اعلیٰ طبقات کے روبرو گھٹنے ٹیکنے کے لیے مجبور ہونا پڑا ہے۔ ایسے میں اس طبقے کی صلاحیتوں کو کبھی بھی آگے آنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ آریائی عہد سے ہی پس ماندہ اور کمزور طبقات کی صلاحیتوں کو کچلنے کی سازشیں، ذات کے نظام میں منقسم سماج نے کی۔ ایک لووے اس کی تاریخی مثال ہے۔ ان خصلتوں سے ہمیں آج بھی آزادی نہیں ملی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سماج کے اس طبقے کی صلاحیتوں کو آگے لانے کے لیے یا ان کی الگ پہچان بنانے کیلئے ان کی تنظیمیں ہونی چاہئیں ورنہ سماج انہیں آج بھی آگے نہیں آنے دے گا۔ یہ صحیح ہے کہ آج صورت حال پہلے کی طرح خراب نہیں ہے لیکن جذبات و خصلت ابھی نہیں بدلی۔ اس لیے ضروری ہے کہ پس ماندہ طبقات کے ادیبوں کی ایک تنظیم ہو۔ اسی طرح سے سماج کے دوسرے کمزور طبقات بھی ہیں، جن کے باصلاحیت افراد کو آگے لانے کے لیے تنظیموں کی ضرورت ہے۔ ●

کلکتہ جنرل پوسٹ آفس کی عمارت ثقافتی ورثہ عمارت قرار دی جائے گی

محکمۂ ڈاک نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنی نگرانی کے تحت ۳۲ عمارتوں کو "ثقافتی ورثہ عمارتیں" قرار دے۔ یہ عمارتیں بھارتی تاریخ، آثار قدیمہ اور ثقافت کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ کلکتہ صدر ڈاک خانہ (جی پی او) ان ۳۲ عمارتوں میں شامل ہے اور اس کی بازآبادکاری کا کام جلد از جلد شروع کر دیا جائے گا۔ کلکتہ جی پی او اس برس ۲ اکتوبر کو ۱۲۵ برس پورے کرے گا اور سالگرہ تقریبات اس عمارت کی گذشتہ شان و شوکت کو لوٹانے کی شکل میں منعقد کی جائیں گی۔

بمبئی، مدراس اور لکھنو کے صدر ڈاک خانے (جی پی او) بھی ثقافتی ورثہ عمارت کے تحت نشان زد کیے گئے ہیں۔ ہماچل پردیش میں منڈی صدر ڈاک خانہ بھی اس زمرے میں آتا ہے جو پہاڑی فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ بازآبادکاری کے کام میں بھارتی قومی ٹرسٹ برائے فن و ثقافتی ورثہ اور محکمہ آثار قدیمہ کے (آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا) کے مشورے لیے گئے ہیں۔

منصوبہ بند کمیشن نے آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران محکمۂ ڈاک کو تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے ۳۵، ۱۲۱ کروڑ روپے کی تخصیص کی ہے۔ ●

فضائیہ کے تحت امداد و عطیات ایسوسی ایشن مزید کنبوں پر احاطہ کرے گی

فضائیہ کے سربراہ ایر چیف مارشل ایس کے کول نے بھارتی فضائیہ کو امداد و عطیات ایسوسی ایشن (آئی اے ایف بی اے) کی سالانہ جنرل میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ احاطہ کیے جانے والے امور میں اضافہ ہوگا۔ مصروف خدمت ملازمین کے لیے بازآبادکاری گرانٹ (امداد) کی مدت دس برس سے بڑھا کر پندرہ برس کر دی گئی ہے۔

آئی اے ایف بی اے ایک سرکردہ ادارہ ہے جو گذشتہ ۵۲ برسوں سے بھارتی فضائیہ کے مصروف خدمت اور سبکدوش ملازمین کی بہبود میں مصروف ہے۔ برس ہا برس سے یہ ادارہ بھارتی فضائیہ کے پریشان حال اور مصیبت کے شکار ملازمین کی مدد کرتا آیا ہے۔ یہ ادارہ بھارتی فضائیہ کے مصروف عمل اور سبکدوش ملازمین کے فوت ہو جانے کے بعد ان کے کنبوں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ ●

خصوصی شمارہ یوم جمہوریت ۱۹۹۴ء

یوجنا

نئی دھلی

جلد ۳۸ شمارہ ۱۹-۲۰

یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ء ۱۱ پوش تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۱۵

قیمت : ۶ روپئے

چیف ایڈیٹر : ڈی. کے. بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر : محمد توحید خان

معاون : وسیم حیدر

کتابت : افتخار احمد خاں

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپئے، دوسالہ ۵۴ روپئے، سہ سالہ ۷۲ روپئے۔ فی کاپی ۳ روپئے

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین) نئی دھلی ۶۶ ۱۱۰

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن : سُدرشن موہن جیٹلی

آرٹسٹ : ایم. ایم. پرمار

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۱

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے اگرچہ اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس شمارے میں

اس شمارے کے مختلف مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنفین کے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ خیالات ان اداروں، وزارتوں اور حکومت کے بھی ہوں جن سے وہ وابستہ ہیں۔

اندھیرے سے اجالے کی طرف

"صرف خواندہ لوگ ہی آزاد ہیں" کافی عرصے پہلے یہ بات عظیم فلسفی ایپک ٹیٹس (EPICTETUS) نے کہی تھی۔ ہمارے بزرگ بھی صداقت کے حامی اور علم کے بہت بڑے شیدائی تھے۔ "اندھیرے سے روشنی کی طرف ہماری رہنمائی کر" ہمارے بزرگوں کی ہمیشہ سے یہی دعا رہی ہے۔ علم کی تلاش اور اس کا حصول ہی ان کے مجموعی تصورات کا مرکز تھا کیونکہ علم کے مسلسل حصول اور اس کی وسعت سے زندگی زیادہ سے زیادہ پُر معنیٰ ہوتی ہے۔ منطقی طور پر اسے اب تک پورے ملک میں پھیل جانا چاہئے تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ بیرونی حملوں کا بار بار ہونا اور پھر ایک طویل مدت تک بدیسی حکومت کا تسلط ایسے اہم عناصر ہیں جو شاید اس کے ذمہ دار تھے۔ اور تعلیمی طور پر آزادی ملنے کے امکان سے بہت پہلے صورت حال اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ سات میں سے صرف ایک شخص پڑھا لکھا تھا۔

خوش قسمتی سے ہمارے قومی رہنما اس بات کو جانتے تھے کہ تعلیم کو پھیلانے اور ناخواندگی کو ختم کیے بنا آزادی کا مفہوم بے معنیٰ ہوگا۔ ہمارا آئین بھی حکومت سے ۱۴ سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ ملک میں تعلیم کی توسیع و ترقی کے لیے حکومت کی ایما پر کئی اہم تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ ان میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ' (NCERT) اور "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ منسٹریشن' (NIEPA) بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کچھ دنوں بعد ۱۹۸۶ء میں "نیشنل پالیسی آن ایجوکیشن" (NPE) تشکیل دی گئی جسے تعلیم کے شعبے میں کل ہند پالیسیوں کی انقلابی ضرورت کی تکمیل کے طور پر ایک سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے درمیان اسکولوں میں سائنس کی تعلیم کی بہتری کے لیے "آپریشن بلیک بورڈ" کی اسکیم کو متعارف کرایا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں "نیشنل لٹریسی مشن" قائم ہوا اور اسی سال "اسکیم آف ووکیشنلائزیشن آف سیکنڈری ایجوکیشن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد اسکول تعلیم میں ماحولیاتی بیداری کا ٹاسک (TASK) دیا گیا۔ عالمی خواندگی کے فروغ کے پیش نظر اپریل ۱۹۹۲ء میں ایک "نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کمیٹی آن لٹریسی" کا قیام وجود میں آیا۔ تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں کیے گئے مختلف اقدامات پر اگر نظر ڈالی جائے تو تصویر کا رُخ نہایت دلکش نظر آئے گا لیکن حقیقتاً کیا ایسا ہے؟

حقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صورتحال بالکل اطمینان بخش نہیں ہے۔ حصول آزادی کے ۴۶ سال کے بعد بھی ناخواندگی کی زیادتی ملک کی مکمل طور پر سماجی و اقتصادی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ بنی رہی ہے۔ درحقیقت دنیا میں سب سے زیادہ ناخواندہ آبادی والے دیش کے روپ میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی مردم شماری کے مطابق ہمارے یہاں ۲۸ کروڑ ناخواندہ لوگ تھے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کی کل ناخواندہ آبادی کا ۳۰ فیصد ہندوستانی تھے۔ ناخواندگی کے علاوہ چند دوسری رکاوٹیں بھی ہیں۔ سستی اعلیٰ تعلیم بے سمت ہو چکی ہے۔ اساتذہ اور طالب علموں کے درمیان کا رشتہ، جس پر ہمیں کبھی ناز تھا، اب ماضی کا حصّہ بن گیا ہے۔ درس و تدریس کا پیشہ جسے کافی معزز مانا جاتا تھا، اب افسوسناک حد تک تجارتی بن گیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کو کس طرح سستا بنایا جائے؟ اس سوال نے تعلیمی حلقوں میں پہلے ہی کافی شدت اختیار کر لی ہے۔ اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو باصلاحیت ہونے کے باوجود بھی بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے تکنیکی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں؟ کیا یہ لوگ ہمیشہ پچھڑے ہوئے ہی رہیں گے؟

تاہم امید کی ایک کرن باقی ہے۔ ہمارے پالیسی ساز اس منظر نامے کو تبدیل کرنے اور بہتری لانے پر قائم ہیں۔ اُنھوں نے ۲۰۰۱ء تک سبھی کو تعلیم مہیا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بہت بڑا کام ہے اور فی الوقت تعلیم کے فروغ کی کوششوں کی جو صورتحال ہے اُسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ناممکن سا نشانہ ہے۔ لیکن کام مشکل ہونے کی وجہ سے کیا ہمیں ہمت ہار دینی چاہئے؟ اس کا جواب ہوگا "نہیں"۔ ہمیں پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اپنے اوپر سے دنیا کے سب سے زیادہ ناخواندہ ہونے کا داغ لازمی طور پر دھو ڈالیں۔ ہمیں ایک نیشن کے طور پر لاعلمی کی تاریکی سے علم کی روشنی کی دنیا میں داخل ہونے کی لازمی کوشش کرنی چاہئے۔ ●

ڈاکٹر کرن سنگھ

اکیسویں صدی میں تعلیم

مضمون نگار نے پیرس میں ۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو یونیسکو کے تعلیمی کمیشن کے اجلاس میں جو مقالہ پڑھا اس کا افتتاحی بیان یہاں دوبارہ پیش کیا جارہا ہے۔ تعلیم کے موجودہ پروگرام میں عالمی نقطہ نظر کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مضمون نگار نے کہا ہے کہ آج ہمارے سامنے تقدیر کے مختلف راستے ہیں۔ ہمیں وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جو مقابلہ آرائی کا نہیں امداد کا ہو، تصادم کا نہیں ہم آہنگی کا ہو، سب کی بھلائی کا ہو، ذاتی عیش کا نہیں، اور قطعی تجزیہ یہ ہے کہ یہ مقصد صرف تعلیم سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

آج جب ہم اس غیر معمولی صدی کے آخری دہے میں سے گذر رہے ہیں جس نے بے مثال تباہی اور ناقابل تصور ترقی، تاریخ انسانی کی سفاکانہ عوامی ہلاکت اور انسانی فلاح کے شعبے میں نمایاں ترین اختراعات، مہلک ہتھیاروں کی ایجاد اور بیرونی خلا میں تخلیقی جہان بین کا عمل دیکھا ہے تو ہم اپنے آپ کو اس کرۂ ارض پر نسل انسانی کی تاریخ کے طویل اور تکلیف دہ چوراہے پر کھڑا پاتے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی کے دور میں ہی حالات کی بہتری اور خرابی کے عمل کو یکجا ہوتے دیکھا ہے۔ جہاں سائنسی معلومات کے اطلاق نے معیار زندگی کو توقعات سے کہیں زیادہ بلند کر دیا ہے وہاں بنی نوع انسان کے مسائل بھی عالمی حدود تک پہنچ گئے ہیں اور آج بھی کروڑوں افراد کو کئی کئی دن کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ایٹمی دھماکوں کی جاری آزمائش، ایٹمی فضلے کا مختلف مقامات پر ڈھیر لگنا، کرۂ ارض کا درجہ حرارت بڑھنے کے خطرات، اوزون کی ڈھال میں سوراخ، جنگلات کی کٹائی کا نقصان، نباتات وحیوانات کی کئی اقسام کی تباہی، بڑے پیمانے پر پانی اور ہوا کی کثافت، خوراک کے وسیلوں کا مسموم ہونا، منشیات کی خفیہ تجارت اور متعدد بیماریوں کا خوفناک رفتار سے پھیلنا کچھ ایسے مسائل ہیں جن کا پوری نسل انسانی کو سامنا ہے اور جن کا حل صرف عالمی کوششوں سے ہی ہوسکتا ہے۔

عالمی معاشرہ

اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انسانی تہذیب ایک نئی قسم کے معاشرے میں تبدیل ہورہی ہے۔ یہ تبدیلی غاروں سے جنگلات اور جنگلات سے خانہ بدوشی، چراگاہوں کی زندگی، صنعتی زندگی اور وہاں سے بعد از صنعتی زندگی کے سماج میں تبدیلی سے بھی زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں خواہ ہم بہت قریب ہونے کی وجہ سے اس کا احساس نہ کریں وہ ایک عالمی معاشرے کی جانب تبدیلی ہے۔ ماضی غائب ہوچکا ہے مستقبل ہم پر چھا رہا ہے اور آج ہم اپنے آپ کو ایک ایسے دور میں دیکھ رہے ہیں جو چنوتیوں اور تبدیلی سے پُر ہے۔ خواہ یہ سیاسی واقعات ہوں یا اقتصادی فیصلے، کاروباری سرگرمی ہو یا صنعتی، کمپیوٹر ٹیکنالوجی ہو یا خلا کی تحقیق خوراک اور لباس کی عادات ہوں یا عالمی موسیقی کی دھن ان سب میں اب قومی سرحدوں کی عائد کردہ مصنوعی رکاوٹوں کا کوئی احترام نہیں رہا۔ اور ان سب کا اظہار عالم گیر ہوگیا ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جو سکڑ گئی ہے اور جس میں جھگڑوں اور مقابلے کی بدنام روایت اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دنیا کی بڑھنے والی خلیج کو باہمی تعاون اور مل بیٹھنے کی نئی ثقافت کے لیے جگہ خالی کرنی ہوگی۔ ورنہ آئندہ صدی کے بارے میں تصورات بکھر کر رہ جائیں گے۔

بڑی تشویش

آج جن شعبوں میں سب سے زیادہ تشویش پائی جاتی ہے اُن میں ترقی پذیر ممالک کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ، ہمارے قدرتی ماحول کو خطرات اور ہماری موجودہ صورتحال میں تعلیمی عمل کا کردار شامل ہے۔ آبادی کے سوال پر ۱۹۹۴ء میں آبادی کے بارے میں عالمی کانفرنس کے ۲۰ برس بعد گہرائی سے غور کیا جائے گا۔ گذشتہ کچھ برسوں میں ماحولیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے گذشتہ کچھ دہوں میں اقتصادی ترقی کی بھاری قیمت چکائی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں مختلف مذاہب کے روحانی رہنماؤں نے انسان اور قدرت کے موضوع پر جو بیش قیمت اعلانات کئے تھے اُن سے اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ان کے طریقہ کار میں اتفاق رائے کا پتہ چلتا ہے۔ بنی نوع انسان نے ماحولیات میں جو بے مثال مداخلت کی ہے اس نے نباتات وحیوانات کے نازک توازن کو برہم کرکے رکھ دیا ہے حالانکہ اسی توازن پر یہ زمین اربوں برس سے

اہم تھی اور علم وشعور کے ارتقا کے لیے ایک انوکھی
مثالی بن گئی تھی۔

لیکن عیب متبادل قدرتی وسیلوں
ے اندھادھند استعمال نے تباہی مچا دی
ر اس عمل کو جاری رہنے دیا گیا تو اس کا نتیجہ بڑی بڑی
درتی آفات کے سلسلے میں رونما ہو سکتا ہے جس
سے آئندہ صدی میں اس سیارے پر زندگی میں
ملل پڑ سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس
ن مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ذہنی علمی یا اقتصادی

> ہم ایک الجھی ہوئی دنیا میں [illegible] ہے اور [illegible] جھگڑوں اور
> مقابلے کی [illegible] تمام [illegible] اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دنیا کو [illegible] بڑھنے
> والی خلیج کو [illegible] اور علم [illegible] نفاق کے لیے جگہ خالی
> کرنی ہوگی

سیلوں کی کمی ہے۔ سائنسی معلومات اور تکنیکی علم
کی ایجادات نے ہمیں ان تمام مشکلات میں قابو
انے کی اہلیت دی ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے
نش اور ہمدردی کے جذبے کی کمی ہے۔ علم پھیل رہا
ہے لیکن عقل و دانش کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر
ہمیں تباہی کی جانب سفر کے رجحان کا رخ پلٹنا ہے
تو ہمیں علم و ذہانت کے بڑھنے والے خلا کو پُر
کرنا ہوگا ـــ اس عمل میں تعلیم کو ایک اہم حیثیت
حاصل ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے تمام قومی
تعلیمی نظام ایسے عقائد پر مبنی ہیں جن کا تعلق ایٹمی
علم سے قبل اور عالمی افکار سے قبل کے تصورات
سے ہے۔ اس لیے وہ خیالات اور فکر کی نئی مثالیں پیش
نہیں کر سکتے جن کی اب انسانی بھلائی اور بقا کے
لیے ضرورت ہے۔ فرسودہ اور پرانے خیالات نئی نسل
کو اس دنیا کیلئے لازم اتحاد کی مناسب آگاہی سے محروم
رکھے ہوئے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت
تو یہ ہے کہ آبادی کے دیگر گروہوں یا اقوام کے تئیں
منفی رویہ اپنا کر وہ پورے عالم کی ترقی کے راستے میں
رکاوٹ کھڑی کر رہے ہیں۔

تخلیقی تعلیم کی ضرورت

آج مواصلات کی جس ٹیکنالوجی نے اس کرۂ
ارض کا احاطہ کر رکھا ہے وہ اپنی بھرپور صلاحیت کو عالمی
قدروں کی توسیع اور زیادہ ہمدردانہ ضمیر کی پرورش
کے لیے استعمال نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اخبارات
اور ذرائع ابلاغ تشدد اور ہوس کی، ظلم و قتل بے لگام
کھسوٹ کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں جس سے
نہ صرف نوجوانوں کی آگاہی اور علم مسخ ہوتے ہیں بلکہ
انسانی تکلیفات اور دکھ کے بارے میں ہمارا احساس
بھی کُند ہو جاتا ہے۔ اس لیے فوری طور پر ضرورت
اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تعلیمی اور مواصلاتی پالیسیوں
کا رُخ پلٹ دیں۔ ہمیں بڑے غور وخوض سے عالمی
پیمانے پر ایسے پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے
جو اس اتحاد یا تعارف پر مبنی ہوں کہ انسانی بقا کے
لیے ایک تخلیقی اور ہمدردانہ عالمی بیداری کی ضرورت
ہے۔ تعلیم کے بارے میں ہمیں نئے حالات میں
ایک بار پھر روحانی عنصر کو اہمیت دینی ہوگی۔ حال

> علم پھیل رہا ہے لیکن عقل و دانش کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔
> اگر ہمیں تباہی کی جانب سفر کے رجحان کا رخ پلٹنا ہے تو ہمیں
> علم اور ذہانت کے بڑھنے والے خلا کو پُر کرنا ہوگا۔ اور اس عمل میں
> تعلیم کو ایک اہم حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ہی میں میں نے ایک حوالہ دیکھا تھا کہ "اگر آئندہ
دس برس میں ہم یورپ کو روحانیت اور زندگی کی
معنویت نہیں دے پاتے تو ہماری سب
کوششیں رائیگاں ہو جائیں گی۔ اگر ہم یورپ کی جگہ
لفظ دنیا استعمال کریں تو ہمیں صاف پتہ چل جاتا
ہے کہ ہمیں کس چیلنج کا سامنا ہے۔

تخلیقی تعلیمی مفکروں نے تعلیم کے زیادہ سے
زیادہ اعادی اور انسانی فلسفے پیش کیے ہیں۔
صرف بھارت میں ہی آروبندو، ٹیگور، مہاتما گاندھی اور
جے کرشنا مورتی جیسے مشہور مفکر ہوئے ہیں جنھوں نے
تعلیم کے بارے میں اپنے اپنے نظریات مرتب کیے
ہیں اور انھیں عمل میں لانے کی کوشش کی ہے۔
تخلیقی تعلیم کے بارے میں بھارت اور دیگر ممالک
کے تجربات ہمیں اکیسویں صدی میں ایک نیا تعلیمی
فلسفہ مرتب کرنے کے کام میں رہنمائی اور ترغیب کا
کام دے سکتے ہیں۔

ہم میں عالمی سطح پر سوچنے کا حوصلہ ہونا چاہیے
جس سے ہم روایتی فارمولوں سے الگ ہو سکیں اور
اور بڑی دلیری سے نامعلوم امکانات کے میدان میں
چھلانگ لگا سکیں۔ ہمیں اپنے داخلی اور خارجی وسیلوں
کو متحرک کرنا چاہیے جس سے ہم ایک دوسرے کی
تباہی کی بجائے ایک دوسرے کی بھلائی پر مبنی ایک
نئی دنیا کی تعمیر کر سکیں۔ عالمی شہریوں کی طرح جو انسانی
بقا اور بھلائی کے خواہش مند ہوں ہمیں دنیا بھر کی
تعلیم کا ایک پروگرام مرتب کرنا چاہیے جو بچوں اور
بالغوں دونوں کے لیے ہو جس سے ان کی آنکھیں عالمی
عہد کے حقائق کو دیکھ سکیں اور ان کے دل دبے
کچلے لوگوں کی تکالیف کو محسوس کر سکیں۔ ہمیں اس
کام کو شروع کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔
کیونکہ عالمی معاشرے کے ظہور کے ساتھ ساتھ
بنیاد پرستی اور تعصب، استحصال اور دھمکیوں کی ترسی
قوتیں بھی سرگرم ہیں۔

اس لیے جتنی جلدی ہو سکے، سب کے لیے
ایک تعلیمی فلسفہ مرتب کریں جو درج ذیل خاکوں پر
مبنی ہو۔

(الف) یہ کرۂ ارض جس پر ہم رہتے ہیں اور جس
کے ہم سب شہری ہیں ایک واحد زندہ
اور سرگرم اکائی ہے۔ اور نسل انسانی ایک
بہت بڑا کنبہ ہے اور اگرچہ نسل اور مذہب،
قومیت اور نظریات، جنس اور جنسی ترجیحات،
اقتصادی و سماجی مرتبے کے اختلافات
بیشک بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں

لیکن انھیں عالمی اتحاد کے وسیع تر سیاق و سباق کی حدود کے اندر دیکھا جانا چاہیئے۔

(ب) کرۂ ارض کے ماحول کو تباہی اور اندھا دھند استحصال سے بچایا جانا چاہیئے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کے وسیلوں میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ یہاں اور زیادہ منصفانہ کھپت کا ڈھانچہ رائج کیا جانا چاہیئے جو بے لگام کھپت کاری پر نہیں بلکہ ترقی کی حدود پر مبنی ہو۔

(ج) نفرت اور تعصب، بنیاد پرستی اور جنون، لالچ اور حسد خواہ وہ اقوام کے درمیان ہوں یا آبادی کے گروہوں میں، یہ تخریب کار جذبات ہیں اُن پر آئندہ صدی کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے غلبہ پانا چاہیئے اور محبت و

ہمیں بڑے غور و خوض سے عالمی پیمانے پر ایسے پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے جو انسانی شرعات یا تعارف پر ضروری دھیان دیتے ہوئے انسانی بقا کے لیے ایک تخلیقی اور ہمدردانہ عالمی بیداری کی ضرورت اجاگر کر سکے۔ تعلیم کے بارے میں ہمیں نئے خیالات میں ایک بار پھر روحانی عنصر کو اہمیت دینی ہوگی۔

ہمدردی، دوستی اور تعاون، سخاوت اور مہربانی جیسے عناصر کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔

(د) دنیا کے عظیم مذاہب ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے لمبی لڑائی میں نہ پڑیں بلکہ نسل انسانی کی فلاح کے لیے ان میں باہمی تعاون ہونا چاہیئے اور روحانی خواہشات کا جو دلکش دھاگہ انھیں ایک دوسرے سے یکجا کرتا ہے اس کو مضبوط کرنا چاہیئے نہ کہ علیحدگی پسندی اور خود نمائی کے خیالات کی پرورش کی جائے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔

(ر) سب کے لیے تعلیم میں انسانی شخصیت کی کثیر جہات یعنی جسمانی، ذہنی، جمالیاتی، جذباتی اور روحانی کو سمونا چاہیئے اور پوری نسل انسانی کی متحدہ اور ہم آہنگ ترقی کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔

(ڈ) قدروں پر مبنی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیئے جن میں ماحولیاتی قدریں، چھوٹے کنبے کے اصول ایک دوسرے کے عقیدے کے احترام کی قدریں اور حقوق و فرائض اور جمہوری آزادیوں کی ذمہ داری کا احساس شامل ہو۔

سب کے لیے تعلیم میں انسانی شخصیت کی کثیر جہات یعنی جسمانی، ذہنی، جمالیاتی، جذباتی اور روحانی کو سمونا چاہیئے۔

(س) ۲۰۱۰ء تک دنیا بھر سے ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے زوردار اجتہادی مہم کی ضرورت ہے اور اس کام کے لیے درکار وسیلے ترجیحی بنیادوں پر متحرک کیے جانے چاہئیں۔ اور

(ش) خواتین کی خواندگی کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیئے تاکہ ماضی کی غلطیوں کو درست کیا جاسکے اور عورتوں کو ان کے حقوق دلانے کا نصب العین حاصل کیا جاسکے جو کہ ایک متحدہ اور ہم آہنگ تہذیب کیلیے بہت ضروری ہے۔

۲۰۱۰ء تک دنیا بھر سے ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے زوردار اجتہادی مہم کی ضرورت ہے اور اس کام کے لیے درکار وسیلے ترجیحی بنیادوں پر متحرک کیے جانے چاہئیں۔

عالمی حدود

دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اس قسم کا تعلیمی مواد فراہم کرنے کے بعد ہمیں ایک ترسیلی نظام بھی تیار کرنا چاہیئے تاکہ یہ مواد دنیا کے تمام ممالک میں پہنچ سکے۔ یونیسکو کے ادارے جیسے کہ اقوام متحدہ کی یونیورسٹیاں، روم کا کلب، قومی تعلیمی ادارے، نجی تعلیمی تنظیمیں، ان سب کو موجودہ تعلیمی پروگراموں کی حدود کو عالمی سطح تک وسیع کرنے کے پیچیدہ عمل میں شریک کرنا ہوگا۔ اگر عالمی تعلیم کے اس طویل مدت تصور کو آگے بڑھانا ہے تو ذرائع ابلاغ کے زوردار تحریری صوتی اور بصری ذرائع کا عقلمندانہ اور تخلیقانہ استعمال کرنا ہوگا۔ میں اس بات پر زور نہیں دینا چاہتا کہ اس قسم کی کوشش ایک خواب ہے بلکہ اگر نسل انسانی کو اس ایٹمی دور میں زندہ رہنا ہے اور سلامتی سے ایک عالمی معاشرے میں تبدیل ہونا ہے تو یہ کوشش ایک فوری ضرورت ہے۔

جب سے میں نے چاند سے کھینچی گئی اس کرۂ ارض کی حیران کن تصویر کو دیکھا ہے جو روشنی اور زندگی کا ایک چھوٹا سا نقطہ دکھائی دیتی ہے جو اتنی خوبصورت اور کمزور ہے اور جو خارجی خلا کے پس منظر میں آگ اور شعور سے روشن ہے، مجھے اس کرۂ ارض میں بہت دلکشی دکھائی دی ہے۔ اس زمین نے جیسے کئی ثقافتوں نے ماں کے طور پر دیکھا ہے اربوں برس سے سمندر سے خشکی تک کے دور میں شعور کی پرورش کی ہے۔ اب ہمیں ایک ڈرامائی جست سے اُن خراشوں کو مٹانا ہے جو ہم نے اس سرزمین کو لگائی ہیں اور آج اس پر آباد تمام حیوانات اور انسانوں کی فلاح کا تحفظ کرنا ہے اور یہ کام ہم آنے والی صدی میں کریں گے۔ مستقبل کے لیے تعلیم کے کارزار میں جو لوگ عمل کر رہے ہیں یہی بات ان کے لیے رہنما اصول ہونی چاہیئے۔ یونیسکو نے اکیسویں صدی میں تعلیم کے بارے

باقی صفحہ ۱۲ پر

محترمہ شیلجہ

تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی ضرورت

وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیں اور اس کے لیے اپنی شرکت سے موافق حالات پیدا کریں۔ ان خیالات کا اظہار نائب وزیر تعلیم محترمہ شیلجہ نے کیا۔ خواتین کی مکمل صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے خواندگی پروگرام کو زیادہ مفید اور بامعنی بنایا جانا چاہئے اس کے لیے بنیادی تعلیمی پروگراموں کو وضع کرنے اور ان کے نفاذ میں جنس کے تئیں ایک موثر اور حساس رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ یہ خوش آیند امر ہے کہ نئے اقدامات میں اس پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔

ہمارے سماج میں تعلیم کو ہمیشہ ایک باعزت مقام حاصل رہا ہے۔ آزادی کے بعد سے تعلیم کی ترقی قانون کی حدود میں طے کیے گئے قومی مقاصد کے مطابق ہوئی ہے۔ آزادی کے وقت سے لے کر اب تک ملک نے تعلیم کے میدان میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲ر۱۰ لاکھ سے بڑھ کر ۱۹۹۱-۹۲ء میں ۵ر۶۵ لاکھ ہوگئی۔ اسی عرصہ کے دوران پرائمری اساتذہ کی تعداد ۵ر۳۸ لاکھ سے بڑھ کر ۱۶ر۹۳ لاکھ پہنچ گئی۔ پہلی سے پانچویں کلاس تک داخلوں کی اوسط شرح ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۴۲ فیصد تھی جو ۱۹۹۱-۹۲ء میں بڑھ کر ۱۰۲ر۷۴ فیصد ہوگئی جب کہ پنجم سے ہشتم کلاس تک یہ شرح اسی دوران ۱۳ فیصد سے بڑھ کر ۶۱ر۱۵ فیصد ہوگئی۔ پرائمری زمرے میں لڑکیوں کی شرح داخلہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۶۰ لاکھ کے مقابلے میں بڑھ کر ۱۹۹۱-۹۲ء میں ۳ر۴ کروڑ تک پہنچ گئی جو باوجود تفاوت کے لڑکوں کی شرح داخلہ سے کہیں بہتر ہے۔ پہلی سے پنجم کلاس تک لڑکیوں کی پڑھائی چھوڑنے کی شرح ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۶۲ر۵ فیصد کے مقابلے میں ۱۹۸۸-۸۹ء میں گھٹ کر ۴۹ر۷ فیصد اور پہلی سے ہشتم کلاس تک یہ شرح اسی عرصے کے دوران ۷۹ر۴ فیصد سے گھٹ کر ۶۸ر۳ فیصد رہ گئی۔ اس فروغ اور ترقی نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کو دنیا کے بڑے سے بڑے تعلیمی نظام کے برابر کر دیا۔ ۸ر۲۶ لاکھ رہائشی مکانات کے لیے جس میں ملک کی ۹۴ فیصد آبادی مقیم ہے ہر ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پرائمری اسکول کی سہولت مہیا ہے۔ اسی کی دہائی میں داخلوں میں اضافے کی وجہ سے پرائمری سطح پر شرح داخلہ صد فیصد کے قریب پہنچ گئی۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی

اگرچہ یہ حصولیابیاں ازخود کافی اہم ہیں پھر بھی ۱۹۸۶ء میں ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی وضع کی گئی جس کا مقصد قومی تعلیمی نظام کی ترویج و ترقی پر زور دینا اور نظام تعلیم میں موجود تفاوت کو دور کرنا اور کیفیتی مداخلت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنا تھا۔ تعلیم کو لوگوں کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے، سماجی طور پر زیادہ مفید بنانے کے لیے قومی تعلیمی پالیسی نے تعلیمی انتظام کو غیر مرکوز کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی کا ایک اہم مقصد خواتین کے اختیارات میں اضافہ کرنا اور پچھڑے علاقوں یا سماج کے کم ترقی یافتہ درجوں کے لیے تعلیم تک رسائی کی خاطر زیادہ دلچسپی ظاہر کرنا تھا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ رسمی تعلیمی نظام ملک کے طول و عرض میں پھیلے بچوں تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے، اس پالیسی میں وسیع پیمانے پر غیر رسمی تعلیمی پروگرام شروع کرنے پر زور دیا گیا اور اس میں لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

بعد ازاں ۱۹۹۲ء میں ۱۹۸۶ء کی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بعد پیدا ہونے والے تعلیمی حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا اس جائزے سے معلوم ہوا کہ اگرچہ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی کا مرتب کردہ دائرہ کار ابھی تک اپنی معنویت رکھتا ہے لیکن گذشتہ چند برسوں کی تعلیمی ترقی اور اس پالیسی کے نفاذ سے حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں کچھ ردوبدل کی ضرورت پڑی۔ یہ ردوبدل مئی ۱۹۹۲ء میں کر دی گئی۔ تعلیم کے میدان میں پرائمری تعلیم کی ہمہ گیری، تعلیمی مواقع کی مساویانہ فراہمی، خواتین کی تعلیم و ترقی، ثانوی تعلیم کی پیشہ وارانہ اور اعلیٰ تعلیم کو مربوط کرنا، تمام سطحوں پر تعلیم کے معیار، مواد اور طریقوں کو بہتر بنانا قومی کاوشوں کا ایک عنصر رہا ہے۔ ایک اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ طلبا کے لیے بنیادی تعلیم میں توجہ کا مرکز داخلوں سے ہٹ کر تعلیم جاری رکھنے اور حصول تعلیم کی طرف ہو گیا ہے۔

قومی مشن کی تجویز

۱۹۹۲ء کی ترمیم شدہ پالیسی میں اس یقین دہانی کا بھی عہد کیا گیا ہے کہ اکیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے ہم چودہ سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو مفت اور اطمینان بخش لازمی تعلیم فراہم کریں گے۔

مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک قومی مشن قائم
لے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ جوم ٹین (JOM TIEN)
ائی لینڈ میں "سب کے لیے تعلیم کی عالمی کانفرنس" میں
صدی کے آخر یا اس سے جتنا جلد ممکن ہو سکے
تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کا نصب العین رکھا
یا ہے۔ حال ہی میں ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو نئی دہلی میں
منعقد ہوئی "سب کے لیے تعلیم کی چوٹی کانفرنس"
دنیا کے کثیر آبادی والے نو ترقی پذیر ممالک نے
عہد کا اعادہ کیا۔ اس ترمیم شدہ پالیسی میں پرائمری

۱۹۸۶ کی قومی تعلیمی پالیسی کا ایک اہم مقصد خواتین کے اختیارات میں اضافہ کرنا اور پچھڑے علاقوں یا سماج کے کم ترقی یافتہ طبقوں کے لیے تعلیم تک رسائی کی خاطر زیادہ دلچسپی ظاہر کرنا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ رسمی تعلیمی نظام ملک کے طول و عرض میں بچوں تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے اس پالیسی میں وسیع پیمانے پر غیر رسمی تعلیمی پروگرام شروع کرنے پر زور دیا گیا اور اس میں لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

تعلیم کو ہمہ گیر بنانے اور سب کے لیے تعلیم کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جن طریقوں کی سفارش کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(i) ایک کلو میٹر کے فاصلے کے اندر اندر ایک پرائمری اسکول یا این۔ ایف۔ ای (NFE) مرکز جیسے متبادل نظام کی فراہمی۔

(ii) فرقہ وارانہ شرکت اور دیہات کی سطح تک تعلیمی مینجمنٹ کو موثر طور پر غیر مرکوز کرنے کے طریقوں کے ذریعے منصوبہ بندی کرنا۔

(iii) کلاس پنجم و ہشتم کے طلبار کی تعداد کا جائزہ لے کر توجہ اس پر مرکوز کرنا کہ طلبار آگے تعلیم برقرار رکھ سکیں اور اس سے مستفیض ہوں نیز ایسے پروگرام مرتب کرنا جن سے یہ یقین دہانی کی جا سکے کہ تعلیم کے ایک مرحلے کی تکمیل پر تمام بچوں نے کم از کم مقررہ سطح تک علم حاصل کر لیا ہے۔

(iv) تختۂ سیاہ آپریشن کو وسعت دے کر پرائمری اور اس سے اعلیٰ سطح کے اسکولوں کو بہتر بنایا جائے اور مزید سہولتیں فراہم کی جائیں۔

(v) جو بچے رسمی اسکولی نظام سے فیضیاب نہیں ہو سکتے ان کے لیے غیر رسمی تعلیمی پروگراموں کو بہتر بنایا جائے اور ان میں تنوع پیدا کیا جائے۔

(vi) ننھے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لیے ما قبل اسکول تعلیم کو مضبوط بنایا جائے۔ اساتذہ کی تعلیم کو وسیع اور بہتر بنانے کے لیے زیر ملازمت رواں تعلیم کے نیٹ ورک کے مراکز قائم کیے جائیں۔

(vii) تعلیمی پروگراموں کو وسعت دی جائے اور بہتر بنایا جائے۔

(viii) بیرونی ایجنسیوں کے ذریعہ وسائل میں اضافہ کیا جائے اور ضلعی سطح پر مخصوص پراجیکٹوں کو شروع کیا جائے۔

ترمیم شدہ لائحہ عمل

یہ لائحہ عمل اختصار کے طور پر پرائمری تعلیم کی ہمہ گیری کے مسئلے کو لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ گردانتا ہے اور تعلیم کے تمام مراحل میں خصوصاً سائنس، پیشہ ورانہ، تکنیکی اور کامرس جیسے مضامین میں جہاں لڑکیوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے ان کی شرکت کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

مذکورہ پالیسی کی ترمیم کے نتیجے میں حکومت نے اگست ۱۹۹۲ء میں ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا۔ اس پروگرام میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیمی مینجمنٹ کی اصلاح اولین کام ہے۔ اس کے مطابق لیاقت کا معیار اس بات پر منحصر نہیں ہونا چاہیے کہ کسی نے پورا بجٹ صرف کر کے اور مزید رقم کا مطالبہ کیا بلکہ کارکردگی اور حصول مقصد یا حصولیابی کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ اس پروگرام عمل کے مطابق زیادہ لوگوں تک تعلیم کی رسائی کا مطلب ضروری نہیں کہ داخلوں میں اضافہ ہو۔ لہٰذا توجہ کا مرکز اسکول کی سہولتوں سے ہٹ کر سہولیات کی بہتری سب کے داخلوں اور اطمینان بخش سطح تک علم کے حصول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لائحہ عمل میں ذکر ہے کہ مکمل خواندگی مہم ایک قابل تقلید نمونہ بن کر ابھری ہے اور اس نے ہمہ خواندگی بالغان کے نصب العین کو حصول کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ لائحہ عمل اختصار کے طور پر پرائمری تعلیم کی ہمہ گیری کے مسئلے کو لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ گردانتا ہے اور تعلیم کے تمام مراحل میں، خصوصاً سائنس، پیشہ ورانہ تکنیکی اور کامرس جیسے مضامین میں جہاں لڑکیوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے ان کی شرکت کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ خواتین میں مساوات اور تعلیم کے فروغ کے لیے اور ایسا طریقہ دریافت کرنے کے لیے جس سے تمام قومی پروگراموں کے نفاذ میں جنس کے اظہار کا احساس ہو تعلیم کی تشکیل نو کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

تعلیم نسواں

آزادی کے بعد سے خواتین کے لیے تعلیمی مواقع کی فراہمی قومی کوششوں کا ایک اہم جز رہا ہے اگرچہ ان کی کوششوں سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں پھر بھی جنسی امتیاز میں ہنوز کوئی خاطر خواہ کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور یہ زیادہ تر دیہی علاقوں اور پچھڑے ہوئے فرقوں میں مروج ہے۔ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کو ایسا ایجنٹ قرار دیا گیا ہے جو خواتین کے مقام میں بنیادی تبدیلی لا سکتا ہے۔ اس کے مطابق ماضی کی جمع ہوئی خامیوں کے ازالے کے لیے خواتین کے حق میں بہتر اور اچھی

طرح سوچے سمجھے اقدامات کیے جائیں۔ خواتین کو مزید اختیارات دینے کے لیے قومی نظام تعلیم ایک مثبت رول ادا کرے گا۔ خواتین میں ناخواندگی اور بنیادی تعلیم تک ان کی رسائی میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے، اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے خصوصی مددگار خدمات کی فراہمی، وقت کے نشانوں کا تعین اور موثر جائزے کے ذریعے اولین ترجیح دی جائے گی۔

خواتین کے لیے تعلیم محض سرمایہ کاری پر منافع کمانے کا سوال نہیں ہے بلکہ اس کی خودکی توقیر میں اضافے کا ایک اہم طریقہ ہے جو ترقیاتی کاموں میں ان کی مساوی شرکت کو یقینی بناتا ہے۔ خواتین کے لیے براہ راست ترقیاتی فوائد مجموعی سماجی و اقتصادی اشاریہ میں بہتری، چھوٹا خاندان، بچوں کی گھٹتی ہوئی شرح اموات، معیار زندگی کی بہتری، بڑھتی ہوئی اقتصادی پیداوار، خاندانی صحت میں بہتری تو ضروری ہیں ہی۔ لیکن میرے خیال میں اس کے علاوہ مساوات اور سماجی انصاف کا تقاضہ ہے کہ خواتین کو سماج میں اپنے حقوق کو استعمال کرنے کی اور اپنی زندگی کے متعلق روایت سے ہٹ کر پسند و ناپسند کا اختیار ہونا چاہیئے اس کے علاوہ تعلیم تک رسائی کی کمی، ملازمتوں اور سماجی خدمات کی قلت اور عوامی زندگی میں شرکت کا فقدان۔ یہ ہر عورت کو ایک انسان ہونے کے حق سے محروم کرتا ہے۔ یہ ایک ملک کے لیے اپنے افرادی وسائل کے نصف فیصد کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

اس لیے وقت کا تقاضہ ہے کہ خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ ہمیں ہر سطح پر بھرپور کوشش کر کے عورتوں کی پرانے وقتوں کی خاموشی، تنہائی اور امتیاز جیسی فرسودہ روایتوں کو دور کر کے مردوں کی تعلیم کے مساوی ان کی شرکت کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے چاہئیں۔ بنیادی تعلیم کی ہمہ گیری کا نصب العین لڑکیوں کو اسکول کی سہولیات کی فراہمی اور اسے برقرار رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج لڑکیوں کی شرکت لڑکوں کے مقابلے میں کافی کم ہے اور اسکول چھوڑنے کی شرح زیادہ ہے۔ ہمیں بنیادی تعلیمی پروگرام وضع کرنے اور ان کے نفاذ میں جنس کے عنصر کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا تاکہ وہ مفید اور بامعنی ہوں۔

> **خواتین کے لیے تعلیم محض سرمایہ کاری پر منافع کمانے کا سوال نہیں ہے بلکہ اس کی خودکی توقیر میں اضافے کا ایک اہم طریقہ ہے جو ترقیاتی کاموں میں ان کی مساوی شرکت کو یقینی بناتا ہے۔**

> **آزادی کے بعد سے خواتین کے لیے تعلیمی مواقع کی فراہمی قومی کوششوں کا ایک اہم جز رہا ہے۔ اگرچہ ان کوششوں سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں پھر بھی جنسی امتیاز میں ہنوز کوئی خاطر خواہ کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور یہ زیادہ تر دیہی علاقوں اور پچھڑے ہوئے فرقوں میں مروج ہے۔**

نئی پیش قدمی

ملک میں تعلیمی طور پر زیادہ پست علاقوں کے لیے بنیادی تعلیم کے پروگرام مرتب کرتے وقت حکومت نے اس پہلو پر خاص زور دیا ہے۔ ان اضلاع میں جہاں خواتین کی خواندگی کی سطح قومی اوسط سطح سے کم ہے وہاں لڑکیوں کے لیے تعلیم تک رسائی اور اس کو جاری رکھنے کی صلاحیت اور حصول علم کی سطح کو فروغ دینے کے لیے خاص توجہ اور کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کوشش کی ضلع پرائمری تعلیمی پروگرام کے نام سے شروعات کی گئی ہے۔ غیر رسمی تعلیمی پروگرام کے نمونے اور نصاب میں اتنی لچک ہونی چاہیئے کہ وہ بے تعلق اور غیر مستفیض فرقوں کی لڑکیوں کو فیضیاب کر سکے۔ خصوصی کوششوں سے ہم نے تختۂ سیاہ آپریشن کے تحت ۳۹٫۷ ۵ فیصد خاتون اساتذہ تقرر کیا ہے۔ اسکول کی نصابی کتابوں میں تصاویر اور عبارت سے جھلکنے والے جنسی امتیاز کے خاتمے کا ایک بڑا کام پہلے ہی کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان سب اقدامات سے تعلیم کے تمام مراحل میں لڑکیوں کے حصول علم اور تعلیم میں ان کے جٹے رہنے میں مدد ملے گی۔

مہیلا سماکھیا

یہاں یہ ذکر کر دوں کہ ایک منصفانہ اور خوشگوار نظام تعلیم میں لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم کے مواقع کو فروغ دینے کی ذمہ داری سے کوئی بھی سماج منہ نہیں موڑ سکتا۔ مساوات کے لیے خواتین کی تعلیم یا مہیلا سماکھیا کے نام سے منسوب پروگرام کے ذریعہ ایک انوکھی حکمت عملی اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ہمیں اُن پر فخر ہے۔ اس پروگرام کا مقصد خواتین کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق علم اور معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ماحول

> **مساوات کے لیے خواتین کی تعلیم یا مہیلا سماکھیا کے نام سے منسوب پروگرام کے ذریعہ ایک انوکھی حکمت عملی اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ہمیں اُن پر فخر ہے۔ اس پروگرام کا مقصد خواتین کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق علم اور معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ماحول تیار کرنا ہے۔**

تیار کرنا ہے۔ اس پروگرام سے نشانے طے نہیں کیے گئے ہیں۔ اس میں کثرت سے ایسے طریقے وضع کیے گئے ہیں جن میں خواتین کو از خود لائحۂ عمل طے کرنا ہوگا۔ اس پروگرام میں مرکزی حیثیت دیہی سطحوں پر خواتین کے اجتماع یا "مہیلا سنگھ"، کو حاصل ہے۔ خواتین اپنے مسائل کو ترتیب دے کر اجتماعی عمل سے اس کا حل تلاش کرتی ہیں اسی کے ساتھ وہ اپنی تنقیدی فکر کی صلاحیتوں اور علم کے حصول سے بطور عورت اپنی تصویر اور سماج میں اپنے مفید کردار کو از سر نو تشکیل دیتی ہیں۔

فی الوقت اس پروگرام کا اطلاق اتر پردیش، کرناٹک، گجرات اور آندھرا پردیش صوبوں کے چودہ اضلاع میں ہو رہا ہے۔ مہیلا سا کھیا نے گجرات اور کرناٹک کے اضلاع میں مکمل خواندگی مہم میں ایک قابل ذکر کردار ادا کیا ہے اور اتر پردیش میں غیر رسمی تعلیم سے متبادل مواقع فراہم کرنے میں مصروف ہے۔ اس پروگرام کے تحت مقامی سطحوں پر علم کے حصول اور تدریس کے جدید اور انوکھے ساز و سامان تیار کئے گئے ہیں۔ مزید برآں اس پروگرام نے خواتین میں اعتماد، خود انحصاری اور اجتماعی عمل کی صلاحیتیں پیدا کر کے تعلیم، صحت اور بچوں کی بہبود کے لیے بہتر سہولتیں طلب کرنے کی جرأت پیدا کی۔

قومی خواندگی مشن کے تحت جو پندرہ سے پینتیس سال تک کے عمر والے آٹھ کروڑ ناخواندہ افراد کو خواندہ بنانے کے لیے ۵ مئی ۱۹۸۸ء کو قائم کیا گیا تھا، تمام ملک میں مکمل خواندگی مہم شروع کی گئی تھی، درس و تدریس میں شریک خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اس مہم میں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پرجوش ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ اس مہم کا خاص مقصد خواتین کی قوت میں اضافہ کرنا ہے اور یہ واضح ہے کہ خواندہ خواتین زیادہ فعال اور باوقار کردار ادا کرتی ہیں۔

خواتین کی بھرپور شرکت کے بغیر قوم کی پائیدار ترقی ممکن نہیں ہے اس لیے حکومت خواتین کو برابری دینے کی خاطر ان کی تعلیم میں سرمایہ کاری کی پابند ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو نئی دہلی میں منعقدہ سب کے لیے تعلیم کی سربراہ کانفرنس میں دنیا کے کثیر آبادی والے نو ترقی پذیر ممالک کی طرف سے جاری کردہ دہلی اعلانیہ میں اس امر کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم اور ان کی قوت میں اضافہ بجائے خود اہم پہلو ہے اس کے ذریعہ سماجی ترقی، حالیہ اور آئندہ نسلوں کی تعلیم اور ان کے مفاد اور صلاحیت اور ترقی و اظہار کے مواقع کے فروغ میں بھی کلیدی کردار ادا ہو سکے گا۔ اس اعلانیہ سے منسوب لائحۂ عمل میں ایسی حکمت عملی اختیار کی گئی ہے جس کے ذریعے تعلیم نسواں کے ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔

اس قومی تعلیمی نظام سے خصوصاً تعلیم نسواں کے پروگرام سے مجھے یقین ہے اکیسویں صدی میں ہمارا خیر مقدم ہوگا۔ ●

بقیہ : بامقصد تعلیم کی مصوبہ سازی

انسانی اقدار سربلند ہوں، تو نہ کوئی ترقی ہو سکتی اور نہ کوئی پیش رفت۔ لہٰذا تعلیم کا انتظام کرنے والوں کو اسے فرد کے نہیں بلکہ سماج کے لیے موزوں بنانا ہوگا نہ کہ خود اپنے لیے موزوں سا نا۔" کام کے بغیر تعلیم اور فہم بے رنگ اور میکانیکی ہو جاتا ہے اور تعلیم بغیر کام کے ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس قسم کے عدم توازن کو دور کرنے کے لیے منصوبہ بنانا ہوگا۔ ہمیں تدریسی اور تعلیمی برادری کو سماجی مقاصد کے تصور کے قریب لانے کی طرف رجوع کرنا ہوگا ورنہ پھر تعلیم کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے ہم لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں لیکن وہ پھر بھی کم فہم، غیر تعلیم یافتہ، غیر انسانی، غیر دانشمند اور اپنے بھائیوں اور پڑوسیوں کی خوشحالی سے لاتعلق رہیں گے۔ اس قسم کی تعلیم یا خواندگی ایک سماجی تباہی ہے۔ اسے بامقصد بنانے کے لیے ہمیں نظریات اور اقدار کو میکانیکی تعلیم کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا اور ذہین، دانشمند دوسروں کا خیال رکھنے والے انسان پیدا کرنا ہوں گے۔

تعلیم کی سربراہ کانفرنس

۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دہلی میں زیادہ آبادی والے نو ممالک کی سب کے لیے تعلیم کے بارے میں سربراہ کانفرنس ختم ہوگئی۔ جس میں دہلی اعلانیہ سامنے آیا۔ جس میں سب کے لیے تعلیم کے عالمی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے اور تعلیم کو، عالمی انسانی اقدار، انسانی وسائل کے معیار اور تہذیبی تنوع کے احترام کو فروغ دینے کا اہم ترین وسیلہ تسلیم کیا گیا ہے۔ نو ممالک، بنگلہ دیش، برازیل، چین، مصر، بھارت، انڈونیشیا، میکسیکو، نائیجیریا اور پاکستان کے لیڈروں نے ہر بچے کو ۲۰۰۰ء تک اسکول تک رسائی دلانے اور اسکول کے ساتھ درکار دیگر مناسب سہولیات کو یقینی بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ مصر اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنے بجٹ کا بڑا حصہ خرچ کر رہا ہے۔ ہمارے پردھان منتری نے ایک بیان دیا ہے کہ بھارت ۲۰۰۰ء تک تعلیم کی مد پر اپنی مجموعی قومی پیداوار کا قریب ۶ فیصد خرچ کرے گا۔ تعلیم پر ہمارے موجودہ اخراجات مجموعی قومی پیداوار کا ۳ر۵ فیصد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدی کے اختتام تک مالی وسائل دوگنے کرنا پڑیں گے۔ ہمیں یہ وسائل بڑی احتیاط اور سمجھداری سے استعمال کرنا ہوں گے۔ تعلیم کو غیر مرکوز کر کے اور مقامی نیز گاؤں پنچایتوں کو انتظام کا اختیار دے کر ہم ان کی شرکت اور جوابدہی یقینی بنا سکیں گے۔ ریاستی اور مرکزی انتظامیہ کی اعلیٰ سطحوں پر قومی امنگوں کے مطابق نصاب اور سلیبس وضع کیے جا سکتے ہیں جس سے تکنیکی، پیشہ ورانہ اور ثانوی سطحوں کی تعلیم کا راستہ ہموار ہوگا۔ سب کے لیے تعلیم کا مقصد سب کی پرعزم کوششوں سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے اسے محض سرکاری ایجنسیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ غیر سرکاری اداروں کو بھی اس میں کردار ادا کرنا ہوگا۔ لائحۂ عمل کو اس طرح روبہ عمل

"کام کے بغیر تعلیم اور فہم بے رنگ اور میکانیکی ہو جاتا ہے اور تعلیم بغیر کام کے ایک بوجھ بن جاتی ہے۔"

میں لانا ہوگا کہ تفریق اور عدم توازن دور ہو اور مقصد پورا ہو۔ ہمیں اپنے بچوں کا روشن مستقبل یقینی بنانے کے لیے عمل کرنا ہے۔

ڈاکٹر ڈی سوامی نادھن

اعلیٰ تعلیم کو زیادہ بامقصد بنانے کی ضرورت

زیر نظر مضمون کے مصنف کا کہنا ہے کہ آج ہمارے ملک میں اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم سخت آزمائش سے گذر رہی ہے۔ عالمی بیداری کے اس ابھرتے دور میں یہ لازم ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں، صنعتی اداروں اور قومی سطح کی آر اینڈ ڈی لیبارٹریوں کے درمیان قریبی اور مستحکم روابط قائم کئے جائیں۔ ان کی یہ رائے بھی ہے کہ یونیورسٹیوں کی مالیاتی خود مختاری انھیں زیادہ کارگر اور بامقصد بنانے میں دوررس اور دیرپا نتائج کی حامل ہوگی۔

اعلیٰ تعلیم سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے لیے ایک بیحد اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ نئی دریافت، تلاش و تحقیق کے لحاظ سے اور معیشت کے لیے افرادی قوت کی فراہمی کے ایک ذریعہ کے طور پر اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ملک کو معاشی فروغ کی سمت میں لے جانے میں اسے اہم رول ادا کرنا ہے۔

بھارت جیسے بڑی آبادی والے ملک میں انسانی وسائل کے فروغ کو ترقیاتی حکمت عملی میں اہم رول ملنا چاہیئے۔ سماجی اور معاشی ترقی میں انسانی وسائل کے فروغ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے فروغ کے لیے درج ذیل پانچ ذرائع کی نشاں دہی کی گئی ہے۔

(۱) تعلیم (۲) صحت اور اچھی غذا (۳) ماحولیات (۴) ملازمت (۵) سیاسی اور معاشی آزادی۔

یہ بنیادی ذرائع باہم مربوط اور لازم و ملزوم ہیں لیکن ان میں تعلیم کو بے حد اہم اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیم اگرچہ اپنی تمام شکلوں میں انسانی وسائل کے فروغ کے لیے بے حد اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم ہی معاشی ترقی کے راستے سے عوام کی زندگی کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتی ہے اس لیے اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو بامقصد ہونا چاہیئے، تاکہ وہ سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا احاطہ کر سکے۔

موثر ترقی

آزادی کے فوراً بعد ہمیں اپنی زراعتی غلبہ والی معیشت کو صنعتی معیشت کی طرف لے جانے کے تیز رفتار چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کے لیے حکومت کو اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے اداروں، ریسرچ لیبارٹریوں اور صنعتوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم کرنا پڑا۔ اس کی بدولت اعلیٰ تعلیم کا فروغ کافی پُر اثر رہا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ہمارے یہاں ۲۷ یونیورسٹیاں تھیں، ۶۹۶ کالج تھے۔ ان میں زیر تعلیم طلبا کی مجموعی تعداد ۳٫۶۸ لاکھ تھی۔ تعلیم دہندگاں کی تعداد ۲۴۱۹۰ تھی۔ اس کے بعد سے یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۷۷ ہوگئی۔ کالجوں کی تعداد ۷۱۲۱ تک پہنچ گئی۔ ان میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد ۴۴٫۲۵ لاکھ اور اساتذہ کی تعداد ۲،۱۳،۱۲۵ تک جا پہنچی۔ طلبا کے داخلے میں ۴٫۲ فیصد کے موجودہ اضافے کے حساب سے ۱۹۹۵ء کے آخر تک طلبا کی تعداد ساٹھ لاکھ کے ارد گرد پہنچ جانے کا امکان ہے۔

بھارت میں تعلیم کی ترقی کا ایک حوصلہ افزا پہلو عورتوں کے داخلے میں تیز رفتار اضافہ ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں خواتین کے داخلے کا تناسب ۳۲٫۵ فیصد تک پہنچ گیا تھا۔ اگر اضافے کا رجحان توقع کے مطابق جاری رہا تو اعلیٰ تعلیم کی مانگ میں اور اضافہ ہوگا۔

بھارت میں تکنیکی تعلیم کے میدان میں جو توسیع ہوئی ہے اس کی رفتار بھی حوصلہ افزا رہی ہے۔ آزادی کے وقت ہمارے یہاں تکنیکی تعلیم کے ڈگری سطح کے اداروں کی تعداد صرف ۳۸ تھی جب کہ ان میں داخل طلبا کی تعداد ۲٫۹۴۰ تھی۔ ڈپلوما والے اداروں کی تعداد ۵۳، اور ان میں داخل طلبا کی تعداد ۳۶۷۰ تھی۔ اب تکنیکی اداروں کی تعداد ڈگری سطح پر ۳۵۰، اور ڈپلوما سطح پر ۹۵۰ ہے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد بالترتیب ۱،۶۸۰۰۰ اور ۲،۶۰۰۰۰ ہے۔ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی میں پوسٹ گریجویٹ کورس چلانے والے اداروں کی تعداد ۱۹۰ ہے اور زیر تعلیم طلبا کا سالانہ تناسب ۸۵۰۰ ہے۔ مزید برآں مینجمنٹ کی تعلیم کے (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کے چار اداروں سمیت) تقریباً ۱۵۰ ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ ان میں زیر تعلیم طلبا کا سالانہ تناسب چار ہزار ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور تکنیکی تعلیم کے اداروں نے اپنے اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کرکے قابل تعریف کام انجام دیا ہے۔

تعلیم (بشمول عام، اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم) کے لیے مختلف پلانوں کے تحت جو مصارف منظور کیے گئے ہیں انھیں ٹیبل نمبر ۱ میں دکھایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے لیے مختص مصارف

میں سے اعلیٰ تعلیم کا فیصد تناسب (چھٹے پلان کے ۲۰ر۸۹ فیصد سے لے کر آٹھویں پلان کے ۱۴ر۲۰ فیصد تک) بدلتا رہا ہے۔ اسی طرح تکنیکی تعلیم کے مصارف بھی مذکورہ مدت میں بالترتیب ۱۲ر۸۸ فیصد سے لے کر ۱۴ر۲۱ فیصد تک کے حساب سے بدلتے رہے ہیں۔

گذشتہ چند سال کے دوران بین الاقوامی سطح پر غیر متوقع اور حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا گہرا اثر بین الاقوامی تعلقات اور عالمی معیشت پر بھی پڑے گا۔ اس مدت میں بہت سے ترقی پذیر ملکوں نے اپنی اپنی معیشت کی نئی تشکیل کرتے ہوئے متعدد جرأت مندانہ اصلاحی قدم

اعلیٰ تعلیم اور تکنیکی تعلیم کے اداروں نے اپنے اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے قابل تعریف کام انجام دیا ہے۔

اٹھائے ہیں اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر معاشی فروغ کے مقابلوں کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ بلاشبہ ان تمام تبدیلیوں کا اثر بھارت کی معیشت پر بھی پڑے گا۔ حالیہ مدت میں بھارت بھی معیشت کی راہ میں ایک تاریخی مرحلے سے گذر رہا ہے۔ سرکار نے ملکی معیشت کی تشکیل کے لیے نئے قدم اٹھائے ہیں۔ نئے جرأت مندانہ فیصلے کیے ہیں تاکہ ملک کے معاشی بحران کا مقابلہ کیا جا سکے۔ آٹھواں پنج سالہ منصوبہ معاشی فروغ کے بعض اہم پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع کیا گیا ہے۔

عالمی سطح کی تبدیلیوں اور قومی معیشت کی سطح پر کیے گئے اقدامات کے نتیجے میں عالمی بیداری کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا ہے۔ آج بھارت کی صنعت عالمی اور دیسی سطح پر زبردست مقابلے کا سامنا کر رہی ہے۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے صنعت کو جدید کاری، افرادی قوت کی صلاحیت میں ترقی، جدید مینجمنٹ تکنیکوں کے استعمال، بہتر کارکردگی اور بہتر کوالٹی کے ساتھ زیادہ پیداواری صلاحیت کی ضرورت ہوگی۔ ان مقاصد کی برآوری کے لیے سائنسی ذہن اور مزاج رکھنے والی ایسی ورک فورس چاہیئے جو عالمی معیاروں کے مطابق اعلیٰ کوالٹی برقرار رکھ سکے اور پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ کرے۔ اس کے لیے متعلقہ "آر اینڈ ڈی" کی جدوجہد کو بڑھانا ہوگا اس لیے اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم اور تحقیق کو نئے

چیلنجوں کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اچھی صلاحیت والے مردوں اور عورتوں کو عالمی معیاروں کے مطابق ٹریننگ دینی ہوگی۔ اسی طرح قومی سطح کی آر اینڈ ڈی لیبارٹریوں کو صنعت کی خاطر مطلوبہ "آر اینڈ ڈی" صلاحیت کو بڑھانا ہوگا۔ صنعتی اداروں کو تحقیقی اور تکنیکی مدد فراہم کرنی ہوگی تاکہ ہماری مصنوعات عالمی سطح کے مقابلوں کا سامنا کر سکیں۔ دوسری طرف بھارت کے صنعت کاروں کو چاہیئے کہ وہ اندرون ملک دستیاب "آر اینڈ ڈی" صلاحیت پر بھروسہ رکھیں اور باہر سے ٹکنالوجی حاصل کرنے کے ارادے سے باز رہیں۔

خامیاں

تیزی سے بدلتے معاشی منظر اور اس کے لازمی نتائج سے صرف نظر کر کے جب ہم اپنے اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے سسٹموں کی طرف دیکھتے ہیں تو اس میں بہت سی خامیوں کا احساس ہوتا ہے، جیسے کہ مانگ میں اضافہ، غیر معیاری تکنیکی اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد، کوالٹی اور معیار میں گھٹیا پن، اکیڈمک کیلنڈر

اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم اور تحقیق کو نئے چیلنجوں کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اچھی صلاحیت والے مردوں اور عورتوں کو عالمی معیاروں کے ٹریننگ دینی ہوگی۔

کو برقرار رکھنے میں ناکامی، فرسودہ نصاب تعلیم، تکنیکی تربیت۔ کم معیاروں میں نابرابری، ناکافی وسائل، ریسرچ کے لیے ناکافی مدد، فرسودہ مینجمنٹ سسٹم وغیرہ۔ ضروری ہے کہ ہم بدلتے معاشی منظر اور اپنے سسٹم کی خامیوں کی طرف توجہ دیں اور انھیں دور کرنے کے لیے معقول اقدامات کریں تاکہ تکنیکی تعلیم اور ریسرچ زیادہ بامقصد بن سکے۔

فوری توجہ کے میدان

پلاننگ کمیشن کی طرف سے "طوفانی ذہن" (BRAIN STORMING) کے عنوان سے

جو سیمینار ہوئے ان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے درج ذیل میدانوں کی نشان دہی کی گئی۔

(۱) اعلیٰ تعلیم کے لیے مربوط لائحہ عمل (۲) اعلیٰ تعلیم میں بہتر معیار (۳) اعلیٰ تعلیم کے سسٹم کو مالی طور پر خود کفیل بنانے کی جدوجہد کے دوران تعلیمی پروگرام کی اس انداز سے توسیع کہ وہ سب کے لیے یکساں اور اخراجات کے مطابق فائدہ پہنچانے والا ہو۔ (۴) سماجی اور معاشی تبدیلیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کا اس طرح اہتمام کہ وہ نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ (۵) احادیث پر مبنی تعلیم کی ترقی (۶) یونیورسٹیوں میں مینجمنٹ سسٹم کا استحکام۔

اہم کام

ہمارے ملک میں اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم آزمائشی مرحلے میں ہے۔ بدلتے ہوئے منظر میں اعلیٰ تعلیم کو دو اہم چنوتیوں کا سامنا ہے۔ وہ ہیں۔

(الف) وسائل کی کمی کی صورت میں حالات سے نمٹنے کی کوشش اور (ب) صنعت اور معیشت کے متعلقہ سیکٹروں کو ان کی مانگ کے مطابق مستعد افرادی قوت اور اعلیٰ درجے کی آر اینڈ ڈی مدد کی فراہمی۔

یہ مقاصد صحیح رہنمائی اور مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(الف) وسائل کا بھرپور استعمال (ب) وسائل کی حرکت پذیری (ج) اشتراک عمل۔ مربوط کام اور سہولیات میں ساجھے داری (د) آر اینڈ ڈی کی مدد کا صحیح استعمال (ہ) باصلاحیت اور مستعد افرادی قوت کی توسیع اور (و) بین الاقوامی تعاون اور اشتراک عمل کی ذمہ داری سنبھالنا۔

اشتراک عمل

یونیورسٹیوں کو تجارتی و صنعتی سیکٹروں اور قومی سطح کی "آر اینڈ ڈی" کے ساتھ اشتراک عمل کی راہ نکالنی چاہیئے۔ یہ اشتراک عمل معاشی ترقی میں بے حد اہم رول ادا کرے گا۔ آج کی دنیا میں باہمی انحصار

اور اشتراک عمل مسلم حقائق ہیں۔ تعاون اور اشتراک عمل کے ایک مضبوط نیٹ ورک کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وسائل محدود ہوں۔ اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے اداروں کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ بیرونی دنیا یعنی سماج، حکومت، متوازی حیثیت کے اداروں اور کمتر حیثیت کے اداروں، صنعتی تنظیموں وغیرہ کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔ اس طرح کے اشتراک عمل کے نتیجے میں جو کامیابی حاصل ہوگی اس میں سب ہی متذکرہ بالا اداروں کا حصہ ہوگا اور اس سے قومی ترقیات کے مقصد کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ چونکہ ہندوستانی صنعت کو آج عالمی مقابلے کا سامنا ہے اس لیے اس کو یونیورسٹیوں اور قومی "آر اینڈ ڈی" کی طرف سے رہنمائی

> **یونیورسٹیوں کو تجارتی، صنعتی سیکٹروں اور قومی سطح کی "آر اینڈ ڈی" کے ساتھ اشتراک عمل کی راہ نکالنی چاہئے۔ یہ اشتراک عمل معاشی ترقی میں بہت اہم رول ادا کرے گا۔**

اور تعاون کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورتحال میں قومی آر اینڈ ڈی کو فنڈ کی بھی ضرورت ہوگی اور وہ ایسے فنڈ انڈسٹری اور ایسے دیگر اداروں کے اشتراک سے حاصل کرے گی جو اس کے اکویمنٹ اور مہارت سے فائدہ اٹھائیں گے۔

روابط

اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ بامقصد بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں، صنعتی شعبوں اور نیشنل آر اینڈ ڈی لیباریٹریوں کے درمیان گہرے روابط قائم کیے جائیں۔ اس تال میل کا نتیجہ درج ذیل مقاصد کے حصول کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

(۱) وسائل میں ساجھے داری اور ان کا بھرپور استعمال (۲) ایک دیسی ٹکنالوجی کا فروغ جو ہماری قومی ترجیحات اور وسائل کے لحاظ سے موزوں ہو۔ (۳) ضرورت پڑنے پر درآمد ٹکنالوجی میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ وہ ہماری صنعت کو عالمی مقابلے کا سامنا کرنے کے قابل بنا سکے۔ (۴) یونیورسٹی کی تعلیم و تحقیق کو متعلقہ میدانوں میں ہوئے عملی تجربے سے فائدہ پہنچایا جائے۔ (۵) فنڈ کا حصول۔

اس طرح کے اشتراک عمل کا نتیجہ اعلیٰ کارکردگی

کی صورت میں ظاہر ہوگا اور اس سے قومی ترقیات کو مدد ملے گی۔ یونیورسٹی، صنعتی سیکٹر اور "آر اینڈ ڈی" لیباریٹری کے درمیان تال میل اور تعاون کے لیے مصنف کا تیار کردہ ایک ماڈل منسلکہ نمبر ۱ میں دیا گیا ہے۔ یہ ماڈل یونیورسٹیوں، قومی آر اینڈ ڈی لیباریٹریوں اور صنعتوں کے درمیان اشتراک عمل کے میدانوں کی نشاندہی کرتا ہے اگر اس ماڈل کے مطابق کام کیا جائے تو اس سے اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ بامقصد بنانے میں مدد ملے گی۔

حقیقی خود مختاری

یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیمی اداروں کو صحیح معنوں میں خود مختاری ملنی چاہئے تاکہ وہ بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق موثر طور پر کام کر سکیں اور اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ بامقصد بنا سکیں۔ یونیورسٹیوں کو علمی معاملات میں پہلے سے ہی کافی خود مختاری حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مالیاتی خود مختاری بھی ضروری ہے۔ سرکاری امداد کے سسٹم میں ضوابط کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ کئی اور پیچیدگیاں بھی ہیں۔

> **یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیمی اداروں کو صحیح معنوں میں خود مختاری ملنی چاہئے تاکہ وہ بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق موثر طور پر کام کر سکیں اور اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ بامقصد بنا سکیں۔**

تعلیمی اداروں کو صحیح معنوں میں فضیلت کا مرکز بنانے کے لیے مالی معاملات میں خود مختاری بیحد ضروری ہے۔ مالیاتی خود مختاری حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی ادارے سرکاری امداد پر انحصار بتدریج کم کرتے ہوئے اپنے طور پر فنڈ حاصل کرنے کا اہتمام کریں اس کی بدولت خود کفیلی کے لیے راہ ہموار ہوگی خود کفیلی کا مطلب ایسی استطاعت پیدا کرنا ہے کہ تعلیمی اداروں کی مالی ضروریات اور سرکار سے ملنے

والی مالی امداد کے درمیان فرق کم کیا جا سکے اور اس فرق کی وجہ سے تعلیم و تحقیق کے بنیادی کام پر کوئی اثر نہ پڑے۔

اجتماعی فنڈ

یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیمی ادارے کے لیے ایک اجتماعی فنڈ یا کارپس فنڈ (CORPUS FUND) کا قیام خود کفیلی کی راہ میں ایک اہم قدم ثابت ہوگا یہ 'ENDOWMENT FUND' کی شکل میں ہوگا اس طرح کے فنڈ سے حاصل شدہ سرمایہ اس کا گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امداد پر انحصار کم کر سکے گا۔ "کارپس فنڈ"، یونیورسٹی، صنعت، فلاحی ٹرسٹ وغیرہ کے عطیہ جات اور گورنمنٹ کی طرف سے دی جانے والی رقوم پر مشتمل ہوگا۔ اس تجویز پر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ اور یہ ادارے اب اپنے اپنے "کارپس فنڈ" قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اقدار پر مبنی تعلیم

تعلیم کو زیادہ بامقصد بنانے کے سلسلے میں ایک توجہ طلب معاملہ ہے اقدار کی تعلیم۔ اقدار پر مبنی تعلیم کی ضرورت آج سب سے زیادہ ہے ملک میں انتشار پسند قوتوں کے پھیلاؤ، علاقائی عصبیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات میں اضافے اور اخلاقی، سماجی اور قومی اقدار کے زوال کے پیش نظر ایسی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ تعلیم کے وسیلے سے انسانی اقدار کی اشاعت ایک قومی اہمیت کا معاملہ ہے۔ تعلیم کو اقدار پر مبنی کرنے کی سفارش اگرچہ متعدد اعلیٰ اختیاری کمیشنوں اور کمیٹیوں کی طرف سے کی جا چکی ہے اور اسے گذشتہ چار دہوں کے دوران قومی ترقیات کے

منصوبوں میں شامل کرنے کی منظوری بھی ملتی رہی ہے لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اسے ابھی تک ایک مخصوص تعلیمی پروگرام کے طور پر نافذ کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

اس اہم پروگرام کے نفاذ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پلاننگ کمیشن نے (جو ملک کی سب سے بڑی پالیسی ساز اور پلاننگ تنظیم ہے) ایک "کور گروپ" (COIE GROUP) اس (مضمون ہٰذا کے) مصنف کی سربراہی میں قائم کیا۔ اس کور گروپ کی رپورٹ جس میں اقدار پر مبنی تعلیم کے نفاذ کے سلسلے میں ہر تعلیمی سطح کے لیے ایک لائحۂ عمل تجویز کیا گیا ہے، پیش کی جا چکی ہے۔ اس رپورٹ کی ایک سفارش پر عمل کرتے ہوئے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت نے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مصنف کی سربراہی میں قائم کی ہے تاکہ ہر ایک تعلیمی سطح (بشمول اعلیٰ تعلیم) کے لیے اقدار کی تعلیم کے امکانات کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ کمیٹی اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر تعلیمی سطح پر اقدار کی تعلیم کے نفاذ کے لیے ایک تفصیلی خاکہ تیار کر رہی ہے۔

ختم

یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیمی ادارے کے لیے ایک اجتماعی فنڈ یا "کارپس فنڈ" (CORPUS FUND) کا قیام خود کفیلی کی راہ میں ایک اہم قدم ثابت ہوگا یہ 'ENDOWMENT FUND' کی شکل میں ہوگا۔

اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے سسٹموں کو زیادہ بامقصد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان سسٹموں کو قومی اور عالمی سطح کے تقاضوں اور بدلتے ہوئے معاشی منظر کا سامنا کرنے کے قابل بنایا جائے۔ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ذہین اور باصلاحیت مردوں اور عورتوں کو مطلوبہ آر اینڈ ڈی لیاقت کی تربیت دی جائے اور ایسے باصلاحیت لوگوں کو سامنے لایا جائے جن کی وسیع معلومات دنیا بھر میں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ہو رہی ترقی کا احاطہ کر سکے۔ مطلب یہ کہ ہمارا تعلیمی سسٹم ٹھوس بنیاد پر قائم ہو، کوالٹی برقرار رکھتے ہوئے، ضرورت کے مطابق اور بروقت عمل کرنے کے قابل ہو۔ اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ بامقصد بنانے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ تعلیمی سسٹم کو غیر ضروری پابندیوں اور سیاسی دخل اندازی سے نجات دلائی جائے۔ اور اسے مطلوبہ انتظامی، مالیاتی اور تعلیمی خود مختاری دی جائے۔ آخر میں، یہ بھی ضروری ہے کہ یہ سسٹم بجائے خود عوام کے سامنے جواب دہ ہو۔

اقدار پر مبنی تعلیم کی ضرورت آج سب سے زیادہ ہے۔ ملک میں انتہا پسند قوتوں کے پھیلاؤ، علاقائی عصبیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات میں اضافے اور اخلاقی، سماجی اور قومی اقدار کے زوال کے پیش نظر ایسی تعلیم بے حد ضروری ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

منصوبہ وار منظور شدہ مصارف

پلان	سیکٹر	مجموعی تعلیم	اعلیٰ تعلیم	تکنیکی تعلیم
۱	۲	۳	۴	۵
چھٹا (۱۹۸۰-۸۵)	مرکز	۶۵۹٫۲۱	۲۸۸٫۷۵	۱۶۸٫۰۰
	ریاستیں/مرکزی علاقے	۱۶۶۶٫۸۱	۱۹۷٫۲۵	۱۳۱٫۶۵
	میزان کل	۲۳۲۶٫ ۲	۴۸۶٫۰۰ (۲۰٫۸۹٪)	۲۹۹٫۶۵ (۱۲٫۸۸٪)
ساتواں (۱۹۸۵-۹۰)	مرکز	۱۷۳۸٫۶۴	۴۲ ٫ ۰	۲۲۰٫۰۰
	ریاستیں/مرکزی علاقے	۳۷۱۸٫۴۵	● ۵۴۱٫۱۷	۴۶۱٫۷۹
	میزان کل	۵۴۵۷٫ ۹	۹۶۱٫۱۷ (۱۷٫۶۱٪)	۶۸۱٫۷۹ (۱۲٫۴۹٪)
آٹھواں (۱۹۹۲-۹۷)	مرکز	۷۴۴۳٫۰	●● ۷۰۰٫۰۰	۸۲۴٫۰
	ریاستیں/مرکزی علاقے	۱۲۱۵۶٫۷۳	۱۴۹۵٫۶۸	۱۹۶۲٫۳۸
	میزان کل	۱۹۵۹۹٫۷۳	۲۱۹۵٫۶۸ (۱۱٫۲٪)	۲۷۸۶٫۳۸ (۱۴٫۲۲٪)

- اس سے حقیقی مصارف کا اظہار ہوتا ہے۔
- ان سے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے مجوزہ مصارف کا اظہار ہوتا ہے۔

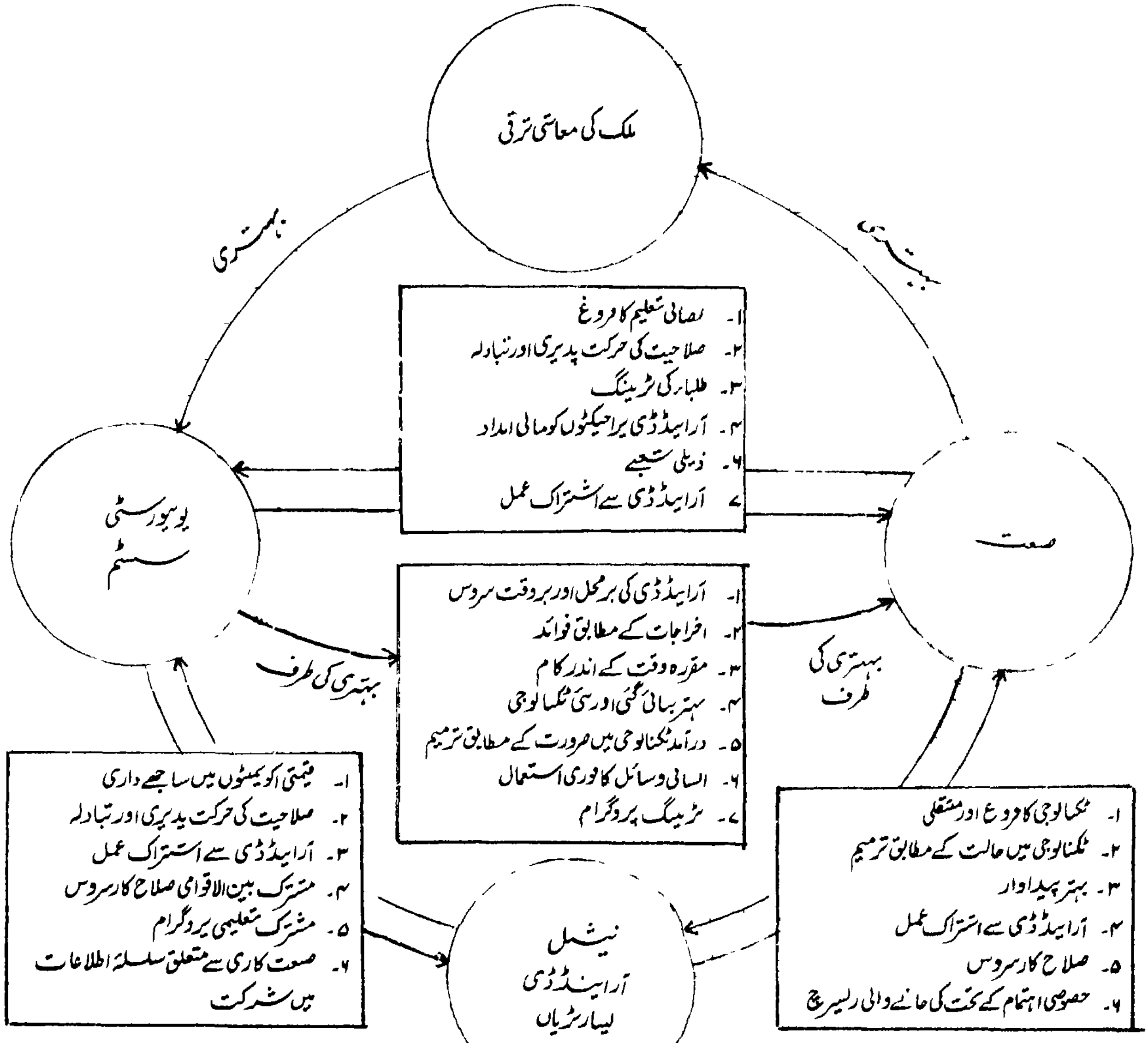
منسلکہ نمبر ا

( ) بریکٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار سے تعلیم کے لیے مختص مجموعی رقم کے فی صد تناسب کا اظہار ہوتا ہے۔

بحوالہ:- تعلیمی سیکٹر کے لیے: بیلاں کا سالانہ جائزہ

برائے ۸۷-۱۹۸۶ء، ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء
ایس اینڈ ٹی کے لیے آٹھویں پلان کی دستاویزات (۹۷-۱۹۹۲ء)

یونیورسٹی، صنعت، نیشنل آر اینڈ ڈی کے مابین اشتراک عمل کے لیے سوامی نادھن ماڈل



نوٹ: ۱۔ "یونیورسٹی سسٹم" میں انجینئرنگ، ٹکنالوجی، میڈیسن، فارمیسی، ایگریکلچر، مینجمنٹ وغیرہ کے پیشہ ورانہ ٹریننگ کے ادارے شامل ہیں۔

۲۔ "صنعت" میں معیشت کے دیگر سیکٹر بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر مالکم ایس۔ ادی سیشیہ

تعلیم۔ اقتصادی تبدیلی کا ذریعہ

صاحبِ مضمون کا کہنا ہے کہ پرائمری اور ابتدائی سطح کی تعلیم کسی بھی سماج میں بڑی اور چھوٹی سطح پر اقتصادی تبدیلی لانے کے لیے موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ غریبی ہٹانے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ تاہم اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم سے اقتصادی بہتری میں براہ راست مدد ملنی چاہیئے۔

ملک کی مطلوبہ اقتصادی تبدیلی کو ہم بڑی اور چھوٹی تبدیلی ہر دو نقطہ نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔

بڑے پیمانے پر اقتصادی تبدیلی کے لیے غریبی کم کرنے اور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ تمارنیا کی مرکزی تنظیم کے اندازوں کے مطابق غریب لوگوں کی آبادی کا تناسب جو ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۳۳٫۳۸ فیصد تھا ۱۹۹۱-۹۲ء میں بڑھ کر ۴۸٫۸۵ ہو گیا۔ اس طرح غریب لوگوں کو تعداد میں دو برس میں ۶۱ لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ دوسری اقتصادی تبدیلی کی ضرورت بے روزگاری اور کم روزگاری میں کمی کرنے اور روزگار کے اور زیادہ مواقع پیدا کرنے کی ہے۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ ملک میں بڑھ رہی اقتصادی ناہمواری کو روکا یا کم کیا جائے جس کا ذکر ریزرو بینک آف انڈیا کے جائزوں، بڑی بڑی صنعتی کمپنیوں اور تجارت میں اجارہ داری کو روکنے سے متعلق ادارے کی سالانہ رپورٹ میں کیا گیا ہے۔

چھوٹی سطح پر اقتصادی تبدیلی کے لیے متوسط اور بالائی طبقوں میں لوگوں کے رویہ میں فضول خرچی کی بجائے بچت اور کفایت کا رجحان پیدا کرنا ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۹۱-۹۲ء میں جہاں مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ کی شرح ۳٫۱ فیصد تھی وہاں فی کس کھپت کی شرح میں ۴٫۲ کا اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ صورتِ حال میں اختراعات کے استعمال اور نئے علم کو کام میں لانے کی صلاحیت کو بڑھانے کی بھی ضرورت ہے۔

چھوٹی اور بڑی سطح پر اقتصادی تبدیلیوں کے لیے تعلیم کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اس سوال کا تجزیہ کئی طرح کیا جا سکتا ہے لیکن اختصار اور وضاحت کے لیے یہ کام یہاں رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے مختلف ذرائع کی جانچ کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

رسمی تعلیم

جہاں تک رسمی تعلیم کا تعلق ہے اقتصادی تبدیلی پر اس کے اثر کی جانچ پرائمری، ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح پر کی جا سکتی ہے۔

پرائمری و ابتدائی تعلیم

کسی بھی سماج میں بڑی اور چھوٹی اقتصادی تبدیلیاں لانے کا موثر ترین ذریعہ پرائمری اور ابتدائی سطح کی تعلیم ہے۔ پرائمری تعلیم پہلے ۵ برس کا تحصیل علم ہے جب کہ ابتدائی تعلیم پہلے ۸ برس کا مطالعہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے ان دونوں سطحوں کی تعلیم کو بیسک یا بنیادی تعلیم میں اکٹھا کر دیا تھا جسے انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے پرائمری اور مڈل تعلیم کے نظام کا متبادل قرار دیا تھا۔ بعد ازاں آئین سازوں نے دفعہ ۴۵ کے ہدایتی اصولوں میں یہ ذمہ داری عائد کر دی تھی کہ سرکار آئین کے نفاذ کے دس برس کے اندر اندر تمام بچوں کے لیے ۱۴ برس کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم کا اہتمام کرے گی۔ جہاں ترقی یافتہ صنعتی ملکوں نے پرائمری اور مڈل تعلیم کی سطح ڈیڑھ سو اور دو سو برس میں حاصل کی تھی وہاں سوویت یونین میں مطلوبہ اقتصادی تبدیلیاں لانے کے لیے پرائمری اور مڈل تعلیم کی فوری ضرورت اور اس کے کردار کو تسلیم کیا گیا اور ماہر اقتصادیات اسٹرملن نے ۱۹۱۹ء میں صنعت کاری کے زبردست پروگرام کے اجرا کے موقع پر لینن کو لکھے گئے مراسلے میں تنبیہہ کی کہ وہ پن بجلی کے جو بڑے بڑے منصوبے بنا رہا ہے اور جو بڑے بڑے صنعتی ادارے شروع کر رہا ہے، مشینی کھیتی کے فارم بنا رہا ہے، مشینی آلات اور فولاد کے کارخانے لگا رہا ہے وہ سب بند ہو جائیں گے اگر اتنی ہی رقم تعلیم پر صرف نہ کی گئی۔ اسٹرملن نے یہ نتیجہ ایسے مطالعہ سے نکالا تھا جس سے پتہ چلا تھا کہ اس کے ملک میں پرائمری تعلیم کے نتیجہ کے طور پر ایک مزدور کی آمدنی اور اجرت میں ۷۹ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سوویت یونین میں تعلیم، پیداوارِیت اور آمدنی کا یہ رشتہ اس وقت قائم ہوا جب اُس کی معیشت ابھی نیم ترقی یافتہ اور بھارت کی طرح زراعتی ہی تھی۔ اس طرح بڑی اور چھوٹی سطح پر پرائمری اور مڈل تعلیم سے اہم

اقتصادی تبدیلیاں ہوتی ہیں، جن سے کسی ملک کو پیداواریت اور آمدنی بڑھانے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ سادہ مگر بنیادی ہوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اتنی تعلیم حاصل کرنے والوں میں کھیت، کارخانے یا دفتر میں پیداوار بڑھانے کے لیے اپنے مسائل کی فہم پیدا ہوتی ہے۔ جسے وہ اپنے علم، اسی پیداوار اور اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔

> صنعتی ممالک نے پرائمری اور ابتدائی تعلیم کی یہ عالمگیر سطح بتدریج ڈیڑھ سو دو سو برس میں حاصل کی تھی۔ سوویت یونین میں بھی ماہر اقتصادیات اسٹرم لن تھا اپنے ملک میں مطلوبہ اقتصادی تبدیلیاں لانے کے لیے پرائمری اور ابتدائی تعلیم کے رواج اور اس کی فوری ضرورت کا معترف تھا۔

دوسری سطح کی تعلیم عام طور پر ہائی یا ہائر سکنڈری میں دو یا ۵ برس کے لیے ہوتی ہے۔ جو قبل از پیشہ ورانہ مہارت یا پیشہ ورانہ ہنرمندی کو مدنظر رکھتے ہوئے براہ راست دی جاتی ہے۔ سماج اور افراد کے لیے یہ بنیادی تبدیلی ابھی ہمارے ملک میں نہیں آئی ہے۔ گاندھی جی کے بنیادی تعلیم کے نظام میں تحصیل علم اور آمدنی حاصل کرنے کا ساتھ ساتھ انتظام تھا۔ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ پر عمل کرتے ہوئے تعلیم کی دوسری سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کا عنصر شامل کیا گیا جس میں ثانوی تعلیم کے دو برسوں میں سے ایک برس علم اور دوسرا پیشہ ورانہ تربیت کے لیے رکھا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ثانوی درجے کی تعلیم میں داخلہ لینے والے نصف طالب علم تعلیمی شعبے میں اور باقی نصف پیشہ ورانہ شعبے میں داخل ہوں گے جس میں زراعت و صنعت دونوں ہی شامل ہوں گے۔

> یہ بات قابل ذکر ہے کہ سوویت یونین میں تعلیم، پیداواریت اور آمدنی کا یہ رشتہ اس وقت قائم ہوا جب اس کی معیشت ابھی ترقی یافتہ اور بھارت کی طرح زراعتی ہی تھی۔

اس فیصلے پر عمل درآمد میں دس برس لگ گئے۔ اور جب عمل درآمد ہوا تو دیکھا گیا کہ ہائر سکنڈری میں داخل ہونے والے صرف دو فیصد طالب علم پیشہ ورانہ شعبہ اختیار کر رہے ہیں۔ صرف تامل ناڈو میں ۲۵ فیصد طالب علموں نے پیشہ ورانہ شاخ میں داخلہ لیا۔ اس صورت حال کو درست کرنے کے لیے حکومت نے فیصلہ کیا کہ ہائی اسکول میں ہی نویں اور دسویں جماعتوں میں طلبا کو کچھ قبل از پیشہ ہنروں کی تربیت مہیا کی جائے تاکہ بڑی تعداد میں طلبا کو کچھ آمدنی حاصل کرنے کی صلاحیت مہیا کی جاسکے جو سیکنڈری سطح پر تعلیم چھوڑ دیتے ہیں اور ثانوی تعلیم کے لیے داخلہ لینے والوں میں یہ خواہش پیدا کی جاسکے کہ وہ خاص خاص اقسام کی ہنرمندی حاصل کریں جسے وہ فی الفور کھیتی، صنعت کاری، تدریس، نرسنگ، الیکٹرانکس اور بہت سے دیگر پیشوں کے لیے استعمال کرسکیں۔ اقتصادی تبدیلی لانے کا یہ اہم ذریعہ جس میں ہائی اور ہائر سکنڈری کے طلبا کو روزگار کے قابل بنایا جاتا ہے ابھی عمل میں نہیں لایا جاسکا۔

> آرٹس اور سائنس کے کالجوں میں اعلیٰ تعلیم کی اصلاحات کا حل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ طلبا کو حقیقی علم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور اس کا انحصار امتحانی نظام کی اصلاح میں ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کی کنجی ہے۔

اعلیٰ تعلیم :

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر خاص طور پر دو اقسام کی تعلیم میں مسائل پیش آتے ہیں۔ اس قسم کی پہلی تعلیم کے مسائل وہ ہیں جو عام طور پر ملک کی ۱۲ یونیورسٹیوں سے ملحق فنون اور سائنس کالجوں کی اعلیٰ تعلیم میں پیش آتے ہیں۔ یہاں پر فوری مسئلہ امتحان کے نظام کو تبدیل کرنے کا ہے جو عموماً یادداشت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس تبدیل شدہ نظام کو ہی تحصیل علم کی آزمائش بنایا جانا چاہیے۔ تاکہ افراد اور سماج کے بدلتے رجحانات کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ یہ کام تعلیم کے سلسلے کو مرحلوں میں تقسیم کرنے سے ہوسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی لگاتار داخلی جائزہ بھی ہوتا رہے گا۔ اگر یہ کام تامل ناڈو کے سائنس اور ہوم کے ۵۰ کالجوں کے ڈھنگ سے کیا جائے تو نصابات کی تجدید، پڑھنے اور پڑھانے کے طریقوں میں تبدیلی ساتھ ساتھ ہوتی جائے گی۔ اس طرح آرٹس اور سائنس کالجوں میں اعلیٰ تعلیم کی اصلاحات کا حل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ طلبا کو حقیقی علم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے جسے وہ زندگی میں استعمال کرسکیں اور اس کا انحصار امتحانی نظام کی اصلاح میں ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کی کنجی ہے۔

کچھ خود مختار کالجوں نے اس طرح کی اصلاح کی ہے لیکن زائد از پانچ ہزار کالجوں میں اقتصادی تبدیلی لانے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے طریق کار میں تبدیلی لانے کا کام ابھی کرنا باقی ہے۔ اس اصلاح کے ذریعہ کالجوں سے نکلنے والے گریجویٹ نہ صرف ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہوں گے بلکہ انھیں تجزیہ کرنے کی اہلیت میں بھی مدد ملے گی۔ اور اس سے وہ اپنے کنبے، کھیت، کارخانے یا دفتر میں پیش آنے والے کسی بھی مسئلہ کو سمجھ کر حل کرسکیں۔

اعلیٰ تعلیم کی دوسری شکل پیشہ ورانہ یا ٹیکنیکل اعلیٰ تعلیم ہے جس میں تدریس، قانون، طب بشمول نرسنگ فارمیسی، علاج دنداں، صحت اور ٹیکنالوجی، زراعت بشمول جنگل بانی، مچھلی اور پشو پالن اور دیگر پیشہ ورانہ شعبے شامل ہیں۔ اس پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل اعلیٰ تعلیم کو اقتصادی تبدیلی کا آلہ کار بنانے میں کچھ مشکلات پیش آتی ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جو طالب علم یہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن میں سے صرف ۱۰۔۱۲ فیصد طالب علم ہی داخلہ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں یا داخلے کا امتحان پاس کرسکتے ہیں۔ پیشہ ورانہ نصابات میں داخلے پر پابندی لگانا ضروری ہے ورنہ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری جو آرٹس اور سائنس کے طلبا میں پائی جاتی ہے وہ پھیل کر پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل نصابات میں

بھی آجائے گی۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ فنون اور سائنس کے کالجوں کے برعکس پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم میں عمارات لیبارٹریوں، مشینوں اور ساز و سامان پر بھاری سرمایہ کاری کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل کالجوں کے طالب علموں پر سائنس اور فنون کے کالجوں کے طالب علموں کے مقابلے میں فی طالب علم چار گنا خرچہ آتا ہے۔ خرچے میں اضافے کی وجہ سے یہ خلیج اور بھی چوڑی ہوتی جا رہی ہے۔ پیشہ ورانہ کالجوں کو درپیش تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی بڑی تیز رفتاری سے تبدیل ہو رہی ہے جس سے نہ صرف ان کالجوں کا ساز و سامان اور لائبریریوں کی کتابیں تبدیل کرنی پڑتی ہیں بلکہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیشے کی زیادہ واقفیت کلاس روم کی سرلسٹ کام پر لائبریری یا لیبارٹری میں ہی حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا کمرۂ جماعت کی تعلیم اور کام پر تجربے کے درمیان زیادہ توازن ہونا چاہیے۔ اس طرح اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم سے کھیتی، صنعت کاری، نظم و نسق تعلیم، قانون، طب وغیرہ پیشوں کے لیے درکار پیشہ ورانہ تربیت یافتہ افراد حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ تعلیم روزگار اور آمدنی بڑھا کر کے سماج اور افراد کی اقتصادی حالت میں تبدیلی لانے کے لیے زیادہ براہ راست خدمت انجام دیتی ہے۔

غیر رسمی تعلیم

اس ملک میں غیر رسمی تعلیم کے دو اہم میدان ہیں۔ پہلے میں بالغان کی تعلیم ہے جس کی تعداد ۳ کروڑ ہے۔ آج ملک میں ان لوگوں کی تعلیم کا جو انتظام کیا گیا ہے اسے اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ انھیں پڑھنے لکھنے اور ریاضی کی تعلیم دی جا سکے لیکن اس تعلیم کو بلاکوں اور دیہات میں مزید تقسیم کر کے ہر ایک گروپ کی کھیتی، صنعت یا دیگر پیشوں کی تعلیم سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ سو فیصد خواندگی کا یہ پروگرام جو کیرل سے شروع ہوا تھا اور اب دیگر ریاستوں کے ۲ سو اضلاع میں پھیل چکا ہے۔ اقتصادی تبدیلی پر ایسا اثر دکھانے لگا ہے جو ہمیں افراد، دیہات اور قصبات میں نظر آسکتا ہے۔ اس تعلیم سے جو کچھ سیکھا جاتا ہے اس کا اطلاق کسانوں، ہنرمند و غیر ہنرمند کارکنوں زرعی محنت کشوں کو پیش آنے والے مسائل پر کر کے انھیں حل کیا جاتا ہے جس سے کارکنوں پیداوار، اجرت اور روزگار میں اضافہ ہو۔

سو فیصد خواندگی کا یہ پروگرام جو کیرل سے شروع ہوا تھا اور اب دیگر ریاستوں کے دو سو اضلاع میں پھیل چکا ہے، اقتصادی تبدیلی پر اپنا اثر دکھانے لگا ہے جو ہمیں افراد، دیہات اور قصبات میں نظر آسکتا ہے۔

جنسی نابرابری کم کرنا

تعلیم دینے کے اس عمل سے خواتین کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ انھیں اس قابل بنایا جا رہا ہے کہ وہ تاڑی کی فروخت، جہیز کے مطالبے اور اموات اور قوانین کے خلاف تشدد کا مقابلہ کریں۔ خواندگی کی اس تعلیم کی مہم سے مرد و عورت میں نابرابری کو بھی کم کیا جا رہا ہے۔ یہ کمی غیر رسمی تعلیم کے شعبہ میں بھی ہو رہی ہے جہاں ناخواندہ افراد میں سے ۶۔۷ فیصد عورتیں ہیں اور رسمی تعلیم میں بھی کیونکہ پرائمری کی تعلیم حاصل کرنے

تعلیم دینے کے عمل سے خواتین کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ انھیں اس قابل بنایا جا رہا ہے کہ وہ تاڑی کی فروخت، جہیز کے مطالبے اور اموات اور قوانین کے خلاف تشدد کا مقابلہ کریں۔

والی خواتین کی تعداد۔ ۱۹۵ء میں ۵۴ لاکھ تھی ۱۹۹۱-۹۲ء میں بڑھ کر ۴ کروڑ ۳۴ لاکھ ہوگئی ہے مڈل درجے میں یہ تعداد ۵ لاکھ سے بڑھ کر ۲ کروڑ ہو گئی ہے پھر بھی تعلیم کی ہر سطح پر لڑکیوں کا تناسب کل طالب علموں میں ۳۔۳۵ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ رجحان دوسری سطح اور اعلیٰ تعلیم اور روزگار و اجرتوں و تنخواہوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خواندگی کی تعلیم سے تعلیم پانے والے افراد ان محرومیوں اور نابرابریوں سے واقف ہو جاتے ہیں جن کا وہ شکار ہوتے ہیں۔

روایتی تعلیم کی دوسری بڑی اصلاح غیر رسمی تعلیم ہے جو متعدد ریاستوں، شہروں اور دیہات میں ان بچوں کے لیے شروع کی گئی ہے جو پرائمری یا مڈل اسکولوں سے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے طلبا کو نئے اسکولوں میں لایا جاتا ہے ان کا تعلیم کا وقفہ کم کر دیا جاتا ہے اور زیادہ توجہ ان لڑکوں لڑکیوں، ان کے کھیتوں، اقتصادی ماحول اور روزگار کی ضرورت پر دی جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ غیر رسمی تعلیمی ادارے افراد اور سماج میں اقتصادی تبدیلی لانے کا براہ راست ذریعہ ہیں۔

نتائج

مختصر یہ کہ مختلف شکلوں میں تعلیم اقتصادی تبدیلی کا ایک بڑا ذریعہ ہے جس کے نتیجے کے طور پر تعلیم پانے والا شخص غریبی کی سطح سے اوپر اٹھ سکتا ہے اور جس سے ملک میں غریبی کا تناسب کم ہو سکتا ہے۔ یہ کام تعلیم پانے والے لڑکے لڑکیوں، مردوں اور عورتوں کو مختلف ہنروں کی تعلیم دے کر روزگار کے قابل بنانے سے ہوتا ہے۔ لوگوں کو تعلیم کے ذریعہ اقتصادی تبدیلی لانے کے قابل بنانے کے لیے مقابلے میں کچھ اور کام بھی ضروری ہیں جیسے کہ زراعت، صنعت اور خاص طور پر چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں سرمایہ کاری میں اضافہ کیا جائے، تکنیک اور ٹیکنالوجی کی تجدید کی جائے، ایسے پیشے شروع کیے جائیں جن میں روزگار کی صلاحیت زیادہ ہو اور ہمارے سماج میں جو نابرابریاں پائی جاتی ہیں انھیں نمایاں طور پر پیش کیا جائے۔ اگر یہ ضروری شرائط پوری ہوں تب ہی تعلیم افراد، کنبے اور سماج میں اقتصادی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

پروفیسر امرک سنگھ

اعلیٰ تعلیم: کچھ مسائل، کچھ تجاویز

اعلیٰ تعلیم کے موجودہ نظام سے متعلق اس فکر انگیز جائزے میں مصنف نے متعدد دلچسپ سوال اٹھائے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مصنف کی رائے میں، بیشتر خامیوں کے اسباب، سیاسی تنگ نظری، بنیادی تعلیم کے تئیں لاپرواہی اور قومی ہمارے کے تئیں اعلیٰ اداروں میں یکجا ارادوں کے فقدان جیسے عوامل بنتے ہیں۔ داخلہ، امتحانات اور اساتذہ کے کام کے اوقات وغیرہ کے بارے میں بھی مصنف کی تجاویز قابلِ غور ہیں۔

ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق جو تجاویز سامنے آئی ہیں ان میں دو کمزوریاں نمایاں ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تجاویز میں تعلیم کے غیر ملکی نمونوں پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے اور ان باتوں کا اطلاق اُس حد تک ہمارے یہاں کی صورتحال پر نہیں ہوتا۔

تعلیم ہر سطح پر، مقامی صورت حال سے جڑی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان باتوں کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ خواندگی کی سطح کیا ہے، سرمایہ کس حد تک دستیاب ہے، تنظیمی ڈھانچہ کیا ہے، سرکاری پالیسی اور ضابطہ کارکردگی کن خطوط پر وضع کیے گئے ہیں۔ کلاس میں جو پڑھائی ہوتی ہے اس پر طلبا کی کس حد تک توجہ ہوتی ہے؟ اس کے علاوہ اور بھی کچھ عوامل ہوتے ہیں جن کا ذکر کرنا، یہاں غیر ضروری ہے۔ ان تمام چیزوں سے قطع نظر، ہماری صورت حال اُن دوسرے ممالک کی صورتحال سے مختلف ہے، جنھیں بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی عامل، ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتا۔

اسی سے جڑا ہوا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ غلط نمونوں اور ٹھوس نوعیت کے معاملات کے تئیں ہماری عدم توجہی کے باعث اعلیٰ تعلیم سے متعلق بیشتر تجاویز ایسی سفارشات کے ساتھ آتی ہیں کہ مجموعی طور پر وہ ناقابل عمل ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اعلیٰ تعلیم کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا تو وہ اتنا ہی غلط ہوگا جتنا کہ یہ کہا جائے کہ بعض اچھی تجاویز کو اس دباؤ کے تحت بددلی سے نافذ کیا جاتا ہے جس میں ہم کام کرنے کے عادی ہیں۔ اور اگر انھیں نافذ نہ کیا جاسکا تو ہم اسے سیاسی عزائم کی کمی سے تعبیر کرتے ہیں۔

سیاسی عزم کی کمی، بلاشبہ ایک اہم سبب ہے۔ تاہم مختصراً اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں سے زائد عرصے سے، ہمارا ملک ایک خاص قسم کے ترقیاتی حکمتِ عملی کے تحت کام کر رہا ہے۔ اگر ایسی تجاویز سامنے آتی ہیں جو حکمتِ عملی میں زبردست تبدیلی کی متقاضی ہوں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ ایسی تجاویز کی حمایت کرنے کے باوجود ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ نظام تعلیم کا ڈھانچہ بنانے کی ضرورت اپنی جگہ، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم عوامل سامنے آتے ہیں جنھیں منظم کرنا ضروری ہوگا۔

وہ لوگ جن کا شعبۂ تعلیم سے تعلق ہے وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ منصوبہ سازی کے سلسلے میں ایک خاص حد سے زیادہ اثر انداز ہوں اور ایک وسیع تر دائرۂ کار متعین کرسکیں (ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم ہے اور ان کے پاس کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں) دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا دائرۂ اثر بہت محدود ہے اور پالیسی متعین کرنے کے قطعی فیصلے پر اثر انداز ہونا ان کے بس میں نہیں ہے۔ جون ۱۹۹۱ء میں جو اقتصادی اصلاحات شروع ہوئیں، انھیں بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

توازن ادائیگی کا مسئلہ، انتہائی سنگین ہو چکا تھا، جس کے باعث ہندوستان کو معیشت کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ انہی تبدیلیوں کو آزاد روی سے تعبیر کیا گیا۔ یہ تبدیلیاں بھی آسانی سے رونما نہیں ہو رہی ہیں۔ دراصل ان اقتصادی پالیسیوں کو مطلوبہ سیاسی حمایت نہیں حاصل ہو پا رہی ہے۔ کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

دوسری حد بندی یہ ہے کہ بیشتر سیاستداں صرف آج کے بارے میں سوچتے ہیں۔ کل کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ انھیں ایک ایک دن کی مہلت ملتی ہے اور وہ مشکل ہی سے ایسے فیصلے کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں جو طویل مدت حکمت عملی کے حامل ہوں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ تعلیم کا شعبہ کچھ ایسا ہے کہ اس میں قطعی اور مطلوبہ نوعیت کے نتائج حاصل کرنے میں، ایک نسل سے کم کی مدت درکار نہیں ہوتی۔ پچھلی چند دہائیوں کے دوران بنیادی یا

ابتدائی تعلیم کے تئیں جو لاپرواہی سیاست دانوں نے برتی ہے اس کی کوئی اور مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ نظریاتی طور پر تو سبھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن عملی طور پر بنیادی تعلیم کو باقاعدہ اور منظم طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ آج اس صورت میں نظر آرہا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی میں دس سے پندرہ فیصد کا فاصل اضافہ ہوا ہے۔ اب ہم اس صورتحال کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے اگر ہم نے ہر شخص کی خواندگی کو یقینی بنایا ہوتا اور دستور میں درج ہدایات کے مطابق کام کیا ہوتا تو ۱۹۶۰ء تک یہ کام مکمل ہو جاتا اور حالات قطعی مختلف ہوتے۔

ان تمام حالات کے نتیجہ میں ایک ہی چیز ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ایسی بہت سی مجبوریاں پیدا ہوگئی ہیں جنھیں ذہن میں رکھنا ضروری ہوگیا ہے۔ اگلے صفحات میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے جو سختی سے قابلِ عمل ہوں تاکہ صرف ایسی تجاویز پیش کی جائیں جنھیں نافذ کرتے وقت معیشت یا متعلقہ سیاسی ڈھانچے میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہ پیش آئے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے ہر شخص منظور کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے حد درجہ احتیاط پسندی سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن اس کے بارے میں بہتر طور پر شاید یہ کہا جاسکے گا کہ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ موجودہ حد بندیوں کو سمجھا جاسکے۔

> **پچھلے چند دہائیوں کے دوران بنیادی یا ابتدائی تعلیم کے تئیں جو لاپرواہی سیاستدانوں نے برتی ہے اس کی کوئی اور مثال مشکل ہی سے ملے گی نظریاتی طور پر تو سبھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن عملی طور پر بنیادی تعلیم کو باقاعدہ اور منظم طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ آج اس صورت میں نظر آرہا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی میں دس سے پندرہ فیصد کا فاصل اضافہ ہوا ہے۔ اب ہم اس صورت حال کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے۔ اگر ہم نے ہر شخص کی خواندگی کو یقینی بنایا ہوتا اور دستور میں درج ہدایات کے مطابق کام کیا ہوتا تو ۱۹۶۰ء تک یہ کام مکمل ہو جاتا اور حالات قطعی مختلف ہوتے۔**

۲

بعض باتوں کے ذکر سے گریز کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طرح کا فیصلہ کیا گیا کہ کیا کچھ ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔ کیا کچھ ہونا چاہئے، اسے مجموعی طور پر حاشیہ کی تحریر سمجھنا چاہئے اور یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی مختلف انداز سے تشریح کی جاسکتی ہے۔ اس میں صرف ایک احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ تعلیم کے شعبہ میں احتجاج کے ذریعہ سیاسی نوعیت کی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ احتجاج سے کام نہیں بنتا اور نہ ہی بے اطمینانی کا آزادانہ اظہار، اُن افراد یا حالات کو متاثر کرسکتا ہے جو بنیادی طور پر سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

دراصل کام اُس صورت میں بن سکتا ہے جب موجودہ انتظامی ڈھانچے سے مطابقت پیدا کی جائے (اگرچہ ہر معاملے میں یہی بات صادق نہیں آتی) دوسری اہم بات یہ ہے کہ اصل سابقہ اساتذہ سے پڑتا ہے سیاست دانوں سے نہیں۔ یہ صورتحال کسی حد تک واضح ہو جائے گی اگر ہم قومی سطح کے، اعلیٰ تعلیم کے تینوں اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔ ان کے اداروں کی کارکردگی میں گراوٹ آئی۔

> **یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ سیاسی قیادت اپنی پسند کا سربراہ منتخب کرے اور ہر طرح سے اس کی حمایت کرے۔ کیا اس طرح کی توقع کرنا، ضرورت سے زیادہ مطالبہ کرنے کے مترادف تصور کیا جائے گا؟**

ان اداروں میں میڈیکل کونسل آف انڈیا سب سے پرانا ہے۔ لیکن یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ اداروں کے معاملات اسی کو نمٹانے پڑتے ہیں اور اس کے فیصلے سے تقریباً دو لاکھ اساتذہ اور کم و بیش ۴۰ لاکھ طلبا متاثر ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں ریاستی حکومتیں بھی اس کے فیصلوں سے متاثر ہوتی ہیں اور متعدد معاملات میں انھیں، اس کی باتوں پر غور کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود یو جی سی کچھ برسوں سے زوال پذیر نظر آتا ہے۔

اس جائزہ میں بعض باتوں پر بحث ہو چکی ہے لہٰذا انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے لہٰذا اس میں کہیں زیادہ بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دو شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ ادارے کا سربراہ یعنی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین (۱) تعمیری طرزِ فکر کا حامل اور جرأت مند شخص ہو (۲) وہ حکومت سے بھرپور اور مثبت نوعیت کی حمایت حاصل کرسکے۔ اِن شرائط کے پورے ہو جانے کے بعد صورت حال میں بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔

ان دونوں میں سے اوّلین اہمیت کی حامل یہ بات ہے کہ ایک معقول سیاسی قیادت ہو کیونکہ اس کے بغیر، ادارے کے سربراہ کے لیے کام کرنا مشکل ہوگا۔ چونکہ برسوں تک ایک خاص انداز سے کام ہوتا رہا ہے، اس لیے اس ادارے کو خصوصی مفادات کے حامل افراد نے گھیر رکھا ہے۔ ان لوگوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے سیاسی پشت پناہی ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ متعدد قسم کے تعلیمی معاملات میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں وہ سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس صورت میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ سیاسی قیادت اپنی پسند کا سربراہ منتخب کرے اور ہر طرح سے اس کی حمایت کرے۔ کیا اس طرح کی توقع کرنا ضرورت سے زیادہ مطالبہ کرنے کے مترادف تصور کیا جائے گا؟

اگر میڈیکل کونسل آف انڈیا (ایم سی آئی) کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اختیارات اور کارکردگی میں سنگین قسم کی خامی موجود

ہے۔ ایک بار جب کوئی یونیورسٹی کسی میڈیکل کالج کو منظوری دے دیتی ہے تو ریاستی حکومت اس بات کے لیے مجبور ہو جاتی ہے کہ اندرون ریاست وہ اس کی ڈگری یا سند کو بھی منظور کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو ایم سی آئی سابقہ صورت حال سے سمجھوتہ کرتی ہے یا پھر کوئی سخت قدم اٹھائے۔ لیکن عموماً یہی ہوتا ہے کہ سابقہ صورت حال برقرار رہتی ہے۔

خوش قسمتی سے اب سپریم کورٹ نے مداخلت کی ہے اور دباؤ ڈال کر جو بدعنوانی کا ماحول پروان چڑھتا رہا ہے اس پر ایک حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیکل کونسل ایکٹ میں ترمیم کی جائے اور ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جس کے تحت نئے انتظام میں بہتری پیدا کی جا سکے (یہ مسئلہ پچھلی ایک دہائی سے التوا میں پڑا ہوا ہے۔)

جہاں تک آل انڈیا کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کا سوال ہے تو اب یہاں بھی کل وقتی چیرمین حال کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ادارے میں پیشہ ورانہ ڈھنگ سے کام ہوگا۔ منصوبہ بندی اور رابطہ قائم کرنے کی ذمہ داریوں کے علاوہ اس ادارے کو اب یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ ٹیکنیکل اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مناسب اقدام کرے لیکن اس سمت میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے اگرچہ اسٹاف سے متعلق کچھ کام آگے بڑھا ہے۔ اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے نہ صرف منصوبے بنانے کی ضرورت ہے بلکہ اس پر سختی سے عمل کرنا بھی لازمی امر بن جاتا ہے۔ ٹیکنیکل تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے دوسرے شعبوں میں بھی یہی اقدام کیے جانے چاہئیں اور وہاں بھی پیشہ واریت کو فروغ دیا جانا چاہیے۔

ان تینوں اداروں پر جو خاص طور سے بحث کی گئی ہے، اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تینوں ادارے پہلے ہی سے موجود ہیں دوسری خاص بات یہ ہے کہ انھیں بھرپور اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور اگر ان اختیارات کا صحیح استعمال کیا جائے تو بڑے دور رس نوعیت کے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب تک جو مسئلہ درپیش رہا ہے وہ یہ ہے کہ نہ تو یہ ادارے سرگرم ہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ساتھ میں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھیں خاطر خواہ سیاسی حمایت بھی حاصل نہیں ہے جو اس طرح کے اداروں کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ بہت ساری خامیوں کے خود یہ ادارے ذمہ دار نہیں رہے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جو ذمہ داری ان کی اور صرف ان کی ہے، اس سے بھی مشکل ہی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یو جی سی ایکٹ میں ۱۹۸۵ء ہی میں ترمیم کر دی گئی تھی جس کے تحت اسے یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ ہر سطح پر فیس کا تعین کرے۔ اگر یو جی سی نے اپنی یہ ذمہ داری نبھائی ہوتی تو سپریم کورٹ کو معاملات میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔

۳

جب سیاسی حمایت کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بنیادی حقیقتوں کو ذہن میں رکھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مختلف ریاستیں کس طرح اپنی حدود میں رہ کر کام

> **قابلِ غور بات یہ ہے کہ ریاستی سطح پر تعلیم سے متعلق انتظامی معیار وہی رہا جو پہلے تھا یعنی انیسویں صدی جیسا۔**

کرتی ہیں۔ اعلیٰ اور پیشہ ورانہ سطح پر جو کچھ کیا جاتا ہے اس کے ۹۵ فیصد حصے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ریاستیں کس طرح کام کرتی ہیں، اور کتنی لگن کے ساتھ ان معاملات میں اپنے آپ کو ملوث کرتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف ریاستوں کی صورتحال مختلف ہوتی ہے۔ بہت کچھ کا انحصار ان سیاستدانوں کی ذاتی خصوصیات اور ارادوں پر ہوتا ہے جن کے ذمہ تعلیم کا شعبہ ہوتا ہے۔۱

البتہ انتظامی سطح پر ایک اہم مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تعلیم کا محکمہ بھی جنگلات اور سیاحت جیسا ہی ایک محکمہ ہوتا ہے۔ ان تمام محکموں میں ایک سکریٹری مقرر کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک شخص کے ذمہ کئی محکمے بھی ہوتے ہیں۔ اب ایک بنیادی نقطہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ریاستی بجٹ کا کم و بیش ایک چوتھائی حصہ تعلیم پر صرف ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انتظامی اعتبار سے تعلیم کے محکمہ کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جتنی اہمیت مذکورہ شعبوں کو دی گئی ہے۔۱۱

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتحال یہ ہے کہ تعلیم کا محکمہ بھاری بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ متعدد ریاستوں میں اس شعبے سے وابستہ ملازمین کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اگر ان کا ایک معمولی حصہ بھی کسی معاملے میں سکریٹری سے ملنا چاہے تو بھی ہر روز سیکڑوں افراد اس کے یہاں پہنچیں گے۔ لہٰذا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس محکمے کا سکریٹری کام کے بوجھ سے لدا ہوا ہو۔ بعض ریاستوں میں سکریٹری کی معاونت کے لیے کچھ سینئر افسران بھی مقرر کیے جاتے ہیں۔ تاہم اصل بوجھ سکریٹری ہی کو برداشت کرنا پڑتا ہے جہاں تک اس کے کام کی نوعیت اور اہلیت کا سوال ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ کو بلاشبہ تعلیم کے فروغ سے دلچسپی ہوگی لیکن بیشتر افراد کے لیے یہ کام اتنا ہی اچھا یا برا ہوتا ہے جتنا دوسرے محکموں کا کام۔۱۱۱

لہٰذا ان حالات کی روشنی میں ۱۹۸۶ء میں یہ پالیسی وضع کی گئی کہ ہر ریاست میں اعلیٰ تعلیم کی ایک ریاستی کونسل قائم کی جائے گی۔ اس کے دو مقاصد تھے ایک مقصد تو یہ تھا کہ سکریٹری کا بوجھ کم کیا جائے۔ ثانوی سطح سے آگے کے معاملات کی دیکھ بھال یہ کونسل کرے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ کونسل پیشہ ورانہ معاملات پر نظر رکھے، خاص طور سے اس صورت میں جب پیشہ ورانہ تعلیم کی دیکھ بھال بھی اسی کی ذمہ داری ہو۔۱۷

لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک چند ہی ریاستوں میں ایسی کونسلیں بن پائی ہیں اور ان میں بھی پیشہ ورانہ نقطۂ نظر پر خاص توجہ نہیں دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی کارکردگی خامیوں سے پُر رہی یا ان پر ضرورت سے زیادہ سیاسی شخصیتوں کا دباؤ رہا۔ ان کی تشکیل کے پیچھے اصل مقصد یہ کارفرما تھا کہ انھیں زیادہ سے زیادہ بااختیار بنایا جائے اور اسی طرح یہ وہ پیشہ ورانہ سطح پر رابطے کا کام انجام دیں جس سطح پر کم و بیش مرکزی ادارے کام کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے اداروں کے لیے جس طرح کے اختیارات درکار ہوتے ہیں، وہ ریاستی حکومتیں نہ دے سکیں۔ ایسا کیوں نہ ہو سکا، اس کے اسباب پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ریاستی سطح پر تعلیم سے متعلق انتظامی معیار وہی رہا جو پہلے تھا۔ یعنی انیسویں صدی جیسا۔

نچلی سطح کے بعض دباؤ کے باعث منصوبہ

سازوں کے نقطۂ نظر میں بڑی ناخوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں تعلیم سے متعلق بجٹ کا جو خاکہ تیار کیا گیا تھا، اس میں ابتدائی تعلیم کے لیے ۵۶ فیصد رقم مخصوص کی گئی تھی لیکن بعد کے برسوں میں اس میں کمی واقع ہونے لگی اور ۶۹۔۱۹۶۶ء کے دوران تو یہ سطح گر کر ۲۴ فیصد پر آگئی۔ لیکن اس کے بعد صورتحال بہتر ہوئی اور آٹھویں پلان کی مدت میں یہ رقم ۴۷ فیصد ہو گئی۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی دباؤ بڑھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، بیشتر لوگ اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ انتظامی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی لائی جائے۔ کوئی اگر اس میں دلچسپی لے بھی تو وہ افسران کوئی دلچسپی نہیں لیں گے جن کا انتظامی امور پر کنٹرول ہوتا ہے۔ نیا ڈھانچہ بننے کی صورت میں، انھیں گھاٹا ہوگا۔

۴

تاہم کچھ کام ایسے بھی ہیں، جو نسبتاً آسانی سے انجام دئے جاسکتے ہیں۔ اگر ابھی تک اُن پر عمل نہیں ہو سکا ہے تو اس کی کوئی اور وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ متعلقہ افراد سست روی اور عدم توجہی سے کام لیتے ہیں اور کسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ خصوصی مفادات کے حامل افراد کو کہیں کہیں معمولی سی مشکلات درپیش ہوں گی لیکن ایک خاص حد سے زیادہ ان کے مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر مناسب وقت پر صحیح ڈھنگ سے تھوڑی سی بھی کوشش کی جائے تو وہ تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں جن کی یہاں وکالت کی گئی ہے۔ بہت زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے یہاں ۵ بنیادی نکات کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔

داخلہ

بعض یونیورسٹیوں نے مختلف سطحوں پر داخلے کے لیے ٹیسٹ لینے کا انتظام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے یونیورسٹی اور کالجوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت یا حدود کے مطابق ہی طلبا/طالبات کے نام درج کریں۔ اس سے ایک طرف بھیڑ بھاڑ سے نجات ملتی ہے تو دوسری طرف ادارے کا تعلیمی معیار بھی کسی حد تک بلند ہوتا ہے۔ کم از کم یہ معاملہ پورے طور پر ان اداروں سے وابستہ ماہرین تعلیم کے اختیار میں ہوتا ہے لہٰذا معیار تعلیم کو ذہن میں رکھ کر تھوڑی سی کوشش کرکے دوسرے ادارے بھی اسی طرح ٹیسٹ لینے کا انتظام کیوں نہیں کر سکتے۔

بعض یونیورسٹیوں نے مختلف سطحوں پر داخلے کے لیے ٹیسٹ لینے کا انتظام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے یونیورسٹی اور کالجوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت یا حدود کے مطابق ہی طلبا/طالبات کے نام درج کریں۔ اس سے ایک طرف بھیڑ بھاڑ سے نجات ملتی ہے تو دوسری طرف ادارے کا تعلیمی معیار بھی کسی حد تک بلند ہوتا ہے۔

طلبا کی رکارڈ شیٹ

اگر ہر طالب علم کو رکارڈ شیٹ دے دی جائے تو اس سے اُس طالب علم سمیت ہر ایک کو اس کے بارے میں تمام ضروری جانکاری ایک نظر میں حاصل ہو سکتی ہے اس سے ہر ایک کو اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مشکل ہی سے کہیں باقاعدہ اس طرح کا رکارڈ رکھنے کا سسٹم رائج ہوگا۔ اگر اس طرح کا رکارڈ رکھنے کا سلسلہ رائج کر دیا جائے تو حالات میں خوشگوار تبدیلی آنے لگے گی۔

بیشتر کالجوں میں اگر ابتری کا ماحول نہیں ہے تو کم از کم معاملات غیر منظم ضرور ہیں۔ نصف کے قریب طلبا/طالبات لکچر نہیں سنتے۔ کبھی کبھی وہ کالج آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر جمع ہوتے ہیں۔ کینٹین میں وقت برباد کرتے ہیں لیکن اتنی زحمت نہیں کرتے کہ کلاس میں جاکر پڑھائی کریں۔ اساتذہ بھی کچھ اس طرح کی لاپروائی کا شکار ہیں ان کی ایک محدود تعداد ہی ایسی ہوتی ہے جو اپنے پیشے میں دلچسپی لیتی ہے۔ ورنہ بیشتر اساتذہ غفلت برتتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ لکچرر کے رکارڈ بھی یا تو دباؤ کے تحت کسی صورت اپنے حق میں مرتب کر لیتے ہیں یا پھر اُس دھوکہ کی بنیاد پر جس میں کوئی خاص چھان بین نہیں ہوتی۔

اس صورت حال پر قابو پانے کی، اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ اساتذہ اور طلبا دونوں کو ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جائے جہاں دونوں ایک دوسرے کے ضابطۂ اخلاق کا تعین کر سکیں۔ اگر ہر ماہ کے آخر میں لکچرز کا حساب کرکے طلبا کے رکارڈ شیٹ پر درج کر دیا جائے تو گھپلے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ اس طرح کے رکارڈ شیٹ سے کلاس کا کام پابندی سے انجام پاتا

بیشتر کالجوں میں اگر ابتری کا ماحول نہیں ہے تو کم از کم معاملات غیر منظم ضرور ہیں۔ نصف کے قریب طلبا/طالبات، لکچر نہیں سنتے۔ کبھی کبھی وہ کالج آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر جمع ہوتے ہیں کینٹین میں وقت برباد کرتے ہیں لیکن اتنی زحمت نہیں کرتے کہ کلاس میں جاکر پڑھائی کریں۔ اساتذہ بھی کچھ اس طرح کی لاپروائی کا شکار ہیں ان کی ایک محدود تعداد ہی ایسی ہوتی ہے جو اپنے پیشے میں دلچسپی لیتی ہے۔

سے گا۔ جو بھی کام ہو اس کا ریکارڈ رکھا جائے، بلکہ اسے نوٹس بورڈ پر بھی چسپاں کیا جائے۔ ریکارڈ شیٹ پر طالب علم کی ہر طرح کی سرگرمیوں کی تفصیلات درج کی جانی چاہئیں مثلاً اس کی حاضری، تعلیمی کارکردگی، کھیل کود اور دوسری سرگرمیوں سے متعلق معلومات، فیس کی ادائیگی، ضابطہ شکنی، وارننگ یا سزا وغیرہ سے متعلق تمام تر تفصیلات۔

ریکارڈ شیٹ تو طلبا کے پاس ہوگی لیکن تمام تر تفصیلات کالج کے ریکارڈ میں بھی موجود رہنی چاہئیں ثبوت پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کالج کے ریکارڈ کو مستند تصور کیا جانا چاہئے۔ لیکن کسی طالب علم کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ وہ تو کچھ کر رہا تھا، اس کا اسے علم نہیں تھا یا اس کی حاضری اگر کم ہوئی تو اسے بتایا نہیں گیا۔

اصولی طور پر اس طرح کا ریکارڈ رکھنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کے شاندار نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ اگر اس سسٹم کی تھوڑی بہت تنقید ہوگی بھی تو وہ صرف اساتذہ کی جانب سے ہوگی کیونکہ انھیں ہر طالب علم کے دستخط لیتے وقت ایک ایک منٹ صرف کرنا پڑے گا۔ ریکارڈ شیٹ پر طالب علم خود تفصیلات درج کرے گا البتہ اس کی تصدیق متعلقہ ٹیچر یا دفتر کے کسی عہدیدار کی جانب سے کی جائے گی۔

طلبا کے ریکارڈ شیٹ رکھنے کا سلسلہ ایک چھوٹا سا قدم ہوگا لیکن اس کے اثرات دور رس ہوں گے اور کالج کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے تعلق سے یہ قابل ذکر تبدیلی لانے کا باعث بن سکتا ہے۔

طلبا کے ریکارڈ شیٹ رکھنے کا سلسلہ ایک چھوٹا سا قدم ہوگا لیکن اس کے اثرات دور رس ہوں گے اور کالج کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے تعلق سے یہ قابل ذکر تبدیلی لانے کا باعث بن سکتا ہے۔

امتحانات

امتحانات بربادی وقت اور بدعنوانی کا ذریعہ بنتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ اور دوسرے اسٹاف آپسی تعاون کے ذریعہ امتحان کے طریقے میں کوئی تبدیلی پیدا کریں۔ اس موضوع پر متعدد اسکالرز نے کافی تفصیل سے تجزیئے کئے ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کے بجائے مندرجہ ذیل معاملات پر خصوصی توجہ دینے کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔

(۱) ہر یونیورسٹی کو اس بات کا جائزہ لینا چاہئے چاہئے کہ وہ طلبا کے داخلے کے وقت انھیں "ڈیٹ شیٹ" مہیا کر سکتی ہے یا نہیں۔ اس میں صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اسٹاف پہلے ہی کچھ کام کریں۔ کسی خاص شعبہ میں امیدواروں کی ممکنہ تعداد کا اندازہ کیا جائے اور پھر اسی کی بنیاد پر ڈیٹ شیٹ تیار کی جا سکتی ہے۔ بعد کے مرحلے میں ممکن ہے معمولی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے لیکن اس سے کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

(۲) امتحانات، فائدے نقصان کی بنیاد پر منعقد نہ کرائے جائیں۔ کسی بھی یونیورسٹی سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مالی فائدہ حاصل کرے گی یا اپنے محدود وسائل سے رقم خرچ کرے گی۔ اس میں دس فیصد کے بقدر کمی

امتحانات بربادی وقت اور بدعنوانی کا ذریعہ بنتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ اور دوسرے اسٹاف آپسی تعاون کے ذریعہ، امتحان کے طریقے میں کوئی تبدیلی پیدا کریں۔

بیشی تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ ہونے کی صورت میں یہی تصور کیا جائے گا کہ کسی نے اپنا کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام نہیں دیا۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات اور ذہن میں رکھنی چاہئے۔ امتحان فیس طلبا سے اسی وقت وصول کرلی جائے جب ان کا داخلہ ہو رہا ہو۔ اگر کوئی طالب علم تعلیمی سال کے اندر ہی کلاس چھوڑ دیتا ہے تو اس کی امتحان فیس واپس کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی طالب علم اگر مضامین یا مضامین کے گروپ بدل دیتا ہے تو اسی اعتبار سے اس کی فیس کی ادائیگی میں بھی مناسب ترمیم کی جا سکتی ہے۔ یونیورسٹی کو طلبا کے کسی ایسے دباؤ میں نہیں آنا چاہئے جس کے تحت وہ یونیورسٹی کو مجبور کریں کہ وہ اتنی کم امتحان فیس لے کہ امتحان کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہو۔ یونیورسٹی جب امتحان کے لیے طلبا کو رول نمبر جاری کرے، اسی وقت یہ بھی اعلان کر دے کہ ایک خاص مدت کے اندر ہی نتائج کا اعلان کر دیا جائے۔ نتائج کے اعلان میں تاخیر کا مطلب یہ ہوگا یونیورسٹی کو ایک ایک روز کے حساب سے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ جرمانہ اس شخص یا ان افراد کو ادا کرنا پڑے گا جس کے باعث نتائج کے اعلان میں تاخیر ہوئی ہو۔

نتائج کے اعلان میں تاخیر کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے اور یہاں اس سلسلے میں جو تجویز پیش کی گئی ہے اسی کے تحت صورتحال سے نمٹنا چاہئے۔ لیکن یہ ضابطہ بہت آسانی سے نہیں نافذ کیا جا سکے گا۔ ہر شخص کے، کام کے اپنے کچھ طریقے ہوتے ہیں اور بیشتر افراد اکثر سست روی سے کام کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ کسی بھی کام کی تکمیل کے سلسلے میں سختی سے کوئی حتمی تاریخ نہیں طے کرتے۔ تاہم، جہاں تک امتحانات کا تعلق ہے، تاخیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تعلیمی سال برباد ہو۔ لہٰذا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

(۳) بیشتر یونیورسٹیاں امتحانات کے روایتی نظام اوقات کے مطابق ہی کام کرتی ہیں اور عام روایت یہ ہے کہ دو بار امتحان لئے جائیں۔ ایک مارچ/اپریل میں اور دوسرا ستمبر/اکتوبر میں۔ کیوں نہ جون/جولائی کے آس پاس ایک اور امتحان کا اہتمام کیا جائے؟ مثال کے

طور پر کیرالا یونیورسٹی کے تقریباً ۲۵ فیصد طلبا دوبارہ امتحان دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ایسے طلبا کو چند ماہ بعد ایک بار پھر اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کریں جو اپنے پچھلے نتیجہ سے مطمئن نہیں تھے؟

پہلے امتحان کے موقع پر بھی، اگر ضرورت پڑے تو امتحان کے اوقات اس طرح ترتیب دیئے جائیں کہ طلبا کا ایک گروپ، پہلے امتحان میں شریک ہو جب کہ دوسرا گروپ دوسرے مرحلے میں شریک ہو جس کا اہتمام چند روز بعد ہی کیا جائے۔ امتحان کے پورے نظام اوقات کو پہلے ہی سے اس طرح مرتب کرنا چاہیئے کہ امیدوار اپنی مرضی اور تیاری کے مطابق، پہلے مرحلے میں شریک ہوں یا دوسرے مرحلے میں۔

اگر کسی شخص کو گاڑی چلانے کا لائسنس لینا ہے تو اس کا فیصلہ وہی بہتر طور پر کر سکتا ہے کہ اس سلسلے میں کب ٹیسٹ دینا چاہیئے۔ یہاں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی طالب علم امتحان دینے کی پوزیشن میں نہ ہو لیکن یونیورسٹی کے فیصلے کے مطابق اسے امتحان میں بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد امتحانات منعقد کرانے سے یہ مسئلہ بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا انتظام اتنی آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ دشواریوں پر قابو ہی نہ پایا جا سکے۔

(۴) بعض یونیورسٹیوں میں ایک ہی خاص کورس کے لیے ایک لاکھ تک کی تعداد میں طلبا شریک ہوتے ہیں اس سے انتظامی سطح پر نیز دوسری نوعیت کے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کچھ ایسا انتظام کیا جا سکے کہ بڑی تعداد میں سوالنامے پہلے ہی تیار کر لیئے جائیں تو طلبا کی تعداد گھٹانا کچھ مشکل کام نہ ہوگا۔

اس طرح کے معاملات کو صیغۂ راز میں رکھنے کا مسئلہ ایک انتہائی اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک بار اگر بڑی تعداد میں سوالنامے تیار ہو گئے تو انھیں پوشیدہ رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کس خاص سوالنامے کو استعمال کیا جائے اس کا فیصلہ متعلقہ مضمون کی جانکاری رکھنے والے شخص کو کرنا چاہیئے۔ کسی دوسرے شخص کو اس میں ملوث نہ کیا جائے۔ متعلقہ مضمون کا کوئی تجربہ کار شخص ہی سوالنامے ترتیب دینے کے فن سے واقف ہوتا ہے۔ کسی ایسے ہی تجربہ کار شخص کو تلاش کرنا چاہیئے۔ دوسری تفصیلات طے کرنا نسبتاً آسان ثابت ہو سکتا ہے۔

> ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف سائنس کے اساتذہ کو چھ سے سات گھنٹے روزانہ کالج میں گذارنا پڑتے ہیں تو دوسری طرف غیر سائنس مضامین کے اساتذہ دو یا تین گھنٹے بھی کام نہیں کرتے مزید برآں وہ ہر روز آتے بھی نہیں۔

(۵) چھپائی کی صنعت کے فروغ کے اس دور میں ہر یونیورسٹی کو خود اپنا پریس قائم کرنا چاہیئے۔ اس سے دو طرح کے فائدے ہوں گے۔ پہلا یہ کہ چھپائی پر جو خرچ آتا ہے وہ بہت کم ہو جائے گا۔ بہت سی یونیورسٹیاں پیشہ ور پرنٹرز کو بہت بڑی رقم ادا کرتی ہیں۔ یہ پرنٹرز رازداری کے ضابطوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ کام یونیورسٹی خود اپنے ذمہ لے لے تو اس سے نہ صرف رازداری قائم رہے گی بلکہ کام بھی آسانی سے اور کم مدت میں نمٹایا جا سکتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یونیورسٹیاں کسی دوسرے ادارے کی محتاج نہیں رہ جائیں گی اور کسی ناخوشگوار صورتحال کے رونما ہونے کا امکان بھی باقی نہیں رہے گا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا کام ہے لیکن اس کے فائدے بہت ہیں۔

کام کے اوقات

ایک ٹیچر کو اوسطاً کتنا کام کرنا چاہیئے؟ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ضابطے کے مطابق اسے دوسرے اداروں کی طرح یہاں بھی ہفتہ میں ۴۰ گھنٹے صرف کرنے چاہیئں۔ ان ۴۰ گھنٹوں میں سے ۱۰ گھنٹے وہ اپنی تیاری پر صرف کر سکتا ہے جس کی اسے اجازت ہے۔ اب یہ دس گھنٹے وہ کالج میں گذارے یا گھر پر، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ اگر کالج یہ چاہتا ہے کہ ٹیچر وہ وقت کالج کے احاطے میں گذارے تو یہ لازم ہے کہ کالج کی طرف سے اس کے لیے کرسی اور میز کا انتظام کیا جائے اور یکسوئی کی جگہ بھی مہیا کی جائے۔

ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف سائنس کے اساتذہ کو چھ سے سات گھنٹے روزانہ کالج میں گذارنا پڑتے ہیں تو دوسری طرف غیر سائنس کے مضامین کے اساتذہ دو یا تین گھنٹے بھی کام نہیں کرتے مزید برآں وہ ہر روز آتے بھی نہیں (ایسے اساتذہ مجموعی تعداد کے دو تہائی حصہ کا احاطہ کرتے ہیں) اگرچہ بہ اعتبار فرد، کالج و مقام، صورتحال مختلف بھی ہو سکتی ہے کسی حد تک تو یہ معاملہ دستیاب سہولیات اور آسانیوں سے جڑا ہوا ہے لیکن بڑی حد تک اس کا انحصار شخصی رویوں پر ہوتا ہے۔

> عام تصور یہ ہے کہ درس و تدریس کا کام کل وقتی نہیں ہے بلکہ جز وقتی ہوتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے اجرت پورے دن کے (کل وقتی) اصول کی جاتی ہے۔ ٹیچروں کے طبقے سے اسے ایک دلچسپ پہلو لگتا ہے۔ لوگ یہ سوچنا گوارا نہیں کرتے کہ سال میں کام کے دن کتنے ہوتے ہیں۔

عام تصور یہ ہے کہ درس و تدریس کا کام کُل وقتی نہیں بلکہ جُز وقتی ہوتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے اجرت پورے دن کی (کُل وقتی) وصول کی جاتی ہے۔ ٹیچروں کے متعلق سے اس کا ایک دلچسپ پہلو اور بھی ہے لوگ یہ سوچنا گوارا نہیں کرتے کہ سال میں کام کے دن کتنے ہوتے ہیں۔ صرف یہ کہہ دیا جائے کہ ہفتہ میں کام کے اوقات سمٹے ہوتے ہیں اور اس بات پر غور نہ کیا جائے کہ کام کے دن کتنے ہوتے ہیں تو یہ بات قاعدے کی رُو سے غلط ہے اس صورت حال کو کوئی بھی مفہوم دیا جا سکتا ہے۔ اور عام طور سے یہ بات اُن ہی لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو لاپروا ہوتے ہیں۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے، امتحانات اور امتحان کی تیاری سے متعلق چھٹیوں کو چھوڑ کر، کام کے دن ۱۸۰ مقرر کئے ہیں۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ اضافہ کر کے پورے دو سو دن کر دیے جائیں۔ اگر یہ مقصد حاصل کرنا ہے تو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کام کے دن ۲۴۰ ہونے چاہئیں۔ جب کہ اس وقت ایک سو ساٹھ ہیں (کم از کم دلی یونیورسٹی کی حد تک)۔

امتحان کے دوران کبھی کبھی طلبا تیاری کے لیے چھٹیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر یہ مطالبہ مان لیا گیا تو مزید ۲۰ سے ۳۰ دن نکالنے پڑیں گے۔ یو جی سی نے اس سلسلے میں ایک تجویز پیش کی ہے لیکن کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا ہے جس سے اس سفارش کو قابلِ عمل بنایا جا سکے۔ حتیٰ کہ مرکزی یونیورسٹیوں میں بھی ایسا نہیں ہو رہا ہے جو براہ راست اسی کے زیرِ نگرانی ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ صورتحال کو بگڑنے دیا گیا۔ اب اسے پٹری پر لانے کے لیے چند لازمی اقدامات کرنا ہوں گے اور ایسا کرنا بہت اہم ہے۔ ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کے لیے، جس میں ٹیچر سے پورے دن کے کام کا تقاضہ کیا جا سکے، انھیں ذمہ دار یا جوابدہ ہونے کی حوصلہ افزائی کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس صورت میں اساتذہ کے بارے میں طلبا/طالبات کی رائے کو ایک اہم عنصر تصور کرنا ہوگا۔

اساتذہ کے بارے میں طلبا کی رائے

ملک میں شاید ہی کوئی کالج ایسا ہو جو اس سسٹم پر عمل کرتا ہو۔ اس سلسلے میں دو مسائل سامنے آتے ہیں ایک تو یہ خیال عام ہے کہ جہاں دوسرے ملکوں میں اسے نافذ العمل بنایا جا سکتا ہے وہاں ہندوستان میں ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ گمراہ کن کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی شخص جو جغرافیہ یا علم کیمیا پڑھا رہا ہے، وہ ہر اس شخص سے مقابلہ کر رہا ہے جو کسی اور جگہ یہی مضامین پڑھا رہا ہے یہ مضامین کن زبانوں میں پڑھائے جا رہے ہیں اور کیسے اور کہاں پڑھائے جا رہے ہیں، یہ قابلِ غور بات ہے۔

جب حتمی طور پر اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ہم سب، ایک کا دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں تو پھر سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس طرح کا موازنہ غیر رسمی طور پر کیا جائے، جیسا کہ اس وقت ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ یا باقاعدہ اور رسمی طور پر جیسا کہ ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ یہی چیز ہماری توجہ دوسرے مسئلے کی جانب بھی مبذول کراتی ہے۔

جب کبھی بھی طلبا کی رائے جاننے کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اساتذہ کو ان کی لاپرواہی یا خام کارکردگی کی سزا دینے کے لیے انتظامیہ کو ایک ہتھیار دیا جا رہا ہے۔ مسئلہ پر اس ڈھنگ سے نظر ڈالنے کا یہ انداز غلط ہے۔ طلبا کی رائے کو، سزا دینے کا بہانہ نہیں تصور کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس اسے تعلیم کا معیار بلند کرنے کا ایک وسیلہ سمجھنا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں، طلبا اپنی رائے خفیہ طور پر دیتے ہیں جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ اس کا اساتذہ تک جو تاثر پہنچتا ہے، اس کی تعبیر اسے یوں کرنی چاہئے کہ۔ پڑھانے کے کام میں بہتری لائی جائے۔

اگر اسے اپنی کارکردگی اور اہلیت پر اعتماد ہے تو وہ اس کا برا نہیں مانے گا بلکہ دوسروں سے اتفاق کرے گا اور اگر اس کے اندر اعتماد کی کمی ہے تو وہ رکارڈ کو خود تک محدود رکھے گا اور جس طور پر بھی ممکن ہوگا اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا۔ صاف لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے رکارڈ یا تجزیہ کو اس کی ملکیت تصور کرنا چاہئے۔ اگر کوئی دوسرا اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہی کہا جائے گا کہ وہ اس کی نجی یا پرائیویٹ زندگی میں مداخلت کر رہا ہے۔

ایک بار اگر اس طریقہ کار کو اپنا لیا جائے تو بیشتر اساتذہ اس سسٹم کو تسلیم کر لیں گے ہر ایک کے لیے ایک ہی طرح کا فارم ہوگا جس میں اساتذہ کی کارکردگی یعنی پابندی وقت، لیکچر کی تیاری، پڑھانے کے طریقے، ان کے اثرات نیز دوسری بہت سی باتوں کی، طلبا کی جانب سے تفصیل درج کی جائے گی۔ ہر باشعور ٹیچر طلبا کی رائے پر توجہ دے گا۔ اور اس بات کی توقع تو کی ہی جا سکتی ہے کہ وہ توجہ دینا چاہے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اساتذہ کی بہت بڑی تعداد اس سسٹم سے استفادہ کرے گی۔

آج ماحول میں جو زہر بھر گیا ہے، اس کی وجہ بے اعتمادی کا رویّہ ہے۔ اس نئے خیال کو (جو حقیقتاً کوئی نیا یا اچھوتا خیال نہیں ہے) اساتذہ ایک ایسا ہتھیار تصور کرتے ہیں جس سے انھیں سزا دی جائے گی۔ یہ ایک منفی طرزِ فکر ہے اور اس سے دامن بچانا چاہئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلنے لگیں گے اور ایک ایسی منزل آ سکتی ہے جب اساتذہ خود ہی اس کا برا نہیں مانیں گے اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی اتفاق کریں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو اس کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔ درس و تدریس کا کام ایسے ماحول میں

جب کبھی بھی طلبا کی رائے جاننے کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اساتذہ کو ان کی لاپرواہی یا خام کارکردگی کی سزا دینے کے لیے انتظامیہ کو ایک ہتھیار دیا جا رہا ہے۔ مسئلہ پر اس ڈھنگ سے نظر ڈالنے کا یہ انداز غلط ہے۔

باقی صفحہ ۶۸ پر

پروفیسر ڈاکٹر جے. وی. ولانیلم

لامرکزیت کا مسئلہ اور ہماری یونیورسٹیاں

مصنف کا خیال ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ میں سخت گیری کو مہر تصدیق کی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر کچھ دوسری دشواریاں بھی بلا کی طرح نازل ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً فیصلے کرنے میں تاخیر، دنیا بھر کی کاغذی کارروائیاں، انتظامیہ کی نچلی سطح پر اعتماد کی کمی، تمام کاغذات کو فیصلے کے لیے آگے بڑھانے کا رجحان نیز صورتحال سے متعلق مروجہ رجحان کے تحت مختلف اوقات میں مختلف قسم کے فیصلے کرنا وغیرہ۔ اگر موجودہ ناخوشگوار ماحول میں تبدیلی لانا مقصد ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اختیارات تقسیم کیے جائیں۔ اگر ہمیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے دور رس نوعیت کے اقدامات کرنے ہیں تو یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں ماہرین تعلیم کی نمائندگی بڑھانا ہوگی، اسکول کی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کو فروغ دینا ہوگا اور ڈگری کو ملازمت سے جوڑنے کے رجحان کو ختم کرنا ہوگا۔

آج کل نہ صرف سیاسی اور سرکاری حلقوں میں لامرکزیت کا ذکر عام ہے بلکہ تعلیمی معاملات میں بھی لامرکزیت کو فروغ دینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ شکی قسم کے لوگ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ لامرکزیت بلاشبہ ایک اچھا تصور ہے لیکن اسے قابل عمل بنانے کا تصور قیاس اور اندیشوں کے دھندلکوں میں گم ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اعلیٰ سطح پر اختیارات کا جو سرچشمہ ہے اسے نیچے نہیں لایا جا سکتا اور وہ وہیں قائم رہے گا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو مرکزیت کی حامل لامرکزیت یا لامرکزیت کی حامل مرکزیت کی بات کرتے ہیں۔

اگر ہمارا مقصد ترقی ہے تو اختیارات کی تقسیم کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ یونیورسٹی کے نظام کے تحت اختیارات قانوناً وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر رجسٹرار، افسر مالیات یا کنٹرولر آف اگزامینیشن جیسے عہدیداروں کے پاس ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ یونیورسٹیوں میں مالیہ کی فراہمی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے ہوتی ہے لہٰذا یونیورسٹی انتظامیہ کی کارکردگی کا دارومدار بڑی حد تک حکومت کی جانب سے ملنے والی رقوم پر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے افسران اگرچہ بااختیار ہوتے ہیں لیکن یونیورسٹی کی بھلائی کے لیے ان اختیارات کے استعمال کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ سینیٹ، سنڈیکیٹ اور تعلیمی کونسل، فیکلٹی، بورڈ آف اسٹڈیز، طلبا کی کونسل اور مالیاتی کمیٹی کس طرح کی ہیں اور ان کا رجحان کیا ہے۔ یہ کمیٹیاں یا کونسل، ایک خاص مدت تک کے لیے کافی اختیارات کی حامل ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کے افسران کے ذمہ انہی اداروں کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا کام ہوتا ہے اگرچہ یونیورسٹی کا سربراہ ہونے کے ناطے وائس چانسلر کو بعض حالات میں ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن عام طور سے وائس چانسلر ان اختیارات کا استعمال نہیں کرتا۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کا اعلیٰ انتظامی سطح پر کارکردگی کا یہی ڈھانچہ رہا ہے جو کئی دہائیوں قبل ترتیب دیا گیا تھا۔ معمولی تبدیلی کے ساتھ بیشتر یونیورسٹیوں میں یہی ڈھانچہ اب تک رائج ہے۔

ہندوستان کے یونیورسٹی نظام میں انتظامی سطح پر لامرکزیت کے بارے میں کوئی بامقصد بحث مالیاتی آزادی کے پس منظر میں ہی کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اب بھی بڑی حد تک بجٹ اور سرکاری فنڈ والے نظام کی مرہون منت ہے۔ جیسا کہ یو جی سی پروگرام آف ایکشن ۱۹۹۲ء میں جو کہ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی کا نظرثانی شدہ مسودہ ہے، کہا گیا ہے۔

"ہندوستان میں تعلیم کا معاملہ بڑی حد تک بجٹ پر مبنی نظام کا مرہون منت ہے جہاں کارکردگی کا معیار یہ ہے کہ کتنا زیادہ بجٹ "ہضم" کرے اور کتنا زیادہ مزید مطالبہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بہتر کارکردگی کو کوئی اہم پیمانہ نہیں مانا گیا ہے۔ لیکن اب اقتصادی اصلاحات اور معیشت کے ڈھانچے کو نئی صورت حال سے ہم آہنگ کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ بعض تبدیلیوں کا متقاضی ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہوگی کہ لاگت سے زیادہ کارکردگی اور نتائج پر نظر رکھی جائے۔ لہٰذا تعلیمی انتظامیہ اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہر سطح پر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے گا کہ لاگت یا اخراجات کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔"

پروگرام آف ایکشن کے مسودے میں لامرکزیت کی عدم موجودگی، ترجیحات طے کرنے میں ناکامی اور انتظامی سسٹم کی کمزوریوں کی جانب توجہ مبذول

کرائی گئی ہے۔ اس میں غیر شعبہ جاتی نیز شعبہ جاتی رابطوں کی ناقص کارکردگی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معمول کے کاموں مثلاً نصابی کتابوں کی فراہمی، امتحانات کے انعقاد اور تعلیمی کیلنڈر کے مطابق عمل کرنے میں اکثر ناکامی ہوتی ہے (بشرطیکہ کوئی باقاعدہ اور موثر تعلیمی کیلنڈر بھی موجود ہو)۔ قومی تعلیمی پالیسی اور پروگرام آف ایکشن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر سطح پر تعلیم کے شعبہ میں منصوبہ بندی اور انتظامی امور میں لامرکزیت کو فروغ دیا جائے اور اس عمل میں عوام کو بھی ملوث کیا جائے تاکہ فیصلہ سازی میں عوام کے منتخب نمائندوں کی جمہوری شرکت کو یقینی بنایا جا سکے۔

پہلے ہم فوری طور پر یونیورسٹی کی سینیٹ کے دستور پر نظر ڈالیں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا

اس طرح مجموعی طور پر سینیٹ ایک سیاسی ادارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سینیٹ کے ممبران آنکھ بند کر کے جماعتی وفاداریوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خالص تعلیمی نوعیت کے معاملات میں غیر سائنسی یا غیر حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ اس صورت میں انتظامی معاملات سے نمٹنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔

وہاں منتخب نمائندوں کی شرکت کو یقینی بنایا گیا ہے۔ سینیٹ میں ۳۹ ممبر ہوتے ہیں جو نامزد کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۷ تو یونیورسٹی کے شعبوں کے سربراہ، چار مختلف فیکلٹیوں کے ڈین اور ایک یونیورسٹی یونین کا چیئرمین ہوتا ہے۔ منتخب ممبران کی تعداد ۱۷ ہوتی ہے۔ ۷ پرنسپل ہوتے ہیں جن کا انتخاب پرنسپل صاحبان کے درمیان ہوتا ہے۔ رجسٹرڈ گریجویٹ بھی اپنے ۲ نمائندے چن کر بھیجتے ہیں، چھ ممبران اسمبلی ہوتے ہیں جب کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے ۳ نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری کالجوں کے اساتذہ اپنے ۵ نمائندے اور پرائیویٹ کالجوں کے اساتذہ اپنے ۶ نمائندے بھیجتے ہیں۔ یونیورسٹی کے علاقے میں واقع ہر ضلع کے مقامی حکام اپنا ایک نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے علاقے میں ہی واقع تسلیم شدہ ٹریڈ یونینیں بھی اپنے دو نمائندے بھیجتی ہیں۔ یونیورسٹی کے نان ٹیچنگ اسٹاف کا ایک نمائندہ اور یونیورسٹی کے تسلیم شدہ کالجوں کے نان ٹیچنگ اسٹاف کے تین نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ کالجوں کے مینیجر اپنے چار نمائندے بھیجتے ہیں جب کہ یونیورسٹی یونین کی جنرل کونسل یونیورسٹی میں زیر تعلیم باقاعدہ طلبار میں سے دس ممبران کا انتخاب کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سینیٹ کے تقریباً ۷۰ فیصد ممبران منتخب نمائندہ ہوتے ہیں جو پرنسپلوں، اساتذہ، نان ٹیچنگ اسٹاف، ریاستی اسمبلی، رجسٹرڈ گریجویٹ، ٹریڈ یونین، اساتذہ کی یونین، مقامی اداروں، کالج کی انتظامیہ اور طلبار کی نمائندگی کرتے ہیں (ریاستی اسمبلی کی نمائندگی کا مطلب یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے علاقے کے عام ووٹروں کے براہ راست نمائندگی ہوتی) ان تمام ممبران کے انتخاب سیاسی جماعتوں سے وابستگی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر سینیٹ ایک سیاسی ادارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سینیٹ کے ممبران آنکھ بند کر کے جماعتی وفاداریوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خالص تعلیمی نوعیت کے معاملات میں غیر سائنسی یا غیر حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ اس صورت میں انتظامی معاملات سے نمٹنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔

سنڈیکیٹ میں ۱۲ ممبران ہوتے ہیں جنھیں سینیٹ منتخب کرتی ہے۔ ان میں سے ۱۶ ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا درس و تدریس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی یہ ادارہ بھی کم و بیش سیاسی نوعیت کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ سنڈیکیٹ میں طلبار کا ایک نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۳ نمائندے منتخب ہوتے ہیں (جن میں سے ۷ غیر اساتذہ ہوتے ہیں) سنڈیکیٹ کے منتخب ممبران کا تناسب ۶۸/۴۲ فیصد ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ کام جمہوری خطوط پر ہوتا ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خالص تعلیمی نوعیت کے معاملات کے فیصلے غیر ضروری طور پر سیاسی تنازعات سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح انتظامی معاملات میں بھی دشواری پیدا ہوتی ہے۔

تعلیمی کونسل میں بھی سیاسی طور پر منتخب کیے گئے ممبران کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

حکومت ہند کی تعلیمی مشاورتی کمیٹی نے ۱۹۸۶ء میں انتظامی معاملات سے متعلق ایک جائزہ پیش کیا تھا اس کے بعض اہم مشاہدوں کا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی رپورٹ میں حوالہ دیا گیا ہے۔

رپورٹ کا عنوان ہے "نئی تعلیمی انتظامیہ کی سمت" (نئی دہلی یو جی سی ۱۹۹۰ء صفحہ ۵۲-۵۱) اور اس میں مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی ہیں

"یہ بات کافی اہم ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی کے پس منظر میں یونیورسٹی کے مقاصد پر بہتر ڈھنگ سے روشنی ڈالی گئی ہے اور متعلقہ ایکٹ میں اسے شامل بھی کیا گیا ہے۔ یو جی سی کے ایکٹ میں اس طرح ترمیم کی جانی چاہئے کہ نئی یونیورسٹیاں کھولنے سے قبل، کمیشن کی رائے لازمی طور پر لی جائے۔ یونیورسٹی کے اداروں میں انتخابات نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں کسی بھی وزیر یا ممبر اسمبلی کو کسی بھی یونیورسٹی میں کوئی عہدہ نہیں ملنا چاہئے اور نہ ہی اسے یونیورسٹی سے ملحقہ کسی ادارے میں شریک ممبر کی حیثیت سے شامل کیا جانا چاہئے کورٹ اور سینیٹ غیر ضروری ادارے ہیں اور اس بات کی سفارش کی جاتی ہے کہ انھیں ختم کر دیا جائے۔ اساتذہ، غیر تدریسی عملے اور طلبار کے درمیان زیادہ سے زیادہ صلاح و مشورہ ہونا چاہئے اور اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ تعلیمی کونسل میں ۳۰ سے زیادہ ممبر نہیں ہونے چاہئیں اور اس کے کسی عہدے کے لیے انتخاب نہیں کرانا چاہئے۔ اساتذہ کے لیے واضح طور پر کچھ خصوصی ضابطے، غیر تدریسی عملے کے لیے ضابطۂ اخلاق اور طلبار کے لیے ڈسپلن کے کچھ معیار وضع کیے جانے چاہئیں۔"

گویا اس بنیادی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اختیارات کے سلسلے میں نئے ضابطے وضع کیے جائیں۔

یونیورسٹیوں کو حصول علم کا مرکز بننا چاہیئے نہ کہ سیاسی اکھاڑہ۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں کے متعدد ایکٹ کا جائزہ لینے کے بعد یو جی سی کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بیشتر معاملات میں قوانین اور ضابطے کافی ملتے جلتے ہیں اگرچہ ایک دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہیں۔ اگر فرق کچھ ہے تو بس کم و بیش کا۔ کارکردگی کی نوعیت ایک ہی جیسی ہے۔ لیکن کمیٹی نے بیشتر یونیورسٹیوں کے ایکٹ میں جو سب سے بڑی خامی پائی ہے وہ یہ ہے۔ انتظامیہ کا ڈھانچہ کچھ اتنا سخت ہوتا ہے کہ اگر یونیورسٹیاں چاہیں کہ پڑھائی، تحقیق و توسیع اور تعلیمی پروگرام کو بہتر بنانے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کوئی مناسب اقدام کریں، تو لچک کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے (سی تعلیمی انتظامیہ کی سمت۔ صفحہ ۷۰)

یہی سخت گیری یونیورسٹی کے روزمرہ کے انتظامی معاملات میں آڑے آئی ہے۔ بالکل معمولی اور غیر اہم معاملات کے لیے بھی وائس چانسلر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ گویا یہ نظام کچھ ایسا ہے کہ وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ سے وابستہ حکام کو ضرورت سے زیادہ مرکزیت حاصل ہو گئی ہے فیصلہ کرنے میں تاخیر ضرورت سے زیادہ کاغذی کارروائیاں، انتظامیہ کی نچلی سطح پر اعتماد کی کمی، فیصلہ کے لیے تمام کاغذات کو "آگے" بڑھانے کا رجحان اور صورتحال کے مطابق، مختلف اوقات میں مختلف قسم کے فیصلے کرنا۔ یہ وہ عوامل ہیں جو یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں رکاوٹ بنتے ہیں ان تمام باتوں کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا، اساتذہ، انتظامیہ سے وابستہ اسٹاف، والدین اور عام آدمی، سبھی بے اطمینانی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبا، اسٹاف اور اساتذہ کی جانب سے کبھی کبھی اچانک احتجاج کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے جو اکثر لمبی مدت تک برقرار رہتا ہے جس کے باعث اور زیادہ ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح یونیورسٹی انتظامیہ کی حالت عموماً خستہ رہی ہے۔ لامرکزیت ان میں سے بیشتر مسائل کو حل کر سکتی ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سسٹم کے پورے ڈھانچے کو بدلا جائے اور اس کے ساتھ ہی ایسے اقدام بھی کیے جائیں جن کے تحت ہر یونٹ یا شعبے کو جوابدہ ہونا پڑے۔ یہ اہم مقصد یونیورسٹی کے مختلف اداروں میں ماہرین تعلیم کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دے کر حاصل کی جا سکتی ہے تعلیم کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کرنے پر

> اساتذہ کو پڑھانے اور تحقیق کے کام میں دلچسپی لینی ہوگی اور طلبا میں پڑھنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ لائبریریوں کی صورت حال بہتر اور کارکردگی اچھی ہونی چاہیئے، شعبوں کو اپنے معاملات میں زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ کالجوں کے الحاق کے نظام پر نظر ثانی کر کے اسے اس لائق بنایا جانا چاہیئے کہ نئے کالج زیادہ با اختیار ہوں اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔

بھی زور دیا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کو پڑھانے اور تحقیق کے کام میں دلچسپی لینا ہوگی اور طلبا میں پڑھنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ لائبریریوں کی صورتحال بہتر اور کارکردگی اچھی ہونی چاہیئے۔ شعبوں کو اپنے معاملات میں زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ کالجوں کے الحاق کے نظام پر نظر ثانی کر کے اسے اس لائق بنایا جانا چاہیئے کہ نئے کالج زیادہ با اختیار ہوں اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ داخلے وقت پر ہونے چاہئیں پڑھائی اور احتساب کا کام ساتھ ساتھ ہوتے رہنا چاہیئے۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں بہت بڑی تعداد میں طلبا شریک ہوتے ہیں جو بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے، اس میں تخفیف کی جانی چاہیئے۔ طلبا، اساتذہ اور والدین کے مابین زیادہ سے زیادہ صلاح و مشورہ کے سلسلے کو فروغ دینا چاہیئے اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو سماج کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیئے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ڈھانچے پر نظر ڈالنے سے کچھ اور اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے تین قسم کے ادارے اس وقت کام کر رہے ہیں۔ (۱) ایسی یونیورسٹیاں جن سے کالج ملحق نہیں ہوتے (۲) ایسی یونیورسٹیاں جن سے بہت سے کالج ملحق ہوتے ہیں اور (۳) ایسی یونیورسٹیاں جو متصورہ ہوتی ہیں۔ ایسی یونیورسٹیاں جن سے کوئی کالج ملحق نہیں ہوتا، ان کی تعداد بہت کم ہے "متصورہ" یونیورسٹیاں بھی چند ہی ہیں۔ لیکن اُن یونیورسٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن سے کالج ملحق ہوتے ہیں اور انہی یونیورسٹیوں کے انتظامی معاملات میں زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں لہٰذا لامرکزیت کے تعلق سے ہم ایسی ہی یونیورسٹیوں کے بارے میں زیادہ توجہ صرف کریں گے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر، جب کہ ہندوستان میں پہلی تین یونیورسٹیاں (کلکتہ، بمبئی اور مدراس) قائم ہوئی تھیں، اب تک، کالجوں کے الحاق سے متعلق ایک ہی طریقہ چلا آرہا ہے، جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ یہ ان یونیورسٹیوں کے لیے بہت بڑی لعنت ہے۔ آج کی صورتحال میں مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اس طریقے کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

> ان یونیورسٹیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن سے کالج ملحق ہوتے ہیں اور انہی یونیورسٹیوں کے انتظامی معاملات میں زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا لامرکزیت کے تعلق سے ہم ایسی ہی یونیورسٹیوں کے بارے میں زیادہ توجہ صرف کریں گے

۱۔ انگریز سرکار نے مرکزیت کے ایک

نظام کے تحت کالجوں کے الحاق کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کا کنٹرول براہ راست پریسیڈنسی ہیڈ کوارٹرز (راجدھانی) میں واقع یونیورسٹی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ صوبائی راجدھانی اور اس کے آس پاس چند ہی کالج ہوا کرتے تھے اور یونیورسٹی اور اُن کالجوں کے درمیان آسانی سے رابطہ قائم ہو جایا کرتا تھا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ دور دراز علاقوں میں بھی ایسے کالج موجود ہیں جن کا الحاق یونیورسٹی سے ہوتا ہے اور ان کالجوں کو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات کے لیے بہت دور واقع مرکزیت کے حامل ایک نظام پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں، ملک کے دور دراز علاقوں میں طلبا کی تعلیمی ضروریات پوری کرنا کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

۲۔ آزادی سے قبل یونیورسٹیوں اور ملحقہ کالجوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد اور زیادہ کم ہوتی تھی۔

۳۔ آزادی کے بعد تعلیم میں 'جمہوریت کاری' کو فروغ دینے کا خیال قدرتی طور پر اچانک بہت ساری یونیورسٹیاں اور کالج کھولنے کا باعث بنا۔ یقیناً یہ ایک اچھی بات تھی لیکن اچانک اعلیٰ تعلیم کا جو پھیلاؤ ہوا، اس کے باعث تعلیمی خدمات کا معیار گر گیا۔ اچھے اساتذہ اور لائبریری کی بہتر سہولیات کے نظام پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ یونیورسٹیاں اعلیٰ معیار تو طے کرتی ہیں لیکن کوئی باقاعدہ ایسا نظام موجود نہیں ہے جس کے تحت اس معیار کا جائزہ بھی لیا جا سکے۔ پھر حکام کی ایسی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منظور شدہ کالجوں کا معیار گرتا گیا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بہت سے کالجوں میں طلبا کی تعداد پر قابو پانے اور پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں بہتری لانے کا کوئی موثر نظام موجود نہیں ہے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ متوازی اور ٹیوٹوریل کالج قائم ہونے لگے جہاں کالجوں کے باقاعدہ طلبا اپنی کلاسیں چھوڑ کر جانے لگے۔

۴۔ اگرچہ منظور شدہ کالجوں کے قیام کا خیال بنیادی طور پر برطانیہ کی دین ہے۔ خاص طور سے لندن یونیورسٹی کی، جو ۱۸۳۶ء میں قائم ہوئی تھی، لیکن نہ تو لندن یونیورسٹی سے اور نہ ہی دوسری پرانی یونیورسٹیوں مثلاً آکسفورڈ اور کیمبرج سے اتنے کالج ملحق ہوتے ہیں۔ ان کے منظور شدہ کالج صرف وہی ہیں جو ان کے احاطے میں واقع ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان میں تعلیمی منصوبہ بندی کے لیے خصوصی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔ برطانیہ کی یونیورسٹیوں سے جو کالج ملحق ہوتے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہوتی ہے، کالجوں میں طلبا کی تعداد ۵۰۰ سے ایک ہزار تک اور پوری یونیورسٹی میں ۵ ہزار سے ۲۵ ہزار تک ہوتی ہے۔ اب ہندوستان میں ایسی یونیورسٹیوں کی صورت حال کیا ہے؟ صرف ایک ریاست، کیرالا کی مثال کو سامنے رکھتے ہیں۔ کیرالا یونیورسٹی میں منظور شدہ کالجوں کی تعداد ۶ ہے۔ اور یہ کالج ترلوینڈرم ضلع صدر مقام سے کافی دوری پر واقع شہروں اور قصبوں میں واقع ہیں۔ ان میں سے بیشتر منظور شدہ کالجوں میں (پیشہ ورانہ اداروں کو چھوڑ کر) طلبا کی تعداد ۲۵ سو سے ۴ ہزار تک پہنچتی ہے مہاتما گاندھی یونیورسٹی اور کالی کٹ یونیورسٹی کی صورت حال بھی کم و بیش یہی ہے۔ مہاتما گاندھی یونیورسٹی کے کالجوں کی تعداد ۶۵، اور کالی کٹ یونیورسٹی کے کالجوں کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے طلبا کی مجموعی تعداد ۸۷ ہزار سے ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ ان کالجوں اور وہاں کے طلبا کی اتنی بڑی تعداد کو یونیورسٹیاں ضروری سہولیات فراہم نہیں کر پاتیں۔

۶۔ اگر طلبا کی تعداد کو سامنے رکھا جائے تو ہندوستان کو کم از کم ایک ہزار یونیورسٹیوں اور دس ہزار کالجوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت صرف ۲ سو یونیورسٹیاں ہیں جن میں تینوں قسم کی یونیورسٹیاں شامل ہیں (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) جب کہ کالجوں کی تعداد کم و بیش ۷۵۰۰ ہے۔

۷۔ چونکہ اتنی بڑی تعداد میں یونیورسٹی اور کالج کھولنا بہت بڑے سرمائے کا متقاضی ہوگا اس لیے ہمیں ان باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ (الف) طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرنا ہوگا جہاں وہ کچھ سیکھ نہیں پاتے سوا اس کے کہ بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ (ب) ہر ریاست میں جہاں کالج کی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اوپن یونیورسٹی کھولی جائے اور (ج) دور دراز علاقوں میں رہنے والے طلبا کو تعلیم دینے کے لیے خط و کتابت کورس کا اہتمام کرنے والی یونیورسٹیوں نے جو ادارے کھولے ہیں ان کی کارکردگی پر نظر ثانی کی جائے اور اس سسٹم کو مزید مستحکم کیا جائے۔

۸۔ یونیورسٹیوں کے ڈھانچے میں اہم تبدیلی لانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم ایک ہزار کالجوں کو (جو اس وقت مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں) پورے اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ مقامی ضروریات کے پیش نظر اپنے طور پر کورس اور نصاب تیار کریں اور اس کے لیے سرمایہ بھی خود ہی اکٹھا کریں۔ یونیورسٹی، تعلیمی اور

> **یونیورسٹیوں کے ڈھانچے میں اہم تبدیلی لانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم ایک ہزار کالجوں کو (جو اس وقت مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں) پورے اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ مقامی ضروریات کے پیش نظر اپنے طور پر کورس اور نصاب تیار کریں اور اس کے لیے سرمایہ بھی خود ہی اکٹھا کریں۔ یونیورسٹی تعلیمی اور انتظامی معاملات میں صرف کچھ ضروری ہدایات جاری کرے جن میں اسٹاف کی بحالی سے متعلق پالیسی بھی شامل ہو۔**

انتظامی معاملات میں صرف کچھ ضروری ہدایات جاری کرے جس میں اسٹاف کی بحالی سے متعلق پالیسی بھی شامل ہو۔ لیکن کالج کا حقیقی انتظام کالج ہی کے ذمہ ہونا چاہیے۔

۹۔ برطانیہ کی یونیورسٹیوں مثلاً آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں سے ملحق کالج پورے طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنا انتظام خود کرتے ہیں اور "ان کی اپنی املاک اور آمدنی ہوتی ہے۔ جیسا کہ کامن ویلتھ یونیورسٹیز ائیر بک ۱۹۹۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے اپنے قوانین اور ضابطوں کے تحت نمٹائے جاتے ہیں، اگرچہ یہ ضابطے یونیورسٹی اور ملکہ کی منظوری کے بغیر بدلے نہیں جا سکتے۔ انھیں یونیورسٹی کے چند قوانین کا پابند بھی رہنا پڑتا ہے۔" (صفحہ ۲۲۹۱)۔ آکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی سے ملحق کالجوں میں طلبار کی تعداد ۵ سو سے کم ہوتی ہے اور یہ کالج یونیورسٹی کے صدر دفتر کی عمارت سے نصف میل کی دوری کے اندر ہی واقع ہوتے ہیں۔

> "برطانیہ کی یونیورسٹیوں، مثلاً آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں سے ملحق کالج پورے طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنا انتظام خود کرتے ہیں اور "ان کی اپنی املاک اور آمدنی ہوتی ہے"۔

یونیورسٹیوں سے ملحق کالجوں کی خود مختاری کی بات کرتے وقت ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ مغربی سماج کی رہنمائی جو بنیادی فلسفہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوا جائے اور وہ ضابطے جو پارلیمنٹ، یونیورسٹیوں اور میونسپلٹیوں کے ذریعے وضع کیے جاتے ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اب تعلیمی منصوبوں کے نفاذ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے، ان ضابطوں کے دائرے میں رہ کر آزادانہ طور پر کام کرنا کالج کے ذمہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ پرانی مغربی جمہوریتوں میں جو شائستہ جمہوری روایات موجود ہیں اور قانون کی پاسداری جس ڈھنگ سے کی جاتی ہے، اس کا تصور ہندوستان میں ممکن نہیں ہے لہٰذا بجا طور پر یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آیا یورپ یا امریکہ کے لیے جو چیز بہتر ہے، وہ ہندوستان کے لیے بھی بہتر ثابت ہو سکے گی؟ ان کو ہمارا جواب یہ ہے کہ مغربی ممالک کے بعض اچھے نمونے ہمارے یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں نیز یہ کہ ہماری یونیورسٹیاں اور کالج مغرب کے نمونوں پر ہی قائم کیے گئے ہیں۔ اگر آزادروی کا مغربی فلسفہ بدلتے ہوئے حالات میں ہمارے لیے قابل قبول یا قابلِ عمل نہیں ہے تو ہم کوئی ایسا سیاراستہ اختیار کریں جو ہمارے سماجی اور اقتصادی ماحول سے مطابقت رکھتا ہو اس کے لیے کیا ضروری ہے کہ برطانوی نمونے کی ادنیٰ سے ادنیٰ خامی کی نکتہ چینی کریں اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کے آدھے نمونے کو اپنا بھی رہے ہوں۔ اس طرح تو ہمارے نظام تعلیم کے پورے انتظامی منظر نامہ میں الجھاؤ پیدا ہو جائے گا۔ لامرکزیت کے بارے میں اس اعتبار سے غور کیا جانا چاہیے کہ انتظامیہ کی نچلی سطح پر زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں نیز مالیہ کی فراہمی میں اضافہ کیا جائے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں ہر شعبہ یا سیکشن، اخراجات سے متعلق چھوٹے چھوٹے معاملات کے لیے اعلیٰ حکام کے دروازے کھٹکھٹاتا ہے کیونکہ ضابطوں کی سختی اسی بات کی متقاضی ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام فائلیں انتہائی سست روی سے اعلیٰ حکام تک پہنچتی ہیں وہ فیصلے جو نچلی سطح پر ہی ہو سکتے ہیں، ان میں فائلوں کے اس "سفر" کے باعث غیر ضروری تاخیر ہو جاتی ہے۔

> "ان کے معاملات ان کے اپنے قوانین اور ضابطوں کے تحت نمٹائے جاتے ہیں اگرچہ یہ ضابطے یونیورسٹی اور ملکہ کی منظوری کے بغیر بدلے نہیں جا سکتے۔ انھیں یونیورسٹی کے چند قوانین کا پابند بھی رہنا پڑتا ہے"۔

کوئی بھی تنظیم، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، اس میں انتظامی معاملات کے عموماً تین پہلو ہوتے ہیں۔ یعنی (الف) افرادی قوت (ب) مادّی وسائل اور ساز و سامان اور (ج) ایسے سسٹم اور ضابطے جو حصول مقصد میں معاون ثابت ہوں۔

جہاں تک یونیورسٹی انتظامیہ کا سوال ہے، افرادی قوت گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبار کی بہت بڑی تعداد، تدریسی، تحقیقی اور دوسرے اسٹاف اور اس غیر تدریسی عملے پر مشتمل ہوتا ہے جس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تعلیمی معاملات سے متعلق فیصلوں کو نافذ کرانے اور سہولیات مہیا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اگر ہم بہتری لانے کے متمنی ہیں تو بنیادی ضرورت یہ ہے کہ مختلف شعبوں میں مناسب افراد بحال کیے جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ طلبار کے داخلے پر توجہ دی جائے۔ آج طلبار کا داخلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے امتحان میں کتنے نمبر حاصل کیے تھے۔ جب کہ امتحانات کا سلسلہ ہی خامیوں سے پُر ہے۔ ایک لیکچرر پڑھاتا ہے تو دوسرا لیکچرر بہت دور بیٹھا ہوا سوالنامے ترتیب دیتا ہے وہ یہ بھی نہیں دیکھ پاتا کہ پڑھائی لکھائی کس طرح کی ہوئی؟ اسی طرح حالات کا جائزہ لیے بغیر ایک تیسرا لیکچرر طلبار کی کاپیاں جانچتا ہے اور چوتھا اس پر نظر ثانی کرتا ہے۔ گویا اس طرح پڑھائی اور اس کی جانچ کے کام میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ تعلیم دینے کا عمل اُس وقت تک مکمل نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ وہی لیکچرر طلبار کی جانچ نہیں کر لیتا جو انھیں پڑھاتا ہے۔ جانچنے کے بعد جواب نامے متعلقہ طلبار کو واپس کر دینے چاہئیں تاکہ وقفہ وقفہ سے پڑھائی کے طریقوں اور پڑھنے کے عمل میں بہتری اور سدھار آتا رہے۔

پڑھانے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے سے تیار کیے ہوئے نوٹ کی بنیاد پر کچھ لیکچر دے دیئے جائیں (وہ نوٹ بھی بعض اوقات دہائیوں پرانے ہوتے ہیں) اور ان کی جانچ کا کام مرکزیت کے حامل ادارے کو سونپ دیا جائے جس کا طلبار کی تعلیم کے

معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ طلبار کی پڑھائی کی جانچ کا یہ طریقہ بالکل مصنوعی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کی شکایات عام ہیں کہ سوالنامے ترتیب دینے اور کاپی جانچنے کے کام میں بدعنوانی ہوتی ہے۔ امتحان ہال میں نقل کرنے، نگرانی کی تئیں غفلت برتنے اور نگراں اور ممتحن کے ذریعہ طلبار کی مدد کیے جانے کی شکایات بھی موصول ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ کبھی کبھی کاپیاں جانچنے کا کام جلد بازی اور لاپروائی سے انجام دیا جاتا ہے۔

طلبار کے امتحان کا مطلب یہ ہوتا ہے انھیں یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ ان کی معلومات میں کیا کمی رہ گئی ہے اور اسے کیسے دور کیا جانا چاہئے۔ اس سے اساتذہ کو بھی یہ سمجھنے کا موقع ملنا ہے کہ اس کا طریقہ تعلیم کس حد تک پُراثر رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہم کرتے یہ ہیں کہ تعلیمی سال کے اختتام پر طلبار کو امتحان کے ایک ناقص، غیر حقیقی اور غیر سائنسی سسٹم کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اگر ہم اسی حقیقت کو سامنے رکھیں کہ یونیورسٹی میں پہلے امتحان کے نتائج کے اعلان کے بعد، دوسرے امتحان میں ان میں سے تقریباً ایک چوتھائی طلبار ہی شریک ہوتے ہیں تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پہلا امتحان کس قدر ناقص اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارا موجودہ نظام اُن اساتذہ پر بھروسہ نہیں کرتا جو طلبار کو پڑھاتے ہیں۔ اگر طلبار کو پڑھانے والے اساتذہ براہ راست انھیں وقفہ وقفہ سے جواب نامے جانچ کے بعد واپس کرتے رہیں تو طلبار کو اس بات کا موقع ملے گا کہ وہ اپنی جماعت کے دوسرے طلبار کی کاپیوں سے ان کا موازنہ کر سکیں گے اور اگر انھیں کوئی شکایت ہوگی تو اس کے ازالے کے لیے اساتذہ سے رجوع کریں گے۔ اساتذہ خود زیادہ بہتر طور پر اپنے طلبار کی صلاحیتوں کی جانچ کر سکیں گے۔

امتحانات کا سلسلہ ہی خامیوں سے پُر ہے۔ ایک ٹیچر پڑھاتا ہے تو دوسرا ٹیچر بہت دور بیٹھا ہوا سوالنامے ترتیب دیتا ہے وہ یہ بھی نہیں دیکھ پاتا کہ پڑھائی لکھائی کس طرح کی ہوئی ہے؟ اسی طرح حالات کا جائزہ لیے بغیر ایک تیسرا ٹیچر طلبار کی کاپیاں جانچتا ہے اور چوتھا اس پر نظرثانی کرتا ہے۔

طلبار کے داخلے پر ایک اور زاویے سے نظر ڈالنا ہوگی۔ بہت سے ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ کالجوں میں جو آج طلبار کی اتنی بڑی بھیڑ نظر آتی ہے اس کی خاص وجہ ہماری سماجی اور اقتصادی صورت حال ہے۔ بہت سے طلبار صرف اس لیے کالج آتے ہیں کہ ان کے یہاں کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ جیساکہ امرک سنگھ اور بعض دوسرے افراد نے حال ہی میں بنگلور میں منعقدہ ایک سیمینار میں یہ اشارہ کیا کہ کالجوں میں ہم نے لڑکوں اور لڑکیوں کی یوں ہی بھیڑ جمع کر رکھی ہے جو وہاں اپنی مرضی سے حصول علم کے لیے نہیں بلکہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر آتے ہیں۔ بہت سے مفکرین کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف انہی طلبار کو موقع دیا جانا چاہئے جو سنجیدگی سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں اور اعلیٰ سطح کی دانشورانہ لیاقت اور تحقیق کے متحمل ثابت ہو سکیں۔ اس کے برعکس آج ہوتا یہ ہے کہ ہم کالج میں بہت سے ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولیات (جو عموماً ناکافی ہوتی ہیں) مہیا کر دیتے ہیں جن کی حصول علم میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہاں ان کے آنے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وقت گذارا جائے اور ایک ڈگری حاصل کر لی جائے جو کلرکی یا کسی دوسری طرح کی ملازمت حاصل کرنے میں پاسپورٹ کا کام کرے اکثر ملازمت کا پڑھائی کے مضامین سے کوئی علاقہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ بات مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہے لیکن وہ یونیورسٹیوں میں معمولی "اسسٹنٹ" کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح بہت سے ایم۔ اے پاس بطور بس کنڈکٹر بحال ہوئے ہیں۔ کم از کم ملک کی سب سے زیادہ خواندہ ریاست کیرالا میں یہی صورت حال دیکھنے میں آئی ہے ہم اپنی افرادی قوت، سرمایہ اور مادی وسائل کو کس قدر برباد کر رہے ہیں۔ مہنگی اعلیٰ تعلیم سے طلبار کو آراستہ کر کے ہم بے روزگاروں اور ایسے گریجویٹ کی بھیڑ اکٹھا کر رہے ہیں جو کسی کام کے لائق نہیں ہوتے۔

صورت حال میں اسی وقت بہتری لائی جا سکتی ہے جب ڈگری کا تعلق روزگار سے توڑ دیا جائے۔ بہت سے ایسے کام، جو کالج سے فارغ ہونے والے طلبار انجام دیتے ہیں، وہی کام ہائی اسکول سے فارغ ہونے والے افراد بھی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ان کی کارکردگی کالج گریجویٹ سے بہتر نہیں ثابت ہوگی تو ان سے کمتر بھی نہیں ہوگی اور وہ اپنے کام کو اطمینان بخش بھی تصور کریں گے۔ سیکڑوں کام ایسے بھی ہیں جن میں ٹکنکی مہارت کی ضرورت پڑتی ہے لیکن ان کاموں کے لیے بہتر تربیت یافتہ افراد نہیں مل پاتے۔ اگر ہم اعلیٰ سطح کی تعلیم میں اصلاح لانا چاہتے ہیں تو فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول کے نظام پر توجہ دی جائے۔ اعلیٰ تعلیم میں پیشہ واریت اور مہارت کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مڈل اور ہائی اسکول کی سطح پر پیشہ ورانہ نصاب ترتیب دیئے جائیں۔ جب تک اسکول کے نظام میں بہتری نہیں آئے گی اور نوجوانوں کو اس بات کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ اپنے طبعی رحجان کی بنیاد پر کسی پیشہ ورانہ شعبے کا انتخاب کر سکیں۔ اس وقت تک اعلیٰ سطح پر کیے گئے اقدام ہمارے سماجی حالات پر کچھ خاص اثرات نہیں مرتب کر سکیں گے۔

کالج میں آنے والے طلبار کے بارے میں ایک دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو ہاتھ کے کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس رجحان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسکولوں میں صرف کتابی علم پر زور دیا جاتا ہے۔ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں نوجوانوں کو اس بات کا موقع دیا جاتا ہے کہ اسکولوں میں ایسے کام کریں جن میں دماغ اور ہاتھ دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ دراصل ہاتھ، دماغ، سوچ کی توسیع ہے۔ دماغ جو کچھ سوچتا ہے اسے ہاتھ عملی جامہ پہناتا ہے لہٰذا بچوں کو یہ موقع ملنا چاہئے کہ وہ اس قدرتی رابطے کو بروئے کار لا کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔ اُن ملکوں میں ایسے

ت سے اسکول قائم ہیں جہاں بچوں سے لازمی طور
اسکول سے ملحقہ ورکشاپ میں کام کرایا جاتا ہے۔
دسرے لفظوں میں مڈل اسکول کی سطح پر بچے کام کرنا
روع کر دیتے ہیں۔ ان کے کاموں میں بڑھئی، آہنگری،
لش اور پینٹنگ اور لکڑی اور پتھر وغیرہ کاٹنے
کام شامل ہیں۔ اس طرح وہ اوزاروں سے پورے
ریر مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس میں اونچ نیچ کی
ئی قید نہیں ہوتی۔ تمام بچوں کو اس طرح کی
ٹریننگ دی جاتی ہے۔ یہی بچے جب ہائر سکنڈری

اگر ہم اعلیٰ سطح کی تعلیم میں اصلاح لانا چاہتے ہیں تو فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول کے نظام پر توجہ دی جائے۔ اعلیٰ تعلیم میں پیشہ واریت اور مہارت کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مڈل اور ہائی اسکول کی سطح پر پیشہ ورانہ نصاب ترتیب دیئے جائیں۔

سکول میں پہنچتے ہیں تو اس وقت تک ان کا ذہن
س بات کے لیے تیار ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں
س کام کا انتخاب کریں گے۔ اسکول کی سطح پر ہی لیبر
محنت مشقت کے وقار کا احساس اُن کے دلوں میں
ال دیا جائے گا۔ جو لوگ حقیقتاً کالج جانا چاہتے ہیں
ور کل وقتی طور پر باقاعدہ مطالعے پر توجہ صرف کرنا
باہتے ہیں ان کے طبعی میلان کی جانچ کے لیے قومی
یمانے پر ٹیسٹ لیا جانا چاہیئے۔ تمام بچوں سے یہ امید
رنا کہ وہ انجینیر، ڈاکٹر، اعلیٰ سائنس داں، کمپیوٹر
کے ماہر یا آئی اے ایس افسر بنیں گے، حقیقت پر مبنی
ہو گا۔ بچوں کو خود اس بات کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ
پنے لیے اپنی پسند کے کام کا انتخاب کریں۔ والدین کو
ن پر اپنی مرضی نہیں لادنی چاہیئے۔ بہت سے شہری
علاقوں میں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ چھوٹے
چھوٹے بچے تنگ بسوں یا دوسری طرح کی گاڑیوں پر
سوار ہو کر اسکول پہنچنے کے لیے ایک ایک گھنٹے کا
سفر طے کرتے ہیں اور ان کی پیٹھ پر کتابوں اور نوٹ
بک کے بھاری بوجھ لدے ہوتے ہیں۔ بچوں کو اس
طرح کی "ظالمانہ اور ماورائے معمول دانشورانہ سزا"
دینے کے بجائے انھیں پڑھنے اور کھیلنے کی اجازت

دی جانی چاہیئے ان بچوں کو تعلیم کی بجائے صرف معلومات حاصل ہو پاتی ہیں اور وہ معلومات بھی ایسی ہوتی ہیں جن کا زندگی کے حالات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور جو امتحان دینے کے بعد ان کے ذہن سے آسانی سے نکل جاتی ہیں کیونکہ امتحان میں صرف ان کی یادداشت کی جانچ ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا سماجی ڈھانچہ کچھ ایسا ہے کہ جدید دور میں سانس لینے کے باوجود کچھ پرانے تصورات کے بارے میں ہمارے رویئے بہت سخت ہوتے ہیں اور بعض طرح کے کام کرنے کو خلاف شان تصور کرتے ہیں۔ اس سے قبل کہ بچے اپنے بزرگوں کے اِن خیالات اور اوہام کی بھول بھلیوں میں پھنس جائیں اور ان کے ذہن میں ذات

اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف اچھے طلبا کو موقع دیا جانا چاہیے جو سنجیدگی سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں اور اعلیٰ سطح کی دانشورانہ لیاقت اور تحقیق کے متحمل ثابت ہو سکیں۔ اس کے برعکس آج ہوتا یہ ہے کہ ہم کالج میں بہت سے ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولیات (جو عموماً ناکافی ہوتی ہیں) مہیا کر دیتے ہیں جنھیں حصول علم میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی

پات کے تحفظات اور تعصبات گھر کر جائیں، ذات پات اور مذہب کی حد بندیوں سے دور رہ کر اگر وہ ہاتھ کے کام کرنا سیکھ لیں گے تو وہ ایک بہتر اور معقولیت پسندی پر مبنی سماج کی تعمیر کر سکیں گے۔ کم سنی میں ہی ان کے ذہنوں کو انسانی برادری کی برابری کے تصور سے آشنا کرانا سماج کے لیے بہتر ثابت ہو گا۔ جس نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب

سوامی وویکانند، مہاتما گاندھی، نہرو اور دوسرے رہنماؤں نے دیکھا تھا اسے حقیقت کا جامہ اسی صورت میں پہنایا جا سکتا ہے جب بچے اپنے بزرگوں کا منفی رویّہ ترک کر کے تعلیم کے تئیں ایک نیا نقطہ نظر اختیار کریں گے۔ لہٰذا آنے والے برسوں میں ہائی اسکول سے فارغ ہونے والی نئی نسل سے طلبا، اساتذہ اور انتظامی عملے کی نئی کھیپ برآمد ہونی چاہیئے۔

ایک بات پر اور غور کر لیا جائے۔ اس وقت بھی ایسے جھلائے ہوئے نوجوانوں کا ایک حلقہ ہمارے درمیان موجود ہے جو کسی بھی معاملے میں محنت کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اچانک ٹی وی کے عروج نے ان میں نئی توقعات پیدا کر دیں۔ لہٰذا اب وہ امید یہ کرتے ہیں کہ بس بٹن دبائیں گے اور ان کا کام ہو جائے گا۔ طلبا کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو امتحانات میں نقل کرتی ہے، نگراں اور ممتحن کو دھمکاتی ہے اور پڑھائی پر توجہ دینے کے سوا ہر طرح کے غیر ضروری کام کرتی ہے۔ اگر ہائی اسکول کی سطح پر انھیں کسی کام کی ٹریننگ دی گئی ہوتی تو ان میں سے بہت سے طلبا کالج کا رخ نہ کرتے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ نچلی سطح کے کچھ کام کرتے ہیں کیونکہ کالج میں ایسی ٹریننگ نہیں دی جاتی جس کا تعلق کسی کام سے ہو۔ ان کی جھلاہٹ اور مایوسیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ جھلاہٹ اس شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم کام کے عوض زیادہ سے زیادہ اجرتوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ طلبا، اساتذہ اور عوام کی، ان کے ذریعہ کوئی خاص خدمت نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ سے

باقی صفحہ ۳۵ پر

ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ ہجیلہ

اعلیٰ تعلیم کے بدلتے رُخ

آزادی کے بعد اعلیٰ تعلیم کے میدان میں کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں اِن میں سے کچھ کا خیرمقدم کیا گیا اور کچھ کا نہیں کیا گیا۔ مضمون نگار نے اِس مضمون میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ناپسندیدہ سیاست کے دخل پر توجہ مرکوز کی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اگر یونیورسٹی کے نوجوانوں کو سیاست سے دور رکھا جائے تو یہ نقصان دہ ہوگا لیکن اگر عملی سیاست کی بجائے سیاسی دانشوری کے ماحول کو فروغ دیا جائے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا اندازہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد اور ان میں داخلہ لینے والوں کی تعداد میں اضافے سے جو گزشتہ ۴۰ برس میں ہوا ہے لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں ملک میں ۵۱-۱۹۵۰ء میں کالجوں کی تعداد ۵۴۲ تھی ۹۲-۱۹۹۱ء میں وہ تعداد بڑھ کر گیارہ گنا ہو گئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں یونیورسٹیوں کی تعداد ۱۴۹ تھی جو ۹۲-۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ۱۷۷ ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں اِن تعلیمی اداروں میں طلبا کی تعداد ۳ لاکھ ۶ ہزار تھی جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۴ لاکھ ۴ ہزار ہو گئی۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں یونیورسٹیوں سے ملحق کالجوں میں طلبا کی تعداد ۳۶ لاکھ ۹۳ ہزار تھی جب کہ یونیورسٹیوں میں ۷ لاکھ ۳۲ ہزار طالب علم تھے۔

۵۱-۱۹۵۰ء سے ۸۴-۱۹۸۳ء کے درمیان آرٹس سائنس اور کامرس کے طالب علموں کی تعداد میں ۲۱۷ فیصد سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہوا اِس کے بعد کے برسوں میں خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم اور پرائیویٹ طلبا کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دینے سے یونیورسٹیوں میں داخلے میں اضافہ کی شرح کم ہو کر ۴ یا ۵ فیصد رہ گئی ہے جہاں اس کمی سے رسمی تعلیم کے اداروں پر طلبا کا بوجھ کم ہو گیا ہے وہاں اِس سے تعلیم کے معیار میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ داخلے کا بوجھ کم ہو جانے سے اِن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فی طالب علم اخراجات میں کوئی کمی نہیں کی گئی دوسرے یہ کہ وہ بڑے بڑے امور جن کا تعلیم کے معیار پر منطقی اثر پڑتا تھا وہ طلبا کی تعداد میں کمی سے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے۔

ہم تعلیمی معیار کا ذکر بعد میں کریں گے۔ دریں اثنا ہم مقداری توسیع کے علاوہ دیگر تبدیلیوں پر نگاہ ڈال سکتے ہیں جو بھارت میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔

خود مختارانہ حیثیت

ایک تبدیلی یہ ہے کہ کالجوں کو خود مختاری کا مقام دے دیا گیا ہے جس کے تحت انھیں تعلیمی نصابات اور امتحانات کے بارے میں مقابلتاً خود مختاری دے دی گئی ہے اور انھیں ان معاملات میں اب یونیورسٹیوں کی رکاب سے نہیں بندھا پڑے گا۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ملک میں ۱۰۶ خود مختار کالج تھے ہم نے دیکھا ہے کہ کالج یونیورسٹی کی بہ نسبت ۵ گنا طالب علموں کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔

دراصل یونیورسٹیوں میں فیکلٹی کے کمپلیکس اکثر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ کالجوں کے لائق، ہونہار اور مستحق اساتذہ کو بھی یونیورسٹیوں میں تحقیق اور تدریس کے کاموں میں شامل ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالجوں کے اساتذہ ایک مذموم حلقہ کا شکار ہو جاتے ہیں ان کا یونیورسٹیوں کے تعلیمی شعبوں کے ساتھ کوئی اشتراک عمل نہیں ہوتا ان پر بہتر تحقیق و تخلیق کی کوئی مجبوری نہیں ہے لہٰذا وہ درمیانہ قسم کے معیار سے بندھ کر رہ جاتے ہیں لیکن اب خود مختار کالجوں کی صورت میں وہ کم از کم عمدگی مقابلوں کا تو اہتمام کر سکتے ہیں۔

ملازمت کے دوران تربیت

ایک اور تبدیلی جس کا اساتذہ کے تعلیمی معیار پر اثر پڑ سکتا ہے وہ اکیڈمک اسٹاف کالجوں کے ذریعہ کالجوں کے نوجوان اساتذہ کے لیے ملازمت کے دوران تربیت کی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء تک ایسے ۴۸ کالجوں نے ۴۶۴ تعلیمی اور تجدیدی نصابات کا اہتمام کیا ہے جن میں ۱۲۹۷۰ اساتذہ شریک ہوئے۔

تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے تعلیم اور امتحان کا سمیسٹر سسٹم بہت سی یونیورسٹیوں میں شروع کیا گیا ہے جس سے طالب علم سالانہ امتحانوں کے سسٹم کی بہ نسبت تعلیم کے عمل میں زیادہ باقاعدگی سے مشغول رہتے ہیں۔

کچھ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ مطالعہ کے مراکز بھی قائم کیے گئے ہیں تاکہ وہاں تحقیقی کاموں میں اضافہ کیا جا سکے اور وہ اعلیٰ قابلیت کے ایسے مرکز ہو جائیں جن سے سب مستفید ہو سکیں۔ ان مرکزوں

کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اساتذہ کو اس امر کی ترغیب ملے کہ وہ اگر قابلیت کے لحاظ سے بہتر نہیں تو کم از کم اپنی پہلی سطح کو برقرار رکھیں۔

بھارت میں بڑے پیمانے پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اگر ہمیں تعلیم کے معیار کو بلند رکھنے کی فکر تھی تو ہمیں دھڑا دھڑ کالج اور یونیورسٹیاں نہیں کھولنی چاہئے تھیں۔ ۱۹۶۸ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں زور دیا گیا ہے کہ ہمیں نئی یونیورسٹیاں قائم کرنے میں احتیاط برتنی چاہئے اس کے باوجود ہم نے ۸۵-۱۹۸۴ء کے بعد ۷ برسوں میں ۲۸ نئی یونیورسٹیاں قائم کی ہیں

اس صورت حال کا ایک اور پہلو بھی ہے جو تشویش پیدا کر رہا ہے۔ جہاں ملک میں وسیلے پیدا کرنے اور انھیں استعمال میں لانے کے مسائل بڑھ رہے ہیں وہاں تعلیم کے لیے مخصوص رقوم کل آمدنی کے چھ فیصد کے برابر رکھنے کے نشانے تک نہیں پہنچیں اِس اثنا میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کے مطالبات بڑھ رہے ہیں خاص طور پر ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے پرائمری تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر بہت پریشانی ہوتی ہے کہ جہاں پرائمری تعلیم کے لیے مخصوص رقم ماسوائے تیسرے منصوبے کے پہلے منصوبے کے بعد سے متواتر کم ہوتی جا رہی ہے وہاں یونیورسٹی تعلیم کے لیے رقوم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے منصوبے میں پرائمری تعلیم کا خرچ کل تعلیمی اخراجات کے ۶۳٫۹ فیصد کے برابر تھا وہ چھٹے منصوبے میں کم ہو کر ۴۵٫۸ فیصد رہ گیا۔ دوسری جانب یونیورسٹی تعلیم کے اخراجات کا تناسب پہلے منصوبے میں ۱۵٫۹ فیصد سے بڑھ کر چھٹے منصوبے میں ۲۲٫۴ فیصد ہو گیا۔

لہٰذا ملک میں یہ رائے دی جا رہی ہے کہ ہمیں یونیورسٹی تعلیم کے اخراجات کی رفتار سست کر کے پرائمری تعلیم کے شعبے میں اخراجات کی رفتار تیز کرنی چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں کوریا نے ۱۹۷۵ء تک ۹۰ فیصد خواندگی حاصل کر لی تھی اور جاپان نے اس سے بھی پہلے یہ نشانہ حاصل کر لیا تھا وہاں ہم ابھی اس سے آدھے تناسب پر بھی نہیں پہنچ سکے۔

اس قسم کی آرا ملک کے مفاد کے منافی ہو سکتی ہیں۔ پرائمری تعلیم کا پیداواریت، آبادی اضافے اور سیاست سے واضح طور پر واسطہ ہے لہٰذا اس سے پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہئے۔ ماحول زندگی کو روشن کرنے

[illegible] تک نہیں پہنچتے۔

کی بجائے تاریک کرتی ہے لیکن علم اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم کی اپنی خوبیاں ہیں اور جب تک ہمارے پاس اعلیٰ تعلیم کے لیے کافی بنیادی سہولیات نہ ہوں تب تک عالمی سطح کے

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالجوں کے اساتذہ ایک مذموم حلقہ کا شکار ہو جاتے ہیں ان کا یونیورسٹیوں کے تعلیمی شعبوں کے ساتھ کوئی اشتراک عمل نہیں ہوتا اور یہ بہتر تحقیق و تخلیق کی کوئی مجبوری نہیں ہے لہٰذا وہ درمیانہ قسم کے معیار سے بندھ کر رہ جاتے ہیں۔

کاروبار میں اُس طرح شریک نہیں ہو سکتے جس طرح ہم چاہتے ہیں۔ بنیادی طور پر عالمی پیمانے کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے خلا کو پُر کیا جائے اور نئے عالمی اقتصادی

[illegible] ہم چاہتے ہیں۔

اور سماجی نظام کے ساتھ ربط پیدا کیا جائے۔

جب یونیورسٹیوں کی قدر و اہمیت کو کم کر کے بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہاں مغربی طرز کا علم اور ٹیکنالوجی حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اس مقصد کے لیے وسیع پیمانے پر اعلیٰ تعلیم کا نظام قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کی بجائے اگر معیاری تعلیم دینے والے کچھ ادارے قائم کر دیئے جائیں تو یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔

یہاں یہ معلوم کرنا باعث دلچسپی ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے ممالک بھی تحقیق کے کاموں میں مصروف افراد کی تعداد کو بھاری اہمیت دے رہے ہیں۔ جہاں بھارت میں دس لاکھ کی آبادی پر ۱۳۲ افراد تحقیقی کاموں میں لگے ہیں جنوبی کوریا میں ان افراد کی تعداد ۱۲۸۳، تائیوان میں ۱۴۲۶، سنگاپور میں ۹۶۰، برازیل میں ۲۵۶، میکسیکو میں ۲۱۷ اور جاپان میں ۴۵۶۹ ہے۔ یہاں تک کہ تھائی لینڈ میں بھی یہ تعداد ۱۵۱ اور انڈونیشیا میں ۱۵۲ ہے۔

لہٰذا جہاں تک یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام پر زور کا تعلق ہے یہ تعداد بہت اہمیت رکھتی ہے۔

لہٰذا وسائل کی کمی کا حل یہ ہے کہ اعلیٰ اور پرائمری دونوں طرح کی تعلیم کے لیے زیادہ رقوم مخصوص کی جائیں نہ کہ ایک کی قیمت پر دوسری کو رقوم مہیا کی جائیں۔ اور یہ وسیلے ایک ہی ذریعہ سے حاصل ہونے چاہئیں جہاں سے یہ دوسری ترقی کی سہولیات کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یعنی ٹیکسوں، بینکوں کی رقوم، عوام سے قرضوں اور اخراجات میں کفایت سے۔

یقیناً اعلیٰ تعلیم کی ٹیوشن کی فیس و دیگر فیسوں کی شکل میں جو سبسڈی دی جاتی ہے اس میں

ا کی جاسکتی ہے جس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ افراد ز
یے ساتھ عوام کی آمدنی اور اخراجات میں بھی اضافہ ہوا ہے
ذا انھیں راغب کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی فیس
ں مرحلہ وار اضافہ کو برداشت کریں۔

> ... کا آسان نشانہ بن جاتے ...

اس عمل کے راستے میں طلبا کے رہنما رکاوٹیں کھڑی کرسکتے ہیں۔ یہ رکاوٹیں وہی ہیں جو سیاسی سرگرمیوں کے ماہ سماج میں سرگرم عمل ہیں اور کالجوں میں بھی نظر آتی ہیں۔

طلبا کی مایوسی

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت میں یونیورسٹیوں کے طلبا اپنے آپ کو بہت دل شکستہ اور مایوس محسوس کرتے ہیں کیونکہ جس تعداد میں گریجویٹ یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں وہ اس تعداد سے کہیں زیادہ ہے جسے معیشت میں کھپایا جاسکتا ہے۔ ملک میں روزگار کے وسیلوں میں اضافے کی شرح صرف دو فیصد سالانہ ہے۔ اگر طلبا سے کہا جائے کہ وہ تعلیم کے معیار کی جانب زیادہ توجہ دیں تو وہ اس مشورے کو روزگار کے امکانات سے وابستہ کرتے ہیں اور بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو

> ... ہے کہ اگر سماج ...

امتحان میں اچھے نتیجہ کو حاصل کرسکیں۔

اساتذہ اگر چاہیں تو اس مشکل صورت حال میں کوئی مدد نہیں کرسکتے کیونکہ سیاسی جماعتوں کی یہ پیاس کم نہیں ہوتی کہ وہ طلبا اور اساتذہ کو اپنے گھیرے میں لئے رہیں۔ سیاسی جماعتیں تو مایوس طلبا و اساتذہ کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کریں گے ہی سماج میں خصوصی مفادات کی کشمکش رہتی ہے، طبقہ اور ذات کی آویزش ہوتی ہے۔ اور اقتصادی استحصال

ناموں کرتا ہے لہٰذا قدرتی طور پر سیاسی قائد ایک یا دوسرے گروہ کی طرفداری کرتے ہیں۔ ان حالات میں یونیورسٹیوں میں نوجوانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اگر لائبریری، کلاس روم، ہوسٹل کی سہولیات، تدریس، امتحان یا انتظامیہ یا اہلیت

> ... کے لیے روزگار کی صلاحیت ... کیمپس کو ...

کا کوئی سوال ہو بھی تو باہر کی سیاسی جماعتیں اس منظر میں کیسے داخل ہوسکتی ہیں؟

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے یا برقرار رکھنے کے لیے ماحول کو غیر مطلوبہ طور پر سیاسی رنگ دیا جاتا ہے۔ اس سے تعلیمی عمدگی کی بجائے مفادات خصوصی ڈسپلن شکنی اور یونیورسٹی کے انتظامیہ کے حکام پر زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ مایوس طلبا سیاسی رہنماؤں کے لیے آسان نشانہ بن جاتے ہیں جس سے قدرتی طور پر تدریس و تحقیق کے معیار کو نقصان پہنچتا ہے۔ اساتذہ بھی اس شور شرابے میں شامل ہوجاتے ہیں خاص طور پر وہ اساتذہ جن کے کیمپس سے باہر کی سیاسی دنیا سے رابطے ہوتے ہیں۔

ہمارا ارادہ کسی طرت شخص یا اشخاص کو قصوروار ٹھہرانے کا نہیں ہے بلکہ اس طریقہ کار کی طرف توجہ دلانے کا ہے جس سے سیاسی تربیت کے نام پر نوجوانوں کی مایوسی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور نظم و ضبط کا موزوں ماحول پیدا کرنے، محنت و لگن اور ملکی مسائل کی جانب توجہ نہیں دلائی جاتی۔ اگر یونیورسٹی کے نوجوانوں کو سیاست سے دور رکھا جائے تو یہ ایک خراب بات ہوگی لیکن اُن مذموم حلقوں کے درمیان جو نوجوانوں کی مایوسی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور انھیں اعلیٰ قابلیت کے حصول سے روکتے ہیں یونیورسٹی کے نوجوانوں کے پاس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ایسا مستقبل اس طرح بنائیں کہ اگر فوری طور پر نہیں تو کم از کم کچھ دیر سے ہی ان کی مایوسی ختم ہو۔ اس قسم کا تعمیری طرز عمل جس میں تعلیمی اداروں اور وائس چانسلروں کو بھی شامل ہونا چاہئے سیاسی دانشوری سے فروغ پاسکتا ہے نہ کہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے۔ اس میں مدد دینے کے لیے سیاسی جماعتوں کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کو سیاسی اکھاڑہ بنانے کے خلاف قومی پیمانے پر اتفاق رائے پیدا کریں۔

اس معاملے میں مغربی روایات کا حوالہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اُن ملکوں کی یونیورسٹیوں میں اُس قسم اور اُس پیمانے کی مایوسی کبھی پیدا نہیں ہوتی جیسی ہم یہاں دیکھتے ہیں۔ وہاں زائد از ۲۰ فیصد نوجوان یونیورسٹی تعلیم کے لیے جاتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں یہ تناسب ۷ یا ۸ فیصد ہے اور ان کے یہاں کسی ڈسپلن سے عاری تحریکیں، احتجاج اور مقصدیت کی کمی دکھائی نہیں دیتی جو ہمارے ہاں ہے۔ یہاں تک کہ جاپان، تائیوان اور کوریا جیسے مشرقی ایشیائی ممالک کی مثال بھی ہم پر لاگو نہیں ہوتی۔

وہاں سب کے لیے روزگار ہے۔ لہٰذا وہاں کا نوجوان ایک مقصد کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ تعلیم سے حقیقی معنوں میں انسانی وسائل کے فروغ میں مدد ملتی ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ افرادی قوت تو ہے لیکن اس کا معیار بلند نہ ہونے کی وجہ سے وہ موثر نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں سیاسی قیادت معیشت کے لیے روزگار کی صلاحیت میں اضافے کے طریقے تلاش کرے وہاں وہ یونیورسٹی کیمپس کو اپنی ذہانت کا استعمال خود کرنے دے اور مداخلت نہ کرے کیونکہ یہ مداخلت اُن کی کوششوں میں اضافہ کرنے کی بجائے اُس میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔

جواب دہی یا ذمہ داری

یہ بات ایک مقولے کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ یونیورسٹیاں عوام کو جواب دہ ہونی چاہئیں لہٰذا حکومت کو لازمی طور پر وائس چانسلر مقرر کرنے اور برخاست کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ سیاسی اثرات و اختیار میں توسیع کی حامی سیاسی قیادت کے ہاتھوں وائس چانسلروں کی ذمہ داری گھٹتے گھٹتے ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ہمارا آدمی وائس چانسلر ہو۔ یہاں تک کہ جب کوئی حکومت تبدیل ہوتی ہے تو یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وائس چانسلر بھی تبدیل کر دیئے جائیں۔ ہمیں اس بات پر شدید اعتراض ہو سکتا ہے کہ وائس چانسلروں کے بارے میں یہ سمجھا جائے گویا وہ کسی سیاسی یا دفتری عہدے پر فائز ہیں۔ یونیورسٹیوں کے بارے میں پرانے قوانین میں یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ایک وائس چانسلر یونیورسٹی کا انتظامیہ اور تعلیمی سربراہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک عام منتظم سے مختلف شخص ہوتا ہے۔ اور کسی بھی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوئی سیاسی عہدہ سنبھالے ہوئے ہے۔

اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اگر سماج حکومت کے ذریعہ یونیورسٹیوں کے اخراجات برداشت کرتا ہے تو یونیورسٹیوں کو عوام کے سامنے جوابدہ ہونا چاہئے۔ خاص طور پر اُس حالت میں جب انہیں دی جانے والی مالی امداد اتنی زیادہ ہو جتنی کہ اس وقت دی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں یونیورسٹیوں کو مکمل خود مختاری نہیں دی جا سکتی۔ آخر ٹیکس دہندگان کا پیسہ ہے جو یونیورسٹیوں پر خرچ ہوتا ہے اور وہ جائز طور پر ان سے جواب مانگ سکتے ہیں۔

مشکل اس وقت کھڑی ہوتی ہے جب مالی جوابدہی ان لوگوں کی سیاسی اغراض کو چھپانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو برسرِ اقتدار ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مالی بے ضابطگیاں کس طرح ہوتی ہیں جب کہ وہاں پورا وقت صرف کرنے والے فنانس افسر ہوتے ہیں اور جب یونیورسٹیوں کے اخراجات کے بارے میں پیشگی آڈٹ پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ یونیورسٹی اخراجات کا ۸۰ فیصد حصہ عملے کی تنخواہوں اور روزمرہ کے اخراجات پر صرف ہوتا ہے اور مالی وسیلوں کی کمی ہے تو مالی جوابدہی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

بہرحال وائس چانسلروں کے معاملات میں حکومت کے پاس من مانی کرنے کے اختیارات کی وکالت نہیں کی جا سکتی۔ اتر پردیش میں یہ اختیارات ایمرجنسی کے دنوں میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ حاصل کیے گئے لیکن ایمرجنسی کے مخالفوں کے اقتدار میں آ جانے کے بعد بھی حکمرانوں نے یہ اختیارات اپنے پاس رکھے۔ اور اب بھی یونیورسٹیوں پر گرفت کو مضبوط کرنے کی خواہش جاری ہے۔

ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے کہ کیا آزادی کے بعد اعلیٰ تعلیم میں آئے زوال کو یونیورسٹیوں کے تئیں انگریزوں کی نسبت کم فراخدلانہ رویہ سے درست کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ اگر اس وقت معیار بہتر تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یونیورسٹیوں کو زیادہ آزادی حاصل تھی۔ لیکن دوسری جانب بھی دلیل دینا مشکل ہے کہ یونیورسٹیوں میں حکومت کے کنٹرول میں اضافہ کر کے اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے وسیلوں کی کمی کا مسئلہ وسیلوں کی عام کمی کے مسئلہ کا ہی ایک حصہ ہے اور اسے یونیورسٹیوں پر زور دے کر حل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے لیے خود وسیلے حاصل کریں۔ اگر اعلیٰ تعلیم میں تیزی سے ترقی ہو بھی اور پیداواریت میں ہمہ گیر اضافہ بھی ہو پھر بھی اس کے پاس اپنا کوئی وسیلہ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ پیداواریت میں اضافہ سے فائدہ اٹھانے والوں سے کہا جائے کہ وہ پڑھائی کے لیے زیادہ فیس دیں۔ یہ ایک بہت بڑے مسئلے کا بہت کمزور حل ہے۔ اگر سیاسی اتفاق رائے ہو تو فیس بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن باقی معاملات کے لیے یونیورسٹیوں کو سماجی دائرہ کار کا خیال کرنا ہوگا جسے ان بنیادوں پر ہی تعمیر کرنا ہوگا جن پر عام معیشت کے لیے بنیادی سہولیات کی تعمیر کی جاتی ہے۔ ●

بقیہ: لامرکزیت کا مسئلہ اور ہماری یونیورسٹیاں

انتظامی معاملات میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

جہاں تک یونیورسٹی میں آنے والے اساتذہ کا سوال ہے، تو یہاں بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ درس و تدریس کے پیشے کے لیے اچھے اور باصلاحیت اساتذہ کیسے تلاش کیے جائیں؟ یو جی سی نے ہر سطح کے اساتذہ کے لیے تنخواہ کی جو نئی شرح مقرر کی اس کا مقصد یہی تھا کہ کالجوں کے لیے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن اساتذہ کو تعلیم اور تحقیق کا معیار بلند کرنے کے بجائے اپنی تنخواہ میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اچھے اساتذہ اور طلبا موجود نہ ہوں، نتیجہ تباہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انتظامیہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اسے معیار کو بہتر بنانے کا پابند ہونا چاہئے تو اسے یہ آزادی بھی ملنی چاہئے کہ وہ بہتر اور باصلاحیت طلبا، اساتذہ اور انتظامی اسٹاف بحال کر سکے۔

اگرچہ تعلیمی اداروں کی انتظامیہ میں لامرکزیت لانے کے کام سے اور بھی کچھ معاملات جڑے ہوئے ہیں لیکن اس مختصر مضمون میں چند باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (الف) یونیورسٹی/کالج انتظامیہ میں نچلی سطح پر زیادہ اختیارات دینے کے لیے ضابطے میں تبدیلی کرنا ہوگی (ب) اچھے طلبا، اساتذہ اور انتظامیہ کے اسٹاف بحال کرنے ہوں گے (ج) کالجوں کو منظوری دینے کے سوال پر پرانے تصورات پر نظرثانی کرنا ہوگی اور (د) کالجوں کو مالی اور تعلیمی معاملات میں مزید اختیارات دینے ہوں گے تاکہ کسی خاص علاقے کی ضروریات کے مطابق نئے کورس روشناس کرائے جائیں اور طلبا کی صلاحیت کی جانچ کے لیے نئے پیمانے وضع کیے جائیں۔ ایک بار پھر اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں اسی صورت میں بہتری لائی جا سکتی ہے جب ڈگری کے ساتھ ملازمت کے تصور کو توڑ دیا جائے۔ اس شعبے میں صرف انہی لوگوں کو بحال کیا جائے جو حقیقتاً اس کے خواہشمند اور پاسداری کرنے کے پابند ہوں اور سب سے اہم بات یہ کہ اسکول کی سطح پر ہی پیشہ ورانہ تعلیم کو روشناس کیا جائے۔ ●

ڈاکٹر ڈی۔ ایم۔ نجنڈپّا

یونیورسٹیوں میں نئی روح پھونکنے کی ضرورت

حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان میں یونیورسٹی نظام میں عظیم توسیع ہوئی ہے۔ اس نظام کی کارکردگی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنف نے اس مضمون میں کہا ہے کہ ہمارے تعلیمی رہنماؤں نے، جن میں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی شامل ہیں، اس بارے میں دوربینی کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے طلبا کے لیے کیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت طلبا کے بجائے تحقیقی کام یا ریسرچ کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور طلبا کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ چنوتیاں مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ پھر بھی مصنف کی رائے میں ثانوی تعلیم کو بہتر بناکر، صنعت کے ساتھ تعلیم کا رشتہ جوڑکر، تحقیقی وسائل کا موثر استعمال کرکے اور مختلف سطحوں پر لامرکزیت لاکر صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

"مکمل اور فراخدلانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو امن اور جنگ کے دونوں ہی زمانوں میں سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر دانشمندی، انصاف پسندی اور وسیع الخیالی کے ساتھ کام کرنے کے قابل بناتی ہے۔" جان ملٹن کے یہ الفاظ تعلیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یونیورسٹیوں جیسے تعلیمی مراکز کے فرائض کی جانب اشارہ کرتے ہیں جنھیں علم، روشنی اور آزادی کا مینارہ سمجھا جاتا ہے اور جنھیں نظامِ تعلیم کے ذریعے قومی مسائل حل کرنے کو اعلیٰ ترجیح دینی چاہیئے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں اس آدرش کے حصول میں بہت پیچھے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں کی کارکردگی پر ایک سخت تنقید ہے۔ یہ الزام کوئی نیا نہیں ہے کیونکہ یہ گذشتہ کئی دہائیوں سے لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن صرف ہندوستان ہی میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ کئی اور ملکوں میں بھی یونیورسٹیوں کے بارے میں مختلف وجوہ کی بنا پر ایسی تنقید کی جاتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے ریٹائرڈ پریذیڈنٹ، پروفیسر ڈیرک بوک نے امریکی یونیورسٹیوں اور امریکی تعلیم پر ہونے والی نکتہ چینیوں کا ذکر کیا ہے، اگرچہ غیر ممالک میں ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ "امریکی یونیورسٹیاں عوام کا اعتماد کھو چکی ہیں اور اب سوال یہ ہے کہ اس اعتماد کو کیسے بحال کیا جائے۔"

اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سے گروپوں کو یونیورسٹیوں نے ناراض کر دیا ہے اس لیے لوگوں کا موڈ اکھڑا ہوا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان میں یونیورسٹی نظام کی بڑے پیمانے پر توسیع ہوئی ہے۔ لاکھوں لوگوں کو یونیورسٹیوں تک رسائی حاصل ہو گئی ہے جس سے ایک بنیادی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ تاہم ہمارے تعلیمی رہنما، بشمول وائس چانسلروں کے، طلبا کی تعلیم کو اعلیٰ ترین ترجیح دینے کے معاملے میں خاموش ہیں۔ یہ بات خاص کر انڈر گریجویٹوں اور پوسٹ گریجویٹوں کے ضمن میں صحیح ہے۔

سوالات جن کا جواب نہیں ملتا

جب یونیورسٹی کے رہنماؤں پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اس بارے میں دوربینی کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ وہ طلبا کے لیے کیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس کے جواب میں وہ فوراً نصابات میں اصلاح، نئے کورسوں، تحقیقی مطالعوں، عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں اور کیٹلاگ اور پمفلٹ دکھاتے ہیں لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ طلبا مختلف کورسوں اور پروگراموں کا زیادہ بنیادی نصب العینوں کے حصول کے لیے کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔ وائس چانسلر، پروفیسر اور ایڈمنسٹریٹر ان والدین سے کیا کہتے ہیں جو کچھ بنیادی باتوں کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ یہ سسٹم یا ادارہ ان کے بچے کی کس طرح مدد کرے گا کہ وہ زیادہ واضح انداز میں سوچ سکتے ہیں، کیسے زیادہ خلیق اور با اخلاق انسان بن سکتے ہیں، کیسے زندگی میں کوئی تسلی بخش کام دھندہ یا پیشہ شروع کر سکتے ہیں اور کیسے اپنے اندر وہ قدریں پیدا کر سکتے ہیں جن سے انھیں ایک اچھا اور قابلِ فہم انتخاب کرنے میں مدد ملے۔

یونیورسٹیاں طالب علموں کے لیے ہیں پھر بھی طالب علموں کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ جب پڑھانے کی بات آتی ہے تو زیادہ

کہ یونیورسٹی اور صنعت و کاروبار کے درمیان کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں یونیورسٹی اور صنعتی سیکٹر کے درمیان ایک مناسب رشتہ قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ طلبا صنعتی اداروں میں جاکر تربیت حاصل کرسکیں۔ بدقسمتی سے اس سلسلے میں ابھی زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ بنیادی رکاوٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صنعت کو یونیورسٹیوں یا ان کے مراسلات تعارف پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ لہذا پہلے یونیورسٹیوں کو اپنی ڈلیوری کی صلاحیت کا یقین دلانا ہوگا۔

اس یقین دہانی کی کمی کے سبب صنعت یا تو خود اپنے ریسرچ اور ڈولپمنٹ کے شعبے پر یا غیر ملکی ٹکنالوجی پر انحصار رکھنا پسند کرتی ہے۔ بے اعتمادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں مکمل علیحدگی میں کام کرتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی وائس چانسلر اپنی یونیورسٹی کے ساتھ صنعت کا رشتہ جوڑنے کی تجویز لے کر کسی صنعت کار کے پاس جائے تو اس کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا جائے گا۔ اس صورتحال کو یونیورسٹیوں کے ماہرین اور صنعتوں کے منتظمان اور کارکنان کے درمیان گفت و شنید کے کئی ادوار سے بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام صرف یونیورسٹیاں ہی نہیں کرسکتیں۔ یونیورسٹیوں، صنعتوں اور طلبا کے درمیان، جنھیں نظریاتی تربیت حاصل کرنے کے بعد صنعتوں کے مختلف شعبوں میں کام کرنا ہے، تفاعل اور رابطہ کے لیے سرکار کو پرزور مداخلت کرنی ہوگی۔ اس معاملے میں پہل فروغ انسانی وسائل کی وزارت اور ریاستی حکومتوں کو کرنی ہوگی۔

بعض کمپنیوں میں اس ضمن میں جو شبہات پائے جاتے ہیں ان پر توجہ دینا بھی ضروری ہے تاکہ افراد کی صنعت کے لیے تربیت بازار میں دستیاب نہیں ہے کیونکہ کوئی پرائیویٹ کمپنی کسی ایسے مرد یا عورت کو تربیت دینے کو تیار نہیں ہوتی جسے کسی اور کمپنی کا اعتماد حاصل ہو یا جس کے کسی اور کمپنی میں کام کرنے کی امید ہو۔ وہ سوچتی ہے کہ دوسری کمپنی تربیتی اخراجات سے بچنا چاہتی ہے پھر وہی کیوں تربیت کا خرچ اٹھائے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر منصوبے بنانے والی تنظیم کو غور کرنا ہے۔

قومی مسائل کو حل کیجئے

اس سوال کا کہ طلبا نے کیا کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ سیکھا ہے وہ کتنا کارآمد ہے، جواب دینے

> یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے سوائے معاشرہ کے کچھ اداروں کے بارے میں ریسرچ کرنے کو بیتاب رہتی ہیں۔ پروفیسر اور معلمین یہ جاننے کی کوشش تو کرتے ہیں کہ کوئی طالب علم کتنا اسمارٹ ہے لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ انھوں نے گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ ہونے تک کیا کچھ سیکھا ہے۔

کے لیے یونیورسٹیوں کو ہندوستان کی ترقی سے حاصل ہونے والے مواقع کا فائدہ اٹھانا چاہئے خصوصاً صحت، دیہی ترقی، کاروبار، سرکاری نظام تقسیم، لوکل سیلف گورنمنٹ، تنظیمی قابلیت، ثقافتی وراثت اور سماجی ترقی وغیرہ کے شعبوں میں۔ صرف اسپیشلسٹ تیار کرنا ہی کافی نہیں ہے۔

> یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو اسکول کی تعلیم کو بہتر بنانے میں دلچسپی لینی چاہئے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں یونیورسٹیوں کو اپنا فرض نبھانا ہوگا۔

انھیں یہ سکھانا چاہئے کہ لاگتوں کو بڑھنے سے کیسے روکا جائے۔ بزنس کے میدان میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستانی مینیجروں نے ہندوستانی بزنس اسکولوں، اداروں یا یونیورسٹیوں کی بہ نسبت امریکی یا جاپانی کمپنیوں سے زیادہ سیکھا ہے۔ بہرحال تربیتی پروگراموں کی اشد ضرورت ہے۔ فیکلٹی آف ایجوکیشن کو ہمارے ملک کو درپیش عظیم اقتصادی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ سرگرمی اور سوجھ بوجھ سے کام کرنا ہوگا۔

لاگت کے مطابق موثر کارگزاری

حال ہی میں ایسکس یونیورسٹی (برطانیہ) کے وائس چانسلر پروفیسر مارٹن ہریس نے مختصر مگر جامع انداز میں یونیورسٹیوں کے معاملے میں لاگت کے مطابق موثر کارگزاری اور اہلیت کا سوال اٹھایا ہے۔ یہ قدم یونیورسٹیوں میں اہلیت سے متعلق جیرٹ رپورٹ (۱۹۸۵ء) کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ہندوستان کی یونیورسٹیوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تجزیہ نفس یعنی خود اپنا تجزیہ کرنے کا طریقہ رائج کیا ہے لیکن اس پر عمل آوری میں سرد مہری ہی دیکھنے میں آئی۔ پروفیسروں کا خیال ہے کہ ایڈمنسٹریٹر اس طریقے کا استعمال اپنے فائدے کے لیے کرسکتے ہیں، وہ اس طرح کہ اس سے انھیں پروفیسروں پر بندشیں لگانے کا موقع مل جائے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ تجزیہ نفس اس قدر حساس ہو۔ یونیورسٹی لیڈروں کو اس قسم کا تجزیہ کرنے پر راضی ہوجانا چاہئے، تبھی وہ مثالی کردار کا نمونہ پیش کرسکیں گے۔ تعجب کی بات ہے وائس چانسلر صاحبان مختلف شعبوں میں اپنے رفقار کار کے کام کے تجزیے پر تو اس قدر اصرار کرتے ہیں لیکن خود اپنا تجزیہ کرانے پر رضامند نہیں ہوتے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی کے تحقیقی وسائل کا استعمال کتنے موثر انداز میں کیا جارہا

ہمیت ریسرچ یا تحقیقی کام کو دی جاتی ہے بجائے اس کے کہ انھیں کتنے موثر ڈھنگ سے پڑھایا جاتا ہے اور اساتذہ ان کی دیکھ ریکھ کیسے کرتے ہیں۔ اساتذہ یہ کہہ کر پڑھانے کا بوجھ کم کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر وہ پڑھانے پر زیادہ وقت صرف کریں گے تو ریسرچ کو نقصان ہوگا۔ لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ زیادہ وقت صرف کرنے سے ریسرچ اعلیٰ درجے کی ہوگی۔

ہماری یونیورسٹیوں میں نئی روح پھونکنے کا کام یونیورسٹی نظام کی پیچیدگی، یونیورسٹی پراڈکٹ کے لیے بدلتی ہوئی مانگ اور ایسے پراڈکٹ کی فطری قوت و افادیت سے پیدا ہونے والے کئی چیلنجوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس صورت حال کی بہت سی وجوہات ہیں جو سبھی کو معلوم ہیں، لہٰذا انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال یہ بات تو یقینی ہے کہ یونیورسٹیوں نے اپنا تناظر کھو دیا ہے۔

تعلیم کے مختلف مرحلوں کیلئے تخصیص زر

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی تعلیم میں اُس وقت تک بہتری نہیں آسکتی جب تک کہ سیکنڈری (ثانوی) تعلیم کی کوالٹی کو بہتر نہ بنایا جائے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صرف ثانوی تعلیم ہی نہیں ابتدائی یا پرائمری تعلیم اور گھریلو ماحول کو بھی بہتر بنانا ضروری ہے۔ اس کے لیے ہمیں سرکاری رقومات کی تخصیص کی خاطر نسبتی ترجیحات مقرر کرنی ہوں گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے یونیورسٹی تعلیم سے زیادہ فنڈ مخصوص کرنا ہوگا تو کئی وائس چانسلر بھنویں چڑھالیں گے۔

> **وائس چانسلر، پروفیسر اور ایڈمنسٹریٹر ان والدین سے کیا کہتے ہیں جو کچھ بنیادی باتوں کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ سسٹم یا ادارہ ان کے بچے کی کس طرح مدد کرے گا کہ وہ زیادہ واضح انداز میں سوچ سکتے ہیں، کیسے زیادہ خلیق اور با اخلاق انسان بن سکتے ہیں، کیسے زندگی میں کوئی تسلی بخش کام دھندہ یا پیشہ شروع کر سکتے ہیں اور کیسے اپنے اندر وہ قدریں پیدا کر سکتے ہیں جن سے انھیں ایک اچھا اور قابل فہم انتخاب کرنے میں مدد ملے۔**

ہم اس موضوع پر بعد میں آئیں گے۔ فی الحال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں طلبا کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ہمیں ان یونیورسٹیوں کو بہتر بنانا ہے تو ہمیں کچھ سخت اور پریشان کن سوالات کرنے ہوں گے اور ان کا خاطر خواہ جواب بھی دینا ہوگا۔

اہم بات یہ ہے کہ طالب علم کیا سیکھتے ہیں؟

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے سوائے معاشرہ کے کسی بھی ادارے کے بارے میں ریسرچ کرنے کو بے تاب رہتی ہیں۔ پروفیسر اور معلمین یہ جاننے کی کوشش تو کرتے ہیں کہ کوئی طالب علم کتنا 'اسمارٹ' ہے لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس نے گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ ہونے تک کیا کچھ سیکھا ہے۔ چونکہ معلم یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ کتنا اچھا پڑھاتے ہیں اور طالب علم کیا کچھ سیکھتے ہیں، اس لیے ان کے پاس طریقہ تعلیم کو بہتر بنانے کا کوئی اچھا طریقہ بھی نہیں ہے۔ وہ برہم ہو کر یہی کہتے ہیں کہ وہ ایسے طالب علموں پر جتنی محنت کرتے ہیں لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔

> **ہماری یونیورسٹیوں میں نئی روح پھونکنے کا کام یونیورسٹی نظام کی پیچیدگی، یونیورسٹی پراڈکٹ کے لیے بدلتی ہوئی مانگ اور ایسے پراڈکٹ کی فطری قوت و افادیت سے پیدا ہونے والے کئی چیلنجوں سے بھرا ہوا ہے۔**

یہ بات صحیح ہے کہ نصابات پر نظر ثانی کرتے ہوئے محض معمولی تبدیلیاں کر دی جاتی ہیں نصابات کے مشمولات کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ انھیں مقدس دستاویز تصور کیا جاتا ہے، ان کی بنیادی ترجیحات کو بدلنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ماہرین علم کو سمجھنا چاہیئے کہ اُن پر طلبا کو پڑھانے کی اعلیٰ ترین ترجیح دینے کی ذمہ داری ہے۔ انھیں طلبا کو خصوصاً ڈگری سے نیچے کی سطح کے طلبا کو بہترین تعلیم دینی چاہیئے۔ جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے ان پر نکتہ چینی ہوتی رہے گی، اور نصاب تعلیم، فیکلٹی، ٹیوشن، پرچوں کو جانچنے کے طریقے کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا۔

اسکولی تعلیم

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو اسکول کی تعلیم کو بہتر بنانے میں دلچسپی لینی چاہیئے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں یونیورسٹیوں کو اپنا فرض سمجھنا ہی ہوگا۔ سیکنڈری (ثانوی) اسکولوں کے اساتذہ، ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کو یونیورسٹیاں ہی تربیت دیتی ہیں۔ وہی کلاس روم کا بہتر میٹریل تیار کرتی ہیں اور طلبا کو پڑھنے میں مدد دینے کے نئے طریقے ایجاد کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ہوتا یہی ہے کہ اسکولوں سے متعلق سارا کام فیکلٹی آف ایجوکیشن پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسکول ٹیچروں اور منتظمان کو تربیت دینے کا کام زیادہ دلچسپ بنایا جائے اور اسکولوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے کام میں پوری یونیورسٹی شریک ہو۔

صنعت کے ساتھ تعلق

اس بات پر بھی کافی نکتہ چینی کی جاتی ہے

ہے۔ کارکردگی کے چاہے کتنے ہی اشاریئے پیش کیے جائیں، قابل قبول اشاریئے پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ آؤٹ پُٹ (OUT PUT) یا ماحصل کی کوالٹی کے بارے میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن یونیورسٹیوں میں اسکالروں کی ہر پبلی کیشن کی افادیت کا تو جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ اسی لیے یہ بات واجب معلوم دیتی ہے کہ ریسرچ (تحقیق) کے لیے رقوم مخصوص کرنے کی سفارش ان امور کی بنا پر کی جائے: اسکالر کے شائع کردہ مواد کی خود اس کی چھپی ہوئی جزدی فہرستیں قومی اور بین الاقوامی جریدوں میں ان کے مواد کی اشاعت، جریدوں کی ادارت اور ایسے طلبار کی تعداد جنھوں نے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ سفارش کی ایک اور بنیاد یہ ہوسکتی ہے کہ قومی ایجنسیوں اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے پالیسی ریسرچ کے لیے مختلف شعبوں کو کتنے پروجیکٹ دیئے ہیں۔ اگرچہ خود ایسے کام کا تجزیہ کرنے کا طریقہ ایک اچھا قدم ہے تاہم یہ ایک بہت حساس معاملہ ہے اور اس پر عمل درآمد صرف کا غذوں تک ہی محدود رہا ہے۔

وقت آگیا ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ریاستوں تمام یونیورسٹیوں اور تمام مرکزی یونیورسٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لے اور معلوم کرے کہ ملک کی کسی اور یونیورسٹی کے مقابلے میں اس کی کارگزاری کیسی ہے۔ اس ضمن میں طلبار اور اساتذہ کے تناسب، تحقیقی جائزوں کی ساکھ، یونیورسٹی جن موضوعات پر کام کر رہی ہے انھیں اور بیرونی سیاسی عناصر وغیرہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس بات پر زور دیا جانا چاہیئے کہ جتنے زیادہ اخراجات ہوں کارگزاری بھی اتنی ہی زیادہ اور عمدہ ہو۔ جو بھی کارروائی کی جائے پوری احتیاط کے ساتھ کی جائے تاکہ کسی فیصلے سے اس قدر اختلاف پیدا نہ ہوپائے جس سے یونیورسٹی کی مجموعی کارکردگی پر اثر پڑے جب کوئی ایسا فیصلہ کرنا پڑے جس کا اثر بہت سے افراد پر پڑنے والا ہو تو اس بات کی پوری کوشش کرنی

نئی تعلیمی پالیسی میں یونیورسٹی اور صنعتی سیکٹر کے درمیان ایک مناسب رشتہ قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ طلبار صنعتی اداروں میں جاکر تربیت حاصل کرسکیں۔ بدقسمتی سے اس سلسلے میں ابھی زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

چاہیئے کہ اس فیصلے میں زیادہ سے زیادہ ارباب اختیار شریک ہوں۔ اس تعلیمی ادارے کی کارگزاری بہ لحاظ لاگت اور اہلیت کے درمیان زیادہ سے زیادہ فائدہ مند توازن قائم کرنا ممکن ہے لیکن موخرالذکر کا دارومدار بڑی حد تک تحریک عمل، اچھی ساکھ اور یونیورسٹی ملازمین کے بلند حوصلے پر ہوتا ہے۔

گو اس بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے کہ یونیورسٹی کا پڑھانے والا عملہ کیسے اپنے پیشے، ایسے ادارے اور ایسے طلبار کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکتا ہے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ پڑھانے والے عملے کے کام کا تجزیہ کرنے کے ایک ایسے نظام سے جو مناسب اداروں میں پلان کیا گیا ہو، ہمدردی کے ساتھ قائم کیا گیا ہو اور قابل اعتبار ہو، ماہرین تعلیم اور دیگر اشخاص کو اُن کی طاقت اور کمزوریوں کو سمجھنے اور ان کے لیے ان کے رفیقوں کی مدد سے ایسے نصب العین اور ایسے مقاصد طے کرنے میں مدد ملتی ہے جس کی تکمیل میں ان کی طاقت سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے اور ان کی کمزوریوں کو دور کیا جاسکے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تجزیے کے ایک موثر نظام کے ساتھ ساتھ ادارے کی طرف سے عمدہ کام پر انعامات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے۔

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ اکیڈیمک آؤٹ ہونا چاہیئے لیکن اہلیت کا جائزہ کوالٹی کو دھیان میں رکھتے ہوئے لیا جانا چاہیئے مزید یہ کہ یہ

وقت آگیا ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ریاستوں کی تمام یونیورسٹیوں اور تمام مرکزی یونیورسٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لے اور یہ معلوم کرے کہ ملک کی کسی اور یونیورسٹی کے مقابلے میں اس کی کارگزاری کیسی ہے۔

جائزہ کسی ماہر اقتصادیات کے بتائے ہوئے اصول کی روشنی میں ہی نہیں لیا جانا چاہیئے بلکہ سماجی و تعلیمی اہلیت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔

مالیات

یونیورسٹیوں کے لیے رقوم کی فراہمی ایک اور معاملہ ہے جہاں صورتحال مایوس کن ہے۔ سرکاری فنڈ کافی نہیں ہوتے اور جسے "تخلیقی شاہ خرچی" کہا جاتا ہے وہ بھی تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتی اس لیے یونیورسٹیوں کو غیر سرکاری ذرائع سے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کچھ کام یک وقت کرنے ہوں گے۔ انھیں اپنے موجودہ وسائل کا حتیٰ الامکان موثر سے موثر استعمال کرنا ہوگا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اس وقت تک کے مقابلے میں زیادہ بہتر شبیہ پیش کرنی ہوگی تبھی وہ فنڈس میں مزید تخفیف کے خلاف سیاسی دباؤ بڑھوا سکیں گے۔

یونیورسٹی داخلوں کو منضبط کرنے کی چابی فیس کے ڈھانچے کے پاس ہے۔ لیکن فیس کے ڈھانچے کو اس وقت تک یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے جس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے اگر فیس بڑھائی گئی تو ایک سیاسی پارٹی کے مفادات پر خراب اثر پڑے گا۔ یونیورسٹی تعلیم کے لیے بہت بڑی سبسڈی دینے کے موجودہ طریقے پر کچھ وقت سے کسی طرح سے اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے نئی تعلیمی پالیسی میں فیسوں کے ڈھانچے کو تعلیمی اخراجات بالخصوص پیشہ ورانہ تعلیم کے اخراجات کے مطابق بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ یہ امر قابل اطمینان ہے کہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینیجمنٹ کے معاملے میں نظرثانی کی جاچکی ہے اور مینیجمنٹ فیسوں میں اضافے اور مشاورتی خدمات کی فروخت کے ذریعے اپنے مالی وسائل بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ عمل

میڈیکل کالجوں، انجینئرنگ کالجوں اور دوسرے اداروں میں بھی شروع کیا جانا چاہیے۔

ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مالیات کی از خود فراہمی کا طریقہ نکالا جا رہا ہے لیکن غلط فہمیاں اور بیرونی مداخلتیں اس کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔ اگر عمدہ کوالٹی کی تعلیم فراہم کرنے والا کوئی نظام تعلیم ایسے اخراجات کے لیے اپنے آپ مالیات فراہم کرتا ہے تو یہ کوئی بُری بات نہیں ہے یہی تو امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیاں کرتی ہیں۔ لیکن اسے تعلیم کو تجارتی بنالے کی حمایت نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ کوالٹی اور اہلیت

> یونیورسٹی داخلوں کو [illegible] کرنے کے بارے میں شرح کے ڈھانچے کے بارے میں ہے لیکن شرح کے ڈھانچے کو اس وقت تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے جس کی وجہ سے [illegible] علاقوں [illegible] کے مفادات پر خراب اثر پڑے گا۔

کو برقرار رکھنے کے لیے کسی ادارے کی کسی یونیورسٹی سے وابستگی کی شرائط کو پورا کروانے کے لیے یونیورسٹیوں اور حکومت کو مضبوط رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ خود اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے سیلف فائنانسنگ (از خود مالیات کی فراہمی) کے طریقہ کو الزام نہیں دیا جانا چاہیے۔ یہ ایک لغو بات ہے کہ سبھی داخلے ریاستی حکومت کا کوئی ایک متعلقہ محکمہ کرے۔ اس سے تو بدعنوانیوں ہی کا دروازہ کھلے گا اور کرپشن بڑھے گی۔ اس کا علاج اسی میں ہے کہ نظام میں اعتماد بحال کرا کے فضا کو بہتر بنایا جائے اور داخلوں کو منضبط رکھنے کے طریقے کو خوش اسلوبی مگر انتہائی سختی کے ساتھ زیر عمل لایا جائے۔ اگر طلبا اس بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لیں یا کوئی متبادل راستہ اختیار کریں، مدد دینے کے لیے فیسوں کے ڈھانچے کو استعمال نہیں کیا جائے گا تو یونیورسٹیوں کی کمر توڑ توسیع ہوتی رہے گی اور طلبا کی تعداد پر قابو نہیں رکھا جا سکے گا۔ اور اچھا یا برا کوئی طالب علم اس بات پر غور نہیں کرے گا کہ اسے اعلیٰ تعلیم سے فائدہ ہوگا یا نہیں۔ پھر داخلوں کو کیسے منضبط رکھا جائے گا۔؟

لامرکزیت اور شراکتی مینجمنٹ

اب کچھ باتیں یونیورسٹیوں میں لامرکزیت لانے کی ضرورت کے متعلق بھی کہہ دی جائیں ایک یونیورسٹی کا متحرک ماحول کو ایک اہل انتظامیہ کی ضرورت ہے تبھی وہ تمام چنوتیوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ اگر یونیورسٹی کی انتظامیہ سست ہے تو وہ ایک متحرک علمی ماحول کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر پائے گی۔ ترقی اور بقا کے لیے کارکردگی کو زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ لیکن اگر حکومت اور یونیورسٹیاں مرکزیت سے چمٹی رہیں گی تو ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لامرکزیت لانا ضروری ہے خاص کر مالی بندوبست اور حساب کتاب کے معاملے میں۔ قلت اور اقتدار کی سیاست سے پیدا ہونے والے تناؤ اور ٹکراؤ کو لامرکزیت کے ذریعے یا دوسرے لفظوں میں ریاست، یونیورسٹی اور اس کے مختلف شعبوں کو اختیارات اور ذمہ داریاں

> ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مالیات کی از خود فراہمی کا طریقہ نکالا جا رہا ہے۔ لیکن غلط فہمیاں اور بیرونی مداخلتیں اس کی راہ میں حائل ہو رہی ہیں۔

بانٹ کر ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ لامرکزیت لانا بہت ضروری ہے کیونکہ تناؤ اور ٹکراؤ سے جہاں لے عملی اور تاخیر پیدا ہوتی ہے وہاں چیف ایگزیکیٹو، ریسرچ کرنے والوں، ٹیچروں اور طلبا کی سُبکی بھی ہوتی ہے۔ سنیٹ اکیڈیمک کونسل اور ایگزیکیٹو کونسل کو ایک یا دو اداروں میں مدغم کرنے کی تجاویز سے وہ مسائل حل نہیں ہوں گے جن کی وجہ سے یونیورسٹیوں میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ لامرکزیت کا نچوڑ یہ ہے کہ یونیورسٹی کی برادری کے ہر رکن سے عزت سے پیش آیا جائے، اس کا احترام اور اس پر اعتبار کیا جائے یونیورسٹیاں اس وقت جس دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں اس سے انھیں نکلنے کا ایک طریقہ لامرکزیت اور شراکتی مینجمنٹ ہے۔ زیادہ تر توجہ یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریشن پر مرکوز کی جاتی ہے اس بات پر نہیں کہ وہ طلبا کو قومی مسائل کے حل کے لیے کیسی تربیت دے رہی ہیں اور آیا ان کی کارگزاری اصل لاگت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مسائل بھی سامنے آتے ہیں جو مینجمنٹ کی دیانت داری اور طریقہ کار پر اثر انداز ہوتے ہیں کچھ لوگوں کے نزدیک بہترین مشورہ یہ ہے کہ ادارہ جاتی ڈھانچے کو بہتر بنایا جائے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ادارہ جاتی بندوبست کی تنظیم نو کے لیے بال کی کھال نکالنے سے اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہوگا جب تک لیڈرشپ اتنی عمدہ کوالٹی کی نہ ہو کہ وہ یونیورسٹی کی برادری کی سبھی سطحوں سے کثیر طرفی شراکت کے ذریعے اتفاق رائے پیدا کر سکے۔ یونیورسٹی مینجمنٹ سسٹم کو قائم و برقرار رکھنے کی امید صرف اسی طرح بندھ سکتی ہے۔ ہمیں باہمی کشیدگیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی ہوگی، باہمی رابطہ کو بڑھانا ہوگا، تنظیمی قابلیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا، انسانی وسائل کو فروغ دینے پر توجہ دینی ہوگی، ایک سخت ضابطہ اخلاق پر عمل کرنا ہوگا اور اچھی مثال قائم کر کے دوسروں کی تحریک دینے والی لیڈر شپ مہیا کرنی ہوگی۔ ●

> ”تعلیم ہی ایسا وسیلہ ہے جو ایک طالب علم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی کے مسائل کو صحیح طور پر سمجھے اور انھیں حل کر سکے۔“
> مہاتما گاندھی

پروفیسر وی۔ سی۔ کلندائی سوامی اور ٹی۔ آر۔ سری نواسن

"فاصلہ مبنی تعلیم" کے ذریعہ نئے چیلنجوں کا مقابلہ

زیر نظر مصنفین کا کہنا ہے کہ تعلیم آج سماجی و معاشی ترقی کا زینہ بن چکی ہے۔ ایک قوم کو ترقی کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ ہر فرد تعلیم کو اپنا حق سمجھ کر اس کی مانگ کرتا ہے۔ چونکہ تعلیم اب اختیاری چیز نہیں رہی بلکہ موجودہ دور کی ضرورت بن گئی ہے اس لیئے فاصلہ مبنی تعلیم (DISTANCE EDUCTION) نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔"

"فاصلہ مبنی تعلیم" (DISTANCE EDUCATION) اور "کھلی تعلیم" (OPEN LEARNING) اگرچہ مقبول عام اصطلاحات ہیں پھر بھی انھیں سمجھنے کے معاملے میں عام لوگ ہی نہیں علمی ماہرین بھی زبردست غلطی کرتے ہیں۔ اول الذکر اصطلاح ایک مخصوص طریق تعلیم کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ موخرالذکر سے تعلیم کے مواقع میں لچک کا اظہار ہوتا ہے۔ "فاصلہ مبنی تعلیم" ایک ایسا سسٹم ہے جس میں سیکھنے اور سکھانے والے جگہ یا جگہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں جب کہ کھلی تعلیم (OPEN LEARNING) کا سسٹم پڑھائی لکھائی کے دروازے کھولنے کی راہ میں حائل متعدد پابندیوں اور سخت گیر ضابطوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اگرچہ داخلے کی شرائط، تعلیم کی مدت اور مضامین کے انتخاب میں کافی لچک دی جاتی ہے پھر بھی "فاصلہ مبنی تعلیم" کا مطلب آج دنیا بھر میں "فاصلے سے کھلی تعلیم" (DISTANCE OPEN EDUCATION) لیا جا رہا ہے اور ہم اپنی بحث میں "فاصلہ مبنی تعلیم" کو اسی مفہوم میں استعمال کریںگے۔

ارتقاء

بحث کا آغاز کرتے ہوئے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ فاصلہ مبنی تعلیم اب ایک اختیاری معاملہ نہیں بلکہ موجودہ دور کی ایک لازمی ضرورت ہے تعلیم ایک بنیادی عمل ہے جو ماحول کے تقاضوں کے تحت بڑھتا ہے اور "فاصلہ مبنی تعلیم" اس ارتقائی سلسلے کے تیسرے مرحلے کی نمایندگی کرتی ہے۔

باقاعدہ تعلیم کا ابتدائی مرحلہ وہ ہے جسے ہم "گروکل" سسٹم کہتے ہیں یہ سسٹم ایک طویل مدت تک اپنا مقصد اچھی طرح پورا کرتا رہا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ تعلیم کے شعبوں میں تنوع بہت تیزی سے بڑھنے لگا اور معاشی فروغ کے لیے مطلوب تعلیم اور تربیت یافتہ افرادی قوت کی مانگ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ "گروکل" سسٹم ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے کلاس روم سسٹم وجود میں آیا۔ مزید یہ کہ جب ہم بیسویں صدی کے نصف آخر کی طرف بڑھے تو ہمیں ایسے تقاضوں اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا مقابلہ تعلیم کا روایتی سسٹم کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ روایتی طریق تعلیم کی تشکیل ایسے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے نہیں کی گئی تھی۔ تعلیم کی ان ہی مطلوبہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی جد و جہد کے سلسلے میں "فاصلے سے کھلی تعلیم" کا سسٹم وجود میں آیا اور اب یہ اپنے پیش رو نظام کے مقابلے میں زیادہ رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔

فاصلہ مبنی تعلیم کا پھیلاؤ

کچھ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ "فاصلہ مبنی تعلیم" کا آغاز مراسلاتی (CORRESPONDENCE) پروگرام سے ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ "فاصلہ مبنی تعلیم" کا سسٹم اپنے دائرہ عمل اور جہت دونوں کے لحاظ سے مراسلاتی سسٹم سے کہیں بہتر اور وسیع تر ہے اور اس کا ارتقائی رشتہ برطانیہ میں ۱۹۶۹ء میں قائم کی گئی "اوپن یونیورسٹی" (OPEN UNIVERSITY) سے جوڑا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر "فاصلہ مبنی تعلیم" کی تاریخ کم و بیش ایک چوتھائی صدی پرانی ہے۔ اس مختصر سی مدت میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔ "یو کے اوپن یونیورسٹی" کے "انٹرنیشنل سینٹر فار ڈسٹینس لرننگ" (INTERNATIONAL CENTRE FOR DISTANCE LEARNING) نے فاصلہ مبنی تعلیم سے متعلق دنیا بھر کے مختلف ملکوں سے جو اعداد و شمار حاصل کیے ہیں وہ ذیل کے تین گوشوارے میں دیئے گئے ہیں۔ (یہ ماہ جولائی ۱۹۹۳ء تک حاصل شدہ اعداد و شمار ہیں)

> کچھ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ "فاصلہ مبنی تعلیم" کا آغاز مراسلاتی (CORRESPONDENCE) پروگرام سے ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ "فاصلہ مبنی تعلیم" کا سسٹم اپنے دائرہ عمل اور جہت دونوں کے لحاظ سے مراسلاتی سسٹم سے کہیں بہتر اور وسیع تر ہے

گوشوارہ نمبر ۱

خطے، ممالک اور "فاصلہ مبنی تعلیم" کے ادارے

براعظم / بڑے خطے	ملکوں کی تعداد	اداروں کی تعداد
افریقہ	۳۴	۱۰۳
ایشیا	۱۳	۹۰
آسٹریلیا*	۴	۶۰
وسط مشرق	۲	۲
یوروپ	۱۷	۱۷۰
شمالی امریکہ	۲	۱۹۴
کیریبین	۴	۷
لاطینی امریکہ	۱۳	۵۸
میزان کل	۸۹	۶۸۴

* کسرالکاہل جنوبی کے ممالک ــــ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فیجی اور پاپوآ نیوگنی۔

گوشوارہ نمبر ۲

گوشوارہ نمبر ۱ میں ظاہر کردہ اداروں کی طرف سے مختلف میدانوں میں چلائے جا رہے کورسوں کی تعداد

نمبر شمار	پڑھائی کے میدان	کورسوں کی تعداد
۱۔	آرٹس، ہیومنیٹز اور سوشل سائنسز	۷۱۲۲
۲۔	برنس مینجمنٹ، اکنامیز، سروسز	۶۳۲۶
۳۔	تعلیم اور ٹریننگ	۳۶۷۷
۴۔	سائنس (خالص) اور میتھمیٹکس	۲۸۴۲
۵۔	ٹکنالوجی، کمپیوٹر، ماحولیات اور اپلائیڈ سائنسز	۳۴۹۱
۶۔	صحت، سماجی بہبود، دوائیں (میڈیسن)	۲۴۱۸
۷۔	زراعت اور ماہی گیری	۲۴۱۸
۸۔	لاء (قانون) لاء انفورسمنٹ، ریگولیٹری اینڈ اسٹینڈرڈز	۱۰۶۷
۹۔	براڈ ملٹی سبجیکٹ اسٹڈیز، اسٹڈی اسکلز	۸۰۹
۱۰۔	فن تعمیر، سروے، پلاننگ، بلڈنگ	۸۹۵
۱۱۔	پرسنل، ہوم اور فیملی افیئرز	۳۹۳

گوشوارہ نمبر ۳

گوشوارہ نمبر ۱ میں ظاہر کردہ اداروں کی طرف سے چلائے گئے کورسوں کی تعلیمی سطحیں اور اقسام تعلیم

۱۔	پرائمری	۱۳۹۴
۲۔	سیکنڈری	۲۶۱۱

۳۔	مزید تعلیم	۲۵۷۹
۴۔	ڈگری سے قبل	۱۴۸
۵۔	ڈپلوما سرٹیفکٹ	۱۳۳۵
۶۔	ڈگری	۱۰۸۴۶
۷۔	پوسٹ گریجویٹ	۵۴۳۶
۸۔	مسلسل تعلیم	۹۵۵۶
۹۔	ٹریننگ	۵۲۹۲
۱۰۔	کمپیوٹر ایجوکیشن	۱۳۷۹

فاصلہ مبنی تعلیم کیوں؟

ہم نے ان نئے تقاضوں اور نئے چیلنجوں کا حوالہ دیا تھا جنھوں نے "فاصلہ مبنی تعلیم" اور اس کی بطور ایک سسٹم ترقی اور قیام کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر ان محرکات و عوامل

عام اور ہمہ گیر تعلیم بیسویں صدی کی مانگ ہے اور انسانی معاملات اور بنی نوع انسان کی ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے دخل کی وجہ سے بے حد ضروری ہو گئی ہے

کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جائے۔ انھیں حسب ذیل زمروں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سب کے لیے تعلیم
۲۔ تعلیم کے مواقع میں برابری
۳۔ مسلسل تعلیم / زندگی بھر تعلیم

اگرچہ مختلف اور متعدد سماجوں نے تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن ان میں سے بیشتر نے ایک طویل مدت تک اس کے دائرہ عمل کو معدودے چند میدانوں تک محدود رکھا ہے۔ عام اور ہمہ گیر تعلیم بیسویں صدی کی مانگ ہے اور انسانی معاملات اور بنی نوع انسان کی ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے دخل و عمل کی وجہ سے بے حد ضروری ہو گئی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی ایسے اوزار ہیں جن کا استعمال اَن پڑھ عوام نہیں کر سکتے اور معاشی فروغ اب سائنس اور ٹکنالوجی کے اوزاروں کے استعمال کا دوسرا نام ہے۔ تعلیم آج سماجی اور معاشی ترقی کی سیڑھی ہے۔ قوم کو ترقی کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر فرد اسے اپنا حق سمجھ کر اس کی مانگ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے زیادہ آج ہم تعلیم کے مواقع میں برابری کی مانگ زیادہ زور سے اور ہر ملک میں زیادہ شدت سے سن رہے ہیں۔

"معلومات کے عہد" میں، جس میں کہ ہم رہتے ہیں، معلومات عامہ میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس تیز رفتار سے یہ معلومات فرسودہ ہوتی جا رہی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس لیے معیشت کے فروغ و ترقی کی خاطر نئے سرے سے تعلیم اور نئے سرے سے ٹریننگ رسمی تعلیم کی مانند اہم بنتے جا رہے ہیں۔

ہر سطح پر سیٹوں کی تعداد بڑھانے میں واقعی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن سیٹوں کی دستیابی کا مطلب ان تک رسائی نہیں ہے۔ دستیاب مواقع ابھی تک بہت سے لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔

ہندوستانی منظر

ایک صدی سے زیادہ کی مدت گذری سوامی دویکانند نے دو اہم مشاہدات پیش کیے تھے ان میں سے ایک مذمت کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسرا ایک مطالبے کی مانند ہے۔ انھوں نے کہا تھا:-

"قوم کی ترقی کا تناسب اس کے عوام میں تعلیم اور سوجھ بوجھ کے مطابق ہوتا ہے۔ ہندوستان کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں تعلیم اور سوجھ بوجھ مٹھی بھر لوگوں کی اجارہ داری بن کر رہ گئی ہے۔ اگر ہمیں دوبارہ ابھرنا ہے تو ہمیں یہ کام عوام میں تعلیم پھیلانے کے ذریعہ کرنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے ادنیٰ طبقے کی کوئی خدمت کر سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ہم انھیں تعلیم دلائیں تاکہ وہ اپنی انفرادیت کو ترقی دے سکیں۔ اگر کوئی بچہ تعلیم تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تو پھر تعلیم کو اس تک رسائی حاصل کرنی چاہئے۔"

افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ کام ابھی تک بڑے پیمانے پر نہیں کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد سے مسلسل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ ہر سطح پر سیٹوں کی تعداد بڑھانے میں واقعی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن سیٹوں کی دستیابی کا مطلب ان تک رسائی نہیں ہے۔ دستیاب مواقع ابھی تک بہت سے لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اس

سلسلے میں اعلیٰ تعلیم کی مثال ہی لے لیجئے۔ ہمارے یہاں یونیورسٹی کی سطح کے ۲۱۰ ادارے، ۷۷۲۰ کالج اور ۴ء۸ ملین طالب علم ہیں۔ لیکن تعلیم کے تینوں طرح کے سسٹموں میں مطلوبہ عمر گروپ کے طلبا کا تناسب تقریباً چھ فیصد یا زیادہ سے زیادہ ۷ فیصد ہوتا ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں ہی نہیں بلکہ بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں بھی اس کا تناسب کہیں زیادہ ہے (ذیل کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں)

مصر ــــــــ بیس فیصد

> داخلے کی موجودہ سطح پر بھی ہمارے یہاں ایسے ۳ء۲ لاکھ پرائمری اسکول ٹیچر ہیں جو غیر تربیت یافتہ ہیں لیکن کلاس روم میں تعلیم دے رہے ہیں۔ عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایسے تمام ٹیچروں کو محدود تعداد والے ٹریننگ اداروں کے ذریعے ٹریننگ دلائی جائے۔

برازیل ــــــــ گیارہ فیصد

ترکی ــــــــ دس فیصد

تھائی لینڈ ــــــــ بیس فیصد

میکسیکو ــــــــ سولہ فیصد

ہمارے ملک کے ان ۹۴ فیصد لوگوں میں جو کہ اس سسٹم سے باہر رہ گئے ہیں، بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے اندر تعلیم کا شوق ہوگا، جن کے اندر علمی صلاحیت ہوگی لیکن وہ لوگ سماجی، معاشی یا جغرافیائی مجبوریوں کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کے بی ایس سی پروگرام میں داخل طلبا نے ہائر سیکنڈری امتحان میں ۸۸ فیصد کے اوسط سے بھی زیادہ نمبر حاصل کیے۔ فاصلاتی تعلیم کا سسٹم دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کی آرزوؤں کو بروئے کار لاتا ہے۔ ملک میں "فاصلاتی تعلیم" کے سسٹم کے تحت چلائے جا رہے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ ڈگری پروگراموں میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد داخلہ لیتی ہے۔

"سب کے لیے تعلیم" کا مطلب مختلف ملکوں کے نزدیک مختلف ہے۔ بھارت میں اس کا مفہوم ہے پرائمری تعلیم کو ہمہ گیر بنانا۔ داخلے کی موجودہ سطح پر بھی ہمارے یہاں ایسے ۳ء۲ لاکھ پرائمری اسکول ٹیچر ہیں جو غیر تربیت یافتہ ہیں لیکن کلاس روم میں تعلیم دے رہے ہیں۔ عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایسے تمام ٹیچروں کو محدود تعداد والے ٹریننگ اداروں کے ذریعہ ٹریننگ دلائی جائے۔ اسی طرح سروس کرنے والے امیدواروں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ٹیچنگ کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں بی ایڈ پروگراموں کی ضرورت بہت زیادہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ریاستوں میں ٹیچر ٹریننگ کالجوں کا ایک طوفان سا آیا ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر کالج غیر معیاری ہیں۔ ٹریننگ کے پرانے ادارے سروس کرنے والے ٹیچروں کے لیے زیادہ مددگار ثابت نہیں ہو سکتے اس لیے کہ یہ لوگ ان اداروں میں کُل وقتی طالب علم نہیں بن سکتے۔ اگنو کا فاصلاتی تعلیم کا سسٹم ہی بی ایڈ پروگرام فراہم کرنے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے، اگرچہ بعض معاملات میں کوالٹی بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

پیرا میڈیکل سروسوں میں افرادی قوت کی ضرورت بہت زیادہ ہے اور یہ کام بڑی مدت سے نامکمل پڑا ہے۔

> بھارت میں ہمارے سامنے ایک عجیب صورت حال ہے۔ یہاں ایک نرس کے ساتھ تقریباً دو ڈاکٹر ہیں جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر ایک ڈاکٹر کے ساتھ ۵ یا ۶ نرسیں ہوتی ہیں۔ مڈلیار کمیٹی نے ایک ڈاکٹر کے لیے کم از کم تین نرسیں رکھنے کی سفارش کی تھی۔ اس کے لیے نرسوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کی ضرورت ہوگی۔

انسٹی ٹیوٹ آف اپلائیڈ مین پاور ریسرچ (IAMR) کے ایک تجزیے کے مطابق ایلوپیتھک سسٹم میں نرسنگ اسٹاف کی مجموعی تعداد ۱۹۸۶ء میں ۱,۴۸,۰۰۰ تھی (ان میں اوگزیلری نرسنگ مڈوائیوز شامل نہیں ہیں) جب کہ سند یافتہ ڈاکٹروں کی مجموعی تعداد ۲,۷۰,۰۰۰ تھی۔ چنانچہ بھارت میں ہمارے سامنے ایک عجیب صورت حال ہے یہاں ایک نرس کے ساتھ تقریباً دو ڈاکٹر ہیں جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر ایک ڈاکٹر کے ساتھ ۵ یا ۶ نرسیں ہوتی ہیں۔ اب سے بہت پہلے یعنی ۱۹۷۰ء کے دہے میں مُڈلیار کمیٹی نے ایک ڈاکٹر کے لیے کم از کم تین نرسیں رکھنے کی سفارش کی تھی۔ اس کے لیے بھی نرسوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کی ضرورت ہوگی۔ ہم ایک سال میں ۹ ہزار سے زیادہ نرسیں تیار نہیں کرتے لیکن اس سے متذکرہ بالا ڈاکٹر اور نرس کے تناسب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ہم ایک سال میں کم و بیش ۱۷ ہزار ڈاکٹر تیار کرتے ہیں۔ اس لیے لوگوں کو لازمی طور پر فاصلاتی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کا ارادہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۹۹۴ء سے ایک بی ایس سی نرسنگ ڈگری پروگرام شروع کیا جائے۔ امکان ہے کہ "فاصلاتی تعلیم" کا سسٹم آگے چل کر دیگر پیرا میڈیکل پروگرام بھی شروع کرے گا۔

"زندگی بھر تعلیم" اب کوئی پامال فقرہ یا نعرہ نہیں ہے بلکہ معلومات کے اس عہد کی، جس میں انسانیت داخل ہو چکی ہے، ایک ابھرتی ضرورت ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ معلومات میں اضافے کی رفتار اب اتنی تیز ہو گئی ہے کہ نہ صرف اوزار اور طریقِ کار بلکہ ان سے کام لینے والے عورت مرد بھی فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ فرسودہ خیال یا فرسودہ معلومات کے لوگ ایک

پورے سسٹم کے لیے واقعی بوجھ ثابت ہوسکتے ہیں فرسودہ مشینیں صرف اعلیٰ کارکردگی سے محروم ہو جاتی ہیں لیکن فرسودہ معلومات کے لوگ اپنے زیر اثر پورے سسٹم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ معلومات کے تمام میدانوں میں بالعموم اور سائنس اور ٹکنالوجی میں بالخصوص، مسلسل چلنے والے تعلیمی پروگرام ایک لازمی ضرورت بن گئے ہیں۔ ۱۹۹۰ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق بھارت کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ۳٫۸ ملین افرادی قوت تھی۔ اب یہ تعداد زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ان لوگوں کے لیے ۵ سال میں ایک بار جدید ترین معلومات فراہم کرنے کا پروگرام چلایا جائے تو ہمیں ہر سال ۰ ۷۶۰٫ لوگوں کے لیے ایسے پروگرام چلانے ہوں گے۔ ہمارے روایتی سسٹم میں اتنی بڑی تعداد سے نمٹنے کے لیے کوئی ذیلی اہتمام کی سہولیات موجود نہیں ہیں۔ اور نہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ اپنے دفاتر اور گھر بار چھوڑ کر کلاس روم میں طالب علم بن کر آسکتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے نئی معلومات حاصل کرنے کی سہولیات اس طرح فراہم کرنی ہوں گی کہ وہ اپنے گھر پر رہتے ہوئے اور اپنے دفتروں یا روزگار کے مقامات پر کام کرتے ہوئے یہ معلومات حاصل کرسکیں۔ "اوپن" (OPEN) یونیورسٹیوں اور ڈائریکٹوریٹس آف کرسپانڈنس نے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کی سطح پر متعدد پروگرام شروع کیے ہیں۔ لیکن ابھی بہت سے مختصر مدت کے کورس شروع کرنے ہوں

> **فرسودہ خیالات یا فرسودہ معلومات کے لوگ ایک پورے سسٹم کے لیے واقعی بوجھ ثابت ہوسکتے ہیں۔ فرسودہ مشینیں صرف اعلیٰ کارکردگی سے محروم ہو جاتی ہیں لیکن فرسودہ معلومات کے لوگ اپنے زیر اثر پورے سسٹم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔**

گے۔ "فاصلاتی تعلیم" کا سسٹم جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا یہ مختلف شعبوں میں جدید ترین معلومات فراہم کرنے کے پروگرام چلائے گا۔

ٹارگیٹ گروپ

یہاں ٹارگیٹ گروپوں کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے جس سے "فاصلاتی تعلیم" کے سسٹم اور مروج سسٹم میں داخلے کے فرق کا اندازہ ہوسکے گا۔ ہم درج ذیل گروپوں کو مثال کے طور پر لے سکتے ہیں۔

(۱) عمر گروپ
(۲) ملازم لوگ
(۳) دیہی عوام
(۴) خواتین

افسوس ہے کہ اس سلسلے میں تمام اداروں سے اطلاعات حاصل نہیں ہوسکیں ہیں۔ "اوپن" یونیورسٹیوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر مندرجہ ذیل اعداد و شمار ذیل کے گوشوارہ نمبر ۴، ۵ اور ۶ میں پیش کیے جارہے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۴ عمر کے لحاظ سے طلبا کی تقسیم اور فی صد تناسب

یونیورسٹیاں (حوالہ کا سال)	۲۱ سال سے کم	۲۱-۳۰	۳۱-۴۰	۴۱-۵۰	پچاس سے اوپر
آئی جی این او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۹٫۰	۵۸٫۲	۲۲٫۸	۶٫۵	۱٫۵
وائی سی ایم او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۱۲٫۷	۵۴٫۸	۱۷٫۸	۷٫۷	۷٫۰

گوشوارہ نمبر ۵ صنف (مرد عورت) کا تناسب اور روزگار کی کیفیت

یونیورسٹی (حوالہ کا سال)	صنف کا تناسب		روزگار کی کیفیت	
	مرد (فیصد)	عورت (فیصد)	برسر روزگار (فیصد)	بے روزگار (فیصد)
آئی جی این او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۶۴٫۲ ●	۳۲٫۸ ●	۵۲٫۶۷	۴۷٫۳۳
بی آر اے او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۶۷٫۰	۳۳٫۰	۲۸٫۱۸	۷۱٫۸۲
وائی سی ایم او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۷۴٫۵	۲۵٫۵	۵۰٫۶۷	۲۸٫۷۶ ●●

● اس میں مینجمنٹ کورس کے طلبا شامل نہیں ہیں۔
●● ۲۰٫۵۵ فیصد نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۶ طلبار کی تقسیم شہری/ دیہی اور درج فہرست ذات/ قبیلہ/ عام لوگ

یونیورسٹی (حوالہ کا سال)	مجموعی تعداد کا تناسب (فیصد) شہری	دیہی	مجموعی تعداد کا تناسب (فیصد) درج فہرست	قبیلہ	عام لوگ
آئی جی این او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	۷۹٫۱	۲۰٫۹	۵٫۶	۲٫۶	۹۱٫۸
بی آر اے او یو (۹۲-۱۹۹۱ء)	(اعداد وشمار دستیاب نہیں)		۹٫۰	۱٫۰	۹۰٫۰

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تعلیم کے لیے مجموعی بھرتی میں خواتین کا تناسب ۸۹-۱۹۸۸ء میں ۳۱٫۲ فیصد تھا جب کہ اسی سال کے دوران فاصلاتی تعلیم میں ان کا تناسب ۴۲ فیصد تک پہنچ گیا تھا۔

آٹھویں پلان کا ٹارگیٹ

بھارت میں اب "فاصلاتی تعلیم" کے اداروں کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے اگرچہ ان کی جغرافیائی تقسیم زیادہ تر غیر متوازن ہے۔ پرانے طرز کی ۳۵ یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں فاصلاتی تعلیم کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں مندرجہ ذیل "اوپن" یونیورسٹیاں ہیں (ان کا سال قیام بریکٹ میں دیا جا رہا ہے۔

قومی سطح

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (۱۹۸۵ء)

ریاستی سطح

۱۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد، آندھرا پردیش (۱۹۸۲ء)

۲۔ کوٹا اوپن یونیورسٹی، راجستھان (۱۹۸۷ء)

۳۔ نالندہ اوپن یونیورسٹی، بہار (۱۹۸۷ء)

۴۔ یشونت راؤ چوان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی (۱۹۸۹ء)

۵۔ بھوج اوپن یونیورسٹی، مدھیہ پردیش (۱۹۹۲ء)

ریاستی یونیورسٹیوں میں سے نالندہ اور بھوج اوپن یونیورسٹیوں نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم سے متعلق تشکیل کردہ ورکنگ گروپ نے اندازہ لگایا تھا کہ آٹھویں پلان کے دوران (جس کی مدت ابتدا میں ۹۵-۱۹۹۰ء رکھی گئی تھی) اعلیٰ تعلیم کے لیے بھرتی میں دس لاکھ طلبار/طالبات کا اضافہ ہوگا۔ اس نے مشورہ دیا تھا کہ اس تعداد کا ۵۰ فیصد "فاصلاتی تعلیم" کے سسٹم میں بھرتی کیا جائے۔ "پروگرام آف ایکشن" کے لیے قائم شدہ ٹاسک فورس نے مقررہ ٹارگیٹ کا جائزہ لیا اور سفارش کی کہ آٹھویں پلان کی ترمیم شدہ مدت (۹۷-۱۹۹۲ء) کے دوران "فاصلاتی تعلیم" مذکورہ بالا زائد بھرتی کے چالیس فیصد یعنی ۴ لاکھ طلبار کو اپنے یہاں جگہ دے سکتی ہے۔ اس طرح بھرتی کی مجموعی تعداد میں "فاصلاتی تعلیم" کا حصہ ۱۹۹۲ء کے ۱۱٫۵ فیصد سے بڑھ کر آٹھویں پلان کے اختتام تک ۱۶٫۵ فیصد ہو جائے گا۔ یہ تعداد ٹارگیٹ گروپوں کے لیے پیش کیے جانے والے بہت سے پروگراموں اور روزگار پر مبنی کورسوں میں شرکت کرنے والے طلبار کے علاوہ ہوگی۔ ان طلبار کی تعداد بھی اس میں شامل نہیں ہوگی جو ہائر سیکنڈری سسٹم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینا چاہتے ہیں۔

> جب کہ دیگر تمام میدانہائے عمل میں دستکاری کو ٹکنالوجی میں بدلنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے طریق کار اور آلہ جات کا استعمال کیا جاتا ہے، روایتی تعلیم کے میدان میں گذشتہ ایک سو برس یا اس سے بھی زیادہ کی مدت میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی ہے۔ تعلیم آج بھی دستکاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخراجات کی اثر خیزی

روایتی سسٹم کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں لچک کی کمی ہے اور شاید اسی وجہ سے یہ ضرورت کے مطابق فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ جب کہ دیگر تمام میدانہائے عمل کو دستکاری کو ٹکنالوجی میں بدلنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے طریق کار اور آلہ جات کا استعمال کیا جاتا ہے، روایتی تعلیم کے میدان میں گذشتہ ایک سو برس یا اس سے بھی زیادہ کی مدت میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی ہے۔ تعلیم آج بھی دستکاری کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہرحال "فاصلاتی تعلیم"، ٹکنالوجی کو استعمال میں لاتی ہے۔ یہ زیادہ نفع بخش ہے اور اس طرح اس کے اخراجات اثر خیز ہوتے ہیں۔ درج ذیل اعداد وشمار اس بات کی تصدیق کریں گے۔

اخراجات کی اثر خیزی کا اندازہ روایتی سسٹم کے ساتھ موازنہ اور مساوی نوعیت کے پروگراموں کے تقابلی مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ بیچلر کی ڈگری کے پروگرام سے یہ موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ روایتی سسٹم کے تحت اس ڈگری کے مصارف مختلف اداروں میں الگ الگ ہیں۔ گوشوارہ نمبر ۷ میں چھ ریاستوں کے ۷۰ کالجوں سے موصولہ ۹۰-۱۹۸۹ء کے اعداد وشمار کا ایک جائزہ اخراجات کے لحاظ سے پیش کیا جا رہا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۔ آرٹس/سائنس/کامرس میں بیچلر ڈگری پروگرام چلانے والے کالجوں کے ۱۹۸۹-۹۰ء کے اخراجات
(فی نفر خرچ روپیوں میں)

نمبر شمار	ریاست	کالجوں کی تعداد	طلبار کی تعداد	خرچ فی طالب علم
۱۔	جموں وکشمیر	۱۶	۱۲۹۷۶	۴۲۳۵
۲۔	مدھیہ پردیش	۱۲	۱۶۲۴۲	۲۴۶۲
۳۔	اڑیسہ	۷	۹۴۹۵	۴۴۲۴
۴۔	گوا	۵	۳۷۰۹	۲۳۰۷
۵۔	پانڈیچری	۵	۳۳۹۴	۸۲۰۶
۶۔	تمل ناڈو	۳۴	۲۹۵۴۲	۴۷۱۸
	اوسط (تمام ریاستیں)	—	۷۵۳۷۸	۴۱۴۱

چونکہ دستیاب اعداد و شمار صرف ۱۹۸۹-۹۰ء کے بارے میں تھے اس لیے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی بیچلر ڈگری کے اخراجات کے ساتھ موازنہ کی خاطر ہر ایک یونٹ کے ۱۹۸۹-۹۰ء کے اخراجات کو قیمتوں کی موجودہ شرح کے ساتھ ملایا گیا تاکہ ۱۹۹۰-۹۱ء اور ۱۹۹۱-۹۲ء کے سالانہ اخراجات کا اندازہ کیا جا سکے۔ یہ پورا لیسٹ گوشوارہ نمبر میں پیش کی جا رہی ہے۔

گوشوارہ نمبر: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور منتخب کالجوں کے بیچلر ڈگری پروگرام کے اخراجات کا موازنہ

(اخراجات فی نفر روپئے میں)

سال	اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے اخراجات	منتخب کالج	منتخب کالجوں کے مقابلے میں آئی جی این او یو کے اخراجات کا فیصد تناسب
۱۹۸۹-۹۰ء	۱۸۴۲	۴۱۴۱	۴۴٫۴۸
۱۹۹۰-۹۱ء	۱۶۴۴	۴۷۶۲	۳۴٫۵۲
۱۹۹۱-۹۲ء	۱۹۹۷	۵۴۷۶	۳۶٫۴۷

یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے بیچلر ڈگری کے اخراجات روایتی سسٹم والے کالجوں کے اخراجات کے مقابلے میں ۳۴٫۵ فیصد اور ۴۴٫۵ فیصد کے درمیان رہے ہیں۔ لیکن اسے کلیہ نہیں بنایا جا سکتا اس لیے کہ یہ سب کچھ طلبار کی تعداد، پروگرام کی نوعیت اور طلبار کو فراہم کردہ سروس پر منحصر ہے۔ جہاں تک مندرجہ بالا موازنہ کا تعلق ہے، یہ بات فرض کرنی ہوگی کہ ان تمام یونٹوں میں کوالٹی ایک جیسی ہے۔

نتیجہ

ملک میں فاصلاتی تعلیم کے سسٹم سے متعلق مختصر طور پر درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ بھارت میں اس وقت ایک نیشنل اوپن یونیورسٹی، ۵ ریاستی اوپن یونیورسٹیاں اور ۴۵ سے زیادہ عام یونیورسٹیاں ہیں جہاں فاصلاتی تعلیم کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔

۲۔ سی اے بی ای نے سفارش کی ہے کہ ہر ایک ریاست میں ایک اوپن یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس بات کا امکان ہے کہ بہت سی بڑی ریاستیں ایک ایک اوپن یونیورسٹی قائم کریں گی۔

۳۔ فاصلاتی تعلیم کے پروگرام ناسازگار حالات کے مارے طلبار کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک مسلسل تعلیم کی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں۔

باقی صفحہ ۱۳ پر

کے۔جی۔جوگلیکر

پنچایتی راج اور تعلیم کا انتظامیہ

زیر نظر مضمون کے مصنف کہتے ہیں کہ تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال کے بعض میدان ایسے ہیں جہاں سرکاری ایجنسیوں کے مقابلے میں پنچایتی راج کے یونٹ زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ تعلیم پھیلانے کی ذمہ داری پنچایتوں کے سپرد کر دینا مروجہ تصورات سے زبردست انحراف ہوگا۔ فاضل مصنف کی رائے ہے کہ اس مقصد میں کامیابی کے لیے پنچایتی کمیٹیوں اور ریاستی سرکاروں کے درمیان صحیح معنوں میں تال میل ہونا چاہیے۔

یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو سب ہی سیاسی جماعتیں اور سیاسی رہنما انتظامیہ کو غیر مرکزی بنانے پر زور دیتے ہیں لیکن دوسری طرف یہی لوگ اپنے اس موقف کو عملی شکل دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاسی لیڈر اور سرکاری افسر دونوں ہی اپنے اپنے اقتدار میں کمی لانے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس ہچکچاہٹ کے لیے یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے مقامی سطح پر اقتدار کا غلط استعمال ہو سکتا ہے۔ مقامی انتظامی اداروں (LOCAL SELF GOVERNMENT BODIES) کو اقتدار سونپنے میں یہ ہچکچاہٹ دراصل برٹش راج کی میراث ہے۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اگر تعلیم، صحت، صفائی، آب پاشی یا زراعت سے متعلق پلاننگ اور ویلفیئر اسکیموں کو کامیاب بنانا ہے تو اس کی ابتدا بالکل نیچے کی سطح سے ہونی چاہیے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور با اثر طبقہ اپنا اقتدار چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب تک ہوئے متعدد عام انتخابات میں دیہات کے ووٹروں نے جن کی اکثریت اَن پڑھ ہے جس سوجھ بوجھ اور سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا ہے اس نے اس خوف کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے کہ دیہات کے عوام اپنے معاملات کو سنبھالنے کی لیاقت نہیں رکھتے۔ پھر بھی اس بات سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا گیا ہے۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے اور صحیح بھی ہے کہ بھارت اپنے دیہات میں بستا ہے۔ اس لیے دیہات کو تمام ترقیاتی اسکیموں کا نقطۂ آغاز ہونا چاہیے۔ قدیم ہندوستان میں دیہی پنچایتوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا تھا جو دیہات سے متعلق تمام معاملات یہاں تک کہ عدل و انصاف کے لیے بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ دیہی آبادی زیادہ تر خود کفیل ہوتی تھی اور اسے بڑی حد تک مقامی سطح پر خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ ملک بھر کو مربوط رکھنے والا یہ وسیع سلسلہ بھارت کے عوام کو بیرونی ملکوں کے مسلسل حملوں کا سامنا کرنے میں مدد دیتا تھا۔ بیرونی جارحیت کے نتیجے میں ہوئی سیاسی تبدیلیوں کا اثر دیہات پر بہت کم ہوتا تھا۔ دیہی آبادی بیرونی حملے کے صدمے اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے انتشار کو برداشت کر لیتی تھی اور نئے سرے سے تعمیر میں لگ جاتی تھی۔

برٹش راج نے دیہی پنچایتوں کے نظام کو تباہ کن دھکا پہنچایا۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے قیام، مالیات اور پولیس ایڈمنسٹریشن کی تشکیل، ریلویز اور مواصلاتی نیٹ ورک کی تعمیر اور افراد کی جداگانہ حیثیت کے تصور کی ترقی نے پنچایتوں کو فرسودہ تنظیمیں بنا دیا۔ برطانوی حکمراں بھارت کی انفرادی حیثیت کو ختم کر کے اسے انگلینڈ کی فیکٹریو[ں] کے لیے خام مال فراہم کرنے والے علاقے میں تبدی[ل] کر دینا چاہتے تھے۔ چھوٹے پیمانے کی اور دیہی صنعت[یں] جو دیہات کے عوام کو نفع بخش روزگار فراہم کرت[ی] تھیں، آہستہ آہستہ برباد ہوتی چلی گئیں۔ یہ صنعتیں ویسے بھی انگلینڈ کی فیکٹریوں میں تیار شدہ ساما[ن] کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ بیکاری بڑھنے لگی اس لیے کہ زمینی پیداوار پر دباؤ بڑھ گیا تھا اور کھیتی باڑی کے علاوہ دیہات میں روزگار کا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں بچا تھا۔

مدتوں پہلے یعنی ۱۹۰۷ء میں غیر مرکزیت [سے] متعلق ایک رائل کمیشن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ بھارت میں گاؤں ہی سرکاری ایڈمنسٹریشن کا ایک بنیادی یونٹ ہے۔ اس لیے کمیشن نے سفارش کی کہ پنچایتوں کی کھوئی ہوئی خود مختاری بحال کی جائے۔ لیکن برطانوی افسروں کے اپنے اپنے حد شمار تھے جنھوں نے کمیشن کی سفارشات کی روح یہ کہہ کر پیش کر کے نکال لی کہ پنچایتوں کو ضلع ایڈمنسٹریشن کے مکمل کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ برٹش بیوروکریسی اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھی کہ پنچایتوں کا کنٹرول رجسٹرار آف کوآپریٹو سوسائٹیز کے سپرد

کردیا جائے۔

لوکل باڈیز کو اقتدار کی منتقلی میں برطانوی حکومت کی ہچکچاہٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں دئے گئے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا "ایک ننھے بچے کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے خود چلنا پھرنا سیکھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور جب وہ چلنا سیکھنے میں کامیاب نہ ہو تو اسے بچے کو الزام دیا جائے۔ آزاد بچہ ٹھوکر کھا کھا کر اپنا توازن قائم کرنا سیکھ لے گا لیکن سدھا ہوا بچہ مفلوج ہو جائے گا اور کبھی نہیں چل سکے گا۔"

> — برٹش راج نے دیہی پنچایتوں کے نظام کو تباہ کن دھکا پہنچایا۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے قیام، مالیات اور پولیس ایڈمنسٹریشن کی تشکیل، ریلویز اور مواصلاتی نیٹ ورک کی تعمیر اور افراد کی جداگانہ حیثیت کے تصور کی ترقی نے پنچایتوں کو فرسودہ تنظیمیں بنا دیا۔

برٹش سرکار کا اندیشہ درست تھا کہ اگر لوکل باڈیز کو زیادہ اختیارات دئے گئے تو اس کا نتیجہ اعلیٰ سطح پر زیادہ اختیارات کے مطالبے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ جب مہاتما گاندھی نے ہر گاؤں کو ایک ایسی ری پبلک بنانے پر زور دیا جہاں کوئی ان پڑھ نہ ہو، کوئی بے روزگار نہ ہو، ہر شخص کو ضرورت کے مطابق کھانا اور کپڑا ملے تو اس بات نے انگریز حکمرانوں کا یہ شبہ اور بڑھا دیا کہ غیر مرکزیت کا عمل برٹش راج کے لیے خطرہ پیدا کر دے گا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ پنچایتی راج یونٹوں کی اپنی جمہوری بنیاد ہو، انھیں ضرورت کے مطابق اختیارات حاصل ہوں اور انھیں صحیح معنوں میں سوراج کا مزہ ملے۔

بابائے قوم کی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ بھارت کے آئین کی دفعہ ۴۰ (جو کہ آئین میں شامل رہنما اصولوں کا ایک حصہ ہے) میں کہا گیا ہے کہ "بھارت سرکار دیہی پنچایتوں کی تنظیم کے لیے قدم اٹھائے گی اور انھیں وہ اختیارات دے گی جن کی انھیں سیلف گورنمنٹ کے یونٹوں کے طور پر کام کرنے کے لیے ضرورت ہوگی۔" ۱۹۵۲ء میں جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام شروع کیا گیا تھا وہ سماجی اور معاشی پروگرام کو غیر مرکزی بنانے کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ دیہات کے عوام ترقیاتی پروگراموں کی ذمہ داری لیں اور انھیں حکومت کی مدد سے چلائیں۔ لیکن غیر مرکزی منصوبہ بندی کی سمت میں اٹھایا گیا پہلا قدم افسر شاہی کے کنٹرول کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ عوام کو تحریک عمل دینے اور انھیں اپنی ہی فلاح کے پروگراموں میں شرکت پر آمادہ کرنے سے متعلق جو بلونت رائے مہتا کمیٹی قائم کی گئی تھی اس نے سفارش کی کہ جمہوری طرز پر غیر مرکزیت لانے کی غرض سے گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر تین مرحلے والی اور باہم مربوط تنظیمیں قائم کی جائیں۔

ریاستی قانون ساز اسمبلیوں کے پاس کردہ پنچایتی راج ایکٹوں کے تحت ریاستی حکومتوں کی طرف سے اس معاملے سے متعلق کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ لیکن جلدی ہی پنچایتوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ضلعی سطح کی سیلف گورنمنٹ باڈیز میں سیاسی لیڈروں اور سرکاری افسروں کے غلبے نے بلاک اور گاؤں کی سطح کی پنچایت تنظیموں سے اپنے طور پر ترقیاتی کام

> مدتوں پہلے، یعنی ۱۹۰۷ء میں غیر مرکزیت سے متعلق ایک رائل کمیشن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ بھارت میں گاؤں ہی سرکاری ایڈمنسٹریشن کا ایک بنیادی یونٹ ہے۔ اسی لیے کمیشن نے سفارش کی کہ پنچایتوں کی کھوئی ہوئی خود مختاری بحال کی جائے۔

شروع کرنے کا اختیار چھین لیا۔ یہاں تک کہ پنچایتی راج کی تنظیموں کے انتخابات بھی ملتوی ہو گئے۔

آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترمیم گاؤں، بلاک اور ضلعی سطح کی پنچایتوں اور میونسپلٹیوں کو زیادہ اختیارات اور وسائل فراہم کرنے کی غرض سے کی گئی تاکہ وہ معاشی ترقی اور سماجی انصاف کے لیے اسکیمیں تیار کر سکیں اور انھیں بروئے کار لا سکیں۔ نیچے کی سطح پر ہونے والی سرگرمی سے متعلق فیصلہ کرنے کی ذمہ داری اب عوام کے منتخب نمائندوں پر ہے۔ ان تنظیموں کے لیے باضابطہ اور باقاعدہ انتخابات ہونے سے انھیں جمہوری سسٹم میں اپنا اپنا صحیح مقام ملے گا اور انھیں ملک کے ترقیاتی عمل کا ایک بنیادی حصہ بنا دے گا۔

یہ بات عام طور پر نظر انداز کی جاتی رہی ہے کہ تعلیم نہ صرف ایک ذریعہ ہے بلکہ ترقیاتی سرگرمی کا ایک لازمی حصہ بھی ہے۔ اگرچہ ملکی آبادی میں بے تحاشا اضافے نے معیشت کے میدان میں حاصل شدہ ترقی کو الٹ کر رکھ دیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زراعت اور صنعت کے میدان میں ہم نے زبردست ترقی کی ہے اور صحت عامہ سے متعلق سروسوں میں بہتری آئی ہے لیکن صحیح تعلیم کی کمی کے سبب دولت نفع بخش میدانوں میں خرچ نہیں ہو رہی ہے اور غیر ضروری مصارف پر برباد کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ تعلیم کو پنچایتی راج سے مربوط کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ قدیم ہندوستان میں تعلیم حکومت کے کنٹرول سے بالکل آزاد تھی یہاں تک کہ شہزادوں کو بھی "گروکل" میں جانا پڑتا تھا۔ یہ سسٹم برطانوی راج تک جاری رہا۔ برٹش عہد میں تعلیم کا ایک بالکل نیا سسٹم نافذ کیا گیا۔ نیا سسٹم حکومت پر مرکوز تھا۔ حکومت نصاب کا فیصلہ کرتی تھی اور امتحانات کے قواعد و ضوابط تیار کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "پاٹھ شالاؤں"، "گروکل" اور مکتبوں کے مدبم رہے زوال آمادہ ہو گئے اس لیے کہ وہاں تعلیم پانے والے طلبا کے سامنے روزگار کے مواقع بہت کم ہوتے تھے۔

گھڑی کی سوئیوں کو الٹا نہیں گھمایا جا سکتا

پاٹھ شالا: مکتبوں کے عہد میں واپس

نہیں جا سکتے۔ جدید طریق تعلیم کو دو بنیادی اسباب کی بنا پر باقی رہنا ہے۔ اوّلاً یہ کہ نصاب کی درجہ بندی اور معیار لازمی امور ہیں۔ دوسری بات ہے سائنس اور ٹکنالوجی کی معلومات جو نئے زمانے میں آگے بڑھنے کے لیے بہت ضروری ہے اور یہ کامیابی ہم قدیم نظام

> جب مہاتما گاندھی نے ہر گاؤں کو ایک ایسی ری پبلک بنانے پر زور دیا جہاں کوئی اَن پڑھ نہ ہو، کوئی بے روزگار نہ ہو، ہر شخص کو ضرورت کے مطابق کھانا اور کپڑا ملے تو اس بات نے انگریز حکمرانوں کا یہ شبہ اور بڑھا دیا کہ غیر مرکزیت کا عمل برٹش راج کے لیے خطرہ پیدا کر دے گا۔

تعلیم کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ بہرایں ہمہ یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ عوام الناس اور جدید نظام تعلیم کے درمیان ایک دوری ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سفید پوشی والا روزگار حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال گریجویشن کرنے والے ہزارہا افراد کے لئے بیکاری میں اضافہ ہو رہا ہے اس لیے کہ ہر شخص سفید پوشی والی ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس قسم کی ملازمتیں ان کی ضرورت کے مطابق موجود نہیں ہیں۔

موئلی کمیٹی کی رپورٹ

اس لیے تعلیم کو پنچایتی راج سے مربوط کرنے کا مسئلہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ تعلیم کا کام چلانے کے اختیارات پنچایتی راج اداروں کو دیئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم کا معیار برقرار رہتا ہے یا نہیں۔ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے تعلیم کے اہتمام کو غیر مرکزی بنانے کے سوال سے متعلق ایک کمیٹی شری ویراپا موئلی، وزیر اعلیٰ کرناٹک کی سربراہی میں قائم کی تھی۔ اس کمیٹی نے تعلیم کو غیر مرکزی بنانے کے سوال پر چند رہنما خطوط تیار کئے ہیں۔ اس نے سفارش کی ہے کہ جہاں پنچایت صرف ایک گاؤں پر مشتمل ہے وہاں تعلیم سے متعلق ایک اسٹینڈنگ کمیٹی قائم کی جائے اور اسے پنچایت راج قانون کے تحت لاکر فیصلہ اور عمل کے اختیارات دئے جائیں۔ لیکن جہاں ایک

> آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترمیم گاؤں، بلاک اور ضلعی سطح کی پنچایتوں اور میونسپلٹیوں کو زیادہ اختیارات اور وسائل فراہم کرنے کی غرض سے کی گئی تاکہ وہ معاشی ترقی اور سماجی انصاف کے لیے اسکیمیں تیار کر سکیں اور انہیں بروئے کار لا سکیں۔

پنچایت کے تحت ایک سے زیادہ گاؤں ہوں وہاں اس پنچایت کے تحت تعلیمی کمیٹیاں اس طرح قائم کی جائیں کہ ہر گاؤں کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی ہو۔

> قدیم ہندوستان میں تعلیم حکومت کے کنٹرول سے بالکل آزاد تھی۔ یہاں تک کہ شہزادوں کو بھی ”گروکل“ میں جانا پڑتا تھا۔ یہ سسٹم برطانوی راج تک جاری رہا۔ برٹش عہد میں تعلیم کا ایک بالکل نیا سسٹم نافذ کیا گیا۔

اسی طرح ضلع کی سطح پر تعلیم سے متعلق ضلع پریشد اسٹینڈنگ کمیٹی قائم کی جائے۔ پنچایتی سطح کی کمیٹیوں کے ذمہ اہم کام ہوں گے، تعلیم بالغاں، ننھے بچوں کی صحت اور تعلیم اور غیر رسمی اور پرائمری تعلیم کی نگرانی۔ اس کے علاوہ یہ کمیٹیاں مخلوط ”اپر پرائمری اسکولوں کی نگرانی بھی کریں گی“ دیہی کمیونٹی میں تعلیم سے متعلق عام بیداری پیدا کرنے، اسکولوں میں بچوں کے داخلے کے لیے تحریک چلانے اور والدین کو بچوں کے داخلے کی ترغیب دینے، اسکولی تعلیم درمیان میں ہی چھوڑنے والے بچوں کی تعداد گھٹانے، تعلیم، صحت اور بہبود کے پروگراموں کے لیے ٹیچروں اور دیگر لوگوں کی مدد لینے کے کام بھی کریں گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ مالی وسائل فراہم کرنے، اسکولوں میں پینے کا پانی مہیا کرنے، پیشاب خانے بنانے کھیل کے میدان تیار کرنے وغیرہ جیسی سہولیات کا اہتمام بھی کریں گی۔ اس طرح یہ کمیٹیاں ترقیاتی پروگراموں میں عملی طور پر شرکت کریں گی۔

گاؤں اور ضلع کمیٹیوں کو اپنی اپنی سطح پر اس طرح کے کام کرنے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے ممبروں کی کم از کم ایک تہائی تعداد خواتین پر مشتمل ہوگی۔ ان کے علاوہ درج فہرست ذاتوں، قبیلوں پسماندہ طبقوں اور اقلیتوں کو بھی نمائندگی حاصل ہوگی۔ موئلی کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ریاستی حکومتوں کی طرف سے فنڈ دیئے جانے کے علاوہ ضلع پریشدوں اور پنچایت سمیتیوں کو یہ اختیار ملنا چاہئے کہ وہ زمین کے لگان، سیل ٹیکس، بلڈنگ ٹیکس، پروفیشنل وغیرہ پر سرچارج لگا کر اور مختلف اسکیموں کے لیے چندہ جمع کر کے اور طلبا اور طالبات کے والدین سے چندہ لے کر تعلیمی سرگرمیوں کے مصارف پورے کریں۔

پنچایت کمیٹیوں کو ایسی ذمہ داریاں سونپنا کچھ عجیب سا لگے گا لیکن یہ کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ جیسا کہ ۱۹۰۷ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے قائم کردہ رائل کمیشن برائے غیر مرکزیت نے سفارش کی تھی کہ پنچایتوں کو اسکولوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی جائے

اوراسکولوں کے انتظامات میں انھیں بھی شریک کیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا کہ گاؤں پنچایت کی پہلی ذمہ داری لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہونی چاہیئے۔

تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال کے بعض میدان ایسے ہیں جہاں پنچایتیں سرکاری ایجنسیوں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم، جس سے اولین پنج سالہ پلان تعلیم کے شعبے کی اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ پنچایتوں کو سپردگی تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال کے میدانوں کے مسلمہ تصورات میں ایک زبردست انقلابی تبدیلی کے مترادف ہے۔ اس سلسلے کی بہت سی مفید اسکیمیں کوتاہی عمل کے سبب ناکام ہوچکی ہیں۔ یہ توقع ضرورت سے زیادہ ہے کہ پنچایت کمیٹیاں ایک دو دن کے اندر ہی موثر طور پر کام کرنے لگیں گی۔ اس میں کافی وقت لگے گا۔ اس کے

> **پنچایت کمیٹیوں کو ایسی ذمہ داریاں سونپنا کچھ عجیب سا لگے گا لیکن یہ کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ رائل کمیشن برائے غیر مرکزیت نے سفارش کی تھی کہ پنچایتوں کو اسکولوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی جائے اور اسکولوں کے انتظامات میں انھیں بھی شریک کیا جائے۔**

کے بعد سے غفلت برتی جارہی تھی، ۱۹۸۶ء میں تعلیم سے متعلق قومی پالیسی کی قرارداد پاس ہونے کے بعد سے زیادہ توجہ پانے لگی ہے۔ اگر "سب کے لیے تعلیم" کے نصب العین کو موجودہ صدی کے اختتام تک حاصل کرنا ہے تو زیادہ بجٹ فراہم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ امید کی جاسکتی ہے کہ فنڈ کا ایک بڑا حصہ دیہات میں خرچ ہوگا اور اس لحاظ سے مختلف سطحوں پر پنچایت کمیٹیوں کا کام زیادہ اہم ثابت ہوگا۔ ان کمیٹیوں کو دیہات کی ان لڑکیوں پر خاص توجہ صرف کرنی ہوگی جو اپنی پڑھائی درمیان میں ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے تناسب میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں ان کا تناسب پرائمری سطح پر ۶۲٫۵ فیصد تھا۔ یہ ۸۹-۱۹۸۸ء تک گھٹ کر ۴۹٫۷ فیصد رہ گیا۔ لیکن تناسب اب بھی زیادہ ہے اس لیے کہ بہت سے والدین لڑکیوں کو تعلیم دلانا بے کار سمجھتے ہیں۔ دیہات میں دس فیصد لڑکیاں اس لیے تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں کہ ان کے والدین ان کی پڑھائی کے مقابلے میں ان سے گھروں یا کھیتوں میں کام کرانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مقامی پنچایتوں کے ممبروں (جن کا سب لوگ احترام کرتے ہیں) کے علاوہ اور کون شخص ایسے والدین کو سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ترغیب دے سکتا ہے۔

لیے کمیٹیوں کے درمیان صحیح تال میل اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ کسی بھی اسکیم کی قطعی کامیابی کے لیے احتیاط کے ساتھ ساتھ اعتماد و یقین کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ●

بقیہ: سب کے لیے تعلیم چوٹی کانفرنس کا دہلی اعلانیہ

کردار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم عہد کرتے ہیں کہ اس صدی کے آخر یا اس سے جتنا جلد ممکن ہوسکے

۳.۱ : ہر بچے کو اسکول کی سہولت بہم پہنچائیں گے یا اس کی صلاحیت کے مطابق مناسب تعلیمی پروگرام فراہم کریں گے تاکہ استادوں، متعلقہ ضروری ساز و سامان یا مناسب جگہ کی کمی کی وجہ سے کوئی بھی بچہ اس سے محروم نہ رہے۔ اس عہد سے بچوں کے حقوق سے متعلق کنونشن میں کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔

۳.۲ : سب کے لیے بنیادی تعلیم کی مشترکہ حکمت عملی کے تحت خواندگی اور تعلیم بالغان کے پروگراموں کی بہتری اور ان کے فروغ کے لیے سرکاری و نجی ذرائع کی طرف سے کی جانے والی نوجوانوں اور بالغوں کے لیے بنیادی تعلیم فراہم کرنے کی کوششوں میں تیزی لائیں گے۔

۳.۲ ہم، بنیادی تعلیم کے حصول میں، جنس، عمر، آمدنی، خاندان، ثقافتی، قومی اور لسانی اختلاف یا جغرافیائی پسماندگی کی وجہ سے پیدا شدہ امتیاز کو ختم کریں گے۔

۳۴. ہم درسی مواد اور تدریس کے لیے ضروری ساز و سامان کی بہتری اور تعلیمی نظام میں دوسری ضروری اصلاحات کی خاطر اساتذہ کا وقار، ان کی تربیت اور ان کے کام کرنے کے حالات میں سدھار کے لیے اپنی کوششوں میں تیزی لاکر بنیادی تعلیم کے معیار اور اس کی افادیت میں اضافہ کریں گے۔

۳.۵ : ہم اپنے اعمال سے قومی و دیگر سطحوں پر انسانی ترقی کو اولین ترجیح دیں گے اور اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ قوم اور فرقے کے ذرائع کا زیادہ حصہ بنیادی تعلیم اور موجودہ تعلیمی ذرائع کے مینجمنٹ پر صرف ہو۔

۳۶ : اس اعلانیہ میں طے شدہ دائرہ عمل کی حمایت میں کیے گئے کام کا قومی سطح پر جائزہ لینے کے لیے اور عالمی برادری کے ساتھ اپنے تجربات کے تبادلے کے لیے ہم سماج کے تمام طبقوں کو متحرک کریں گے تاکہ سب کے لیے تعلیم کا نصب العین پورا ہو۔

۴. ہماری گذارش ہے کہ

۴۱ : اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح کے معاونین بنیادی تعلیمی خدمات کی بہتری اور فروغ کے لیے درکار ہماری کوششوں کی حمایت میں خاطر خواہ اضافہ کریں گے۔

۴۲. بین الاقوامی مالیاتی ادارے، اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کے تحت، خواندگی کو سرمایہ کاری تصور کریں جس میں کسی آخری حد کی قید نہ ہو اور ایک ایسے ماحول کو فروغ دیں جس میں سب ممالک اپنی سماجی و اقتصادی ترقی کو برقرار رکھ سکیں۔

۴۳ : "سب کے لیے تعلیم" کے نصب العین کو اس صدی کے آخر یا اس سے قبل جتنی جلد ممکن ہو حاصل کرنے میں بین الاقوامی برادری ہمارا ساتھ دے اور اس ضمن میں اپنی کوشش تیز کرے۔ ●

آر۔ سی۔ ترپاٹھی

بامقصد تعلیم کی منصوبہ سازی

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ تعلیم کو بامقصد بنانے کی غرض سے تدریسی اور تعلیم دینے والی برادری کو سماجی مقاصد کے تصور کے قریب لانا لازمی ہے۔ جب تک اس کا مقصد اخلاقی نظام میں ہاتھ بٹانا نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے بچوں کا ایک درخشاں مستقبل یقینی بنانے کے لیے نظریات اور اقدار کو میکانیکی ہدایات کے ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

اب جب کہ صدی بدلنے والی ہے یہ نہایت موزوں موقع ہے کہ ہم اس قوم کے ماضی پر نگاہ ڈالیں اور مستقبل پر غور کریں جس کے پاس قریب ۵ سال کی تاریخ اور ثقافت ہے۔ ہمارے ملک نے عروج و زوال خوشحالی اور بدحالی، نوآبادیاتی حکومت اور غلامی اور عوام کی بیداری دیکھی ہے جس کے نتیجے میں آزادی اور خود مختاری ملی۔ ہمیں پچھلے قریب ۴۵ سال کی کامیابیوں کا خیال آتا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا ملک آویزش، سماجی اقتصادی عدم توازن کی جانب بڑھتا معلوم ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو سیاسی استحکام کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ علاقائی تفریقات اور امیر اور غریب کے درمیان شدید رقابت، سماجی تانے بانے اور قوم کی ترقی پر کمند ڈالتی ہے اس قسم کی صورتحال سے نکلنے اور سماج کی ہم آہنگی اور نشوونما میں ہاتھ بٹانے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟

پچھلے ۴ سال کی اوسط اقتصادی نشوونما قریب ۳ر۵ فیصد سالانہ رہی ہے۔ یہ بات زور دار ہندو ماہرین اقتصادیات کے حوالہ سے کہی ہے۔ اس اوسط نشوونما کی شرح سے عوام کی آرزوؤں کی تکمیل میں مدد نہیں ملی ہے۔ اور نتیجے میں کئی میدانوں میں بہت کچھ کرنا باقی رہتا ہے۔ معمول کے حالات اور نظم و ضبط جیسے بنیادی پہلوؤں کو یقینی بنایا جا رہا ہے تو پھر نشوونما کی رفتار توقعات سے کیوں کم ہے؟ کیا قوانین میں کچھ کمی ہے؟ تاریخ میں یا روایات میں کچھ خامی ہے یا پھر عوام میں کچھ کمی ہے؟

ہمارے آئین میں ذات عقیدے یا جنس کی تفریق کے بغیر سب کو آزادی، انصاف اور برابری کی ضمانت دی گئی ہے۔ سیاسی نظام سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سب کو مساوی برابر امداد سے انصاف اور بہبود فراہم کرے گا۔ ہماری تاریخ اور روایات، مفاہمت، یک جہتی میں یک رنگی، رواداری اور محبت پر مبنی ہے۔ ہمارے عوام اب بھی سیدھے اور سچے ہیں۔ لیکن اب بھی لڑکھڑا رہے ہیں اور اقوام عالم کے درمیان بہت پیچھے ہیں۔

تعلیم کا رول

اس بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی ترقی کے لیے، خاص کر ایسے وقت میں جب آپ کو سماجی تانے بانے اور ڈھانچوں میں نئی جان ڈالنے پر غور کرنا ہو، منصوبہ سازی ضروری اور لازمی ہے منصوبہ سازی کے عمل میں مسائل کی سمجھ بوجھ اور تدارک کا علم شامل ہے۔ مختلف تدارک اور دستیاب وسائل سمیت سبھی باتوں کا تجزیہ ہمارے مقصد کے حصول میں معاون ہوتا ہے۔ اپنی منزل کا شعور واضح تصور اور قوت فہم پر ہوتا ہے۔ قوت فہم یا مسئلے کے شعور کی سطح تعلیم پر مبنی ہوتی ہے۔

تعلیم سے ہم کیا سمجھتے ہیں؟ کیا تعلیم کو مقدار کے اعتبار سے محض خواندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آیا تعلیم ایک مخصوص وقت میں حاصل کی جا سکتی ہے اور اسے کس طرح ناپا جا سکتا ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کے تفصیلی اور تنقیدی تجزیہ کی ضرورت ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ تعلیم خواندگی کے مساوی نہیں ہے۔ خواندگی اور عدد شناسی وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ افراد اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے اہل بنتے ہیں۔ خواندگی وہ ذریعہ ہے جو وقت اور مقام کے نظریات، خیالات اور واقعات کے اظہار میں مددگار ہوتا ہے لہٰذا یہ ایسا آلہ ہے جس سے اطلاعات کی ترسیل اور اس کی روک ہوتی ہے۔ خواندگی اہلیت دیتی ہے لیکن افراد اور معاشروں کو پورے طور سے بااختیار نہیں بنا سکتی۔ لہٰذا خواندگی محض ایک محدود رول ادا کرتی ہے۔ دوسری طرف تعلیم انسانی شخصیت کی مجموعی ترقی پر مشتمل ہوتی ہے جو آدمی کی بہترین صفات کو بروئے کار لاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کا مقصد انسانوں کو زندگی کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کا اہل بنانا اور ان کی صلاحیت اور مہارت کو ترقی دینا ہے۔

تعلیم کا لفظی مطلب "بچے کی پرورش یا بچے کی تربیت، ہدایات، جسم، ذہن اور تمدن کی طاقتوں کو مضبوط بنانا ہے۔" دوسری طرف علم کا

مطلب لغت میں "حتمی یقین، وہ شے جو معلوم ہے، معلومات، ہدایت، قابلیت، عملی مہارت اور جانکاری" دیا ہوا ہے۔ ان معنوں سے واضح ہوتا ہے کہ علم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ جسم ذہن اور تمدن کو مستحکم کیا جائے۔ گویا یہ ذہن، دل اور ہاتھوں کو ساتھ ساتھ ترقی دیتا ہے۔ علم، ان سب چیزوں کا مجموعہ ہے جو انسان تحریری یا غیر تحریری ذرائع ابلاغ سے حاصل کرتا ہے۔ یہ حاصل کی ہوئی وہ معلومات ہے جو انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتی ہے اور مہذب اور متمدن انسان کو جنم دیتی ہے۔ تعلیم کا عمل، معلومات حاصل کرنے، واقفیت، مہارت اور اہلیت حاصل کرنے کا عمل ہے۔ خواندگی وہ ذریعہ ہے جس سے وقت اور کسی مقام پر حاصل کی ہوئی واقفیت کو دوسروں کو منتقل کیا جاتا ہے درحقیقت خواندگی اور تعلیم دو معاون ہیں جن سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس طرح یہ کاسانی علم کی اصل منزل کے حصول کے عمل ہیں۔ بامقصد تعلیم، اسی قسم کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگا۔

> خواندگی وہ ذریعہ ہے جو وقت اور مقام کے نظریات، خیالات اور واقعات کے اظہار میں مددگار ہوتا ہے لہٰذا یہ ایسا آلہ ہے جس سے اطلاعات کی ترسیل اور اس کی روک ہوتی ہے۔

آج کے ہندوستانی معاشرہ کو کئی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اسے یہ طے کرنا ہے کہ کس سمت بڑھا جائے؟ کیا ترقی اور اصراف سے کوئی مقصد حل ہوگا؟ یا بنیادی اقدار موزوں اور اہم ہیں؟ بھارت کے رہنما اور سادھو سنت، سچائی، علم، انسانیت، حوصلہ، ہمدردی، عالمی بھائی چارے، رحم دلی اور محبت کی اقدار کے وکیل تھے۔ کیا یہ چیزیں آج بھی موزوں ہیں؟ ہم ان اقدار کو کیسے اختیار کریں؟ ہم ایسے معاشرہ میں نظم و ضبط کیسے پیدا کریں، اور عوام کے حالات کس طرح بہتر بنائے جا سکتے ہیں، غریبی اور بے روزگاری کو کیسے دور کیا جائے اس منظر نامے میں تعلیم اور تعلیم کی منصوبہ سازی نہایت بامعنی اور اہم معلوم ہوتی ہیں۔

خواندگی اور اس کے اثرات

بھارت میں خواندگی کی سطح اس وقت ۵۲٫۱۱ فیصد ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ہر دوسرا شخص ناخواندہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے ہر دوسرے شخص کے پاس رسم الخط کا علم نہیں ہے اور وہ تحریری الفاظ کے ذریعہ ترسیل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایسا شخص قطعی لاعلم ہے اور زندگی میں ناکام ہے۔ دراصل ایسے بہت سے لوگ نہایت مہذب ہیں، زندگی کا شعور رکھتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ تر اقدار میں پختہ یقین رکھتے ہمیں گاندھی جی کی "نئی تعلیم" کی یاد آتی ہے جنھوں نے "نئی تعلیم" کو "زندگی کے لیے" ضروری قرار دیا تھا اور پُرزور الفاظ میں کہا تھا کہ تعلیم زندگی "کے لیے" اور زندگی "کے" ذریعہ ہوتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی نظر میں تعلیم زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے خاص کر زندگی کی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کا سکھانا بھی اس میں شامل ہے۔ ان کے لیے یہ زندگی کی متساوی تھی جس میں صفائی، صحت، کام، عبادت، کھیل اور تفریح شامل تھے۔ گاندھی جی کے الفاظ میں تعلیم "ایک منصفانہ سماجی نظام" کے لیے تھی اور ان کی نظر میں خواندگی، تعلیم کا آخری سرا نہیں تھا۔ یہ تو آغاز بھی نہیں تھا۔ انھوں نے زور دے کر کہا تھا کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جانا چاہئے کہ وہ تعلیم کے آغاز سے ہی، مفید اور تعمیری دستکاری حاصل کر سکیں۔ جس سے بچوں کو زندگی، صفائی، حفظان صحت، تغذیہ کے اصول معلوم ہو سکیں، سماجی کام کرنے اور گھر میں اپنے والدین کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ ہم نے سماجی طور پر مفید پیداواری کام کے تجربات کیے ہیں لیکن ان سے جو جذبہ متوقع تھا وہ پیدا نہیں ہو سکا۔

> علم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ جسم، ذہن اور تمدن کو مستحکم کیا جائے۔ گویا یہ ذہن، دل اور ہاتھوں کو ساتھ ساتھ ترقی دیتا ہے

اگرچہ خواندگی کی فیصد ۴۵ سال میں بڑھ گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ نشو و نما کے نقشے میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں، مایوس اور پژمردہ نوجوانوں، لاتعلقی کے ریگزار، اور سماجی نظام کے خلاف تقریباً ایک درست شورش کے وسیع خطے پائے جاتے ہیں۔ آئین میں سب کو خواندہ بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن ہم ابھی اس منزل سے بہت دور ہیں۔ تعلیمی ادارے واقفیت، سمجھ داری اور فہم پیدا کرنے کے بجائے، محض سبق رٹ لینے اور حتیٰ کہ نقل کرنے تک کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایک کاغذی سند، فہم اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے زیادہ اہم ہے۔ اعلیٰ تعلیم ڈھیلی ڈھالی اور ضرورت سے زیادہ بوجھل ہو گئی ہے سماجی ضروریات سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے اور ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ سماج کی ضرورتوں کی پوری طرح تکمیل کر رہی ہے۔ اس طرح حصول علم تباہی کا شکار ہے اور سماج ان فوائد سے محروم ہو رہا ہے جو اسے بڑھتی ہوئی سائنسی اور ٹیکنالوجیکل معلومات کے ذریعہ حاصل ہونے چاہئیں تھے۔ اس قسم کی ترقی اور بڑھتی ہوئی معلومات سے قدم ملائے رکھنے کے لیے حصول علم اور تعلیم کے عمل کو درست کرنا ہوگا، متواتر اس کو درست کرتے رہنا ہوگا تاکہ وہ موزوں بنی رہے۔ لہٰذا تعلیم کا بنیادی مقصد سماجی اقتصادی، نفسیاتی، تہذیبی، اور روحانی ضرورتوں سے مطابقت ہے تاکہ زیادہ ذہین اور بہتر افراد پیدا کیے جا سکیں۔ ہمیں اس بات کی اچھی سمجھ ہونا چاہئے کہ ایک اچھے اور ذہین شخص میں کیا صفات ہونا چاہئے۔

پچھلے دو سال میں تعلیم میں ہونے والے تجربات ہندوستانی سماج کے لیے بہت بامعنی رہے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ۱۸۱۵ء کے چارٹر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مقامی لوگوں کی تعلیم پر ایک لاکھ روپئے خرچ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اسی کے مطابق

لارڈ میکالے نے اس رقم کو خرچ کرنے کی پالیسی بنائی تاکہ برطانوی اور کروڑوں محکوموں کے درمیان ایک درمیانی طبقہ پیدا کیا جاسکے جو رنگ و نسل سے تو ہندوستانی ہو لیکن مزاج، رائے، اخلاق اور دانش کے اعتبار سے انگریز ہو۔ روڈز کے مراسلے میں موٹے طور سے آج کے تعلیمی ڈھانچے کی بنیاد رکھی گئی۔ کئی کمیشنوں نے اس نظام کا مطالعہ کیا۔ راجہ رام موہن رائے، جیوتی با پھولے، سوامی دیانند اور مہاتما گاندھی جیسے بڑے لیڈروں نے روشن خیال تعلیم کو اختیار کیا تاکہ بھارت کو مغربی ممالک کے ہم پلہ بنایا جاسکے۔ گاندھی جی کی "نئی تعلیم" کے تجربے کو پوری طرح اور اس توجہ سے روبہ عمل نہیں لایا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ نئی تعلیم کا مقصد افراد اور سماج کو بہتر بنانا تھا۔ یونانی فلسفیوں نے بھی اسی طرح سوچا تھا۔ افلاطون کے مطابق تعلیمی نظام میں جمالیات، اخلاقیات اور ذہنی و جسمانی نشوونما کو شامل ہونا چاہیے جس میں موسیقی کی فہم بھی شامل ہو۔ ارسطو نے افلاطون کی وضع کردہ تعلیم کی تعریف کو توسیع دیتے ہوئے کہا کہ تعلیم کا مقصد شہریوں کی تعلیم ہونا چاہیے جو ریاست کے معاملات میں سرگرمی سے اپنا کردار نبھانے کے قابل ہوں۔ اس نے مزید منطق اور روشن خیال فنون لطیفہ پر بھی زور دیا۔

ابتدائی تعلیم کی اہمیت

تعلیم میں اعلیٰ معیار کی ضرورت پر عام اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم میں اعلیٰ معیار کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی صلاحیتوں کو بڑھایا جاسکے اور اسے دنیا کے دوسرے ممالک کے ہم پلہ بنایا جاسکے۔ اعلیٰ معیار کی تعلیم کی بنیاد ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیادوں میں مضمر ہے۔ اگر یہ دونوں مقاصد حاصل نہیں کیے جاتے تو تباہ کن ہوں گے۔ اگر اعلیٰ تعلیم سماجی ضرورتوں سے مطابقت نہیں رکھتی تو ابتدائی تعلیم بھی مہارت، شعور اور زندگی کی قدروں جیسے مقاصد کی سمجھ اور تفاخر کو حاصل کرنے میں بھی معاونت نہیں کررہی ہے۔ ابتدائی تعلیم بھی پھول پھل سکتی ہے اور ترقی کرسکتی ہے جب اسے بنیادی سطح تک لے جایا جائے گا۔ گاؤں اور محلہ کی یونٹوں کو بااختیار اور خواندہ بنایا جائے اور ان کو ہی تعلیمی پروگراموں کو روبہ عمل لانے اور تعلیم کے معیار کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا جائے۔

پچھلی دہائیوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ سماجی مقاصد نیز بچوں اور ملک کے مستقبل سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ سرکاری اداروں میں کچھ پڑھائی نہیں ہوتی اور پرائیویٹ نیز پبلک اداروں میں بھاری فیس لی جاتی ہے جس کی وجہ سے ابتدائی تعلیم عام آدمی کی دسترس سے باہر ہوگئی ہے۔ پڑھنے پڑھانے کے مواد کی سماج سے مطابقت کے معاملے کو سراہا جاتا ہے لیکن ان کی تشکیل دانشورانہ تجسس اور سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف اس کی وجہ سے بڑی تعداد میں بچے اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔ فادروں کے نظام کو کوئی کردار ہی حاصل نہیں ہے۔ اندرا گاندھی کا مقولہ ہے "دو قسم کی اقدار نہیں ہوسکتیں۔ سیاست زندگی کا حصہ ہے اور قدیم یونانی مفہوم کے اعتبار سے لفظ سیاست زندگی کا نچوڑ ہے کیونکہ یہ تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ بدقسمتی سے آج کے سیاستدانوں نے اسے اتنا سطحی بنا دیا ہے گویا یہ محض ایک پیشہ ہے۔ سیاسی یا پیشہ ورانہ زندگی میں اقدار کو ان دائمی اقدار سے الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا جو انسانی شخصیت منکشف ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ انسانی اقدار سے الگ سیاسی اقدار وضع کرنا انسان کی تہہ داری کو کم کرنا ہے۔ اقدار کی کسی بھی تلاش میں کی عنصر اور سماجی ذمہ داریوں میں صحیح توازن قائم کرنا ہوگا۔ اقدار کی تلاش کو ایک مسلسل عمل ہونا چاہیے جس میں ان اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کی مسلسل کوشش ہونا چاہیے۔ محض اقدار کے تصور کی کوئی قیمت نہیں اسے زندگی میں برتا جانا چاہیے"۔

لہٰذا یہ بات صاف ہے کہ آج ہم کو انسانی زندگی میں بنیادی اقدار پیدا کرنے کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

دفعہ ۵۱ اے میں شہریوں کے بنیادی فرائض درج ہیں۔ آئین میں ان فرائض کے درج ہونے کے باوجود ہم کو آج ٹکراؤ اور تنازعات کے مسائل کا سامنا ہے جس کے نتیجے میں تباہیاں پھیلتی ہیں۔ کسی ترقی سماجی مقاصد سے زیادہ اہم بن جاتی ہے۔ کوئی بھی تعلیم یا منصوبہ سازی جس کا مقصد اخلاق سدھارنا نہ ہو۔ جس میں سماجی برابری انصاف اور

جیسے گاندھی جی کی "نئی تعلیم" کی یاد آتی ہے جنھوں نے "نئی تعلیم" کو "زندگی کے لیے" ضروری قرار دیا تھا اور پرزور الفاظ میں کہا تھا کہ "تعلیم زندگی کے لیے" اور "زندگی کے ذریعہ" ہوتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی نظر میں تعلیم زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔

گاندھی جی کے "نئی تعلیم" کے تجربے کو پوری طرح اور اس توجہ سے روبہ عمل نہیں لایا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ نئی تعلیم کا مقصد افراد اور سماج کو بہتر بنانا تھا۔ یونانی فلسفیوں نے بھی اسی طرح سوچا تھا۔

تعلیمی ادارے واقفیت، سمجھ داری اور فہم پیدا کرنے کے بجائے، محض سبق رٹنے تک کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم ڈھیلی ڈھالی اور ضرورت سے زیادہ بوجھل ہوگئی ہے۔

باقی صفحہ ۹ پر

پروفیسر جندھیالہ بی جی تلک

تعلیم کے وسائل کی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے

ملک میں تعلیم کے فروغ کے لیے مالیہ کی فراہمی سے متعلق متعدد پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ جدید تعلیمی نظام معقول مالی وسائل کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا۔ ضروریات اور حقیقی فنڈ کی فراہمی کے درمیان جو خلا موجود ہے اس کا معیار تعلیم پر بہت برا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں فیس میں اضافہ، بہتر اساتذہ اور غیر تدریسی اسٹاف کی بحالی، لائبریریوں کے نظم و نسق میں سدھار، خدمات کے عوض وسائل کا حصول اور ایک مضبوط مالی بنیاد کا قیام ـــــ یہ وہ اقدام ہیں جو تعلیم سے متعلق وسائل کی بنیادوں کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ ہمیں قلیل مدتی اور فوری نوعیت کے ایسے اقدامات پر غور کرنے سے گریز کرنا چاہئے جو آگے چل کر تباہی کا باعث بنیں۔

ہندوستان میں نظام تعلیم جن باتوں سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے وہ یہ ہیں کہ اس شعبے میں سرمایہ کاری بہت کم ہوتی ہے، اسکولوں کی حالت خستہ، تدریسی عمل ناقص اور کم سے کم بنیادی ضروریات کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ سرکاری بجٹ سے بہت معمولی ضروریات پوری ہو پاتی ہیں۔ ضروریات اور وسائل کی فراہمی کے درمیان موجود خلا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اہم تعلیمی منصوبے مجروح ہوتے ہیں اور نظام میں اصلاح کرنے اور بہتر پالیسیوں کے نفاذ کے سلسلے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

حکومت ہند نے بارہا اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ وہ تعلیم کے لیے معقول مالی وسائل فراہم کرے گی اور اس کے لیے مجموعی گھریلو پیداوار کا چھ فیصد حصہ مختص کرنے کا نشانہ مقرر کیا جائے گا۔ اس وقت مجموعی گھریلو پیداوار کا صرف ۴ فیصد حصہ شعبۂ تعلیم پر صرف ہو رہا ہے۔ مزید برآں پنج سالہ منصوبوں کے مجموعی بجٹ میں تعلیم کا حصہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ آٹھویں پلان میں اس بات کی خصوصی کوشش کی گئی ہے کہ اس رجحان میں تبدیلی لائی جائے۔ تجویز پیش کی گئی ہے کہ آٹھویں پلان میں شعبۂ تعلیم کا بجٹ بڑھا کر ۹ر۴ فیصد کر دیا جائے جو ساتویں پلان میں ۵ر۳ فیصد اور چھٹے پلان میں ۷ر۲ فیصد تھا۔

مرکزی اور ریاستی بجٹ نیز ٹیکس اور مالی حساب کتاب کا جائزہ لینے کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بجٹ کا مشکل سے دس فیصد حصہ تعلیم پر صرف ہوتا ہے جو اس عام تصور کے برعکس ہے کہ بجٹ کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ تعلیم کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ البتہ ریاستوں کے محصولاتی بجٹ کے اعتبار سے یہ درست نظر آتا ہے۔ عام طور سے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ شعبۂ تعلیم کے لیے ایڈہاک کے طور پر رقم فراہم کی جاتی ہے جو عموماً بجٹ کی بچی کھچی رقم کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جو مالی وسائل مختص کیے جاتے ہیں وہ اُس حقیقی نشانے پر کبھی پورے نہیں اترتے جس کا منصوبے یا پالیسی میں ذکر ہوتا ہے۔ اور شعبۂ تعلیم پر جو اخراجات آتے ہیں اُن پر مشکل ہی سے ملک کی اقتصادی صلاحیت اثر انداز ہوتی ہے۔ مختلف ریاستیں تعلیم کے شعبے میں جو خرچ کرتی ہیں ان پر اقتصادی صورت حال اثر انداز نہیں ہوتی۔ مثلاً ریاست کی فی کس آمدنی اثر انداز نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اقتصادی عوامل کے بجائے غیر اقتصادی عوامل تعلیم پر ہونے والے سرکاری اخراجات کے سلسلے میں زیادہ اہم رول ادا کرتے ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی طور پر ایک پیمانہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق ملک کی تمام ریاستوں پر ہو۔ یعنی یوں کہا جائے کہ بجٹ کا ایک کم سے کم حصہ تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس کے باعث ملک میں تعلیم کو متوازن انداز میں فروغ حاصل ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد کے دور میں اگرچہ تعلیم کے مجموعی اخراجات اور فی طالب علم تعلیمی اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن حقیقی قیمتوں کے اعتبار سے اخراجات میں (فی طالب علم کے حساب سے) گراوٹ آ گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں یہ گراوٹ بہت نمایاں ہے۔

مالی وسائل کا استحکام

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا نظام حد سے زیادہ حکومت کی مالی اعانت پر انحصار کرتا ہے اور غیر سرکاری حلقوں سے جو رقم وصول ہوتی ہے وہ بہت معمولی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ایک طرف اضافی وسائل حاصل کرنے کے لیے متبادل حکمت عملی اختیار کرنے

کی ضرورت واضح طور پر محسوس کی جاتی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کا جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی ڈھانچہ ہے اس میں یہ حکمت عملی کچھ زیادہ کارگر نہیں ثابت ہوسکتی۔ اور حکومت کو ہی لامحالہ تعلیم پر ہونے والے اخراجات کا بڑا حصہ برداشت کرنا پڑے گا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تعلیمی امور پر خاندان جو سرمایہ کاری کرتے ہیں اس کی اہمیت اندازاً سرکاری سرمایہ کاری سے کسی قدر کم نہیں ہوتی۔ اس کے باعث خاندانوں سے رضاکارانہ طور پر یا لازمی نوعیت کے رسوم (مثلاً فیس) حاصل کرنے میں ایک حد تک رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ غیر سرکاری طور پر مالی وسائل حاصل کرنے کی کچھ کوششیں کی جاتی ہیں۔ فیس کی صورت میں جو رقم وصول ہوتی ہے وہ مشکل ہی سے اضافی وسائل کی فراہمی یا نظام کو بہتر بنانے کا وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے۔ تعلیم پر صرف ہونے والے سرمایے کا سچ پوچھیے تو فیس سے وصول ہونے والی رقم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں یونیورسٹیوں، کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں کو اس وقت تک شاید نقصان اٹھاتے رہنا پڑے گا جب تک کہ یہ ادارے اپنے طور پر معقول وسائل حاصل کرنے کا انتظام نہیں کرتے۔ ایسا کرتے وقت یہ بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ معیار تعلیم مجروح نہ ہو اور مالی وسائل کی فراہمی اور ان کے استعمال کے موجودہ طریقے میں کچھ بہتر تبدیلی لائی جائے۔ اس پس منظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک کثیر جہتی منصوبہ اپنایا جائے۔ یہاں مختصراً کچھ خصوصی تجاویز پیش کی جارہی ہیں جن کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے نظام کو مالی اعتبار سے مستحکم بنانا ہے۔

فیس میں اضافہ

اس بات پر شاید اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں، فیس میں اضافہ کیا جائے۔ ۸۰ کی دہائی کے وسط میں فیس کی رقم (مثلاً ٹیوشن فیس، ہاسٹل اور امتحان فیس وغیرہ) اخراجات کے ۱۵ فیصد حصے کا احاطہ کرتی تھی۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں جو فیس وصول کی جاتی ہے وہ برائے نام ہوتی ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مناسبت کا موازنہ بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک سے کیا جاسکتا ہے لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہ شرح ۳۷ فیصد تھی جس میں کافی گراوٹ آگئی ہے۔ چونکہ ان برسوں میں معیار زندگی بلند ہوا ہے اس لیے یہ توقع کرنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ فیس میں اضافہ کیا جائے یا اعلیٰ تعلیم کے مجموعی اخراجات میں فیس کا تناسب بھی بڑھایا جائے اور اسے بتدریج ۵۱-۱۹۵۰ء کی سطح پر لایا جائے تاہم اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اعلیٰ تعلیم ایک منتخب خوشحال طبقے تک محدود تھی لیکن اب اعلیٰ سطح کی تعلیم میں جمہوری رویوں کو فروغ حاصل ہوا ہے اور اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے طلبا بھی بڑی تعداد میں اس جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے ایک دم ۵۰ کی دہائی والی سطح پر لایا جائے۔

> عام طور سے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ شعبۂ تعلیم کے لیے ایڈ ہاک کے طور پر رقم فراہم کی جاتی ہے جو عموماً بجٹ کی بچی کچی رقم کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جو مالی وسائل مختص کیے جاتے ہیں وہ اس حقیقی نشانے پر بھی پورے نہیں اترتے جن کا منصوبے یا پالیسی میں ذکر ہوتا ہے۔

بہت سی یونیورسٹیوں میں امتحان فیس سے ہونے والی آمدنی اور امتحان پر خرچ ہونے والی رقم تقریباً برابر ہوتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹیوشن اور ہاسٹل فیس وغیرہ کی شرح پر نظرثانی کی جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ٹیوشن فیس کا سلسلہ افراطِ زر سے جوڑ دیا جائے اور ہر طرح کی فیس میں افراطِ زر کے لحاظ سے اضافہ کیا جائے۔ اس طرح فیس فی طالب علم اور فیس سے وصول ہونے والی مجموعی رقم میں گراوٹ کا رجحان باقی نہیں رہے گا۔ متبادل کے طور پر یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اخراجات میں ایک ایسے حصے کی حد مقرر کر دی جائے جو طلبا سے وصول ہونے والی فیس سے پورا کیا جاسکے۔

علاوہ ازیں جہاں فیس کی شرح یا مجموعی اخراجات میں فیس کے مخصوص حصے کی حد مقرر کی جائے وہیں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس فیصلے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ لازمی طور پر ہر طالب علم کو انفرادی طور پر فیس کا مقررہ حصہ ادا کرنا پڑے گا۔ اختیاری فیس رعایت کی پالیسی اپنائی جاسکتی ہے تاکہ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں منصفانہ طریقۂ کار کا تحفظ ہوسکے۔

> ایک طرف اضافی وسائل حاصل کرنے کے لیے متبادل حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت واضح طور پر محسوس کی جاتی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کا جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی ڈھانچہ ہے اس میں نئی حکمت عملی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اور حکومت کو ہی لامحالہ تعلیم پر ہونے والے اخراجات کا بڑا حصہ برداشت کرنا پڑے گا۔

فیس میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں جو تجاویز پیش کیے جاتے ہیں انہی کے ساتھ وظیفے کی رقم میں اضافے اور کمزور طبقوں کے طلبا کو دیے جانے والے قرضوں میں اضافے کے جواز بھی پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اعلیٰ تعلیم میں منصفانہ طریقۂ کار کو یقینی بنایا جاسکے

فیس میں اضافے اور تعلیمی قرضوں نیز وظیفوں کی رقم میں اضافہ کرنے کی تجاویز کو اصلاحات کا ایک ناقابلِ تقسیم حصہ تصور کیا جانا چاہئے ورنہ اعلیٰ تعلیم میں منصفانہ طرزِ عمل کو یقینی نہیں بنایا جاسکتا دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کم از کم فوری طور پر قرضے دینے کا پروگرام ایک بڑی سرکاری سرمایہ کاری کا متقاضی ہوتا ہے۔ عوامی (سرکاری) بجٹ سے قرضوں اور وظیفوں کے لیے لازمی طور پر ایک رقم مخصوص کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر قرضوں کا پروگرام بہتر ڈھنگ سے آگے بڑھتا رہا تو آگے چل کر یہ ایک ایسا متحرک فنڈ ثابت ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کو مالی وسائل فراہم کیے جا سکیں گے۔

> ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں جو فیس وصول کی جاتی ہے وہ برائے نام ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس تناسب کا موازنہ بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک سے کیا جا سکتا ہے لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ شرح ۳۷ فیصد تھی جس میں کافی گراوٹ آگئی ہے۔

اخراجات میں تخفیف

(الف) ہنگامی اخراجات میں کٹوتی :- اس بات کی ضرورت ہے کہ کچھ ایسے اقدام کیے جائیں جن کے تحت اخراجات میں تخفیف کی جاسکے۔ اس وقت یونیورسٹیوں کے مجموعی اخراجات کا ۳۰ فیصد حصہ ہنگامی نوعیت کے اخراجات کے لیے مخصوص ہوتا ہے یعنی یہ وہ رقم ہوتی ہے جو تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی تنخواہیں ادا کرنے کے بعد بچ جاتی ہے۔ ہنگامی نوعیت کے کچھ اخراجات میں کٹوتی تو کی جاسکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہوگا کہ اس سے یونیورسٹیاں کوئی معقول رقم بچا سکیں۔ علاوہ ازیں ہنگامی اخراجات میں تخفیف کرنے کے نتیجہ میں کچھ کٹوتی تو ہوسکتی ہے جیسے فضول خرچی سے گریز کرنے کا فیصلہ تصور کیا جاسکتا ہے لیکن لائبریری وغیرہ کے بجٹ میں جہاں آسانی سے اس طرح کے فیصلوں کو نافذ کیا جاسکتا ہے، یہ کٹوتی اعلیٰ معیار تعلیم و تحقیق کے لیے سم قاتل ثابت ہوسکتی ہے۔

(ب) انتظامی عملے میں مناسب تخفیف

بہت سی یونیورسٹیوں میں اس وقت انتظامی عملے کی تعداد تدریسی عملے کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کاکتیا یونیورسٹی میں یہ تناسب ۲:۱ کا ہے جب کہ دستیاب تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق وکرم اور مہاراشٹر یونیورسٹی میں یہ تناسب ۷:۱ ہے۔ صرف یہ کہ مختلف یونیورسٹیوں میں انتظامی عملہ کی تعداد اساتذہ سے زیادہ ہوتی ہے بلکہ بہت سی یونیورسٹیوں میں غیر تدریسی عملے پر تدریسی عملے کے مقابلے زیادہ رقم صرف ہوتی ہے۔ اس میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے اقدام کیے جانے چاہئیں جن کے تحت اساتذہ اور انتظامی عملہ کے درمیان معقول تناسب برقرار رہے۔ اگرچہ طاقتور لیبر

> فیس میں اضافے اور تعلیمی قرضوں نیز وظیفوں کی رقم میں اضافہ کرنے کی تجاویز کو اصلاحات کا ایک ناقابلِ تقسیم حصہ تصور کیا جانا چاہئے ورنہ اعلیٰ تعلیم میں منصفانہ طرزِ عمل کو یقینی نہیں بنایا جاسکتا۔

یونین اس تجویز کو رد کرسکتی ہیں لیکن کم از کم ان یونیورسٹیوں میں تو اس تناسب کو کم کرنا ہی پڑے گا جہاں صورتحال بالکل ہی غیر متوازن ہے مطلوبہ تناسب قائم کرنے کے لیے کچھ ضابطے وضع کرنا ہوں گے۔ دفتروں میں نئی ٹکنالوجی کا نفاذ، خاص طور سے کمپیوٹر کی سہولیات، غیر ضروری انتظامی عملے کو بتدریج کم کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ انتظامی عملے کی تعداد میں توازن پیدا کر کے اور تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے درمیان بہتر تناسب قائم کر کے مالی وسائل کا معقول حصہ بچایا جاسکتا ہے۔ اس سے اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی مجروح نہیں ہوگا۔ لیکن یہ کام فوری طور پر نہیں بلکہ مرحلہ وار طور پر انجام دیا جانا چاہئے۔

لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ کم از کم ابتدائی مرحلے میں کمپیوٹر کاری اضافی اخراجات کی متقاضی ہوتی ہے اور صرف نازک اور بھاری پرزوں کی خریداری ہی پر رقم نہیں خرچ ہوتی بلکہ افرادی قوت کو ٹریننگ بھی دینا پڑتی ہے۔ کچھ ناگزیر قسم کی فضول خرچی بھی ہوسکتی ہے۔ خاص طور سے ابتدائی مرحلے میں۔ کمپیوٹر کاری بہتر کارکردگی فراہم کرتی ہے لیکن یہ کچھ کم مہنگی نہیں ثابت ہوتی، خاص طور سے شروع کے مرحلے میں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کمپیوٹر سسٹم کو فروغ دینے کے لیے اضافی فنڈ درکار ہے تاکہ پرزے خریدے جاسکیں۔ ان کی دیکھ بھال ہوسکے اور متعلقہ افراد کو ٹریننگ دی جاسکے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کمپیوٹر کاری ناگزیر ہوجاتی ہے کیونکہ اس سے مجموعی کارکردگی میں بہتری آتی ہے، بھلے ہی شروع شروع میں یہ سودا مہنگا ثابت ہو۔

(ج) تدریسی عملے میں توازن

یونیورسٹیوں کی مختلف فیکلٹیوں میں اساتذہ کی تعداد بھی غیر متوازن ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعلیم اور تحقیق کی ذمہ داریوں اور ضروریات اور طلبا کی تعداد سے صرف نظر کرتے ہوئے اساتذہ کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے، طلبا کی تعداد کا تناسب فی استاد کے اعتبار سے مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف ہے مثلاً پٹنہ میں یہ تناسب ۱:۱ کا ہے جب کہ امراوتی میں ۴:۱ اور رویندر بھارتی میں ۵۴:۱ ہے حالانکہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عام ضابطے کے مطابق یہ تناسب ۲۰:۱ ہونا چاہئے۔ فیکلٹیوں میں

تعداد کا توازن قائم کرنا، متعدد وجوہ کی بنا پر دشوار ثابت ہوسکتا ہے۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی طاقتور یونینیں موجود ہیں اس سے بھی اہم بات یہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ یونیورسٹی فیکلٹی کے ذمہ تعلیم اور تحقیق دونوں کا کام ہوتا ہے لہٰذا استاد اور طالب علم کی تعداد کا تناسب اُس پیمانے سے نہیں قائم کیا جا سکتا جس پیمانے سے پرائمری اور اعلیٰ پرائمری اسکولوں میں قائم کیا جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ۱:۱۰ کا تناسب بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر لازمی بن گیا ہے کہ گریجویٹ پوسٹ گریجویٹ اور تحقیق کی سطح پر الگ الگ استاد طلبا کی تعداد کا تعین کیا جائے۔ اس پس منظر میں پوسٹ گریجویٹ، انڈر گریجویٹ اور تحقیق کی سطح پر جو فرق ہے اسے پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پروفیسر، لیکچرر اور ریڈر کی تعداد کا توازن قائم رکھنے کے لیے کچھ ضابطے وضع کیے جائیں۔ ان تمام اقدامات کے نتیجے میں کچھ وسائل کی بچت ہوسکتی ہے۔ خاص طور سے یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی تنخواہ کی شکل میں جو رقم جاتی ہے اس میں کچھ تخفیف کی جاسکتی ہے۔

(د) لائبریریوں میں مربوط نظام

اس بات پر اب زیادہ زور دیا جا رہا ہے کہ لائبریری سے متعلق وسائل کو بطور خاص مختلف لائبریریوں کے درمیان مربوط کیا جائے۔ اس طور پر مالی وسائل کی بچت کی جاسکتی ہے جس میں غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت بھی شامل ہے۔ بعض اداروں میں اس سلسلے میں جو تجربے کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ لائبریریوں کا مربوط نظام قائم کر کے اچھی خاصی بچت کی جاسکتی ہے لیکن ایسا کرنے سے کچھ اضافی اخراجات بھی ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بنیادی ڈھانچے کے قیام پر رقم صرف ہوگی۔ تاہم یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ مواصلاتی مسائل اور مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان پائی جانے والی دوریاں ایسے عوامل ہیں جن کے باعث بڑے پیمانے پر مربوط نظام نہیں قائم ہوسکتا۔ اگر کسی جریدے میں شائع شدہ مطلوبہ مقالے کی فوٹو کاپی استاد / ریسرچ اسکالر کو فراہم کر بھی دی جائے تو یہ کافی نہیں ہوگا۔ پورے رسالے پر نظر ڈال کر جو معلومات حاصل کی جاتی ہیں وہ کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک ہی یونیورسٹی کے احاطے میں واقع مختلف شعبوں کے درمیان نیٹ ورک قائم کرنا تو ممکن ہے لیکن مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان اس طرح کا رابطہ قائم کرنا مشکل امر ہے کیونکہ وہ جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر واقع ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس طرح کا نیٹ ورک قائم کرنے اور رسالوں کی دوہری خریداری سے بچنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ طلبا اور اساتذہ کی رسائل و جرائد کی ضروریات ہر حال میں پوری ہوسکیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لائبریری کے بجٹ سے معقول رقم کی بچت کرنے کا خیال، پوری طور پر اور آگے چل کر بہت مہنگا ثابت ہوسکتا ہے۔

فیکلٹیوں میں تعداد کا توازن قائم کرنا، متعدد وجوہ کی بنا پر دشوار ثابت ہوسکتا ہے۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی طاقتور یونینیں موجود ہیں۔

(ر) خدمات/سامان کی فروخت

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (آئی آئی ایم) اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی ایسے ادارے تصور کیے جاتے ہیں جو مشاورتی خدمات اور صنعتوں کو اپنی عملی خدمات فراہم کر کے ایسے مالی وسائل حاصل کر سکتے ہیں جن سے اپنے بجٹ کی ضروریات پوری کر سکیں۔ اگرچہ یونیورسٹیوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسی طرز پر مالی فائدے حاصل کر سکتی ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ یونیورسیٹوں کے سائنس، انجینئرنگ اور کمپیوٹر کے شعبوں کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ اس سمت سنجیدگی سے پیش رفت کریں۔ حکومت اس کی حوصلہ افزائی اس طور پر کر سکتی ہے کہ ۱:۱ کی بنیاد پر امداد فراہم کرنے کی تجویز پیش کرے۔ یعنی حکومت اتنی ہی گرانٹ مہیا کرے جس کے بقدر یونیورسٹیاں اپنے طور پر رقم حاصل کر سکیں۔

اب تک صورتحال یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے طور پر مالی وسائل نہیں حاصل کرتیں اور خسارے کو پورا کرنے والے طریقۂ کار کے تحت سب کچھ انجام پاتا ہے۔ اب یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ اس طریقۂ کار کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔ اس صورت میں یہ غور کرنا ضروری ہے کہ حکومت پر جو بوجھ ہے وہ کیونکر کم ہوگا نیز یہ کہ یونیورسٹیوں کو گرانٹ دینے کے لیے کس طرح کا ضابطہ یا اصول اپنایا جانا چاہیے۔ ایک طرف، خود سے وسائل حاصل کرنے والی یونیورسٹیوں کو "مساوی گرانٹ" دینے کی تجویز قابل غور رہے تو دوسری طرف یہ بھی غور کرنا ضروری ہے کہ وہ اچھی اور مثالی یونیورسٹیاں، جو کچھ معقول وجوہ کی بنا پر خود سے وسائل نہیں حاصل کر سکتیں وہ مالی وسائل کے بحران کا شکار نہ ہونے پائیں۔

انتظامی عملے کی تعداد میں توازن پیدا کر کے اور تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے درمیان بہتر تناسب قائم کر کے مالی وسائل کا معقول حصہ بچایا جاسکتا ہے۔ اس سے اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی مجروح نہیں ہوگا۔

محفوظ سرمایہ

(الف) عطیات و امداد:- ۹۴-۱۹۹۳ء کے مرکزی بجٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں کو جو لوگ عطیات اور امداد مہیا کریں گے انھیں آمدنی ٹیکس میں بڑی فراخدلانہ چھوٹ دی جائے گی (چھوٹ کی حد

سو فیصد ہوگی لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کے اعلیٰ اداروں کو جو عطیات دیئے جائیں گے اس کے لیے چھوٹ کی حد ۱۲۵ فیصد تک ہوگی) لیکن ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں پیش کردہ ان تجاویز پر کوئی ردعمل ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے لیے اس طرح کے عطیات یا امداد کی زیادہ بڑے پیمانے پر امید نہیں کی جاسکتی لیکن یہ امید ضرور کی جاسکتی ہے کہ اس طور پر یونیورسٹیاں اپنے وسائل میں کچھ نہ کچھ اضافہ کریں گی۔ اس وقت (۸۰ کی دہائی کے وسط سے) اعلیٰ تعلیم کے بجٹ کا ۵ فیصد حصہ عطیات اور امداد سے پورا ہوتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہ حصہ ۱۳٫۸ فیصد کے بقدر تھا۔ یونیورسٹیوں کو اس طور پر وسائل حاصل کرنے کی کوششوں کی حکومت کی جانب سے اس طرح حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے کہ ۱:۱٫۵ یا ۱:۲ کی بنیاد پر گرانٹ مہیا کرے۔

> ایک طرف خود سے وسائل حاصل کرنے والی یونیورسٹیوں کو "مساوی گرانٹ" دینے کی تجویز قابل غور ہے تو دوسری طرف یہ بھی غور کرنا ضروری ہے کہ وہ اچھی اور مثالی یونیورسٹیاں جو کچھ معقول وجوہ کی بنا پر خود سے وسائل نہیں حاصل کرسکتیں وہ مالی وسائل کے بحران کا شکار نہ ہونے پائیں۔

تاہم اس طرح کے عطیات و امداد کو محفوظ سرمایے کے طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ اس طرح کے رضاکارانہ عطیات و امداد سے یونیورسٹیاں اپنے بجٹ کا کوئی خاص حصہ پورا کرسکیں گی۔ کم از کم جب تک کہ مالی وسائل کا ایک مضبوط ذخیرہ نہیں قائم ہو جاتا اس وقت تک یہ توقع فضول ہوگی۔

(ب) غیر استعمال شدہ دولت کا استعمال

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زمین اور عمارتوں جیسی غیر استعمال شدہ جائداد کے مناسب استعمال کے ذریعہ یونیورسٹیاں ایسا ایک مضبوط فنڈ قائم کرسکتی ہیں اور اس طرح ان کے سالانہ اخراجات کا ایک خاص حصہ پورا ہوسکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی تجویز بے حد خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے اور اس کا غلط یا ناعاقبت اندیشی پر مبنی استعمال یونیورسٹیوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ اور کم از کم ہمارے معاشرے میں ان باتوں کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی توسیع

نئی یونیورسٹیاں کھولنے کی تجویز پر کافی گہرائی سے غور کیا جانا چاہیئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری بجٹ میں تخفیف اور ساتھ ہی ساتھ بے روک ٹوک کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کا سلسلہ، ایسے عوامل نہیں ہیں جو وسائل کی کم یابی کا مسئلہ حل کرنے میں معاون ثابت ہوسکیں۔ نئی یونیورسٹیاں کھولنے کے سلسلے میں سخت ضوابط اپنائے جانے چاہئیں نیز یہ کہ سیاسی مقاصد کے لیے ان ضابطوں میں نرمی نہیں پیدا کی جانی چاہیئے۔

پرائیویٹ سیکٹر کا رول

یونیورسٹیوں کو فنڈ فراہم کرنے کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر اور حکومت کے رول کی واضح طور پر نشاندہی کردی جائے۔ وسائل کی نایابی کے پس منظر میں تعلیم کے شعبہ میں نجی کاری کو ایک اہم وسیلہ تصور کیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے معاملے میں پرائیویٹ سیکٹر کا رول اہم نہیں رہا ہے۔ کم از کم مالی وسائل کی فراہمی کے تعلق سے یہی کہا جائے گا۔ عام طور سے ہندوستان کے بیشتر پرائیویٹ ادارے، پرائیویٹ طور پر ہی چل رہے ہیں لیکن ان کے تقریباً پورے اخراجات حکومت ہی برداشت کرتی ہے امداد کی شکل میں حکومت پرائیویٹ ایڈیڈ اداروں کو بہت بڑی رقم مہیا کرتی ہے پرائیویٹ اداروں کے بارے میں جو جائزے لیئے گئے ہیں ان سے یہ حقائق سامنے آئے ہیں کہ چند ایسے پرائیویٹ ادارے جو حکومت سے کوئی امداد نہیں لیتے وہ طلبا سے بہت زیادہ فیس اور گارجین سے بطور عطیہ بڑی موٹی رقوم وصول کرلیتے ہیں۔ بہرحال یہ کہ پرائیویٹ ادارے جس طریقے سے اپنے مالی وسائل حاصل کرتے ہیں اسے جائز یا منصفانہ نہیں کہا جاسکتا۔ حکومت مشکل ہی سے ان اداروں کی کارکردگی کو بہتر اور پابند بناسکتی ہے۔ اس میں مالی پہلو بھی شامل ہیں۔ یہ بات بھی عام طور سے دیکھی گئی ہے کہ یہ پرائیویٹ ادارے صرف خوشحال طبقے کی ضروریات پوری کرسکتے ہیں۔ پرائیویٹ اداروں میں حکومت کی چند ہی ایسی پالیسیاں قابل عمل ہیں جن کے تحت اقتصادی طور پر پسماندہ افراد کے بچوں کو تعلیم دی جاسکتی ہے۔ تعلیم کے معاملے میں یہ سوچنا کہ پرائیویٹ سیکٹر حکومت کو مالی طور پر کوئی راحت پہنچا سکتے ہیں، محض ایک دھوکہ ہے کیونکہ امداد نہ لینے والے پرائیویٹ اداروں کی تعداد بہت معمولی ہے۔ جب کہ امداد پانے والے پرائیویٹ ادارے اپنے طور پر وسائل نہیں پیدا کرتے۔ عام طور سے پرائیویٹ ادارے نہ صرف یہ کہ لازمی طور پر حکومت کا بوجھ نہیں کم کرتے بلکہ مالی، تعلیمی اور دوسرے سماجی معاملات میں بسا اوقات فلاحی ریاست کے مقاصد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ تعلیم کے شعبے میں نجی کاری کی حوصلہ افزائی کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

حکومت کا حصہ کیا ہوگا اور دوسرے ذرائع مثلاً فیس اور دوسرے اندرونی ذرائع کا حصہ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ متعدد پیمانوں کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ فوری نوعیت کے اقدامات آگے چل کر تباہی کا باعث بن جائیں۔ اعلیٰ تعلیم کے تعلق سے مالی مدد سمیت حکومت کی سرگرم معاونت، ٹھوس نظریاتی اور عملی بنیادوں پر لازمی ہے اور اس کا معقول جواز موجود ہے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اور آخری بات یہ کہ معقول مالی وسائل کے بغیر جدید تعلیمی نظام برقرار نہیں رہ سکتا بلکہ کھوکھلا نظام بن کر دم توڑ دیتا ہے اگرچہ مالی وسائل ہی تعلیم کے تمام تر مسائل نہیں حل کرپاتے۔ ●

> "دنیا بھر میں یہ احساس پیدا ہوچکا ہے کہ مناسب و موزوں تعلیم کے ذریعہ ہی بہتر سماج کی تعمیر ہوسکتی ہے۔"
>
> جواہر لال نہرو

پروفیسر این۔ کے۔ امبشٹ

قبائلی تعلیم: مشکلات اور امکانات

مصنف کے خیال میں تعلیم ایک ذریعہ ہے انسان کی اس کے ثقافتی دائرے کے اندر ترقی و نشوونما کا۔ اس وقت قبائلی بچوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ علم بشریات کے ماہرین اور زیادہ سے زیادہ ثقافتی مطالعات کی پرزور وکالت کرتے ہوئے انھوں نے ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے جو ہر قبیلے کی ضرورتوں کے مطابق اور علم کی کم از کم سطحوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ علم، سماج کو ایک مادّی تصور کرتے ہوئے اس کی مادی صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اسے جو کچھ ملا ہے اس سے زیادہ دے سکے۔ وائٹ ہیڈ (۱۹۴۹ء) کے مطابق تعلیم کا مقصد ترقی کی بنیاد پیدا کرنا اور ترقی کی راہ دکھانا ہے۔" تعلیم کے بامعنی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہماری پوری زندگی، خواہ وہ کیا اقتصادی یا جمالیاتی اور کیا روحانی، سے پوری مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا منبع ہماری بنیادی اقدار اور ہمارے اخلاقی اصول ہونے چاہئیں۔ تعلیم کے صحیح معنی فرد میں ایسی ترقی کا عمل پیدا کرنا ہے جو اس کے ورثے کی ثقافت سے ہم آہنگ ہو۔ چونکہ تعلیم کا ثقافت سے ایک حقیقی رشتہ ہے اس لیے تعلیم کے تئیں ہمارا اندازِ نظر، خصوصاً قبائلی علاقوں میں، لازمی طور پر انسانیاتی ہونا چاہئے۔ تعلیمی عمل میں فرد اور اس کے ماحول کے درمیان تفاعل بہت اہم چیز ہے۔ فرد ایک بڑی حد تک اپنے اردگرد کے ماحول سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا تعلیم کا انحصار ثقافت پر ہے اور ثقافتی مطالعات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

ہندوستان کے مختلف قبائلی سماج امتیازی ثقافتی خصوصیات کے حامل ہیں اگرچہ ایک "قبائلی"، نمایاں غیر قبائلی ثقافتوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے تاہم "قبائلی" کے اندر اس کے قبیلے کی ممیز ثقافتی شناخت نمایاں طور پر موجود ہوتی ہے۔ ہر قبیلے کی نسلی و ثقافتی خصوصیات دوسرے قبیلے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تعلیمی منصوبہ سازی میں اس بات کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہر سماج میں بچے کی نشوونما کا عمل بنیادی طور پر اسے سماج سے روشناس کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران بچہ زبان سیکھتا ہے، خصوصاً وہ زبان جو اس کے گھر والے اور آس پاس کے لوگ بولتے ہیں۔ جوں جوں بچے کی دنیا پھیلتی اور بڑی ہوتی ہے اور وہ ماں کی گود سے نکل کر کنبے میں، کنبے سے پاس پڑوس میں اور وہاں سے سماج میں پہنچتا ہے اس کا خزینۂ الفاظ دھیرے دھیرے بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہی الفاظ اس کی بنیادی فرہنگ بن جاتے ہیں۔

ماضی میں زیادہ تر قبائلی سماج، جہاں تک دور دراز کے لوگوں سے ان کے رابطے کا تعلق ہے، بند سماج ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے بیشتر قبائلی سماجوں نے کوئی تحریری زبان نہیں نکالی۔ وہ صرف اپنی بولی یا بول چال کے الفاظ سے کام چلا لیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی ایک الگ قواعد (گرامر) اور لسانی ڈھانچہ ہوا کرتا تھا جس کی کوئی تحریری شکل نہیں تھی۔ سماج میں اٹھنے بیٹھنے اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے لیے جو تعلیم ضروری ہوتی تھی اس کے لیے بہت سے ہندوستانی قبائلی سماجوں نے اپنے اپنے مخصوص ادارے قائم کر رکھے تھے جو چھوٹے لڑکے لڑکیوں اور نوجوانوں کو سماج کا کارآمد رکن بننے کی تربیت دیتے تھے۔ اگر ہم ان اداروں کے فرائض کا جدید تعلیمی اداروں سے مقابلہ کریں تو ہم دیکھیں

چونکہ تعلیم کا ثقافت سے ایک حقیقی رشتہ ہے اس لیے تعلیم کے تئیں ہمارا اندازِ نظر، خصوصاً قبائلی علاقوں میں، لازمی طور پر انسانیاتی ہونا چاہئے۔ تعلیمی عمل میں فرد اور اس کے ماحول کے درمیان تفاعل بہت اہم چیز ہے۔

گے کہ دونوں قسم کے ادارے ایک ہی رول ادا کر رہے ہیں۔ مصنف نے ۱۹۷۰ء میں ان روایتی اداروں کے فرائض کا مفصل تجزیہ کیا تھا اور انھیں اس زمانے کے ماہرین نفسیات کے تحصیل علم کے مختلف نظریوں کی روشنی میں دیکھا تھا۔ مصنف اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان روایتی اداروں میں جو طریقے کام میں لائے جا رہے تھے ان کی ٹھوس نظریاتی بنیادیں تھیں۔ لیکن انھیں باقاعدہ نظریات یا تھیوریوں کی شکل بہت بعد میں دی گئی۔

یہ ادارے خواندگی کو چھوڑ کر باقی تعلیمی فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ چونکہ قبائلی سماج سب سے الگ تھلگ ایک بند سماج ہوا کرتا تھا اس لیے انھوں نے رسم الخط کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ تاہم ان کی اپنی زبان تھی اور وہ گنتی کی صلاحیت بھی

> **ماضی میں زیادہ تر قبائلی سماج، جہاں تک دور دراز کے لوگوں سے ان کے رابطے کا تعلق ہے، بند سماج ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے بیشتر قبائلی سماجوں نے کوئی تحریری زبان نہیں نکالی وہ صرف اپنی بولی یا بول چال کے الفاظ سے کام چلا لیا کرتے تھے۔**

رکھتے تھے۔ قبائلی سماجوں میں جدید تعلیم کے حامیوں نے اپنے ان اداروں کو یکسر مسترد کر دیا کیونکہ یہ لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام نہیں کرتے تھے۔ انھیں مسترد کرتے ہوئے انھوں نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان اداروں اور جدید تعلیمی نظام کا کوئی امتزاج ممکن ہے کہ نہیں۔ تعلیم اچھی یا بری ہوسکتی ہے لیکن اس کی اچھائی اور برائی اور معلم کی اچھائی، دانشمندی اور ذہانت کے درمیان ایک نسبتی تعلق ہوتا ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "اچھا" اور "برا" اور نیکی ایسی اقدار ہیں جن کا تعلق ثقافت سے ہے جو چیز "ہمارے" لیے اچھی یا مستحسن ہوسکتی ہے" ان کے" لیے نہیں ہوسکتی۔

"ہم" اور "وہ" کے اس فرق سے موقف ساری کی سرپرستی ہوئی ہے۔ "ہم" والے اس گروپ نے "ان" کا ترجمان ہونے کی ذمہ داری از خود اپنے اوپر لے لی ہے۔ اور خود کو "ان" کا "نجات دہندہ" اور "ہمدرد" تصور کرنے لگا ہے۔ انھیں اپنے برابر لانے کی خاطر جلدبازی میں اپنا تعلیمی نظام ان پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور ذرا نہیں سوچتے کہ ان کا ثقافتی پس منظر کیا ہے اور ان

کی ضروریات یا مطالبات کیا ہیں۔ اگر مناسب تطبیق کی کوئی مانگ کی جاتی ہے تو وہ اس دلیل سے دبا دی جاتی ہے کہ اگر "ان کی تعلیم" "ہماری تعلیم" سے مختلف ہوگی تو وہ دوئمنر کی بن کر رہ جائے گی۔ متعدد مذاکروں اور مباحثوں میں اس کے حق میں ان ہمدردوں یا اُن قبائلی ترجمانوں کی طرف سے جو خود جدید تعلیم کے عمل سے گذرے ہیں (اور صحیح طور پر گذرے ہیں کیونکہ سوائے اس کے ان کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہ تھا) اور جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدید تعلیم کے دوران وہ اپنی ثقافتی جڑوں سے الگ ہو گئے ہیں، زوردار دلیلیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ رائے اصلی قبائلیوں کی رائے نہیں ہے، جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں کیونکہ یہ ترجمان خودساختہ ترجمان ہیں۔ مصنف نے جو مطالعاتی جائزے لیے ہیں ان میں دونوں طبقوں کے درمیان یہ بات ابھر کر سامنے آئی ہے۔ (۲)

اب خواندگی تعلیمی عمل کا ایک ضروری حصہ بن گئی ہے کیونکہ یہ مواصلات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے بغیر گذارہ نہیں ہے۔ جہاں زبانی رابطہ

> **اب خواندگی تعلیمی عمل کا ایک ضروری حصہ بن گئی ہے کیونکہ یہ مواصلات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے بغیر گذارہ نہیں ہے جہاں زبانی رابطہ ممکن نہیں ہوتا وہاں خواندگی ہی فرد کی مدد کرتی ہے۔**

ممکن نہیں ہوتا وہاں خواندگی ہی فرد کی مدد کرتی ہے۔ آج کے تعلیمی نظام میں کتابیں ہی تصورات و نظریات اور علم کی روشنی دینے والی ہیں جس سے سمجھ بوجھ اور ہنرمندیوں کو جِلا ملتی ہے۔ کسی بھی سماج کے لیے تعلیم ایک اہم اشاریہ تصور کی جاتی ہے۔ چونکہ خواندگی ایک سادہ ترین اور آسانی سے ماپا جا سکنے والا عنصر ہے۔ اس لیے کسی بھی سماج میں خواندگی کے فیصد کو اس کی ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستانی آبادی میں خواندگی کا فیصد ۵۲٫۱۱ ہے۔ مردوں میں یہ ۶۳٫۸۶ اور عورتوں میں ۳۹٫۴۲ ہے۔ درج فہرست قبائل کے ضمن میں یہ اعداد اس طرح ہیں۔ مکمل خواندگی ۲۹٫۶ فیصد۔ خواندہ مرد ۴۰٫۶۵ فیصد اور خواندہ عورتیں ۱۸٫۱۹ فیصد۔ مکمل تعلیم تو دور کی بات ہے عام آبادی کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے بھی قبائلی عوام کی تعلیم کو ایک طویل مسافت طے کرنی ہے۔

ہندوستان کے عوام نے آئین کے آرٹیکل ۴۶ کے تحت کمزور طبقوں کے عوام کے تعلیمی اور اقتصادی مفادات کو عموماً اور درج فہرست قبیلوں اور درج فہرست والوں کے مفادات کو خصوصاً احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔

سرکاری پالیسی کے اس ہدایتی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے متعدد اسکیمیں اور پروگرام شروع کیے گئے ہیں، مثلاً ترغیبات اور مالی امداد فراہم کرنے کی اسکیمیں، آشرم اسکولوں کا قیام، لڑکوں اور لڑکیوں وغیرہ کے لیے ہوسٹلوں کی تعمیر وغیرہ۔ قبائلی فرقوں کے بچوں کی تعلیم پر بھی تعلیمی منصوبہ ساز توجہ دیتے رہے ہیں کیونکہ ایسا کرنا ابتدائی تعلیم کو عام اور ہمہ گیر بنانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ درج فہرست قبائل کی لڑکیوں کی تعلیم کے ضمن میں تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ قبائلی بچوں میں تعلیم کے فروغ کی سست رفتاری و زبوں حالی کی وجوہات کا پتہ لگانے کے لیے کئی تحقیقاتی مطالعے کیے گئے ہیں۔

مصنف نے ۶۵-۱۹۶۳ء میں قبائلی تعلیم پر کافی کام کیا تھا اور درج فہرست قبائل کی تعلیم کے مسئلے کا مفصل جائزہ لیا تھا۔ درج فہرست قبیلوں کے طلبا کی ترقی اور مسائل کا مختلف مصنفین نے بھی ۷۷-۱۹۷۴ء کے دوران اڑیسہ، مدھیہ پردیش، بہار، مغربی بنگال وغیرہ مختلف خطوں میں ہمہ طبقاتی

مطالعات میں جائزہ لیا تھا۔ ان مطالعات سے معلوم ہوا کہ گرچہ قبائلی عوام کی تعلیم کے میدان میں موجودہ بیماری کی اتنی ساری وجوہات کی شناخت کی جا چکی ہے لیکن صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے بہت کم کوششیں کی گئی ہیں۔

آئیے اب ہم ۱۹۶۱ء سے ۱۹۹۳ء کی مدت میں درج فہرست قبائل کے بچوں میں تعلیم کی اشاعت پر توجہ مبذول کریں۔

داخلے

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا اشاریہ اسکولوں میں طلبا کے داخلے ہیں۔ گو یہ اشاریہ ہمیشہ ہی ایک درست اشاریہ نہیں ہو سکتا کیونکہ داخلے نصاب تعلیم کے کامیابی کے ساتھ مکمل کیے جانے کی ضمانت نہیں سمجھے جاسکتے۔ وجہ یہ ہے کہ کافی بچے داخلے کے بعد تعلیم مکمل کیے بغیر ہی اسکول آنا بند کر دیتے ہیں خواہ اس کا سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ شروع شروع میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر تعلیم تک رسائی ممکن بنا دی جائے تو لوگ اس کا فائدہ اٹھائیں گے۔ اس وقت نظریں مغرب کی مثال تھی جہاں یہ توقع کی گئی تھی کہ اقتصادی ترقی "قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے" عوام تک پہنچے گی۔ لیکن یہ مثال نہ تو اقتصادی ترقی کے شعبے میں کامیاب ثابت ہوئی ہے نہ ہی تعلیمی ترقی کے شعبے میں۔

اگر ۶۱-۱۹۶۰ء اور ۸۹-۱۹۸۸ء کے اسکولی داخلوں کو شمار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ داخلوں کی تعداد میں اس مدت میں بہت ہی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ ان تمام سالوں میں سرکاری منصوبہ بندی کا منشا تعلیم تک لوگوں کی رسائی کو بڑھانا رہا ہے۔ اسی لیے تقریباً تمام گاؤوں میں اسکول کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں (پانچواں کل ہند تعلیمی سروے) اور بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کی مہمات پر زور دیا گیا ہے۔ خیال یہ تھا کہ جب تعلیمی سہولیات میسر ہوں گی تو لوگ ان کا فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں گے۔

داخلوں کا تناسب

اشاعت تعلیم کا ایک اور اشاریہ داخلوں کا تناسب یا انرولمینٹ ریشیو (ای آر) ہے جو درج ذیل فارمولے سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

ای آر = اسکولوں میں داخل ہونے والے ایک مخصوص زمرۂ عمر کے بچوں کی تعداد
—————————— × ۱۰۰
اُس مخصوص زمرۂ عمر کے کل بچوں کی تعداد

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انرولمینٹ ریشیو اکثر ۱۰۰ سے زیادہ ہوتی ہے جو شماریاتی اعتبار سے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد میں وہ بچے بھی شامل ہوتے ہیں جو مخصوص زمرۂ عمر سے باہر ہوتے ہیں یعنی پہلی سے پانچویں جماعت کے ضمن میں چھ سال سے کم اور گیارہ سال سے زیادہ اور چھٹی سے آٹھویں جماعت کے ضمن میں گیارہ سال سے کم اور ۱۴ سال سے زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے انرولمینٹ ریشیو سو سے زیادہ نکلتی ہے۔

بہرکیف اگر انرولمینٹ ریشیو (داخلوں کے تناسب) ہی کو اشاریہ سمجھا جائے تو بھی اس وقت تک عظیم ترقی ہو جانی چاہئے تھی۔ انرولمینٹ ریشیو پر ایک نظر ڈالنے سے ہمارے ذہن میں یہی خیال پیدا ہوگا۔ لیکن کاش یہ اشاریہ ایک درست اشاریہ ہوتا لیکن بدقسمتی سے یہ ہے نہیں۔ ذیل کے گوشوارے میں سال ۸۹-۱۹۸۸ء کی انرولمینٹ ریشیو داخلوں کا تناسب دیا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

ابتدائی سطح پر اسکولوں میں درج فہرست قبائل کے طلبا کے داخلوں کا تناسب

ریاست/مرکزی انتظام کا علاقہ	پہلی تا پانچویں جماعت (۶ تا ۱۱ سال)			چھٹی تا آٹھویں جماعت (۱۱ تا ۱۴ سال)		
ریاست/مرکزی انتظام کا علاقہ	لڑکے ۲	لڑکیاں ۳	کل ۴	لڑکے ۵	لڑکیاں ۶	کل ۷
آندھرا پردیش	۱۴۶٫۲۹	۹۰٫۱۸	۱۱۸٫۵۲	۴۳٫۷۸	۱۹٫۲۲	۳۱٫۵۸
اروناچل پردیش	۱۲۲٫۲۲	۸۵٫۷۶	۱۰۴٫۰۶	۵۰٫۸۲	۲۸٫۴۵	۳۹٫۷۷
آسام	۱۴۷٫۳۰	۱۲۶٫۶۰	۱۳۷٫۲۶	۵۹٫۷۸	۴۶٫۷۹	۵۳٫۵۲
بہار	۱۹٫۱۱	۵۵٫۷۳	۸۲٫۷۸	۴۰٫۵۳	۱۵٫۴۱	۲۸٫۰۴
گوا	۲۸٫۷۳	۱۷٫۱۳	۲۲٫۹۴	۱۹٫۸۹	۱۳٫۵۴	۱۶٫۷۵
گجرات	۱۳۸٫۰۵	۷۹٫۶۵	۱۱۸٫۲۶	۵۳٫۰۴	۲۸٫۳	۴۰٫۹۵
ہریانہ	-	-	-	-	-	-
ہماچل پردیش	۱۰۹٫۱۸	۷۴٫۸۹	۹۲٫۱۶	۸۶٫۱۵	۴۵٫۵۶	۶۶٫۱۵
جموں وکشمیر	-	-	-	-	-	-

کرناٹک	۸۴٫۷۲	۶۲٫۱۳	۷۳٫۶۳	۳۷٫۸۲	۲۲٫۴۶	۳۰٫۱۹
کیرالہ	۱۲۹٫۱۳	۱۲۳٫۶۹	۱۲۶٫۳۵	۸۱٫۷۵	۷۶٫۵۰	۷۹٫۱۵
مدھیہ پردیش	۱۱۶٫۰۹	۵۳٫۱۸	۸۵٫۶۸	۴۱٫۶۲	۱۲٫۵۱	۲۷٫۴
منی پور	۱۶۹٫۴۲	۱۴۳٫۹۳	۱۵۶٫۸۴	۵۶٫۴۴	۴۵٫۵۳	۵۱٫۰۳
مہاراشٹر	۱۳۵٫۹۴	۹۹٫۲۶	۱۱۸٫۱۰	۵۰٫۸۹	۲۸٫۵۰	۳۹٫۹۵
میگھالیہ	۱۱۷٫۲۸	۱۱۰٫۲۰	۱۱۳٫۷۳	۶۳٫۴۷	۵۷٫۷۹	۶۰٫۶۸
میزورم	۱۵۰٫۱۱	۱۴۲٫۹۹	۱۴۶٫۶۴	۷۷٫۶۵	۷۷٫۶۷	۷۷٫۶۶
ناگالینڈ	۱۲٫۹۱	۱۳۶٫۰۳	۷۳٫۴۶	۶۵٫۶۴	۵۸٫۵۱	۶۲٫۱۶
اڑیسہ	۱۲۸٫۸۹	۶۲٫۶۷	۹۶٫۳۵	۳۸٫۸۴	۱۵٫۱۳	۲۷٫۱۰
پنجاب	-	-	-	-	-	-
راجستھان	۱۰۶٫۶۲	۳۲٫۳۵	۷۶٫۶۰	۶۱٫۰۷	۵٫۰۳	۲۸٫۸۱
سکم	۱۱۳٫۹۸	۹۹٫۲۷	۱۰۶٫۷۵	۴۸٫۴۱	۴۹٫۸۶	۴۹٫۱۱
تامل ناڈو	۱۰۷٫۷۵	۸۴٫۱	۹۶٫۱۸	۶۲٫۰۳	۳۵٫۰۰	۴۴٫۱۰
اتر پردیش	۱۰۹٫۸۸	۷۲٫۱۵	۹۲٫۷	۴۷٫۸۶	۱۶٫۶۴	۳۳٫۲۰
مغربی بنگال	۱۶۳٫۴۹	۶۶٫۸۴	۱۱۰٫۶۴	۳۷٫۱۷	۱۲٫۸۳	۲۵٫۰۲
جزائر انڈمان و نکوبار	۸۲٫۲۹	۷۰٫۴۶	۷۶٫۳۱	۷۵٫۲۱	۶۶٫۰۸	۷۰٫۸۲
چنڈی گڑھ	-	-	-	-		-
دادر نگر حویلی	۱۱۳٫۴۹	۷۹٫۷۸	۹۷٫۴۶	۴۹٫۰۶	۲۵٫۵۱	۳۷٫۵۴
دمن اور دیو	-	-	-	-	-	-
دہلی	-	-	-	-	-	-
لکش دیپ	۱۷۵٫۵۰	۱۶۱٫۲۲	۱۶۸٫۴۹	۱۲۷٫۸	۹۲٫۷۴	۱۰۹٫۹۱
پانڈیچری	-	-	-	-	-	-
ہندوستان	۱۲۶٫۲۳	۷۶٫۰۰	۱۰۱٫۷۹	۴۷٫۹۰	۲۲٫۷۳	۳۵٫۶۵

* کل ہند تعلیمی اعداد و شمار ۱۹۸۸ء ـــــ انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت، حکومت ہند

بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والے بچے

اسکولی داخلے یا انرولمینٹ ریشیو درج فہرست قبائل سمیت کسی بھی ہندوستانی طبقے میں تعلیم کی صورتحال کی صحیح عکاسی نہیں کرتے۔ دراصل پہلی سے ۵ ویں جماعت تک بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے خصوصاً درج فہرست قبائل میں۔ درج فہرست قبائل کے ضمن میں ہمیں پہلی جماعت سے ۵ ویں اور ۵ ویں سے آٹھویں جماعت تک سلسلہ وار ایک جماعت پاس کرکے دوسری جماعت میں پہنچنے والے بچوں کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں تاہم عام آبادی جس میں درج فہرست قبائل بھی شامل ہیں، کے اعداد و شمار بھی زیادہ اچھے نہیں ہیں۔

اگلے صفحہ کے گوشوارے میں ہندوستان کی عام آبادی کے اعداد و شمار درج ہیں۔

بقیہ: فاصلہ مبنی تعلیم کے ذریعے چیلنجوں کا مقابلہ

۴۔ یہ سسٹم تعلیم کو عام طور پر کم ترچ بناتا ہے۔ بہرکیف یہ بات بھرتی کی تعداد اور طلباء کو فراہم کی جانے والی سروس پر منحصر ہوتی ہے۔

۵۔ یہ سسٹم روایتی سسٹم کے تحت بھرتی کی مانگ کو جزوی طور پر پورا کرتا جا رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ آٹھویں پلان کے دوران زائد بھرتی کا تقریباً ۴ فیصد فاصلہ مبنی تعلیم کے سسٹم میں شامل ہو سکے گا۔

۶۔ اندازہ ہے کہ آٹھویں پلان کے اختتام تک فاصلہ مبنی تعلیم کا سسٹم اعلیٰ تعلیم کے لیے ہونے والی مجموعی بھرتی کے ۱۶٫۵ فیصد کو اپنے یہاں جگہ دے سکے گا۔

بقیہ: اکیسویں صدی میں تعلیم

ہیں یہ بین الاقوامی کمیشن قائم کرکے جو قدم اٹھایا ہے وہ اسی صورت میں بامعنی ہو سکتا ہے اگر ہم آئندہ دو برسوں میں ایک رپورٹ اور ایک منصوبہ عمل تیار کر سکیں جو سب کو منظور ہو اور اس کے بعد موجودہ صدی کے اختتام سے پہلے پہلے اس پر عمل درآمد شروع کریں۔ ہم تقدیر کے چوراہے پر کھڑے ہیں ہمیں مقابلے کا نہیں بلکہ ایک دوسرے کی مدد کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے وہ راستہ جو تصادم کا نہیں ہم آہنگی کا ہو سب کے مفاد کا ہو ذاتی عیش کا نہیں۔ آخر میں قطعی تجزیہ یہ ہے کہ یہ کام صرف تعلیم سے ہی ہو سکتا ہے۔ ●

گوشوارہ نمبر ۲
دوسری سے آٹھویں جماعت میں ہونے والے داخلوں کا
پہلی جماعت میں ہوئے داخلوں کے ساتھ فیصد تناسب

ریاست / مرکزی انتظام کا علاقہ	جماعت							
	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
آندھرا پردیش	۱۰۰٫۰۰	۶۴٫۹۳	۵۳٫۴۱	۴۲٫۸۱	۲۵٫۲۷	۲۴٫۹۸	۱۵٫۸۸	-
اروناچل پردیش	۱۰۰٫۰۰	۵۹٫۷۰	۴۶٫۹۲	۳۶٫۵۶	۳۰٫۱۸	۲۱٫۴۲	۱۶٫۱۶	۱۶٫۰۹
آسام	۱۰۰٫۰	۵۵٫۸۲	۴۷٫۴	۳۶٫۸۵	۳۴٫۰۹	۳۱٫۸۹	۲۷٫۱۲	۲۱٫۳۵
بہار	۱۰۰٫۰	۵۹٫۵۰	۴۸٫۰۷	۴۰٫۴۲	۳۴٫۴۷	۲۷٫۰۹	۲۳٫۰۳	۱۹٫۸۲
گوا	۱۰۰٫۰۰	۸۸٫۵۸	۹۸٫۱۳	۹۴٫۳۸	۹۵٫۴۴	۹۵٫۹۵	۷۶٫۹۵	۸۲٫۰۸
گجرات	۱۰۰٫۰۰	۷۳٫۰۴	۶۹٫۴۸	۵۷٫۳۵	۵۰٫۶۱	۴۱٫۲۹	۳۴٫۸۲	۳۰٫۰۳
ہریانہ	۱۰۰٫۰۰	۹۱٫۹۴	۸۷٫۶۱	۷۷٫۱۳	۶۸٫۵۲	۶۵٫۳۷	۵۴٫۹۷	۵۳٫۱۲
ہماچل پردیش	۱۰۰٫۰۰	۸۱٫۲۴	۷۴٫۹۲	۷۴٫۱۷	۶۷٫۰۶	۶۷٫۱۲	۵۷٫۵۹	۹۱٫۴۹
جموں وکشمیر	۱۰۰٫۰۰	۸۰٫۲۸	۷۴٫۱۹	۶۷٫۴۱	۶۴٫۵۹	۶۰٫۹۴	۵۳٫۲۱	۴۸٫۷۷
کرناٹک	۱۰۰٫۰۰	۷۷٫۹۹	۶۹٫۲۶	۵۷٫۸۵	۴۷٫۵۰	۳۹٫۶۰	۳۳٫۸۳	۲۸٫۷۴
کیرالہ	۱۰۰٫۰۰	۸۹٫۹۷	۹۱٫۱۵	۷۷٫۰۵	۶۴٫۱۴	۴۶٫۸۸	۳۵٫۸۹	۳۶٫۷۰
مدھیہ پردیش	۱۰۰٫۰	۸۹٫۹۷	۹۱٫۱۵	۷۷٫۰۶	۶۴٫۱۴	۴۶٫۸۸	۳۵٫۸۹	۳۶٫۷۰
مہاراشٹر	۱۰۰٫۰۰	۷۷٫۳۲	۷۱٫۷۰	۵۸٫۸۴	۵۷٫۰	۴۹٫۷۳	۴۸٫۰۴	۴۲٫۲۶
منی پور	۱۰۰	۷۹٫۴۴	۶۸٫۸۰	۶۲٫۵۸	۵۷٫۰۰	۴۹٫۷۳	۴۸٫۰۴	۴۲٫۲۶
میگھالیہ	۱۰۰٫۰۰	۳۸٫۵۱	۳۱٫۹۶	۲۶٫۷۱	۲۱٫۸۳	۲۱٫۵۴	۱۸٫۵۶	۱۶٫۰۲
میزورم	۱۰۰٫۰۰	۴۲٫۴۲	۴۵٫۳۹	۳۶٫۴۴	۳۴٫۴۹	۲۹٫۶۹	۲۶٫۱۵	۱۶٫۸۱
ناگالینڈ	۱۰۰٫۰۰	۶۱٫۴۶	۵۰٫۶۳	۴۰٫۸۸	۳۹٫۹۵	۲۵٫۳۵	۲۲٫۶۱	۱۶٫۹۰
اڑیسہ	۱۰۰	۸۰٫۱۵	۷۴٫۶۰	۵۶٫۴۸	۴۷٫۱۰	۳۸٫۱۵	۳۱٫۰۱	۲۷٫۹۲
پنجاب	۱۰۰٫۰۰	۱۰۲٫۳۱	۹۰٫۰۶	۸۱٫۴۸	۶۵٫۱۵	۶۳٫۸۲	۵۴٫۸۱	۴۸٫۸۲
راجستھان	۱۰۰٫۰۰	۴۷٫۶۱	۳۵٫۳۸	۳۳٫۲۵	۲۷٫۵۵	۲۷٫۱۹	۰٫۸۷	۱۸٫۵۰
سکم	۱۰۰٫۰۰	۵۸٫۹۷	۵۱٫۸۱	۳۷٫۷۴	۳۴٫۲۶	۲۴٫۰۱	۰۱٫۳۷	۲۲٫۸۱
تامل ناڈو	۱۰۰٫۰۰	۸۸٫۵۳	۸۰٫۱۲	۸۰٫۹۵	۶۷٫۷۹	۵۹٫۵۰	۲۹٫۳۲	۴۳٫۳۱
تریپورہ	۱۰۰٫۰۰	۵۶٫۸۵	۵۶٫۲۸	۴۷٫۹۰	۳۹٫۱۶	۳۶٫۳۳	۲۹٫۳۲	۲۴٫۰۸
اتر پردیش	۱۰۰٫۰۰	۹۰٫۴۴	۸۵٫۲۷	۷۱٫۱۸	۵۸٫۵۷	۵۲٫۴۹	۴۷٫۳۲	۴۳٫۳۱
مغربی بنگال	۱۰۰٫۰۰	۵۶٫۳۴	۴۷٫۷۷	۴۰٫۲۵	۳۸٫۱۵	۲۹٫۷۳	۲۷٫۸۲	۲۱٫۹۰
جزائر انڈمان ونکوبار	۱۰۰٫۰۰	۹۶٫۱۳	۸۹٫۶۸	۸۹٫۱۲	۸۳٫۱۳	۸۳٫۱۱	۶۵٫۳۲	۵۶٫۳۵
چنڈی گڈھ	۱۰۰٫۰۰	۷۹٫۹۵	۷۵٫۸۰	۷۲٫۷۴	۷۴٫۳۶	۷۴٫۲۲	۶۸٫۸۸	۶۵٫۷۳
دادر اور نگر حویلی	۱۰۰٫۰۰	۸۱٫۹۳	۸۲٫۷۶	۷۱٫۱۳	۵۳٫۵۱	۳۵٫۶۶	۳۶٫۶۳	۲۴٫۹۴
دمن اور دیو	۱۰۰٫۰۰	۹۵٫۸۲	۱۱۴٫۹۸	۱۲۳٫۴۵	۱۰۵٫۹۷	۸۲٫۴۰	۶۷٫۹۶	۷۱٫۴۹
دہلی	۱۰۰٫۰۰	۹۲٫۵۸	۸۳٫۱۰	۷۷٫۵۱	۷۰٫۵۱	۷۹٫۵۶	۷۲٫۰۰	۶۴٫۳۷
لکش دیپ	۱۰۰٫۰۰	۸۲٫۰۱	۷۶٫۷۴	۸۵٫۰۰	۷۱٫۷۷	۵۸٫۳۹	۴۸٫۳۰	۴۶٫۰۷
پانڈیچری	۱۰۰٫۰۰	۹۲٫۷۳	۹۵٫۱۵	۹۲٫۰۴	۸۳٫۲۱	۷۷٫۵۸	۷۱٫۶۱	۶۵٫۴۴
ہندوستان	۱۰۰٫۰۰	۷۳٫۴۱	۶۵٫۹۵	۵۶٫۴۶	۴۹٫۲۸	۴۱٫۴۰	۳۱٫۵۲	۳۱٫۱۱

ذریعہ: پانچواں کل ہند تعلیمی سروے: منتخب اعداد و شمار این سی ای آر ٹی

اگر ہندوستان کی مجموعی آبادی میں پہلی جماعت میں داخلہ لینے والے بچوں میں سے نصف میں سے کچھ زیادہ تعداد ہی پانچویں جماعت تک پہنچتی ہے تو قبائلی آبادی میں تو یہ تعداد اور بھی کم ہو گی۔ پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کی تعداد اور پاس ہو کر دوسری جماعت میں پہنچنے والے بچوں کی تعداد کا موازنہ کرنے سے ہمیں اس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلی جماعت میں ہی کتنے بچے اسکول جانا بند کر دیتے ہیں۔

اس طرح یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ اسکولوں میں داخلے کی سہولیات میسر ہونے پر ابتدائی تعلیم عام ہو جائے گی۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد اس وقت اور زیادہ ہوتی ہے جب وہ دس سال کے ہو جاتے ہیں کیونکہ اس وقت گھر یا کھیت میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ یہ بات درج فہرست قبائل میں اور بھی زیادہ درست پائی گئی ہے۔

وجوہات

درج فہرست قبائل کے بچوں کو ان کے والدین کنبے کا اقتصادی اثاثہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بڑی عمر کے لڑکے یا لڑکی کو اسکول بھیجنے سے ان کی اقتصادیات پر اثر پڑے گا اور اولاد کے بڑا ہو کر روزی کمانے اور کام کاج میں ہاتھ بٹانے کی روایت ٹوٹ جائے گی۔ لڑکیاں گھر میں اپنی ماؤں کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور فصل کی بوائی اور کٹائی کے دنوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔

ابھی تک بچوں کو ان کی مادری زبان یعنی قبائلی بولیوں میں تعلیم دینے کی سمت میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، معلم بھی باہر کے ہوتے ہیں جو بچوں کی مادری زبان نہیں جانتے، کتابیں باہر کے ماحول اور غیر مقامی پس منظر میں لکھی جاتی ہیں بلکہ وہ دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں۔

وہ جنگل سے لکڑیاں اور دوسری چیزیں اکٹھا کر کے لاتے ہیں، گائیں اور بھیڑ بکریاں چراتے ہیں، فصل کی رکھوالی کرتے ہیں، پانی بھر کر لاتے ہیں، مچھلیاں پکڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

والدین کے لیے اسکولوں سے اپنے بچوں کو اٹھا لینے کی ایک اور وجہ اسکول کے پروگراموں کا ان کی سہولت کے مطابق نہ ہونا ہے۔

یہ وجوہات آج بھی جوں کی توں برقرار ہیں۔ ابھی تک بچوں کو ان کی مادری زبان یعنی قبائلی بولیوں میں تعلیم دینے کی سمت میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، معلم بھی باہر کے ہوتے ہیں جو بچوں کی مادری زبان نہیں جانتے، کتابیں باہر کے ماحول اور غیر مقامی پس منظر میں لکھی جاتی ہیں بلکہ وہ دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں۔ قبائلیوں کی تمام بول چال کے الفاظ کی کوئی فرہنگ تیار نہیں کی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان علمی سوالات کو سائنٹی فک انداز میں حل کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ اور باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ قبائلی بچوں کو دی جانے والی تعلیم ان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ چونکہ تعلیم سماجی نظام کا موضوع ہے اس لیے اسے متعلقہ سماج کے مطالبات کو پورا کرنا ہو گا۔ جیسا کہ ہوا کرتا ہے، غالب سماج کسی نہ کسی طرح قبائلی سماج پر اپنا اثر ڈالتا ہے اور اس عمل کے دوران کافی زیادہ عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے جس سے سماجی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ثقافتی قدروں کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو علیحدگی پسندانہ مطالبات کو جنم دیتے ہیں۔ جدید تعلیم کا ڈیلیوری سسٹم بھی ایسا نہیں ہے جو قبائلی سماجوں کے مطالبات کو پورا کرتا ہو جب کہ ان سماجوں میں اقتصادی اور سماجی ضرورتوں کو تعلیمی ضرورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان قبائلی اور غیر قبائلی تعصب اپنا کام کرتا رہتا ہے اور دونوں کے بیچ فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ جدید تعلیم تیزی سے قبائلی عوام کا طرز زندگی ہی نہیں ان کا طرز فکر بھی بدل رہی ہے۔

مواصلاتی نظام کی توسیع اور قبائلی علاقوں کے اندر سڑکوں کی تعمیر، ٹرانسپورٹ کے انتظام اور ترقی یافتہ ٹکنالوجی (جنھیں اکثر تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے) کے ساتھ ساتھ اقدار دو حصوں میں منقسم ہو رہی ہیں ایک وہ جو پہلے سے عزیز ہیں اور دوسری وہ جنھیں اب پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جسے الٹا نہیں جا سکتا کیونکہ اب تک جو قبائلی سماج سب سے الگ تھلگ تھے اب ان کی ثقافتوں پر سبھی اطراف سے حملہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک سماجی ضرورت ہے کہ ان سماجوں کو بھی ملک میں ہونے والی ترقی سے فائدہ پہنچے۔ چونکہ غالب اور سربرآوردہ سماج اِن سماجوں کے تعلیمی نظام کو اختیار نہیں کر سکتا اس لیے وہ اپنا تعلیمی نظام ان پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے تعلیمی نظام کے مطابق ان کی ضرورتوں میں کاٹ چھانٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے بجائے اس کے کہ تعلیمی نظام کو ان کی ضرورتوں کے مطابق بنائے۔

قبائلی سماجوں کی ضرورتیں گوناگوں اور سیال نوعیت کی ہیں۔ وہ متفقہ طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ضرورت کیا ہے۔

قبائلی عوام سے "منسوب کی گئی ضرورتوں" اور ان کی "محسوس کردہ ضرورتوں" میں اکثر فرق ہوتا ہے، لیکن ان کے ایک دوسرے کے مقابل رکھے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ قبائلی عوام کو اپنی محسوس کردہ ضرورتوں کو بیان یا پورا کرنے کے مواقع میسر نہیں ہوتے۔ اور جنھیں یہ مواقع میسر آتے ہیں وہ تیسرے فریق ہوتے ہیں جو ان کے نمائندے یا ترجمان ہونے کی ذمہ داری

اپنے اوپر لیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ برگزیدہ قبائلی، جو اپنے روایتی سماجوں کی ثقافتی جڑوں سے دور ہو چکے ہیں اور جنھیں ان کے قبیلے کے لوگ "بھٹکا ہوا" سمجھتے ہیں، ان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قبائلی علاقوں میں اسکولوں اور قبائلی سماج کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ معلم ان کی قبائلی ثقافت اور اقدار کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔

مواصلات کے نظام کی توسیع اور قبائلی علاقوں کے اندر سڑکوں کی تعمیر، ٹرانسپورٹ کے انتظام اور ترقی یافتہ ٹکنالوجی (جنھیں اکثر تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے) کے ساتھ ساتھ اقدار دو حصوں میں منقسم ہو رہی ہیں ایک وہ جو پہلے سے عزیز ہیں اور دوسری وہ جنھیں اب پیدا کرنا مقصود ہے۔

(۳)

بہت سے حلقوں میں اس بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے کہ علیحدہ قسموں کی تعلیم سے نابرابری پیدا ہوتی ہے اور تعلیم کی ان علیحدہ قسموں کے اول یا دوسرے درجے کی تعلیم قرار دیے جانے کا احتمال ہے۔ اس طرح کی دلیل ایسے لوگوں کی طرف سے دی جاتی ہے جو تعلیم کے بنیادی اغراض و مقاصد کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ تعلیم کا مقصد بچے میں ایسی شخصیت کی نشو و نما کرنا اور علم کی روشنی سے اس کے اندر ایسی سمجھ بوجھ، ہنرمندی، عادات و اطوار، رجحانات اور اقدار پیدا کرنا ہے جو اس کی اپنی ثقافت سے مطابقت رکھتی ہوں۔ پس ظاہر ہے کہ ایک ثقافت کا نظام تعلیم دوسری ثقافت پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ اسے دوسری ثقافت میں رائج کرنے سے پہلے دوسری ثقافت کی ضرورتوں اور مانگوں کے مطابق بنانا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو سماجی عدم توازن کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

آیئے فی الحال ہم اپنی بحث کو قبائلی بچوں کی پرائمری تعلیم تک ہی محدود رکھیں۔ یہ توقع کرتے ہوئے کہ تعلیم سے حاصل ہونے والے بڑے فائدے وہی رہیں گے۔ نصاب تعلیم ہر قبیلے کی ضرورتوں کے مطابق اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی ثقافت اور ماحول سے مطابقت رکھتا ہو۔ ایک بڑا مسئلہ جس کا معلم کو قبائلی علاقوں میں سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ہے کہ تعلیم دینے کے لیے کون سی ایسی چیزیں تیار کی جائیں جن کی تعلیمی افادیت وہی ہو جو دوسری جگہوں پر استعمال کی جانے والی چیزوں کی ہے اور تعلیم کے مقابلے میں قبائلی بچے دوسری جگہوں کے بچوں کے برابر ہو سکیں۔ اس سے پہلے کہ ہم پرائمری سطح کی تعلیم کی جزئیات پر غور کریں یہ نامناسب نہ ہوگا کہ ہم اس تعلیم کے اغراض و مقاصد پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ حکومت ہند نے ۱۹۹۱ء میں "علم کی کم از کم سطحیں" کے عنوان سے ایک دستاویز شائع کی تھی۔ اس میں تعلیم کی جو کم از کم سطحیں بیان کی گئی ہیں وہ بڑی حد تک وہی ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ یہاں پہلے کی سطحوں اور مذکورہ دستاویز میں بیان کی گئی سطحوں کے درمیان فرق بتانے کی ضرورت نہیں ہے محض اتنا کہنا کافی ہوگا کہ تعلیم کی کم از کم سطح تک پہنچتے پہنچتے تعلیمی مقاصد کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ مذکورہ دستاویز کے مطابق پرائمری کی سطح پر زبان سکھانے کا بڑا مقصد بچہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ

— بات کو سن اور سمجھ سکے،
— رسمی اور غیر رسمی موقعوں پر اچھی طرح سے بول سکے،
— کتاب کو سمجھتے ہوئے پڑھ سکے اور مختلف قسموں کے تعلیمی مواد کو پڑھنے میں دلچسپی لے،
— ترتیب کے ساتھ صاف صاف لکھ سکے اور اسے پڑھ سکے،
— پڑھنے لکھنے میں گرامر کا صحیح استعمال کر سکے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے تعلیمی مواد اور اشیا ایک ایسی زبان میں تیار کی جائیں جو قبیلے کی مخصوص ضرورتوں کے مطابق ہو۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تعلیمی مواد دو زبانوں میں اور کئی زبانوں میں تیار کرنے کی ضرورت ہو سکتی ہے لہٰذا اس بات کا پتہ لگانا ضروری ہوگا کہ یہ لوگ کن باتوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ بچوں میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے یا اس صلاحیت کو بڑھانے کے لیے ایک خاص زمرہ عمر کے بچوں کے ذریعے استعمال کیے جانے والے الفاظ کی ایک فرہنگ مرتب کرنی ہوگی۔ یہ

بہت سے حلقوں میں اس بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے کہ علیحدہ قسموں کی تعلیم سے نابرابری پیدا ہوتی ہے اور تعلیم کی ان علیحدہ قسموں کے اول یا دوسرے درجے کی تعلیم قرار دیے جانے کا احتمال ہے۔ اس طرح کی دلیل ایسے لوگوں کی طرف سے دی جاتی ہے جو تعلیم کے بنیادی اغراض و مقاصد کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔

فرہنگ دو زبانوں میں مرتب کرنی ہوگی۔ ایک تو مادری زبان میں اور دوسری اس زبان میں جس کا استعمال قبیلے کے لوگ گرد و نواح کے دوسرے فرقوں سے رابطے کے لیے کرتے ہیں۔ یہ فرہنگیں ہی ہمیں نصابی کتابیں تیار کرنے کے لیے صحیح بنیاد فراہم کریں گی۔ میں ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا کہ نہ صرف مستعمل الفاظ کی فہرست یا فرہنگ مرتب

نا ضروری ہوگا بلکہ اسی قدر اہم کام مقامی لوک کہانیاں، لوک گیت، قصے اور داستانیں اور میلوں اور تہواروں کی تفصیلات جمع کرنا ہوگا۔ میں نصابی کتب کے اسباق انہی کی بنیاد پر تیار کرنے ہوں گے۔

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ہند کی دستاویز میں بیان کیے گئے مقاصد ایسی صورت حال میں حاصل کیے جاسکتے ہیں جب ہم نئے سرے سے نصابات قبائلی ضرورتوں کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کریں اور ایک مختلف سماج کے لیے لکھی اور لکھی گئی کتابوں سے نقل یا ترجمہ نہ کریں۔

اب آئیے پرائمری کی سطح پر ریاضی کے علم کے لیے حکومت ہند کی دستاویز میں مقرر کی گئی کم از کم سطحوں پر بھی ایک نظر ڈالیں۔

پرائمری کی سطح پر ریاضی کی تعلیم کا مقصد بچوں کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ

— تیزی اور درستی کے ساتھ حساب لگاسکیں۔
— ریاضی کی اصطلاحات اور علامات کا استعمال کرسکیں اور اشکال بناسکیں۔
— ماپ تول کا ایک معقول اندازہ لگاسکیں۔
— روزمرہ کی زندگی میں علم ریاضی کے اصولوں کا استعمال کرسکیں اور سیدھے سادے سوال حل کرسکیں۔
— منطقی انداز میں سوچ سکیں۔
— ترتیب اور ساخت کو پہچان سکیں۔

قابلیت

حکومت ہند کی دستاویز میں ہر جماعت کے لیے ریاضی کے اصول و قواعد بالترتیب بیاں نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں ریاضی کی قابلیت کے ۵ زمروں میں رکھا گیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

(۱) اعداد اور ہندسوں کو سمجھنے کی صلاحیت
(۲) پورے اعداد کو جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کرنے کی صلاحیت۔
(۳) زر کی اکائیوں، لمبائی، چوڑائی، وزن اور وقت سے متعلق روزمرہ کے سوالوں کو حل کرنے کی قابلیت
(۴) اعشاریہ اور فیصد تناسب کا استعمال کرنے کی صلاحیت۔
(۵) علم ہندسہ (جیومیٹری) کے اشکال اور فضائی و مکانی رشتوں کو سمجھنے کی صلاحیت۔

آئیے دیکھیں کہ بچہ جب سماج میں دھیرے دھیرے بڑا ہوتا ہے تو اس میں ریاضی کی کیسی بشارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور کھیل کود میں اعداد کی سمجھ بوجھ کا کیا استعمال کرتا ہے۔ اگر ہم ایک قبائلی بچے کی روزمرہ کی زندگی کو غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اسے پورے اعداد کا علم ہے اور بسا اوقات وہ اعشاریہ کے بجائے کوئی اور طریقہ استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض قبائلی سماجوں میں وہ ۵ کی اکائی یا پنجی سے گنتے ہیں اور ایک روشن دماغ ریاضی داں کے نزدیک ایک ایسا طریقہ ہے جس میں ۵ کی اکائی

ایک بڑا مسئلہ جس کا معلم کو قبائلی علاقوں میں سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ہے کہ تعلیم دینے کے لیے کونسی ایسی چیزیں تیار کی جائیں جن کی تعلیمی افادیت تو ہو جو دوسری جگہوں پر استعمال کی جانے والی چیزوں کی ہے اور تعلیم کے معاملے میں قبائلی بچے دوسری جگہوں کے بچوں کے برابر ہوسکیں۔

سے گنا جاتا ہے۔ کچھ اور سماجوں میں بیسی سے گنتی کی جاتی ہے۔ یہ بھی بیس کی اکائی پر مبنی گنتی کا طریقہ ہے۔ اس طرح قبائل میں حساب لگانے کے کئی طریقے رائج ہیں جس کے بنیادی اصول اتنے ہی کھرے ہیں جتنے کہ ہمارے۔ کیا ہمیں اس بات پر زور دینا چاہئے کہ وہ شروع سے ہمارا ہی طریقہ سیکھیں؟ کیا ہمارے لیے کوئی ایسا طریقہ نکالنا ممکن ہے جس سے وہ اپنا طریقہ مستقلاً استعمال کریں اور بعد میں کسی مرحلے پر اس میں اعشاریہ کی منطق بھی شامل کردی جائے؟ ہماری ریاضی کی تاریخ میں زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب ہم نے دو کی بنیاد پر جوڑوں سے گنتی کا طریقہ شروع کیا تھا لیکن ہمیں اس کو چھوڑ دینا پڑا کیونکہ ہم اسے نئے سسٹم میں نہیں ڈھال سکے۔ اسی طرح کی دقت ایک قبائلی بچے کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ پنجی یا بیسی کے بجائے دستی سے گننا شروع کرتا ہے۔ ہم کیا کریں جس سے وہ اپنے طریقے کے ساتھ بڑا ہو اور پھر ہم کچھ عرصہ بعد اسے عشری نظام پر لے آئیں؟ یہ چند سوالات ہیں جن پر متعلقہ قبیلے کے ثقافتی پس منظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آئیے اب ماحولیاتی مطالعات کی بات کریں۔ علم کی کم از کم سطحوں سے متعلق دستاویز میں شاگردوں میں دس بڑی صلاحیتیں پیدا کرنے کو کہا گیا ہے جس سے کہ وہ

(۱) سماجی اور قدرتی ماحول میں اپنی بہبود و بہتری کے متعلق آگاہی حاصل کرسکے۔
(۲) سماجی اور شہری ماحول کے اہم پہلوؤں کو دیکھ سکے اور ان کی کارفرمائی کو سمجھ سکے۔
(۳) مختلف لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر "کام کی دنیا" کی اہمیت سمجھ سکے۔
(۴) انساں اور اس کے ماحول کے باہمی رشتے اور فضا کی اہمیت کو سمجھ سکے اور ان کی تشریح کرسکے۔
(۵) انساں کے ماضی اور حال کے درمیان رشتے کو دیکھنا شروع کرے اور ماضی کو اس کے صحیح تناظر میں رکھے۔
(۶) سیدھے سادے اور آسانی سے دیکھے جاسکنے والے سماجی و اقتصادی حالات اور مسائل کو سمجھے، ان کا تجزیہ کرے اور اپنے تجربے کے مطابق ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے۔
(۷) اچھی صحت کی برقراری میں معاون عناصر کو سمجھے۔
(۸) اپنے ماحول کی جاندار چیزوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرکے اس کی

زمرہ بندی کرے اور ان سے سادہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرے۔

(۹) غیر جاندار اشیاء کی کچھ مشترکہ خصوصیات کا مشاہدہ و تجزیہ کرے۔

(۱۰) زمین اور آسمان سے متعلق سیدھے سادے نظریات کا مطالعہ کرے اور ان کا مطلب سمجھے۔

چونکہ قبائلی علاقوں میں پھولوں اور پیڑ پودوں وغیرہ کی قدرتی طور پر بہتات ہے اس لیے ان کے تناظر میں ماحولیاتی مطالعات کے مقاصد کی اہمیت کو سمجھنا نسبتاً آسان ہوگا۔ جہاں تک سماجی سائنسوں سے تعلق رکھنے والے نظریات کا تعلق ہے، قبائلی بچے بچپن ہی سے گھر، خاندان، گاؤں اور پنچایت جیسے سماجی اداروں سے متعارف ہیں۔ ... اسپتال، اسکول، ضلع انتظامیہ وغیرہ سماجی اداروں سے کوئی ۳۰ سال پہلے تک ان بچوں کا کوئی سابقہ نہیں پڑتا تھا لیکن اب تو ان اداروں نے قبائلی علاقوں میں بھی (ماسوائے دور دراز علاقوں کے) کافی زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ماحول کے تحفظ اور جنگلات و نباتات وغیرہ کے بچاؤ کی فکر قبائلی ثقافتوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت وہاں کے قدیم رسم و رواج اور درختوں اور جانوروں کی پوجا ہیں جس کا مقصد ان کا تحفظ ہی تو ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قبائلی عوام کی تعلیم کے لیے جو مواد تیار کیا جائے وہ ان کے رسم و رواج اور طریقوں کی بنا پر تیار کیا جائے اور ان میں سے ہر رسم یا طریقے کی منطقی وضاحت کی جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی معقولیت تلاش کرنی ہوگی۔ اس طرح ان لوگوں میں سائنسی مزاج بڑی آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

قبائلی بچوں کے لیے مخصوص نصاب تجویز کرنا اس مضمون کا منشا نہیں ہے کیونکہ یہ ایک کافی طویل مشق ہے جس کیلیے زیادہ وقت کی ضرورت ہے مصنف تو یہاں صرف اس بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ کم از کم سطحوں کے ڈھانچے کے اندر ہر قبیلے کے لیے اس کی ضرورتوں کے مطابق ایک موزوں نصاب تیار کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے۔ یہ بات تعلیم کے شعبے میں لامرکزیت لانے کی اعلان شدہ پالیسی کے عین مطابق ہوگی۔ ایسا کرنے کے بعد ہی تعلیم کو ان لوگوں کی ثقافت کا ایک لازمی حصہ بنانا ممکن ہوگا۔ جہاں تک موجودہ تعلیم ہے اس نے قبائلی بچوں کو ان کی ثقافتی جڑوں سے دور کر دیا ہے۔ تعلیم انسان کی اس کے ثقافتی منظر میں ترقی کا ذریعہ ہے۔ اگر ہم اس سمت میں سمجھ بوجھ کر کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں گے تو اس سے ترقی کو دوام حاصل ہوگا اور ان بچوں کی عزت خود ان کی نگاہ میں بڑھ جائے گی جس کے نتیجے میں ان سماجوں میں علیحدگی پسندانہ رجحانات کو روکا جا سکے گا۔

وقت آگیا ہے کہ ماہرین عمرانیات اور یونیورسٹیوں کے درمیان اور زیادہ تعاون پیدا کیا جائے اور باقاعدہ مطالعات شروع کیے جائیں کیونکہ قبائلیوں کے شعبے میں متعدد ریسرچ پراجیکٹ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

قبائلی سماجوں کے لیے غیر رسمی تعلیم زیادہ موزوں ہے لیکن اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس عظیم مسئلے کے حل کے لیے ماہرین عمرانیات اور غیر رسمی

> قبائلی سماجوں کے لیے غیر رسمی تعلیم زیادہ موزوں ہے لیکن اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس عظیم مسئلے کے حل کے لیے ماہرین عمرانیات اور غیر رسمی تعلیم کے اساتذہ مل کر کام کریں۔

تعلیم کے اساتذہ مل کر کام کریں۔

مصنف کے خیال میں تعلیم اور سماجی عمرانیات کے بارے میں اور زیادہ بین شعبہ جاتی مطالعات کا اہتمام کیا جانا چاہیئے۔ وہ اس بات کی بھی حمایت کرتا ہے کہ تمام بڑے قبائلی علاقوں میں سے ہر علاقے کے لیے مخصوص نصاب تعلیم مرتب کرنے اور تعلیمی مواد تیار کرنے کے واسطے سماجی عمرانیات اور درس تعلیم میں تربیت یافتہ لوگوں کے خصوصی گروپ بنائے جائیں۔ یہ گروپ قومی نصابی ڈھانچے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقامی علاقے کے لسانی اور ثقافتی پس منظر سے میل کھاتا ہوا تعلیمی مواد تیار کرے۔ اور نصاب تعلیم بھی مرتب کرے۔ کیونکہ انھوں نے اس کی تربیت لے رکھی ہے۔

یہاں یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ (سی آئی آئی ایل) اور این سی ای آر ٹی جیسے مرکزی اداروں نے بھی اس ضمن میں چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر اہم کوششیں کی ہیں۔ لیکن یہ کوششیں کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرکزی تنظیمیں ہیں اور ان کا اثر نیچے تک پہنچتے پہنچتے بہت کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ریاست ہر بڑے قبیلے کے لیے ایک ایسا گروپ تشکیل دے اور اگر ضروری ہو تو نصاب تعلیم مرتب کرنے اور تعلیمی مواد تیار کرنے سے متعلق خصوصی تربیتی پروگرام بھی شروع کرے اگرچہ اس کی مہارت اشتراکی طریقوں سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ●

بقیہ: اعلیٰ تعلیم: کچھ مسائل، کچھ تجاویز

ہونا چاہیئے جو ہر طرح کے ذہنی بوجھ اور احساس جرم سے آزاد ہو۔ اس وقت کلاس روم میں جو اطمینان کا ماحول نظر آتا ہے وہ دراصل سست روی کا مظہر ہے۔ ایک بار اساتذہ کے بارے میں طلبا کے رائے دینے کا طریقہ کار نافذ ہو جائے گا تو ماحول بدلنے لگے گا۔ اساتذہ لاپروائی برتنے کے بجائے سنجیدگی اختیار کریں گے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔

آخر میں دو اور باتیں واضح کر دی جائیں۔ اسی سلسلے میں کچھ اور سفارشات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارا مقصد مختصراً کچھ مثالیں دے کر اہم بات کو واضح کرنا ہے کسی جامع نوعیت کا خاکہ پیش کرنا نہیں!

دوسری بات یہ ہے کہ ان سفارشات میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جس میں سیاستدانوں کی مداخلت کی ضرورت پیش آئے۔ تقریباً تمام کے تمام باتیں ایسی ہیں جو خود تعلیم گاہوں سے وابستہ ذمہ دار افراد کے دائرہ اختیار میں آتی ہیں۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ تمام باتیں مان ہی لیں لیکن اُن کی معمولی سی کوشش اور وہ بھی ان لوگوں کی کوشش جو اعلیٰ تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہیں، تعلیم کے شعبے میں قابلِ ذکر بہتری لانے کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر یہ کوشش نہیں کی گئی تو اس سے یہی ظاہر ہوگا کہ جو لوگ تعلیم کی صورتحال کو بہتر بنانے کی قسمیں کھاتے ہیں، ان کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ ●

پروفیسر جے. ایس. راجپوت

سب کے لیے بنیادی تعلیم : ایک جائزہ

مصنف کہتا ہے کہ موجودہ تعلیمی ڈھانچوں اور معاشرہ کی ضرورتوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج نے اس اثر کو بے کار کر دیا ہے جو ابتدائی تعلیم، معیار زندگی اور عوام کی آرزوؤں کی تکمیل پر پڑ سکتا تھا۔ اس خلیج کو پُر کرنا ضروری ہے کیونکہ تعلیمی نظام کو معاشرہ کی ضرورتوں کے مطابق ہونا لازم ہے۔ نئی حکمت عملی میں مخصوص علاقوں اور نشانہ بنائے گئے گروپ کی خاص منصوبہ بندی پر توجہ دینا لازم ہے۔

قومی ترقی کے ایک وسیلے کے طور پر سماجی اور اقتصادی اعتبار سے اوپر اٹھنے کے وسیلے کے طور پر اور عوام خاص کر کمزور طبقوں کا معیار زندگی بہتر بنانے کی ایک موثر حکمت عملی کے طور پر تعلیم کی اہمیت کو جدوجہد آزادی کے لیڈروں نے بھارت کے آزاد ہونے سے بہت پہلے تسلیم کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے تعلیم کو "شعور کی ترقی اور سماج کی تعمیر نو کا ایک بنیادی وسیلہ" قرار دیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے بنیادی تعلیم کی ایک اسکیم پیش کی جس میں سب بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ اس اسکیم میں بچوں کی ہمہ جہت ترقی پر خاص زور دیا گیا تھا۔ قومی نقطہ نظر ابھارنا، آس پاس کے ماحول کو حصول علم کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرنا، تعلیم اور کام کے درمیان ہم آہنگی، ربط اور آپسی تعلق، اور اس سے بھی اہم پڑھنے اور پڑھانے میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی اس حکمت عملی کے دیگر پہلوؤں میں شامل تھے۔ یہ پڑھنے والوں کی ضرورتوں کے مطابق ایک قومی نظام تعلیم وضع کرنے کی جانب پہلا بڑا اقدام تھا۔ اس اسکیم میں سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ مساوی مواقع پیدا کرنے کی بھی صلاحیت تھی۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت ابتدائی تعلیم کی حالت قطعی اطمینان بخش نہیں تھی۔ برطانیہ نے ایک ایسا نظام تعلیم تھوپا تھا جو بنیادی طور سے مٹھی بھر لوگوں کے لیے تھا اور جس میں تعلیم یافتہ اور ناخواندہ لوگوں کے درمیان ایک وسیع طبقہ کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ آزادی کے وقت صرف ۱۴ فیصد آبادی خواندہ تھی۔ تین میں سے محض ایک بچہ اسکول جاتا تھا۔ تعلیمی نابرابری کے ساتھ ساتھ اقتصادی نابرابری، عورت مرد کی تفریق اور سخت گیر ذات پات کی درجہ بندی نے سونے پر سہاگے کا کام کر رکھا تھا۔

تعلیم اور آئین

اس خطرناک صورت حال کے نتائج اور اس کے تدارک کی فوری ضرورت کو آئین سازوں نے ٹھیک سے سمجھ لیا تھا اور محسوس کر لیا تھا جس میں کہا گیا ہے "ریاست" اس آئین کے شروع ہونے سے دس سال کے اندر یہ کوشش کرے گی کہ تمام بچوں کو ۱۴ سال کی عمر کو پہنچنے تک مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جائے" اس کے بعد اس مقصد کی تکمیل کے لیے کی گئی تمام کوششوں میں تمام بچوں، نوجوانوں اور بالغوں کو بنیادی تعلیم فراہم کرنے کو پیش نظر رکھا گیا۔ قومی ترقیاتی کوششوں کا مقصد سماجی اقتصادی تبدیلی لانا اور جمہوریت، سماجی انصاف اور سیکولرازم کے اصولوں پر مبنی ایک نیا سماجی نظام پیدا کرنا رہا ہے۔ یہ بات محسوس کی گئی کہ بنیادی تعلیم میں عوام کی شرکت کے بغیر ایک منصفانہ اور غریب پرور سماج قائم کرنا ناممکن ہوگا۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کا انحصار عوام کی موثر شرکت پر ہوگا جنھیں ایسے علم، ہنر، رویّہ اور اقدار سے لیس کرنے کی ضرورت ہوگی جو سماجی اور اقتصادی تعمیر نو کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

۱۹۶ء تک ۱۴ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو بنیادی تعلیم فراہم کرنے کی آئین کی ہدایت آج بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال اس ۴ دہائی کے عرصہ میں حقیقت پسندی کے ساتھ یہ بات سمجھ لی گئی ہے کہ مختلف نشانہ گروپوں کے مختلف زمروں کی ضروریات اور آرزوئیں کیا ہیں جن کو پورا کرنا ہے۔ بنیادی ڈھانچے کی سہولیات اور مختلف سماجی گروپوں کا احاطہ کرنے میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد سے بھارت کا نظام تعلیم وسعت اختیار کر کے دنیا کا ایک سب سے بڑا نظام بن گیا ہے، جس میں چھ لاکھ سے زیادہ پرائمری اسکول، پرائمری سیکشن اور دو لاکھ ۷۰ ہزار غیر رسمی تعلیم کے مراکز ہیں جن میں تقریباً ۱۳ کروڑ ۱۰ لاکھ بچوں کا اندراج ہوتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۶ سے ۱۱ سال کے گروپ کا محض ۸ر۳۷ فیصد

اور ۱۱ سے ۱۴ سال کے گروپ کا ۱۳ فیصد احاطہ کیا گیا تھا۔ مجموعی اندراج (۹۰-۱۹۸۹ء) کا تناسب بالترتیب ۸۹٫۹۹ فیصد اور ۶۰ فیصد ہے۔ پرائمری سے اپر پرائمری میں داخلہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲۸٫۱۶ فیصد اور ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۳۲٫۱۳ فیصد تھا۔

نامکمل کام

اس توسیع کے باوجود، سب کو بنیادی تعلیم فراہم کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوسکا ہے۔ مالی مشکلات اور آبادی کے اضافے نے مل کر وسائل کے توازن پر برا اثر ڈالا ہے۔ بڑی تعداد میں اسکولوں کے پاس اب بھی کوئی عمارت اور قابل استعمال کھیل کا میدان نہیں ہے۔ کم تربیت یافتہ اور لگن نہ رکھنے والے ٹیچروں، ناکافی وسائل رکھنے والے انتظامیہ اور حوصلہ نہ بڑھانے والے اسکول کے ماحول کی وجہ سے اسکول چھوڑنے والوں کی شرح خطرناک حد تک بڑھی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے تخمینہ کے مطابق درجہ ایک سے ۵ تک یہ شرح ۴۶٫۹۷ فیصد اور درجہ ایک سے ۸ تک یہ ۶۲٫۲۹ فیصد تھی۔ اسی کے مطابق لڑکیوں میں یہ شرح بالترتیب ۴۹٫۴۲ فیصد اور ۶۱٫۵۵ فیصد تھی۔ مختلف خطوں کے درمیان کافی تفریق پائی جاتی ہے جو اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ کیرالا میں درجہ ایک سے ۵ تک اسکول چھوڑنے والے بچوں کی شرح ۳۹٫۴ فیصد ہے جب کہ بہار میں یہ شرح ۶۵٫۶۳ فیصد ہے۔ اسی طرح درجہ ایک سے آٹھ تک کے اعداد و شمار ۱۵٫۴۹ فیصد اور ۷۹٫۰۳ فیصد ہیں۔

"مزید کیا کرنا ہے" اس کے لیے درکار چیزوں کا واضح تصور ضروری ہے تاکہ تعلیمی ڈھانچے کو تمام بچوں کی پڑھنے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تیار کیا جاسکے۔ توسیع نے ایک ایسی صورتحال بھی پیدا کی ہے جس میں تدارک کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔ اچھی طرح لیس نہ ہونے اور لگن نہ رکھنے والے اساتذہ اکام کے بوجھ سے دبے ہوئے انتظامی نظام اور غیر دلچسپ اسکول کے ماحول نے ان کوششوں کے نتائج کی رفتار گھٹادی جو نظام کی توسیع کی صورت میں کی گئی تھیں۔ دور دراز کے علاقوں میں اساتذہ کی عدم دستیابی، باقاعدگی سے اسکول نہ چلنا اور اسکولوں میں بچوں کا کوئی کامیابی حاصل نہ کرنا

> ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت ابتدائی تعلیم کی حالت تشفی بخش نہیں تھی۔ برطانیہ نے ایک ایسا نظام تعلیم چھوڑا تھا جو بنیادی طور سے شہری لوگوں کے لیے تھا اور جس میں لوگوں کے مسائل ایک وسیع طبقہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

بھی بڑی تعداد میں بچوں کے اسکول کے دائرہ سے باہر رہنے کے ذمہ دار ہیں۔ پھر الگ الگ گروپوں کی مخصوص ضروریات ہیں۔ وہ سماجی اقتصادی اور تمدنی پہلو جو لڑکیوں کو گھریلو کام کاج میں مصروف رکھتے ہیں اور کم عمری میں بچوں کو روزی کمانے پر مجبور کرتے ہیں، فاصلے اور جغرافیائی محل وقوع کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نابرابری بھی دور دراز، دیہی، ریگستانی اور قبائلی علاقوں میں بچوں کی پڑھائی میں شرکت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بنیادی تعلیم میں خاص طور سے دیہی علاقوں میں رہنے والی اور کمزور طبقوں کی لڑکیوں نیز کام کرنے والے بچوں کی شرکت، سب کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کی کوششوں میں انتہائی تشویش کا سبب بنی ہوئی ہے۔ جو بچے ابتدائی تعلیم کے تمام مراحل پورے کرلیتے ہیں وہ بھی حصول علم میں مطلوبہ سطحوں کو حاصل نہیں کرتے۔ غیر دلچسپ پڑھائی، بوجھ معلوم ہونے والے نصاب کی رٹائی، ان میں وہ بنیادی اہلیت پیدا نہیں کرپاتے جو بلوغت کی زندگی میں ان کی کام کی مہارت کا معیار بڑھاسکے۔

> یہ تسلیم کیا گیا کہ ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کا انحصار عوام کی مؤثر شرکت پر ہوگا جنہیں، ایسے علم، ہنر، رویّے اور اقدار سے لیس کرنے کی ضرورت ہوگی جو سماجی اور اقتصادی تعمیر نو کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

خلیج کو پُر کرنا

اسکولوں کی عدم کارکردگی اور ناموزوں نصابوں کے نتیجے میں معاشرہ ابتدائی تعلیم کے عمل سے بیزار ہوگیا ہے۔ موجودہ تعلیمی ڈھانچوں اور معاشرے کی ضرورتوں اور تصورات میں اس بد نما رخنہ نے بڑی حد تک اس اثر کو بے کار کر دیا ہے جو ابتدائی تعلیم لوگوں کے معیار زندگی اور عوام کی آرزوؤں پر مرتب کرسکتی تھی۔ اس خلیج کو پُر کرنا ابتدائی تعلیم کی نئی حکمت عملی میں مرکزی مقام کا حامل ہونا چاہیے۔ مسئلہ اس وجہ سے اور بھی بگڑ گیا ہے کہ ۱۴-۶ سال کی عمر کے گروپ کے بچوں کی ایک بڑی تعداد اسکولوں سے باہر ہے۔ ان میں مزدوری کرنے والے بچے، گھریلو کام کاج میں یا کنبہ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے والے بچے، خاص طور سے لڑکیاں، اور پسماندہ بستیوں کے بچے۔ اس گروپ کی تعداد کا تخمینہ ۴٫۴ کروڑ لگایا گیا ہے۔ ان محروم گروپوں کی طرف خصوصی توجہ دینا لازمی ہے۔ ان میں سب تو باقاعدہ اسکول میں داخل نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا متبادل راستے تلاش کرنا ہوں گے۔

اسکول کے باہر کے بچوں کو جز وقتی تعلیم کے ذریعہ پڑھانے پر ۱۹۷۴ء میں تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ CABE نے زور دیا تھا۔ بورڈ نے کہا تھا "سب کو تعلیم دینے کا مقصد صرف تعلیم کے رسمی نظام پر انحصار کر کے حاصل نہیں کیا جاسکتا جس میں داخلہ کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے، تربیتی نظام اور کل وقتی پیشہ ورانہ ٹیچر۔ اس نے تجویز کیا تھا" ان بچوں کے لیے

جو کسی نہ کسی وجہ سے کل وقتی بنیاد پر اسکول میں داخلہ نہیں لے سکتے، کئی دروازوں سے داخلہ کا نظام اور ایک بڑا جز وقتی تعلیمی پروگرام اختیار کرکے موجودہ نظام کی انقلابی تعمیر نو کی جانی چاہیے۔" حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں قائم کیے گئے، ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے ورکنگ گروپ نے اپنی سفارشات میں "یا تو کل وقتی تعلیم ہو یا تعلیم نہ ہو" کا حوالہ دیا تھا اور پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی کی تجویز رکھی اور ایک نیا نعرہ دیا تھا: "۶-۱۴ سال کے گروپ کے ہر بچے کو اگر ممکن ہو تو کل وقتی بنیاد پر تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور اگر ضروری ہو جائے تو جز وقتی بنیاد پر تعلیم حاصل کرنا چاہیے"۔ لیکن ایسا کرنے میں کم از کم علم، خواندگی، عدد شناسی اور سماجی نیز شہری ذمہ داریوں کا شعور بیدار کرنے کی قربانی نہیں دی جانی چاہیے۔ اس متبادل راستے کی تعلیم کا متن ایسا ہو جس سے ترقی کے راستے مسدود نہ ہوں۔ ان سفارشات کو اس صورت سے عملی جامہ پہنایا گیا کہ بچوں کی ضروریات اور سہولیات کے مطابق مناسب جگہوں اور مناسب وقت پر غیر رسمی جز وقتی تعلیمی مراکز قائم کیے گئے۔

> اچھی طرح تعلیم یافتہ نہ ہونے اور لگن نہ رکھنے والے اساتذہ کا کام کے بوجھ سے دبے ہوئے انتظامی نظام اور غیر دلچسپ اسکول کے ماحول نے ان کوششوں کے نتائج کی رفتار گھٹا دی جو نظام کی توسیع کی صورت میں کی گئی تھیں۔

ابتدائی اقدامات

تعلیم کی قومی پالیسی۔ ۱۹۸۶ء میں کم سے کم وقت میں سب کو عالم گیر ابتدائی تعلیم سے لیس کرنے کا مقصد حاصل کرنے کی لازمی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس میں یہ عزم ظاہر کیا گیا کہ ۱۴ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم ۱۹۹۵ء تک فراہم کر دی جائے گی۔ مساوات کو فروغ دینے کے لیے تعلیم کی قومی پالیسی ۱۹۸۶ء میں سب کو نہ صرف اس تک رسائی بلکہ کامیابی کے لیے درکار حالات میں بھی مساوی مواقع فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس میں اسکول چھوڑنے والوں، بغیر اسکول والی بستیوں کے بچوں، روزی کمانے والے بچوں اور لڑکیوں کے لیے جو پورے دن کے اسکولوں میں شرکت نہیں کر سکتے، ایک بڑا اور باقاعدہ 'غیر رسمی تعلیم کا پروگرام بھی تجویز کیا گیا۔ اس نے یہ بھی تجویز کیا کہ غیر رسمی تعلیم کے مراکز میں پڑھائی کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے جدید ٹیکنالوجیکل معاونت کا استعمال کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنانے پر زور دیا کہ غیر رسمی تعلیم کا معیار رسمی تعلیم کے ہم پلہ ہو۔ اس میں ٹیچروں کے پیشہ ورانہ معیار کو بلند کرنے، رضاکار تنظیموں کے رول اور معاشرہ کی شمولیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔

۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی کے نتیجے میں جو منصوبۂ عمل تیار کیا گیا اس میں سب کو ابتدائی تعلیم دینے کے مقصد کے حصول کے لیے چند بڑی اسکیمیں اور اقدامات وضع کیے گئے۔ اسکولوں میں پڑھائی کا ماحول بہتر بنانا تھا، اساتذہ کی اثر پذیری کو بڑھانا تھا، اور متبادل حکمت عملی پر عمل کرنا تھا تاکہ اسکولوں سے باہر کے ۶-۱۴ سال کی عمر کے بچوں کو پڑھنے کے مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ مرکزی سرپرستی کی تین بڑی اسکیمیں: آپریشن بلیک بورڈ، اساتذہ کی تعلیم کی درستگی اور استحکام اور غیر رسمی تعلیم کی اسکیم ۱۹۸۷-۸۸ء کے بعد سے بڑے پیمانے پر روبہ عمل لائی گئیں۔

> سب کو تعلیم دینے کا مقصد صرف تعلیم کے رسمی نظام پر انحصار کرکے حاصل نہیں کیا جا سکتا جس میں داخلہ کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے، باترتیب نظام اور کل وقتی پیشہ ورانہ ٹیچر۔

آپریشن بلیک بورڈ

ملک میں تمام پرائمری اسکولوں کو کم از کم بنیادی سہولیات فراہم کرنے کے لیے آپریشن بلیک بورڈ کی اسکیم شروع کی گئی۔ ان سہولیات میں ہر موسم میں کام کرنے والے دو کمروں پر مشتمل عمارت جس میں برآمدہ بھی ہو، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ پاخانے، کم از کم دو ٹیچر جن میں سے ایک بہتر ہو کہ عورت ہو، اور کچھ پڑھائی میں کام آنے والی بنیادی اشیاء۔۔۔ ۳۳۲ پرائمری اسکولوں میں سے تقریباً ۹ فیصد کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ بقیہ کا احاطہ آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے ابتدائی برسوں میں کیا جا رہا ہے۔

غیر رسمی تعلیم

غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کی موجودہ شکل میں بچوں پر مرکوز، ماحول سے مطابقت رکھنے والے لچکدار نظام کا تصور ابھارا گیا جس سے نسبتاً محروم جغرافیائی خطوں اور معاشرہ کے سماجی، اقتصادی طبقوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ زور اس بات پر دیا گیا کہ مناسب سہولیات فراہم کی جائیں اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو والدین کو راغب کرے اور بچوں کی شرکت یقینی بنائے اور ساتھ ہی ساتھ طے شدہ تعلیمی کامیابیاں بھی حاصل ہوں۔ اس پروگرام کی صفات ہیں، ادارے کی لچک، موزوں نصاب، غیر مرکوز انتظامیہ اور پڑھنے والوں کی ضروریات سے مطابقت رکھنے والی تعلیمی سرگرمیاں شامل ہیں۔ لگن رکھنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، جو اگر مقامی ہوں تو بہتر ہے، جز وقتی پڑھائی اور نگرانی کے لیے متعین کیے جائیں۔ معمولی علامتی اعزازیہ کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ اس اسکیم کو ریاستی سرکاریں اور رضاکار تنظیمیں چلاتی ہیں۔ آج کل ریاستی سرکاریں ۲ لاکھ ۴۳ ہزار مرکز چلا رہی ہیں جن میں سے بیشتر تعلیمی اعتبار سے دس پسماندہ ریاستوں میں ہیں۔ اور قریب ۲۸۰۰۰ مراکز رضاکار تنظیمیں چلا رہی

ہیں۔ پڑھنے پڑھانے کے مثالی ساز و سامان کی تیاری اور اہم کارکنوں کی تربیت کا کام نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کر رہے ہیں۔

اساتذہ کی تربیت

اساتذہ کی تعلیم کی تنظیم نو اور تشکیل نو کا ایک بڑا پروگرام سن ۱۹۸۷ء میں شروع کیا گیا۔ ایک بڑا کام جو سب کو ابتدائی تعلیم دینے کی کوششوں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، ضلع کی سطح پر بہم تعلیم

مرکزی سرپرستی کی تین بڑی اسکیمیں: آپریشن بلیک بورڈ، اساتذہ کی تعلیم کی درستگی اور استحکام اور غیر رسمی تعلیم کی اسکیم ۸۸-۱۹۸۷ء کے بعد سے بڑے پیمانے پر روبہ عمل لائی گئیں۔

اور تربیت کے انسٹی ٹیوٹ DIET قائم کرنے اور ریاستوں کی تعلیم، تحقیق اور تربیت کی کونسلوں SCERT کو مستحکم کرنے کا ہے۔ اب تک ۳۰۷ DIET منظور کی جا چکی ہیں اور SCERT کو مستحکم کرنے کی اسکیم کو قطعی شکل دی جا رہی ہے۔ DIET کو ضلع سطح کے وسائل کے ایسے مراکز بنانا مقصود ہے جو عمارت، عملہ اور آلات سے پوری طرح لیس ہوں۔ اساتذہ کی تربیت پوری طرح ان کی ذمہ داری ہے، خواہ وہ ملازمت سے قبل کی ہو یا باقاعدہ اسکول میں ملازمت کے دوران کی تربیت ہو، غیر رسمی تعلیم اور تعلیم بالغاں کے انسٹرکٹروں کی تربیت ہو یا مزید یہ کہ ان میں کام کے تجربہ، تعلیمی ٹیکنالوجی نصاب اور تدریسی مواد کی تیاری نیز منصوبہ بندی اور انتظام کی مکمل شاخیں موجود ہیں۔ DIET رہائشی ادارے ہیں جن کا مقصد ان لازمی ثقافتی وراثت اور اقدار سے لیس موثر ٹیچر تیار کرنا ہے جو قومی ترجیحات کے موجودہ تناظر میں نہایت ضروری ہیں۔

اوپر جن تین اسکیموں کا ذکر کیا گیا وہ آٹھویں منصوبے میں بھی جاری رہیں گی۔ اگرچہ آپریشن بلیک بورڈ اپنی موجودہ شکل میں مکمل کر لیا جائے گا لیکن اس کے متن کو وسعت دے کر ۳ کمروں، تین اساتذہ کر دیا جائے گا اور اس کا دائرہ اپر پرائمری اسکول تک بڑھا دیا جائے گا۔ غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کو انتظامی اور تکنیکی وسائل کے سہارے کے اعتبار سے مزید مستحکم کیا جا رہا ہے۔ مزید DIET قائم کیے جائیں گے اور ان سب کو جلد از جلد شروع کیا جائے گا۔ یہ سب مل کر آٹھویں منصوبے کی حکمت عملی کے اہم عنصر کا کام انجام دیں گے۔ تعلیم کی کم از کم سطحوں اور غائر منصوبہ بندی کی مرکزی سرپرستی کی اسکیمیں بھی شروع کی جانے کی امید ہے۔

مائیکرو پلاننگ

مائیکرو پلاننگ یا چھوٹی سطح کی منصوبہ بندی کا مقصد کنبہ وار یا بچوں کی مناسبت سے عمل کا خاکہ جس کے ذریعہ ہر بچہ باقاعدگی سے اسکول جا سکے یا غیر رسمی تعلیم کے مرکز میں جا سکے یا اپنے لیے مناسب اور موزوں مقام پر تعلیم جاری رکھ سکے، اور

غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کی موجودہ شکل میں بچوں پر مرکوز، ماحول سے مطابقت رکھنے والے لچکدار نظام کا تصور ابھارا گیا جس سے نسبتاً محروم جغرافیائی خطوں اور معاشرہ کے سماجی اقتصادی طبقوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔

کم از کم ۵ سال کی اسکولی تعلیم یا اس کے مساوی غیر رسمی تعلیم کے مراکز میں تعلیم مکمل کر سکے۔" اس قسم کے بھرپور پروگرام کی حکمت عملی یہ ہے کہ (i) شرکت کی منصوبہ بندی کا نظریہ، جس میں معاشرے کو اپنی ضرورتوں کی خود نشاندہی کرنے کے لیے حرکت میں لایا جائے اور اسے پروگراموں پر کامیابی سے عمل درآمد کو یقینی بنانے کی ذمہ داری سونپی جا سکے۔ (ii) انتظامی کاموں کی مرکزیت کم کرنا تاکہ مقامی تعلیمی عملہ اپنے علاقوں کے بارے میں خود فیصلے کر سکیں اور یہ کہ نظام میں اتنی لچک ہو کہ اسے معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق موڑا جا سکے۔

چھوٹی منصوبہ بندی میں لازمی طور سے مراد علاقوں کی مخصوص منصوبہ سازی ہے جس میں علاقہ مثالی طور پر تو گاؤں ہو لیکن عملی طور پر ایک بلاک تعلقہ یا ضلع۔ اس علاقہ کے اندر جن اقدامات کے ذریعہ چھوٹی منصوبہ بندی چلائی جائے گی وہ ہیں ا۔ (i) برادری کی شرکت کی کوشش (ii) تعلیمی انتظامیہ کی مرکزیت کم کرنا (iii) مقامی انتظامیہ اور وسائل کی مدد کے نظاموں کی تشکیل نو اور استحکام (iv) علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا پتہ لگانا (v) ان تمام بچوں کو اسکول میں داخل کرانا جو آ سکتے ہیں اور غیر رسمی تعلیم کے پروگرام یا جو اس سے استفادہ کرنے کے اہل نہیں ہیں ان کے لیے متبادل اور سہارا دینے کے اقدامات کرنا (vi) یہ یقینی بنانا کہ تمام بچے باقاعدگی سے اور حقیقت میں پرائمری تعلیم میں شرکت کریں (vii) اسکولوں یا غیر رسمی تعلیم کے مراکز کو بہتر بنانے کی منصوبہ بندی تاکہ موثر طور سے پڑھائی ہو سکے۔

اسکول میں تعلیم حاصل کرنے میں بہتری لانے کی حکمت عملی کے تحت کلاس روم میں ہونے والی سرگرمی پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے اور انصاف پسندی اور معیار کے اصولوں کو بروئے کار لانا مقصود ہے۔

اس حکمت عملی کا مقصد تعلیم کے وہ نتائج طے کرنا ہے جن کی حقیقت پسندی موزونیت اور کام کی سطح پر بنیادی تعلیم سے توقع کی جا سکتی ہے اور ایسے اقدامات اختیار کرنے کی تجویز کی جاتی ہے جن کے ذریعہ اسکولی تعلیم کی ایک منزل مکمل کرنے کے بعد ان نتائج کو حاصل کر سکے۔ یہ نتائج حصول علم کی وہ کم از کم سطحیں ہیں جو اسکول اور اس کے مساوی غیر رسمی تعلیم کے پروگرام دونوں میں مشترک ہیں۔

جن اقدامات کے ذریعہ اسکولوں میں حصول علم کی کم از کم سطحیں حاصل کرنے کا کام شروع کیا

جائے گا وہ ہیں: (i) موجودہ تعلیمی کامیابیوں کی سطح کا اندازہ لگانا (ii) علاقے کے لیے حصول علم کی کم از کم سطح طے کرنا اور وہ وقت طے کرنا جس میں یہ کامیابی حاصل کرنا ہے (iii) پڑھانے کے طریقوں میں اصلاح کر کے اسے باصلاحیت بنیادوں پر قائم کرنا (iv) طالب علم کے حصول علم کا متواتر اور بھرپور جائزہ لیتے رہنے کا طریقہ رائج کرنا (v) اگر ضرورت ہو تو نصاب کی کتابوں پر نظر ثانی کرنا (vi) ضروری چیزوں کی فراہمی جن میں مادی سہولیات، اساتذہ کی تربیت کی نگرانی اور جانچ وغیرہ، تاکہ چھوٹی سطح کے حصول علم میں پڑھائی کو بہتر بنایا جاسکے۔ کوشش یہ ہوگی کہ پڑھائی کی کامیابیوں پر نگاہ رکھی جائے تاکہ جہاں پڑھائی کی سطح کم ہے وہاں زیادہ وسائل فراہم کیے جاسکیں اور ضرورت مند علاقوں میں ترقیات کے عمل کی رفتار بڑھائی جاسکے۔ اور اس طرح تفریق کم کی جائے معیارات کو مساوی بنایا جائے اور نظام کی کارکردگی کے ذریعہ درکار اشیاء کی فراہمی اور معیار کی بہتری کا انتظام کیا جائے۔

مستقبل کا منظر نامہ

آٹھویں منصوبے (۹۷-۱۹۹۲ء) کے دوران ابتدائی تعلیم کی حکمت عملی میں توجہ کا اصل مرکز غیر اجتماعی حکمت عملی پر ہے جس میں علاقے اور آبادی کے لیے سب کو ابتدائی تعلیم دینے کے مخصوص منصوبے تیار کیے جائیں۔ اس کا سبب یہ حقیقت ہے کہ ہر ریاست/مرکزی انتظام کے علاقے میں ایسے علاقے اور اضلاع موجود ہیں جن میں تعلیمی اعتبار سے آپس میں کافی فرق پایا جاتا ہے جن میں خواندگی کی سطحیں/داخلے، لڑکیوں کی شمولیت وغیرہ کے فرق شامل ہیں۔ ان میں سے بعض تو سب کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کی منزل کے بہت قریب ہیں۔ لیکن دوسری طرف، حتیٰ کہ تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ریاستوں میں بھی ایسے اضلاع پائے جاتے ہیں جو تعلیمی اعتبار سے اب بھی پیچھے ہیں۔ ان حالات میں تفریق کم کرنے میں ریاستی سطح کی منصوبہ بندی کا کامیابی سے ہمکنار ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بجائے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ علاقوں اور طے شدہ گروپوں کے لیے خاص منصوبے بنائے جائیں۔ لہٰذا مستقبل میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے ضلع یا بلاک کی سطح پر منصوبہ سازی پر زور دیا جائے گا۔ ان منصوبوں میں ذمہ داریوں، مقررہ وقت اور مخصوص علاقوں کے نشانوں کی پوری وضاحت ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ منصوبے بڑی حکمت عملی کے ڈھانچے کے دائرہ کے اندر ہی تیار کیے جائیں گے اور ان میں مرکزی سرپرستی کی اسکیموں پر موثر عمل درآمد اور ریاست کی طرف سے باقاعدگی سے فراہم کیے جانے والے سہاروں کا دھیان رکھا جائے گا۔

ان پراجیکٹوں کے مقاصد یہ ہوں گے کہ تعلیم تک رسائی کے معاملے میں پائی جانے والی موجودہ تفریق کم کرنا اور ایسے محروم گروپوں کے لیے متبادل حکمت عملی فراہم کرنا جو رسمی اسکول کی سہولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے تحت اسکول کے ماحول، اسکول کی کارکردگی میں کافی بہتری لانے اور رسمی اسکولوں غیر رسمی تعلیم کے مراکز اور رضاکارانہ اسکولوں کو چلانے میں معاشرے کی شمولیت یقینی بنانے پر بھی توجہ دی جائے گی۔

اعلیٰ خواندگی کے اضلاع میں سب کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کے مقصد کا حصول خاص کر تعلیمی انتظامیہ کو بہتر بنانے، بہتر تال میل کو یقینی بنانے، نگرانی کو بہتر بنانے اور مختلف اقدامات پر عمل درآمد کی موثر نگرانی یقینی بنانے پر منحصر ہوگا۔ یہاں پر تعلیم کے کم از کم معیار کے حصول کا پروگرام بڑی ایمانداری سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ کم خواندگی کے اضلاع میں، رسائی اور شرکت کے اقدامات پر خاص زور ہوگا جس میں توجہ دیہی اور قبائلی لڑکیوں کی شمولیت پر ہوگی۔ یہاں پر چھوٹی سطح کی منصوبہ بندی کافی معاون ہو سکتی ہے۔

ابتدائی تعلیم میں محروم گروپوں کے بچوں کی شرکت کی رکاوٹوں کو کافی کم کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اوائل کم عمری کی دیکھ بھال اور تعلیم ECCE کو وسعت دی جائے اور اسے پرائمری اسکولوں اور غیر رسمی مراکز سے ہم آہنگ کیا جائے۔ تعلیم بالغان کے پروگراموں، صحت کی دیکھ بھال اور تغذیہ کے پروگراموں کو بنیادی تعلیم کی وسعت اور بہتری کے لیے موثر طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مکمل خواندگی کی مہمات، جو بڑی تعداد میں اضلاع میں چلائی گئی تھیں، کافی حد تک مکمل کر لی گئی ہیں۔ ان سے پڑھائی کے مراکز میں اندراج بڑھانے اور بچوں کو اسکول میں موجود رکھنے میں موثر سہارا ملا ہے۔ اس کے نتائج کو بروئے کار لانا ہوگا اور برقرار رکھنا ہوگا۔

منصوبۂ عمل کی ایک سوچی سمجھی پالیسی اور پروگرام پھر قوم کے سامنے ہے۔ عمل درآمد کی ایک بھرپور حکمت عملی ملک کے گاؤں اور دور دراز کے علاقوں میں ہی وضع کرنا ہوگی جس میں معاشرے کی مکمل شمولیت ہو۔ نظام کو بھی معاشرے کی ضرورتوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ دوسری طرف خود معاشرے کو اپنے بچوں کی تعلیم کی دیکھ بھال کرنا چاہیے۔ ریاست اور عوام ان کوششوں میں اشتراک اور سہارا دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکولی تعلیم کے موجودہ نظاموں میں رویہ کی تبدیلی لائی جائے۔ بچوں میں تبدیلی اور اقدار کی تعلیم کو موثر کرنے سے ابتدائی تعلیم کا معیار بہتر بنانے میں حقیقی مدد مل سکتی ہے۔ اس سے نصاب میں درکار تبدیلیاں لانے اور ماحول کو بچوں کے لیے زندگی سے بھرپور اور خوشگوار بنانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

●

اسکول میں تعلیم حاصل کرنے میں بہتری لانے کی حکمت عملی کے تحت کلاس روم میں ہونے والی سرگرمی پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے اور انصاف پسندی اور معیار کے اصولوں کو بروئے کار لانا مقصود ہے۔

بقیہ: تعلیمی نصاب کا بوجھ کم کیا جائے

کہ وہ مقامی حالات کے مطابق نصابی کارروائی کو ملا سکیں۔ تمام اسکولوں کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ درسی کتب اور دیگر سامان کے معاملے میں اپنے اپنے حالات کے مطابق فیصلے کریں۔

(ب) رسمی اور غیر رسمی تعلیم کی سرگرمیوں سے وابستہ رضاکار تنظیموں کو نصاب کی تدوین، درسی کتب کی تیاری اور اساتذہ کی ٹریننگ کے معاملات میں زیادہ آزادی ملنی چاہیے۔ ایسی تنظیموں کے تجربات کی اشاعت اور ترویج کے لیے ایک مناسب و موزوں لائحہ عمل تیار کیا جانا چاہیے۔

(ج) ہم اس تجویز کی تائید کرتے ہیں کہ گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر تعلیمی کمیٹیاں قائم کی جائیں جو اپنے دائرہ اختیار میں اسکولوں کی نگرانی کا کام انجام دے سکیں۔

(د) ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ایک مناسب رقم (جو اسکول کی تنخواہوں کے مجموعی بل کے دس فیصد سے کم نہ ہو) مختص کی جائے۔ اور اس کو اسکول کے لیے مختلف سامان کی خریداری، مرمت، بدلی وغیرہ کے لیے اسکول کے سربراہ کی تحویل میں رکھا جائے۔

۳۔ درسی کتب لکھوانے کے چلن میں تبدیلی ہونی چاہیے تاکہ ان کی تیاری میں اساتذہ کی شمولیت بڑھ جائے۔ سائنس دانوں اور دیگر میدانوں کے ماہرین کو درسی کتب کی تیاری میں بطور مصنف نہیں بلکہ بطور مصلاح کار شرکت کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں پہل روشن خیال اور جدت پسند اساتذہ کی طرف سے ہونی چاہیے۔ انھیں درسی کتب لکھنے کی تربیت ملنی چاہیے۔

۴۔ اسکولی تعلیم کے کم از کم تین متوازی سسٹم (سلیبس، درسی کتب اور امتحان) مختلف ریاستوں میں یکساں طور پر اور ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ہر ایک ریاست میں اسکولوں کی اکثریت اس ریاست کے بورڈ آف ایجوکیشن سے وابستہ ہوتی ہے کچھ تھوڑے اسکول "سی بی ایس ای" یا "آئی سی ایس ای" سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ سی بی ایس ای کا نصاب ریاستی بورڈوں کے لیے ایک نمونہ بن جاتا ہے جس کے طرز پر وہ کام کرنا پسند کرتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کی اکثریت پر نصاب کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ سی بی ایس ای کا دائرہ عمل سنٹرل اسکولوں اور "نوودیہ" اسکولوں تک محدود رہے اور دیگر تمام اسکول ریاستی بورڈوں سے منسلک رہیں۔

۵۔ ابتدائی PRE-SCHOOL تعلیم

(الف) ننھے بچوں کی ابتدائی (اسکولی سطح سے پہلے کی) تعلیم کے (پرائیویٹ) اداروں کے قیام اور ان کے انتظامی امور سے متعلق ضوابط مقرر کرنے کی غرض سے مناسب قانونی اور انتظامیاتی اقدامات کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے اسکولوں کے سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے پاس مناسب جگہ، اسٹاف، تعلیمی اشیاء اور کھیل کود کا سامان موجود ہو۔ یہ دھیان رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایسے ادارے پڑھائی لکھائی اور حساب کی تعلیم کے معاملے میں شدت سے کام لے کر بچوں پر جبر تو نہیں کر رہے ہیں۔ نرسری کلاسوں میں داخلے کے لیے ٹیسٹ اور انٹرویو کا طریقہ بھی ختم ہونا چاہیے۔

(ب) پرائیویٹ اسکولوں کو تسلیم کرنے سے متعلق ضابطوں کو اور زیادہ سخت ہونا چاہیے اور ان پر سختی سے عمل ہونا چاہیے۔ اس سے ایک طرف تعلیم کا معیار بلند ہوگا تو دوسری طرف ان پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو منافع بخش کاروباری ادارے بنانے کے رجحان میں کمی واقع ہوگی۔ ان ترمیم شدہ ضوابط کا اطلاق تمام اسکولوں (بشمول سرکاری اسکول) پر یکساں طور سے ہونا چاہیے۔

۶۔ ننھے بچوں کو کتابوں کے بھاری بھاری بستے روزانہ ساتھ لے کر اسکول بھیجنے پر مجبور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ درسی کتابیں اسکول کی ملکیت سمجھی جانی چاہئیں اور بچوں کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ انفرادی طور پر تمام کتابیں خریدیں اور انھیں روزانہ اسکول لے کر آئیں۔ ہوم ورک کرنے اور درسی کتب اور نوٹ بک استعمال کرنے کے لیے ایک علیحدہ ٹائم ٹیبل تیار کرنی چاہیے اور بچوں کو اس کی اطلاع پیشگی دینی چاہیے۔

۷۔ ہوم ورک کی نوعیت اور طریقے دونوں میں زبردست تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ابتدائی درجات کے بچوں کو ہوم ورک نہیں ملنا چاہیے۔ اس کی بجائے ایسے اقدامات کیے جانے چاہئیں جن کے سبب بچے کے لیے پڑھائی کا ماحول گھر پر بھی برقرار رہے۔ پرائمری سے اوپر اور سیکنڈری کلاسوں میں ہوم ورک صرف ضرورت کے وقت دیا جانا چاہیے۔ یہ ہوم ورک درسی کتابوں سے الگ ہونا چاہیے۔ اگر بچوں کو ہوم ورک کے لیے درسی کتب کی ضرورت پڑے تو یہ کتابیں انھیں اسکول سے باری باری ملنی چاہئیں۔

۸۔ استاد اور شاگردوں کی تعداد کے موجودہ تناسب (ایک ٹیچر، چالیس طالب علم) پر سختی سے عمل ہونا چاہیے اور آئندہ جب کبھی نئے سرے سے تعلیمی منصوبہ بندی کی جائے تو اس تناسب کو گھٹا کر ایک ٹیچر تیس طالب علم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۹۔ ملک بھر میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق بیداری پیدا کرنے کی غرض سے الیکٹرانک میڈیا کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ "کرشی درشن" کے طرز پر ایک باقاعدہ ٹیلی ویژن پروگرام طلبا، اساتذہ اور والدین کے لیے "شکشا درشن" یا اسی طرح کے عنوان سے شروع کیا جانا چاہیے۔

۱۰۔ اساتذہ کی ٹریننگ

اساتذہ کی ناکافی ٹریننگ اور تیاری کا نتیجہ غیر تسلی بخش معیار تعلیم کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ بی ایڈ کورس میں ثانوی (سیکنڈری) ابتدائی، پرائمری اور نرسری سطح کی تعلیم کی الگ الگ مہارت کے لیے گنجائش پیدا کرنی چاہیے۔ گریجویشن کے بعد اساتذہ کی اس طرح کی ٹریننگ کی مدت ایک سال اور ہائر سیکنڈری کے بعد تین یا چار سال ہونی چاہیے۔ ٹیچرز ٹریننگ پروگرام کی از سر نو تشکیل ہونی چاہیے تاکہ اسکولی تعلیم کے بدلتے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس پروگرام میں اس بات پر زور دیا جائے کہ زیر تربیت افراد میں از خود سیکھنے اور اپنے طور پر غور و فکر کرنے کی لیاقت پیدا ہو۔ چونکہ ٹیچرز ٹریننگ کا قبل از ملازمت پروگرام ایک پیشہ ورانہ پروگرام ہوتا ہے اس لیے اس کو پر مشقت، مربوط، مکمل اور باضابطہ ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کے پیش نظر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بی ایڈ کے مراسلاتی کورس کو تسلیم کرنے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔

(ب) اساتذہ کی مسلسل تربیت کو ایک باضابطہ پروگرام کے تحت چلانا چاہیے۔ ٹیچروں کی دوران سروس ٹریننگ، جس کا مقصد ان کی پیشہ ورانہ لیاقت کو بڑھانا ہوتا ہے، باقاعدہ اور مربوط ہونی چاہیے اور اس میں حالات کے مطابق جدت بھی ہونی چاہیے۔

۱۱۔ امتحانات

دسویں اور بارہویں کلاس کی تعلیم پوری ہونے پر جو پبلک امتحانات ہوتے ہیں ان کے طریقے پر نظر ثانی ہونی چاہیے تاکہ درسی کتب پر مبنی پیچیدہ سوالات کا سلسلہ ختم کیا جائے اور ان کی جگہ طلبا کی لیاقت کو

سب کے لیے تعلیم چوٹی کانفرنس" کا دہلی اعلانیہ

۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو نئی دہلی میں منعقدہ "سب کے لیے تعلیم" کی تاریخی چوٹی کانفرنس میں دنیا کے کثیر آبادی والے نو ممالک، بنگلہ دیش، برازیل، چین، مصر، ہندوستان، انڈونیشیا، میکسیکو، نائجیریا اور پاکستان نے دہلی اعلانیہ پر دستخط کر دئے۔ نو ممالک کے لیڈران نے اس صدی کے آخر تک یا جتنی بھی جلد ممکن ہو سکے "سب کے لیے تعلیم" کے مقصد کو پورا کرنے کا عزم کیا اور اس ضمن میں پرائمری تعلیم کو آفاقی بنانے اور بچوں، نوجوانوں اور بالغوں کے لیے تدریسی مواقع کو فروغ دینے اور بنیادی علمی ضروریات کو پورا کرنے کا عہد کیا۔

دہلی اعلانیہ کا مکمل متن

۱۔ ہم، دنیا کے کثیر آبادی والے نو ترقی پذیر ملکوں کے لیڈران عہد کرتے ہیں کہ ہم ۱۹۹۰ء میں منعقدہ "سب کے لیے تعلیم" کی عالمی کانفرنس اور بچوں کی عالمی سربراہ کانفرنس میں پرائمری تعلیم کو آفاقی بنانے نیز بچوں، نوجوانوں اور بالغوں کے لیے حصول علم کے مواقع کے فروغ کے لیے حصول علم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نیز اس کے لیے طے کیے گئے مقاصد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ یہ عہد کرتے ہوئے ہمیں پورا احساس ہے کہ ہمارے ملکوں میں دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حصہ رہتا ہے۔ مزید یہ کہ ہماری کوششوں کی کامیابی "سب کے لیے تعلیم" کے عالمی نصب العین کے حصول کے لیے نہایت اہم ہے۔

۲۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ

۲.۱: ہماری قوم کی خواہشات اور ترقیاتی مقاصد اپنے کل عوام کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے سے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور اس امر کی یقین دہانی حقوق انسانی کے عالمی اعلانیہ نیز ہمارے اپنے ممالک کے قوانین میں کی گئی ہے۔

۲.۲: تعلیم آفاقی انسانی اقدار، اعلیٰ انسانی وسائل اور مختلف ثقافتوں کے احترام کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔

۲.۳: ہمارے ممالک میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو تعلیمی سہولت فراہم کرنے میں ہمارے تعلیمی نظام نے قابل تعریف کام انجام دیا ہے لیکن پھر بھی تمام افراد کو بہتر تعلیم فراہم کرنے میں کامیابی نہیں مل پائی ہے، جس سے اس نظام میں اندرونی و بیرونی دونوں طور پر جدید طریقوں کو وضع کرنے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

۲.۴: درسی مواد اور تدریسی طریقوں کو اس طرح تیار کرنا چاہیئے کہ وہ منفرد یا اجتماعی طور پر افراد کے حصول علم کی ضروریات کو پورا کر سکیں اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر سکیں جس سے وہ غریبی دور کرنے، پیداوار اور معیار زندگی کی بہتری اور تحفظ ماحولیات جیسے درپیش مسائل کا حل تلاش کر سکیں اور ان میں جمہوری سماج کی ترقی اور ثقافتی ورثے کی تعمیر میں کردار ادا کرنے کی قوت پیدا کر سکیں

۲.۵: جہاں تک خاندان اور برادری یا فرقے کے کردار کا سوال ہے، ایک کامیاب تعلیمی پروگرام میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ منفرد یا اجتماعی عمل کے ذریعے بہتر غذا و موثر حفظان صحت اور چھوٹے بچوں کی مناسب نگہداشت و پرورش کی ترغیب دے۔

۲.۶: لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم اور ان کی طاقت میں اضافہ اپنے آپ میں اہم مقاصد ہیں۔ علاوہ ازیں یہ سماجی ترقی، حالیہ و آئندہ نسلوں کے بہتر مفاد اور ان کی تعلیم نیز صلاحیتوں کی بھرپور ترقی کے لیے خواتین کو حاصل مواقع کے فروغ کے اہم جز تصور کیے جاتے ہیں۔

۲.۷: بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ سے نظام تعلیم کی افادیت پر منفی اثر پڑا ہے۔ ضروری اصلاح اور بہتری کے اقدامات میں خلل پڑا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ممالک میں آبادی کی عمر کے مروجہ ڈھانچے کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ امر آئندہ دس برسوں تک برقرار رہے گا۔

۲.۸: تعلیم، جیسا کہ ہونی چاہیئے، سماج کی ذمہ داری ہے جس میں حکومت، خاندان، فرقے اور غیر سرکاری تنظیمیں برابر کی ساجھے دار ہیں۔ اس میں ان سب کی شرکت بغیر کسی سیاسی حیثیت یا اختلاف رائے کے ضروری ہے۔

۳۔ سماج کی ترقی کے لیے ضروری تعلیم کے اہم

باقی صفحہ ۱۰۵ پر

بقیہ: تعلیمی نصاب کا بوجھ کم کیا جائے

پرکھنے والے فکر انگیز سوالات کو دی جائے۔ یہ واحد اصلاح خواندگی کے معیار کو بلند کرنے اور بچوں کو رٹنے رٹانے کی تکلیف سے بچانے کے لیے کافی ہوگی۔

۱۲۔ پراجیکٹ ٹیم

ہر ایک ریاست میں تعلیم سے متعلق ایک پراجیکٹ ٹیم قائم کی جائے تاکہ تمام اسکولوں کی مختلف کلاسوں، نصاب اور درسی کتب کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جا سکے۔ اس پراجیکٹ ٹیم کے متعدد ذیلی گروپ بھی ہونے چاہئیں جو مندرجہ ذیل امور کا فیصلہ کر سکیں۔

(۱) درسی مضامین کی کم سے کم تعداد

(۲) ہر مضمون میں موضوعات کی کم از کم تعداد

(۳) ہر ایک مضمون کی تعلیم کے لیے اس مدت کا تعین جس میں ایک ٹیچر آسانی سے اس مضمون کی تعلیم دے سکے۔

(ب) ملک بھر کے پرائمری کلاسوں کے میتھمیٹکس کورس پر نظر ثانی کی جائے تاکہ میتھمیٹکس کے بنیادی پہلوؤں کے سلسلے میں بچوں پر دباؤ کم کیا جا سکے اور پرائمری میتھمیٹکس کا دائرہ اتنا وسیع کیا جا سکے کہ اس میں اعداد و شمار کے علاوہ دیگر پہلو اصلاع و اشکال اور متعلقہ سوالات شامل ہو سکیں۔ آج کل رائج میتھمیٹکس نصاب اور درسی کتب میں بچوں کو میکینکل قواعد یاد کرانے کا جو رجحان پایا جاتا ہے وہ بچوں کی راہ میں رکاوٹ بنتا جا رہا ہے۔ آئندہ تیار ہونے والی سلیبس اور درسی کتب میں اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے۔

(ج) زبان سکھانے والی درسی کتب میں عام بول چال کے الفاظ اور محاوروں پر زیادہ زور دیا جانا چاہئے۔ مستقبل میں درسی کتب تیار کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ ان کتابوں میں بچوں کی زندگی کے تجربوں، فکر انگیز کہانیوں، نظموں اور ملک کے مختلف علاقوں کی عوامی زندگی کو نمایاں جگہ ملے۔ دقیق زبان اور ضرورت سے زیادہ ناصحانہ انداز تحریر سے گریز کرنا چاہئے۔

(د) پرائمری کلاسوں کے لیے سائنس کے سلیبس اور درسی کتب میں تجربے کے عمل کے لیے آج کے مقابلے میں زیادہ گنجائش رکھی جائے۔ صحت اور صفائی سے متعلق مضامین میں نظریاتی بحث کی جگہ حقیقی صورت حال کی عکاسی ہونی چاہئے۔

(ہ) سیکنڈری اور سینیئر سیکنڈری کلاسوں کے لیے تیار کیے گئے سلیبس اور درسی کتابوں پر نظر ثانی ہونی چاہئے تاکہ ان کے بیشتر مضامین اور موضوعات ان تجربوں اور سرگرمیوں کے ساتھ عملی طور پر مربوط ہوں جو بچے اور اساتذہ کر سکتے ہیں۔

(و) چھٹی سے لے کر آٹھویں کلاسوں اور نویں دسویں کلاسوں کے لیے سوشل سائنسز کا کورس اس طرح ترتیب دیا جائے کہ یہ تاریخ اور جغرافیہ کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کے بنیادی تصورات اور طریقِ عمل کی توضیح بھی کر سکے اور طالب علم کو اس قابل بنا سکے کہ وہ سماجی، سیاسی اور معاشی فروغ کے مسائل اور ان کی ترجیحات کا جائزہ لے، انھیں سمجھ سکے۔

تاریخ کے نصاب میں ایک ہی بات کو بار بار پیش کرنے کا طریقہ بھی بدلنا چاہئے۔ عہدِ قدیم کی تاریخ کا سلسلہ وار مطالعہ سیکنڈری کلاسوں میں شروع ہونا چاہئے۔ چھٹی سے لے کر آٹھویں کلاس تک کے لیے تاریخ کے سلیبس میں تحریک آزادی اور مابعد آزادی واقعات پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ "سوکس" (CIVICS) جس طرح آج کل پڑھائی جا رہی ہے وہ بچے کے حافظے پر بھاری بوجھ ثابت ہوتی ہے اس لیے اس کی تعلیم کا مروجہ طریقہ ختم کر دینا چاہئے۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس کی جگہ عصری حالات کے مطالعہ پر زیادہ توجہ دی جائے۔ جغرافیہ کا مطالعہ بھی موجودہ حقائق کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ ●

تعلیم — چند مقولے

"تعلیم ایک مستعد فوج سے کہیں زیادہ آزادی کی محافظ ہوتی ہے۔"

— ایڈورڈ ایورٹ

"اگر کوئی شخص اپنی پوری یافت ذہن و علم کے لیے خرچ کرتا ہے، تو اُسے کوئی زوال نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے سرمایہ کاری ہمیشہ ہی منفعت بخش ہوتی ہے۔"

— بنجامن فرینک لن

"تعلیم ایک سماجی عمل ہے۔ تعلیم ہی ترقی ہے، تعلیم کا مطلب زندگی کی تیاری نہیں بلکہ یہ بجائے خود زندگی ہے۔"

— جان ڈیوی

"تعلیم کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے محض تعلیم دہندہ کے سہارے نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

— فرانسس کیپیلر

یوجنا
نئی دھلی

جلد ۱۳ — شمارہ ۲۱-۲۲

یکم تا ۲۸ فروری ۱۹۹۴ء — ۱۲ ماگھ تا ۹ پھاگن شک ۱۹۱۵

قیمت : ۳ روپے

شرح چندہ : سالانہ ۳۰ روپے، دو سالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے۔ فی کاپی : ۳ روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دھلی ۱۱۰۰۶۶

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن : سدرشن موہن چہل

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ڈاکٹر سید شرافت حسین

"ملک میں چھوٹے پیمانہ کی صنعت پر سرمایہ کی قلت کا مضرت رساں اثر"

منصوبہ بندی کمیشن نے آٹھواں پنجسالہ منصوبہ (۹۷-۱۹۹۲ء) وضع کرتے وقت ملک کے چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ میں تکنیکی متروکیت کے روز افزوں بار کے تئیں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس کی واضح رائے تھی کہ مذکورہ زمرہ میں استعمال ہونے والی تکنالوجی کی بالیدگی کے لیے بڑے پیمانہ پر اور ارساری کے شعبے قائم کئے جانے و نیز تربیت دینے کی سہولت کو اہمیت دی جانا چاہئے۔ محض وقت کا اصراف کرنے والی دشواریوں کو دور کر دینا، گورنمنٹ کے ذریعہ مقررہ معقول در پر خام مال کی فراہمی کو یقینی بنا دینا اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی قرض کی حاجت کی تکمیل کر دینا ہی کافی نہیں ہوگا، بلکہ ایک زائد مسابقتی ماحول میں اس زمرہ کی پیداوار کی بقا کے لیے ان میں پیداواری عوامل کی جدید کاری کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی پیداوار میں استعمال ہونے والی تکنالوجی اور انتظام کی اصلاح کی جانا چاہئے۔

چھوٹے پیمانہ کی صنعتی زمرہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی ایک حالیہ شماری (۹۳-۱۹۹۲ء) سے یہ معلوم ہوا کہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ایسے واحدوں کی تعداد ۱۹ر۸ لاکھ سے متزائد ہوکر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲۰ر۸۰ لاکھ ہوگئی، یعنی ایک سال کی مدت میں ان کی تعداد میں ۶ر۸ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اس زمرہ میں کاربند افراد کی تعداد ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۲۵ر۳ لاکھ سے افزوں ہوکر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۲۸ر۸ لاکھ ہوگئی، یعنی ۲ر۸ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ مذکورہ زمرہ کی کل پیداوار ۹۲-۱۹۹۱ء میں تخمیناً ۱,۷۸,۷۰۰ کروڑ روپئے، یعنی ۹۱-۱۹۹۰ء کی ۱,۵۵,۳۴۰ کروڑ روپئے سے ۱۵ فیصدی زائد ہوئی۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبہ کی ابتدا میں محض اتر پردیش میں ۲ر۲ لاکھ واحدے کاربند تھے، جن میں ۱۴ لاکھ افراد کو روزگار مہیا تھا، جن کا کل اصل سرمایہ ۱,۳۹۲ کروڑ روپے اور جن کی کل سالانہ پیداوار ۴,۱۷۳ کروڑ روپئے کے بقدر تھی۔ چنانچہ ان واحدوں کی تعداد و نیز ان کی کل پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہونے کے باوجود اس زمرہ میں کاربند افراد کی تعداد میں محض حاشیائی اضافہ ہی ہوا۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ ان واحدوں کی ۱۸ سال پیشتر ۱۹۷۲ء میں ہوئی شماری کے بعد سے اب تک ان کی ملکیت کے طرز میں معنی خیز تبدیلی ہو چکی ہے۔ ایسے کل واحدوں میں مالکانہ طرز کے واحدوں کی تعداد ۱۹۷۲ء میں ۶۱ فیصدی سے افزوں ہوکر ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۸۰ر۵ فیصدی ہوگئی، جب کہ دوسری جانب اسی مدت کے دوران شراکتی فرم کے طرز کے واحدے ۳۵ فیصدی سے کم ہوکر محض ۱۷ فیصدی رہ گئے۔ اس کے علاوہ محدود کمپنیوں کا حصہ گھٹ کر صرف ۲ فیصدی رہ گیا۔ یہ بھی نشاندہی کرنا برمحل ہے کہ چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی اصل کاری کی حد میں نمایاں تبدیلی ہو جانے کے باوجود، ۸۲ فیصدی واحدوں کی اصل کاری ایک لاکھ روپے سے کمتر ہی تھی۔ دوسری شماری (۸۸-۱۹۸۷ء) کے دوران یہ انکشاف ہی نہیں ہوا کہ کل واحدوں میں زیادہ تر کی اصل کاری ایک لاکھ روپے سے کمتر تھی، بلکہ یہ بھی ظاہر ہوا کہ ان میں سے ۹۵ فیصدی واحدے ننھے زمرہ سے متعلق تھے، جو اس زمرہ کی کل پیداوار کے ۶۰ فیصدی کے لیے جوابدہ تھے۔

مذکورہ شماری (۹۳-۱۹۹۲ء) کے مطابق ۸۸-۱۹۸۷ء کو بنیادی سال مانتے ہوئے ۹۱-۱۹۹۰ء میں کل مندرج فہرست واحدوں کی تقریباً ۳۱ فیصدی، یعنی ۸۷ر۹ لاکھ واحدے بند ہو چکے تھے اور مزید ۵۷ ہزار واحدوں کی نشاندہی سرکاری اہل کاران نہیں کر سکے تھے۔ اس صورت حال سے معرکی غرض سے اگست ۱۹۹۱ء میں چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں میں نمو کی فروغ کے تئیں گورنمنٹ نے اپنی پالیسی میں اصلاح کی غرض سے ایک اصلاحی پیشتارہ پر عمل درآمد کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن ابھی تک اس ضمن میں کوئی خاص اقدامات عمل میں نہیں لائے گئے۔ مذکورہ پیشتارہ میں مزدوروں سے متعلق چند قوانین کا خاتمہ، آبکاری محاصل میں رعایت، رعایتی قرضوں کی فراہمی، چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے ہندوستانی بینک (ایس آئی ڈی بی آئی) کے ذریعہ چھوٹی صنعتوں کی ایکویٹی تقویت، خام مال کی سستے در پر اور مستعدی سے فراہمی، و نیز ضابطہ کی سہل کاری، وغیرہ اقدامات شامل تھے۔ لیکن اس پیشتارہ کو نہ تو ابھی تک وزارت مالیات سے منظوری عطا ہوئی ہے اور نہ ہی چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کے لیے مالیاتی اداروں و نیز بینکوں سے وسائل مہیا کیے جانے

ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف اکونامکس جواہر لال نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج بارہ بنکی (یوپی)

کے تعلق سے پی آر نائیک کمیٹی کی سفارش کے تئیں ریزرو بینک آف انڈیا نے کوئی فیصلہ کیا ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے مرکزی گورنمنٹ کے بجٹ نے بھی فہرست میں اندراج کی چھوٹ کی حد کو ۵ر۷ سے بڑھا کر ۱۰ لاکھ روپے کرنے کی سفارش کو منظور کرنے کے علاوہ چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی جدید کاری و نیز نمو کے لیے کوئی تحریک نہیں کی ہے۔ درحقیقت مذکورہ زمرہ سے متعلق لوگوں کو شکایت ہے کہ چھوٹے واحدوں کی پیداوار پر آبکاری محصول کی رعایتی در کی ۵۰ لاکھ روپے کی حد کو کم کرنے اور ان کی پیداوار پر عائد ۵ فیصدی فاضل صوری قدر افزائی ٹیکس (موڈویٹ) قرض کی واپسی اس زمرہ کو کوئی سہولت پہنچانے کے بجائے بازار میں ان کی مسابقیت کو مزید کم کردے گی۔

فی الوقت چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ کا سب سے خراب پہلو ان میں آزردگی کا روز افزوں رجحان ہے۔ گورنمنٹ کے اعداد و شمار کے بموجب ملک میں چھوٹے پیمانہ کے آزردہ صنعتی واحدوں کی تعداد ۲ر۲ لاکھ ہے اور ان واحدوں کے تئیں ۲،۷۹۳ کروڑ روپے کے مساوی بینک قرض منجمد ہے۔ آج بھی مذکورہ زمرہ پر محیط صنعتی آزردگی سے مقابلہ کرنے کی گورنمنٹ کی موثر حکمت عملی وضع ہونا اب بھی باقی ہے۔ خبر ہے کہ گورنمنٹ صنعتی اور مالیاتی اصلاح کے بورڈ (بی آئی ایف آر) کے طرز پر ملک کی ہر ریاست میں ایک کل وقتی انجمن اس غرض سے قائم کرنے کی جانب مائل ہے کہ جو چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی آزردگی رفع کرنے کے مسئلہ کو حل کرنے کی سمت موثر لائحہ عمل مرتب کرے گی چونکہ چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں میں ۱۰ فیصدی سے بھی متجاوز واحدے آزردگی کی ایک نہ ایک علامت مرض سے متاثر ہیں، اس لیے مذکورہ نہج پر ایک دستوری انجمن کی اشد ضرورت ہے، جو اس زمرہ کے ایسے واحدوں کی آزردگی کی تنبیہہ کر سکے کہ جو ملک کے ۳۰ فیصدی راست برآمدات کے لیے جوابدہ ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کی مذکورہ تجویز عمل درآمد کی منزل سے تاہنوز دور ہے۔

چھوٹے پیمانہ و نیز ننھی صنعتوں کے زمرہ کی صورت حال سے متعلق ایک جائزے (۱۹۸۹ء) سے یہ انکشاف ہوا کہ مذکورہ زمرہ میں آزردگی سے متاثر کل واحدوں میں سے ۳۸ فیصدی واحدے رواں سرمایہ کی قلت سے متاثر تھے۔ ریزرو بینک آف انڈیا نے اپنے ایک حالیہ تبصرہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ چھوٹے پیمانہ کے واحدوں کو ان کی کل پیداوار کے محض ۸ر۱۱ فیصدی کے مساوی اور ننھے و نیز دیہی صنعتی واحدوں کو اُن کی کل پیداوار کے ۷ر۲ فیصدی کے مساوی ہی رواں سرمایہ فراہم ہوا، جب کہ دوسری جانب چھوٹے پیمانہ کے زمرہ کے مقابلتاً بڑے واحدوں کو ان کی کل پیداوار کے ۸ر۱۸ فیصدی کے مساوی رواں سرمایہ مہیا ہوا، لیکن وہ بھی اس ۲۰ فیصدی کی حد سے کم تھا کہ جس کے حصول کے وہ مستحق تھے۔ چنانچہ چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ کے تئیں اس تغافلانہ سلوک کی وجہ سے ۱۹۹۱ء کے اختتام تک بینکوں و نیز دیگر مالیاتی اداروں سے اس زمرہ کے واحدوں کو کل صنعتی قرضہ کا محض ۲ر۱۳ فیصدی فراہم ہو سکا، جب کہ بڑے و میانہ زمروں کے صنعتی واحدوں کو ۷ر۱۷ فیصدی حاصل ہوا۔ مزید یہ کہ اس میں مسلسل تخفیف ہوتی جارہی ہے۔ اجمالاً ۹۰-۱۹۸۹ء کے اپریل تا جولائی کی مدت میں چھوٹے پیمانہ کی صنعت کو بینکوں سے فراہم کردہ سرمایہ ۲،۴۰۸ کروڑ روپے (کل قرض کا ۸ر۱۳ فیصدی) تھا۔ اس میں سال بہ سال تخفیف ہوتی گئی کہ ۹۱-۱۹۹۰ء کی جوائی مدت کے دوران کل فراہم کردہ سرمایہ ۴۳۸ ارکروڑ روپے (کل قرض کا ۵ر۱۰ فیصدی)، ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۷۷۹ کروڑ روپے (کل قرض کا ۵ر۷ فیصدی) اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۴۸ر۳ کروڑ روپے (کل قرض کا ۹ر۱ فیصدی) ہی تھا۔ بہت سے معاملات میں تو قرض کی منظوری کے بعد بھی بینکوں نے کسی نہ کسی بہانہ قرضہ کی رقم دیر سے مہیا کی یا آخر میں قرضہ رد کردیا۔ اکثر ایسا عمل اس بنیاد پر کیا گیا کہ معیادی قرضہ فراہم کرنے والے اداروں کے ذریعہ پروجیکٹ کی از سر نو پڑتال ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بینک و نیز مالیاتی ادارے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے تئیں چند سے زیادہ ہی سخت گیر رویہ اختیار کرتے ہیں اور بیشتر ان کے اصل دائرہ کا تخمینہ اس حد تک مستبدانہ طور پر کیا جاتا ہے کہ منظور شدہ قرض مذکورہ واحدوں کی کاروباری اصل کی حاجت کے معاملہ میں کمتر ہوتا ہے۔ عموماً ننھی صنعتوں کے تئیں حکام کے متعصبانہ رویہ کے باعث ان کی تیز رو فروغ کی اسکیموں پر عمل درآمد ہی نہیں ہو پاتا ہے، حالانکہ اس ضمن میں یہ حقیقت قابل غور ہے کہ ننھی صنعتیں، چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے ۹۶ فیصدی حصہ پر محیط ہیں۔ گورنمنٹ کی درجہ بندی کے مطابق چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدے میں انتہائی اصل کاری کی حد ۶۰ لاکھ روپے اور ننھے صنعتی واحدوں کے لیے محض ۵ لاکھ روپے مقرر ہے۔

چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے لیے آبکاری محصول کی بنیادی حد استثنیٰ پر گورنمنٹ کے ذریعہ نظر ثانی نہ کیے جانے کے باعث بھی یہ صنعتیں مزید دقتوں سے دوچار رہتی ہیں۔ نتیجتاً آبکاری محصول سے بچنے کی غرض سے یہ صنعتی واحدے جان بوجھ کر اپنی پوری استعداد بھر کام نہیں کرتی ہیں، یا اپنی ہی قسم کا ایسا فرضی متوازی واحدہ قائم کرلیتی ہیں کہ جس کی سالانہ فروختگی ۲۰ لاکھ روپے سے بھی کم رہتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کی نازیبا حرکتوں سے انھیں باز رکھنے و نیز ان کی پیداوار کی ہمت افزائی کرنے کی غرض سے بنیادی حد استثنیٰ میں اضافہ کے لیے اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ اس اصرار سے گورنمنٹ متفق تو ہوگئی ہے، لیکن ابھی تک اس معاملہ میں یقین دہانی کو عملی شکل نہیں دی جاسکی ہے۔ ان تمام مختلف عوامل و نیز ملک میں امن و قانون کی حالت میں ابتری آنے کی وجہ سے یہ اندیشہ ہے کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ میں آزردگی کو مزید شہ مل جائے۔ مثال کے طور پر فرید آباد و نیز نوائیڈہ میں چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں میں سے کم از کم ۴۰ فیصدی حال میں بند ہوگئے ہیں۔ چنانچہ اگر گورنمنٹ کے وعدہ کے مطابق لازمی اصلاحات پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا ہے، تو خدشہ ہے کہ حالات مزید ابتری اختیار کرلیں گے۔

مذکورہ منظر نامہ کے پیش نظر ہی گورنمنٹ نے ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر شری پی آر نائیک کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی کہ جو چھوٹے زمرہ کی صنعتوں کے لیے قرضہ فراہمی میں فراخی بہم پہنچانے کی غرض سے ایک اصلاحی محضر نامہ سفارش کرے و نیز ۵ لاکھ روپے کی انتہائی اصل کاری کے ساتھ کاربند ننھے واحدوں کی توسیع و ہمت افزائی کے لیے معیار عمل کا ایک مجموعہ وضع کرے۔ لہٰذا نائیک کمیٹی نے سفارش کی کہ چھوٹے

پیمانہ کی صنعتوں کی نمو اور جدید کاری کے لیے، ان کو مہیا کیے جانے والے سرمایہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔

مذکورہ کمیٹی کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل خاص خاص سفارشات تھیں: (۱) ایک لاکھ روپے کے قرض کی انتہائی حد والے دیہی و ننھے صنعتی واحدوں کو چھوٹے پیمانہ کی صنعت کے تئیں 'ترجیحی زمرہ کے قرض' کے ذیل میں افضلیت دی جائے۔ اس زمرہ کے لیے درکار سرمایہ کا تخمینہ ۱۹۸۹-۹۰ء کو بنیادی سال مان کر کیا جائے اور سال مذکور کے تئیں تخمیناً حاصل رقم میں مارچ ۱۹۹۰ء کی کل بقایا رقم سے ۵ فیصدی زائد مزید جوڑ دی جائے۔ (۲) ابتداً ایک لاکھ روپے کے قرض کی انتہائی حد والے واحدوں کی خبر گیری کرنے کے بعد 'ترجیحی زمرہ کے قرض' کے ذیل میں ۱ لاکھ روپے کے قرض کی حد والے واحدوں کے کاروباری قرض کی مکمل بازیافت کی جائے۔ (۳) چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ میں ۵ لاکھ روپے سے زائد اصل کاری والے نسبتاً بڑے واحدوں کے لیے بھی بینکوں کے ذریعہ مقررہ حد تک مکمل قرضہ فراہمی کی جانا چاہیئے۔ فی الوقت مروج طریقہ کے مطابق بینک ان واحدوں کو ان کی سالانہ فروختگی کے ۲۰ فیصدی کی حد تک ہی کاروباری سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔ (۴) بینکوں کی شاخوں کے مینیجران کو ان واحدوں کی منظور شدہ حدوں سے بالاتر ۱۰ فیصدی تک ایڈہاک اضافہ کرنے کا اختیار ودیعت کیا جائے، تاکہ یہ واحدے ہیڈ کوارٹر سے منظوری آنے کی طوالت میں الجھے بغیر غیر متوقع حالات سے روبراہی حاصل کرسکیں۔ (۵) ۲ لاکھ روپے تک منظور شدہ قرض کے لیے ضمانتی سیکورٹی کا ضابطہ ختم کر دیا جائے۔

مندرجہ بالا سفارشات کے نتیجہ میں عموماً چھوٹے پیمانہ اور ننھے صنعتی زمرہ کے لیے مالیاتی اداروں و نیز بینکوں سے امکانی قرض کی حد میں توسیع تو ہو گئی ہے لیکن بینکوں اور مالیاتی اداروں نے ان واحدوں کو رعایتی دروں پر روا پیشگی کی سہولیت کو بہرحال ختم کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ کمیٹی کی سفارشات میں چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ کی جدید کاری کرنے و نیز ان میں آوردگی کے بارے میں اضافہ کی روش کی تاکید کرنے کی غرض سے بھی اقدامات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بہرنوع تمام مذکورہ بالا اقدامات کی موثر عمل کاری کا انحصار اس بات پر رہے گا کہ گورنمنٹ ان سفارشات پر عاجلانہ طور پر کہاں تک عمل درآمد کرتی ہے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ملک میں اب تک صنعتی اشیاء کا بازار عملاً 'بازار فروخت کار' اور صارفین کا اقتدار اعلیٰ مفقود رہا ہے۔ ٹارف کی بلند دروں سے محفوظ، ملکی صنعت نے داخلی بازار میں مطلق اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اور صارفین کے دائرہ انتخاب کو ملکی پیداوار تک ہی محدود کر رکھا ہے۔ چنانچہ چھوٹی صنعتوں کے زمرہ کو اب تک محض ملکی مصنوعات کے ساتھ ہی مسابقت کا سامنا تھا، لیکن حالیہ اقتصادی اصلاحات کے ذیل میں معاشی کشادگی کے تئیں داخلی بازار میں اب بین الاقوامی مسابقت کا بھی سامنا ہوگا۔ چنانچہ داخلی بازار اب محض بازار فروخت کار، نہ رہ کر بین الاقوامی بازار میں تبدیل ہو رہا ہے، جس میں صارفین کے اقتدار اعلیٰ کے مکمل طور پر بحال ہو جانے کے سبب چھوٹے پیمانہ کی صنعت کی مصنوعات کو ملکی صنعت اور بین الاقوامی صنعتی زمرہ کی شدید مسابقت پیش ہوگی۔ ان حالات میں، بشمول چھوٹے پیمانہ کے زمرہ کی مصنوعات کے، ملکی مصنوعات کے لیے اپنی پیداوار کی فروخت کے تئیں فروختگی عوامل و نیز اس کا نظام وضع کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ فروختگی نظام و عوامل کے لیے اصولاً مصنوعاتی واحدوں کی سالانہ فروخت کی در سے بلند تر در پر سرمایہ درکار ہوگا۔ یہ حقیقت اس وقت مزید اہمیت حاصل کرلے گی کہ جب فروختگی نظام چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی فروخت میں اضافہ کرنے کی جانب عامل ہوگا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ کل فروخت کے تناسب کے اعتبار سے فروختگی نظام کی 'نفع گنجائش' نسبتاً کم ہونے کے باعث منافع کی باز اصل کاری سے بڑھتی ہوئی پیداوار کی تسویق کی انجام دہی فروختگی نظام کے لیے ممکن نہیں ہو سکتی ہے۔ مزید برایں، فروختگی نظام کے 'قائم اثاثہ' و نیز 'اساس اصل' کے کم ہونے کے باعث اس کو تمسکات اور انفرادی جمع سے بھی ضرورت بھر سرمایہ فراہم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی تسویق کے فروختگی نظام کے تئیں سرمایہ کی بسط و نیز سرمایہ فراہمی کا طریقہ مرتب کرنے کی غرض سے ایک گورنمنٹ کمیٹی کی تشکیل کے لیے وکالت کی جا رہی ہے۔

بہرنوع چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے ہندوستانی بینک (ایس آئی ڈی بی آئی) نے چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی پیداوار کے فروختگی نظام کو معقولیت عطا کرنے کی غرض سے اس نظام کی سرمایہ کاری کی ایک اسکیم مرتب کی ہے، تاکہ مذکورہ زمرہ معقول نظام فروختگی کے فقدان کے باعث موجودہ اضمحلالی کیفیت سے روبراہ ہو سکے۔ مذکورہ بینک دیہی و نیم شہری علاقوں تک دسترس حاصل کرنے کی غرض سے فروختگی کے مناسب و معقول نظام کو وسیلہ بنانے پر بھی غور کر رہا ہے۔ مزید برآں، بینک امداد باہمی اداروں و نیز مشہور فروختگی کی ایجنسیوں کو بھی چھوٹے پیمانہ کی صنعت کی پیداوار کو صحیح سمت رواں کرنے کی کوششوں کے تئیں امداد فراہم کرنے کی تجویز بھی کر رہا ہے۔ اس مقصد سے ایسے اداروں و نیز ایجنسیوں کو دفتری عمارت، ساز و سامان، اور گودام خریدنے کے لیے بھی مالی اعانت دے گا۔ چنانچہ دیہی اور چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں کی پیداوار کی منفعت بخش تسویق کے لیے ایک معقول فروختگی نظام کی وضع کاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ بھی اس پر منحصر ہے کہ بینک و دیگر مالیاتی ادارے کہاں تک اس ضمن میں فروختگی نظام کو مالیہ فراہم کرکے ملک کے معاشی فروغ کے لیے عموماً اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے تئیں خصوصاً کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ●

محمد عارف

ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری - نیا ماحول اور نئی سہولتیں

ہندوستانی معیشت میں گذشتہ دو برسوں میں کافی تیزی کے ساتھ بہتری دیکھنے کو ملی ہے گذشتہ برس صنعتی ترقی کی رفتار میں ۴ فیصد تک اضافہ دیکھنے کو ملا۔ اس برس یعنی ۹۴-۱۹۹۳ء میں صنعتی ترقی کی شرح میں ۶ فیصد تک کا اضافہ متوقع ہے۔ آئندہ سال کے بعد سے یہ شرح ترقی مستحکم بنیادوں پر ۶ فیصد رہے گی۔ موجودہ اقتصادی اصلاحات اگر کامیاب ہو سکیں تو اقتصادی محاذ پر مزید بہتری متوقع ہے۔

صنعتی ترقی کی شرح میں اضافہ سے ہر شخص کے لیے سرمایہ کاری کے نئے مواقع میسر آئیں گے۔ تمام بڑی اور چھوٹی کمپنیوں کے منصوبوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ملک میں نئی نئی مصنوعات کی تیاری کا پروگرام ہے اور نئی نئی منڈیوں کی تلاش بھی کی جا رہی ہے جہاں ہندوستانی مصنوعات فروخت کی جا سکیں گی۔ مصنوعات کی تیاری میں نیاپن لانے کے لیے باہر سے مدد کی جا رہی ہے، اس کام کو ترقی دینے کے لیے نئے شراکت کاروں کی تلاش جاری ہے۔ اس طرح صنعتی پیداوار کو مزید متحرک بنایا جا رہا ہے۔ اسی لیے بیرونی سرمایہ کاری کے لیے خوشگوار ماحول اور نئے نئے مواقع میسر ہیں۔ گذشتہ دو برسوں سے غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے ہندوستان میں بہت سی رعایتیں دی گئیں۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو ۳۴ بڑی صنعتوں میں ۵۱ فیصد تک کی سرمایہ کاری کی اجازت دی گئی۔ اشیائے صارفین کی صنعتوں کو چھوڑ کر باقی تمام بڑی صنعتوں میں غیر ملکی سرمایہ کار ۵۱ فیصد تک سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی غیر ملکی سرمایہ کار ۵۱ فیصد سے بھی زیادہ سرمایہ کاری کا خواہشمند ہے یا پھر وہ ۳۴ بڑی صنعتوں کے علاوہ کسی اور طرح سرمایہ کاری کا خواہشمند ہے، تو اس کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے وزیر اعظم کے دفتر میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے فروغ سے متعلق ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کار کو اس سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور یہ دو یا تین ہفتوں میں اس بارے میں فیصلہ لے لیتا ہے، اس کے فیصلے زیادہ تر اجازت کی صورت میں ہی ہوتے ہیں چنانچہ اس سے رجوع کرنے والے تمام غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کی اجازت مل چکی ہے۔

اگر کوئی سرمایہ کار براہِ راست سرمایہ کاری کے جوکھم سے بچنا چاہتا ہے، تو وہ اسٹاک ایکسچینج کی صورت میں سرمایہ کاری کر سکتا ہے اور وہ حصص یا تمسکات وغیرہ کی صورت میں سرمایہ لگا سکتا ہے۔ اس طرح کی اجازت ایسے غیر ملکی سرمایہ کاری والے اداروں کو دی جاتی ہے جو اپنے اپنے ملک میں اس کام کے مجاز اور رجسٹرڈ ادارے ہیں۔ اُن کو ہندوستان میں سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج بورڈ کے یہاں درخواست دینی پڑتی ہے۔ یہ دفتر بمبئی میں ہے۔ یہی بورڈ غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دیتا ہے۔ لائسنس پانے کے بعد وہ شیئرز اور ڈیبنچرز (تمسکات) کے ہندوستانی بازار میں آزادانہ تجارت کر سکتے ہیں۔

سردست ہندوستان کا اسٹاک بازار مندا ہے۔ اس کی قیمتیں اپریل ۱۹۹۲ء کی عمومی قیمتوں کی تقریباً نصف رہ گئی ہیں، اگر صنعتی ترقی میں اضافے کے نتائج مکمل ہو جاتے ہیں تو یہ قیمتیں ضرور بڑھیں گی۔ ہندوستان کے سرمایہ بازار کے امکانات کافی حد تک روشن ہیں اور جب قیمتیں بڑھتی ہیں، تو یقیناً شیئر ہولڈروں کو کافی فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہندوستان کے سرمایہ بازار سے فائدہ اٹھانے کی زبردست گنجائش ہے۔

ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کا ماحول غیر ملکی تجارتی پالیسیوں میں اصلاح و بہتری کی وجہ سے بن سکا ہے۔ اس سلسلے میں روپئے کی قیمت میں تبدیلی کی گئی ہے۔ جون ۱۹۹۱ء میں ڈالر کی قیمت ۲۰ روپئے تھی۔ آج یہ تقریباً ۳۱ روپئے ہے اس سے برآمداتی صنعتوں کو بھاری منافع ہوگا دو سال قبل یہ امکانات نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے نئے صنعت کاروں نے اشیاء کی برآمداتی تجارت میں گہری دلچسپی لی ہے۔ زیادہ تر حالتوں میں امپورٹ لائسنسوں کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے، اب یہ ممکن ہے کہ بینک سے رابطہ قائم کر کے باہر ملکوں سے ضرورت کا سامان منگا لیا جائے۔ زرمبادلہ کے طریق کار اور قانون کو بہت آسان بنا دیا گیا ہے۔ اب امپورٹر یا ایکسپورٹر کو ریزرو بینک جانے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے وہ اپنے بینک ہی سے غیر ملکی زرمبادلہ کا معاملہ کر سکتے ہیں۔ ایکسپورٹروں کے لیے پیشگی لائسنس دینے کا ایک فراخدلانہ نظام شروع کیا گیا ہے۔ جب ان کو باہر سے آرڈر ملے تو وہ اس کے لیے درکار خام مال

باقی صفحہ ۱۰ پر

پی ایس سی (انجینئرنگ) ۱۲/۱-اے جنتی پورہ غازی آباد

سید اختر حسن

نئی اقتصادی پالیسی معاشی ترقی کی طرف ایک قدم

آزادی کے بعد ہندوستان نے اپنی اقتصادی پالیسی کا نقشہ تیار کرکے اپنی اقتصادی ترقی کی راہ کا انتخاب خود کیا اور اس سلسلے میں جس نظریے کو اپنایا گیا اس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور فطری حالات کو پیش نظر رکھا گیا۔ ان اقتصادی پالیسیوں پر عمل درآمد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی لیکن ملک کی عام زندگی کا معیار حد درجہ بہتر ہوا۔ ملک سے سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوا، غریبی اور مفلسی میں جکڑے لوگوں کی فیصد میں کمی آئی۔ اور ہمارا ملک خوشحال ہوکر آہستہ آہستہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگا۔ لیکن جیسے جیسے اپنا ملک ترقی کرتا گیا آبادی کے تناسب سے اس کی ضرورتوں میں بھی بیش بہا اضافہ ہونے لگا۔ لہٰذا ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر موجودہ حکمراں جماعت کی جانب سے ہندوستان کی اقتصادی پالیسی میں نیاپن لانے کی بات سوچی گئی۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے ۱۹۹۱ء میں دفعتاً ہندوستان کی اقتصادی پالیسیوں میں زبردست انقلاب آیا۔ اور ہندوستان نے ایک نئی معاشی پالیسی کو تشکیل دینے کا کام شروع کیا۔ یہ نئی معاشی پالیسی روایتی اقتصادی پالیسی سے بہت مختلف ہے اور سارا ہندوستان اسے پر امید نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ بعض حلقے اس نئی اقتصادی پالیسی میں کیے گئے اقدامات سے خائف وہراساں بھی ہیں۔

سوداگر محلہ، ڈاکخانہ گیتا پریس گورکھپور، یوپی ۲۷۳۰۰۵

ایسے لوگوں کا خیال ہے... کہ ہمارے ملک کے سامنے اقتصادی غلامی کا جو نیا بحران پیدا ہوا ہے اس کی خاص وجہ نئی اقتصادی پالیسی ہے، اس نئی اقتصادی پالیسی کے تحت مرکزی حکومت نے کثیر ملکی کمپنیوں کو صنعتی سہولیات فراہم کردی ہے۔ حکومت کی اس نئی اقتصادی پالیسی کی وجہ سے ہمارے ملک میں غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ مزید سنگین ہوجائے گا بلکہ دیہی اور چھوٹی صنعتوں کا مکمل طور پر صفایا ہوجائے گا۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں جب نئی حکومت نے اپنا کام شروع کیا تھا تو اس وقت ملک شدید اقتصادی بحران سے گذر رہا تھا۔ ملک کا اقتصادی نظام پوری طرح سے درہم برہم ہوچکا تھا حتیٰ کہ اپنے ملک کا سونا دوسرے غیر ملکوں کے پاس گروی رکھنے تک کی نوبت آن پہنچی تھی۔ ایسے میں ہندوستانی معاشی نظام میں بیرونی ملکوں کا اعتماد ختم ہو رہا تھا۔ زرمبادلہ میں زبردست کمی ہوگئی تھی اور مہنگائی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مہنگائی کو دور کرنے، تجارتی عدم توازن کو دور کرنے اور معاشیات میں نئی روح پھونکنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے نئی سنگلاخ حقیقتوں سے آنکھ ملاتے ہوئے وزیر اقتصادیات جناب منموہن سنگھ نے نئی اقتصادی پالیسی کا مانگ دہل اعلان کیا۔ اس پالیسی میں ہندوستانی روپئے کا دام بین الاقوامی بازار میں کم کردیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ تجارتی پالیسی میں بھی زبردست ترامیم کیے گئے۔

زرمبادلہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان میں برآمدات کرنے کے قوانین میں بھی بہت سی سہولتیں دی گئیں ہیں اور اس پالیسی سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کو ایک سال میں ۷۵ کروڑ روپئے کا زرمبادلہ حاصل ہوگا اور حکومت کو ۲۵۰ کروڑ روپئے کی آمدنی ہوگی۔

ہندوستان میں بیرونی ممالک سے واپس آنے والے ہندوستانیوں کو اپنے ساتھ اب زیادہ سے زیادہ ایک کلوگرام چاندی لانے کی چھوٹ ملی ہے۔ جس پر ۵۰۰ روپئے کی ڈیوٹی ٹیکس ادائیگی نافذ کی گئی ہے۔

۱۹۹۱ء میں شروع کی گئی معاشی وصنعتی پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ہیں۔ پبلک سیکٹر میں اب صرف ۸ عدد صنعتوں کو رکھا گیا ہے۔ اور باقی کو بیرونی یا ذاتی سرمایہ کاری کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ حکومت ہند کے ذریعہ پابندی ہٹا دینے سے بیرونی سرمایہ کاروں کو نیا حوصلہ ملا ہے۔ اب بیرونی کمپنیاں ہندوستان میں جائداد کی خرید وفروخت کرسکتی ہیں۔ انھیں ہر علاقوں میں دعوت دی گئی ہے۔ لائسنس اور پرمٹ حاصل کرنے کی ضرورت کو ختم کردیا گیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس طرح ہندوستان کی اقتصادی پالیسی 'کھلے بازار' کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس طرح بیرونی سرمایہ کاری کو فروغ دینے سے نئی نئی صنعتوں کا قیام عمل میں آئے گا۔ اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے لیے روزگار کے نئے مواقع فراہم ہوں گے۔

اقتصادی اصلاح کے اس دور میں پیداوار کو بڑھانے، مقابلے کو بڑھاوا دینے اور ایسی صنعت کاری کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ جس سے روزگار کے نئے

فراہم ہوسکیں گے۔ برآمدات کو فروغ دینے کے لیے
ا بندشوں کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اور ان بندشوں کو ہٹانے
مد صرف برآمدات میں تیزی سے ترقی ہے۔ تاکہ
ی توازن کو برقرار رکھا جاسکے۔ حکومت نے اس
ت میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر دی ہیں۔ اب برآمدات
نے والوں کو اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ انھیں نہ صرف
بین الاقوامی بازار سے آرڈر حاصل کرنا ہے بلکہ اپنے
اں تیار اشیا کی کوالٹی کو بھی بہتر بنانا
۔ جاپان نے اپنے اشیا کی بہترین پیش کش کی وجہ سے
الاقوامی بازاروں میں خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کیا
۔ اب برآمدات کا دائرہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔ پہلے
سامان باہر بھیجے جاتے تھے اس میں ہیرے، جواہرات
رچمڑے کے سامان تو تھے ہی، اب جیپ، سلے سلائے
ڑے، زراعت سے متعلق سامان، کاجو، کافی وغیرہ زیادہ
مقدار میں باہر بھیجے جاسکتے ہیں۔

نئی اقتصادی پالیسی کے تحت اندرون ملک،
چھوٹے صنعت کاروں کو فروغ دینے اور سکروں کی
اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے حکومت نے کئی اقدامات
کیے ہیں "بے سہارا بکروں کے لیے مزید رقومات ادا کرنے
کی پالیسی" اس پالیسی کا بنیادی مقصد اُن سکروں کی
معاشی حالت بہتر بنانا ہے جو خط عزبت سے نیچے
زندگی گذار رہے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت "بکرسیوا
کیندر" کھولے جائیں گے۔

پچھڑے اور دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے بھی
حکومت نے نئے اقدامات کیے ہیں۔ اس کے تحت چھوٹی
بڑی نالیاں درست کرانا، ابتدائی تعلیم گاہوں کے لیے
عمارت کا انتظام کرانا، پینے کا پانی مہیا کرانا، ہر گھروں میں
برقی روشنی کا انتظام کرانا اور صحت کی دیکھ بھال کے لیے
طبی مراکز قائم کرانے جیسے اقدامات بھی شامل ہیں۔ مرکزی
حکومت کے ذریعہ ان پروگراموں کے عمل درآمد کے لیے
۲۵ لاکھ روپئے اور ریاستی حکومت کے ذریعہ پندرہ لاکھ
روپیے دیئے جائیں گے۔ "پروجیکٹ پیکیٹ" ، پروگرام
کے عنوان سے ایک تیسری پالیسی کا بھی اعلان کیا
گیا ہے۔

۲۲ جون ۱۹۹۱ء کو قوم کے نام ایک خطاب میں
ہندوستان کے وزیر اعظم جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے
کہا تھا کہ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کے فوائد صرف
شہروں تک محدود ہیں، ہم اگلے ڈیڑھ سال میں دیہات
کے غریب لوگوں کو نیز آدی باسی اور ریگستان کے دور
دراز کے ایک ایک گاؤں میں (۱۵سو بلاکوں کے) دوکانیں
کھولنے کی کوشش کریں گے۔ اور وہاں ضرورت کے
تحت سامان مہیا کرائے جائیں گے۔

اپنے ۹۴-۱۹۹۳ء کے موجودہ بجٹ کے تحت
مرکزی حکومت نے ترقیاتی اخراجات میں قابل ذکر اضافہ
کیا ہے۔ بوڑھوں اور معذوروں کے نگرانوں کو انکم ٹیکس
راحت دی گئی ہے پیداواری اور درآمد محصولوں میں کمی
کردی گئی ہے۔ بینک قرضے، اور جمع رقومات پر سود کی
شرح میں ایک فیصد کی کمی کر دی گئی ہے۔ اب رہائشی
مکانات واملاک کو سرکاری ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔
اور صنعتی نقطہ نظر سے پسماندہ علاقوں میں نئی صنعتوں کو
۵ برس تک کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبوں کے تحت مکمل روزگار
کے حصول اور غربت ہٹاؤ تحریک چلائی جارہی ہے جس
کا مقصد خط غربت کے نیچے گذر بسر کر رہے اُن لوگوں
کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ فردی قوت
کے بہتر استعمال کے لیے روزگار کے مواقع بڑھائے جائیں
گے۔ اگلے دس سالوں میں سبھی کو کام مہیا کرایا جائے گا۔
اس کے لیے جواہر روزگار اسکیم کے تحت رقم مہیا کرائی
جائے گی۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء سے "پردھان منتری روزگار
یلاں" کے عنوان سے ایک نئی اسکیم شروع کی گئی ہے جس
کا مقصد دس لاکھ بے روزگار نوجوانوں کو روزی روٹی سے
جوڑنا ہے۔ غربت اور مفلسی میں گھرے ہوئے لوگوں، دلتوں،
پچھڑے طبقے اور اقلیتوں اور مالی امور میں کمزور عورتوں
کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اقتصادی پالیسی کے
تحت کئی نئی نئی دیگر اسکیمیں بھی شروع کی گئی ہیں۔ پنچایتوں
کو مزید اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ حکومت کے ذریعہ
اٹھائے جارہے قدموں کا فائدہ چھوٹے اور درمیانی طبقے
کے کسانوں، کاریگروں اور مزدوروں کو مل سکے۔ ۱۵ اگست
۱۹۹۳ء کو لال قلعے سے تقریر کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم
نے کہا تھا کہ "ہم اس بات کا اعلان کرتے ہوئے خوشی
محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے صفائی کرمچاریوں کے لیے بھی
ایک قانونی کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے
متعلق بل پارلیمنٹ کے سامنے پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔
سروں پر میلا ڈھونے کی غیر انسانی رسم کو ختم کرنے کے لیے
ہم اٹل ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے اس سال ۱۱۱ کروڑ
روپئے کی گنجائش رکھی ہے۔

اقلیتوں کے لیے ۵ سو کروڑ روپے کے مجازی
سرمایہ کے ساتھ نیشنل مائناریٹی فائننس اینڈ
ڈیولپمنٹ کارپوریشن بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔
وزیر اعظم کے کہنے کے مطابق اقلیتوں کی اقتصادی ترقی
کے لیے بھی ضروری قدم اٹھائے جائیں گے۔

حکومت کی نئی پالیسیوں اور پروگراموں کا مقصد
سرمایہ کاری میں اضافہ کرنا، روزگار کو بڑھانا، افراط زر کی
شرح کم کرنا، ہمہ جہت ترقی کو فروغ دینا، غریبی کو ختم کرنا،
امن و قانون کو برقرار رکھنا اور سماجی انصاف کو یقینی بنانا
ہے۔ اور ان سب کی ترقی کے ساتھ ہماری سماجی اور
اقتصادی ترقی جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے سنجیدگی سے محسوس
کیا جارہا ہے کہ معیار زندگی کو بہتر بنانے اور غربت کو مٹانے
کے لیے ہمیں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی پر بھی روک لگانی
ہوگی، ناخواندگی کو دور کرنا ہوگا، تعلیم کا معیار بہتر بنانا ہوگا۔
تاکہ غریبوں اور کمزور طبقات کے لوگوں کو صحیح طریقے سے
ان کا فائدہ مل سکے۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئی اقتصادی پالیسی
کے تحت ہندوستان اپنے روایتی اور قدیمی دائروں سے
باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب بیجا قانونی دخل اندازوں
کا زور ختم ہو چکا ہے۔ لائسنس اور پرمٹ کی بدعنوانیوں
سے فروغ پا رہی افسر شاہی ختم ہو رہی ہے۔ اور
ہندوستانی معیشت بین الاقوامی معیشت کا حصہ
بن رہی ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

کے۔ بی۔ لال کلشریشٹھ

اقتصادی تبدیلی کی راہ پر

بھارت نے اپنی اقتصادی اصلاحات کے فروغ کے سلسلے میں جو قابل تعریف پیش رفت کی ہے، وہ اب وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ اصلاحات کا عمل بہت رواں رہا ہے اور بہت سے مختصر مدتی نتائج بہت زیادہ سماجی اور اقتصادی اخراجات کے بغیر حاصل کئے جا چکے ہیں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک کے برخلاف، بھارت نے افراط زر، بے روزگاری اور افراتفری کے حالات سے گریز کیا ہے، جو ترقی پذیر ممالک میں اس قسم کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ رونما ہوئے ہیں۔

صنعت، تجارت، شرح تبادلہ اور غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق پالیسیوں کی وسیع پیمانے پر جو نظر ثانی کی گئی ہے، اس کے نتائج بہت حوصلہ افزا رہے ہیں۔ درحقیقت بھارت، جو ایک کامیاب جمہوریت ہے، اب ایک بیش میں معیشت بھی ہے۔ سرمایہ کاری کے لیے کثیر ملکی کمپنیوں کو متوجہ کرنے پر سرمایہ جاتی منڈیوں اور ٹیکس نظام کی تشکیل نو کرنے کی غرض سے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں۔ حکومت توانائی، خاص طور سے بجلی، ہائیڈرو کاربن، ہلکے سازوسامان کی تیاری و فروغ کے شعبوں میں نیز ان دیگر شعبوں میں براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھتی ہے، جن میں برآمدات کے لیے بہت زیادہ مواقع ہیں۔

حکومت کے قواعد وضوابط کو آسان بنا کر نیز غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے مقررہ شرائط کو دنیا بھر میں رائج موجودہ طریقہ کے حتی الامکان مطابق بنا کر ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے، جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ تعداد میں غیر ملکی سرمایہ کاریاں حاصل کرنا ہے۔ ۳۴ ترجیحی صنعتوں کی مقررہ فہرست میں ۵۱ فیصد ایکویٹی تک غیر ملکی سرمایہ کاری کی منظوریوں کو خودکار بنا دیا گیا ہے، جس کے لیے صرف ریزرو بینک آف انڈیا میں اندراج کے طریقے کی شرط ہے۔

۵۱ فیصد ایکویٹی سے زیادہ کی سرمایہ کاری کی بھی اجازت دی گئی ہے لیکن یہ اجازت غیر ملکی سرمایہ کاری کے فروغ سے متعلق بورڈ (ایف آئی پی بی) کی منظوریوں کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ، بھارتی کمپنیوں کے لیے غیر ممالک میں سرمایہ کاری کرنے اور اس سلسلے میں عالمی روابط کو فروغ دینے کے ضابطے کو بھی آسان بنایا گیا ہے۔

غیر ملکی کمپنیوں پر تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں تاکہ وہ بھارت میں کسی ایجنٹ یا کمپنی کے ذریعہ کام کر سکیں اور ٹریڈ مارکوں کا استعمال کر سکیں نیز تجارتی سرگرمی جاری رکھ سکیں اور اس طرح سرمایہ کاری اور برآمدات کو فروغ دینے کے لیے بھارتی کمپنیوں کے ساتھ برابر کا مقابلہ ہو سکے۔

مزید برآں محصول کی اوسط سطح میں بتدریج کمی، صارفین کی اشیاء کے لیے درآمداتی پالیسیوں اور کسٹمز محصولات کو معقول بنانے وغیرہ سے بین الاقوامی منڈی میں مقابلہ جاتی صلاحیت میں اضافہ کرنے میں مدد ملے گی۔

اشیاء سازی کے شعبوں میں براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری (ڈی ایف آئی) کی اہمیت زیادہ ہے لیکن کچھ مصنوعات کے سلسلے میں بھارت سے عالمی منڈی کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے بنیادی ڈھانچے کی یکسانیوں پر بھی زور دیا گیا ہے۔ حکومت نے غیر ممالک میں سرمایہ کاروں کو ایکویٹی کے قابل تبدیل تمسکات جاری کرنے اور انہیں ٹیکس کے فوائد بہم پہنچانے کی غرض سے اچھے ریکارڈ والی کمپنیوں کو اجازت دینے کے سلسلے میں رہنما خطوط جاری کئے ہیں۔ غیر ممالک میں سرمایہ کاروں کو قابل تبدیل بونڈز اور ایکویٹی جاری کرنے کے سلسلے میں بھارتی کمپنیوں کو اجازت دینے کی ایک اسکیم بھی موجود ہے۔

بڑے سازوسامان کی درآمدات کو آسان بنا دیا گیا ہے تاکہ ملک کی غیر ملکی تجارت کو آئندہ چند برسوں میں مجموعی اندرون ملک پیداوار کے ۲ فیصد کی سطح تک پہنچا دیا جائے۔ نئی صنعتی پالیسی کے اقدامات میں سے ایک اقدام غیر ملکی سرمایہ کاری کے سلسلے میں نیا نظریہ ہے، جو ٹیکنولوجی کی سطحوں کو اوپر اٹھانے، صنعت کو عالمی معیشت کے ساتھ مربوط کرنے اور زیادہ وسائل پیدا کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

پالیسی میں برآمدات کے فروغ کے لیے متعدد نئے اقدامات شامل ہیں۔ برآمداتی پیداوار سے متعلق درآمدات کو، جو محصول سے مستثنیٰ ہے، مالیت پر مبنی پیشگی لائسنس کا نظام شروع کر کے آسان بنا دیا گیا ہے۔ بڑے سازوسامان پر درآمداتی محصول بھی زیادہ برآمداتی ذمہ داری کے ساتھ کم کر دیا گیا ہے۔

بھارت نے پالیسیوں کو نرم اور آسان بنانے کے جو اقدامات کیے ہیں، ان کی پائیداری کے بارے میں اب امریکہ میں کم شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ اصلاحات

باقی صفحہ ۱۳ پر

یم احمد

عمومی معاہدہ برائے محصولات و تجارت

(GATT)

جیسے جیسے ضرورتیں بڑھتی ہیں ویسے ویسے مسائل یتے ہیں اور جیسے جیسے مسائل بڑھتے ہیں ان سے نمٹنے کے دابیر و تراکیب اختیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان جب د ہوا تو تجارت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس وقت ریات بھی کم اور مختلف تھیں۔ بلکی تجارت کی راہ تعین اور مسدود تھی بین الاقوامی سطح پر ہندوستان زیادہ عام مال برآمد کرتا تھا اور لین دین کا دائرہ دو طرفہ بنیاد چند ہی بیرونی ممالک سے تھا اور اس کا دار و مدار بھی ارتی مقاصد سے زیادہ دو طرفہ تعلقات پر ہوتا تھا یہ ف ہندوستان کی ہی بات نہیں تھی بلکہ دنیا کے دیگر بشتر ترقی پذیر ممالک میں بھی یہی حال تھا۔ یہ ممالک رقی یافتہ ممالک کے رحم و کرم پر جی رہے تھے۔ دو طرفہ عارت میں زیادہ فائدہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک ہی د ہوتا تھا۔ ان حالات سے نمٹنے اور ایک موثر و مفید نجارتی نظام قائم کرنے کے لیے ۱۹۴۷ء میں جینوا میں یک ادارے کا قیام عمل میں آیا جس کا نام "عمومی معاہدہ برائے محصولات و تجارت" رکھا گیا۔ اس ادارے کا مقصد عالمی تجارت کے لیے صحت مند ماحول پیدا کرنا، عالمی تجارت کے اصول مرتب کرنا اور اس ضمن میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہوانا میں ہوئے اجلاس سے لے کر ۱۹۸۰ء میں یوروگوئے میں منعقد ہوئی سربراہ کانفرنس تک اس ادارے کے ممبران کی تعداد بڑھ کر ۱۱۷ ہو گئی۔

اس اجلاس میں عالمی تجارت سے متعلق کئی اہم فیصلے کیے گئے۔ ان فیصلوں سے غریب ترقی پذیر ممالک کو امیر ممالک کی منڈیوں میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا موقع ملا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ترقی یافتہ امیر ممالک کو بھی ترقی پذیر ممالک میں اپنی خدمات جیسے بینک، ہوٹل اور میخانے وغیرہ کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے جہاں ترقی پذیر ممالک کو اپنی مصنوعات کے مناسب دام ملے وہاں ترقی یافتہ ممالک کو کثیر آبادی والی منڈیوں میں ان کی خدمات کا بہتر ردعمل ملا۔ اس اجلاس میں درآمدی محصول گھٹ کر ایک تہائی سے بھی کم کرنے کی تجویز رکھی گئی جس سے عالمی تجارت کو بے پناہ فروغ ملا۔ زرعی تجارت کے میدان میں بھی مصنوعات کی درآمد میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی سفارش کی گئی۔ یوروگوئے میں ۱۹۸۶ء میں منعقدہ مذاکرات پر متعدد بار گفت و شنید اور غور و خوض کے بعد ۱۵ دسمبر ۱۹۹۳ء کو اس عمومی معاہدہ برائے محصولات و تجارت پر ۱۱۷ ممالک نے مہر رضامندی ثبت کر دی۔ اس معاہدے سے عالمی تجارت کو زبردست فروغ حاصل ہوگا جس کا بین الاقوامی منڈی میں اشیاء فروش اور خریدار دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ دونوں فریقین کو وسیع بازار کی سہولت حاصل ہوگی جہاں انھیں اپنے مال کی مناسب قیمت مل سکے گی اور وہ کم اور مقابلہ جاتی بنیاد پر مال خرید سکیں گے۔ اس عمومی معاہدے سے عالمی تجارت میں ۲۱۳ ارب ڈالر سالانہ کا اضافہ متوقع ہے۔ اس معاہدے کے تحت بین الاقوامی منڈی میں فروغ کے علاوہ عالمی اقتصادی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ عالمی تجارت

اس ادارے کے سربراہ پیٹر سودرلینڈ نے جینوا میں اس معاہدے کی توثیق کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ اس معاہدے سے عالمی سطح پر سرمایہ کاری اور تجارت میں تو اضافہ ہوگا ہی، روزگار کے مزید مواقع بھی فراہم ہوں گے جس سے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور ان کے معیار زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئے گی۔

پانچ سے زائد صفحات پر مشتمل اس معاہدے پر آئندہ اپریل میں مراقش میں باقاعدہ طور پر دستخط کیے جائیں گے اور اس کا اطلاق ۱۹۹۵ء سے شروع ہو جائے گا۔ اس معاہدے کے تحت آلو کے چپس جیسی ادنیٰ چیز سے لے کر کمپیوٹر اور اس کے پرزوں جیسی مصنوعات پر محصولات کم ہو جائیں گے جس سے ان تک پہنچ اور ان کی طلب میں اضافہ ہوگا۔ اس معاہدے سے ممبر ممالک بغیر کسی سیاسی یا کسی اور طرح کے دباؤ کے بغیر بازار کے منافع کے ماحول میں خرید و فروخت کے جذبے سے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق اپنی سکت اور مالی طاقت کے حساب سے چیزوں کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔ جیسے جیسے عالمی تجارت بڑھے گی خریدار اور اشیاء فروشوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا، لین دین میں پیچیدگی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کی موثر کارکردگی کے لیے نئے اصولوں اور قوانین کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں بھی معاہدے میں اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔ عالمی تجارت کے اصولوں کو فروغ دینا اور ان کو مزید مستحکم بنانا بھی اس معاہدے کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ یہ اصول زرعی اشیاء کی تجارت پر بھی لاگو ہوں گے اور خدمات کی فراہمی بھی

اے کے - ۸ شبلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

ان کے تحت کی جاسکے گی۔ اس معاہدے کا ایک اور اہم مقصد ایک ایسی مضبوط اور موثر عالمی تجارتی تنظیم قائم کرنا ہے جو اس معاہدے کے متبادل کے طور پر کام کرسکے۔

اس عمومی معاہدہ برائے محصولات و تجارت سے اگرچہ یورپ، جاپان، امریکہ اور دیگر اہم تجارتی ممالک اور گروپوں کو زیادہ فائدہ پہنچے گا لیکن کمزور اور ترقی پذیر ممالک بھی اس سے مستفیض ہوں گے۔ جہاں ان کی دسترس بین الاقوامی منڈی تک ہوگی اور ان کو اپنے مصنوعات کے بہتر دام مل سکیں گے وہاں ان کو تحفظ کا احساس بھی ہوگا اور وہ بڑے بڑے تجارتی ممالک کے دباؤ سے آزاد ہو جائیں گے، ان کے رحم و کرم پر رہ کر کمزور ممالک کو اپنی مصنوعات فروخت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہندوستان کو اس طرح کے تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا تھا جب امریکہ نے تجارتی قوانین کی دفع ۳۰۱ کا استعمال اس کے خلاف کیا تھا۔

فی الوقت عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصہ بہت ہی قلیل یعنی صرف ایک فیصد ہے لیکن اگر ہم عالمی تجارت میں متوقع ۲۱۳ ارب ڈالر سالانہ کے اضافہ کا ایک فیصد بھی شمار کریں تو بھی ہندوستان کے لیے یہ سالانہ اضافہ قابل قدر ہوگا۔ لیکن ہمیں عالمی تجارت کے صرف ایک فیصد سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دستیاب وسیع مادی و افرادی وسائل کے بہتر استعمال سے اور عالمی تجارت میں اضافی شرکت سے اپنے حصے میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

اس معاہدے سے ہندوستان کو کپڑا صنعت میں کچھ فائدے کی امید ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ کوششوں سے اس صنعت میں درآمدی کوٹہ نظام کے مرحلہ وار خاتمے سے دونوں ممالک کو فائدہ پہنچے گا۔ امریکہ کو بادل نخواستہ اس نظام کے خاتمے کے عرصے کو ۱۵ سے گھٹا کر دس سال کرنا پڑا۔ اس مسئلے پر دونوں ممالک نے جم کر اس تجویز کی مخالفت کی کہ یہ اپنی کپڑا منڈی کو بیرونی (امریکی پارچہ جات) کے لیے کھول دیں۔ حالانکہ ہندوستان کو اس فائدے کی خاطر چند صنعتی دھاگوں پر سے درآمدی محصول کم کرنا پڑا اور چند اقسام کی روئی پر درآمدی محصول ۹۰ فیصد تک گھٹانا پڑا۔

اس معاملے کو لے کر حزب اختلاف نے ایوان میں بحث کے دوران حکومت کی شدید نکتہ چینی کی۔ ان کا الزام تھا کہ اس معاہدے کی توثیق کر کے حکومت نے ملکی مفاد کو نظر انداز کردیا۔ اس معاملے پر دونوں ایوانوں میں بیان دیتے ہوئے وزیر تجارت پرنب مکھرجی نے کہا کہ کافی غور و خوض کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی یوروگوئے دور کے سمجھوتے کے ذریعے عالمی تجارت کا پھیلاؤ ہندوستان کے لیے زیادہ سود مند ہوگا جب کہ کسی متبادل طریقہ کار سے ایسا نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ حالانکہ درآمد کرنے والے ملکوں کی طرف سے کوٹا نظام میں دس سال کی توسیع پر حکومت خوش نہیں ہے اور نہ درآمد کوٹا میں سالانہ اضافہ اطمینان بخش ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دس سال کے بعد کوٹا نظام ختم کرنے کا وعدہ ایک مثبت کامیابی ہے جس کا فائدہ ہندوستان سمیت کپڑا برآمد کرنے والے ملکوں کو پہنچے گا۔

زرعی میدان میں اس عمومی معاہدے سے ہندوستان کے کاشتکار اور دواساز کمپنیاں متاثر ہوسکتی ہیں کیونکہ دواسازی میں کام آنے والے کیمیاوی اجزا اور بیجوں پر محصولات بڑھ جائیں گے۔ مجموعی طور پر ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ اس عالمی تجارتی معاہدے پر علاقائی بلاک اثر انداز نہیں ہوں گے اور یہ موثر طور پر اپنا کام کرتا رہے گا۔ ●

بقیہ: خواتین میں بچت کی حوصلہ افزائی کی اسکیم

عورتوں کو کچھ مالی تحفظ کا احساس ہوگا اور اس سے سماج میں بھی ان کی ساکھ بڑھنی شروع ہوگی۔

اس اسکیم کی کامیابی کا اندازہ اس کی کم سے کم بچت کی رقم ایک روپیہ اور قابل لحاظ ترغیبی مدد یعنی تین سو روپے پر ۷۵ روپے سے ہوتا ہے حالانکہ اس اسکیم کو جاری ہوئے ابھی چار مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ خواتین نے اس اسکیم کا اچھا خیر مقدم کیا۔ ۲ اکتوبر سے ۳۱ دسمبر تک لگ بھگ تین ماہ کی مختصر مدت میں تین کروڑ ۱۹ لاکھ روپے کی رقوم جمع کرائی جا چکی ہیں۔ اس اسکیم کے تحت اب تک کھاتہ کھولنے والی خواتین کی تعداد دو لاکھ ۸۷ ہزار ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق یہ پروگرام شروع کیے جانے کے بعد پہلے ہی ہفتہ میں ۱۹ ریاستوں اور مرکزی انتظام والے علاقے میں ۷۴۵۰۳ کھاتے کھل گئے، جن میں ۲۷ لاکھ ۷ ہزار روپے جمع کرائے گئے۔ یہ اسکیم ایک لاکھ ۳۱ ہزار ڈاک گھروں کے ذریعے چلائی جارہی ہے۔ ●

بقیہ: ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری

باہر سے منگا سکتے ہیں، اس پر کوئی ڈیوٹی نہیں لگے گی۔ اگر انھوں نے کوئی سامان ڈیوٹی (محصول) دے کر باہر سے منگایا ہے، تو وہ یہ رقم واپس لے سکتے ہیں۔

اس طرح باہر والے ہندوستان کو مال آسانی بھیج سکتے ہیں، اسی طور ہندوستان سے غیر ملکوں کے ساتھ تجارت بھی آسانی سے ہوسکتی ہے اس سے عالمی سطح پر ہندوستان کے تعلقات بہتر ہوں گے۔ پڑوسی ملکوں کے ساتھ تعلقات بنانے میں یہ عمل معاون ثابت ہوگا۔ انجینئرنگ کے ساماں کی برآمدات، جو گذشتہ دنوں گھٹ گئی تھی، اب پھر بڑھنے لگی ہے، مشرق وسطیٰ، بحرۂ روم کے ممالک، جنوبی ایشیا اور افریقی ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت بڑھی ہے اور ان خطوں کے سرمایہ کار ہندوستان میں آنے کے لیے فضا ہموار پا رہے ہیں۔ ہندوستان، مشرقی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان صنعتی پیداوار کا سب سے بڑا ملک ہے۔ گذشتہ بیس برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے مواقع میں اس قدر سہولت دی گئی ہے، چنانچہ امید کی جاتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کار اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ ●

بھارت۔جاپان تجارت

بھارت کی نئی برآمداتی۔درامداتی پالیسی میں آزادی کے ماحول میں غیر ملکی تجارت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ یہ بات آٹھویں منصوبے میں مجوزہ ۱۳٫۶ فیصد کے برآمداتی اضافے کے نشانے کے ضمن میں اہم ہے۔

جاپان ایشیا میں بھارت کا سب سے بڑا ساجھے دار اور دنیا میں دوسرا سب سے بڑا تجارتی ساجھے دار ہے۔ جاپان کی حیرت انگیز اقتصادی ترقی و فروغ کی وجہ سے، خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ بھارت کو جاپان کے سرمائے اور ٹکنالوجی کی ضرورت ہے، بھارت کے ساتھ قریبی تعاون کے بہت ہی زیادہ مواقع فراہم ہوئے ہیں۔ جاپان بھی برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ ان کا نعرہ برآمدات کے ذریعے خوشحالی اور بچتوں کے ذریعہ استحکام ہے۔

بھارت اور جاپان کے درمیان تجارتی تعلقات اُس دو طرفہ معاہدے کے تحت قائم ہیں، جس پر فروری ۱۹۵۸ء میں دستخط کیے گئے تھے۔ بھارت جاپان کاروباری تعاون کمیٹی مشترکہ میٹنگوں میں باقاعدگی کے ساتھ تجارتی تعلقات اور کاروباری تعاون کا جائزہ لیتی ہے۔ چوبیسویں مشترکہ میٹنگ اس سال ۲۲ اور ۲۳ اپریل کو جاپان میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھارت جاپان جائزہ کمیٹی کی میٹنگ حال ہی میں ٹوکیو میں منعقد ہوئی ہے، جس میں طرفین نے دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو مستحکم بنانے اور بھارت میں جاپانی سرمایہ کاری میں اضافہ کرنے کا ماحول پیدا کرنے پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے۔ طرفین نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے تبادلے اور سائنسی تال میل کے ذریعے بیداری کو فروغ دینے کے سلسلے میں کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ جاپان مزید بھارتی مصنوعات کے لیے اپنی منڈی کھول کر ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

بھارت۔جاپان تجارت میں حالیہ برسوں میں اضافہ کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں تجارت کی کل مالیت ۵۳ء۶۲۸۳ کروڑ روپئے تھی، جس میں سے برآمدات کی مالیت ۹۸ء۳۰۳۸ کروڑ روپئے رہی تھی۔ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ اعداد و شمار بالترتیب ۸۷ء۷۱۴۷ کروڑ روپئے اور ۸۵ء۸۲۳۳ کروڑ روپئے تھے۔ ان دو برسوں میں برآمداتی اعداد و شمار بالترتیب ۶۶ء۷۴۰۴ کروڑ روپئے اور ۸۸ء۴۱۵۲ کروڑ روپئے تھے۔ جاپان کے لیے زیادہ تر بھارتی برآمدات میں خام لوہا، ہیرے اور جھینگا مچھلی شامل ہیں۔ یہ اشیاء بھارتی برآمدات کا تقریباً دو تہائی حصہ ہوتی ہیں۔

مستقبل کے عالمی معاملوں میں دونوں سرکردہ ایشیائی ممالک کو زیادہ سے زیادہ اقتصادی تعاون کی ضرورت ہوگی۔ اگرچہ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں، لیکن ایشیائی علاقے میں، جہاں بھارت اور جاپان دونوں واقع ہیں، مقابلتاً استحکام رہا ہے۔ چنانچہ دونوں ہی ملک سرمایہ کاری اور اشتراکِ عمل کے لیے اور خاص طور سے محض ٹکنالوجی کی منتقلی کی بجائے بھارت جاپان کاروباری تعلقات کے لیے زیادہ سازگار ماحول پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔

بھارت جاپان تعلقات

بھارت جاپان تجارت میں جو اضافہ ہوا ہے، اُس سے زیادہ دو طرفہ تال میل کا اظہار ہوتا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں تجارت کی مالیت ۸۵ء۸۲۳۳ کروڑ روپئے تک پہنچ گئی ہے۔ بھارت جاپان کاروباری تعاون کی کمیٹی نے تجارتی کوششوں کو فروغ دینے کے لیے اپنی چوبیسویں مشترکہ میٹنگ منعقد کی۔ ●

بقیہ: "تمباکو و شراب مضر صحت"

کا صفرا بڑھ جاتا ہے، اور اگر یہ عادت ترک نہ کی گئی تو السر بھی ہوسکتا ہے۔

تمباکو کا استعمال کرنے پر بینائی بھی متاثر ہوتی ہے۔ رگوں کے سکڑنے اور خون کی رسائی متاثر ہونے کی وجہ سے اور جسم کمزور ہونے سے انسان اپنی مردانہ طاقت بھی آہستہ آہستہ کھو دیتا ہے، کوئی ۱۵ سے ۲۰ برسوں تک تمباکو نوشی کرتا ہے تو اسے تقریباً تمباکو نوشی اور اس سے پیدا شدہ بیماریوں کے علاج کے لیے کم از کم دو لاکھ روپئے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہی روپیہ اپنی صحت اور اپنے خاندان کی فلاح کے لیے استعمال کرتا تو کتنا فائدہ ہوتا۔ آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں، شروع میں جگر کے اندر چربی جمع ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے جگر کی ضخامت بڑھتی ہے۔ شراب چونکہ خون میں جذب ہونے کے بعد جگر میں پہنچتی ہے تو شراب کے مضر اثرات کی وجہ سے جگر کے خلیہ آہستہ آہستہ مرنے لگتے ہیں اور اس کی جگہ نئے خلیے پیدا ہونے لگتے ہیں اس سے جگر مرجاتا ہے۔ جگر کا کام متاثر ہونے سے خون کے منجمد ہونے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ جس سے انسان کا ہاضمہ برابر نہیں ہونے پاتا۔ شراب کے کثرت استعمال سے انسان کے لبلبہ پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔

اس مطالعہ کی روشنی میں جو تجربہ حاصل ہوتا ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان عادتوں سے دور رہیں اور اگر خدانخواستہ یہ عادتیں ہیں تو آج ان چیزوں کو ترک کرنے کا تہیہ کرلیں، کیونکہ مریض خود جب تک خود اعتمادی اور ہمت سے کام نہیں لیتا، ڈاکٹر اس کی مدد نہیں

اسی طرح شراب نوشی سے جسم پر طرح طرح کے اثرات ہوتے ہیں لیکن سب سے زیادہ شراب نوشی سے انسان کا جگر متاثر ہوتا ہے اور اس کا معدہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ شراب نوشی کی وجہ سے انسان کو بھوک بہت کم لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کو کمزوریوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جگر پر شراب نوشی کے اثرات کرسکتے اور یہ بیماریاں لاعلاج ہوجاتی ہیں اس لیے اپنے آپ کو ان عادتوں سے دور رکھیں۔ ●

خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت

(ٹرائی سیم) کی اسکیم ۱۵۔ اگست ۱۹۷۹ کو مرکز کی طرف سے اسپانسر کردہ ایک اسکیم کے طور پر شروع کی گئی تھی۔ غریبی کے خاتمے کے سلسلے میں مجموعی طور سے جو کوشش کی جا رہی ہے، اس کوشش میں ٹرائی سیم مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) کے تحت شروع کردہ سرگرمیوں کو گوناگوں بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کے نوجوانوں کو تکنیکی اور بنیادی انتظامی ہنر سکھایا جائے تاکہ وہ زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں، صنعتوں، خدمات اور کاروباری سرگرمیوں کے وسیع شعبوں میں خود روزگار شروع کر سکیں۔ اس مقصد میں ۱۹۸۳ء میں توسیع کی گئی تھی تاکہ تربیت یافتہ نوجوانوں کے ذریعے اُجرتی روزگار کا معاملہ بھی اس اسکیم میں شامل کیا جائے۔ گاؤں میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کے ایسے نوجوانوں کے نام، جن کی عمر ۱۸ سال سے ۳۵ سال تک ہے۔ اسکیم کے تحت تربیت کے لیے فہرست میں شامل کیے جاتے ہیں اس فہرست میں درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں اور خواتین کے نام شامل کرنے کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے۔ درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں کے نوجوانوں کی تعداد تربیت یافتہ نوجوانوں کی تعداد کا کم سے کم پچاس فی صد ہونی چاہیئے۔ تربیت یافتہ دیہی نوجوانوں میں خواتین کی تعداد کم سے کم ۴۰ فی صد ہونی چاہیئے۔ ٹرائی سیم تربیت کے بعد خود یا اُجرتی روزگار شروع کر سکنے والے جسمانی طور سے معذور افراد کے لیے کم سے کم ۳ فی صد فوائد مخصوص کیے جانے چاہئیں۔ دیہی علاقوں میں واقع یتیم خانوں میں رہنے والے افراد کے معاملے میں کم سے کم عمر ۱۶ سال ہے۔ بیواؤں، آزاد کیے گئے بندھوا مزدوروں، آزاد کیے گئے مجرموں، بڑے ترقیاتی پروجیکٹوں کی وجہ سے ہٹائے گئے افراد اور کوڑھ سے نجات دلائے گئے مریضوں کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ عمر ۳۵ سال سے ۴۵ سال تک ہے۔

صنعتی اور سروسنگ یونٹوں، تجارتی اور کاروباری اداروں وغیرہ سمیت رسمی، تربیتی اداروں اور ماسٹر دستکاروں جیسے غیر ادارہ جاتی طریقوں دونوں ہی کے ذریعہ تربیت دی جاتی ہے۔ تربیت کی مدت متعین نہیں ہے جس کے بارے میں فیصلہ چھ مہینے تک کے کورسز کے لیے ضلعی سطح پر اور لمبی مدت کے، کورسز کے لیے ریاستی سطح پر کیا جاتا ہے۔ ضلعی دیہی ترقیاتی ایجنسی (ڈی آر ڈی) دیگر ترقیاتی محکموں کے ضلعی سطح کے افسران کے صلاح مشورے سے پیشوں کا انتخاب کرتی ہے پیشوں کا انتخاب کرتے وقت علاقے کی ترقیاتی اسکیموں کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔

اسکیم کے تحت دو قسم کی مالی امداد دی جاتی ہے۔ ٹرائی سیم تربیت کے ریکرنگ اخراجات کے سلسلے میں ریاستوں کو نصف نصف بنیاد پر امداد دی جاتی ہے اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے معاملے میں مرکز سو فی صد امداد دیتا ہے۔ ۱۹۹۳ء کے دوران ریکرنگ اخراجات کے طور پر ۵۱۴۷۹۷ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی۔

ٹرائی سیم کے تحت تربیتی اداروں کو امداد کے ذریعے تربیتی بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کی غرض سے ایک علاحدہ اسکیم یعنی ٹرائی سیم بنیادی ڈھانچے کے لیے غیر ریکرنگ اخراجات کی اسکیم پر بھی عمل درآمد کیا جا رہا ہے، جس کے لیے ہر سال علاحدہ سے رقم مخصوص کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت امداد خاص طور سے ٹرائی سیم کے تحت تربیت دینے کے سلسلے میں درکار تربیتی اداروں کے لیے عمارت، سازوسامان اور تربیتی سازوسامان کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ ریاستوں میں ایس ایل سی سی اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں مساوی ادارے تربیتی اداروں کے تربیتی بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کی تجاویز پر غور کرتے ہیں اور انھیں منظور کرتے ہیں۔

تربیت کی مدت کے دوران، تربیت پانے والے افراد کو ڈیڑھ سو روپے سے لے کر ۳۰۰ روپے ماہانہ تک کا وظیفہ دیا جاتا ہے، جس کا انحصار مخصوص صورتِ حال پر ہوتا ہے یعنی اسی گاؤں میں تربیت کے لیے ۱۵۰ روپے، رہائش کی مفت سہولت کے ساتھ گاؤں سے باہر تربیت کے لیے ۲۵۰ روپے اور رہائش کی مفت سہولت کے بغیر گاؤں سے باہر تربیت کے لیے ۳۰۰ روپے دیے جاتے ہیں۔ تربیت کی مدت کے دوران تربیت پانے والے افراد کو ۶۰۰ روپے تک کی مالیت کے اوزار اور دیگر ساز و سامان دیا جاتا ہے۔ تربیت کی مدت کے لیے ماسٹر دستکاروں کو تربیت پانے والے ایک فرد کے حساب سے ماہانہ ۷۵ روپے دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے، تربیت کا اہتمام کرنے کے لیے تربیتی اداروں کو تربیت پانے والے ایک فرد کے حساب سے ماہانہ سو روپے دیے جاتے ہیں۔ تربیت کی کامیاب تکمیل کے بعد، تربیت یافتہ دیہی نوجوانوں کو آمدنی مہیا کرنے والے اثاثوں کے حصول کے لیے مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت امداد اور ادارہ جاتی قرضہ دیا جاتا ہے، جس کی بنیاد پر یہ نوجوان مسلسل طور پر ان اداروں سے آمدنی حاصل کرنے کی غرض سے ٹرائی سیم کے تحت حاصل کردہ بہتری کا استعمال کر سکتے ہیں۔

ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں ہڈکو کے ذریعہ اسپانسر شدہ تعمیراتی مراکز کو مستحکم بنانے کے لیے نیز کم لاگتی مکانات سے متعلق کاروبار میں ٹرائی سیم کے تحت نوجوانوں کی تربیت کی غرض سے قائم کردہ بنیادی ڈھانچے کے استعمال کے لیے ٹرائی سیم کے بنیادی ڈھانچے کے فنڈ کا استعمال کریں۔ ریاستی حکومتوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ٹرائی سیم کے پروگرام پر عمل درآمد کے کام میں نہرو یووک کیندروں کو شامل کریں۔ ٹرائی سیم کے تحت ہینڈ پمپ میکینکوں کے طور پر کمیونٹی رضاکاروں کی تربیت کا سلسلہ گاؤں کی سطح پر چھوٹی موٹی مرمت کی غرض سے شروع کیا گیا ہے۔

وزارتِ بہبود نے خاکروبوں اور اُن کے منحصرین کی آزادی اور بازآبادکاری کے لیے مرکز کی طرف سے اسپانسر شدہ ایک اسکیم شروع کی ہے۔ دیہی ترقیات کی وزارت خاکروبوں اور اُن کے منحصرین کے لیے موجودہ ٹرائی سیم تربیتی مراکز میں تربیتی کورسز کا اہتمام کرنے کے کام میں مکمل طور سے شامل ہے۔

سائنس اور ٹیکنولوجی کے محکمے کے مشن طریقہ جاتی پروجیکٹ کے لیے امداد، جس کا مقصد روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے، ٹرائی سیم کے ساتھ تال میل کے ذریعہ کی جارہی ہے تاکہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے نوجوانوں کی کچھ تعداد پروگرام کے تحت مستفید ہو سکے۔

ضلعی دیہی ترقیاتی ایجنسی (ڈی آر ڈی اے) کے پروجیکٹ ڈائریکٹروں کے قومی ورکشاپ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ پروگرام کو معیار کے لحاظ سے بہتر بنانے کے لیے مستفید کیے جانے والے افراد کا انتخاب بہت احتیاط اور دھیان سے کرنا ہوگا۔ تربیت کے لیے بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کی توسیع کے سلسلے میں امداد پر خصوصی توجہ دی جائے گی●

ٹرائی سیم کے تحت پیش رفت حسب ذیل ہے:-

مدت	تربیت یافتہ نوجوانوں کی تعداد	کُل روزگار	درجِ فہرست ذاتیں درجِ فہرست قبیلے	خواتین
چھٹا منصوبہ	۱۰۱۴۶۹۵	۵۸۰۴۹۳	۳۳۳۹۲۸	۳۴۲۷۴۴
۱۹۸۰-۸۵		(۵۷ فی صد)	(۳۳ فی صد)	(۳۴ فی صد)
ساتواں منصوبہ	۹۹۷۹۶۰	۵۹۵۱۳۲	۴۲۲۱۴۵	۴۵۹۵۰۵
۱۹۸۵-۹۰		(۶۰ فی صد)	(۴۲ فی صد)	(۴۶ فی صد)
سالانہ منصوبہ	۲۳۶۱۷۷	۱۶۵۲۷۸	۱۰۵۴۴۱	۱۱۶۶۲۳
۱۹۹۰-۹۱		(۷۰ فی صد)	(۴۴ فی صد)	(۴۹ فی صد)
۱۹۹۱-۹۲	۳۰۷۰۴۴	۱۶۷۴۱۸ (۵۴٪)	۱۳۸۶۹۷ (۴۵٪)	۱۵۹۸۴۹ (۵۲٪)
آٹھواں منصوبہ	۲۷۴۳۳۳	۱۴۰۸۷۹	۱۱۵۸۴۲	۱۳۴۰۰۹
۱۹۹۲-۹۳		(۵۱ فی صد)	(۴۲ فی صد)	(۴۹ فی صد)
۱۹۹۳-۹۴	۳۱۱۹۱	۱۲۶۷۰	۱۴۹۹۹	۱۶۳۷۹
(جولائی ۱۹۹۳ تک)				

ادل صدیقی

مارفین کے مفادات کا تحفظ ـــ افراطِ زر کا رجحان کم کرنے میں معاون

سماج کے کمزور طبقات کو راحت پہنچانے
وں میں استحکام لانے اور اشیائے ضروریہ کی فراہمی کو
نی سانے کے لیے سرکار نے پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم
ستحکم بنانے پر خاص زور دیا ہے۔ اس نظام کے تحت
اری ڈپوؤں پر صارفین کے عام استعمال کی اشیاء
سب قیمتوں پر فراہم کی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ نظام سرکار
اقتصادی پالیسی کا ایک اہم ستون بن چکا ہے۔ اس سے
طِ زر کو قابو میں رکھنے میں مدد ملی ہے خوراکی احساس
صارفین اور اس کے پیدا کرنے والوں کو اس نظام
تقویت ملی ہے کیونکہ سرکار نے ایک طرف تو غلہ کی
اری خرید کے لیے قیمتیں متعین کردی ہیں، اس سے
الوں کا یہ ڈر دور ہو گیا ہے کہ ان کی پیداوار ایک خاص
ح سے نیچے کی قیمتوں پر فروخت نہیں ہوگی، اس طرح
انوں کو تحفظ میسر آسکا ہے، دوسری طرف ذخیرہ اندوزی
موقع ملنے کے امکانات کم ہو گئے کہ وہ غلہ جیسی بنیادی
رت کی چیز کو روک کر من مانے داموں پر فروخت کریں۔
طرح سماج کے کمزور طبقات کو گرانی سے محفوظ رکھنے
ریقہ سامنے آسکا ہے۔ عوام کو اشیائے ضروریہ کی کمیابی کی
ایت نہیں رہی ہے اور غلہ اور دیگر ضروری اشیاء
اں قیمتوں پر ملک بھر میں فروخت ہوتی رہتی ہیں۔ اس
ان کمزور طبقات کی خدمت بھی ممکن ہو سکی ہے جن کی
نی کم ہے اور جو ملک کے پسماندہ خطوں میں آباد ہیں۔

ریاستی سرکاروں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں نے مختلف علاقائی ترقیاتی پروگراموں کے تحت ۱۷ سے زیادہ بلاکوں کی نشاندہی کی ہے۔ اب اشیاء ضروری کی تقسیم کی سرکاری دکانوں پر چائے، نمک، دالیں، صابن، ماچس وغیرہ بھی فروخت کی جاتی ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۹۲ء کو اس نظام کو نئی قوت بخشی گئی تھی۔ اس کے تحت مرکزی سطح پر جاری کی جانے والی اشیاء کی قیمتیں کم کی گئیں اور کچھ نئے بلاکوں میں اس نظام کو پھیلا دیا گیا۔ دور دراز مقامات پر واقع پہاڑی اور قبائلی علاقوں میں اس نظام کو پھیلانے اور اسے مستحکم بنانے پر خاص زور دیا۔ مرکز نے ۱۲ کروڑ ۲۸ لاکھ روپئے ۱۵۰ وہیکلز کو خریدنے کے لیے بطور امداد دیئے۔ گوداموں کی تعمیر کے لیے ۴ کروڑ ۸ لاکھ روپئے منظور کئے گئے۔

مرکز نے ایک ایسا نظام وضع کیا جس کے تحت اشیائے ضروری کی فراہمی کے قانون مجریہ ۱۹۵۵ء پر عمل درآمد کی نگہداشت کی جاسکے۔ یکم ستمبر ۱۹۹۲ء سے اشیاء ضروری کی فراہمی کی خصوصی دفعات سے متعلق قانون مجریہ ۱۹۸۱ء کی مدت مزید ۵ سال کے لیے بڑھا دی گئی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران تقریباً ۱۷۸ ہزار چھاپے مارے گئے اور ۱۳ کروڑ ۴۱ لاکھ ۳۰ ہزار روپئے کی مالیت کا سامان ضبط کر لیا گیا۔

سماج کے کمزور طبقات کو اچھا سامان مل سکے اور دکاندار نیز سامان اور خدمات مہیا کرنے والے ادارے صارفین کا استحصال نہ کر سکیں سرکار نے صارفین کے تحفظ کا قانون بنایا۔ یہ قانون ۱۹۸۶ء میں بنا اور اس کے بعد سے اس کے موثر عمل درآمد کی مسلسل تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ مرکزی سرکار نے صارفین کی شکایتوں کے ازالہ کے لیے ایک قومی کمیشن قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ صارفین کے تحفظ کی مرکزی کونسل تشکیل دی گئی۔ اب تک اس کونسل کے ۱۲ سے زیادہ اجلاس ہو چکے ہیں۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق ۳۰ ریاستی کمیشنوں اور ۳۷۴ ضلعی سطح کے فورموں نے کام شروع کر رکھا ہے۔

ملک میں صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لیے باقاعدہ تحریک کی صورت میں کوششیں جاری ہیں۔ اس تحریک میں صارفین کی تنظیموں اور صارفین کو شریک کیا گیا ہے، اس مقصد کے تحت صارفین کے تحفظ کے لیے قومی سطح کے ایوارڈز قائم کئے گئے ہیں۔ نوجوانوں کو اس تحریک سے جوڑنے کے لیے صارفین کے تحفظ کے لیے نیشنل یوتھ ایوارڈ قائم کیا گیا ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے ذریعے صارفین کو ان اقدامات سے آگاہ کیا جا رہا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں بیداری آئے اور وہ صحیح اور معیاری مال بازار سے خرید سکیں اور کسی قسم کے استحصال کا شکار نہ ہو سکیں۔ ۹ جنوری ۱۹۹۳ء کو قومی سطح کے یہ دونوں انعامات تقسیم کئے گئے۔ صارفین میں بیداری لانے کے لیے کچھ لٹریچر بھی تیار کیا گیا ہے۔ اس اشاعتی مواد کے ذریعے صارفین کو ان کے حقوق سے آگاہ کرایا گیا ہے۔ صارفین کے رضاکار اداروں کی ایک ڈائرکٹری

ارج پبلسٹی دارالعلوم دیوبند

بھی تیار کی گئی ہے۔ صارفین کے رضاکار اداروں کو مستحکم بنانے کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کی اسکیم بدستور جاری ہے۔

ضروری اشیا کی سرکاری دکانوں کے ذریعے سپلائی کی تحریک کے ایک حصے کے طور پر صارفین کے کوآپریٹو ادارے بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کوآپریٹو اداروں کے توسط سے عوامی ضرورت کی بیشتر اشیا کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا جاسکا ہے۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں صارفین کے تحفظ کی تحریک کو مزید مستحکم بنانے کا پروگرام ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں صارفین کے کوآپریٹو اداروں کا ۴ سطحی نظام شہری علاقوں میں فروغ پاسکا ہے۔ صارفین کے کوآپریٹو اداروں کی قومی فیڈریشن معرض وجود میں پہلے ہی آچکی ہے۔ ریاستی سطح پر صارفین کے مفادات کے تحفظ کے ۳۰ ادارے کام کررہے ہیں۔ ضلع کی سطح پر اشیا کی تھوک قیمتوں پر فروخت کے لیے صارفین کے ۵۶۷ مرکزی کوآپریٹو اسٹور کام کر رہے ہیں۔ ۲۶۵ ۵ پرائمری اسٹور ان کے علاوہ ہیں، ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء کو دیہی علاقوں میں کوآپریٹو نظام کے تحت ۶۸۰۵۳ فیئر پرائس ستائیس کام کررہی تھیں۔

صارفین کے کوآپریٹو اداروں کی تنظیم و ترقی کے لیے مرکزی سیکٹر میں دو اسکیمیں کام کررہی ہیں۔ ایک ہے صارفین کے کوآپریٹو اداروں کی قومی فیڈریشن کی امداد اور دوسری ہے دہلی میں سُپر بازار کا فروغ۔

۹۳-۱۹۹۲ء میں صارفین کے تحفظ کے پروگرام پر ایک کروڑ روپئے خرچ کئے گئے۔ صارفین کے تحفظ کی تحریک ایک سماجی تحریک ہے۔ لیکن اتنا کچھ ہونے پر بھی یہ تحریک ابھی عہد طفولیت میں ہے۔ سرکار نے جو مختلف قانونی اور انتظامی اقدامات اس سلسلے میں کئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ چونکہ یہ ایک عوامی پروگرام ہے اس لیے رضاکارانہ سطح پر اس کا استحکام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس پروگرام کی کامیابی کا انحصار عوام کے شعور پر ہے۔ اس مقصد کو حل کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تربیت یافتہ عملہ ہو اور اس کام کو کانفرنسوں، سیمناروں، ورکشاپوں وغیرہ کے ذریعے عوام میں مقبول عام بنایا جائے۔ اس سلسلے میں عورتوں کا تعاون خاص اہمیت رکھتا ہے۔ خواتین کے رضاکارانہ ادارے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔

صارفین کے تحفظ کے قانون مجریہ ۱۹۸۶ء پر درج ذیل ریاستوں اور مرکز کے زیرانتظام علاقوں میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔

آندھرا پردیش، اروناچل پردیش، آسام، بہار، گجرات، گوا، ہریانہ، ہماچل پردیش، کرناٹک، کیرالہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، منی پور، میگھالیہ، میزورم، ناگالینڈ، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، سکم، تمل ناڈو، تری پورہ، اترپردیش، مغربی بنگال، جزائر انڈمان و نکوبار، چنڈی گڑھ، دادرا اور نگر حویلی، دہلی، دمن اور دیو، لکش دیپ، پانڈی چری۔

اس کے علاوہ جموں و کشمیر میں ریاستی سرکار نے اس سلسلے میں اپنا قانون بنایا ہے۔

صارفین کے تحفظ کی تحریک شمالی ہندوستان کے مقابلے جنوبی ہندوستان میں زیادہ سرگرم ہے، دوسرے خواتین کو اس تحریک سے خاطر خواہ طور پر منسلک نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بہرصورت اس تحریک کے ذریعے افراطِ زر کے رجحان کو کم کیا جاسکا ہے۔ سابقہ برسوں میں افراطِ زر کا رجحان خوراک، احساس اور دیگر اشیائے ضروریہ کے ساتھ جڑا ہوا تھا مگر اب ان اشیا کی قیمتوں میں استحکام آیا ہے جو ایک بڑی کامیابی ہے۔ ●

زلزلہ — کیا کریں کیا نہ کریں

لاتور کے علاقے میں مزید زلزلے آنے کے ضمن میں بہت سی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ان کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ دنیا میں ابھی کسی زلزلے کے مقام وقت اور شدت کے متعلق پیش گوئی کا کوئی طریقہ ابھی تک وضع نہیں کیا جاسکا ہے۔ کچھ لوگوں کے ذریعہ علم نجوم کی رو سے اس ضمن میں جو پیش گوئیاں کی جارہی ہیں، انھیں سائنسی حقائق کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا۔ لہٰذا آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ایسی افواہوں پر یقین نہ کریں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ء کے بڑے زلزلے کے بعد زلزلے کے جو جھٹکے محسوس کیے جاتے رہے ہیں انھیں زلزلے کے بعد کے جھٹکے کہا جاتا ہے۔ یہ جھٹکے زمین کے اندر جمع تناؤ کے آہستہ آہستہ کم ہونے کا اشارہ ہیں اور مزید کچھ وقت تک ایسے جھٹکے آسکتے ہیں۔ زلزلے کے بعد آنے والے جھٹکوں کی فریکوئنسی اور شدت عام طور پر وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ زلزلے کے دوران زیادہ تر افراد گرتے ہوئے ملبے منہدم دیواروں کی اینٹوں اور لکڑیوں اور ڈھانچوں سے زخمی ہوتے ہیں۔ تاہم ہمیشہ یاد رکھیے کہ عمارت سے دور کھلی جگہ سب سے محفوظ ہے۔ اگر آپ کسی نکاسی کے دروازے کے قریب ہیں تو باہر بھاگئے اور ایسا کرتے وقت اپنے آپ کو گرتی ہوئی دیواروں سے بچائے رکھیے، ایک مرتبہ جب آپ باہر نکل جائیں تو کسی عمارت چہار دیواری وغیرہ کے نزدیک نہ جائیں۔

اگر آپ کسی عمارت کے اندر پھنس جائیں تو کسی دروازے کے فریم، مطالعے کے میز، بستر کے نیچے پناہ لیں اور اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوں تو ایک ایسے کونے کا انتخاب کریں جہاں دو دیواریں باہم ملتی ہوں۔

لاتور کے علاقے میں یہ پایا گیا کہ ان عمارتوں کے دروازوں کے فریم سلامت رہے جو عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ بالکونیوں وغیرہ میں نہ جائیں۔ ان حصوں کے منہدم ہو جانے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ جب زلزلہ آئے تو ہوش و حواس برقرار رکھیں، حفظ ماتقدم کے اقدامات کریں اور افواہیں نہ پھیلائیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو ان افراد کی مدد کریں جو مجروح ہوئے ہیں یا جو زلزلے سے متاثر ہوئے ہیں۔ خوف و ہراس نہ پھیلائیں نہ کوئی افراتفری مچائیں ●

کمل ناتھ

سبزے اور شجرکاری سے متعلق پروگرام کو نئی جہت

جنگل بانی سے متعلق ہماری قومی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ مجموعی طور سے جنگلات کا علاقہ ہمارے ملک کی کل سرزمین کے ۳۳ فیصد علاقے کے برابر ہونا چاہئے۔ اس کے باوجود ہمارے ملک میں جنگلات کا علاقہ کل مذکورہ علاقے کے نصف سے بھی کم ہے۔ جنگلات کے تحفظ سے متعلق قانون ۱۹۸۰ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس سے قبل آزادی کے پہلے تین دہوں میں ۴ لاکھ ہیکٹر سے بھی زیادہ جنگلاتی زمین غیر جنگلاتی استعمال کے لیے منتقل کر دی گئی تھی۔

جنگلات کے تحفظ سے متعلق قانون کا مقصد نہ تو ترقی کی راہ میں حائل ہونا تھا اور نہ ہی مکمل طور سے جنگلاتی زمین کی منتقلی کو روکنا تھا بلکہ صرف اس پر کنٹرول کرنا تھا اور جہاں کہیں ناگزیر ہو، اس کے لیے تلافی کرنا تھا۔ چنانچہ قانون پر مناسب عمل درآمد کے کام میں ترقی اور ماحولیات کی ضروریات کے مطابق انتخاب کرنے کا عمل شامل ہے۔

بھارت میں بڑی تعداد میں صنعتیں خام مال کے طور پر لکڑی پر مکمل طور سے یا جزوی طور سے انحصار کرتی ہیں۔ آبادی میں اضافے اور معیشت کی ترقی و فروغ کی وجہ کاغذ، گودے نیز لکڑی سے متعلق دیگر سازو سامان اور خدمات کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء سے قبل ملک میں قائم کی گئی لکڑی پر مبنی صنعتیں اس عقیدے سے بہت زیادہ متاثر تھیں کہ خام مال کے وسائل کبھی بھی ختم نہیں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لکڑی پر مبنی صنعتوں کے لیے خام مال کی تخصیص کا معاملہ کم و بیش منظور کیا گیا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن بھارت میں دستیاب جنگلات افسوسناک حد تک ناکافی ہیں اور ماحولیاتی بیداری کا تقاضہ ہے کہ اگر کرۂ ارض کے مستقبل کا تحفظ کرنا ہے تو جنگلات کا تحفظ کرنا ہوگا اور ان میں اضافہ کرنا ہوگا۔ جنگلات کی اہمیت کا ابتدائی نظریہ زیادہ تر ماحول کو آلودگی سے پاک کرنے کی ان کی صلاحیت سے متعلق تھا۔ چنانچہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر صرف سبزے اور درختوں والے علاقے میں توسیع کر دی جاتی ہے تو جنگلات کا ماحولیاتی کام مناسب طور سے انجام پاتا رہے گا۔ حیاتیاتی گوناگونی پر حال ہی میں جو زبردست توجہ دی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

محض سبزے اور درختوں والے علاقوں میں اضافہ کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ حیاتیاتی گوناگونی کا تحفظ کیا جائے۔ معمولی گھاس پھوس اور نظر نہ آنے والی کھمبیوں کی اہمیت بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ برگد کے طاقتور درخت کی۔ معیشت حیوانات کے توازن کے لیے ایک کینچوا اور رینگنے والا کیڑا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک ہاتھی یا ایک شیر ضروری ہے۔ اگر جنگل بانی کو صرف تجارتی لحاظ سے دیکھا جاتا ہے تو قدرتی جنگلات کاٹنے اور ایک ہی قسم کی پود کاری کے عمل سے مجموعی طور سے نسلی سلسلہ ناقابل تلافی حد تک ٹوٹتا چلا جائے گا اور عظیم حیاتیاتی گوناگونی ختم ہوتی چلی جائے گی جس سے ہمارا ملک مالا مال ہے۔

بھارت میں جنگلات سماجی، اقتصادی اور ثقافتی گوناگونی کے ساتھ ایک اجتماعی وسیلہ ہیں اس لیے ان کے انتظام دیکھ بھال اور روک تھام کے کام کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا ہوگا۔ جنگلات میں رہنے والے لوگ اور دیگر لاکھوں لوگ جو جنگلات کے اردگرد میں رہتے ہیں، اپنی گذر بسر کے لیے براہ راست جنگلات پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ جنگلات سے جو لکڑیاں کاٹی جاتی ہیں ان کی مالیت سالانہ تقریباً ۳۰۰ کروڑ روپے ہے۔ یہ جنگلات سے حاصل ہونے والی ایک براہ راست مالی امداد ہے جو دیہی لوگوں اور جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن کے معیارات کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جنگل بانی کے شعبے کے لیے نئے نظریات اور اختراعات کی فوری ضرورت ہے، خواہ وہ روک تھام اور دیکھ بھال کے شعبے میں ہوں یا انتظام یا رقم فراہم کرنے کے شعبے میں ہوں۔ جنگلات پر مبنی صنعتوں کو وسائل پیدا کرنے کے کام میں سرگرمی سے شامل ہونا چاہیئے جن کی انھیں خام مال کے طور پر ضرورت ہے۔ انھیں قومی بنیادی ڈھانچے کی تشکیل میں مدد کرنی چاہیئے تاکہ بڑے پیمانے پر فارم جنگل بانی کرنے کے لیے کسانوں کی مدد کی جاسکے۔ اس سے نچلی سطح پر روزگار کے مزید مواقع بھی پیدا ہوں گے اور اس طرح دیہی غریبوں کی معاشی صورت حال میں بھی بہتری آئے گی۔ جنگل بانی کے کام کو عوام میں مقبول بنانے سے بہت سے اقتصادی اور ماحولیاتی مسائل حل ہونگے۔

جنگل بانی کے شعبے سے بہت زیادہ امدادی رسدات صنعت کے ذریعے جنگل بانی کے کام میں کافی سرمایہ کاری کرنے کے سلسلے میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ چنانچہ اب خام مال کی قیمت کا تعین کرنے سے متعلق ایک

ماحولیات اور جنگلات کے مرکزی وزیر مملکت

ایسی عملی پالیسی وضع کرنے پر زور دیا جا ناچاہیئے جو "بٹائے جانے کی لاگت" اور "زمین کی لاگت" کے نظریوں پر مبنی ہو اس سے نہ صرف درکار سرمایہ کاریاں کرنے کے لیے صنعت کو ضروری ترغیب ملے گی بلکہ نجی کسانوں اور گاؤوں کی امداد باہمی انجمنوں کو منافع بخش قیمتیں بھی ملیں گی۔

بنجر اور بے کار زمینوں کو بہتر بنانے سے متعلق قومی بورڈ کی اب تشکیلِ نو جنگل بانی اور معیشت حیوانات کی ترقی و فروغ سے متعلق قومی بورڈ کو بہت سی مشکلات درپیش تھیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرم شمولیت کی وجہ سے نیز مالیہ کمانے والے محکمے کے بجائے ترقی پر مبنی محکمے بنتے جانے سے جنگل بانی کے ریاستی محکموں کے بدلتے ہوئے نظریے کی وجہ سے جنگل بانی کی کوششیں اطمینان بخش رہی ہیں۔ درحقیقت گذشتہ سال مصنوعی سیارے کے ذریعے جو تصویر سامنے آئی ہے اس سے شاید جدید تاریخ میں پہلی بار ملک کے کل جنگلاتی علاقے میں گو معمولی سا ہی سہی سالانہ تقریباً ۳۰ ہزار ہیکٹیر رقبے کے اضافے کا پتہ چلا ہے۔ تاہم اس ضمن میں کافی کام انجام دیا جانا باقی ہے۔ جنگل بانی کے سلسلے میں وسائل کی بہت زیادہ کمی ہے۔ جنگل بانی میں کل سرمایہ کاری کل منصوبہ جاتی تخصیص زر کا ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں جنگل بانی کے شعبے کے لیے فراہم کردہ کل فنڈ تقریباً ۵۷۶ کروڑ روپے تھے۔ کل جنگل بانی ۱۷ لاکھ ہیکٹیر کے علاقے میں تھی جس میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ ہیکٹیر جنگلاتی زمین پر تھی اور بقیہ فارم جنگل بانی اور غیر سرکاری پودکاری تھی۔

بھارت میں کل جنگلاتی زمین ۶ء۴۰ لاکھ ہیکٹیر ہے۔ اس میں سے ۲۵۰ لاکھ ہیکٹیر زمین بنجر ہے یعنی اس زمین پر سبزہ اور درخت اگانے کی کثافت ۴۰٪ سے بھی کم ہے۔ اگر جنگلاتی زمین کی جنگل بانی کا کام سرمایہ کاریوں کی موجودہ سطح پر ہی برقرار رہتا ہے اور پودکاریوں کی بقا کی شرح ۶۰ سے ۶۵ فیصد ہے تو ملک میں تمام جنگلاتی زمین پر جنگل بانی کے لیے ۴۰ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لگ جائے گا اور کل سرزمین کے صرف ۲۰ فیصد حصے پر ہی سبزے اور شجر کاری کا کام انجام دیا جا سکے گا جو ۳۳ فیصد کے ہمارے نشانے سے کہیں دور ہے۔

چنانچہ جس بات کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ وسائل میں اضافہ کیا جائے اور سماج کے تمام طبقوں خاص طور سے عام لوگوں کو شامل کرتے ہوئے ہر محاذ پر دگنی کوششیں کی جائیں۔ ایک منصفانہ آمیزش کرنی ہوگی یعنی صنعت کے لیے خام مال کے ایک ذریعے نیز ایک اجتماعی وسائل کے طور پر جنگلات کے نظریے کی ہم آہنگی۔ قدرتی جنگلات کی عظیم حیاتیاتی گوناگونی اور نسلی اجتماع، نباتات اور حیوانات دونوں کا تحفظ کرنا ہوگا۔ اگر صنعت عام لوگ اور غیر سرکاری تنظیمیں سبزے اور شجرکاری کی کوششوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سبزے اور درختوں پر مشتمل کل علاقہ ایک معقول مدت تک ملک کی کل ایک تہائی حصے تک پہنچ سکتا ہے۔ ●

بقیہ: ملک میں پانی کی قلت — ایک اہم مسئلہ

کہ آب پاشی کرنے والے ٹیوب ویلوں کو اور گہرا کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بہ نسبت آج ٹیوب ویلوں کو تین گنا زیادہ گہرا کرنا پڑ رہا ہے۔ پنجاب کے سنگرور، پٹیالہ، کپورتھلا، ضلعوں میں گذشتہ ۱۵ برسوں میں پانی کی سطح ۷ میٹر نیچے چلی گئی ہے۔ جب کہ مہاراشٹر کے عثمان آباد، لاتور، احمد نگر، بیڑ، امراؤتی اور جل گاؤں ضلعوں میں ۱۵ برسوں میں پانی کی سطح میں دو سے چار میٹر کی گراوٹ آئی ہے۔ تامل ناڈو کے مدراس کے کچھ گاؤں میں تو سرکاری نلوں میں بہت کم ہی پانی آتا ہے اور ان نلوں پر مشکوں کی قطاریں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ٹی وی کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں ٹینکروں کے ذریعہ پانی پہنچایا جاتا ہے اور پانی کی اس قدر قلت کی وجہ سے اکثر لوگوں کو پیسہ دے کر پانی لینا پڑتا ہے۔ یہی نہیں کبھی کبھی تو تیل کے ٹینکروں میں بھی پانی بھر کر آتا ہے اور لوگ وہی بدبودار پانی حاصل کرتے ہیں اور پیتے ہیں۔

اس مصیبت سے بچنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔ ماحولیات کے تحفظ کے لیے عام لوگوں کو بیدار کرنا ہوگا۔ جنگلات کی بے دریغ کٹائی کو روکنا ہوگا۔ بارش کے پانی کو زیادہ مقدار میں اکٹھا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگا۔ زمین کو کیمیائی کھادوں کے برے اثرات سے بچانا ہوگا۔ آج انھیں کیمیائی مادّوں کی وجہ سے ہی زمین کی اوپری سطح ہلکی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے زمین کے اندر پانی جذب کرنے کی صلاحیت میں کافی کمی آگئی ہے۔ ان سب کے علاوہ ہمیں پانی کا بے جا استعمال روکنا ہوگا۔

اس طرح جب بارش ہوگی اور ہم زیادہ سے زیادہ پانی گڈھوں اور تالابوں وغیرہ میں اکٹھا کریں گے اور زمین اس پانی کو کافی مقدار میں اپنے اندر جذب کرے گی تو زمین کے اندر کے پانی کی سطح برقرار رہے گی اور ہمیں اس قدر پانی کی قلت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ●

بقیہ: گھریلو طبی نسخے

کھانسی، اپھارہ، قے، درد، گٹھیا اور بواسیر کے لیے مفید ہے۔

● کان کے درد میں، ادرک کا عرق نیم گرم کان میں دو تین بوند ٹپکانے سے بہت آرام ملتا ہے۔

● ادرک کا عرق اور پیاز کا عرق باہم ملا کر دینے سے ہیضہ اور قے کو روکتا ہے۔

● ادرک کو خشک کر کے اسے اچھی طرح جلا دیں اور اس کا باریک سفوف بنا کر سوتے وقت سلائی سے آنکھوں میں لگائیں اس سے آنکھوں کا دھند اور جالا دور ہوگا۔

● ادرک کا رس، بخار کی بے ہوشی میں مریض کو سنگھانے یا زبان پر ٹپکانے سے اس کی بے ہوشی دور ہو جائے گی۔

● دانت میں درد ہو تو ادرک کو چھیل کر نمک لگائیں اور اسے چبالیں کافی راحت ملے گی۔

● اگر کسی کی آواز بیٹھ گئی ہو یا گلے میں سوزش ہو تو پرانا گڑ اور ادرک ایک ساتھ لے کر نہار منھ کھائیں۔ دو دنوں میں آواز صاف ہو جائے گی۔

● موسم سرما کے درد سر میں عرق ادرک پیشانی پر ملنے سے درد سر جاتا رہے گا۔

● ادرک معدہ اور جگر کی قوت میں اضافہ کرتا ہے ●

سہیل احمد ہلتوری

ملک میں پانی کی قلت۔ ایک اہم مسئلہ

انسانی زندگی کی بقا کے لیے سب سے ضروری چیزوں میں پانی کا ایک اہم مقام ہے بغیر پانی کے انسانی زندگی ممکن نہیں۔ انسان ہی نہیں بلکہ تمام چھوٹے بڑے جانور و پیڑ پودے سبھی کو پانی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں یوں تو پانی کے ذخائر کی کمی نہیں ہے مگر پانی کے بے جا و بے ترتیبی سے استعمال کی وجہ سے آج ملک کے متعدد مقامات پر پانی کی قلت پائی جاتی ہے۔ ماحولیات میں بے توازنی اور پانی کا صحیح استعمال نہ ہو پانے کی وجہ سے ہی آج گرین بیلٹ (green belt) کے نام سے جانا جانے والا یہ علاقہ پانی کی قلت کا شکار ہے۔ مستقبل قریب میں اگر اس اہم مسئلہ سے بے توجہی دکھائی گئی اور اسے دور کرنے کے لیے کوئی مستقل انتظام نہ کیا گیا تو آئندہ برسوں میں یہ علاقے ریگستان میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

بھارت میں پانی مہیا کرنے والے دو ذریعے ہیں۔ پہلا تو وہ جو پانی بارشوں کے ذریعہ گڈھے، تالاب اور جھیلوں وغیرہ میں اکٹھا ہو جاتے ہیں دوسرے وہ پانی جو زمین کے اندرونی حصہ میں موجود رہتا ہے۔ جیسے بورنگ کر کے مشینوں کے ذریعہ نکالا جاتا ہے۔ ملک میں سالانہ بارش تقریباً ۱۸۰۰ مکعب کلومیٹر ہوتی ہے۔ جس کا صرف ۶۹۰ مکعب کلومیٹر ہی بامقصد و مفید کاموں میں استعمال ہو پاتا ہے۔ اسی طرح ایک عارضی تخمینہ کے مطابق تقریباً ۴۳۲-۴۵۲ مکعب کلومیٹر پانی زمین کے اندر موجود ہے۔ جس میں ۶۹-۳ مکعب کلومیٹر پانی پینے کے لیے اور ۴ / ۳۸۳ مکعب کلومیٹر پانی صنعتی و دیگر کاموں میں صرف ہوتا ہے۔

زمین کے اندر موجود پانی کی بہ نسبت زمین کے اوپری سطح پر پائے جانے والے پانی کی ملک میں زیادتی تو ہے مگر اس پانی کا انحصار بارش کے پانی پر ہی ہے ملک کی ۷۰ فیصد بارش مانسونی ہے جو پورے ملک میں ایک جیسی نہیں ہوتی حالانکہ دوسری طرف ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں بارش کے پانی کی کمی بھی نہیں ہے کیونکہ تقریباً ہر برس ملک کی بیشتر دریاؤں میں سیلاب بھی آتا ہے جس سے ہر برس ۷،۷ لاکھ مربع ہکٹیر زمین متاثر ہوتی ہے فصلوں پر برا اثر پڑتا ہے اور تقریباً چودہ سو افراد موت کے منھ میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا ہونے کے باوجود بھی بارش کے پانی کا صرف ۳۵ فیصد حصہ ہی اچھے اور فائدے کے کاموں میں استعمال ہو پاتا ہے۔ بقیہ پانی نالے ندیوں سے ہو کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں بارش کی کمی ہے وہاں تو ندی تالاب و کنویں سب کچھ خشک ہو جاتے ہیں۔ بارش کا کم ہونا ماحولیات میں توازن کی گڑبڑی کا نتیجہ ہے۔ درختوں کی بے دریغ کٹائی کے سبب ماحولیات و موسمیات پر برا اثر پڑا ہے۔

زمینی سطح پر پائے جانے والے پانی اور زمین کے اندرونی حصہ میں پائے جانے والے پانی میں گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ بارش کی کمی کے باعث تالاب و جھیلوں و دیگر پانی جمع ہونے والے گڈھوں میں پانی بہت کم ہی جمع ہو پاتا ہے۔ جو بہت جلد ختم بھی ہو جاتا ہے۔ جب ندی تالاب و گڈھے خشک ہو جاتے ہیں تو انسانوں کی ضروریات کے لیے پانی (جیسے آب پاشی وغیرہ) بورنگ کی گئی مشینوں کے ذریعہ ہی مل پاتا ہے۔ زمین کے اندر کے پانی کو زیادہ سے زیادہ نکالتے رہنے پر پانی کی سطح میں گراوٹ ہوتی جاتی ہے۔ آب پاشی و دیگر گھریلو استعمال کے لیے پہلے لوگ ندی، تالابوں، کنوؤں وغیرہ پر ہی منحصر رہتے تھے جب کہ آج سارا دار و مدار صرف زمین کے اندر کے پانی پر ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمینی پانی کی سطح میں کافی گراوٹ آ گئی۔ تالاب خشک ہو گئے۔ نل بیکار ہو گئے۔ حالت ایسی تشویشناک ہو گئی کہ سرکاری کوششوں کے باوجود بھی اس سنگین مسئلہ سے دوچار ہونے والے گاؤں کی تعداد میں کمی نہیں ہو پا رہی ہے۔

ملک کی کچھ ریاستوں اتر پردیش، کرناٹک، مہاراشٹرا اور تامل ناڈو میں پانی کی قلت ایک ملک گیر مسئلہ بن چکا ہے۔ اتر پردیش میں مراد آباد، بجنور، سہارنپور، مظفر نگر، بلند شہر، فرخ آباد، بدایوں، ایٹہ، مین پوری، میرٹھ، علی گڑھ و جھانسی ضلع میں پانی کی شدید قلت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ جن علاقے میں ۵۵ فیصد پانی زمین کے اندر سے نکالا جاتا ہے وہاں ۵ سینٹی میٹر سے ۷،۲ سینٹی میٹر پانی کی سطح میں سالانہ گراوٹ آئی ہے۔ کرناٹک کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں پانی کی سطح اس قدر نیچے ہو گئی ہے

باقی صـ۱۷ پر

میر حسن روڈ، نو بہار گنج ہلتور۔ یو پی

ڈاکٹر فروغ صبا جامی

تمباکو و شراب مضرِ صحت

انسان نے کئی ایجادات کی ہیں جن کا مقصد انسانی زندگی کو آسان اور لطف اندوز کرنا تھا۔ کبھی کبھی یہی ایجادات انسانی زندگی کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ تمباکو کا استعمال ویسے تو صدیوں سے چلا آ رہا ہے لیکن سگریٹ نوشی کا عام استعمال ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیاں شروع ہوا، ابتدا میں تمباکو نوشی کا استعمال شوقیہ ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ شوق عادت بن جاتا ہے۔

انسان آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سوشل سانے اور تھکن یا اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے یا ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دو قسم کی عادتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ (۱) 'Habituation' یعنی ایسی عادت جس کو اگر چاہے تو چھوڑ سکتا ہے یعنی اس کا جسم اس نشہ آور چیز پر منحصر نہیں رہتا۔ مثلاً چائے، کافی، تمباکو نوشی وغیرہ وغیرہ۔ (۲) 'Addiction' یعنی اصلی نشہ انسان جب ایک مرتبہ اس کا عادی ہو جائے تو اس کو ختم کرنا یا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ مثلاً طرح طرح کی شراب نوشی، مختلف قسم کی دوائیاں جیسے افیم، گانجہ، کوکین، اسمیک وغیرہ۔

تمباکو کا استعمال بیڑی، سگریٹ، چلم، پائپ، سگار، حقہ میں پینے کے لیے ہوتا ہے۔ زردہ، قوام، پان وسادہ، تمباکو کھانے میں استعمال ہوتا ہے تمباکو نوشی سے انسان کو طرح طرح کی بیماریاں ہوتی ہیں، سب سے خطرناک اس کے زیادہ استعمال سے کینسر ہونے کا خدشہ عام لوگوں کے مقابلہ میں دس سے تیس گنا بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ تمباکو میں تقریباً دس سے ۱۵ قسم کے کینسر کرنے والے ذرات پائے جاتے ہیں۔ تمباکو کے استعمال سے منھ کا کینسر، زبان کا کینسر، حلق کا کینسر اور معدہ کا کینسر لاحق ہو سکتا ہے اور اگر سگریٹ یا بیڑی کا کثرت سے استعمال کیا گیا تو پھیپھڑوں کا کینسر لاحق ہو سکتا ہے۔

تمباکو میں نکوٹین پایا جاتا ہے یہ نکوٹین کثرت استعمال کی وجہ سے خون میں جذب ہو کر شریانوں کی اندرونی پرت میں جمع ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی شریانوں کے سوراخ کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی شریانیں سکڑنے لگتی ہیں۔ اور سخت ہونے لگتی ہیں۔ جس کے اثرات پیروں کی انگلیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی چند قدم چلنے سے انسان کی پنڈلیوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی پیروں کی انگلیاں سرد ہونے لگتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شریانوں سے خون کی رسائی نہ ہونے پر 'GanqRene' ہو جاتا ہے۔ اس بیماری کو طبی زبان میں 'Throwbo Aeogitis Obliterance' یا T.A.O. کہتے ہیں۔ اس میں مریض کے جس حصہ میں 'Gangrene' ہوتا ہے۔ اس کو کاٹنا پڑتا ہے اور پیٹ کا آپریشن کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر ایسے مریضوں کو وقت سے پہلے سمجھاتے ہیں کہ "یا تو آپ تمباکو چھوڑ دو، اور اگر نہیں چھوڑنا ہے تو پیروں سے ہاتھ دھو بیٹھو۔"

یہی عمل اگر دل کی شریانوں میں ہوتا ہے تو انسان کو قلبی بیماریوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جو عموماً ابتدا ہوتی ہے۔ قلبی حملہ کی اور پیٹ کی بیماری کی روک تھام نہ کی گئی تو قلبی حملہ ہوتا ہے۔ تمباکو کا استعمال بلڈ پریشر کے مریضوں کے لیے بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ کیونکہ شریانیں سکڑنے کی وجہ سے بلڈ پریشر آسانی سے قابو میں نہیں آتا جس کے لیے زیادہ سے زیادہ دوائیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔

تمباکو نوشی انتہائی مضر ان لوگوں کے لیے بھی ہے جن کو ذیابطیس، موٹاپا ہوتا ہے۔ ان مریضوں میں تمباکو کے استعمال سے ہارٹ اٹیک ہونے کا خدشہ عام مریضوں سے ۲۰ سے ۳۰ گنا زیادہ ہوتا ہے۔

سگریٹ یا بیڑی کی کثرت استعمال سے انسان کو بار بار کھانسی اور بلغم ہونے لگتا ہے۔ سگریٹ کا مضر دھواں انسان کے پھیپھڑوں کو آہستہ آہستہ ناکارہ بنا دیتا ہے۔ یہ عمل بتدریج ہوتا رہتا ہے، اور پھیپھڑوں کے سکڑنے اور پھیلنے کی صلاحیت ختم ہوتی جاتی ہے۔ ان دونوں بیماریوں کی ملی جلی کیفیت کو ڈاکٹر 'COPD' کہتے ہیں۔ یہی بیماری سانس کے پھولنے اور کھانسی کی وجہ سے دل پر اثر انداز ہوتی ہے، جسم کمزور ہونے کی وجہ سے ان مریضوں میں ٹی۔ بی۔ ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس بیماری میں کمزوری کے باعث انسان اپنا روزمرہ کا کام نہیں کر پاتا۔ یعنی اس سے روزی بھی متاثر ہوتی ہے۔

تمباکو نوشی کرنے والی عورتوں کے کمزور بچے تولد ہوتے ہیں یا ان کے حمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حاملہ عورتوں کو تمباکو نوشی یا اس کا استعمال، زردہ، قوام کے پان کی صورت میں کرنے کی مخالفت کرنی چاہئے۔

تمباکو، چونا، یا زردہ و پان کھانے سے انسان

باقی صفحہ ۱۱ پر

کلامی محلہ، نزد مسجد، اورنگ آباد۔ ۸۲۴۱۰۱ (بہار)

ڈاکٹر عرفان علیمی

مرض جذام ناقابلِ علاج نہیں

آج کے اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی بہت سے ایسے امراض ہیں جن کے بارے میں عوام نے اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کی بنیاد پر غلط تصورات و نظریات قائم کر لئے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے امراض کی فہرست میں ایک مرض جذام یا کوڑھ بھی ہے جس کے بارے میں آج بھی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ اس مرض کو برے اعمال کا نتیجہ مانتے ہیں تو کچھ دیوی دیوتاؤں کی ناراضگی کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ کچھ اس کو موروثی مرض سمجھتے ہیں تو کچھ کسی مخصوص غذا کے استعمال کو اس کا سبب مانتے ہیں۔ جب کہ آج سائنس، تجربات و تحقیقات نے ان تمام تصورات و نظریات کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذام نہ تو برے گناہوں کا پھل ہے اور نہ دیوی دیوتاؤں کی ناراضگی کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ نہ یہ موروثی مرض ہے نہ ہی کسی مخصوص غذا کے استعمال سے یہ لاحق ہوتا ہے۔

آج سے تقریباً ۵۰ سال قبل ضرور یہ ایک لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا لیکن تجربات و تحقیقات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ قطعاً کوئی لاعلاج مرض نہیں ہے۔ اگر معالج کے مشورے کے مطابق پابندی سے اس کا علاج کرایا جائے تو مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

جذام ایک مزمن مرض ہے جو ایک مخصوص قسم کے کرم ـ LEPRA BACILLI کے سبب ہوتا ہے جو عموماً اعصابی نظام کے تاروں اور جلد کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک معمولی درجے کا متعدی مرض ہوتا ہے لیکن صرف ۳۰ فیصد مریض ہی متعدی ہوتے ہیں۔

جذام کے متعدی مریضوں کے ساتھ طویل عرصہ تک رہنے سے یہ مرض صحت مند آدمی کو بھی لاحق ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اس شخص کو جو متعدی مریض کے ساتھ رہتا ہو اسے یہ مرض لگ جائے کیونکہ ۹۰ فیصد افراد میں قدرتی طور پر جذام کے خلاف قوت مدافعت موجود ہوتی ہے۔ عام طور پر اس مرض کے جراثیم بچپن ہی میں جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس وقت اس مرض کے خلاف قوت مدافعت کا فقدان ہوتا ہے اور جب مرض ظاہر ہوتا ہے تب تک مریض بالغ ہو چکا ہوتا ہے۔ جراثیم کے جسم انسانی میں داخل ہونے اور علامات کے ظاہر ہونے میں چند ہفتوں سے لے کر ۴۰ سال تک کا طویل عرصہ لگ سکتا ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ بھی غلط فہمی رہتی ہے کہ جذام موروثی مرض ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ جذام میں مبتلا مریضوں کے بچے صحت مند اور توانا ہوتے ہیں۔ ہاں! ایسے والدین جن کو متعدی قسم کا جذام ہو اور وہ علاج بھی نہ کر رہے ہوں تو ان کے بچوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کے خطرے بڑھ جاتے ہیں۔ اس مرض کے شکار مرد اور عورت دونوں ہو سکتے ہیں لیکن عورتوں کے مقابلے مرد اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔

اس مرض میں مریض کے جسم کے کسی بھی حصے پر سفیدی مائل یا سرخی مائل دھبے ظاہر ہونے لگتے ہیں جو مختلف جسامت کے ہو سکتے ہیں، ایک یا ایک سے زائد بھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ ایسے دھبوں میں پسینہ نہیں آتا۔ ان دھبوں میں کٹنے یا جلنے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

چونکہ اس مرض کے جراثیم عموماً اعصابی تاروں کے نظام اور جلد پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے جلد پر دھبے یا گلٹیاں نکل آتی ہیں۔ ان دھبوں کی تعداد، شکل اور حجم مختلف ہوتے ہیں۔ اعصابی تاروں کا نظام چونکہ دماغ کو حطرات کی اطلاع دیتا رہتا ہے اور دماغ ان اعضاء کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب ہمارے پیروں میں کانٹا چبھتا ہے تو غیر ارادی طور پر ہاتھ

ایڈیٹر "نوائے طب وصحت" ڈاکخانہ بیگم سرائے، الہ آباد ۲۱۱۰۱۵

وہاں پہنچ جاتا ہے اور کانٹا نکال دیتا ہے۔ اسی طرح جب ہمارا ہاتھ کسی گرم چیز پر پڑتا ہے تو تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور ہم فوراً اپنا ہاتھ ہٹا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب اعصابی تاروں کے قدرتی اور حفاظتی نظام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تو وہ دماغ کو خطرات سے باخبر کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور دماغ حفاظتی تدابیر کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جذام کے مریضوں میں کانٹا چبھنے، آگ سے جلنے کا احساس نہیں ہوتا اور رفتہ رفتہ یہی زخم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ جذام کے مریضوں کو زخم سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس لیے وہ لاپرواہی کرتا ہے، نہ تو حفاظتی تدابیر اختیار کرتا ہے اور نہ ہی مناسب علاج جس کے سبب زخم بڑھتا جاتا ہے اس میں پیپ پڑ جاتی ہے اور گلنے سڑنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور مریض بدشکل ہو جاتا ہے۔

جذام کے وہی مریض بدشکلی کا شکار بنتے ہیں جو صحیح وقت پر مناسب علاج کرانے سے گریز کرتے ہیں جس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ مریض سماج کے ڈر سے اپنے مرض کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے جب کہ یہ اس کی سب سے بڑی بھول ہوتی ہے کیونکہ جب مرض بڑھ جاتا ہے تو مریض ہزار کوشش کے باوجود اپنے مرض کو چھپانے پر قادر نہیں رہ پاتا۔

جہاں اس مرض کے بارے میں لوگوں میں مختلف قسم کے غلط تصورات موجود ہیں وہیں ایک غلط تصور یہ بھی ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے جب کہ یہ تصور قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ آج اس مرض کا علاج موجود ہے۔ جدید ادویات کے ذریعے ۶ ماہ سے ۲ سال یا اس سے زائد عرصے تک علاج کرانے سے یہ مرض ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اب تو جذام کے ہسپتالوں میں مفت دواؤں کا بھی انتظام موجود ہے۔

اس مرض کے بڑھنے اور پھیلنے کا سب سے بڑا سبب ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات ہیں۔ ایسے مریضوں کے ساتھ نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے، انہیں کمتر اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے پاس اٹھنے، بیٹھنے، کھانے پینے، شادی بیاہ کرنے سے پرہیز کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جذام میں مبتلا مریضوں میں احساس کمتری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مرض کو ہر ممکن چھپانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ سماج کی نگاہوں سے بچ سکے۔ لیکن اس کے اس رجحان سے مرض کے بڑھنے اور پھیلنے کا اندیشہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب جذام کا مریض سماج کے ڈر سے اپنے مرض کو چھپانے کوشش کرے گا اور علاج کرانے سے بھی گریز کرے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ اس کا مرض بڑھتا جائے گا اور اس کے قریب رہنے والے صحت مند افراد بھی اس مرض کی گرفت میں آتے جائیں گے۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ان غلط تصورات کو ختم کر دیں جن کے سبب ہم ایسے مریضوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم خود مرض کے بارے میں صحیح اور مکمل معلومات حاصل کریں، دوسروں کو بھی مرض کے بارے میں سمجھائیں، جذام کے مریضوں کے ذہن سے اس ڈر کو ختم کر دیں جس کے سبب وہ اپنا مرض چھپانے کی کوشش کرتا ہے تبھی اس مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

●

بقیہ: تبصرے

اس کتاب میں بعض تہواروں کے ضمن میں ہندو اور مسلمانوں کی باہمی شراکت کے منظرنامے کو بھی اُبھارا گیا ہے۔ اس سے دونوں فرقوں کے بھائی چارے کو تقویت ملتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ قومی تقاریب کے سلسلے میں انھوں نے ۱۹ نومبر یعنی مسز اندرا گاندھی کے جنم دن کو یوم قومی یکجہتی بھی کہا ہے۔ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ذکر کر کے قومی یکجہتی کے استحکام پر زور دیا ہے۔ جناب نریندر لوتھر صاحب نے اس کتاب ہماری قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے میں اور اس طرح ہمارے معاشرے کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔"

محمد رضی الدین معظم صاحب شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے موقع بہ موقع اشعار کو بھی اپنی تحریر میں سمویا ہے۔ بعض بعض تہواروں کے ذکر میں انھوں نے صفحات کے صفحات اشعار سے رنگ دئے ہیں۔ مثلاً عید اور عید قربانی پر اشعار کا ایک ضخیم انتخاب شامل کیا ہے۔

یوم ولادت یا جینتی تقاریب کے ضمن میں مختلف مذہبی پیشواؤں کا تفصیلی ذکر شامل کیا ہے۔ اس سے مختلف مذاہب کی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ اور اس سے انسانیت کے جذبے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس دور میں انسانیت کا درس سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

مذکورہ کتاب ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے مصنف کی کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان کی محنت و لگن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کی آج کے دور میں ۸۰ روپے قیمت واجبی ہے۔

امید ہے کہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔

م۔ ی۔ ع ●

مناظر حسین

گھریلو طبّی نسخے

سونٹھ کے فوائد

سونٹھ قدرت کا بخشا ہوا ایک مفید اور قیمتی عطیہ ہے۔ سونٹھ دراصل ادرک کی ہی خشک شدہ شکل ہے۔ کم و بیش دونوں کے خواص بھی یکساں ہیں۔ ادرک کو رگڑ کر چھلکا ہٹا کر سکھا لیتے ہیں اور پھر ٹاٹ سے رگڑ کر صاف کر لیتے ہیں تو سونٹھ تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں سونٹھ کے گھریلو علاج میں مفید کچھ آزمودہ نسخے تحریر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ **پیچش یا آنو:** ناقص غذا یا بدہضمی کے سبب پیٹ میں آنو بن جاتی ہے۔ اس کے لیے ۲۵۰ گرام دودھ میں آدھا چمچ سونٹھ کا سفوف ڈال کر خوب ابالیں۔ جب دودھ خوب پک جائے تو اُسے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اسے رات کو سوتے وقت ۳۔۴ دنوں تک پینے سے پیچش یا آنو کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور معدہ ہر طرح کی آلائش سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

۲۔ **آدھے سر کا درد:** آدھے سر میں درد کی شکایت ہو تو سونٹھ کو پانی میں گھس کر پیشانی پر لیپ کریں۔ دو تین دنوں تک استعمال کے بعد انشاءاللہ یہ شکایت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

۳۔ **گٹھیا:** یہ نہایت واہیات اور تکلیف دہ مرض ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک مجرب نسخہ موجود ہے۔ سونٹھ اور گلوئے کی برابر مقدار لے کر موٹا موٹا کوٹ لیں اب اسے دو کپ پانی میں ڈال کر اُبالیں جب آدھا کپ پانی رہ جائے تو اُتار کر ٹھنڈا کر لیں اور چھان کر پی لیں۔ اس نسخے کو فائدہ نہ ہونے تک روزانہ کھانے کے گھنٹے بھر بعد استعمال کریں۔ گٹھیا کی شکایت یقیناً دور ہو جائے گی۔

۴۔ **بھوک نہ لگنا:** سونٹھ کا سفوف نصف چمچ تھوڑے سے گڑ میں ملا کر کھانا کھانے کے بعد کچھ دنوں تک استعمال کرنے سے بھوک نہ لگنے کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور پھر بھوک کھل کر لگنے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں اس نسخے کے استعمال سے پیٹ کے دیگر امراض بھی دور ہو جاتے ہیں

۵۔ **کمر کا درد:** سونٹھ کو موٹا موٹا کوٹ کر دو کپ پانی میں اُبال کر کاڑھا بنائیں۔ جب نصف کپ پانی بچے تو اسے اُتار کر ٹھنڈا کر لیں اور اس میں دو چمچہ ارنڈی کا تیل ڈال کر سونے سے قبل پی لیں۔ یہ کمر، پیٹ اور کولہے کے درد کو ٹھیک کرتا ہے۔ فائدہ نہ ہونے تک استعمال کریں۔

۶۔ **ہچکی:** سونٹھ اور چھوٹی ہرڑ کو پانی میں گھس کر اس کا گاڑھا لیپ ایک چمچ، ایک کپ نیم گرم پانی میں گھول لیں اب اسے گھونٹ گھونٹ کر پی جائیں ہر طرح کی ہچکی کے لیے مفید ہے۔

ادرک کے خواص

ادرک دراصل ایک پودے کی جڑ ہے۔ اس کا رنگ بھورا، ذائقہ تیز اور تلخ ہے۔ مزاج اور تاثیر کے اعتبار سے یہ گرم ہے۔ ادرک ہاضم ہے ریاح خارج کرتا ہے۔ ذہن و حافظہ اور باہ کو قوت عطا کرتا ہے۔

ادرک دوا ہے، کوئی غذا نہیں۔ سردی کے موسم میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بلغم، اپھارہ (بدہضمی) کو دور کرتا ہے۔ کھانا کھانے سے قبل نمک لگا کر ۵ گرام ادرک چھیل کر کھانا معدہ کے لیے مفید ہے۔ اس سے بھوک کھل کر لگتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ادرک کی اتنی ہی مقدار اور کھا لینے سے کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ ادرک کا مربّہ بھی بنایا جاتا ہے۔ لقوہ، فالج، دمہ، نزلہ، زکام، کھانسی کی شکایت ہو تو ادرک تازہ یا ادرک کا مربّہ بے حد مفید ہے۔

ادرک کا استعمال بلا ضرورت کرنے یا مقررہ حد سے زیادہ کھانے پر سینہ کی جلن، پت کی زیادتی، پیشاب میں جلن، خون میں تیزی کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے لہٰذا اس کا استعمال بوقت ضرورت مناسب مقدار میں کرنا چاہیئے

عمدہ ادرک بے ریشہ ہوتا ہے۔ ادرک کو جب خشک کر لیا جاتا ہے تو یہ سونٹھ کہلاتا ہے۔

ادرک کے گھریلو نسخے

- ادرک کا عرق اور اجوائن برابر مقدار میں ملا کر جسم پر لیپ کرنے سے ریاح کے درد کو فائدہ پہنچاتا ہے
- ادرک، دودھ کے ساتھ لینے سے جسمانی درد دور ہوتا ہے۔
- ادرک اور لیموں کا عرق ملا کر کھانے سے بدہضمی اور پیٹ کا درد دور ہوتا ہے۔
- آنکھوں کی سوزش میں ادرک کے عرق کی دو بوندیں آنکھ میں ڈالنے سے کافی آرام ہوتا ہے۔
- ادرک کا عرق دل، حلق، معدہ، سوزش، بلغم

باقی صفحہ ۱۷ پر

ڈتو۔ ڈاکخانہ بارا سوا یا چاکند۔ ضلع گیا ۸۰۴۴۰۴

لوحینا، نئی دہلی

نشاط اسلم

عطر — ہندوستانی تہذیب کا ٹمٹماتا چراغ

عطر بھارت کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور ہزاروں سال پرانی تاریخ کا ایک انتہائی دلچسپ اور انمول حصہ ہے۔ ہمارے یہاں عطر کا استعمال ازمنۂ قدیم سے ہوتا آیا ہے۔ جس وقت دنیا میں لوگوں کو اس فن کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، بھارت میں اس کی کشید اور استعمال کا عام رواج تھا۔

ہندوستانی عطر کو بنانے کا عمل حد درجہ نازک اور پیچیدہ ہے۔ پہلے خوشبودار پھولوں کو تانبے کے مخصوص ڈیزائن کے برتنوں میں اُبلتے ہوئے پانی میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی بھاپ کو دھیرے دھیرے نلی کے ذریعہ صندل کے تیل میں سمویا جاتا ہے۔ صندل کا تیل عطر کی بنیادی چیز ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ساری خوشبو کو اپنے اندر بسا لیتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کافور اور مختلف قیمتی جڑی بوٹیوں کا محلول ملایا جاتا ہے اور انھیں کے امتزاج کے مطابق عطر کو مختلف نام جاتے ہیں مثلاً عطرِ مجموعہ، عطرِ خس، عطرِ حنا، عطرِ موتیا اور عطرِ گلاب وغیرہ۔

عطر کا استعمال ہندوستان کے شہنشاہوں، راجاؤں، نوابوں اور رئیسوں میں ہزاروں سال سے مروّج تھا لیکن عطرِ گلاب کی ایجاد کا سہرا مغل شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ نورجہاں کے سر جاتا ہے۔ نورجہاں کو رنگ برنگے مہکتے ہوئے گلابوں سے والہانہ لگاؤ تھا۔ ایک صبح اس نے اپنے حمّام کے حوض میں نیم گرم سطحِ آب پر ایک رقیق مادّہ پھیلا ہوا دیکھا۔ تحقیق کرنے پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ مائع تازہ گلاب کی ان پنکھڑیوں سے نکلی ہے جو اس کے غسل کے پانی کو خوشبودار بنانے کی غرض سے حوض میں ڈالی گئی تھیں۔ اسی وقت نورجہاں کو ایک نیا خیال آیا۔ اس نے عطرسازوں کو بلا کر مشورہ کیا اور اپنی نگرانی میں اسے بنوانا شروع کیا۔ اس طرح ۱۷ویں صدی میں ایک حسین ملکہ نے ایک دلآویز خوشبو کی ایجاد کی۔

آج کل بھارت میں عطر کی تقریباً ڈیڑھ سو اقسام دستیاب ہیں۔ ان کو بنانے کے لیے جن اشیا کی ضرورت ہوتی ہے وہ لگ بھگ سبھی قنوج میں ملتی ہیں۔ قنوج کا اصلی نام "کانیہ کبج" یعنی کبڑی لڑکی ہے۔ کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں یہاں کی ایک راجکماری نے کسی رشی کی ہتکِ عزت کی تھی۔ انھوں نے غصّے میں اسے بددعا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ کی ایک سو بیٹیاں کبڑی ہو گئیں اور اسی وقت سے یہ شہر کبڑی لڑکیوں کا شہر" کانیہ کبج" کہلانے لگا جو آگے چل کر قنوج بن گیا۔ آخری بودھ راجہ ہرش وردھن نے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ اس وقت قنوج اپنے عظیم شعرا، ادبا، ڈرامہ نگاروں، فلسفیوں اور مختلف فنکاروں کے لیے پورے بھارت میں مشہور تھا لیکن آج اس کا نام صرف عطر سے ہی وابستہ رہ گیا ہے۔ قنوج کے علاوہ عطرسازی کے مشہور مراکز بمبئی اور جونپور ہیں۔

جس طرح بھارت میں ہر چیز ملاوٹ کی شکار ہے اسی طرح عطر بھی ملاوٹ کے شکنجے سے نہیں بچ سکا ہے۔ پچھلے دس پندرہ سال سے بہت سارے عطرساز مغربی ملکوں کی مانند صندل کے تیل کی بجائے الکوحل کا استعمال کرنے لگے ہیں جب کہ الکوحل، عطر کے نازک مزاج کے قطعی خلاف ہے۔ الکوحل کے علاوہ جڑی بوٹیوں کی جگہ سستے کیمیکل کو ملایا جانے لگا ہے۔ اس ملاوٹ سے جو رقیق مادہ تیار ہوتا ہے اسے خوشبو تو کہا جا سکتا ہے لیکن عطر ہرگز نہیں۔ ہندوستانی عوام کو یہی خوشبو عطر کے نام سے فروخت کی جاتی ہے۔ اصلی عطر تو اصلی زعفران کی طرح سعودی عرب، مسقط، کویت، قطر اور دیگر خلیجی ممالک کے علاوہ ملیشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور وغیرہ کو ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے کیونکہ غیر ممالک میں ہندوستانی عطر حد درجہ مقبول ہے اور وہاں اس کی زبردست مانگ ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ خود بھارت میں اس بیش قیمت ورثے کی وہ قدر و منزلت نہیں رہی جو زمانۂ قدیم سے عہدِ مغلیہ تک تھی۔ ہم لوگ پیرس اور دوسرے مغربی ملکوں کے پرفیوم کے لیے مہنگی سے مہنگی قیمت ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں اور اسے خرید کر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن عطر کے لیے مناسب قیمت بھی نہیں دے سکتے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۵ گرام خالص عطر کی قیمت صرف ۵۰ روپئے ہے جو فرانس کے تیار شدہ معمولی درجے کے پرفیوم سے بھی سستا

۸۸-اے پنڈارا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

ہے ۔ سینٹ کے برعکس عطر کی خوشبو بہت پائیدار ہوتی ہے جو کبھی کبھی تو برسوں تک محفوظ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے کئی امراض میں مفید ہے مثلاً عطر گلاب آشوب چشم اور دل کے امراض کے لیے، عطر موتیا کان کے پھوڑے کے لیے، عطر حنا جوڑوں کے درد کے لیے اور عطر خس سر درد کے لیے لیکن ہندوستانی ابھی اس گراں مایہ شئے کی قدر نہ کر کے مغرب کے نقلی سینٹوں کے متوالے ہیں ۔اب تو خالص عطر کا استعمال صرف مذہبی تہواروں تک ہی محدود ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال بے حد تشویشناک ہے۔ دراصل ہندوستانیوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے ایک نئی کوشش کی ضرورت ہے۔ عطر کے استعمال اور مقبولیت کو بڑھانے کے لیے سرکار کی کاٹج انڈسٹریز کے ذریعہ پرچار کیا جانا چاہیے۔ کھادی گرام ادیوگ اور ریاستی سرکاروں کے امپوریم کے ذریعہ عطر کو فروخت کرنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ تجارتی میلوں میں بطور خاص اس کی تشہیر ہونی چاہئے ۔جب کھادی جیسی کھردری چیز پبلسٹی کے ذریعہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک میں مقبولیت کی معراج پر پہنچ سکتی ہے تو عطر جیسی لطیف، نازک اور پُر بہار شئے ہندوستانی عوام کی زندگی میں کیوں نہیں رچ بس سکتی ؟

عطر کی صنعت کے فروغ اور ترقی کے لیے اچھی پیکنگ بھی انتہائی ضروری ہے۔ بھارت میں نہ تو فرانس اور دیگر یوروپین ملکوں کی مانند حسین اور دیدہ زیب شیشیاں بنائی جاتی ہیں اور نہ ہی ان کی خوبصورت پیکنگ کی جاتی ہے ۔فرانس میں سینٹ کی پیکنگ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک فرانسیسی کاریگر پیئر ڈینانڈ (Tiere Dinand) نے تین سو سے زیادہ سینٹ کی شیشیوں کے ڈیزائن تیار کئے ۔آج کل فرنچ کمپنیاں قدیم و جدید ڈیزائنوں کے امتزاج سے انتہائی پُرکشش اور دلفریب شیشیاں بنا رہی ہیں جن کی دلکشی بیان کرنے سے الفاظ بھی قاصر ہیں۔ فرانس میں خوشبوؤں کے ظروف کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ اگر خوشبو کی قیمت تین سو روپئے ہے تو اس کی بوتل ایک ہزار روپئے کی ہوگی۔ بھارت میں عطر کے لیے بے حد گھٹیا اور بھدی شیشیاں بنائی جاتی ہیں ۔اترپردیش کا شہر فیروزآباد اپنے کانچ کی صنعت کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مغربی ایشیا میں مشہور ہے ۔یہاں کی چوڑیوں، فانوس اور شیشے کی مختلف آرائشی مصنوعات کا جھلکتا ہوا تراشیدہ حسن اپنی مثال آپ ہے ۔ یہاں عطر کی شیشیوں کی بناوٹ اور ڈیزائن پر ریسرچ کی جاسکتی ہے ۔ بھارت سرکار وہاں دس کروڑ روپے کی لاگت سے نیشنل گلاس انسٹی ٹیوٹ (National Class Institute) بنا رہی ہے ۔اس انسٹی ٹیوٹ کو عطر کے ظروف کے نمونوں کا کام سونپا جاسکتا ہے۔

عطر کی گمنامی کا ایک اہم سبب پبلسٹی کا نہ ہونا ہے ۔آج کل صحت کے لیے ضرر رساں چیزوں مثلاً پان مسالہ، گٹکا، کھینی، زردہ، بیڑی، شراب سگریٹ اور نسوار وغیرہ کے استعمال کو رنگ برنگے اشتہاروں کے ذریعہ پورے ملک میں پھیلا دیا گیا ہے لیکن عطر جیسی کیف آگیں شئے کا کوئی تذکرہ کہیں نظر نہیں آتا ۔

ریڈیو، ٹی وی، اخبار اور رسائل کے توسط سے دلچسپ اور پُرکشش اشتہار عطر کو ہر دل عزیز بنانے اور مقبولیت عطا کرنے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں ۔یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اپنی تہذیب کے اس ٹمٹماتے چراغ کو گُل ہونے سے بچائیں ۔●

خسرہ کے معاملات میں تخفیف

۸۶-۱۹۸۵ء میں ۴۳ فی صد بچّوں کو خسرہ کا ٹیکہ لگایا گیا جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۸۵٫۸ فی صد بچّوں کو یہ ٹیکے لگے ۔اس طرح ٹیکے لگائے جانے والے بچّوں کی تعداد میں ۸۰ فی صد سے زائد کا اضافہ ہوا۔ ٹیکے لگانے کے کام میں پیش رفت کے نتیجے میں ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۲ء کے دوران خسرہ کے مرض میں ۴۳ فی صد کی کمی ہوئی ۔

ٹیکوں کے ذریعہ جن بیماریوں کو روکا جاسکتا ہے ان میں خسرہ بھی ایک ہے ۔خسرہ ایسی بیماریوں سے ہر برس دنیا بھر میں ۳۰ لاکھ اموات رونما ہوتی ہیں ان میں سے آدھی اموات اسی خسرہ کی وجہ سے ہوتی ہیں ۔بھارت میں ۱۹۹۲ میں جتنے معاملات سامنے آئے تھے، ۱۹۹۳ میں ان کی تعداد آدھی ہے ۔صرف بھارت میں ہر برس سالانہ ۲ کروڑ خسرہ معاملات سامنے آتے ہیں جس میں سے ۲ لاکھ اموات اسی خسرہ سے متعلق ہوتی ہیں ۔

۹۳-۱۹۹۲ کے لیے آندھرا پردیش، ہریانہ، کیرالا، مہاراشٹر، پنجاب، تامل ناڈو اور راجستھان سمیت کئی ریاستوں نے ۹۰ سے ۱۰۰ فی صد تک احاطہ کرنے کی سطح حاصل کر لی ۔

خسرہ کو ۱۹۸۵ء میں بیماریوں سے محفوظ کرنے کے عالمی پروگرام میں شامل کیا گیا ایک تخمینے کے مطابق خسرہ سے نجات دلانے پر ناقص غذائیت اور متعلقہ پیچیدگیوں، ۲۵ فی صد تک نمونیا اور ۱۵ فی صد تک پتلے دست لگنے کی بیماریوں پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے ۔تخمینہ لگایا گیا ہے کہ خسرہ کے تقریباً ۴ فی صد معاملات میں نمونیہ بھی لاحق ہو گیا ۔یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن بچّوں کو خسرہ لاحق ہوتا ہے انھیں عام بچّوں کے مقابلے میں پتلے دست بھی زیادہ لگتے ہیں●

محمد رضی الدین معظم

عیسوی کیلنڈر ــــ ایک مطالعہ

جنتری تقویم 'Calendar' دنیا کے لیے ناگزیر ایجادات میں سے ایک ہے اور تمدنی دنیا میں ایک زبردست شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ اس کے ارتقار میں تہذیب نے بڑے بڑے مشاہدات حاصل کیے جو جدید علمی دور کے لیے اہم ایجادات کا موجب ہوئے۔ ابتدائی دنیا میں سب سے پہلے انسان کو تقویم جنتری کی اس شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے ارتقار کے لیے انسان نے علم نجوم کے مطالعہ سے شمس وقمر (Sun & Moon) کا مطالعہ کیا اور نتیجتاً علم فلکیات اور علم سائنس سے روشناس ہوا۔ کن کن تہذیبوں کی ایجادات سے موجودہ تقویم جنتری آج ہم تک پہنچی اور رہنماؤں مصلحین و محققین نے کس قدر محنت شاقہ برداشت کی اس کے اظہار کے لیے عاصی محمد رضی الدین معظم کا قلم عاجز ہے

ابتدائی زمانہ میں تقویم جنتری کا تعلق زیادہ تر موسموں پر منحصر تھا۔ کسی موسم میں پھل پکتے تھے تو کسی موسم میں کلیاں کھلتی یا کسی موسم میں برف باری، پت جھڑ، موسم باراں (بارش) مانسون ہوتا۔ غرض عہد عتیق میں انسان کی عمر کا حساب بھی موسم ہی کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ دن اور رات شب و روز کا تصور اس قدر قدیم ہے کہ تاریخ سے اس کا پتہ صحیح نہیں چل سکا۔ عہد عتیق کے قبائل مرغ کی بانگ، چڑیوں چہچہاہٹ، ستاروں کے نمودار ہونے اور ڈوبنے سے رات دن کا حساب رکھتے تھے یعنی پہلا تارہ نظر آتے ہی رات اور غائب ہوتے ہی دن کا آغاز سمجھتے۔ اس طرح رات دن کی تقسیم رہی۔ دن کے اوقات سورج کے سائے اور رات کے اوقات رفتار ثوابت پر منحصر تھے۔ اسی طرح انسان نے جب اختر شناسی میں ترقی کرلی تو مہینہ وسال کا تعین رفتار ثوابت ہی سے کیا۔ انھوں نے دن کے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا یعنی صبح، دوپہر، سہ پہر اور شام۔ اور رات کو بھی چار حصوں میں بانٹ دئے تھے ابتدائی شب، نصف شب، آخر شب اور صبح۔ رفتہ رفتہ گھنٹوں لمحوں اور ثانیوں (سکنڈ) کی تقسیم عمل میں آئی۔

جب ہم اپنے ملک میں برسہا برس سے رائج عیسوی کیلنڈر پر غور کرتے ہیں تو یہ اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ رومیوں نے اپنے دیوتاؤں کے نام پر مہینے کے نام رکھے تھے جو آج بھی مغربی دنیا میں قائم ہیں۔ ان کے پاس سال بارہ مہینے ہی کا مقرر تھا لیکن بارہ مہینے کے نام کچھ اس طرح سے تھے۔ (۱) مارٹیئس (Martius) (۲) اپریلیس (Aprilis) (۳) ماولیس (Mauis) (۴) الوییئس (Iunius) (۵) کوئنٹلس (Quintilis) (۶) سیکسٹیلس (Sextilis) (۷) سپتمبر (September) (۸) اکتوبر (October) (۹) نومبر (November) (۱۰) دسمبر (December) (۱۱) اینوارئیس (Iunuerius) (۱۲) فبروارئیس (Februarues) ان میں سے پہلا تیسرا پانچواں اور آٹھواں مہینہ ۳۱ دن کا بارہواں مہینہ ۲۸ دن کا اور باقی مہینے ۲۹ دن کے ہوا کرتے تھے اس طرح ان کا سال ۳۵۵ دن کا ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مہینہ میں تین ہفتے (Weeks) دس دس دن کے محسوب کیے جاتے۔ علاوہ ازیں روم میں خانگی اور تجارتی اشخاص میں مختلف قسم کی جنتریوں کا رواج تھا لیکن یہ عموماً بے ضابطہ سمجھے جاتے تھے۔ ان بے ضابطہ جنتریوں اور ان کے نقائص کو دور کرنے کے لیے اسکندریہ کے لوگ سوسیگ نیس (Sosignies) نے محسوس کیا اور اس کی اصلاح کی جستجو شروع۔ انھوں نے مصری رائج الوقت شمسی جنتری کی نقل کرکے اس میں چند اصلاحات کے بعد جولیس سیزر کے دربار شاہی میں پیش کیا تو جولیس سیزر نے داد تحسین کے ذریعہ سرکاری طور پر اس کو اختیار کرنے کی منظوری دے دی اور یہ جنتری ۴۵ قبل مسیح میں جاری کردی گئی۔ اب ان کا سال مصری سال کی طرح ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا اور ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ کیا جانے لگا۔ فلکیات کے مزید انکشافات سے ایک سال ۳۶۵ دن پانچ گھنٹے ۴۰۵ لمحے اور (۴۶) ثانیے کا ہوگیا۔ اس طرح مصری اور رومی سال میں گیارہ لمحے ۱۴ ثانیے کا فرق باقی رہا۔ چونکہ جولیس سیزر نے مصری جنتری کو جنوری میں نافذ کیا تھا جو اس وقت رائج تھی لہٰذا جولیس سیزر کی یاد میں کوئنٹلیس (Quintilis) نامی مہینہ بدل کر جولیس (Julius) رکھ دیا گیا جو رفتہ رفتہ جولائی (July) کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اسی طرح سکسٹیلس (Sextilis) مہینہ کا نام بھی بدل کر اگسٹس سیزر کے نام پر اگسٹس کردیا گیا یہ مہینہ بھی بعد میں اگست (August) بن گیا۔ آخری دو مہینے ایوارئیس (Iunuerius) اور فبروارئیس (Februarues) بالترتیب جنوری (January) اور فبروری (February)

• محافظ المحاشعین" ۸۶۶۔ رحیم منزل، شاہ گنج، حیدر آباد

کے نام سے مشہور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ پہلا دوسرا تیسرا اور چوتھا مہینے کا نام بدل کر مارچ، اپریل، مئی اور جون ہو گئے۔ اور اس کو جولین جنتری کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ جو آج بھی مغربی دنیا میں عیسوی کیتھولک جنتری کے نام سے موسوم ہے۔

۱۵۸۲ء میں ایک اطالوی پادری اسکالر جوزف سیلو نامی محقق نے کسی بھی دن کے شمار کے لیے یکم جنوری کو تاریخ کا آغاز قرار دیا اور اس طرح ان کی یہ دریافت جولین جنتری کے لیے قبول کر لی گئی۔ عیسوی کیلنڈر کی حقیقت اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ جولیس سیزر مصری جنتری کو اصلاح کے بعد حکم جاری کیا تھا اور عموماً تمام عالم مغرب میں صدیوں تک جاری رہی۔ عیسائی مذہب کے تمام تہوار ایسٹر ڈے (Easter Day) سے متعین و مقرر ہیں یہ تاریخ موسم بہار کے نقطۂ معتدل شمسی کے مشاہدہ سے مقرر ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ موسم بہار کے نقطۂ معتدل شمسی کے بعد پہلی رویت ہلال کی تاریخ معلوم کی جائے۔ لیکن یہ طریقہ مصری، بابل اور رومی شمسی جنتری کے ذریعہ معلوم کرنا محال ہے کیونکہ اس جنتری میں ہلال کسی تاریخ میں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔ جولین جنتری میں یہ تاریخ ۲۵ مارچ مقرر کی گئی تھی لیکن اس وقت کی مشہور و معروف کونسل آف نائیس (Council of Nice) نے ایسٹر کی تاریخ ۲۱ مارچ مقرر کی۔ جولین جنتری میں چند لمحے، ثانیے اور سکنڈوں کا فرق تھا اس وجہ سے ایسٹر کی تاریخ سولہویں صدی عیسوی میں ۱۱ مارچ پڑ گئی۔ جس کے باعث تشویش پیدا ہو گئی بالآخر اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے پوپ گریگری نے جولین جنتری کو از سر نو نظر ثانی کی اور نقص کو دور کر دیا۔ لہٰذا اب اس جنتری کو بجائے جولین جنتری کے عیسوی کیلنڈر کہا جانے لگا۔ پوپ گریگری نے اس جنتری کیلنڈر کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے محسوب کیا۔ گرچہ یہ کہ جدید تحقیقات سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا دن تو کیا، آپ کے بارے میں واقعات کا علم بھی کسی کو نہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس سن میں اس عالم فانی میں رونق افروز ہوئے اور کب تک رہے یہ سب راز جاننے والے سوائے اللہ رب العزت کے سب عاجز ہیں۔ پوپ گریگری نے قیاساً یہ دن مقرر کر لیا ہے۔

اس طرح سن عیسوی کا رواج ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ اور گریگورین کیلنڈر کے نام سے موسوم و معروف ہے۔ جنتری کی تقویم کی وجہ سے دنیا میں توہم پرستی رونما ہوئی اور اختر شناسی کا عوامی زندگی پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ سائنس کی انتہائی کوشش کے باوجود توہم پرستی دنیا سے نہیں مٹائی جا سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد عتیق ہی سے اختر شناسوں نے سیاروں کو دیوتا تصور کیا اور جنتری کی تقویم کے ساتھ ساتھ ہر ستارے کے اثرات کی بھی نشر و اشاعت ہوئی۔ جس کی وجہ سے ایک منظم قسم کی اصنام پرستی پھیل گئی۔ نجومی ہمیشہ یہ باور کراتے آئے ہیں کہ سیاروں کی گردش سے ہر لمحہ و ثانیہ انسان کی تقدیر متاثر ہوتی رہتی ہے اور ہر ستارے کی گردش کے سبب مختلف ایام میں نحوست یا خوشحالی کا اثر ہوتا ہے۔ یہ توہمات ہندوستان میں نہ صرف جاہل طبقہ میں بکثرت موجود ہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان پر عقیدہ واثق رکھتا ہے۔ جدید سائنس نے تحقیق و جستجو کے آئینہ میں یہ بتا دیا ہے کہ ستاروں سے انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور توہم پرستی لغو ہے۔ البتہ جنتری کی حد تک ستاروں کی گردش اہمیت رکھتی ہے۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ حضرت انسان اپنی زندگی میں خود اپنے ہی اعمال و کرتوتوں سے کچھ ایسے اعمال بد و نحوست کا شکار بنتے ہیں جس کے لیے سرور کائنات رسول مکرم و معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تاکیداً ذکر فرمایا ہے جو اوراق احادیث کے مطالعہ پر مشعل راہ بنتے ہیں۔

الغرض عیسوی سال نو کی پہلی تاریخ یکم جنوری کو ہی مانا جاتا ہے۔ حکومت ہند اور تمام ریاستی حکومتیں عیسوی کیلنڈر ہی کو قانوناً رائج و مروج گردانتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں بھی عیسوی کیلنڈر ہی کا رواج عام ہے۔

ہمہ گیر ترقی کے لیے ماحولیاتی منصوبۂ عمل

ماحولیات و جنگلات کی وزارت نے بھارت کے لیے ماحولیاتی منصوبۂ عمل وضع کیا ہے تاکہ قومی تحفظ حکمت عملی نیز گزشتہ برس ریو میں منعقدہ ارضیاتی کانفرنس میں کیے گئے عہد کو ترجیحاتی پروگراموں کی مدد سے عملی شکل دی جا سکے۔ منصوبۂ عمل کے پروگرام کا مقصد بنیادی طور پر ملک میں ماحولیاتی خدمات میں بہتری لانا اور ہمارے ترقیاتی پروگراموں میں ماحولیاتی لاگتوں کو بین الاقوامی شکل عطا کرنا ہے۔

شعبہ جاتی مطالعات کا اہتمام کر کے خصوصی توجہ کے آٹھ علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان آٹھ شعبہ جات میں جنگلات، انسانی بستیوں، زیر آب زمینوں، مونگے کی چٹانوں، پہاڑوں کے معیشت حیوانات نظام سمیت حیاتیاتی گوناگونی کا ہمہ گیر استعمال اور ان کا تحفظ شامل ہے۔

اس کے علاوہ جنگل بانی، زیر آب زمین ترقیات اور مٹی و نمی کا تحفظ کرنا اور آبی وسائل کو کثافت اور آلودگی سے بچانا بھی اس میں شامل ہے۔

صنعت و حرفت سے متعلق آلودگی کی روک تھام صنعتی فضلے کا معقول انتظام وغیرہ بھی اس کے تحت آتے ہیں۔

صاف ستھری تکنالوجی تک رسائی و شہری ماحولیاتی معاملات سے نمٹنا بھی اس کے تحت آتے ہیں۔

متبادل توانائی کا پروگرام بھی اس کے تحت ہے۔ ماحولیاتی منصوبۂ عمل ایک دستاویز ہے جو محض بیان یا اعلانیہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد گزشتہ منصوبوں کا احتساب کرنا اور آئندہ منصوبوں کا جائزہ لینا ہے جو نئی ترجیحات کے مطابق وضع ہوتے رہیں گے۔

اب تک صرف دس ممالک نے اپنے ماحولیاتی منصوبۂ عمل وضع کیے ہیں۔ ان میں مصر، چین، سری لنکا اور کچھ سی آئی ایس ممالک شامل ہیں●

تبصرے

نام کتاب   قومی بچت اور ڈاک خانے
مصنف   سید ساجد علی ٹونکی
صفحات   ۱۰۴
قیمت   ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ   سید عابد علی، علی منزل رحین ٹونک راجستھان

۱۰۴ صفحات پر مشتمل "قومی بچت اور ڈاک خانے" نام کی کتاب سید ساجد علی ٹونکی کی تصنیف ہے جس کا تعلق محکمہ ڈاک خانہ جات سے ہے۔ یہ محکمہ برسوں سے ذاتی اور قومی بچت کے سلسلے میں نمایاں خدمت انجام دیتا آرہا ہے جس سے بچت کھاتوں میں رقم جمع کروانے والوں اور ملک کے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ معاشی اور اقتصادی مسائل پر یہ مصنف کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کی کتاب "ہندوستانی اقتصادی مسائل" ۱۹۹۰ء میں شائع ہو کر خواص وعوام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے، یہاں تک کہ ۱۹۹۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔

زیر نظر کتاب میں جس کا دیباچہ محکمہ کے افسر اعلیٰ اور مشہور ادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی چیف پوسٹ ماسٹر جنرل نے لکھا ہے، محکمہ ڈاک خانہ جات کی بچت سے متعلق مختلف اسکیموں پر مفصل بحث کی گئی ہے اور ان کے تحت ملنے والی سہولیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بچت بنک میں استعمال کی جانے والی متعدد اصطلاحات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ یہ کتاب عام لوگوں کے علاوہ محکمہ مذکورہ کے شعبۂ بچت میں کام کرنے والے ملازمین کے لیے بھی مفید ہے۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف یہ کہ قاری کو بچت سے متعلق قوانین کی معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اس کے دل میں ہر مہینے اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر جمع کرنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ یہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان بچت اسکیموں سے فائدہ اٹھا کر قاری مستقبل وقت کے لیے سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے اور اپنی اولاد کی پرورش، تعلیم اور بیاہ شادی کے لیے ضروری رقم جمع کر سکتا ہے تاکہ اس کو بوقت ضرورت دوسروں کا دست نگر نہ ہونا پڑے اور اس کے بچے اس کی تنگدستی اور ناداری کے سبب احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

اس کتاب میں بیان کی گئی بچت اسکیموں سے فائدہ اٹھا کر قاری مستقبل وقت کے لیے سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے۔

میں اس کتاب کے مصنف کو اس کی اشاعت کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ محکمہ ڈاک بھی اس کے ضروری اقتباسات کو ایک پمفلٹ کی شکل میں چھاپ کر مفت یا برائے نام قیمت پر لوگوں میں تقسیم کرے گا تاکہ وہ فضول خرچی سے بچیں اور ذاتی اور قومی بچتوں میں پیسے جمع کروانا شروع کر دیں۔

صابر ابوہری

نام کتاب   بینک بیاج اور بیع
مصنف   سید ساجد علی ٹونکی
صفحات   ۱۱۲
قیمت   ۲۵ روپے
ناشر: روحا علی، علی منزل محلہ رحین ٹونک راجستھان

زیر نظر تصنیف سید ساجد علی ٹونکی کی تیسری تصنیف ہے موصوف نے اقتصادی ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے یقیناً ضرورت اسی امر کی ہے کہ اردو کو شاعری اور افسانے کے حصار سے نکال کر علمی موضوعات کے وسیع میدان میں داخل کیا جائے اس کتاب میں مختصر لیکن جامع انداز میں روپئے پیسے کے نظام کو سلیس الفاظ میں سمجھایا گیا ہے یہ کتاب مبتدیوں کے ساتھ ساتھ تمام شعبۂ فکر کے لوگوں کے لیے مفید ہے۔

سب سے پہلے تقریباً ایک سو تکنیکی اصطلاحات کی وضاحت کر کے قارئین کے لیے آسانیاں فراہم کر دی گئی ہیں اس کے علاوہ روپئے پیسے اور مال و دولت کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے جدید بینک کاری، معیار زر، معیار کاغذ، اشاریہ قیمت، گرانی، کساد باراری، روپئے کی قیمت میں گراوٹ اور اضافہ، آزاد اور پابند تجارت کے فرق وغیرہ کو اچھوتے انداز میں سمجھایا گیا ہے۔

اس کتاب میں حقیقی اور کاذب سود کے فرق کو بھی ایک مضمون کے لیے بہت دلچسپ انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس کتاب کو سبھی اردو داں حلقوں میں پسند کیا جائے گا

محمد عمر خاں

کتاب   گلدستۂ عیدین و تہوار و تقاریب
مصنف   محمد رضی الدین معظم
ضخامت   ۳۰۸ صفحات
قیمت   ۸۰ روپے

"گلدستۂ عیدین و تہوار و تقاریب" نامی کتاب کے مصنف محمد رضی الدین معظم حیدرآباد کے دینی وعلمی گھرانے کے فرد ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے مضمون نگاری کا شوق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کے جتنے بھی تہوار ہیں انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ قومی تقاریب کو بھی انھوں نے ان تہواروں کے پہلو میں جگہ دی ہے۔ علاوہ ازیں بعض مذہبی رسومات کا بھی ذکر کیا ہے جن کو انھوں نے تہواروں میں شامل کیا ہے۔ کتاب میں انتخاب و مواد کے سلسلے میں علمی استعداد کا ثبوت دیا ہے۔ اور مختلف قلم کاروں کے مضامین کی فراہمی میں تلاش وجستجو کا حق ادا کیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف کے اپنے بہت سے مضامین شامل ہیں۔ جو انھوں نے اپنے خاص انداز و اسلوب میں لکھے ہیں۔ اُن کا ذہنی رادیہ مثبت انداز کا ہے کسی بھی فرقے کے تہواروں کے بیان میں کسی قسم کی عصبیت یا کوتاہ نظری دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ اس کے خلاف ان کی تحریر قومی نقطۂ نگاہ اور دوستانہ انداز نظر کی حامل ہے۔ انھوں نے یہاں کے ماحول، جنگل، دریا، پہاڑ اور مختلف علاقوں کے رسم و رواج کا جس محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے اس سے ان کی وطن دوستی کا احساس ہوتا ہے۔

باقی ص۱۲ پر

کیا آپ جانتے ہیں؟

تعلیم

کیا آپ جانتے ہیں کہ

۱۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ میں ۲۰۹۶۷۱ سے بڑھ کر ۱۹۹۱-۹۲ میں ۵۶۵۰۸۶ ہوگئی ہے۔

۲۔ اسکولوں میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ میں ۲۲۳ لاکھ سے بڑھ کر ۱۹۹۱-۹۲ میں ۱۳۶۰ لاکھ ہوگئی ہے۔

۳۔ پرائمری اسکولوں میں داخلہ لینے والے کُل بچوں میں لڑکیوں کی تعداد اب ۴۱٫۳۷ فی صد ہوگئی ہے، جب کہ ۱۹۵۰-۵۱ میں یہ تعداد ۲۸٫۱۲ فی صد تھی۔

۴۔ شرح خواندگی ۱۹۵۱ میں ۱۸٫۳۳ فی صد سے بڑھ کر ۱۹۹۱ میں ۵۲ فی صد سے زیادہ ہوگئی ہے۔

۵۔ بھارت میں خواندگی کی تحریک نے اب ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس تحریک میں رضاکاروں کی اب تک کی سب سے زیادہ تعداد شامل ہے۔ توقع ہے کہ یہ تعداد ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

۶۔ مکمل خواندگی کی مہموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والے کُل افراد میں خواتین کی تعداد دوتہائی ہے۔

۷۔ مکمل خواندگی کی مہمیں اس وقت ملک کے ۲۰۰ سے زیادہ اضلاع میں چلائی جارہی ہیں۔ آٹھویں منصوبے کے اختتام تک یہ مہمیں ۳۵۰ اضلاع میں چلانے کی تجویز ہے، جس سے ملک میں شرح خواندگی بڑھ کر ۷۵ فی صد ہوجائے گی۔

۸۔ بھارت میں تعلیمی ترقی و فروغ کا ایک اہم حصّہ غیررسمی تعلیم کی ترقی و فروغ رہا ہے، جو اُن بچّوں کے لیے ایک اہم متبادل ذریعہ بن گئی ہے، جو کُل وقتی اسکول نہیں جاسکتے۔

۹۔ غیررسمی تعلیم کی مرکزی اسپانسر شدہ اسکیم کا خاص زور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ دس ریاستوں پر ہے۔ یہ ریاستیں ہیں۔ آندھراپردیش، اروناچل پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اترپردیش اور مغربی بنگال۔

۱۰۔ غیررسمی تعلیم کا سلسلہ دیگر ریاستوں کی شہری گندی بستیوں، پہاڑی قبائلی اور ریگستانی علاقوں نیز اُن علاقوں میں چل رہا ہے، جہاں کام کرنے والے بچّوں کی اکثریت ہے۔

۱۱۔ غیررسمی تعلیم کے سلسلے میں مالی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی حکومتیں مشترکہ تعلیمی مراکز کے لیے نصف نصف کے حساب سے اور لڑکیوں کے لیے غیررسمی تعلیم کے مراکز کے سلسلے میں نوّے اور دس کے حساب سے اٹھاتی ہیں۔

۱۲۔ تجرباتی اور اختراعی پروجیکٹوں کے لیے غیررسمی تعلیم کے مراکز چلانے کے سلسلے میں رضاکار اداروں کو سو فی صد تک امداد فراہم کی جاتی ہے۔

۱۳۔ غیررسمی تعلیم کے مراکز کی تعداد ۱۹۸۶ میں ۱۲۶۰۰۰ سے بڑھ کر مارچ ۱۹۹۲ تک ۲۷۷۰۰۰ ہوگئی ہے اور داخلہ لینے والے بچّوں کی تعداد ۳۶٫۵ سے بڑھ کر ۶۸ لاکھ ہوگئی ہے۔ اس مدّت کے دوران، لڑکیوں کے مراکز کی تعداد ۲۰۵۰۰ سے بڑھ کر ۸۱۶۰۰ ہوگئی ہے۔

۱۴۔ غیررسمی تعلیم کے پروگراموں میں ۳۹۰ سے زیادہ رضاکار ادارے شرکت کررہے ہیں۔

۱۵۔ غیررسمی تعلیم کے سلسلے میں تفصیلی کام کے لیے پچاس تجرباتی اور اختراعی پروجیکٹ نیز ضلعی وسائلی یونٹ کام کررہے ہیں۔

نشریہ

۱۶۔ کیا آپ جانتے ہیں؟
کہ آل انڈیا ریڈیو کی تجارتی آمدنی گزشتہ 'مالی برس' میں بڑھ کر ۷ کروڑ بیس لاکھ روپے ہوگی۔

۱۷۔ اب ریڈیو کے سگنل بھارت کی آبادی کی ۹۷ فی صد آبادی کے لیے دستیاب ہیں اور پورے ملک کے ۸۳ فی صد رقبے پر احاطہ کرتے ہیں۔

۱۸۔ ملک میں ۱۰ کروڑ ریڈیو سیٹ ہیں۔

۱۹۔ آل انڈیا ریڈیو کے سامعین تحقیق

باقی صـ۳۱ پر

یوحناسی دہلی

نوتن لعل

ابراہیم — ایک ننھی سی حیرت انگیز شخصیت

چھوٹی عمر میں جب بچے کوئی بڑا کام سیکھنے کے لیے خواہش کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے والدین اور سرپرست کا قول ہوتا ہے کہ ابھی تم چھوٹے ہو یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے لیکن کہاوت ہے کہ "جہاں چاہ وہاں راہ"۔ اگر کسی بھی کام کو کرنے کی سچی لگن اور مصمم ارادہ ہو تو کامیابی اس فرد کے قدم چومنے کے لیے آمادہ رہتی ہے۔

اس قول کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا ہے آٹھ سالہ ابراہیم جس نے انگریزی زبان کے مکمل علم کے بغیر ہی کمپیوٹر پر اپنی انگلیوں پر اس کرتب کو دکھا کر لاتعداد لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ پنجاب وقف بورڈ۔ اسلام چھاؤنی کی زیر سرکردگی "الیاس کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر" پیلی مزرعہ (چھچھرولی) میں اس وقت کمپیوٹر پر اعلیٰ تربیت حاصل کر رہا ہے۔ اسی سینٹر کے "بیت العلوم مدرسہ" کا آٹھ سالہ ابراہیم اس ادارہ کا ہونہار طالب علم ہے وہ یہاں پر اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ بیت العلوم کے مہتمم جناب مولانا محمد الیاس صاحب کے مطابق ابراہیم اردو۔ ہندی۔ انگریزی اور قرآن شریف کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اردو۔ ہندی کی دوسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ انگریزی بھی دوسری جماعت (ہریانہ گورنمنٹ کے نصاب میں شامل ساتویں جماعت کی انگریزی کتاب) پڑھ رہا ہے۔

اس کمپیوٹر سینٹر میں عربی زبان کی تربیت بھی طالب علموں کو دی جاتی ہے۔ اگرچہ کمپیوٹر کے "کی۔ بورڈ" پر لگے بٹنوں پر انگریزی زبان کے الفاظ اندراج کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ چھوٹا ابراہیم قرآن شریف کے مختلف ۳ پاروں میں بیان شدہ ہر لفظ کی تکرار کی تعداد فوراً کمپیوٹر سے بتا کر عوام کو حیرت میں ڈال دیتا ہے ادیب جناب زاہد زیربھارد واج نے جب ابراہیم سے سوال کیا کہ "قرآن شریف میں لفظ "اللہ" کا کتنی مرتبہ ذکر ہوا ہے تو اس نے فوراً جواب دیا کہ ۲۱۵۳ مرتبہ۔ اس طرح اس نے کمپیوٹر کی مدد سے مزید واضح کیا کہ قرآن شریف میں "طلاق" کا تذکرہ دو مرتبہ علم کا ذکر ۶ مرتبہ اور "حُب" یعنی بھگتی کا ذکر ۱۵۳ بار آیا ہے۔ غور طلب ہے کہ ۳۰ پاروں پر مشتمل ۸ صفحات کے قرآن شریف کے ہر لفظ کو اس کورس کر میں کمپیوٹر میں شامل کیا گیا ہے۔

ابراہیم کا علم کمپیوٹر بہت ہی وسیع اور ٹھوس ہے۔ اس وقت اعلیٰ ٹریننگ کے لیے برائے حصول علم کمپیوٹر لگاتار روزانہ مشق میں مشغول ہے۔ اور بنا کسی امداد کے کمپیوٹر کو حکم دے کر پروگرام کی تشکیل کرتا ہے اور خود اس کا مظاہرہ بھی کر لیتا ہے۔ علاوہ ازیں "فلاپی ڈسک" میں بھی اسے مہارت حاصل ہے۔

پنجاب وقف بورڈ کے محکمہ اطلاعات کے انچارج جناب امتیاز حصر کے مطابق پنجاب وقف بورڈ نے ہریانہ۔ پنجاب اور ہماچل پردیش میں مختلف کمپیوٹر ٹریننگ مراکز اور ادارے کھول رکھے ہیں۔ لیکن پیلی مزرعہ کا "الیاس کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر" مکمل طور پر جدید ٹیکنولوجی سے آراستہ ہے اور بطور ماڈل قابل ذکر ہے۔ ابراہیم کے ساتھ ساتھ اس مرکز میں اس کے ہم عمر دیگر پانچ طالب علم بھی ہیں جو یہاں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن ابراہیم ان طلبا میں سب سے زیادہ بلند رتبہ اور ذہین ہے۔

ابراہیم اپنے گھریلو ماحول سے بہت ہی متاثر ہوا ہے۔ ان کی خوبیوں اور شعور کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان کے والد شریف جناب اللہ بخش جس کا نمایاں کردار رہا ہے۔ جو کہ پیلی مزرعہ کے شعبہ انڈسٹریل ٹریننگ کے پرنسپل ہیں۔ ان کے بڑے بھائی جناب عبدالرحمٰن ایک اعلیٰ درجے کے کمپیوٹر انسٹرکٹر اور انجینئر ہیں۔ جنھوں نے ابراہیم کو تربیت دینے میں پورا بھرپور تعاون دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے دوسرے بھائی محمد اسد صاحب جو مشہور کمپیوٹر پروگرامر ہیں۔ ابراہیم کی ہمیشہ ملقہ کمپیوٹر میں گاہے لگا ہے مدد کر کے حوصلہ افزائی کی ہے۔ ابراہیم کی تینوں بہنیں اپنے اپنے بچوں کو جدید تعلیم دینے کے علاوہ دینی تعلیم بھی دے رہی ہیں اور اعزازی طور پر تعلیم بالغاں کی جانب پوری پوری مدد کر رہی ہیں۔ ابراہیم کے گھر کا ماحول دینداری کے ساتھ جدید علوم کا حامی اور عملی طور پر ثابت قدمی سے قوم اور ملک کے لیے تعلیم میں آگے بڑھنے کی ترغیب دینے میں پیش پیش ہے۔

ہمیں پنجاب وقف بورڈ کا ممنون ہونا چاہئے جس نے "الیاس کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر" پیلی مزرعہ کے علاوہ اس طرح کے مختلف تعلیمی ادارے مدرسے، مکتب اور مراکز چلا کر ان تعلیمی اداروں کے ذریعے پسماندہ اور اقلیتی طبقوں کے بچوں میں علم کی شمع روشن کر کے ملک اور قوم کی خدمت کی ہے۔ اگر اسی طرح پنجاب وقف بورڈ ایسی سہولیات فراہم کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب ابراہیم جیسے ذہین اور ہونہار بچے کو ایسی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا سنہری موقع ملے گا۔ اور وہ اپنے دیش اور پردیش کا نام روشن کرے گا۔ یہ تخلیق نگار اپنی جانب سے ابراہیم اور اس کے خاندان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور اس کے درخشاں مستقبل کے لیے پروردگار سے دعا کرتا ہے●

سینئر انگلش ٹیچر مہاتما گاندھی انٹر کالج منڈاور۔ ضلع بجنور
یوجنا سی دہلی

بقیہ: بھارت کی ترقی میں خواتین کا حصہ

کی فکر نے آزادی کے بعد کے عہد میں خواتین کی ترقی کے لیے سرکاری پالیسی وضع کرنے کے تئیں رہنمائی کی ہے۔ ہم نے مستحکم طریقے سے اپنے پروگراموں کو بہتر بنایا ہے اور انھیں وسعت دی ہے اور اس کے تحت ابتدائی بہبود کے نکات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے اور معاشرے میں خواتین کو اس حد تک بااختیار بنانے کی بات کی گئی ہے کہ وہ ملک کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی پیش رفت کی کوششوں میں مساوی بنیاد پر حصہ لے سکیں۔

حال ہی میں، حکومت نے خواتین کی سماجی حیثیت، مالی خود کفالت اور سیاسی نمائندگی کی حالت میں بہتری لانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ گزشتہ ماہ شروع کی گئی مہیلا سمردھی یوجنا، خواتین کا قومی کمیشن اور راشٹریہ مہیلا کوش اس سلسلے کے چند اہم اقدامات ہیں۔ مہیلا سمردھی یوجنا کا خیر مقدم دیہی خواتین نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے اس بارے میں شک ہونے لگا ہے کہ آیا اس کے پسِ پشت کہیں مردوں کا تو کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ مجھے اس معاملے کا تھوڑا گہرائی سے مشاہدہ کرنا ہوگا کیونکہ ڈاک گھروں میں لاکھوں بچت کھاتے کھولے جا رہے ہیں۔ نتائج بہت ہی حوصلہ افزا ہیں۔ تاہم پیسے کی بچت اس بڑے فائدے کا ایک حصہ ہے جو اس اسکیم کے شروع کرنے کا مقصد تھا۔ اصلی فائدہ تو وہ ہے جب کہ خواتین کے اندر مالی خود کفالت کا احساس پیدا ہو اور ایک خاتون کے اندر یہ احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا اپنا الگ بچت کھاتہ ہوتا ہے اگرچہ یہ ایک عام سی بات لگتی ہے کہ بھلا بچت کھاتہ کھولنے میں کیا خاص بات ہے۔ کوئی بھی کھول سکتا ہے۔ ہاں شہروں میں تو یہ ایسا ہی لگتا ہے، ان علاقوں میں تو یہ ایک عام سی بات ہے۔ تاہم وہ لوگ جو دوسرے انسان پر انحصار کی دماغی کیفیت کو سمجھتے ہیں، آسانی سے ایک دیہی، ناخواندہ عورت کے چہرے پر دمکتے والی خود کفالت و خود اعتمادی کی اس روشنی کو دیکھ سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں۔ جو اس وقت نظر آتی ہے جب اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اقتصادی اعتبار سے اس کی بھی ایک شناخت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چھوٹا سا قدم خواہ کسی قدر غیر متاثر کن ہی کیوں نہ ہو، نظریے میں تبدیلی کی اپنے اندر ایک پوری دنیا سموئے ہوئے ہے اور اس طرح یہ بھارت کی مجموعی آبادی کے نصف حصے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا

حال ہی میں اٹھایا گیا دوسرا اہم قدم آئین میں لائی گئی ۷۳ ویں ترمیم ہے جس کے ذریعہ پنچایتی راج اداروں میں تمام سطحوں پر خواتین کے لیے ایک تہائی نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ یہ ترمیم اس امر کو یقینی بناتی ہے کہ بنیادی سطح پر خواتین رہنماؤں کا ایک وسیع کیڈر وجود میں آئے۔ ان کی تعداد ۸ لاکھ سے زائد ہوگی۔ بنیادی سطح پر خواتین رہنماؤں کا اتنا بڑا کیڈر تبدیلی کا ایک بہت بڑا وسیلہ بنے گا ہمیں اس امر کو یقینی بنانا ہوگا کہ وہ ان اداروں کے کام کاج کے متعلق تربیت پائیں اور انھیں اپنے فرائض و ذمہ داریوں سے واقف کرایا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ اقدامات عورتوں کو ان کے گھروں کی چار دیواری سے باہر لانے میں مددگار ثابت ہوں گے اور وہ عوامی زندگی میں مزید فعال کردار نبھا سکیں گی۔

تاہم سرکار کی طرف سے اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں سماج کا تعاون ضروری ہوگا۔ بھارتی خواتین کے سلسلے میں سماجی نظریات میں تبدیلی اور ان کے حقوق کے تئیں بیداری و احترام ہمارے سامنے ایک بڑا کام ہے۔ جہاں ایک طرف حکومت خواتین کی ترقی کے مسائل کے تئیں ذمہ دار و حساس بنی رہے گی۔ وہیں دوسری طرف سماجی رجحانات میں تبدیلی اور اس کی معقول تشکیل نو بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کام میں سرکاری شعبے کی کوششوں، تعلیمی اداروں اور غیر سرکاری اداروں سبھی کو مل جل کر پورے تال میل کے ساتھ کام کرنا ہوگا تاکہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہو سکے۔

ان سب کے علاوہ سماجی اصلاح کی ایک بڑی کوشش بھی کی جانی ہوگی جو انفرادی بھی ہوگی اور سیاسی و دیگر اداروں کے پروگرام کا ایک حصہ بھی ہوگی۔ خواتین کی اقتصادی آزادی اور ان کے اختیارات اور حقوق کے حصول کے سلسلے میں پہلے ہی سے بہت سے قوانین موجود ہیں۔ تاہم اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں سماج میں بنیادی سطح پر بہت زیادہ اصلاح نہیں ہو سکی ہے جن سے ان قوانین پر عمل درآمد میں مدد ملے۔ ان اداروں کی امداد ہی نہیں بلکہ سماج کی تصدیق و حمایت بھی اس کے لیے اشد ضروری ہے۔ سماجی تصدیق و حمایت قانون سے زیادہ اہم ہے۔ "ستی" کی ہی مثال لے لیجیے ہم نے ایسے لوگوں کے خلاف بڑی سخت جنگ لڑی جو قانون کی جانب سے یا تو توجہ ہٹانا چاہ رہے تھے یا پھر اسے توڑنے مروڑنے کے خواہاں تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں بڑی سخت جد وجہد کرنی پڑی۔ راجیو جی نے اس جنگ کی قیادت کی اور آخر کار ہم اپنے راستے پر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں مناسب کارروائی عمل میں آئی، مجرموں کو سزا ملی لیکن بات وہیں ختم ہو گئی۔

مجھے نہیں معلوم ہے کہ جہاں یہ رواج اب بھی رائج ہے۔ ان علاقوں کے عوام کے ذریعے اس قانون کی توثیق یا سماجی اصلاح کی شکل میں بعد میں کوئی کارروائی ہوئی ہے یا نہیں۔ اب اخبارات میں اس کے بہت زیادہ واقعات شائع نہیں ہو رہے ہیں لیکن سوال یہ نہیں ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا عوام نے اسے منظوری دے دی ہے اور اس کی توثیق کر دی ہے۔ میں اس سلسلے میں یقین کے ساتھ مثبت جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کہ اگر اس کی پارلیمنٹ قوانین منظور کرتی رہے لیکن ان قوانین

کا نفاذ قانون شکنی کے لیے کیا جائے۔ اس خامی کو جلد از جلد دور کرنا ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس صدی کے پہلے ۲۵ برس کے دوران بھی بھارت کے جنوبی علاقوں میں مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں نیز شمالی علاقوں میں بھی سماجی اصلاح کے لیے ایک بہت بڑی کوشش کی گئی تھی۔ دراصل یہ جدوجہد گزشتہ صدی میں راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند، کھانڈورکر، دی ایس نگم جیسے اور تمام لوگوں نے شروع کی تھی۔

ایسے لوگ آج ہمیں کیوں نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ سیاسی جدوجہد کو سیاسی سطح پر ایک بڑی حد تک پورا کر رہے تھے۔ دراصل کچھ لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ جب تک سماجی اصلاح کا کام مکمل نہیں ہو جاتا اس وقت تک آپ کی سیاسی اصلاحات یا جو کوئی بھی تبدیلی آپ لانا چاہتے ہیں بے کار ہوتی رہے گی۔ غالباً اس سے نتائج تو برآمد ہوں گے لیکن وہ نتائج یک طرفہ ہوں گے۔ کسی حد تک ایسا ہوا ہے۔ لہٰذا سیاسی تبدیلی کو سماجی اصلاح کے ساتھ جوڑنا قطعی طور پر ضروری ہے کیوں کہ سماج ان تبدیلیوں کو اپنے اندر ضم کر سکے گا۔ جو آپ لانا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یہ دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔

لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ سماج میں کچھ ہو رہا ہے اور سماج جن خامیوں اور بے قاعدگیوں سے دوچار ہے، ان سب کو دور کرنے کے لیے سیاسی جماعت یا دیگر تنظیموں کو پروگرام کے ایک حصے کے طور پر ساتھ ساتھ جدوجہد کرنی چاہیئے۔ میں یہ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں اور دیگر لوگ بھی کہہ چکے ہیں۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہماری جماعتوں نے اس معاملے کو ابھی تک نہیں اٹھایا ہے۔ غالباً اگر سیاسی جماعتیں اس سلسلے میں پہل کرتی ہیں تو دیگر جماعتیں بھی آگے آئیں گی اور اس طرح ہم ایک ایسی تبدیلی لانے کے لیے جس میں تمام طبقات کی دلچسپی ہو، سماج کی سطح پر نیز قانون سازی کی سطح پر تال میل پر مبنی ایک ہمہ جہتی کوشش کر سکیں گے۔

مجھے امید ہے کہ اس نمائش سے ہمارے بچوں کو لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان مساوات کے عظیم جذبے کے حصول کی ترغیب ملے گی۔ چوں کہ بچے اس ملک کا مستقبل ہیں انھیں ماضی کے تعصبات سے اوپر اٹھ کر خواتین کے تئیں احترام کے اس احساس کے ساتھ بڑا ہونا ہے جو کہ ایک مہذب سماج میں خواتین کو حاصل ہوتا ہے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ اس نمائش سے بھارت کی ترقی میں محض خواتین کے کردار کے بارے میں بیداری پیدا کرنے میں ہی مدد نہیں ملے گی بلکہ ہمارے ان عظیم رہنماؤں کے کردار کے بارے میں بھی بیداری پیدا کرنے میں مدد ملے گی جو انھوں نے اس سلسلے میں ادا کیا ہے۔ ●

بقیہ: کیا آپ جانتے ہیں؟

یونٹ کو گزشتہ برس سامعین کے تقریباً ۲۰ لاکھ خطوط موصول ہوئے۔

-۲۰ آل انڈیا ریڈیو نیٹ ورک ۹۵ فی صد ریڈیو اسٹیشنوں، ۵ مقامی ریڈیو اسٹیشنوں اور ۳۱ دودھ بھارتی مراکز پر مشتمل ہے۔

-۲۱ ۱۴۱ میڈیم ویو ٹرانسمیٹر، ۴۳ شارٹ ویو اور ۳، دی ایف ایچ ایف، ایم، ٹرانسمیٹر ہیں جن کے ذریعہ آل انڈیا ریڈیو کے سگنل ملک کے کونے کونے میں پہنچتے ہیں۔

-۲۲ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ۲۴ زبانوں اور ۱۴۶ مقامی بولیوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر برس اندرون ملک خدمت نشریہ ۳۳۵، ۷ لاکھ گھنٹوں سے زائد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دودھ بھارتی سالانہ بنیاد پر ۵، ۱ لاکھ گھنٹے کے پروگرام کرتا ہے۔ ●

بقیہ: اقتصادی تبدیلی کی راہ پر

کے ناقابل تغیر ہونے کے بارے میں زیادہ اعتماد دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی عام طور سے تعریف کی جاتی ہے کہ بھارت اس سلسلے میں کافی سنجیدہ ہے، امریکہ کا تجارتی اور کاروباری حلقہ چھوٹے ساز و سامان کی برآمدات کے سلسلے میں بھارتی صلاحیت کو بخوبی تسلیم کرتا ہے۔ اس نتیجے میں بھارت کو آئرلینڈ اور اسرائیل کے برابر شمار کیا جاتا ہے۔ توقع ہے کہ بھارت سے چھوٹے ساز و سامان کی برآمدات کی مالیت، جو گذشتہ سال ۱۶ لاکھ ڈالر رہی تھی ۱۹۹۵ء تک ایک ارب ڈالر سے تجاوز کر جائے گی۔ پالیسیوں کو نرم اور آسان بنانے کی بھارتی کوششوں کے نتیجے میں مزید فرانسیسی کمپنیوں کو مشترکہ پروجیکٹوں اور کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب ملی ہے۔

بھارت میں متعدد کثیر مقصدی پروجیکٹوں کے سلسلے میں جرمنی، بھارت کو تکنیکی امداد فراہم کرے گا۔ جاپان کے کاروباری اور تجارتی طبقے کے مطابق، پالیسیوں کو نرم اور آسان بنانے کے ہمہ جہت اقدامات اور مقدار یا تعداد کے لحاظ سے امتیازی کنٹرول کو ختم کیا جانا معیشت کو افسر شاہی کے نیچے سے نجات دلانے کی ایک کوشش ہے۔ بھارتی حکومت ایک ایسے دور کی سمت آگے بڑھ رہی ہے جس میں سرمایہ کاری، سرمایہ جاتی منڈی، اجزا کی قیمتوں اور متعلقہ امور کے بارے میں فیصلے صنعت کار کریں گے اور اس طرح سے تاجر اور کاروباری لوگ منڈی کی قوتوں سے متاثر ہوں گے۔

بھارت کثیر طرفہ سرمایہ کاری گارنٹی ایجنسی (ایم آئی جی اے) کا ۱۳۱واں رکن بن گیا ہے۔ اس ایجنسی کا بنیادی مقصد ترقی پذیر رکن ممالک میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سلسلے کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ ایجنسی کرنسی کے تبادلے، ضبطی، جنگ اور شہری گڑبڑ نیز معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں کسی خطرے سمیت، مختلف خطرات سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بیمہ جاتی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ●

بقیہ: آپ سب کے لیے

والے اخبارات کو چھوٹے اخبار کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

لہٰذا مذکورہ وضاحت میں ترمیم کرنے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے تاکہ حکومت اشاعت کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً از سر نو زمرہ بندی کر سکے۔

حالانکہ مرکزی حکومت نے چھوٹے اور درمیانہ اخبارات کو فائدہ پہنچانے اور انھیں رعایت دینے کی غرض سے یکم اپریل، ۱۹۸۹ء کے ایک پبلک نوٹس کے ذریعے چھوٹے، درمیانہ اور بڑے اخبارات / جرائد کی از سر نو زمرہ بندی کر دی ہے۔ تاہم اس نظر ثانی شدہ زمرہ بندی نے پریس کونسل قانون، ۱۹۷۸ء کی دفعہ ۵ کے تحت دی گئی وضاحت کی جگہ نہیں لی ہے۔ نظر ثانی شدہ زمرے بندی کے مطابق پچیس ہزار تک کی اشاعت والے اخبار / جرائد کو چھوٹے اخبارات کے زمرے میں پچیس ہزار سے زیادہ اور ۷۵ ہزار تک کی اشاعت والے اخبارات / جرائد کو درمیانہ درجے کے اخبارات کے زمرے میں اور ۷۵ ہزار سے زیادہ اشاعت والے اخبارات / جرائد کو بڑے اخبارات کے زمرے میں تصور کیا جاتا ہے۔

شری سنگھ دیو نے کہا کہ ہمیں یہ علم بھی ہوا ہے کہ مہاراشٹر جیسی ریاستی حکومت پریس کونسل قانون کی مذکورہ وضاحت میں بڑے، درمیانہ اور چھوٹے اخبارات کے لیے مقررہ زمرہ بندی کی بنیاد پر رعایت فراہم کر رہی ہے۔

لہٰذا اخبارات / جرائد کی اشاعت کی تعداد میں اضافے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زمرہ بندی کی وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا پریس کونسل قانون کی دفعہ (۲) ۵ کے تحت موجودہ وضاحت کو ترمیم کر کے نئی وضاحت شامل کرنے کی تجویز ہے۔

راجیہ سبھا نے اس بل کو منظوری دے دی ہے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ریلویز کی طرف سے رعائتیں

ریلوے جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے اول درجے، دوسرے درجے اور سلیپر کلاس کے لیے ۷۵ فی صد رعایت دیتی ہے۔ ان دونوں درجوں میں نابینا اور ذہنی طور پر معذور افراد کے لیے بھی رعایت کی یہی فی صد رہتی ہے تاہم گونگے اور بہرے معذور افراد کے لیے جن افراد میں یہ دونوں عذر ایک ساتھ پائے جاتے ہوں، اس رعایت کی شرح ان دونوں درجوں میں ۵۰ فی صد ہوگی۔ ماہانہ سیزن ٹکٹ کے ضمن میں مندرجہ بالا چاروں طرح کے معذور افراد کے لیے اول اور دوسرے درجے اور سلیپر کلاس میں یہ رعایت ۵۰ فی صد دی جاتی ہے چلنے پھرنے اور ذہنی طور سے معذور اور جسمانی طور پر مفلوج افراد کو یہ رعایت اسی شکل میں مل سکتی ہے۔ جب کہ ان کے ساتھ ایک مددگار بھی سفر کرے۔ یہ رعایت اس آدمی کو بھی مل سکے گی جو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے سفر کرے گا۔ نابینا افراد کے سلسلے میں یہ رعایت دونوں صورتوں میں یعنی چاہے وہ تنہا سفر کریں یا مددگار کے ساتھ، حاصل رہے گی۔

چلنے پھرنے سے معذور، جسمانی طور پر مفلوج، ذہنی طور پر معذور اور گونگے اور بہرے افراد کو ان رعایتی ٹکٹ کو حاصل کرنے کے لیے سرکاری ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اسٹیشن ماسٹر کو دکھاتا ہوگا جب کہ نابینا افراد کو یہ سرٹیفکیٹ کسی بھی سرکاری ڈاکٹر یا نابینا افراد کے ایک ایسے ادارے کے ہیڈ کا سرٹیفکیٹ دکھانا ہوگا جسے مرکزی وزارتِ بہبود یا متعلقہ صوبائی سرکار یا مرکز کے زیر انتظام علاقے کا سماجی بہبود سے متعلق محکمہ تسلیم کرتا ہو۔

سرٹیفکیٹ صرف دکھانا ہی ہوگا جب کہ اس کی فوٹو کاپی بکنگ کلرک کو ریکارڈ میں رکھنے کے لیے دینی ہوگی۔

معمر افراد کی نگہہ داشت کے مراکز

رضا کار اداروں نے ملک کے معمّر ضعیف افراد کی نگہہ داشت کے لیے ۵۰۰ اولڈ ایج ہوم (معمر افراد کی نگہہ داشت کے گھر) اور ۱۴۷ دن کی نگہہ داشت کے مراکز قایم کیے ہیں۔ اداروں کو ان اکائیوں کے لیے امدادی عطیے ملتے ہیں حکومت نے آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ایک اسکیم شروع کی ہے تاکہ معمر افراد کی فلاح کے لیے رضا کار اداروں کی مدد کی جائے۔ غیر سرکاری اداروں کو چلتے پھرتے طبی خدمات فراہم کرانے، اور معمّر لوگوں کی بھلائی کے لیے غیر سرکاری ادارہ جاتی خدمات کو مستحکم بنانے کے لیے سرکاری امداد بھی ملتی ہے۔

مذکورہ اقدامات غیر سرکاری اداروں کے ذریعہ معمّر افراد کی فلاح کے لیے چلائی جانے والے پروگراموں کے علاوہ ہے جو یہ ادارے اپنے طور پر چلاتے ہیں۔ کوشش اس بات کی ہے کہ ان تمام معمّر افراد کو یہ فائدہ حاصل ہو سکے جنھیں اس طرح کی سرکاری نگہہ داشت درکار ہے۔

نئی دہلی

یوجنا

جلد: ۱۳ — شمارہ: ۲۳-۲۴

یکم تا ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ء — ۱۰ پھاگن تا ۱۰ چیت شک ۱۶-۱۹۱۵

قیمت: ۳ روپے

چیف ایڈیٹر: ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

سب ایڈیٹر: محمد توحید خان

معاون: وسیم حیدر

کتابت: افتخار احمد خاں

شرح چندہ: سالانہ ۳۰ روپے، دو سالہ ۵۴ روپے، سہ سالہ ۷۲ روپے
فی کاپی: ۳ روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴،
لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ڈپٹی ڈائرکٹر پروڈکشن: سُدرشن موہن چہل

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ

بھارت کی اقتصادی اصلاحات۔ ایک نئی صبح کے لیے عزمِ مصمّم

۱۹۹۰ء کی دہائی کی شروعات دنیا میں ڈرامائی اور زبردست تبدیلیوں کے ساتھ ہوئی۔ اقتصادی ترقی کے عمل کی رہنمائی کرنے والے پرانے فلسفوں کو ترک کیا جا رہا ہے اور متعدد ممالک نے اپنے اقتصادی اور سیاسی نظاموں کی حوصلہ مندانہ اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ منڈیوں اور اداروں، صنعتی تنظیموں اور ڈھانچوں میں پیداوار کے باہمی روابط کی نوعیت میں ڈرامائی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ نئے عالمی نظام میں بھارت کے کردار کا فیصلہ ان تبدیلیوں اور بالخصوص اقتصادی عمل کو عالمی سطح کا بنانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے تئیں بھارت کے ردعمل سے ہوگا۔

آج بین الاقوامی تعلقات میں اقتصادیات کو اہم مقام حاصل ہے۔ ممالک کی طاقت اور ان کا اثر براہ راست ان کی مجموعی قومی پیداوار اور ان کے عوام کی خوشحالی کے تناسب سے ہے نہ کہ ان ممالک کے دفاعی بجٹ کے سائز سے۔ اگر بھارت کو ابھرتے ہوئے اس نئے عالمی نظام میں اپنا صحیح کردار ادا کرنا ہے تو ملک کی معیشت کو بہت زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرنی چاہیے۔

ان تبدیلیوں کے تئیں بھارت کا ردعمل اقتصادی اصلاحات کے وسیع پروگرام کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ تقریباً ڈھائی برس کی اس قلیل مدت میں صنعتی پالیسی، غیر ملکی تجارت اور غیر ملکی زرمبادلہ کی شرح سے متعلق پالیسیوں، ٹیکس کے نظام سے متعلق پالیسیوں اور مالیاتی شعبے میں اہم اصلاحات کی گئی ہیں۔ ان پالیسیوں کا بنیادی وسط مدتی مقصد بھارتی معیشت کی عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی مقابلہ جاتی صلاحیت کے سیاق و سباق میں پیداوار اور روزگار کے مواقع میں مسلسل اضافے کے لیے بنیاد رکھنا ہے۔

ماضی کی پالیسیوں کے جامع جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ واقعتاً اقتصادی اصلاحات کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ ملک ضرورت سے زیادہ سرکاری مالی اخراجات پر مالی خسارے کی اعلیٰ سطحوں کو برداشت نہیں کر سکتا ہے اور افراط زر کی روک تھام کی توقع کرتا ہے۔ اگر سرکاری شعبے کی منافع کمانے کی صلاحیت بہتر نہیں ہوتی ہے اور سرکاری شعبے کے نقصان میں چل رہے یونٹوں کو دی جانے والی رعایات کم نہیں کی جاتی ہیں تو ملک تعلیم، صحت اور دیہی ترقیات پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتا ہے۔

گھریلو صنعت کو اعلیٰ تحفظ فراہم کرنے اور صحیح معنوں میں خودکفالت کے حصول کے لیے برآمدات میں تیز رفتار اضافہ حاصل کرنے کے لیے کسی طور پر مقابلہ جاتی صلاحیت حاصل کرنے کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ سرمایے، ٹیکنالوجی، منڈی تک رسائی اور اس ترقی کے جو مشرقی ایشیا کے ہر ممالک نے کامیابی کے ساتھ حاصل کی ہے۔ فوائد کو کھوئے بغیر غیر ملکی سرمایہ دار کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔ درآمدات سے متعلق لائسنس کے مفصل اور امتیازی نظام کو جاری رکھتے ہوئے برآمدات میں مسلسل اضافے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ حکومت کے غیر ضروری کنٹرول، پابندیوں اور ضوابط کو برقرار رکھتے ہوئے صنعت کاروں، پیشہ وروں اور مزدوروں کے نیز ان کی صلاحیتوں سے کسی طور پر استفادے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

بینک نظام میں شدید بحران کا خطرہ اٹھائے بغیر مال شعبے میں اصلاحات کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ منظم شعبے میں روزگار کی پالیسیوں میں لچک لائے بغیر روزگار کے مواقع میں تیزی سے اضافہ ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کسانوں کو برآمداتی منڈیوں تک رسائی حاصل نہیں ہوگی تب تک اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں تیز رفتار اضافے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ ناخواندگی کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک کہ تعلیمی شعبے کی ترجیحات کو ابتدائی تعلیم اور خواندگی کی سمت میں نہیں موڑا جاتا۔ اگر استفادہ کرنے والے افراد سے اس کی لاگت وصول کی جائے تو اعلیٰ معیار کا بنیادی ڈھانچہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ زرعی شعبے میں سماجی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان موجودہ رعایات کو کم کیا جائے جس سے صرف چند لوگ ہی مستفیض ہوتے ہیں۔ پیداوار اور روزگار کے مواقع میں مسلسل اضافے کے بغیر غریبی کے خاتمے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

اصلاحات کے ابتدائی نتائج حوصلہ افزا رہے ہیں۔ اصلاحات سے بہتر نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی کے بحران پر قابو کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ روپے کے تبادلے کی شرح، جسے تجارتی بنیاد پر قابل تبدیل بنایا گیا تھا، مئی ۱۹۹۳ء سے مستحکم ہو گئی ہے۔ درآمدات کی پالیسی بہت زیادہ نرم اور آسان بنائے جانے کے باوجود ۹۴-۱۹۹۳ء میں درآمدات، مالیت ۹۱-۱۹۹ء کی سطح سے کافی کم چل رہی ہے۔ برآمدات میں ۹۲-۱۹۹۱ء میں بہت کم ہو گئی تھیں، رواں برس کے پہلے آٹھ ماہ کے درمیان ڈالر کے لحاظ سے ۲۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔

غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر جو جون ۱۹۹۱ء میں تقریباً ایک ارب ڈالر رہ گئے تھے، دسمبر ۱۹۹۳ء تک بڑھ کر ۹ ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ اس طرح ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء سے اس میں تقریباً ۳ ارب ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں تجارتی خسارہ تقریباً ایک ارب ڈالر یا اس سے کم رہنے کی توقع ہے جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء اور ۹۱-۱۹۹۰ء میں یہ خسارہ بالترتیب ۱ر۹ ارب ڈالر اور ۴ر۹ ارب ڈالر تھا۔ ادائیگیوں

مرکزی وزیر خزانہ

کے توازن میں چالو کھاتہ خسارہ اس برس کی مجموعی اندرون ملک پیداوار کا تقریباً نصف فیصد ہونے کی توقع ہے جو کہ ۹۱-۱۹۹۰ء کی سطح کے پانچویں حصہ سے بھی کم ہے۔ اس سے ڈھائی برس کی قلیل مدت میں ادائیگیوں کے توازن کی صورت حال میں استحکام آیا ہے۔ اس برس تقریباً بادو ارب امریکی ڈالر کی غیر قرضہ جاتی رقم موصول ہونے کی توقع ہے۔ بین الاقوامی قرضہ جاتی منڈیاں بھارت کے لیے پھر سے کھل گئی ہیں اور بھارتی کمپنیوں نے غیر ممالک میں جو ایکیوٹی اشوز جاری کئے ہیں وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔

اصلاحات کا جو ایک اور اچھا نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ گذشتہ تین برس کے دوران غیر ملکی قرضے میں کمی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء اور ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران بھارت کو تجارتی قرضوں کی منفی آمد کا تجربہ ہوا ہے۔ مجموعی اعتبار سے ۱۹۹۱ء سے غیر ملکی قرضے میں ہر برس تین ارب ڈالر سے کم کا اضافہ ہوگا جب کہ لوین دہے کے دوسرے نصف حصے میں چھ ارب ڈالر سے زیادہ کا اضافہ ہوا تھا لہٰذا اس طرح غیر ملکی قرضے کے بحران کے امکان سے بچنے اور قرضے کی سروسنگ شرحوں کو کنٹرول کے قابل سطح تک محدود رکھنے میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔

افراطِ زر پر قابو پایا گیا ہے۔ افراطِ زر اس وقت آٹھ فیصد سے بھی کم ہے۔ گذشتہ دو برس کے دوران تھوک قیمتوں کے عدد اشاریہ اور اشیائے صرف کی قیمتوں کے عدد اشاریہ دونوں میں ہی کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ افراطِ زر سے خوشحال اور منظم مزدوروں کے مقابلے میں غریب اور غیر منظم مزدوروں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا اصلاحات کی پالیسیوں کی اس کامیابی سے غریب افراد کو واضح طور پر فائدہ ہوا ہے۔ تاہم افراطِ زر کی موجودہ شرح ناقابل قبول حد تک زیادہ ہے۔ لہٰذا حکومت سختی کے ساتھ مالی نظم و ضبط کو بحال کر کے ان اہم وجوہات کو دور کرنے کا عزم مصمم کیے ہوئے ہے جو معیشت میں افراطِ زر کے اس دباؤ کی بنیادی وجوہات ہیں۔

مجموعی طور پر اقتصادی ترقی میں جو ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۲ را فیصد رہ گئی تھی، بہتری آئی ہے اور یہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۴ فیصد سے زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ ایک اہم کامیابی ہے کہ بڑے پیمانے پر پالیسی اصلاحات کے باوجود گذشتہ تین برس کے دوران معیشت میں اضافے کی مثبت شرح برقرار رہی ہے۔ اس برس زرعی شعبے میں دو سے تین فیصد تک اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ صنعتی بحالی میں بھی، جو غیر متوقع حد تک کم ہو گئی تھی۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران چار فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ روس، میکسیکو اور مشرقی یوروپ کے ممالک جیسے دیگر ممالک میں بھی جہاں اس قسم کی اصلاحات عمل میں آئی ہیں، مثبت نتائج برآمد ہونے سے قبل تک تو کئی برس تک پیداوار میں کمی آئی ہے۔

اقتصادی اصلاحات کو سخت اقدامات کا پروگرام نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ یہ اصلاحات بدلتے ہوئے اقتصادی ماحول کے تئیں کھلے دماغ اور لچک والے ردعمل کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کا مقصد عوام کے مفاد کا زیادہ سے زیادہ دھیان رکھنا ہے۔ حکومت اصلاحی اقدامات کے لیے قومی سطح پر اتفاق رائے قائم کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے اور یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ ان اصلاحات کے مثبت ابتدائی نتائج نے پالیسیوں کے بنیادی طور سے ٹھوس ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ اصلاحات کا عمل اس طرح ہونا چاہئے کہ مزدوروں اور آبادی کے دیگر کمزور طبقات کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ قومی تجدیدی فنڈ کا قیام اور ۹۴-۱۹۹۳ء کے بجٹ میں دیہی ترقی، صحت اور تعلیم کے شعبوں کے لیے مختص کی جانے والی رقوم میں کافی اضافہ اصلاحات کے لیے حکومت کی تشویش کا مظہر ہے۔

اصلاحات کے پروگرام کو جاری رکھنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ صرف اسی سے ملک ترقی، خود اعتمادی، جدید کاری، مساوات اور غریب افراد کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے بنیادی مقاصد حاصل کر سکے گا۔

بھارت میں آئندہ اقتصادی انقلاب لانے کی صلاحیت ہے لیکن یہ کام از خود نہیں ہوگا۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے عوام نئے انداز فکر و عمل کے تئیں اپنے آپ کو وقف کر دیں اور نئی اقتصادی پالیسیوں کو کامیاب بنائیں۔ ●

بقیہ: خواتین سے متعلق بچت کی نئی قومی اسکیم

(۱۴) ایم۔ ایس۔ وائی اسکیم کے تحت ایجنٹوں کو کسی قسم کا کمیشن نہیں دیا جاتا ہے یعنی اس کو ایس۔ اے۔ ایس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

جب دیہی ڈاکخانے میں کوئی خاتون مقررہ فارم جمع کرا کر اپنا کھاتہ کھولنا چاہتی ہے تو اس کو برانچ آفس ابتدائی رسید جاری کر دیتا ہے اور رقم مع فارم کے کھاتہ ڈاک گھر میں بھجوا دی جاتی ہے۔ تمام جمع کنندگان کو اپنے دستخط کی دو دو زائد کاپیاں دینا ضروری ہیں جنھیں کھاتہ ڈاکخانے کے نمونہ رجسٹر میں چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

کھاتہ ڈاک گھر میں بھی ایک لیجر ایم۔ ایس۔ وائی (M.S.Y-2) کھول دیا جاتا ہے۔ جس پر کھاتہ نمبر، جمع کنندہ کا نام، تاریخ، جمع یا نکاسی کی رقم دیا جانے والا فائدہ وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے۔

جب کسی کھاتے میں رقم جمع کرائی جاتی ہے تو اس جمع رقم کے سامنے اس تاریخ کو بھی درج کر دیا جاتا ہے جس دن اس کھاتے میں ۲۵ فیصد فائدہ دیا جائے گا اس کے علاوہ اس رقم کو بھی جمع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ادائیگی اس دن ہوگی جب اس کھاتے کو کھلے ہوئے پورا ایک سال گذر گیا ہو۔

اگر کوئی شخص دو ماہ بعد ہی کچھ رقم کو نکال لے تو نکالی گئی رقم پر صرف دو ماہ کا بارہ فیصد کے حساب سے زائد ادا کیا جائے گا۔ اور اس مقررہ رقم میں سے بقیہ رقم کو کاٹ دیا جائے گا۔

ایک سال مکمل ہونے پر شاخ ڈاک خانہ (B.O) اپنے کھاتہ (ACCOUNT OFFICE) ڈاکخانے سے منظوری لے کر رقم کی ادائیگی کر دے گا جس میں اضافی انٹینسیو کی رقم بھی شامل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی اسکیم کو شروع کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے، جب کہ ملک کو کساد بازاری کا سامنا ہے مرکزی بینک نے اپنی شرح سود کم کر دی ہے پھر بھی اس اسکیم پر ۲۵ فیصد کی شرح سے اضافی رقم دی جا رہی ہے۔ اور یہ سہولت صرف دیہات کی خواتین کو ہی کیوں۔

میرے خیال سے اس کی وجہ دیہات کے دقیانوسی رواج کو توڑنے کے لیے اس اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس سے خواتین اپنے گھروں سے نکل کر ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں گی۔ ان میں بچت کی عادت فروغ پائے گی ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ اور مردوں کی نظروں میں ان کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ●

اکٹـــر سید شرافت حسین

اترپردیش کی معیشت کی حالیہ روداد

اترپردیش ہندوستانی وفاق کی … اعتبار
ہی رقبہ چوتھی سب سے بڑی، آبادی کے لحاظ سے
ب سے زیادہ کثیر آبادی والی، اور معاشی پیمانہ پر سب
زیادہ پسماندہ اور نادار ریاست ہے۔ یہ کرۂ ارض
۲۳٫۵۲' و ۳۱٫۱۱' عرض البلد شمال کے درمیان
۷۷٫۳۰' و ۸۴٫۳۹' طول البلد مشرق کے مابین
ع ہے، جو گنگا و جمنا اور ان کی متعدد معاون ندیوں
وادی یعنی دوآبہ پر محیط ہے۔ دراصل یہ ایک وسیع
دان ہے جس کو گنگا و جمنا اور ان کی مختلف معاون
الیائی ندیوں نے بارانی موسم میں گذشتہ ہزاروں سال
دوران سیلاب کے ساتھ لائی ہوئی مٹی سے بنایا
۔ چنانچہ عمومی طور پر یہ ایک ہموار میدان کی شکل میں
د میں آیا ہے۔ اس وسیع میدان کے مختلف حصوں کے
رافیائی خصوصیات میں نمایاں فرق محض اتنا ہے کہ اس
قدرے بلند حصہ دوآبہ کا 'بانگر' اور نسبتاً نشیبی حصہ
لف ندیوں کے کناروں پر واقع 'کھادر' ہے۔ حال
ں چند جھیلیں اور نشیب ہیں، جو بارانی موسم کے
ان اپنے قرب و جوار کے وسیع علاقہ کو غرقاب کر دیتے
۔ اس کے شمال میں ہمالیائی سلسلہ کا دامن کوہ کا
تہ ہے، جس میں ترائی یا کوہستانی دامن کے دلدل دا
ن ہے۔ لہٰذا اس ریاست کی مٹی سیلابی ہونے کے
ث زرخیز تر ذرّوں سے وجود میں آئی ہے۔ اس
کی تین قسمیں ہیں: (۱) چکنی یا دومٹ مٹی، جس میں
ت کے ساتھ سیاہی کھاد مخلوط ہوتی ہے۔ (۲) ریت
لو۔ (۳) چکنی مٹی یا پنڈول جو مرطوب و نم ہوتی ہے۔
انحالیکہ ریاست کے مختلف حصوں میں مٹی کے
وٹ اور اس کے معدنی محتوبات میں و نیز ان کے
ب میں چندے فرق پایا جاتا ہے، تاہم زرخیزی کے
بار سے مجموعی طور پر یہاں کی مٹی کو ۶۰ سے ۶۵ کے درجہ میں رکھا گیا ہے، اگر سب سے زیادہ موزوں حالات میں زرخیزی کو ۱۰۰ درجہ پر تصور کیا جائے۔ چنانچہ ریاست کے مختلف حصوں میں فی ایکڑ پیداواریت میں افتراق کا سبب زمین کی بار آوری کو نہیں گردانا جا سکتا ہے۔

ریاست کا درجۂ حرارت عموماً موسم سرما میں سینٹی گریڈ سے موسم گرما کے دوران ۴۶ سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ مغربی اترپردیش میں موسم سرما کے دوران اکثر پالا (برف) اور ژالہ باری بھی ہو جاتی ہے جس سے فصلوں کو کافی نقصان پہنچ جاتا ہے لیکن کوہستانی دامن کی ترائی والے خطہ میں آب و ہوا زیادہ ترنم یا مرطوب رہتی ہے، جس سے ملیریائی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جب کہ مشرقی خطہ میں آب و ہوا بیشتر معتدل رہتی ہے۔ ریاست میں بارانی موسم آخر جون میں شروع ہو کر وسط ستمبر تک رہتا ہے اور جیسے جیسے ہم ریاست کے مغرب سے مشرق کی سمت یا جنوب سے شمال کی جانب رُخ کریں، ویسے ویسے بارش میں عموماً اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بہرنوع اوسط بارش ۸۴ سینٹی میٹر سے ۱۱۰ سینٹی میٹر تک رہتی ہے، لیکن دوران سال اس کی تقسیم میں کافی فرق رہتا ہے، یعنی بارش زیادہ تر بارانی موسم کے دوران مرتکز رہتی ہے۔ درآنحالیکہ اترپردیش کے معقول رقبہ میں آبپاشی کے وسائل مہیا ہو چکے ہیں، تاہم ریاست کی زراعتی سرگرمیاں ابھی تک بیشتر موسم اور باران پر منحصر رہتی ہیں اور اس سے بے محابہ متاثر ہوتی ہیں۔

اترپردیش کا کل رقبہ ۲/۹۴/۳۶۶ مربع کلومیٹر، آبادی ۱۳ کروڑ سے زائد اور آبادی کی گنجانیت ۳۷۷ فی مربع کلومیٹر ہے۔ ریاست کی کل آبادی کا تقریباً ۱۸٫۴۱ فیصدی ہی فی زمانہ 'محنت طاقت (لیبر فورس)' میں شامل ہے، جب کہ ۱۹۵۱ء میں مذکورہ تناسب ۵۵٫۷ فیصدی تھا۔ محنت طاقت کے تناسب میں یہ تفریق تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب سے بڑھتے ہوئے انحطاط کی غماز ہے۔ اترپردیش کے کل زمینی رقبہ میں سے ۱۷٫۲ فیصدی پر جنگلات وسعت ہیں، ۱٫۴ فیصدی ناقابلِ کاشت ہے، ۷٫۲۰ فیصدی غیر زرعی سرگرمیوں کے استعمال میں آ رہی ہے، ۱٫۵ فیصدی زراعتی فاضل یا غیر مزروعہ ہے، ۰٫۹ فیصدی مرغزاروں اور گلہ بانی کے لیے مختص ہے، ۲٫۶ فیصدی متفرق فصلوں و نیز باغوں کے لیے استعمال ہو رہی ہے، ۳٫۴ فیصدی رواں افتادہ ہے، ۱٫۳ فیصدی دیگر افتادہ میں شامل ہے۔ بہر اخص ۵ر۰د فیصدی زمین خالص زیر کاشت رقبہ ہے۔

مذکورہ سیاق و سباق میں اترپردیش اپنی نوع وساحت، آب و ہوا، مٹی کی زرخیزی، اور آبپاشی کے لیے مہیا وسائل (زیر فصل رقبہ کے ۵۸٫۶ فیصدی کو آبپاشی کے وسائل مہیا ہیں) کی موجودگی کی بنا پر ہمیشہ سے قدرتی طور پر زراعت کے لیے موزوں ترین رہا ہے اور یہاں کی آبادی کا بیشتر تناسبی حصہ اپنے ازوقۂ حیات کے لیے براہ راست یا بالواسطہ زرعی سرگرمیوں سے وابستہ رہا ہے۔ فی زمانہ بھی ریاست کی ۸۲ فیصدی سے زائد آبادی دیہی علاقوں میں قیام پذیر ہے اور تقریباً ۷۸ فیصدی سے متزائد براہ راست زراعت پر منحصر ہے۔ لیکن مذکورہ تمام سہولیات اور قدرتی فیاضی کے باوجود معاشی اعتبار سے نہ صرف اب پسماندہ ہے بلکہ عرصۂ دراز سے غربت سے متاثر ہے، جس کا اہم ترین سبب یہاں کی زراعت کی پسماندگی اور پیداواریت کی کمی ہی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں، کہ جب منصوبہ بند معاشی ترقی کا آغاز ہوا، ریاست کی فی کس اوسط آمدنی ملک کی اوسط آمدنی سے مرتفع تھی۔ اس وقت ملک کی اوسط آمدنی محض ۲۴۸ روپے تھی، جب کہ اترپردیش کی اوسط فی کس آمدنی ۲۶۰ روپے کے مساوی تھی، گویا ریاستی اوسط ملکی اوسط کا ۱۰۴٫۸ فیصدی تھا۔ لیکن بعدہٗ ملکی اوسط کے مقابلہ میں ریاستی اوسط میں متواتر تخفیف ہوتی گئی۔ مثال کے طور پر ۶۱-۱۹۶۰ء میں اترپردیش کی

۔ آف دی اکونامکس ڈپارٹمنٹ۔ جواہرلال نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بارہ بنکی (اترپردیش)

فی کس اوسط آمدنی کم ہوکر ملکی اوسط کی ۸۱ فیصدی (ملک کی اوسط فی کس آمدنی ۵۵۹ روپے اور اتر پردیش کی ۴۵۳ روپے) ۷۱-۱۹۷۰ء میں محض ۷۶٫۸ فیصدی (ملکی اوسط ۶۳۳ روپے اور ریاستی اوسط ۴۸۶ روپے) رہ گئی۔ حالانکہ اس کے بعد ۸۱-۱۹۸۰ء میں ملکی اوسط کے مقابلہ میں ریاستی اوسط آمدنی ۸۳٫۷ فیصدی رہی یعنی اس میں اضافہ ہوگیا تاہم ۹۲-۱۹۹۱ء میں یہ پھر کم ہوکر ۷۲٫۶ فیصدی رہ گئی۔ لہٰذا ۱۹۵۱ء سے اب تک منصوبہ بند طریقہ پر زرعی اور صنعتی زمروں میں نمو کے لیے متحدہ کوششوں و بیر عام پبلک کو مہیا سماجی سہولیات میں خاطر خواہ اضافہ کے باوجود ریاست ہر معاملہ میں نہ صرف ملکی اوسط کے مقابلہ میں متواتر سست رفتار رہی بلکہ ملک کی نسبتاً ترقی یافتہ ریاستوں سے تو بہت پیچھے رہی۔ نتیجتاً ریاست کی فی کس آمدنی، جو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ملکی اوسط سے زیادہ تھی، ۸۰-۱۹۷۹ء میں اس کے مقابلہ میں ۲۸ فیصدی کم ہوگئی۔

حالیہ رجحانات کی روشنی میں، رواں قیمتوں کے لحاظ سے ریاست کی فی کس اوسط آمدنی ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۲۷۲ روپے سے افزوں ہوکر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۴۰۱۲ روپے کے مساوی ہوگئی، یعنی مدت مذکورہ کے دوران اس میں اوسطاً ۱۹٫۶ فیصدی سالانہ کا اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اسی مدت میں ملک کی فی کس اوسط آمدنی ۱۶۳۰ روپے سے بڑھ کر ۵۵۲۹ روپے ہوگئی، بالفاظ دیگر اس میں ۲۱٫۷ فیصدی سالانہ کا اضافہ ہوا۔ دوسری جانب، (۸۱-۱۹۸۰ء) کی قائم قیمتوں پر ریاست کی فی کس اوسط آمدنی ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۲۷۲ روپے سے متزائد ہوکر ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۶۰۷ روپے کے مساوی ہوئی، یعنی محض ۲٫۳۸ فیصدی سالانہ کی اوسط نمو حاصل ہوئی، جب کہ اسی مدت کے دوران ملکی فی کس اوسط آمدنی ۱۶۳۰ روپے سے افزوں ہوکر ۲۱۷۴ روپے ہوگئی، گویا ۳٫۰۳ فیصدی سالانہ کی اوسط افزونی وارد ہوئی۔ اسی جہت پر اس سے پیشتر ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۸۱-۱۹۷۱ء کے دوران ریاستی آمدنی میں نمو کی سالانہ در محض ۲٫۸ فیصدی درج ہوئی تھی۔ جب کہ ملکی سطح پر نمو میں ۳٫۹ فیصدی سالانہ کی در وارد ہوئی تھی ـــ حالانکہ ریاست نے متواتر اپنی نمو میں افزائش کی در کو ملکی اوسط کے مقابلہ میں رفیع کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ قومی (ملکی) فی کس اوسط آمدنی اور ریاستی فی کس اوسط آمدنی کے درمیان تفاوت میں تخفیف کی جا سکے، لیکن واقعتاً اس کی نمو کی در ملکی اوسط سے ہمیشہ خفیف رہی، ماسوا چھٹے پنجسالہ منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰ء) کی میعاد کے دوران، کہ جب اس میں مقابلتاً قدرے زیادہ بالیدگی وارد ہوئی تھی۔

اتر پردیش کی مجموعی ریاستی آمدنی ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۴٫۷۳۲ کروڑ روپے کے مساوی تھی، جو رواں قیمتوں پر ۹۲-۱۹۹۱ء میں افزوں ہوکر ۵۶٫۳۸۱ کروڑ روپے ہوگئی، یعنی ۲۸۳ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ لیکن اگر اس کی قدر قائم قیمتوں پر قلم بند کی جاوے تو یہ رقم کم ہوکر محض ۲۲٫۵۷۰ کروڑ روپے ہی رہ جاتی ہے، گویا اضافہ صرف ۵۳ فیصدی کا ہی ہوا۔ اس سے پیشتر دہے میں بھی رواں قیمتوں پر ریاست کی مجموعی آمدنی ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۴٫۲۵۶ کروڑ روپے سے افزوں ہوکر ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۴٫۷۳۲ کروڑ روپے کے مساوی ہوئی تھی، یعنی مذکورہ دہے کے دوران مجموعی ریاستی آمدنی میں ۲۴۶ فیصدی کا اضافہ ہوا تھا، جب کہ اسی دوران مجموعی قومی آمدنی میں ۲۵۴ فیصدی کی افزائش وارد ہوئی تھی۔ لیکن ۷۱-۱۹۷۰ء کی قائم قیمتوں پر اسی مدت میں مجموعی ریاستی آمدنی ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۴٫۲۵۶ کروڑ روپے سے متزائد ہوکر ۸۲-۱۹۸۱ء میں محض ۵٫۸۷۱ کروڑ روپے درج ہوئی تھی، گویا حقیقی معنوں میں مجموعی ریاستی آمدنی میں مذکورہ مدت میں ۳۷٫۹ فیصدی کا ہی اضافہ ہوا۔ بالفاظ دیگر اتر پردیش کی مجموعی ریاستی آمدنی کی سالانہ مرکب در ۳٫۰ فیصدی رہی تھی، جب کہ قومی سطح پر یہ نمو در ۳٫۵ فیصدی وارد ہوئی تھی۔ چوتھے اور پانچویں پنجسالہ منصوبہ (۶۹-۱۹۶۸ء تا ۷۹-۱۹۷۸ء) کے دوران ریاست کی مجموعی آمدنی ۷۱-۱۹۷۰ء کی قائم قیمتوں پر ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۳٫۶۲۸ کروڑ روپے سے افزوں ہوکر ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۴٫۰۵۹ کروڑ روپے اور ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۵٫۳۱۱ کروڑ روپے ہوئی تھی، یعنی چوتھے منصوبہ کے دوران ریاستی معیشت میں ۲٫۳ فیصدی کی در سے اور پانچویں منصوبہ کی مدت میں مقابلتاً ۵٫۷ فیصدی کی تیز تر در سے افزائش وارد ہوئی تھی۔ پانچویں منصوبہ کے دوران کی نمو در تو قومی نمو کی در (۵٫۳ فیصدی) سے بھی بالاتر تھی۔ خالص فی کس داخلی پیداوار کے نقطہ نظر سے اتر پردیش ملک کی تمام ۲۵ ریاستوں میں کمترین کے مقابلہ میں معکوس طور پر پانچویں مقام پر آتا ہے، یعنی فی زمانہ (۹۲-۱۹۹۱ء میں) محض آسام، بہار، اڑیسہ اور میگھالیہ کی ہی فی کس آمدنی اتر پردیش سے کمتر تھی۔ سر فہرست پنجاب کی ریاست ہے کہ جہاں جہاں فی کس آمدنی ۸٫۲۸۱ روپے اور اتر پردیش میں محض ۳٫۵۵۳ روپے تھی۔

اتر پردیش اب بھی بہ تفوق ایک زرعی ریاست ہے۔ چنانچہ ۹۲-۱۹۹۱ء کی بابت ریاست کی مجموعی پیداوار میں زراعت اور معاون زمروں کا حصہ ۴۲٫۴ فیصدی اور مطلقاً ابتدائی زمرہ کا حصہ ۴۳٫۶ فیصدی ہوا تھا، جب کہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۵۲٫۹ فیصدی اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۵۸٫۴ فیصدی تھا۔ مصنوعاتی حلقہ نے اس میں ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۲٫۴ فیصدی کی مدد دی تھی، جب کہ مسلّم ثانوی زمرہ کا حصہ ۱۹٫۶ فیصدی کے مساوی تھا۔ تیسرے زمرہ کی شراکت ۳۶٫۸ فیصدی رہی تھی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں مصنوعاتی زمرہ نے ۱۱٫۴ فیصدی اور مسلّم ثانوی زمرہ نے ۱۵٫۳ فیصدی کی شراکت کی تھی لیکن ۷۱-۱۹۷۰ء میں بالترتیب ان کی مد ۸٫۹ فیصدی اور ۱۴٫۹ فیصدی رہی تھی۔ چنانچہ گذشتہ ۲۰-۲۱ سال کے دوران مذکورہ دونوں زمروں کی نسبتی شراکت میں تبدیلی ریاستی معیشت کے تغیر کلی و بیر اس کی بوقلمونی کا ثمرہ ہے۔

جہاں تک زمرہ جاتی آمدنی کا تعلق ہے ۸۲-۱۹۸۱ء اور ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ریاستی معیشت کے مختلف زمروں سے تحقیق آمدنی کی شرح نمو میں خاصا افتراق رہا ہے اور مذکورہ مدت میں ریاست کے مختلف زمروں سے تحقیق نسبتی آمدنی کی الگ الگ شرح نمو قلم بند ہوئی ہے۔ ریاست کے مختلف زمروں میں وارد علیحدہ علیحدہ شرح نمو مندرجہ ذیل تھی (۱) زراعت و مویشی پروری: ۲٫۹ فیصدی (۲) مسلّم ابتدائی زمرہ: ۲٫۸ فیصدی (۳) مصنوعاتی زمرہ: ۷٫۶ فیصدی (۴) مطلق ثانوی زمرہ: ۶٫۳ فیصدی (۵) دیگر زمرے: ۵٫۸ فیصدی (۶) مجموعی ریاستی آمدنی: ۴٫۴ فیصدی۔ اس سے پیشتر ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۸۲-۱۹۸۱ء کی مدت کے دوران زراعت و مویشی پروری کے زمرہ میں ۲٫۰ فیصدی، مصنوعاتی زمرہ میں ۵٫۳ فیصدی اور دیگر تمام زمروں میں ۳٫۸ فیصدی کی سالانہ شرح نمو درج ہوئی تھی۔ درآنحالیکہ مذکورہ اعداد و شمار اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ زرعی زمرہ میں شرح نمو سب سے کمتر اور مصنوعاتی زمرہ میں ارفع درج ہوئی، تاہم اتر پردیش کی ریاستی داخلی پیداوار (ایس ڈی پی) میں صنعت کا نسبتی حصہ ملک کی دیگر ریاستوں کی داخلی پیداوار میں صنعت کے حصہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ ریاست کی یہ پسماندگی زیادہ تر اس

کی اصل کاری کی کم تر رقم کے باعث ہے کہ جس کی مظہر اگر ایک جانب پست مقدار میں فی کس مصارف ونیز مرکزی امداد ہیں تو دوسری طرف مرکزی اصل کاری بازاری قرض ونیز ملک کے مالیاتی اداروں کی اصل کاری میں ریاست کا کم حصہ ہے۔

اتر پردیش ایک زرعی ریاست ہے، جو ملک کے کل ۱۴ فیصدی زیر کاشت رقبہ پر محیط، ملک کی ۲۱ فیصدی اناج کی پیداوار کے لیے ذمہ دار ہے۔ اس کی ۷۸ فیصدی آبادی زراعتی میدان عمل کی مختلف قسم کی سرگرمیوں میں منہمک ہو کر ریاست کی کل آمدنی میں ۴۴ فیصدی کے مساوی شراکت کرتی ہے۔ ماضی میں تو یہ شراکت حال سے خاصی زیادہ رہتی تھی۔ مثلاً ۷۱-۱۹۷۰ء میں حصہ داری کا فیصد ۵۱٫۴ تھا، جو ۷۹-۱۹۷۸ء میں کم ہو کر ۵۸٫۵ فیصدی اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۵۲٫۹ فیصدی رہ گیا تھا۔ گویا گذشتہ ۲۰-۲۲ سال میں ریاستی آمدنی میں زراعت اور معاون سرگرمیوں کا نسبتی حصہ کافی سے زیادہ کم ہو جانے کے بعد اب بھی خاطر خواہ ہے، جو اس بات کا غماز ہے کہ ریاستی معیشت میں آج بھی زراعتی زمرہ ہی کا غالب درجہ ہے۔ پوری منصوبہ سازی مدت کے دوران ریاست کے زراعتی زمرہ کی نمو کے رجحان زراعتی پیداوار ونیز پیداواریت اور زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کی مرکب سالانہ در سے عیاں ہوتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

انقلاب، منفرد طور پر موثر رہا۔ درآنحالیکہ بعد میں اس انقلاب کے اثرات دیگر پسماندہ منطقوں تک بھی پہنچے، تاہم یہ امر حقیقت ہے کہ تمام منطقے یکساں طور پر ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۰-۷۱ اور ۱۹۸۰-۸۱ء کے دوران زراعتی زمرہ میں سالانہ نمو در مغربی منطقہ میں ۲٫۴ فیصد، وسطی منطقہ میں ۱٫۶ فیصد، مشرقی منطقہ میں ۱٫۹ فیصد، پہاڑی منطقہ میں ۲٫۱ فیصد اور بندیل کھنڈ منطقہ میں ۱٫۱ فیصد وارد ہوئی تھی، جب کہ پوری ریاست کی سالانہ اوسط نمو در ۲ فیصدی تھی۔ مذکورہ دہے میں سے اگر پانچویں پنج سالہ منصوبہ (۷۴-۱۹۷۳ء لغایتہ ۷۹-۱۹۷۸ء) کو الگ کر کے دیکھا جائے تو مدت مذکورہ میں، پورے دہے کے مقابلہ میں، پانچوں منطقوں اور پوری ریاست کی اوسط نمو در میں کافی بالیدگی نظر آتی ہے۔ مثلاً مذکورہ ۵ سالہ میعاد کے دوران مغربی منطقہ میں ۴٫۵ فیصدی، وسطی منطقہ میں ۲٫۶ فیصدی، مشرقی منطقہ میں ۴٫۶ فیصدی، پہاڑی منطقہ میں ۲٫۷ فیصدی اور بندیل کھنڈ منطقہ میں ۱٫۵ فیصدی، لیکن پوری ریاست میں ۵٫۷ کی اوسط نمو در وارد ہوئی تھی

یہ امر بھی یقیناً قابل ذکر ہے کہ اتر پردیش کی زراعت گذشتہ دہے کے دوران نمایاں طور پر قوت آفریں رہی، جس کی مظہر زراعتی پیداوار ونیز پیداواریت میں ممتاز اضافہ ہے۔ چنانچہ ۸۱-۱۹۸۰ء لغایتہ ۹۲-۱۹۹۱ء

پیداوار (لاکھ ٹن میں)

فصل	۸۱-۱۹۸۰ء	۹۲-۱۹۹۱ء	اوسط سالانہ اضافہ (فیصد)
۱۔ چاول	۵۵٫۶۹	۱۰۲٫۶۰	۸٫۴
۲۔ گیہوں	۱۳۳٫۸۵	۱۸۶٫۰۰	۳٫۹
۳۔ اناج	۲۲۴٫۲۱	۳۲۷٫۴۴	۴٫۶
۴۔ دالیں	۲۵٫۲۶	۲۷٫۷۲	۱٫۰
۵۔ اجناس	۲۴۹٫۴۷	۳۵۵٫۱۶	۴٫۲
۶۔ آلو	۳۱٫۶۵	۶۳٫۹۴	۵٫۴
۷۔ گنّا	۶۴۲٫۰۵	۱۰۳۵٫۶۲	۶٫۱
۸۔ تلہن	۳٫۷۴	۱۳٫۰۸	۲۵٫۰

لیکن اس ممتاز کارکردگی کے باوجود اتر پردیش کے زراعتی زمرہ میں پیداوار ونیز پیداواریت اب بھی ملکی اوسط یا پنجاب اور ہریانہ جیسی نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں کے مقابلہ میں خاطر خواہ پسماندہ ہیں مزید برآں ریاست کے مختلف منطقوں اور اضلاع کے مابین بھی اس نقطہ نظر سے غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی منطقہ میں زرعی فصلوں کی پیداوار ونیز پیداواریت، بندیل کھنڈ یا مشرقی منطقوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر اناج کی فی ہیکٹیر پیداوار مغربی منطقہ میں ۱۶٫۹۴ ٹن ہے جب کہ وسطی منطقہ میں ۱۲٫۶۴، بندیل کھنڈ منطقہ میں ۹٫۲۴، مشرقی منطقہ میں ۱۱٫۶۰ ٹن ہے اور ریاستی اوسط ۱۳٫۲۸ ٹن ہے۔ اسی طرح ریاست کی کل اناج کی پیداوار میں مغربی منطقہ کا فیصد حصہ ۴۰٫۲ ہے جب کہ وسطی منطقہ کا ۱۶٫۲، بندیل کھنڈ منطقہ کا ۶٫۹، مشرقی منطقہ کا ۳۱٫۹ فیصدی ہے۔ بین ریاستی پیداواریت کے فرق کی وضاحت کرنے کی غرض سے یہی کافی ہے کہ اتر پردیش میں چاول اور گیہوں کی فی ہیکٹیر پیداواریت اوسطاً علی الترتیب ۱,۱۱۵ کلوگرام اور ۱,۸۳۹ کلوگرام ہے، جب کہ پنجاب میں بالترتیب ۳,۴۴۴ کلوگرام اور ۳,۷۰۰ کلوگرام اور ہریانہ میں بالترتیب ۲,۶۰۷ کلوگرام اور ۲,۵۲۶ کلوگرام ہے۔ یہ افتراق اس جہت کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس پر ریاستی زراعت کی ترقی کے پروگرام کی جہت کے خدوخال ترویج دیئے جانے چاہئیں۔ بالفاظ دیگر ریاست میں آبپاشی کے وسائل مزید زمینی رقبہ کے لیے مہیا کیے جائیں، کیمیاوی کھاد کم قیمتوں پر اور

گذشتہ منصوبہ سے بالاتر فیصد میں نمو کی مرکب سالانہ در

میعاد	پیداوار	رقبہ	پیداواریت
پہلا پنج سالہ منصوبہ ۵۶-۱۹۵۱ء	-	-	-
دوسرا پنج سالہ منصوبہ ۶۱-۱۹۵۶ء	۱٫۲۷	۰٫۸۴	۰٫۴۳
تیسرا پنج سالہ منصوبہ ۶۶-۱۹۶۱ء	۰٫۹۰	۰٫۰۰۲	۰٫۹۱
سالانہ تین منصوبے ۶۹-۱۹۶۶ء	۲٫۲۳	۰٫۷۶	۱٫۴۴
چوتھا پنج سالہ منصوبہ ۷۴-۱۹۶۹ء	۴٫۴۵	۰٫۶۷	۳٫۷۵
پانچواں پنج سالہ منصوبہ ۷۹-۱۹۷۴ء	۲٫۵۴	۰٫۲۲	۲٫۷۲
چھٹا پنج سالہ منصوبہ ۸۵-۱۹۸۰ء	۴٫۷۲	۱٫۰۹	۳٫۶۰
ساتواں پنج سالہ منصوبہ ۹۰-۱۹۸۵ء	۴٫۰۲	۰٫۲۸	۳٫۶۲

لیکن ریاست کے پانچ منطقوں ۔ مغربی، وسطی، مشرقی، پہاڑی اور بندیل کھنڈ ۔ میں سے مغربی منطقہ میں زراعت سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے کہ جہاں سبز

کے دوران ریاست میں جملہ زرعی فصلوں کی پیداوار میں آگے کے نقشے میں پیش کردہ اضافہ درج ہوا ہے۔

سبھی کاشتکاروں کو آسانی سے فراہم کی جائے، کل قابل کاشت زمین پر دوہری فصلوں کو مروّج کرنے کی سہولیات دی جائیں، زیادہ پیداوار دینے والے نئی اقسام کے بیج تمام کاشتکاروں کو بہم پہنچائے جائیں، فصلوں کو کیڑوں اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی تمام ممکن ترکیبیں عمل میں لائی جائیں، ریگستانی زمین کے لیے بارانی کاشت کاری، پہاڑی منطقہ کے لیے پٹی دار کھیتی اور سیڑھی دار کھیتی کی توسیع کی جاوے تاکہ اتر پردیش میں بھی زراعت اور معاون زمرہ میں تحریک کا عمل بار آور ہو کر پوری ریاست میں سبز انقلاب کے اثرات ظہور پذیر ہو سکیں۔

بہرحال ریاستی معیشت میں زراعت کے کلیدی رتبہ کے جاری رہنے کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی امر محال ہے کہ بغیر صنعت کاری کیے ہوئے ریاست کی معیشت میں ساختی تغیر ممکن ہو سکے۔ ایسا راستہ اپنانے پر ہی روزگار کے نئے و زیادہ وسائل پیدا کیے جا سکتے ہیں و پیرآمدنی کی سطح کو مرتفع کرنا ممکن ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر گذشتہ دہے کے دوران خصوصاً عمل میں لائے گئے مختلف اقدامات کے باعث ریاست میں رجسٹرڈ شدہ صنعتوں کے زمرہ و نیز چھوٹے پیمانہ کے صنعتی زمرہ کی ترقی پُر اثر رہی اور صنعتی ساخت میں جدید صنعت کے حق میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے جس کا گوشوارہ حسب ذیل ہے :

صنعت کی قسم	پیداوار (کروڑ روپے میں)		سالانہ اوسط اضافہ (فیصد میں)
	۸۰-۱۹۷۹ء	۸۸-۱۹۸۷ء	
۱۔ زراعت پر مبنی صنعت	۸۶۲	۲,۷۸۰	۲۴٫۷
۲۔ پارچہ بافی کی صنعت	۳۶۸	۹۵۱	۱۷٫۶
۳۔ مویشی پروری پر مبنی صنعت	۴۶	۳۴۹	۷۳٫۲
۴۔ جنگلات پر مبنی صنعت	۵	۲۳	۴٫۰
۵۔ معدنیات پر مبنی صنعت	۳۶۷	۱,۷۷۷	۴۲٫۷
۶۔ کیمیاوی صنعت	۳۱۵	۱,۱۰۰	۲۷٫۷
۷۔ انجنیئرنگ صنعتیں	۷۷۹	۴,۳۱۳	۵۱٫۴
۸۔ دیگر صنعتیں	۲۶۳	۲,۵۰۸	۱۰۷٫۰
مجموعی صنعتیں	۲,۹۷۸	۱۳,۹۸۱	۴٫۶

اتر پردیش کے صنعتی زمرہ میں منصوبہ بند اصل کاری نہایت ہی قلیل رہی ہے، جس کے باعث ریاست مختلف لحاظ پر صنعتی نقطہ نظر سے پسماندہ رہی ہے لیکن گذشتہ تقریباً ایک دہے کے دوران ریاست کے رجسٹرڈ شدہ کارخانوں میں صنعتی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ دراصل ریاست میں صنعتی زمرہ کو تیز روی چھٹے پنج سالہ منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰ء) کے دوران عطا ہوئی۔ لہٰذا جب کہ ۱۹۷۱ء میں ریاست کی 'محنت طاقت' کا محض ۳٫۷ فیصدی ہی مصنوعاتی زمرہ میں کار رسد تھا، ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۴٫۰ فیصدی ہو گیا۔ ریاست کی منظم مصنوعاتی صنعتیں شکر، سیمنٹ، بناسپتی اور پارچہ جات ہیں۔ جملہ صنعتی پیداوار کا اشاریہ ۱۹۷۰ء میں ۱ سے اضافہ ہو کر ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۸۹٫۷ ہو گیا اور بعد ازاں اس میں متواتر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۲۷٫۷ تک پہنچ گیا گویا ۸۳-۱۹۸۲ء کے مقابلہ میں ۲٫۱ فیصدی اور ۸۰-۱۹۷۹ء کے مقابلہ میں ۲۰٫۰ فیصدی کی افزائش ہوئی۔ کل ملا کر ریاستی معیشت میں ۷۵-۱۹۷۴ء لغایتہ ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران صنعتی زمرہ کی نمو ۴٫۹ فیصدی وارد ہوئی تھی، جس میں رجسٹرڈ زمرہ میں ۹٫۹ فیصدی اور غیر رجسٹرڈ زمرہ میں ۸٫۸ فیصدی کی درج ہوئی تھی۔ غیر رجسٹرڈ زمرہ میں نمو کی در چھٹے پنج سالہ منصوبہ کے دوران ۸٫۰۱ فیصدی ہو گئی، جب کہ پانچویں پنجسالہ منصوبہ میں یہ ۹٫۹ فیصدی ہی تھی۔ اس کے مقابلہ میں رجسٹرڈ زمرہ میں پانچویں منصوبہ میں نمو کی شرح ۸٫۸ فیصدی سے کم ہو کر چھٹے منصوبہ میں محض ۴٫۴ فیصدی رہ گئی تھی۔

مذکورہ گوشوارے اور حقائق پر مبنی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) ریاستی معیشت کی صنعتی ساخت بڑی معنی قدرے متحرک اور اس لیے اثر آفریں ہو گئی ہے کہ روایتی صنعتوں کا تناسبی حصہ کم ہو گیا ہے اور ایسی صنعتوں کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے کہ جو نمو کی تیز کاری کے عمل کے تئیں دقیقہ رس گردانی جاتی ہیں۔

(۲) مقامی طور پر دستیاب وسائل کے برتر اور زیادہ استعمال کے رجحان کے تئیں نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ جنگلات پر مبنی و پیر معدنیات سے متعلق صنعتوں کی ترقی اس ضمن میں نشاندہی کرتی ہے۔

(۳) چھوٹے پیمانہ کے زمرہ میں روایتی صنعتیں زیادہ عمیق محنت کی طرف مائل ہیں، جب کہ غیر روایتی صنعتیں بیشتر اصل کی جانب رواں ہیں گذشتہ تقریباً پورے دہے کے دوران منظم و غیر منظم زمروں میں نمو کی وارد نسبتی در کا تجزیہ اس حقیقت کی حمایت کے لیے کافی ہے۔ ●

بقیہ : بھارت میں کھیل کود۔ ایک جائزہ

ممتاز نوجوان کھلاڑی لینڈر پیز اور رمیش کرشنن نے سوئزرلینڈ کی ٹیم پر شاندار کامیابی حاصل کی جب کہ سوئزرلینڈ کی ٹیم میں اولمپک سنگلز چیمپئن مارک روزیٹ بھی شامل تھے کرشنن نے جب پانچویں یادگار میچ میں جیکب ہائمیک کو ہرا یا تو انھیں دنیا کے بہترین کھلاڑیوں میں ۲۰۸ واں نمبر دیا گیا۔

کرشنن اور پیز نے ایک اور شاندار کامیابی اس وقت حاصل کی جب انھوں نے سیمی فائنل میں پہنچنے کے لیے فریجس میں فرانس کی ٹیم کو شکست دی۔ غیر ممالک میں ایک زبردست مقابلے میں اوڈر لفی گلبرٹ کے خلاف پانچویں میچ میں فتح حاصل کرنے کا سہرا ابھی رمیش کرشنن کے سر ہے۔ البتہ رمیش اور لینڈر کی یہ جوڑی چنڈی گڑھ میں آسٹریلیا کے خلاف اسی طرح کا مظاہرہ نہ کر سکی۔

بھارت نے اندرا گاندھی اسٹیڈیم میں جسے دنیا کا ایک شاندار انڈور اسٹیڈیم تسلیم کیا جاتا ہے، عالمی بیڈمنٹن چیمپئن شپ کا انعقاد کیا۔ حسب توقع انڈونیشیا نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کر کے اعزازات حاصل کیے۔ ●

تمباکو کی پیداوار اور برآمدات

یہ بہت ہی زیادہ تعجب کی بات ہے کہ عالمی سطح پر تمباکو کے خلاف جامع مہم کے باوجود تمباکو ایک اہم فصل ہے، جس سے زبردست آمدنی ہوتی ہے۔ بھارت غیر تیار شدہ تمباکو کی پیداوار کرنے والا چوتھا سب سے بڑا ملک ہے، جہاں تمباکو کی کل عالمی پیداوار کے سات فیصد حصے کی پیداوار ہوتی ہے۔ تمباکو کی پیداوار کے سلسلے میں بھارت کا نمبر چین، امریکہ اور برازیل کے بعد آتا ہے۔ ورجینیا تمباکو کی زیادہ تر پیداوار آندھرا پردیش اور کرناٹک میں کی جاتی ہے۔

تمباکو سے متعلق بورڈ کے قانون مجریہ ۱۹۷۵ء کے تحت ۱۹۷۶ء میں تمباکو سے متعلق ایک بورڈ قائم کیا گیا تھا جس کا صدر دفتر گنٹور میں ہے۔ یہ بورڈ تمباکو کی پیداوار اور خرید و فروخت کا انتظام کرتا ہے۔ تمباکو کی صنعت کو فروغ دینے اور تمباکو کے کاشتکاروں کے لیے معاوضہ جاتی قیمتوں کو یقینی بنانے کا کام تمباکو سے متعلق بورڈ کے ذمہ ہے۔ یہ بورڈ بھارت میں ورجینیا تمباکو کے معیار کو بہتر بنانے، بین الاقوامی منڈیوں میں تمباکو کی تمام اقسام اور اس کی مصنوعات کی برآمدات کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

تمباکو سے متعلق بورڈ کے قانون کے تحت، تمباکو سے متعلق بورڈ ورجینیا تمباکو کی پیداوار اور اس کو سکھانے کا انتظام کرتا ہے۔ تمباکو کے کاشتکاروں اور تاجروں کے صلاح مشورے پر تمباکو کے بقیہ ذخیرے، تمباکو کی اندرون ملک مانگ، تمباکو کی سپلائی اور مانگ کی بین الاقوامی صورتِ حال کے جائزے کی بنیاد پر، تمباکو سے متعلق بورڈ آندھرا پردیش اور کرناٹک کے لیے علیحدہ سے فصل کے سائز کا تعین کرتا ہے۔ کرناٹک میں تمباکو کی فصل مون سون کی صورتِ حال کے لحاظ سے اگائی جاتی ہے اور اس کی فصل کی خرید و فروخت کا کام اگست یا ستمبر سے جنوری یا فروری تک کے عرصے میں انجام دیا جاتا ہے۔ تمباکو سے متعلق بورڈ تمباکو کے ہر ایک کاشت کار کو تمباکو کی پیداوار کے لیے لائسنس دیتا ہے۔

۱۹۹۲-۹۳ء کے دوران ۴ر۱۶۲۲ لاکھ کلوگرام تمباکو کی پیداوار ہوئی تھی جس میں سے آندھرا پردیش اور کرناٹک کا حصہ بالترتیب ۱۲۹۰ لاکھ کلوگرام اور ۴ر۳۳۲ لاکھ کلوگرام تھا۔ ۱۹۹۱-۹۲ء میں ۹ر۱۵۹۱ لاکھ کلوگرام تمباکو کی پیداوار ہوئی تھی، جس میں سے آندھرا پردیش کا حصہ ۸ر۱۳۲۷ لاکھ کلوگرام اور کرناٹک کا حصہ ۱ر۲۶۴ لاکھ کلوگرام ہے۔

تمباکو سے متعلق بورڈ نے تمباکو کی پیداوار اور اس کی پیداوار پر کنٹرول کے سلسلے میں ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کمیٹی کی ایک میٹنگ اس سال ۱۰ مارچ میں منعقد ہوئی تھی، جس میں کرناٹک میں ۱۹۹۳-۹۴ء میں تمباکو کی فصل کے سیزن کے لیے فصل کے سائز پر غور و خوض کیا گیا تھا۔ کمیٹی نے کرناٹک ایف سی وی تمباکو کی کل ضرورت کا اندازہ ۲۷۰ لاکھ کلوگرام لگایا تھا۔ گذشتہ فصل میں سے ۶۰ لاکھ کلوگرام تمباکو باقی بچ جانے کی امید ہے۔ اس لیے ۲۷۰ لاکھ کلوگرام میں سے ۶۰ لاکھ کلوگرام نکال لینے کے بعد، کرناٹک میں ۱۹۹۳-۹۴ء میں تمباکو کی فصل کے سیزن کے لیے فصل کا سائز ۲۱ لاکھ کلوگرام متعین کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بورڈ نے آندھرا پردیش میں ۱۹۹۳-۹۴ء میں تمباکو کی فصل کے سیزن کے لیے فصل کے سائز پر بھی غور و خوض کیا۔ بورڈ نے آندھرا پردیش کے تمباکو کی برآمدات ۲۸۵ لاکھ کلوگرام، اندرون ملک مانگ ۵۹۰ لاکھ کلوگرام ہونے کا اندازہ لگایا ہے۔ اس طرح ان دونوں اعداد و شمار کو ملا کر کل مانگ ۸۷۵ لاکھ کلوگرام ہو جاتی ہے۔

جب کبھی مانگ کے مقابلے میں سپلائی زیادہ ہوتی ہے تو کسانوں کے لیے بنیادی قیمتوں پر ناموافق اثر پڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر تمباکو سے متعلق بورڈ نے ان تمام امور کا جائزہ لیتے ہوئے کسانوں کو فصل کے منظور شدہ سائز سے زیادہ تمباکو کی پیداوار نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ کسانوں میں اس بات کی بھی تشہیر کی گئی ہے کہ وہ صرف فصل کے منظور شدہ سائز کے لحاظ سے ہی پیداوار کریں۔

تمباکو سے متعلق بورڈ کو اختیار ہے کہ وہ تمباکو کی غیر قانونی پیداوار یا فروخت کرنے والے افراد کے خلاف مقدمہ چلائے۔ لیکن تمباکو سے متعلق بورڈ کے قانون کی دفعہ ۲۸ کے مطابق، اس قسم کے مقدمے کے لیے مرکزی حکومت سے پیشگی منظوری لینے کی ضرورت ہے۔

برآمدات کے معاملے میں بھارت کا نمبر ۱۹۹۲ء میں تمباکو کی عالمی منڈی میں آٹھواں تھا۔ ایف سی وی تمباکو بھارت سے برآمدات کیے جانے والے تمباکو کی اہم قسم ہے۔ تمباکو کی غیر ایف سی وی اقسام کی برآمدات بھی کی جاتی ہے۔ بھارت تمباکو کی مصنوعات یعنی سگریٹوں، حقے میں بھرنے والے تمباکو، چبانے والے تمباکو، بیڑیوں، نسوار کی خوشبو والے تمباکو کی برآمدات بھی کرتا ہے۔

۱۹۹۲-۹۳ء میں تمباکو کی برآمدات کی مالیت ۱۴ر۴۳۴ کروڑ روپے رہی ہے، جب کہ ۱۹۹۱-۹۲ء میں یہ مالیت ۶۹ر۳۴۲ کروڑ روپے تھی۔ تمباکو کی مصنوعات مثلاً بیڑیوں، سگریٹوں، چبانے والے تمباکو، حقے میں بھرنے والے تمباکو، نسوار کی خوشبو والے تمباکو کی برآمدات میں بھی اضافے کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں مالیت پر مبنی ان مصنوعات کی برآمدات کی مالیت ۶۸ر۳۲۷ کروڑ روپے رہی ہے، جب کہ ۱۹۹۱-۹۲ء میں یہ مالیت ۸۱ر۴۷۷۰ کروڑ روپے تھی۔

برآمدات کے لیے اہم منڈیاں روس، برطانیہ، نیپال، بیلجیم، الجیریا اور مصر ہیں۔ تمباکو کی برآمدات میں اضافہ کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے جن میں بھارتی تمباکو کی جانب بین الاقوامی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ بیوپاریوں کو راغب کرنے کے

غرض سے بھارت میں تمباکو کے معیار اور پیداواریت کو بہتر بنانا بھی شامل ہے۔ روس جیسی منڈیوں کے لیے روایتی ایف سی وی تمباکو کے علاوہ تمباکو کی برآمدات کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ تجارتی وفود کو اسپانسر کرکے نیز نمائشوں میں شرکت کرکے اسپین، روس اور دیگر سی آئی ایس ممالک، مورکو، تونیشیا، فلپائن، فرانس، پرتگال جیسی منڈیوں سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

کسانوں کی مدد کرنے کے لیے حکومت ورجینیا تمباکو کے لیے زرعی لاگتوں اور قیمتوں کے کمیشن کی سفارش کی بنیاد پر کم سے کم امدادی قیمتیں مقرر کرتی ہے۔ تمباکو سے متعلق بورڈ قیمتوں میں استحکام لانے کے لیے کسانوں سے ورجینیا تمباکو خریدتی ہے۔ تمباکو کی فروخت کے لیے نیلامی کے نظام سے خرید و فروخت کے نظاموں میں ایک اہم تبدیلی آئی ہے۔ غیر ورجینیا تمباکو کے سلسلے میں خرید و فروخت کے ناکافی انتظام کے پیش نظر مذکورہ تمباکو کو تمباکو سے متعلق بورڈ کے دائرہ کار میں لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نیلامی کے نظام کی شروعات سے قبل کسان تاجروں کے رحم و کرم پر رہتے تھے نیز ادائیگیوں کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے لیے مدت کا تعین ہوتا تھا۔ نیلامی کے نظام کے تحت کسانوں کو چیک کے ذریعہ اُن کے واجبات کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ اگر قیمتیں کم سے کم امدادی قیمتوں سے بھی نیچے چلی جاتی ہیں تب بھی کسانوں کو کم سے کم امدادی قیمتوں کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔ تمباکو سے متعلق بورڈ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مداخلت کرے اور تمباکو خریدے۔

نیلامی کے نظام کی شروعات سے کسانوں کی حاصل کردہ اوسط قیمت میں کافی بہتری آئی ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اوسط قیمت کی وصولی آندھرا پردیش میں ۶۳/۲۷ روپے فی کلوگرام اور کرناٹک میں ۵۲/۲۶ روپے فی کلوگرام رہی ہے، جب کہ یہ وصولی ۱۹۹۰ء میں آندھرا پردیش میں ۶۹/۱۴ روپے فی کلوگرام اور کرناٹک میں ۴۴/۲۶ روپے فی کلوگرام تھی۔

لیکن کم سے کم امدادی قیمتیں کسانوں کے لیے زیادہ معاوضہ جاتی نہیں پائی گئی ہیں اور ہمیشہ منڈی میں رائج قیمتوں کے مقابلے میں کہیں کم رہی ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بورڈ نے کسانوں کے لیے معاوضہ جاتی قیمتوں کو یقینی بنانے کی غرض سے کم سے کم ضمانت شدہ قیمت کا نظریہ مرتب کیا ہے۔ فصل کے سائز کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرتے وقت تاجروں سے کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ کم سے کم ضمانت شدہ قیمت ادا کرنے کی ضمانت دیں، جو ان کی وعدہ کردہ مقدار کے لیے کم سے کم امدادی قیمت سے زیادہ ہو۔

کم سے کم ضمانت شدہ قیمت تاجروں، کسانوں اور بورڈ کے درمیان ایک مفاہمت ہے۔ یہ ایک رضاکارانہ اسکیم ہے۔ پود کاری کیے جانے سے قبل کم سے کم ضمانت شدہ قیمت کے بارے میں وسیع پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہے۔ ●

بقیہ: ڈاکٹر انصاری — مثالی رہنما

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر انصاری کی صد سالہ تقاریب کے افتتاح کے موقع پر فرمایا کہ:—

"ان کی شخصیت بے داغ تھی، اپنی زندگی میں وہ ہندو، مسلمانوں کے روایت اور جدت، قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کا کام دیتے تھے۔۔۔ آج ہمیں ایک بار پھر ڈاکٹر انصاری کی خداترسی اور انسانیت، قومی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دینے کا جذبہ، مذہبی جنون سے مبرا اور پاک و صاف ہونا، دیگر مذاہب اور برادریوں کے لوگوں کے لیے احترام اور نیک دلی کی ضرورت ہے، جس کے وہ مظہر تھے۔"

۱۹۹۳ء میں غیر معمولی غیر ملکی سرمایہ کاری

نئی صنعتی پالیسی کی شروعات کے بعد کی مدت میں غیر ملکی سرمایہ کاری ۱۲۱۶ کروڑ روپے کے برابر ہے۔ ان میں سے ۸۸۶۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کو صرف ۱۹۹۳ء میں ہی منظوری دی گئی ہے نئی صنعتی پالیسی کے تحت غیر ملکی سرمایہ کاروں کی جانب سے یہ برس غیر معمولی مثبت رد عمل کا برس ثابت ہوا ہے۔

اسی طرح ۱۹۹۱ء سے نومبر ۱۹۹۳ء کے دوران غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری ۴۴۲۶ کروڑ روپے کے برابر رہی ہے۔

نئی صنعتی پالیسی کے تئیں غیر ملکی سرمایہ کاروں کا مثبت رد عمل ۱۹۹۳ء میں مختلف ممالک کی مجموعی غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ امریکہ سے کی جانے والی سرمایہ کاری جو ۱۹۹۱ء میں ۸۵/۱۸۵ کروڑ روپے کی اور ۱۹۹۲ء میں ۵۸/۱۲۳۱ کروڑ روپے تھی، ۱۹۹۳ء میں ۸۸/۶۱/۳۴ کروڑ روپے ہو گئی۔ اسی طرح برطانیہ کی سرمایہ کاری ۱۹۹۱ء میں ۱/۲۳ کروڑ روپے تھی، ۱۹۹۳ء میں ۷۳/۶۲۲ کروڑ روپے ہو گئی۔ عمان نے ۱۹۹۳ء میں ۹۸ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے تیسرا مقام حاصل کیا۔

سوئٹزرلینڈ، متحدہ عرب امارات، تھائی لینڈ، نیوزی لینڈ، جاپان، میکسیکو، جرمنی، آئرلینڈ، فرانس، مارلیشش، اٹلی اور ہانگ کانگ کی سرمایہ کاری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ●

بھارت میں مکمل خواندگی

بھارت میں مکمل خواندگی کا خواب اب شرمندۂ تعبیر ہونے لگا ہے اور یہ نشانہ قابل حصول نظر آنے لگا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں خواندگی مہم کے سلسلے میں ارناکلم کے تجربے کی قابل ذکر کامیابی کے بعد سے، دیگر اضلاع نے بھی مکمل خواندگی کی مہمیں چلانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت ملک بھر کے دو سو سے زیادہ اضلاع میں مکمل خواندگی کی مہمیں چلائی جا رہی ہیں۔ توقع ہے کہ یہ تعداد مستقبل قریب میں بڑھ کر ۳۵۰ ہو جائے گی، جن کی وجہ سے ملک میں خواندگی کی شرح بڑھ کر ۷۵ فیصد تک پہنچ جائے گی۔

مکمل خواندگی کی مہم کی ایک اور خصوصیت ناخواندہ لوگوں کو پڑھانے کے سلسلے میں رضاکاروں کے طور پر نوجوانوں کا جوش و خروش ہے۔ اس قسم کے رضاکاروں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ گئی ہے، جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ایک اور اہم خصوصیت پڑھنے والے لوگوں میں خواتین کی تعداد زیادہ ہونا ہے۔ مکمل خواندگی کی مہمیں ۶۵ روپے فی طالب علم کے حساب سے ایک بہت ہی کم اخراجاتی معاملہ ثابت ہوئی ہیں۔ مہموں سے ثابت ہوا ہے کہ مکمل خواندگی ایک خواب بعید نہیں ہے۔ اس کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ●

ڈاکٹر بلشٹر

دیہی کوآپریٹو سوسائٹیوں میں اصلاح کی ضرورت

دیہات کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو صرف زرعی قرضوں پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے سبھی طبقوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر دھیان دینا چاہئے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ان سوسائٹیوں کو موثر بنانے کے لیے کمزور طبقوں کو ان کی انتظامیہ کمیٹیوں میں نمائندگی دینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قرضوں کا ایک حصہ ان طبقوں کے لیے بھی مخصوص کیا جانا چاہئے۔

آزادی کے بعد جب ملک میں اقتصادی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کا دور شروع ہوا تو منصوبے میں زرعی پیداوار میں کثیر اضافے کا مقصد بھی شامل کیا گیا اور اس کے لیے سرگرم کوششیں کی گئیں۔ کوآپریٹو قرضوں کو نمایاں اہمیت دی گئی تاکہ سود خور مہاجنوں سے اونچی شرح سود پر قرض لینے کی ضرورت نہ رہے اور زرعی پیداوار و ترقی کے لیے حصول مالیات کا ایک قابل اعتبار ذریعہ میسر آجائے۔ دیہی قرضوں سے متعلق کل ہند جائزہ کمیٹی (۱۹۵۱-۵۲ء) نے کاشت کاروں کی قرضوں کی تمام تر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہی کوآپریٹو انجمنوں کو مضبوط و مستحکم بنانے پر زور دیا۔ یہ سفارش کرتے وقت کمیٹی کو کوآپریٹو انجمنوں کی ڈھانچہ جاتی اور دیگر خامیوں کا علم تھا لیکن چونکہ اسے قرضوں کی فراہمی کے لیے کوئی اور ادارہ یا ایجنسی نظر نہ آئی اس لیے اس نے سفارش کی کہ زرعی مالیات کی فراہمی کے لیے کوآپریٹو انجمنوں کو ہی واحد ادارہ جاتی ایجنسی کے طور پر ترجیح دیا جائے۔ کمیٹی نے کوآپریٹو نظام کو کامیاب بنانے کے لیے بعض سخت اقدامات تجویز کیے۔ ان اقدامات کے زیر عمل لائے جانے کے بعد کاشت کاروں کے ذریعے لیے جانے والے قرضوں میں کوآپریٹو قرضوں کا حصہ ۳ء۱۹۵۱ میں ۱ر۳ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۶۱-۶۲ء میں ۱۵ر۵ فیصد ہو گیا۔ بینکنگ کمیشن (۱۹۷۲ء) نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ دیہات کے لیے کوآپریٹو انجمنیں ہی سب سے زیادہ موزوں ہوں گی۔

پرائمری ایگری کلچرل کریڈٹ سوسائٹیاں انفرادی قرض خواہوں کو مختصر اور درمیانی مدت کے قرضے فراہم کرتی ہیں جب کہ طویل مدت کے قرضے پرائمری لینڈ ڈیولپمنٹ بینک دیتے ہیں۔

پرائمری کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیاں ہی ملک میں کوآپریٹو قرضوں کے نظام کی اصل بنیاد ہیں اور پورے قرضہ جاتی ڈھانچے کی مضبوطی کا انحصار ایک بڑی حد تک انہی پر ہے۔ بھارت میں پرائمری ایگری کلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کی تعداد ۱۹۶۰-۶۱ء میں دو لاکھ بارہ ہزار سے گھٹ کر ۱۹۷۱-۷۲ء میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار اور ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۹۰ ہزار رہ گئی۔ لیکن ان سوسائٹیوں کی رکنیت میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ان سوسائٹیوں کے ارکان کی تعداد ۱۷۰ لاکھ تھی جو بڑھتے بڑھتے ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۷۱۹ لاکھ ہو گئی۔ سوسائٹیوں کی تعداد میں کمی کی وجہ بدحال سوسائٹیوں کو ختم یا کسی مستحکم سوسائٹی میں مدغم کرکے ان سوسائٹیوں کی ازسرنو تنظیم کرنے کی سرکاری پالیسی تھی۔ بہرحال ان سوسائٹیوں کی رکنیت میں اضافہ اس بات کی دلیل ہے کہ دیہات کے لوگوں میں کوآپریٹو نظام کی افادیت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر سوسائٹی کی رکنیت میں اضافہ ہونے سے اسے اقتصادی استحکام حاصل ہوا۔ اس کے فنڈس بڑھے اور اس کی سرگرمیوں کو مزید وسعت حاصل ہوئی۔ ان سوسائٹیوں کے ڈپازٹ ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۷۵ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۷۰۹ کروڑ روپے ہو گئے یعنی نو گنا۔ ان سوسائٹیوں کے ملکیتی فنڈس چار گنا اضافے کے ساتھ ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۲۹۲ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۱۱۹۴ کروڑ روپے ہو گئے۔ ان کی قرض لی ہوئی رقوم میں تقریباً چھ گنا اضافہ ہوا اور وہ ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۷۴۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۴۳۲۶ کروڑ روپے ہو گئیں۔ اسی طرح ان سوسائٹیوں کے دیے ہوئے واجب الادا قرضوں میں (مدت زیر تبصرہ) میں چار گنا اضافہ ہوا۔ ایسے قرضوں کی کل رقم ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۱۰۵۶ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۶-۸۷ء میں ۴۶۳۵ کروڑ روپے ہو گئی۔

تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان سوسائٹیوں کے پاس جمع ۱۹۷۱-۷۲ء کے ۷۵ کروڑ روپے کے ڈپازٹ انہیں واجب الادا قرضوں کا صرف ۸ر۱ فیصد اور ۱۹۸۶-۸۷ء کے ۷۰۹ کروڑ کے ڈپازٹ ان کو واجب الادا قرضوں کا صرف ۱۵ر۲ فیصد ہی تھے۔ اس کے مقابلے میں ان سوسائٹیوں نے ۱۹۷۱-۷۲ء میں اپنے واجب الادا قرضوں کی ۸۶ر۳ فیصد اور ۱۹۸۶-۸۷ء میں اپنے واجب الادا قرضوں کی ۹۳ر۳ فیصد رقم بیرونی وسائل سے قرض لی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیرونی وسائل پر ان سوسائٹیوں کے انحصار میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سوسائٹیاں دیہی گھرانوں میں بچت اور کفایت شعاری کو بڑھاوا نہیں دے سکی ہیں اور ان کی بچتوں کو پوری طرح بروئے کار نہیں لا سکی ہیں۔

علاقائی نابرابریاں

سال ۱۹۸۴-۸۵ء میں کوآپریٹو قرضوں کی مجموعی سپلائی کو دیکھتے ہوئے قرض کی فی ہیکٹر دستیابی بہار میں ۲۴ روپے سے لے کر کیرالہ میں ۱۴۹۰ روپے تھی۔ بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان

مغربی بنگال، اتر پردیش اور کرناٹک میں کوآپریٹو قرضوں کی فی ہیکٹیئر دستیابی ۱۷۵ روپے فی ہیکٹیئر کی قومی اوسط سے کم تھی۔ سب سے بڑا قرضہ (۲۵۵ روپے) گجرات میں اور سب سے چھوٹا قرضہ (۲۳ روپے) بہار میں دیا گیا۔ فی قرض خواہ بڑے کوآپریٹو قرضے گجرات، ہریانہ، کیرالہ، کرناٹک، مہاراشٹر، پنجاب اور تمل ناڈو کی مقابلتاً زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں میں دیئے گئے جب کہ فی قرض خواہ نسبتاً چھوٹے قرضے بہار، اڑیسہ، جموں وکشمیر، راجستھان، ہماچل پردیش، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی ریاستوں میں دیئے گئے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ملک میں کاشتکاروں کو دیئے گئے کل کوآپریٹو قرضوں میں سے ۶۵ فیصد قرضے آندھرا پردیش، تمل ناڈو، کیرالہ، کرناٹک، پنجاب، ہریانہ، گجرات اور مہاراشٹر میں فراہم کیے گئے۔ ان اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ کوآپریٹو قرضوں کی فراہمی کے معاملے میں ریاستوں کے درمیان نابرابری پائی جاتی ہے۔ نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں میں کوآپریٹو قرضوں کے ارتکاز کی وجہ ان ریاستوں میں تعلیم کی اعلیٰ سطح ہے جو لوگوں کو کوآپریٹو نظام کے فائدوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور کاشتکاروں کو کاشتکاری کی نئی ٹکنالوجیاں اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ہمارے ملک کے زرعی منظر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں چھوٹے اور نہایت چھوٹے کاشتکاروں کی تعداد بہت زیادہ یعنی کاشتکاروں کی کل تعداد کا ۷۶٫۴ فیصد ہے جب کہ ان کے پاس زمین صرف ۲۸٫۸ فیصد ہی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے اور نہایت چھوٹے کسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ چونکہ چھوٹے اور نہایت چھوٹے کسانوں کو زرعی قرضے اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے جتنی آسانی کے ساتھ وہ بڑے کسانوں کو ہو جاتے ہیں اس لیے وثوق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک ان کے لیے قرضوں کی فراہمی کا خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا جاتا اس وقت تک ملک میں زرعی ترقی کی رفتار تیز نہیں کی جاسکتی۔ کوآپریٹو سیکٹر پر عرصہ دراز سے بڑے کاشتکار ہی حاوی رہے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے اور نہایت چھوٹے کاشتکاروں کو قرض حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے چھوٹے اور نہایت چھوٹے کسانوں اور دیہی سماج کے کمزور طبقوں کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے ہیں۔ مالیات فراہم کرنے والی ایجنسیوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ قرض دینے کے معاملے میں چھوٹے اور نہایت چھوٹے کاشتکاروں کا خاص خیال رکھیں۔ نتیجتاً دو ہیکٹیئر سے کم رقبے کے چھوٹے فارموں کو "غیر چھوٹے" فارموں کی بہ نسبت فی ہیکٹیئر زیادہ قرضے دیئے گئے۔ لیکن یہ بات مایوس کن ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹیاں صرف ۲۰ فیصد چھوٹے کاشتکاروں کو ہی قرضے دے سکیں جب کہ "غیر چھوٹے" کاشتکاروں یعنی ایسے کاشتکاروں کے ضمن میں جن کے پاس دو ہیکٹیئر سے زیادہ زمین ہے یہ فیصد ۴۲ تھا۔ لہٰذا زرعی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پرائمری کوآپریٹو سوسائٹیاں چھوٹے کسانوں کی زیادہ بڑی تعداد کو قرضے مہیا کریں۔

کمزوریاں

کوآپریٹو سوسائٹیاں عوام کی ایسی تنظیمیں ہوتی ہوتی ہیں جن کا مقصد بچت اور امداد باہمی کے ذریعے عوام کے اقتصادی حالات کو بہتر بنانا ہے۔ ان کا ڈھانچہ جمہوری ہوتا ہے۔ اگر چہ زراعت کے لیے مالیات کی فراہمی کے معاملے میں کوآپریٹو نظام نے کافی ترقی کی ہے پھر بھی اس کی کارکردگی حسب توقع نہیں کہی جاسکتی۔ ایسا بعض کمزوریوں کی وجہ سے ہے جن کا بیان ذیل میں کیا جارہا ہے۔

(۱) عدم استحکام

بہت سی پرائمری کوآپریٹو ایگریکلچرل سوسائٹیوں کی بنیاد کمزور اور غیر مستحکم ہے۔ کوآپریٹو قرضوں سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۹۱ء) میں کہا گیا تھا کہ "ایک مستحکم اکائی وہ ہے جو حکومت کی مدد کے بغیر ایک معقول مدت میں کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد کو وہ خدمات بہم پہنچا سکے جن کی کوآپریٹو قرض کی سوسائٹیوں سے امید کی جاتی ہے چونکہ پرائمری ایگریکلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کی بڑی تعداد مضبوط و مستحکم نہیں ہے اس لیے انھیں زرعی پیداوار کے لیے قرض کی فراہمی کے معاملے میں غیر تسلی بخش ایجنسیاں تصور کیا جانا چاہیئے"۔ ۱۰-۱۹۷۹ء کے اعداد وشمار کے مطابق ۹۴۵۹۲ پرائمری ایگریکلچرل سوسائٹیوں میں سے تقریباً ۶۱۲۸ سوسائٹیاں غیر فعال تھیں اور ۳۶۱۲۵ نقصان میں چل رہی تھیں۔ اس صورت حال کی وجوہات میں سوسائٹی کے دائرہ کار کا بہت تھوڑے علاقے یا محض ایک گاؤں یا ملحقہ گاؤں تک ہی محدود ہونا، سوسائٹی کے ارکان کی تعداد کم ہونا، ارکان سے ان کی بچائی ہوئی رقومات حاصل نہ کر پانا اور عملے کا تربیت یافتہ تجربہ کار نہ ہونا شامل ہیں۔ اسی لیے ان سوسائٹیوں کو از سر نو مضبوط و مستحکم اکائیوں کی شکل میں منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں پرائمری ایگریکلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کی تعداد گھٹ گئی مگر لوگوں میں کوآپریٹو نظام کے فائدوں کا احساس پیدا ہونے سے ان کی رکنیت میں اضافہ ہوا۔

ان سوسائٹیوں کو از سر نو منظم کرنے کی کوششوں کے باوجود یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ان سوسائٹیوں کی کارکردگی میں اتنی بہتری نہیں آئی ہے جتنی کہ امید کی جاتی تھی۔ زراعت اور دیہی ترقی کے لیے ادارہ جاتی قرضوں کے انتظامات کا جائزہ لینے کے واسطے مقرر کی گئی کمیٹی نے کہا ہے کہ جہاں از سر نو تنظیم کی مشق مکمل ہو گئی ہے وہاں بھی کارکردگی میں کما حقہٗ بہتری واقع نہیں ہوئی ہے۔

(۲) کمزور مرکزی بینک

کمزور مرکزی کوآپریٹو بینکوں کی موجودگی بھی کوآپریٹو نظام کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ ملک میں ۳۴۱ مرکزی کوآپریٹو بینکوں میں سے صرف ۲۱۴ بینک ہی مستحکم بینک ہیں۔ کمزور مرکزی بینک پرائمری ایگریکلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کو مطلوبہ رقوم فراہم نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مرکزی کوآپریٹو بینکوں کو مالی استحکام عطا کرنے کے لیے یہ تجویز کیا گیا کہ ان کے دائرہ اختیار میں ایک ضلع سے کم علاقہ نہیں ہونا چاہیئے تاکہ ان کا کاروبار اتنا زیادہ ہوسکے جو انھیں مالی استحکام بخشنے کے لیے کافی ہو۔ یہ سجھاؤ بھی پیش کیا گیا کہ کمزور مرکزی بینکوں کے دائرہ اختیار میں کام کرنے والی پرائمری ایگریکلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کو اعلیٰ سطح کے بینکوں سے براہ راست قرض لینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

(۳) عوام سے انکی بچائی ہوئی رقوم کا ناکافی حصول

ملک میں کوآپریٹو تحریک کا ایک بڑا مقصد

ین میں کفایت شعاری اور بچت کی عادت پیدا ارہا ہے۔ اس مقصد کے تحت اراکین اور غیر لین سے ان کے ڈیپازٹ قبول کیے جاتے ہیں۔ یہ حالیہ برسوں میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ڈیپازٹوں کا فی اضافہ ہوا ہے تاہم اراکین سے ڈیپازٹ حاصل تے کے معاملے میں ان کی کارکردگی پوری طرح بخش نہیں کہی جا سکتی جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سائٹیاں اپنے اراکین میں کفایت شعاری اور بچت عادت نہیں ڈال سکی ہیں کافی تعداد میں اراکین ڈیپازٹ حاصل نہ کر پانے کی وجہ سے ان سوسائٹیوں قرضے دینے کے لیے مطلوبہ مالیات کے حصول کے سطے مرکزی بینکوں پر بہت زیادہ انحصار رکھنا ا ہے۔ یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ کسی بھی یڈیٹ ایجنسی کی کامیاب کردگی کا دارومدار اس ت پر ہوتا ہے کہ وہ ڈیپازٹوں کی شکل میں عوام بچتیں کہاں تک حاصل کرتی ہے۔ کوآپریٹو انجمنوں ، لیے تو یہ اور بھی اہم ہے کیونکہ ان کا رول لوگوں کفایت شعاری اور بچت کی عادت ڈالنے میں ا ہے۔ ان ڈیپازٹوں سے لوگوں کے پاس بے کار ے ہوئے روپے کو اکٹھا کر کے کاشتکاروں کو اداری قرضے دینے میں مدد ملتی ہے۔ اگر یہ سائٹیاں لوگوں سے کافی مقدار میں ڈیپازٹ ں حاصل کر پاتیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے ہ عوام میں بچت کی عادت ڈالنے میں ناکام رہی ہیں۔

۴) انتظامیہ کی نااہلیت

کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ایک اور کمزوری ان انتظامیہ کی نااہلیت ہے جو لوگوں میں تشویش کا ث بن گئی ہے۔ ان سوسائٹیوں کا عملہ اکثر اتنا اہل ں ہوتا کہ وہ زرعی اور دیہی ترقی کے منصوبوں پروگراموں اور نئی پالیسیوں کو مناسب اور موثر زمین زیر عمل لا سکے۔ کمتر انتظامیہ اہلیت کی بڑی کم تنخواہیں اور غیر پیشہ ور کوآپریٹو عملہ ہے جسے آپریٹو بندوبست کی تربیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ...جات کی سہولتوں کا جائزہ لینے والی کل ہند کمیٹی نا ہے کہ "کوآپریٹو اداروں میں کاروباری انداز کے فقدان کا ایک پہلو یہ ہے کہ بہت سے علاقوں یہ ادارے کم تنخواہ پانے والے غیر پیشہ ور عملے سے کام چلاتے رہے ہیں، جب کہ اس میں اتنی صلاحیت موجود نہیں ہوتی کہ وہ ان اداروں کے تقاضوں اور ضرورتوں کو بطریق احسن پورا کر سکیں۔ اس پر طرہ یہ کہ عملے کا انتخاب اکثر مقامی سرپرستی یا ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔" یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کوآپریٹو اداروں کے دیئے ہوئے قرضوں کی بازوصولی نہ ہو پانے کی ایک اہم وجہ انتظامیہ عملے کی نااہلی ہے۔

(۵) سرکاری مداخلت

کوآپریٹو اداروں کو سرکاری مداخلت کے بغیر آزادی سے کام کرنے کی اجازت کبھی نہیں دی جاتی۔ بہت سی ریاستوں میں ان کی جمہوری انداز میں کام کرنے کی آزادی پر قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ ان اداروں کی خودمختاری کو بحال کرنے کے لیے کوآپریٹو قانون کی امتناعی دفعات کو ختم کرنا ضروری ہے۔ کوآپریٹو اداروں کو سرکار کے کوآپریٹو محکمے کی ایجنسی نہ سمجھ کر انھیں عوامی تنظیمیں سمجھا جانا چاہیے اور حکومت کو ان کی ترقی میں مدد دینی چاہیے۔

(۶) بقایا جات

پالیسی سازوں کے لیے ایک اور اہم مسئلہ کوآپریٹو اداروں کے بڑھتے ہوئے بقایا جات ہیں۔ کوآپریٹو قرضوں کے نظام کی مضبوطی و استحکام کا دارومدار ایک بڑی حد تک کاشتکاروں کو دیئے گئے قرضوں کی بروقت بازوصولی پر ہوتا ہے لیکن یہ امر باعث تشویش ہے کہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر کاشتکاروں کے اندر قرضوں کو وقت پر واپس نہ کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، جس کی وجہ سے کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کے بقایا جات میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان کاشتکاروں کو ضرورت کے وقت کافی قرضے مہیا کرنے کی صلاحیت متاثر ہو رہی ہے، جس سے اقتصادی ترقی کی رفتار بھی سست ہو جاتی ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ کریڈٹ سوسائٹیوں کو وقت پر بار ادائیگی نہ کرنے کے مرتکب زیادہ تر خوشحال کسان ہی ہو رہے ہیں۔ اس مسئلے پر ان تمام لوگوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے جو ملک کی اقتصادی ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

تجاویز

کوآپریٹو قرضوں کے نظام کی خامیوں کو دور کرنے اور اسے زیادہ اہل بنانے کے لیے صوبائی اور مرکزی بینکنگ کمیٹیوں، زرعی کمیشن اور ریزرو بینک آف انڈیا وغیرہ مختلف اداروں نے متعدد سفارشات کی ہیں۔

(۱) پرائمری ایگریکلچرل سوسائٹیوں کو اپنے ارکان میں کفایت شعاری اور بچت کی عادت بڑھانی چاہیے۔ انھیں تمام قسموں کے ڈیپازٹ قبول کرنے چاہئیں اور بینکنگ کی سہولیات فراہم کر کے مقامی بچتوں کو حرکت میں لانا چاہیے۔ چونکہ بینکنگ ریگولیشن ایکٹ پرائمری سوسائٹیوں پر لاگو نہیں ہوتا اس لیے ان سوسائٹیوں کے لیے مالی وسائل کے حصول کے واسطے مقامی بچتوں کو حرکت میں لانا ضروری ہے۔ ڈیپازٹوں کے تحفظ کے لیے کوئی ایسا طریقہ نکالنا ہوگا جس سے وہ ڈیپازٹ انشورنس اسکیم کے تحت آ جائیں۔ اگرچہ دیہی علاقوں میں بچتوں کا کافی امکان ہے لیکن دیہات کے لوگ کم شرح سود کی وجہ سے کوآپریٹو اداروں میں روپیہ جمع کرنا پسند نہیں کرتے اور انھیں اداروں پر بھروسہ بھی نہیں ہے چونکہ نجی طور پر روپیہ ادھار دینا بہت زیادہ منافع بخش ہوتا ہے اس لیے کوآپریٹو اداروں کے ڈیپازٹوں پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کوآپریٹو اداروں میں ڈیپازٹوں کی تعداد بڑھانے کے لیے ایسا قانون بنایا جائے جس سے نجی طور پر روپیہ ادھار دینے کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔

ڈیپازٹوں میں اضافہ ہونے سے پرائمری کریڈٹ سوسائٹیوں کا کاروباری سرمایہ بڑھے گا اور وہ دیہی عوام کی قرض کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں گی۔

(۲) کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیاں صحیح معنوں میں کوآپریٹو یا امداد باہمی کے اصولوں پر چلائی جانی چاہئیں۔ ان کے عملے کو مناسب تربیت دینے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جانے چاہئیں تاکہ وہ نئی چنوتیوں کا مقابلہ کر سکیں اس کے علاوہ مخفی مفادات کو قانون سازی اور دیگر اقدامات کے ذریعے ختم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ دیہی سماج کے کمزور طبقوں کو پرائمری کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کے بندوبست میں شریک کیا جانا چاہیے اور انھیں سرکاری مداخلت کے بغیر کام کرنے دینا چاہیے۔ ●

بڑے شہروں میں ہاؤسنگ کا مسئلہ: چند تجاویز

جوں جوں شہر کاری اور اقتصادی ترقی کی رفتار میں تیزی آئے گی توں توں رہائش گاہوں کا مسئلہ بھی شدت اختیار کرے گا۔ مصنف کا خیال ہے کہ کمیونٹی یا سماج کی شرکت سے مکانات کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کر کے اس مسئلے کے حل کی جانب بہتر پیش قدمی کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ایک قومی ہاؤسنگ الفارمیشن بینک قائم کرنے پر بھی زور دیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے قومی، ریاستی اور مقامی سطحوں پر حقیقت پسندانہ ہاؤسنگ پالیسیاں وضع کرنے میں مدد ملے گی۔

۱۹۹۱ء میں بھارت میں ۲۳ میگا[1] (بڑے) شہر تھے جن کی آبادی ۱۰ لاکھ یا اس سے زیادہ تھی اور جن کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی شہری علاقوں میں رہتی تھی۔ جہاں تک رہن سہن کے حالات کا تعلق ہے شہروں میں غیر معیاری ماحول میں رہنے اور بے روزگاری یا کم روزگار کے سبب مشکل حالات میں گذر کرنے والی آبادی جسے شہری خدمات و سہولیات تک رسائی نہیں ہوتی، کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق زیادہ تر بڑے شہروں میں دو تہائی آبادی جھگی جھونپڑیوں، گندی بستیوں یعنی سلم علاقوں اور بلا اجازت بسائی گئی کالونیوں میں رہتی ہے جو چھوٹے شہروں میں یہ تعداد ان کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہو سکتی ہے۔ اس صدی کے اختتام تک بڑے شہروں میں بھیڑ بھاڑ بہت بڑھ جائے گی، آبادی اور اس کے مسائل کی گوناگونی میں مزید اضافہ ہوگا اور ان کا معیار زندگی غیر کشش انگیز ہو جائے گا۔ معیار زندگی کا ایک اہم مظہر جائے رہائش یا مکان ہوتا ہے آج کل بیشتر بڑے شہروں میں کئی ایجنسیاں شہریوں کو رہائشی یونٹ مہیا کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ ان میں ڈڈکو، ریاستی ہاؤسنگ بورڈوں، میونسپل اداروں، ڈیولپمنٹ اتھارٹیوں، ایچ ایف ڈی سی اور ایچ یو ڈی کو کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ سب ایجنسیاں مل کر ایک بڑے شہر میں ایک سال میں تیس تا چالیس ہزار رہائشی یونٹ فراہم کرا پائی ہوں گی جب کہ ضرورت آئندہ دس برسوں میں ہر برس پچاس ہزار سے ایک لاکھ ۲۵ ہزار یونٹ فراہم کرنے کی ہے۔ اتنے رہائشی یونٹوں کی ضرورت اس لیے ہوگی کہ مکانوں کی پچھلی بقایا مانگ کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی کی اضافی مانگ کو بھی پورا کرنا پڑے گا اور پرانے اور کمزور پڑ گئے مکانوں کی جگہ پر نئے مکانات بنانے ہوں گے۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہر بڑے شہر میں مکانات کی سالانہ مانگ ۵ رہائشی اکائیوں کی ہوگی۔ ۱۹۹۱ء سے ۲۰۱۱ء تک کی مدت میں ۲۳ بڑے شہروں میں ہر سال مجموعی طور پر ۱٫۲۵ ملین رہائشی یونٹ درکار ہوں گے۔ لیکن موجودہ صدی کے اختتام تک اگر بڑے یا MEGA شہروں کی تعداد بڑھ کر ۳۵ ہو جاتی ہے تو مجموعی طور پر ہر سال ۱٫۷۵ ملین رہائشی یونٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہر سال جتنی مانگ پوری نہ کی جا سکے گی وہ ان اعداد میں شامل نہیں ہے۔

ہر سال ۱٫۲۵ ملین رہائشی یونٹوں کی مانگ پوری کرنے کے لیے مجموعی طور پر ... کروڑ روپیے سالانہ کی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔ یا یوں سمجھئے کہ آئندہ ۲۰ سالوں میں ۲۳ بڑے شہروں میں سے ہر شہر میں اوسطاً ۱۲۷ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے ہاؤسنگ ایجنسیوں کا بجٹ اتنی بڑی سرمایہ کاری کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔

ابھی حال تک ہاؤسنگ ایجنسیوں کا کردار ایک فراہم کنندہ کا رہا ہے۔ جب کہ ان ایجنسیوں نے روایتی اور کتابی تشریحات کے مطابق تکنیکی اعتبار سے اچھے اور مضبوط مکانات فراہم کرنے کی کوشش کی۔ بیشتر طلب گاروں نے انھیں قیمت یا دیگر وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا۔ رابطہ کی کمی کی وجہ سے ہاؤسنگ ایجنسیوں نے اس کا غلط مطلب نکالا۔ دوسری طرف طلب گاروں کے سامنے یہ سوال رہا کہ وہ اپنے کام کی جگہ سے مکان کے نزدیک ہونے اور رہن سہن کے بہتر ماحول میں سے کس کا انتخاب کریں اور ایک بار کی بڑی سرمایہ کاری اور مکان پر بار بار کی جانے والی سرمایہ کاری میں سے کسے چنیں۔

شہروں میں غریب طبقے کے لیے مکانات یا رہائشی یونٹوں کی فراہمی فلاح و بہبود کے شعبے میں آتی ہے جس کے لیے بحیثیت ایک شعبے کے کم رقومات مختص کی جاتی ہیں۔

راجدھانی میں دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کا قیام ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا تھا اور تب سے مختلف بڑے اور چھوٹے شہروں میں ۱۵۰ ڈیولپمنٹ اتھارٹیاں قائم کی جا چکی ہیں جن کا بڑا مقصد کالونیوں کی اندھا دھند تعمیر کو روکنا اور باقاعدہ ڈیولپمنٹ کا اہتمام

[1] میگا شہروں سے مراد بڑے شہر ہیں جن کی آبادی دس لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔

رہتا ہے۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں کم آمدنی والے خاندانوں کو نئے رہائشی یونٹ یا پلاٹ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زیادہ آمدنی والے خاندانوں کی ضرورتیں پوری کرنے پر توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ آمدنی والے لوگوں نے کم آمدنی والے لوگوں کے لیے بنائے گئے رہائشی یونٹ ہتھیا لیے۔

دوسری طرف میونسپل ادارے صرف شہری سہولیات کی فراہمی کا کام کرتے ہیں اور انھیں کمزور اور خستہ حال مکانات کے تحفظ یا مرمت وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ان کے پاس اتنے فنڈس بھی نہیں ہوتے کہ وہ وسیع رہائشی علاقے ڈیولپ کریں۔ اس کے نتیجے میں ٹوٹے پھوٹے اور کمزور مکانوں کی جگہ نئے مکان بنانے کی ذمہ داری ہاؤسنگ ایجنسیوں پر آتی ہے۔ اس سے ان کے کام میں اضافہ ہوتا ہے۔

رہائش گاہوں کی ضرورت

اگر ہمارا اتھارٹیوں کو ہاؤسنگ کے مسئلے کا حجم معلوم ہو جائے تو بڑے شہروں میں فراہمی مکانات کے لیے معقولیت پسندانہ پالیسیاں اور پروگرام وضع کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

مثال کے طور پر دہلی میں دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی اپنی ۹۰-۱۹۸۹ء کی رپورٹ کے مطابق ایک سال میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ ہزار رہائشی یونٹ ہی فراہم کر سکی ہے۔ لیکن دہلی میں ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ کیا ہوگی؟ اس سادہ مگر بنیادی سوال کا جواب اگر سب نہیں تو زیادہ تر بڑے شہروں میں فوری طور پر دستیاب نہیں ہے۔

لیکن ایک حقیقت پسندانہ اور کارگر ہاؤسنگ پالیسی وضع کرنے کے لیے ان اعداد و شمار کا دستیاب ہونا بہت ضروری ہے۔

کسی شہر میں ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ کا اندازہ مکانات کی پچھلی بقایا مانگ، بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مکانات کی اضافی مانگ اور پرانے اور شکستہ حال مکانات کی تعمیر نو کی ضرورت کی بنیاد پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس فارمولے کے مطابق دہلی میں ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ کا اندازہ ۵۹ر۲۷ر۱ رہائشی یونٹ ہے۔

مکانات کی پچھلی بقایا مانگ (ب۔م)

اس زمرے میں اُن کنبوں کی تعداد کو شمار کیا جاتا ہے جو کھلے آسمان کے تلے یا کمزور یا خستہ حال مکانوں میں یا عارضی اور نیم مستقل کھوکھوں میں رہ رہے ہیں۔ پھر اس تعداد کو ۲۰ سے تقسیم کر کے ایک سال کی اوسط بقایا مانگ نکالی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس بات کی امید ہو کہ یہ بقایا مانگ ۲۰ سال کے اندر پوری کی جا سکے۔ اگر اس مانگ کے دس سال میں پورا کیے جانے کی امید ہو تو پھر دس سے تقسیم کر کے سالانہ اوسط نکالی ہوگی۔

آبادی بڑھنے کے سبب پیدا ہونے والی اضافی مانگ (ا م)

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں بڑے شہروں میں آبادی میں ۴۰ فیصد اضافہ قدرتی افزائش کی وجہ سے اور ۴۰ فیصد اضافہ دوسری جگہوں سے لوگوں کے آکر شہر میں بسنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی اضافہ میٹروپالیٹن حدود میں نئے علاقوں کے شامل کیے جانے سے ہوتا ہے۔

پرانے مکانوں کو پھر سے بنانے کی ضرورت پر مبنی مانگ (پ م)

بڑے شہروں میں اینٹوں اور سیمنٹ وغیرہ سے پختہ مکان بنائے جاتے ہیں لیکن ۵۰ سال گزر جانے کے بعد انھیں پھر سے بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہر سال دو فیصد مکان ایسے ہوتے ہیں جنھیں دوبارہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ کسی بڑے شہر کی ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ ب م، ا م اور پ م کو جوڑ کر نکالی جا سکتی ہے۔

مکان کے طلبگاروں کی مالی حیثیت

ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ کے عددی تخمینوں کے ساتھ ساتھ مکانات کی کوالٹی بھی اتنا ہی اہم پہلو ہے۔ مکانات کی کوالٹی کیسی ہو اس کا دار و مدار ان لوگوں کی مالی حیثیت پر ہوتا ہے جن کے لیے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں۔ ان کی مالی حیثیت کا درست اندازہ لگانے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ان کی آمدنی کیا ہے اور وہ اپنی آمدنی کا کتنا حصہ مکان کے لیے وقف کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ ضروری ہے کہ مکانات آمدنی کے تمام زمروں کے لیے بنائے جائیں ورنہ کم آمدنی والے زمرے کے لیے بنائے گئے مکانات زیادہ آمدنی والے لوگوں کے پاس چلے جائیں گے۔

مختصر یہ کہ آمدنی کے تمام زمروں کے لوگوں کے ضمن میں ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ کا تخمینہ نہ صرف عددی اعتبار سے بلکہ کوالٹی کے لحاظ سے بھی لگایا جانا چاہیے تبھی تمام زمروں کی ضروریات پوری کی جا سکیں گی۔

بڑے شہروں کے باشندوں میں سماجی، اقتصادی اور ثقافتی تبدیلیاں کافی تیزی سے رونما ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن سرکاری ایجنسیوں کے ہاؤسنگ پروجیکٹوں میں ان تبدیلیوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر اسی بات کو لیجیے کہ ڈی ڈی اے کی سیلف فائنانسنگ اسکیم کے تحت متوسط بلکہ اونچی آمدنی والے لوگوں کے لیے بنوائے گئے رہائشی یونٹوں میں واشنگ یا کپڑا دھونے کی مشین رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں بنائی گئی ہے۔ شاید ان کا ڈیزائن بنانے والوں نے اس بات پر توجہ ہی نہیں دی کہ دہلی میں کپڑا دھونے کی مشینیں کتنی مقبول ہو گئی ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور مثال یہ ہے کہ اپارٹمنٹس کی طرز کی بیشتر رہائش گاہوں میں اسکوٹر یا موٹر سائیکل وغیرہ رکھنے کے لیے پارکنگ کی جگہ نہیں رکھی گئی۔

سیکھنے کے لائق باتیں

حیدرآباد کے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (یو سی ڈی)، سری لنکا کے ملین ہاؤسز پروگرام (ایم ایچ پی) اور انڈونیشیا کے کامپنگ امپروومنٹ پروگرام (کے آئی پی) جیسے ہاؤسنگ پروجیکٹوں نے مشکلات کے باوجود اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان ماڈلوں میں حسب ضرورت اصلاح کر کے انھیں بھارت کے بڑے شہروں میں بھی ہاؤسنگ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یو سی ڈی، حیدرآباد

بھارت سرکار نے سال ۶۳-۱۹۶۲ء میں گندی بستیوں کو ہٹانے کی مہم شروع کی تھی بعد میں ماحول کو بہتر بنانے کی ایک اسکیم بھی شروع کی گئی۔ لیکن کچھ وجوہات کے سبب یہ دونوں اسکیمیں جلد ہی بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ یہ وجوہات تھیں گندی بستیوں سے ہٹائے گئے لوگوں کا اپنی مالی دشواریوں کے سبب متبادل رہائش گاہ خریدنے کی استطاعت نہ رکھنا، سماجی و اقتصادی ترقی کی جزئیات کو کم ترجیح، کمیونٹی سروسوں پر بہت زیادہ زور اور انفرادی مسکنوں کو

بہتر بنانے پر بہت کم توجہ۔

حیدرآباد کے یو سی ڈی پروگرام سے قبل دہلی میں ۱۹۵۸ء میں، کلکتہ میں ۱۹۶۶ء میں اور بعد ازاں کچھ دوسرے شہروں میں بھی شہری اجتماعی ترقی کے پروگرام تجربے کے طور پر شروع کیے جا چکے تھے۔ اُس وقت ان پروگراموں کا مقصد "مادی و انسانی وسائل کو سماج کے تمام لوگوں کی انفرادی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کا عمل شروع کرنا" بتایا گیا تھا۔ اس طرح یو سی ڈی پروگرام کے فلسفے کو اس مفروضہ کی بنیاد پر آگے بڑھایا جاتا تھا کہ کوئی بھی پڑوس خواہ وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو خود اپنی کوششوں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتا ہے نیز یہ کہ باہر سے کوئی بھی امداد صرف اسی وقت طلب کی جانی چاہیئے جب اپنے وسائل بالکل ختم ہو چکے ہوں۔

۱۹۷۶ء میں جب یو سی ڈی پروگرام حیدرآباد میں شروع کیا گیا تو اس وقت اس شہر کی ہاؤسنگ کی سالانہ مانگ ۴۴۰۰ یونٹوں کی تھی جب کہ سپلائی صرف ۷۰۰ یونٹ سال تھی۔ یو سی ڈی پروگرام کی وہ خصوصیات جن کی وجہ سے وہ کامیابی سے ہم کنار ہو پائی یہ ہیں:۔

(۱) تعمیر مکانات کے لیے سبھی قسم کے نقشے عوام کی شرکت سے تیار کرنا۔

(۲) بڑی سڑک تک جانے والی نئی چھوٹی سڑکوں اور پانی کی فراہمی کے لیے ٹنکی وغیرہ کی تعمیر کے لیے جگہ پلاٹوں کے مالکوں اور مکان بنانے والی ایجنسی کے درمیان گفت و شنید کے ذریعے نکالی جانی چاہیئے۔

(۳) زمین کی ڈیولپمنٹ کے اخراجات عوام، مکان بنانے والی ایجنسی اور میونسپلٹی کو مل کر برداشت کرنے چاہئیں۔

(۴) اخراجاتِ تعمیر میں کفایت کے لیے مقامی لیبر اور پرانے مکانوں سے نکالی ہوئی اینٹیں وغیرہ استعمال کی جانی چاہییں۔

حیدرآباد کے یو سی ڈی پروگرام کو دیگر خصوصیات میں تعمیر مکانات کی اسکیموں پر بڑو اور دوسری متعلقہ ایجنسیوں کی منظوری حاصل کرنا، جائے تعمیر پر مکانات بنانے کی منظوری لینا، گندی بستیوں کی جگہ پر نئے مکانات بنانے کے لیے مکینوں کو متبادل عارضی جائے قیام مہیا کرنا شامل تھا۔ لیکن یو سی ڈی حیدرآباد کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بچوں، عورتوں اور نوجوانوں کی فلاح و بہبود اور مسکنوں کی تعمیر جیسے سماجی ترقی اور روزگار پیدا کرنے والے پروگرام بھی شامل کیے گیے۔ ان پروگراموں کی تفصیلات متعلقہ طبقوں کے ساتھ مفصل غور و خوض کے بعد تیار کی گئیں۔

حیدرآباد کا یو سی ڈی پروگرام اس وقت تک بھارت میں فراہمی مکانات کا سب سے کامیاب پروگرام ثابت ہوا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز ابتدائی مرحلوں سے ہی عوام کی شرکت، گندی بستیوں میں رہن سہن کے حالات بہتر بنانے کے لیے درست انداز نظر، یو سی ڈی کے کارکنان کی پرخلوص خدمات اور سیاسی و انتظامی سطحوں پر فیصلے لینے کے مجاز لیڈران اور افسران کی حمایت میں پنہاں ہے۔

سری لنکا کا ملین ہاؤسز پروگرام (ایم۔ ایچ۔ پی)

سری لنکا کا مشہور ملین ہاؤسز پروگرام (ایم ایچ پی) وہاں کی حکومت نے ۱۹۸۴ء میں شروع کیا تھا۔ ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء کے تین برسوں کے لیے مقررہ تعداد میں سے ۸۰ فیصد خاندانوں تک پہنچ کر اس پروگرام نے ۱۹۸۸ء تک شاندار کامیابی حاصل کر لی تھی۔ انہی تین برسوں میں کولمبو کے میٹروپالیٹن علاقے میں زائد از سات ہزار خاندانوں تک پہنچ کر ان کے رہن سہن کے حالات کو ذیلی سہولیات کی فراہمی کے ذریعے بہتر بنایا جا چکا تھا۔ اس سے ان خاندانوں کے روزی کمانے کے ذریعوں کو بھی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ بیشتر خاندان اپنے گھروں سے ہی کام دھندہ کرتے تھے۔

سری لنکا کے ایم ایچ پی پروگرام کو زیر عمل لانے کی ذمہ داری خاص کر وہاں کی نیشنل ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ کارپوریشن پر تھی، کارپوریشن نے شروع ہی سے ایک "امدادی" پالیسی اختیار کی۔ امدادی پالیسی کے معنی یہ تھے کہ "حکومت ان اقدامات کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی جو کوئی خاندان یا سماج خود اپنی ترقی کے لیے کرے گا۔ اپنی طرف سے مداخلت وہ صرف اس صورت میں کرے گی جب لوگ مدات تو دیکھ نہ کر پائیں گے۔"

سرکاری مدد و حمایت کا استعمال عام طور پر سماجی تنظیموں کو قانونی حیثیت دینے، زمین پٹے پر حاصل کرنے، ذیلی سہولیات کا انتظام کرنے، صحتی خدمات بہم پہنچانے اور مکان بنانے کے لیے ضروری اطلاعات، تربیت اور قرضوں کی فراہمی کے لیے کیا گیا۔ ایم۔ ایچ۔ پی کی تین بنیادی خصوصیات یہ تھیں۔

(۱) ترقی کے لیے ایک ایسا ماڈل اختیار کیا گیا جس میں عوام کو مرکزی مقام حاصل تھا عوام کی طرف سے از خود اپنے رہن سہن کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کی گئی کوششوں میں مدد دی گئی اور ایم۔ ایچ۔ پی سے مستفید ہونے والوں کی حیثیت سے انسانی وسائل کو فروغ دیا گیا۔

(۲) زمین کی قیمت بلحاظ استعمال کو زمین کی بازار قیمت پر ترجیح دی گئی مارکیٹ وغیرہ کسی اور مقصد کے لیے مخصوص زمین کو جس پر بعد میں عارضی مکانات یا جھونپڑیاں وغیرہ بن گئیں، قابضوں سے خالی کرانے کی بجائے یہ سوچ کر قابضوں کے قبضے میں ہی رہنے دیا گیا کہ زمین کا یہ استعمال اُس سے زیادہ فائدہ مند ہوگا جس کا کہ پلان بنایا گیا ہے۔

(۳) بہت سے معاملات میں مقامی طور پر تجویز کیے گئے چھوٹے موٹے حلوں کو باہر سے لائے گئے پیچیدہ حلوں سے بہتر سمجھا گیا۔ یعنی استفادہ کنندگان نے اپنے مسکنوں کی اصلاح و بہتری کے لیے جو طریقے نکالے ان کی اجازت دے دی گئی بجائے اس کے کہ پیشہ وروں سے مشورہ طلب کیا جائے۔ یہ طریقہ کارگر ثابت ہوا۔ اگر بعد میں کسی مرحلے پر پیشہ ور ماہرین کا مشورہ لینا ضروری ہو جائے تو یہ اور بات ہے۔ تب تو کسی ان کا مشورہ لیا جائے گا

ایم۔ ایچ۔ پی۔ پروگرام کا انحصار شروع سے ہی پروگرام کے ہر مرحلے میں استفادہ کنندگان کی شرکت پر رہا۔ ان کی بھرپور شرکت کمیونٹی ڈیولپمنٹ کونسلوں اور کمیونٹی کنٹریکٹ سسٹم کے ذریعے حاصل کی گئی۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کونسلوں کے اراکین کی تعداد وہی ہوتی تھی جو کسی بستی میں رہنے والے کنبوں کی ہوتی تھی۔ یہ کونسلیں ۵۰ سے ۱۲۵ کنبوں کی نمائندگی کرتی تھیں اور ان کے اراکین کا چناؤ ہر سال ہوتا تھا۔ ان کونسلوں کے بن جانے کے بعد ان کا رجسٹریشن میونسپل سرکار کے دفاتر میں کرایا جاتا تھا۔ پھر یہی کونسلیں اپنے علاقے کے مسکنوں کی اصلاح و

بہتری کے طریقے تجویز کرتیں اور علاقے کی آبادی کی طرف سے بات چیت کرتی تھیں۔ بہت سی اصلاحات مثلاً مشترکہ بیت الخلاؤں، فٹ پاتھوں اور کوڑا دانوں وغیرہ کی تعمیر کونسل کے مقرر کردہ استفادہ کنندگان کے گروپ عمل میں لاتے تھے۔ اس قسم کے تمام کاموں کے لیے کنٹریکٹ اور قرضے میونسپلٹی کمیونٹی ڈیولپمنٹ کونسل کو دیتی تھی۔ اصلاحات عمل میں لانے کے اس طریقے کو کمیونٹی کنٹریکٹ سسٹم کہا جاتا تھا۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کونسلیں تمام امور کے بارے میں فیصلے کھلے عام اور سماج کی موجودگی میں کرتی تھیں۔

مسکنوں کی براہ راست اصلاح و بہتری پر توجہ دینے کے علاوہ ایم۔ ایچ۔ پی پروگرام کے تحت بعض ذیلی پروگراموں کے لیے بھی امداد دی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک "کام دھندے کے لیے مدد دینے کا پروگرام" تھا جس کے تحت اراکین قرضے لے کر روزی کمانے کے پروجیکٹ شروع کر سکتے تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ بہت سے بے روزگار مردوں اور عورتوں نے مستقل و منظم مسکن حاصل ہو جانے کے بعد روزی کمانے کے لیے چھوٹے چھوٹے نفع بخش کام شروع کیے۔ مثلاً پھولوں کی کاشت اور پکے ہوئے کھانے کے پیکیٹ تیار کر کے بیچنا وغیرہ۔

لیکن ایم۔ ایچ۔ پی کی کامیابی ان سب باتوں کے علاوہ، پختہ سیاسی عزم اور سیاسی اقتدار کے انکسار اور لوگوں سے کچھ سیکھنے کے جذبے کی مرہون منت تھی۔

کے۔ آئی۔ پی (کامپنگ امپرومنٹ پروگرام) انڈونیشیا

اگرچہ ابتدا میں یہ پروگرام انڈونیشیا سرکار نے ۱۹۶۹ء میں شروع کیا تھا مگر اسے رفتار ۱۹۷۴ء میں ہی حاصل ہوئی جب اس کے لیے عالمی بینک سے فنڈس آئے۔ اس پروگرام نے انڈونیشیا میں ہاؤسنگ کا عظیم مسئلہ دس سالوں میں حل کر کے ایم۔ ایچ۔ پی کی طرح دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔

۱۹۷۴ء میں انڈونیشیا کی دو تہائی آبادی کامپنگوں یا بے قاعدہ بستیوں میں رہا کرتی تھی جن کی تعداد بڑے شہروں کے مجموعی ہاؤسنگ اسٹاک کے ۵۹ فیصد کے برابر تھی۔ ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء کی مدت میں جکارتہ کے ہاؤسنگ اسٹاک میں ۱٫۳۰٫۰۰۰ رہائشی یونٹوں کا اضافہ ہوا جن میں سے ۲٫۳۰٫۰۰۰ یونٹ کامپنگوں یا بے قاعدہ بستیوں میں تھے۔

کے۔ آئی۔ پی پروگرام کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

(۱) اجتماعی خدمات پر توجہ

کے۔ آئی۔ پی کی مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پروگرام انفرادی مسکنوں کی اصلاح کی بجائے ساری بستی کی اجتماعی نوعیت کی اصلاح پر توجہ دیتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت کامپنگوں میں سڑکیں اور نالیاں بنوائی گئیں، نل لگوائے گئے اور میونسپل خدمات کے ساتھ ساتھ اسکول اور شفا خانے کھولے گئے۔ پھر بھی ایک کسر رہ گئی جس کے بارے میں یوں کہا گیا "پروگرام کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ انسانی فضلے کو ٹھکانے لگانے کی خاطر خواہ سہولیت نہیں کیا جا سکا ہے۔ نہ تو عوامی بیت الخلاء سوائے کی کوئی کامیاب رہی ہے نہ ہی پلاٹ پر گڑھا کھود کر فضلے کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ کامیاب ثابت ہوا ہے کیونکہ آج بھی بہت سے لوگ رفع حاجت کے لیے نہروں وغیرہ کے کنارے جاتے ہیں۔"

(۲) متاثرین کو کمیونٹی کی طرف سے معاوضہ

اکثر ایسا ہوا کہ کسی کامپنگ (بے قاعدہ بستی) میں میونسپل خدمات کی فراہمی کے لیے کچھ افراد کو اپنی زمین یا مکان یا اس کا کچھ حصہ چھوڑنا پڑا۔ کے۔ آئی۔ پی کے تحت متاثرہ فرد یا خاندان کو مالی معاوضہ پانے کا حق نہیں تھا لیکن کامپنگ کے ان لوگوں سے جنہیں فائدہ پہنچا تھا، یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ متاثرہ افراد یا خاندانوں کے مسئلوں کا کوئی قابل قبول حل دریافت کریں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کامپنگ یا بستی کو کے۔ آئی۔ پی کے دائرے سے باہر کر دیا جاتا تھا۔

(۳) اگرچہ کے۔ آئی۔ پی مسکنوں کی بہتری کے لیے عوام کی شرکت پر مبنی پروگرام ہے تاہم اس پر عمل درآمد اوپر کی سطح سے نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ فیصلے لینے کا کام اور مالیات کی فراہمی کا انتظام اور نگرانی ہیرو منا یعنی شہری ترقیات کی کارپوریشن کرتی ہے۔ یہ کارپوریشن ۱۹۷۴ء میں ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے قائم کی گئی تھی۔ اس کے فرائض میں قومی اور بین الاقوامی ذرائع سے مالیات فراہم کرنا، منصوبے تیار کرنا اور ان پر عمل درآمد کے پروگرام بنانا اور رہائشی یونٹوں کو پٹے پر دینا یا فروخت کرنا شامل تھا۔ کے۔ آئی۔ پی پروگرام کی کچھ اور خصوصیات جن کی بدولت اسے کامیابی نصیب ہوئی یہ تھیں۔

(۱) کمیونٹی کے ارکان کے ساتھ گفت و شنید، معاہدہ اور فیصلے کمیونٹی کے روایتی ڈھانچے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی طرح کیے جاتے تھے جیسے کہ گاؤوں میں کیے جاتے ہیں۔ اس افراد اور خاندانوں کے درمیان رشتے استوار ہوتے تھے۔

(۲) ہاؤسنگ اسٹاک کو کبھی ختم نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

(۳) اصلاحات کو عمل میں لاتے ہوئے کافی لچکدار رویہ اختیار کیا جاتا تھا اور استفادہ کنندگان کی مالی پوزیشن کا دھیان رکھا جاتا تھا۔

(۴) گرد و نواح میں نئی رہائشی بستیاں بننے کے لیے وقت دیا جاتا تھا اور

(۵) سادہ اور ایسی ٹیکنالوجیاں استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی تھی جن سے لوگ آشنا ہوں۔

حالیہ رجحانات

این۔ سی۔ یو کی رپورٹ (۱۹۸۸ء صفحہ ۲۰۵ تا ۲۲۹) بھارت میں شہروں میں ہاؤسنگ کے مسئلے کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتائج اخذ کیے گئے تھے۔

(۱) بھارت کی کل شہری آبادی کا چوتھا حصہ یعنی ۵ کروڑ افراد "بہت سی محرومیوں کے ساتھ" زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۲) مکانات کی سالانہ اضافی مانگ کا صرف ۸ فیصد ہی باقاعدہ ہاؤسنگ سپلائی کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔

(۳) بھارت کے شہروں اور قصبات میں مکانات کے مسئلے میں گندی بستیوں کی اصلاح، پرانے مکانات کا تحفظ اور نئے مکانات کی تعمیر شامل ہیں۔

(۴) ۱۶ لاکھ اضافی مسکن تعمیر کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے ۶۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری درکار ہوگی۔ جن لوگوں کے لیے مکانات بنانا مقصود ہیں ان میں سے ۶۰ فیصد لوگ جو سماج کے غریب تر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مکانات خریدنے کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے این۔ سی۔ یو نے یہ رائے ظاہر کی کہ "شہروں کی گندی بستیوں اور فٹ پاتھوں پر گھٹیا اور غیر معیاری ماحول میں رہنے والے کروڑوں افراد کو ایک معقول مدت میں محدود مالی وسائل کے ساتھ رہائشی یونٹ مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ طریقوں کو ترک کیا جائے، تناظر میں قابل لحاظ تبدیلی لائی جائے اور مکانات کے طلبگار اور ان کی طرف

سے فیصلے کرنے والے دونوں ہی نئی قدریں اختیار کریں۔"

این سی یو نے بھارت کے شہروں میں مکانات کے مسئلے کے حل کے لیے گیارہ تبدیلیاں تجویز کیں۔ ان میں سے دس تبدیلیاں نئی تشریحات، نئے رشتوں، نئی کفایتوں اور نئی اہمیتوں وغیرہ کے بارے میں تھیں۔ این سی یو کے تجزیے کی طرح یہ تجاویز بھی نہایت جامع تھیں۔ ان میں کمیونٹی کی شرکت، مالیات رسیں، ادارہ جاتی تنظیم نو کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا تھا اور حیدرآباد اربن کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

مئی ۱۹۸۸ء کی قومی ہاؤسنگ پالیسی میں دوسری تجویزیں پیش کرنے کے ساتھ صاف طور پر یہ کہا گیا تھا کہ (۱) ہاؤسنگ ایجنسیوں کو مکانات تعمیر اور فراہم کرنے والی ایجنسیوں کا رول ادا کرنے کی بجائے سہولت فراہم کرنے والی ایجنسی کا رول ادا کرنا چاہیئے۔ (۲) استفادہ کنندگان کو مالی امداد مہیا کرنے اور انھیں دیئے گئے قرضوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے ایک قومی ہاؤسنگ بینک قائم کیا جانا چاہیئے۔ (۳) جنگی بیواؤں، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں جیسے کمزور طبقوں کے لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جانی چاہیئے اور (۴) موجودہ صدی کے اختتام یعنی سن دو ہزار تک فراہمیٔ مکانات کا تمام بقیہ کام مکمل کرلیا جانا چاہیئے۔

اگرچہ پالیسی دستاویز کی تمہید میں ہاؤسنگ اور سماجی و اقتصادی ترقی کے باہمی رشتے کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا تاہم ہاؤسنگ پالیسی میں تعمیر مکانات کے ذریعے روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور حوالگی وغیرہ کے پروگراموں کے ذریعے انسانی وسائل کی ترقی کی بات شامل نہیں کی گئی تھی۔

۱۹۹۲ء کی ہاؤسنگ پالیسی میں کہا گیا کہ ۱۹۸۸ء کی پالیسی راجیہ سبھا سے منظوری حاصل کرچکی ہے۔ نیز یہ کہ آٹھویں منصوبے کی تشکیل کے سلسلے میں ۱۹۸۸ء کی دستاویز کی وضاحت ضروری ہے۔

لہٰذا ۱۹۹۲ء کی پالیسی میں ۱۹۸۸ء کی پالیسی کی تجاویز کو ہی منعکس کیا گیا۔ اس میں ایجنسیوں کے امدادی رول پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ آئندہ دس برسوں میں بے مکان لوگوں کی تعداد کم کرنا ہوگی اور ہاؤسنگ کے شعبے میں صحت مند ماحول اور توانائی کی بچت کو یقینی بنانے کی خاطر ڈیولپ کی ہوئی مزید اراضی اور مالیات فراہم کرنی ہوں گی نیز مکانات کی تعمیر میں کم خرچ عمارتی سامان اور ٹیکنالوجی استعمال کرنی ہوں گی۔ پالیسی میں چودہ اجزاء کی وضاحت کی گئی اور ایک منصوبۂ عمل بھی پیش کیا گیا۔

منصوبۂ عمل کے شروع ہی میں واضح کیا گیا کہ ہاؤسنگ ایک ریاستی موضوع ہے اور ہاؤسنگ پروگراموں کو مقامی سطح پر مقامی اداروں اور شہریوں کے گروپوں کی سرگرم شرکت سے مکمل کرنا ہوگا۔ منصوبہ عمل میں ایک زیادہ اہم بات یہ کہی گئی کہ مکانات کی ضرورتوں کا اندازہ دیہی اور شہری علاقوں کے لیے الگ الگ اور مقامی لوگوں کی مالی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے لگایا جانا چاہیئے۔

نتائج

موجودہ صورت حال میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ کچھ دہائیوں میں بڑے شہروں میں رہائشی یونٹوں کی اضافی مانگ ہر سال بڑھتی ہی جائے گی اور اسے دبایا یا روکنا ناممکن ہوگا۔ نیز یہ کہ شہری علاقوں میں مکانات کی سپلائی کو صرف عوام یا کمیونٹی کی شرکت سے ہی بڑھایا جاسکے گا۔

ہاؤسنگ کے مسئلے کے حل کی کوششوں میں عوام کی شرکت کی اہمیت بھارت میں ۱۹۵۰ء سے ہی تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ پھر بھی پبلک سیکٹر کی ایجنسیاں ابھی حال تک اس اصول کو بڑے پیمانے پر زیر عمل نہیں لاسکیں۔ اس پر ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے خاص کر جب ہم حیدرآباد میں اربن کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی کامیابی کو دیکھتے ہیں جو بیس سال پہلے حاصل کرلی گئی تھی۔

بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ حیدرآباد کا اربن کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کو (یو۔ سی۔ ڈی) سری لنکا کا ملین ہاؤسز پروگرام (ایم۔ ایچ۔ پی) اور انڈونیشیا کا کامپنگ امپرومنٹ پروگرام (کے۔ آئی۔ پی) ایسے اغراض و مقاصد اور نتائج کے اعتبار سے ایک ہی جیسے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یو۔ سی۔ ڈی اور کے۔ آئی۔ پی پروگراموں میں ترقیاتی عمل اوپر سے نیچے کی طرف چلتا تھا اور ایم۔ ایچ۔ پی میں نیچے سے اوپر کی طرف۔ یو۔ سی۔ ڈی اور ایم۔ ایچ۔ پی کا فلسفہ ایک ہی ہے۔ ان دونوں پروگراموں کا آغاز یہ سمجھتے ہوئے کیا گیا کہ غریب سے غریب شہری بھی اپنے رہن سہن کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال سکتے ہیں جو تربیت یافتہ پیشہ ور ماہرین کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔

مئی ۱۹۹۲ء کی قومی ہاؤسنگ پالیسی میں ملک کے دیہی اور شہری علاقوں میں مکانات کی بھاری مانگ کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کو دوہرایا گیا ہے کہ بھارتی آئین کے تحت "ہاؤسنگ ایک ریاستی موضوع ہے اور یہ اچھا ہی ہے کیونکہ ملک کی مختلف ریاستوں میں ہاؤسنگ کی ضرورتوں اور ہاؤسنگ کے لیے مخصوص کی جانے والی مالیات کا حجم مختلف ہے۔"

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ متذکرہ بالا دستاویزات پر پارلیمنٹ کے کسی قانون کی مہر نہیں ہے اس لیے انھیں سرکاری پالیسی کی دستاویزات نہیں کہا جاسکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی بھارت میں کوئی میٹرو پالیٹن ہاؤسنگ پالیسی تو کیا کوئی بھی ہاؤسنگ پالیسی ہی نہیں ہے جسے متعلقہ ایجنسیاں ریاستی اور مقامی حکومتیں زیر عمل لائیں۔

جیسا کہ سبھی پر آشکارا ہے قومی ترقی کو معقول رفتار سے جاری رکھنے کے لیے بڑے شہروں میں مکانات کی مانگ کو حقیقت پسندانہ انداز میں جلد از جلد پورا کرنا ضروری ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ ہاؤسنگ انفارمیشن بینک قائم کیا جائے جہاں سے تمام ریاستیں اور مرکزی انتظام کے علاقے ملک کے تمام خطوں اور غیر ممالک کے فراہمیٔ مکانات کے تجربات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرکے قومی، ریاستی اور مقامی سطح کی معقول ہاؤسنگ پالیسیاں وضع کرسکیں۔ اگر تعمیر ... ہی کو ایک ایسا عمل سمجھا جائے جس کے نتیجے میں ... قتصادی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوتی ... ں اور بہتری آتی ہے تو ہمیں بڑے شہروں میں ہاؤ... پر کافی توجہ دینی ہوگی۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ بڑ... ں میں ہاؤسنگ کا مسئلہ حل کرنے سے لاکھوں لو... پیداواری اور کارد باری زندگی شروع کرنے میں مد... ے گی اور جب تعمیر و فراہمیٔ مکانات کا عمل وسیع پیمانے پر شروع کیا جائے گا تو وہ ایک فلاحی شعبے کی بجائے اقتصادی شعبے کا کام کرے گا۔

اس طرح میٹرو پالیٹن شہروں میں ہاؤسنگ کم از کم آئندہ کچھ دہائیوں کے لیے اہم ترین گھریلو صنعت بن سکتی ہے۔

توضیحات

(۱) این۔ سی۔ یو کی رپورٹ (شائع شدہ ۱۹۸۸ء)۔

باقی صفحہ ۲ پر

پنچایتی راج — عوام کے ذریعہ عوام کے لیے ایک نظام

معاشی اور سماجی زندگی میں مستقل بنیاد پر معیاری تبدیلیوں کو اسی صورت میں بہتر طور پر یقینی بنایا جا سکتا ہے جب چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی کے کام میں ان لوگوں کو شامل کیا جائے، جن کے لیے منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ مقامی وسائل سے ان کی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں اقدامات کرنے [illegible] ترقی کے [illegible] کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۲ء میں آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کے قانون کے تحت پنچایتی راج یونٹوں کے ادارہ جاتی انتظام کے لیے مضبوط اور موثر بنیاد فراہم کی گئی ہے۔ کرناٹک، اڑیسہ، بہار، گجرات اور تری پورہ کی ریاستی حکومتیں اس سلسلے میں پہلے ہی مناسب قانون وضع کر چکی ہیں۔ اس طرح سے نئی روش کو متعارف کرنے والا یہ نظام اقتصادی منصوبہ بندی اور سماجی سرگرمی میں گاؤں کے غریب لوگوں اور خواتین کے اہم کردار کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔

منصوبہ بندی کے عمل کی شروعات سے ہی چھوٹی سطح پر منصوبہ بندی کا نظریہ ہمیشہ ہی کارفرما رہا ہے۔ ترقی و فروغ کا کثیر پہلوئی کام انجام دینے کے لیے چھٹے دہے کی ابتدا میں اجتماعی ترقیاتی پروگراموں کی تشکیل اور قومی توسیعی بلاکوں کا قیام اس سمت میں پہلا منظم قدم تھا۔ اس کے بعد سے ایک منصوبے میں ضلع اور بلاک کو منصوبہ بندی کا بنیادی یونٹ قرار دیتے ہوئے ترقیاتی حکمتِ عملیوں پر زور دیا گیا ہے۔

ان حکمت عملیوں کے مطابق، بلاک کی سطح کے منصوبوں میں دائرہ کار میں آنے والے گاؤوں کی تمام تر سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں کو شامل کرتے ہوئے [illegible] کے ساتھ شامل کرنے اور مقامی طور سے اقدامات کرنے پر زور دیا جائے گا۔ روش سے بالکل الگ ہٹ کر [illegible]

منصوبے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت ترقیات کے سلسلے میں صرف سہولت بہم پہنچانے والا کردار ادا کر سکتی ہے۔ عوام کو ہی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کرنا ہے۔

عوام کی اس طرح کی موثر شرکت کو پنچایتی راج اداروں (پی آر آئی) کے ذریعے یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کے قانون ۱۹۹۲ء میں گاؤں کی سطح پر، درمیانہ سطح پر اور ضلعوں کی سطح پر بااختیار اور جوابدہ پنچایتوں کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔

تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے لیے، ۲۰ لاکھ سے کم کی آبادی والے علاقوں کو چھوڑ کر، ایک تین سطحی نظام ہوگا۔ اس وقت ۱۶ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں تین سطحی نظام ہے۔ جہاں تک گاؤں اور درمیانہ سطح کی پنچایتوں کا تعلق ہے، ریاستوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے مقامی ڈھانچے اور ضروریات کے لحاظ سے اقدامات کریں۔ ریاستی حکومتوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان اداروں کو مناسب اختیارات دیں گی، ان پر ذمہ داریاں عائد کریں گی اور انھیں مالیہ فراہم کریں گی۔

اس قانون کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پنچایتوں کو انتخابی حلقوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور ان کے لیے نشستوں کو اس طرح سے مختص کیا گیا ہے کہ مختلف انتخابی حلقوں کی آبادی اور نشستوں کی تعداد کا تناسب جہاں تک قابلِ عمل ہے، تمام پنچایتوں میں یکساں رہے گا۔ قانون میں خواتین اور کمزور طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب ریزرویشن کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

پنچایت کے حلقے میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی جتنی آبادی ہے، اُسی تناسب میں ہر ایک پنچایت میں ان کے لیے لازمی ریزرویشن کا اہتمام ہے۔ درج فہرست ذاتوں و درج فہرست قبیلوں کے لیے مخصوص کردہ تمام نشستوں میں سے ایک تہائی نشستیں انہی زمروں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے مخصوص کرنی ہوں گی۔ یہ نشستیں باری باری سے مختلف انتخابی حلقوں کے لیے مخصوص کی جا سکتی ہیں اور ریاستیں اس سلسلے میں خود ایسا اصول مرتب کر سکتی ہیں۔ کل نشستوں میں سے کم سے کم ایک تہائی نشستوں پر خواتین کے لیے ریزرویشن بھی کیا گیا ہے۔

متعدد دفعات کے ذریعے پنچایتوں کو اختیارات دئے گئے ہیں تاکہ وہ مقامی حکومت کے اداروں کے طور پر کام کر سکیں۔ قانون کے نفاذ سے ایک سال کے اندر اندر ایک ریاستی مالی کمیشن تشکیل دیا جائے گا تاکہ پنچایتوں کی مالی صورتِ حال کا جائزہ لیا جا سکے۔ یہ کمیشن ریاستوں اور پنچایتوں کے درمیان نیز مختلف سطحوں پر پنچایتوں کے درمیان ٹیکس، محصولات اور چنگیوں سے ہونے والی کل آمدنی کی تقسیم کے اصولوں کی سفارش کرے گا۔

انتخابی فہرستوں کی تیاری کے کام کی نگرانی، ہدایت اور کنٹرول کے لیے نیز تمام پنچایتوں کے انتخابات کرانے کے لیے علیحدہ سے ایک ریاستی انتخابی کمیشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔

چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی کی کامیابی اور نچلی سطح پر عوام کی شرکت کا کافی حد تک انحصار ان کی تربیت پر ہے۔ مرکزی حکومت نے تین اہم اداروں کی نشاندہی کی ہے، یعنی لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری، دیہی ترقیات کا قومی ادارہ، حیدرآباد اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، دہلی۔ یہ ادارے تربیت دینے والے افراد کی تربیت کے لیے معیار وضع کرتے ہیں، جس کے بعد یہ معیار ریاستوں کو دستیاب کرا دئے

باقی صـ۲۳ پر

سی۔ کے۔ جعفر شریف

کثیر طریقہ جاتی ٹرانسپورٹ

بھارت میں ۱۸۵۳ء میں پہلی بار ریلوے کی شروعات ہوئی تھی۔ تب سے ہی ریلوے کی وجہ سے حقیقی معنوں میں ملک کی صنعتی اور اقتصادی ترقی و فروغ کی سمت پیش رفت ہوئی ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں کو جلد ہی ایک اہم مقام حاصل ہو گیا تھا، جہاں سے تجارت اور کاروبار کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ابتدا میں ایک وقت میں ریل کے ذریعے مال کا لدان اور اس کی نقل و حمل ایک اسٹیشن سے چند مال کے ڈبوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ریل ٹرانسپورٹ میں بڑے پیمانے پر تیزی سے بڑھتی ہوئی نقل و حمل کی وجہ سے کام کاج کے اخراجات کو کنٹرول میں رکھنے کی غرض سے زیادہ صلاحیت والے مال ڈبے، زیادہ طاقتور ڈیزل اور بجلی انجن اور بڑے ٹرمینل ضروری ہو گئے۔ ان تکنیکی بہتریوں کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ضرورت تھی۔ بڑی تعداد میں چھوٹے مال ٹرمینلوں کو چلانا اور اُن کے لیے ستنگ مال گاڑیاں فراہم کرنا ریلوے کے لیے قطعی منافع بخش نہیں تھا۔ نتیجتاً بڑی تعداد میں ایسے چھوٹے مال گوداموں کو بند کرنا پڑا تھا، جو منافع بخش نہیں تھے۔

چھوٹے پیمانے پر مال کی اوسط نقل و حمل رفتہ رفتہ ریل ٹرانسپورٹ [illegible] ٹرک ٹرانسپورٹ سے کی جانے لگی۔ یہ نقل و حمل لوگوں کو زیادہ باسہولت پر طویل مدتی کاروباری نقطۂ نظر سے زیادہ گھاٹے کا معلوم ہوئی۔ صارفین کی ترجیح میں یہ تبدیلی زیادہ قیمت والی اشیاء کے معاملے میں زیادہ نمایاں رہی ہے، جن کے لیے معیاری سروسز کی ضرورت ہے اور جن کے لیے سڑک ٹرانسپورٹ کے زیادہ اخراجات برداشت کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال نہ تو بھارتی ریلوے کے لیے اور نہ ہی مجموعی طور سے معیشت کے لیے سازگار ہے۔

سب سے پہلے ریلوے کو زیادہ منافع والی اشیاء ٹریفک کا نقصان ہوا، جس کے نتیجے میں مالیہ کی وصولی میں کمی واقع ہوئی اور ریلوے نظام کی مزید ترقی و فروغ کے سلسلے میں سرمایہ کاری متاثر ہوئی۔ زیادہ سڑک ٹرانسپورٹ کا نتیجہ ڈیزل تیل کی زیادہ کھپت ہے، جو بہت زیادہ اخراجات کر کے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ سرسری تخمینوں کے مطابق ایک ارب ٹن کلومیٹر (بی ٹی کے ایم) مال کی نقل و حمل کے لیے سڑک ٹرانسپورٹ کے ذریعے ۳۵۰ لاکھ لیٹر ڈیزل تیل کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ ریل ٹرانسپورٹ کے ذریعے صرف ۵۰ لاکھ لیٹر تیل درکار ہوتا ہے۔ ۲۰۷ کلومیٹر کے اوسط لدان کے ساتھ ایک ارب ٹن کلومیٹر مال کی نقل و حمل سے مراد اندازاً یومیہ صرف ۱۴ لاکھ ٹن مال یا تقریباً دو ریل گاڑیوں کا لدان ہے۔

سڑک ٹرانسپورٹ کی وجہ سے ڈیزل تیل جلتا ہے، جس کی وجہ سے ماحولیاتی آلودگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یکساں مقدار میں مال کی نقل و حمل کی غرض سے ایک ریلوے لائن کے لیے درکار زمین ایک سڑک کے ذریعے نقل و حمل کے لیے درکار زمین کے مقابلے میں کہیں زیادہ کم ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا امور اور اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کنٹینروں کے ذریعے چھوٹے پیمانے پر عام مال کی نقل و حمل کے سلسلے میں بین الاقوامی رجحانات میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے، بھارتی ریلوے نے کثیر طریقہ جاتی نقل و حمل کے شعبے میں قدم رکھا ہے۔ اس کثیر طریقہ جاتی نقل و حمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے نقل و حمل کے ہر ایک [illegible] طریقے کے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو بہتر سروس فراہم کی جا سکتی ہے۔

ابتدا میں بھارتی ریلوے نے کنٹینروں کی نقل و حمل کے لیے خود اپنی سہولیات کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن جلد ہی یہ محسوس کیا گیا کہ کثیر طریقہ جاتی نقل و حمل کی ترقی و فروغ کے لیے ایک خصوصی ادارے کی ضرورت ہو گی۔ چنانچہ بھارتی ریلوے نے مارچ ۱۹۸۸ء میں بھارت کی کنٹینر کارپوریشن (کونکور) قائم کی۔ کونکور نے نومبر ۱۹۸۹ء سے کام کرنا شروع کر دیا اور تب سے ہی یہ کارپوریشن ملک بھر میں ایسے نظام کی توسیع کر رہی ہے تاکہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ بھی، جنہیں ایسے علاقے میں ریلوے اسٹیشن یا بندرگاہ کی سہولت دستیاب نہیں ہے، کثیر طریقہ جاتی ٹرانسپورٹ کے فوائد حاصل کر سکیں۔

اس وقت کونکور کے ۱۹ ٹرمینل ہیں، جن میں سے گیارہ ٹرمینل اِن لینڈ کنٹینر ڈپو (آئی سی ڈی) ہیں جہاں برآمدات اور درآمدات کے سلسلے میں کسٹمز کے کلیئرنس سمیت تمام سہولیات فراہم ہیں۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران کونکور کے ٹرمینلوں سے کی گئی برآمدات کی مالیت ۳۱۶۰ کروڑ روپے تھی۔ اس کے علاوہ کونکور اندرون ملک نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی ضروریات بھی پوری کر رہا ہے۔

بین الاقوامی ٹریفک کی نقل و حمل کنٹینروں میں کی جاتی ہے، جو ۲۰ فٹ لمبے ہوتے ہیں اور جن کی مال ڈھونے کی صلاحیت فی کنٹینر ۲۰ ٹن ہے۔ اندرون ملک ٹریفک کی نقل و حمل چھوٹے کنٹینروں میں کی جاتی ہے، جن کی مال ڈھونے کی صلاحیت فی کنٹینر ۵ ٹن ہے۔ اندرون ملک ٹریفک کی نقل و حمل کے لیے بین الاقوامی کنٹینروں کا بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

۹۰-۱۹۸۹ء میں کل ٹریفک ۶۱۱۴۷ یونٹ تھا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ ٹریفک دوگنے سے بھی زیادہ یعنی ۱۵۵۱۵ یونٹ ہو گیا۔ اس میں سے ۹۰-۱۹۸۹ء میں درآمداتی اور برآمداتی ٹریفک ۵۲۰۱۷ یونٹ تھا اور اندرون ملک ٹریفک ۹۷۶ یونٹ تھا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں درآمداتی اور برآمداتی ٹریفک بڑھ کر ۱۲۲۶۴ یونٹ

مرکزی وزیر ریلویز

ہوگیا اور اندرون ملک ٹریفک بڑھ کر ۳۲۹۴ یونٹ تک پہنچ گیا۔ کو ٹریفک کا اندازہ ۲۰ فٹ مساوی یونٹوں میں لگایا جاتا ہے۔

اہم درآمدی اور برآمدی اشیا میں، جن کی نقل و حمل کی جا رہی ہے، الیکٹرونک کا ساز و سامان، دھات کی چھیلن، کپڑا، تانبے کا ساز و سامان، چائے، کافی، تمباکو، کاجو، چاول شامل ہیں۔ اندرون ملک شعبے میں جن اشیا کی نقل و حمل کی جا رہی ہے ان میں مشینری، فاسل جیسے پرزے، گھریلو ساز و سامان، چاول، کیمیاوی کھادیں، سیمنٹ، تمباکو اور مختلف اشیائے صرف شامل ہیں۔

کنٹینروں کے ذریعے نقل و حمل سے مساوی طور سے مال تیار کرنے والوں، نقل و حمل کرنے والوں اور صارفین کو فائدہ ہوتا ہے۔ مال تیار کرنے والے لوگ خود اپنی نگرانی میں کنٹینر میں اپنے ہی احاطے میں اپنے مال کا لدان کر سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو حفاظت کے لیے کنٹینر پر خود اپنا تالا لگا سکتے ہیں۔

مال تیار کرنے والے اور مال فروخت کرنے والے دونوں کو ریل کے ذریعے مال کی نقل و حمل کے کم اخراجات کرنے پڑتے ہیں اور سڑک کے ذریعے مال کی نقل و حمل کے مقابلے میں مال کی حفاظت بھی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو پیکنگ کی کم لاگت کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ انھیں بے احتیاطی، چوری، بارش اور آگ لگ جانے کی وجہ سے مال کی نقل و حمل کے دوران ہونے والا نقصان بھی بھگتنا نہیں پڑتا ہے۔ اس طرح مال تیار کرنے والے لوگوں اور مال فروخت کرنے والے لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ فیکٹری سے روانہ کیا ہوا مال پوری طرح صحیح سالم پہنچے گی۔

ان لینڈ کنٹینر ڈپو برآمد کنندوں اور درآمد کنندوں کو ایک اور بڑا فائدہ یہ پہنچاتے ہیں کہ تمام کام کاج اور ضابطہ پوریاں یعنی لدان، مہر بندی، کسٹمز کلیرنس، دستاویز بندی وغیرہ ایک ہی جگہ پر انجام دی جاتی ہیں اور انھیں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کے لیے مزید لوگوں کو ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

ٹرانسپورٹ کو اپنی سرمایہ کاری سے زیادہ موثر طور سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ مال لادنے اور اتارنے کے لیے صرف کنٹینروں کو روکنا پڑتا ہے جب کہ رولنگ اسٹاک اگلے ٹریفک کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔ ریلوے کے معاملے میں کثیر طریقہ جاتی ٹرانسپورٹ سے بہت زیادہ سرمایہ کاری کی بھی بچت ہوتی ہے، جس کی ضرورت ناکافی ٹریفک والے دور دراز علاقوں میں نئی ریلوے لائنیں بچھانے کے سلسلے میں پڑتی ہے اور اس طرح اس سے ان دور دراز علاقوں کے لوگ ریل ٹرانسپورٹ کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کنٹینروں پر مبنی ٹریفک کی وجہ سے مال کے نقصان کے سلسلے میں ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں مختلف آپریٹروں نیز مال کی نقل و حمل کرنے والے لوگوں اور صارفین کے درمیان جھگڑوں میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سب سے قطعی اور سب سے زیادہ فائدہ عام آدمی کو ہوتا ہے، جسے کثیر طریقہ جاتی ٹرانسپورٹ کی وجہ سے کم قیمت پر اعلیٰ معیاری سامان ملتا ہے۔

معیشت کو عالمی سطح پر لے جانے اور بڑھتی ہوئی برآمدات پر توجہ دینے نیز غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت کرنے سے زیادہ قیمتی مال کی نقل و حمل میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔ بھارتی ریلوے بڑھتے ہوئے کثیر طریقہ جاتی ٹرانسپورٹ کے بین الاقوامی رجحانات کے ساتھ ساتھ چلنے پر اس بات کو یقینی بنانے کے لیے پوری طرح سے تیار ہے کہ ٹرانسپورٹ کا سب سے زیادہ کفایتی اور ماحولیات کے لحاظ سے سازگار طریقہ یعنی ریل ٹرانسپورٹ ملک کے تمام حصوں میں عوام کو دستیاب ہو جائے۔ ●

بقیہ: بڑے شہروں میں ہاؤسنگ کا مسئلہ: جیند کھادیر

(جلد ۲، صفحہ ۹ ۲) نیشنل بلڈنگ آرگنائزیشن کے معیارات کے مطابق تعمیر مکانات کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے فی مربع میٹر تعمیر کا خرچ ۱۲۰۰ روپے فرض کیا گیا تھا۔ آج کل کی قیمتوں کے حساب سے یہ اخراجات ۲۰۰۰ روپے فی مربع میٹر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اگر ہر رہائشی یونٹ کا رقبہ ۲۰ مربع میٹر سمجھا جائے تو ۲۵ء۱۲ لاکھ رہائشی یونٹ بنوانے کے لیے ۵۰۰ کروڑ روپے کا سرمایہ درکار ہوگا۔ (۲۵ء۱۲ لاکھ × ۲۰ مربع میٹر × ۲۰۰۰ روپے = ۵ کروڑ روپے) اس میں زمین کی قیمت بھی شامل ہے۔

(۲) اینٹ، سیمنٹ، مارٹر وغیرہ سے بننے والی ایک پختہ عمارت کی زندگی ۱۰۰ سال سمجھی جا سکتی ہے بشرطیکہ تعمیر مقررہ تصریحات کے مطابق کی جائے اور عمدہ قسم کا مال مسالہ استعمال کیا جائے۔ لیکن چونکہ آج کل عام طور پر استعمال کی جانے والی تصریحات اور مال مسالہ اوسط قسم کا ہوتا ہے اس لیے پختہ مکانوں کی زندگی اوسطاً ۵۰ سال فرض کرنے کی سفارش کی گئی۔ ●

بھارت میں پن بجلی ترقیات

مرکزی بجلی اتھارٹی (سی ای اے) نے ملک میں چھوٹے پن بجلی مضمرات کا منظم جائزہ لینے کا کام شروع کیا ہے اور نو ریاستوں کے لیے ابتدائی مطالعات مکمل کر لیے ہیں۔ عام تاثر کے برخلاف چھوٹے پن بجلی مضمرات ۱۰۰۰۰ میگھاواٹ (تنصیبی صلاحیت) کے آس پاس ہونے کی توقع ہے۔

ایں سی ڈی کے ایما پر مرکزی حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی ہے جس میں منصوبہ بندی کمیشن، وزارت خزانہ، وزارت بجلی اور سی ای اے سکریٹری کی سطح پر شامل ہیں۔ انھیں نویں پنج سالہ منصوبے کے آخر تک پن بجلی کی پیداوار کا تناسب ۴۰ فیصد تک لے جانے کے لیے ذرائع و وسائل بہم پہنچانے کے طریقوں کا تعین کرنا ہے۔

سی ای اے نے ایسی ہی اسکیموں کی نشاندہی کر کے انھیں منظوری دی ہے جن پر فوری طور پر عملدرآمد ہو جانا چاہیے تاکہ مذکورہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

ملک میں ۱۸۲ پن بجلی اسٹیشن ایسے ہیں جن کی ۵۴۴ جنریٹنگ اکائیاں ہیں اور ان کی تنصیبی صلاحیت ۳ میگھاواٹ سے زیادہ ہے۔ ان اسٹیشنوں کی مجموعی صلاحیت ۱۹۴۸۷٫۵ میگھاواٹ ہے۔ دس زیر زمین بجلی اسٹیشن ایسے ہیں جن کی مجموعی تنصیبی صلاحیت ۲۹۳۰ میگھاواٹ ہے۔ ۱۳ زیر زمین بجلی اسٹیشن زیر تعمیر ہیں۔ ان کی مجموعی تنصیبی صلاحیت ۸۸۸۰ میگھاواٹ ہے۔

پن بجلی پیدا کرنے والی اکائیوں کی کارکردگی اس امر کے باوجود بھی لگاتار بہت اچھی رہی ہے کہ ان میں سے کئی کافی پرانی ہو گئی ہیں۔ اور اپنی متوقع کارآمد مدت پوری کر چکی ہیں۔ پن بجلی پیداوار حالیہ برسوں میں مقررہ نشانوں سے پانچ سے دس فیصد تک تجاوز کرتی رہی ہے اور اس کی وجہ سے بجلی کے بحران کے دور میں خصوصاً گرڈ کے فیل ہو جانے پر اس سے بڑی مدد ملی ہے۔ ●

اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا کی پیش رفت

اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا (سیل) کی کارکردگی میں مختلف محاذوں پر یعنی پیداواریت، مارکٹنگ، منافع اور کاروبار کے لحاظ سے نمایاں بہتری آئی ہے اور اس طرح اس نے حالیہ برسوں میں پیش رفت کے اپنے سفر میں متعدد سنگ میل پار کیے ہیں۔ سرکاری دائرہ کار کے اس شعبے نے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱۱ کروڑ روپے سے زیادہ کا کاروبار کر کے ملک کے سب سے بڑے فولاد ساز ادارے کی حیثیت سے اپنی صورت حال مستحکم کی ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں قدرے کساد بازاری کے رجحان کے باوجود متعدد اہم فیصلوں کی وجہ سے فولاد سازی کی صنعت اور خاص طور سے سیل کی ترقی و فروغ میں بہت مدد ملی ہے۔

فولاد سازی کی صنعت کے سلسلے میں لازمی لائسنس کا معاملہ ختم کر دیا گیا ہے اور اب غیر سرکاری شعبہ چند کی کچھ پابندیوں کی شرط کے ساتھ فولاد ساز کارخانے قائم کرنے کے لیے آزاد ہے۔ مزید نرمی اور آسانی کے اقدامات کے ایک حصے کے طور پر حکومت نے کچھ ترجیحی شعبوں کے لیے چند تحفظات کی شرط کے ساتھ قیمتوں اور تقسیم کا ضابطہ ختم کیا ہے۔ فولاد اور لوہے کو کسی غیر ملکی زر سرمایہ کاری کے لیے اعلیٰ ترجیحی زمروں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔

آٹھویں منصوبے کے اختتام تک ۰۹ء۲۴ لاکھ ٹن فولاد کی تخمینہ شدہ پیداوار کے مقابلے میں ۲۵ء۲ لاکھ ٹن تیار فولاد کی مانگ کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ منصوبے میں فولاد ساز شعبے کے اخراجات کا حصہ سرکاری شعبے کے کل اخراجات کا تقریباً تین فیصد ہے اور سرکاری شعبے کے فولاد ساز کارخانے فولاد سازی کی صنعت میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

سیل بھلائی، بوکارو، درگاپور، رورکیلا اور برن پور میں پانچ مربوط فولاد ساز کارخانے چلا رہا ہے۔ اس نے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۳۲۰ء۱۱ کروڑ روپے کا کاروبار کیا ہے۔ کاروبار میں یہ اضافہ مختلف عناصر کی وجہ سے ہوا ہے، جن میں زیادہ فروخت، بہتر پیداوار، ایکسائز محصول جیسے پیداواری محصولات سمیت لوہے اور فولاد کی قیمتوں کی نظر ثانی اور ری رولنگ کے سامان کی برآمدات کے امدادی فنڈ کے لیے تعاون شامل ہیں۔

حال ہی میں کنٹرول کے خاتمے اور نرم پالیسیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، متعدد نئی مصنوعات کی شروعات کر کے مارکیٹ پر مبنی ایک پروڈکٹ مکس شروع کیا گیا تھا۔ صنعت میں کساد بازاری کے باوجود سیل نے ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران اپنی اندرون ملک فروخت اور برآمدات میں اضافہ کیا ہے۔ سیل نے نئی منڈیوں میں قدم جمائے ہیں، اور مختلف ممالک کے لیے ۵۴۷ء۲ ٹن فولاد کی برآمدات کی ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے لیے سیل نے بین الاقوامی منڈی میں کچھ نئے زمرے شروع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ توقع ہے کہ موجودہ سال میں کل برآمدات دوگنی ہو جائے گی۔ اپریل تا نومبر ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ۴۶۴ ٹن فولاد کی برآمدات کی گئی ہے۔

سیل نے اب اپنی توجہ منافع کی طرف مبذول کر دی ہے۔ اس نے اپریل سے ستمبر ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ۴ء۶۲ کروڑ روپے کا منافع کمایا ہے، جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کی اسی مدت کے دوران اس نے ۶۷ء۵۲ کروڑ روپے کا منافع کمایا تھا۔ سیل کے ریکارڈ منافع کی کارکردگی کی بنیادی وجہ تکنیکی و اقتصادی صلاحیتوں میں نمایاں بہتری اور خاص طور سے کوئلے اور پیٹرو ایندھن کی کھپت میں کمی ہے۔

بین الاقوامی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے سیل نے درگاپور اور رورکیلا میں اپنے کارخانوں کی جدید کاری کا ایک زبردست پروگرام بنایا ہے۔ اس سے کم لاگت پر پروسیس اور مصنوعات کے معیار میں بہتری کے ساتھ ساتھ منافع اور پیداواریت میں بھی بہتری آئے گی۔ ●

زلزلے — حادثوں کی روک تھام

پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ درج ذیل سادہ سے حفظ ماتقدم کے طور طریقے اختیار کر کے جراحتیں کم کی جا سکتی ہیں اور زندگیاں بچ سکتی ہیں۔

- بجلی کے ننگے تار نہ چھوئیں۔ بجلی کے کرنٹ لگنے سے ہونے والی اموات سے بچنے کے لیے (مین) بجلی سوئچ آف کر دیں۔
- متاثرہ علاقے میں پانی کا جماؤ روکنے کے لیے فوری طور پر پانی کا نل / مین پائپ لائن بند کر دیں۔
- کوکنگ گیس کنکشن فوری طور پر سوئچ آف کر دیں۔
- اگر ضرورت ہو تو ٹارچ کا استعمال کریں۔
- ملبے کے ڈھیر پر نہ چلیں نہ اسے کچلیں تاکہ نیچے پھنسے ہوئے لوگوں کو چوٹ نہ لگے۔
- ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کا پتہ لگانے کی کوشش کریں۔

پہلے مکمل خاموشی اختیار کریں۔ پھر الگ الگ مقامات سے زور سے آواز دیں۔ ملبے میں نیچے تک گئی ہوئی دھات کی چیزوں کو کھٹکھٹائیں، اگر دستیاب ہو تو لاؤڈ اسپیکر کا بھی استعمال کریں۔

- ملبے میں پھنسے ہوئے فرد کا پتہ لگانے کے بعد اسے فوری طبی امداد فراہم کریں یا قریب ترین جگہ پر منتقل کر دیں جہاں طبی نگہداشت دستیاب ہو سکے۔ آنکھ، ناک سے دھول، مٹی، گرد و غبار صاف کر دیں۔ بہت زور سے نہ ملیں۔ مجروح شخص کو اٹھاتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کریں۔ اس امر کو یقینی بنائیں کہ اس کا سر، گردن وغیرہ ایک ہی زاویے میں رہیں ورنہ اس سے جراحت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

ملبے کو اس وقت تک نہ ہٹائیں جب تک اچھی طرح اس امر کا اطمینان نہ کر لیں کہ اس سے عمارت مزید منہدم نہ ہو گی۔ ●

کے۔ جی۔ جوگلیکر

میڈیا کی انقلابی پیش رفت اور اس کے سماجی و معاشی اثرات

اقوام متحدہ کے تعلیم و ثقافت سے متعلق دلی کمیشن اور بھارت سرکار کے پریس انفارمیشن بیورو کے زیر اہتمام گذشتہ اکتوبر میں رابطہ عامہ کے نئے ماحول کے بارے میں ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں بھارت اور امریکہ کے طباعتی اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے ماہرین نے اس بارے میں اظہار خیال کیا کہ اس صدی کے بعد نئے ذرائع ابلاغ کی کیا صورت ہو گی۔ مذاکرہ نے تین اطلاعوں میں مستقبل میں اخبارات کی شکل و صورت، الیکٹرانک ذرائع کی مدد سے پیش کیے جانے والے طباعتی میڈیا کی اشکال، ترقی پذیر ممالک میں میڈیا کے استعمال، تحقیقاتی صحافت کی صلاحیتوں اور خطرات اور ضوابط کی ازسر نو ترتیب پر بحث کی گئی۔

انیسویں صدی دنیا میں صنعتی انقلاب لائی تھی۔ بیسویں صدی اطلاعات کے شعبے میں انقلاب لائی ہے۔ الیکٹرانکس نے رابطہ عامہ کی جس ٹکنالوجی تیار کرنے میں بہت مدد کی ہے اس سے بھارت جیسے ترقی پذیر ملک کے مقابلتاً چھوٹے اخبارات کے لیے بھی کمپیوٹروں، فیکس مشینوں، آفسیٹ پرنٹنگ پریسوں وغیرہ کی مدد سے کئی جگہوں سے بیک وقت کئی کئی ایڈیشن نکالنا ممکن ہو گیا ہے۔ اخبارات کی صورت بھی پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا میں تو اور بھی نمایاں اور وسیع تبدیلی واقع ہوئی ہے ساری دنیا اب ایک الیکٹرانک نیٹ ورک کے دائرے میں آ گئی ہے۔ تازہ ترین خبریں، تفصیلات، اعداد و شمار اور دیگر اطلاعات روشنی سے بھی زیادہ تیز رفتار سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں بلا روک ٹوک پہنچنے لگی ہیں جس سے سیاسی سرحدیں اور خبروں کی اشاعت سے متعلق قواعد و ضوابط بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ریڈیو اور اس سے بھی بڑھ کر کیبل نیٹ ورک سے پیش کیے جانے والے ٹیلی ویژن پروگرام لوگوں کو ایسی باتیں بتاتے اور دکھاتے ہیں جنہیں شاید بعض حکومتیں خفیہ رکھنا پسند کریں۔

مذاکرہ میں حصہ لینے والے امریکی ماہرین نے مستقبل میں آنے والی چیزوں کی ایک دلکش تصویر پیش کی۔ اب کسی فیکٹری یا صنعتی ادارے کے ایک اعلیٰ منتظم کے لیے اپنے چھوٹے سے کمپیوٹر کے پینل پر تقریباً ایک سو اخبارات میں سے اپنی دلچسپی کے آئٹم مختصر وقت میں دیکھنا ممکن ہو سکے گا اور جو آئٹم بعد میں کام آنے والے ہوں گے انہیں کمپیوٹر کی میموری (یاد داشت) میں محفوظ رکھا جا سکے گا۔ سیاسیات، معاشیات، سائنس، ٹکنالوجی، کھیلوں اور قدرتی آفات کی خبریں محض ایک بٹن دبا کر اسکرین پر دیکھی جا سکیں گی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سبھی سہولیات ہمیں آئندہ تین سالوں میں میسر آ جائیں گی۔ مذاکرہ میں اس بارے میں اظہار خیال بہت کیا گیا اور شاید دو دن کی نشستوں میں کیا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ صنعتِ اطلاعات میں اس انقلاب کا بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک پر کیا اثر پڑے گا۔ مذاکرہ میں ان باتوں کا محض سرسری ذکر ہوا کہ اطلاعاتی انقلاب کا عورتوں اور بچوں پر، ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک کے فیملی سسٹم پر اور اشاعتِ تعلیم پر کیا اثر پڑے گا۔

لیکن سچ پوچھئے تو یہی وہ باتیں ہیں جو ترقی پذیر ممالک کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک امریکی ماہر نے مجھے بتایا کہ اس کے ملک میں ایک بچہ ہر روز اوسطاً ساڑھے چھ گھنٹے ٹیلی ویژن دیکھتا ہے فی الوقت بھارت میں بچے اتنی زیادہ دیر تک تو ٹیلی ویژن نہیں دیکھتے مگر ان کے ٹی وی دیکھنے کا وقت رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا ہے۔ شہر کی اچھی اور پوش کالونیوں میں وڈیو پارلروں اور لائبریریوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ جو بچے شام کو کھیلا کرتے تھے وہ اب ٹی وی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ایک جھگی کالونی کے ایک اسکول ماسٹر نے مجھے بتایا کہ بچے اکثر دوپہر بعد اسکول سے غیر حاضر رہتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت دور درشن سے دکھائی جانے والی فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں حالیہ برسوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق کم ہو گیا ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ آئندہ برسوں میں تو وہ اور بھی کم ہو جائے گا۔ یوروپ اور امریکہ کے بہت ترقی یافتہ سماجوں میں نوجوانوں کا زیادہ ٹیلی ویژن دیکھنا درست ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا بھارت جیسے ترقی پذیر ملک برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے مستقبل کے شہری سنجیدہ مشاغل کے بجائے ٹیلی ویژن دیکھنے میں اتنا زیادہ وقت برباد کریں۔ بہت زیادہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے آنکھوں اور اعصابی نظام کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کے بارے میں اخبارات میں کافی خطوط چھپ چکے ہیں۔ کم از کم دہلی کے ایک اسکول میں، جب سے دور درشن نے دوپہر کو فلمیں دکھانا شروع کی ہیں، علاج کے لیے شفاخانوں میں جانے والے طلبا کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔

دو سوال

امریکی ماہرین اور بین الاقوامی ٹیلی ویژن نیٹ ورکس کے ہندوستانی افسران بڑے فخر کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ عالم گیر رابطہ لامحدود مواقع فراہم کرتا ہے اور اس کی بدولت دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے۔ ان کا زور ان سہولیات پر تھا جو عالمی سطح کا کمیونیکیشن (مواصلاتی نظام) فراہم کرتا ہے۔ اثرات اور جزئیات کا پہلو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔ بہرحال ذہن میں دو سوال اٹھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ڈھائی ہزار سال پہلے گوتم بدھ نے رابطہ عامہ کے جدید ذرائع کے بغیر اپنا امن کا پیغام دور دراز مقامات تک پھیلایا تھا۔ آدی شنکر اچاریہ، رامانج اچاریہ، گورو نانک دیو اور دوسرے روحانی پیشواؤں کو بھی اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے نہ تو اخبار اور کتابیں دستیاب تھیں نہ ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشری سہولیات۔

آج جب کہ ہمیں رابطے اور تشہیر و اشاعت کی جدید ترین سہولیات دستیاب ہیں تو پھر دنیا میں انتشار و اختلافات اور تنازعات کیوں بڑھ رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ زیادہ رابطوں اور زیادہ تشہیر و اشاعت سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ لوگوں میں لازماً زیادہ مفاہمت پیدا ہوگی۔ یا پھر غلطی جس طرح سے ان ذرائع کا استعمال کیا جا رہا ہے اُس میں ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ہم اطلاعات کو علم کے برابر اور علم کو دانشمندی کے برابر سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں۔

دوسرا سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے اخراجات کا ہے۔ یہ بات خواہ کتنی ہی اچھی اور کارآمد کیوں نہ لگے کہ مستقبل میں کسی ادارے کا ایک اعلیٰ افسر اپنے کمپیوٹر سے یہ کہہ سکے گا کہ وہ اسے اسکرین پر ایک سو اخبارات میں سے اس کی دلچسپی کے آئٹم دکھائے اور پھر چنے آئٹموں کو وہ کہے انہیں اپنی یادداشت (Memory) میں محفوظ کرے، حقیقت یہ ہے کہ بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک میں خوشحال لوگوں کے لیے بھی اس سہولت کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لہٰذا لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کو ملک اور بیرون ملک کے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انحصار رکھنا ہی ہوگا۔ آنے والے وقتوں میں سماج 'داروں' اور 'ناداروں' کے دو طبقوں میں منقسم ہو جائے گا۔ ایک طبقے کو مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی اطلاعات تک رسائی حاصل ہوگی جب کہ دوسرا طبقہ جس کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ اطلاعات کے دائرے کے کنارے پر کھڑا رہتا ہوگا۔ اس سے نہ صرف اختلافات اور رقابتیں بڑھیں گی بلکہ افواہیں بھی پیدا ہوں گی۔ ہم نے نہ جانے کتنی بار ایسی افواہیں سنی ہیں جو بی بی سی کے حوالے سے پھیلائی گئیں جب کہ بی بی سی نے وہ خبریں نشر ہی نہیں کی تھیں۔

مذاکرہ میں اس خدشے کا اظہار بھی کیا گیا کہ میڈیا کو عالمی بنانے کا نتیجہ آسمان سے ثقافتی حملے کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ کثیر اقوامی نیٹ ورکس کے امریکی اور ہندوستانی اربابِ اختیار نے اس دلیل کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ مختلف ذرائع سے اطلاعات کی اس قدر بھرمار ہوگی کہ کوئی ایک نیٹ ورک یا کوئی ایک ملک اپنے مقاصد کے لیے اس سہولت کا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ شری رام نواس مردھا ممبر پارلیمنٹ نے اپنے خطبے میں کہا کہ بھارت کو ماضی میں بھی اس قسم کے ثقافتی حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس نے ان حملوں کو کامیابی کے ساتھ پسپا کیا۔ ان کی رائے میں خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے مگر اس بار حملہ زیادہ شدید ہے گو بظاہر ایسا لگتا نہیں ہے۔ ۱۹۹۰ء میں خلیج کی جنگ میں امریکہ نے جس طرح سے ٹیلی ویژن کا استعمال کیا اسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے کسی بحران میں بھی امریکہ اور کثیر اقوامی میڈیا کی تنظیمیں عالمی میڈیا کا استعمال اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کریں گی۔ خلیج کی جنگ کے دوران ٹیلی ویژن پر ایک تصویر دکھائی گئی تھی جس میں عراقی سپاہی ایک 'Incubator' سے جس میں کویتی بچے رکھے گئے تھے، آکسیجن کی نلیاں کاٹ رہے تھے لیکن جب لڑائی ختم ہوگئی تو پتہ چلا کہ وہ تصویر جعلی تھی اور اس کا ٹی وی پر دکھایا جانا پروپیگنڈے کی ایک چال تھی۔ یہ ایک تصویر ہی ٹی وی دیکھنے والوں کے ذہن پر اس قدر چھا گئی کہ اتنا نقصان عراقیوں کو ایک سو مراسلوں سے بھی نہیں پہنچتا۔

فوری اثر

ٹیلی ویژن اپنی دور رسائی کی وجہ سے ایک زود اثر ذریعہ ابلاغ ہے۔ اخبار کے نامہ نگار کے پاس خبریں ارسال کرنے کے لیے ٹیلی ویژن کے کیمرا مین یا ریڈیو کے نامہ نگار کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت ہوتا ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی خبر یا خبریں اگلے روز چھپتی ہیں اور پھر اخبار کی سرکولیشن بھی جغرافیائی لحاظ سے محدود ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹیلی ویژن یا ریڈیو سے نشر کی جانے والی خبریں بہت جلدی میں تیار اور نشر کی جاتی ہیں جو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اور سیاسی حدود بلکہ براعظموں تک کے پار دوسرے مقامات پر فی الفور سنی یا دیکھی جاتی ہیں۔ ایک ترقی یافتہ سماج میں لوگ بحیثیت ایک فرد کے سوچتے ہیں نہ کہ بحیثیت ایک طبقے یا سماج کے۔ لیکن ایک ترقی پذیر ملک میں لوگوں کا ردعمل فوری اور تباہ کن ہو سکتا ہے۔ تصویر زبان کی قید سے آزاد ہوتی ہے اسے دیکھتے ہی شدید یا متشددانہ عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اسی لیے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ خبریں وغیرہ تیار اور نشر کرنے والے لوگ فہم و فراست سے کام لیں۔ ایک امریکی ماہر نے مذاکرہ میں سابت سنجیدگی سے کہا کہ کوئی خبر تیار کرتے وقت اس کے پاس یہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا کہ دور دراز ملکوں کے ناظرین پر اس کی خبر کا کیا اثر پڑے گا۔ اس نے کہا کہ وہ تو حقیقت بیان کرنے والے ایک آزاد صحافی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرنے کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے میڈیا کے از خود ضبط سے کام لینے کے سوال کو بلاواسطہ طور پر مسترد کر دیا۔ جمہوری سماج میں حکومت کی طرف سے میڈیا پر کسی طرح کے کنٹرول اور ضابطہ بندی کو ایک سیاہ دھبہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر اگر کسی ٹیلی ویژن پروگرام کو دیکھ کر کسی جگہ پر تشدد پھوٹ پڑے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ کیا کوئی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ صحافیوں کی آزادی اور میڈیا کی عالمگیری کی قیمت اس شخص کو ادا کرنی پڑتی ہے جس کا مکان جلا دیا جاتا ہے یا جس کے رشتہ داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے؟ کیا کسی حکومت کو جس کی بنیادی ذمہ داری اپنی عملداری میں امن و امان برقرار رکھنا ہوتی ہے، میڈیا کو عالمگیر بنانے کے نام پر اپنی اس ذمہ داری سے دامن جھٹک لینا چاہیے۔

لیکن اب گھڑی کی سوئیوں کو پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی **سٹیلائٹ** یا مصنوعی سیاروں کے ذریعے ساری دنیا میں نشر کیے جانے والے پروگراموں پر کوئی روک ہی لگائی جا سکتی ہے۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن ابھی بھارت کے لیے نیا ہے لیکن جلد ہی اس کا دائرہ پھیلے گا اور تیزی سے پھیلے گا۔ لہٰذا بین الاقوامی میڈیا نیٹ ورکس کے لیے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جلدی جلدی میں نشر کیے گئے کسی پروگرام سے کیا اثرات اور نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اقتدار اور اختیارات کے ساتھ ذمہ داری بھی آتی ہے۔ اگر بین الاقوامی میڈیا نیٹ ورکس میڈیا کو عالمی بنانے کے فوائد سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو انہیں ساتھ ہی آنے والی ذمہ داریوں سے بھی پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے۔ ●

بقیہ: پنچایتی راج عوام کے ذریعہ عوام کیلئے ایک نظام

جائیں گے تاکہ وہ متعلقہ سطحوں پر تربیت کا اہتمام کر سکیں۔ تربیتی ضروریات کے منظم جائزے کے بعد پنچایتوں کے منتخبہ اراکین اور عملے پر مشتمل ایک جامع تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا جائے گا۔ صحت عامہ، خواندگی مہم، ماحولیاتی امور، توانائی کے متبادل اور قابل اعتبار ذرائع جیسے شعبوں میں چھوٹی سطح کے منصوبہ بندی اداروں کے لیے تکنیکی مہارت فراہم کرنے کے سلسلے میں غیر سرکاری تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے۔ ●

غیر رسمی تعلیم — تعلیم کا نیا تصوّر

زندگی بھر تعلیم حاصل کرنا تعلیمی عمل کا ایک شاندار مقصد ہے۔ اوپن یونیورسٹی نظام اس قابل تعریف مقصد کے حصول کے لیے ایک طاقتور ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اس نظام کا مقصد ان نوجوانوں، گھریلو خواتین، زرعی اور صنعتی مزدوروں اور پیشہ ور افراد کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مواقع میں اضافہ کرنا ہے جو اپنی پسند کی تعلیم اپنے پاس موجود وقت کے حساب سے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی میں بھی غیر رسمی تعلیم پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں یونیورسٹی تعلیمی نظام اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس نظام کے تحت آبادی کے محض سات فیصد حصے کو ہی تعلیمی سہولیات دستیاب ہیں۔ یونیورسٹیوں کو درپیش وسائل کی زبردست قلت کے پیش نظر مسائل اور پیچیدہ ہو گئے ہیں لہٰذا تعلیم فراہم کرنے کے ایک ایسے یا متبادل کی ضرورت ہے جو تعلیم کے خواہشمند تمام لوگوں کو تعلیم فراہم کر سکے۔

غیر رسمی تعلیم موثر طریقے سے ایسا ایک نظام فراہم کر رہی ہے جس کو مراسلاتی تعلیم، ہوم اسٹڈی (گھر پر تعلیم)، آزاد تعلیم، اوپن لرننگ، ایکسٹرنل اسٹڈی جیسے مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ان تمام تعلیمی پروگراموں سے ہے جو ایک تعلیمی ادارہ طلبا کو امتحان میں شامل ہونے کا اہل بنانے پر تعلیمی اداروں میں باقاعدہ کلاسوں میں شامل ہوئے بغیر تعلیمی لیاقت حاصل کرنے کے لیے پیش کرتا ہے۔

اس کے علاوہ غیر رسمی تعلیم طلبا کو موضوعات کے انتخاب اور انھیں سیکھنے کے لیے وقت سے متعلق آزادی بھی دیتی ہے۔ نصاب میں کیمپس کے اندر اور کیمپس کے باہر پڑھائی شامل ہوتی ہے جس میں طلبا کی ضروریات پر زور ہوتا ہے۔ پڑھانے کا طریقۂ کار مختلف میڈیا رجحانات پر مبنی ہے۔

حالانکہ مراسلاتی تعلیم کی شروعات مدت پہلے ۱۸۴۰ء میں اسحاق پٹ مین کے شارٹ ہینڈ کورسوں کے ساتھ ہوئی تھی لیکن غیر رسمی تعلیم کے شعبے میں اس کا عالمگیر اثر ۱۹۶۹ء میں انگلینڈ میں ملٹن کینز میں اوپن یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ رونما ہوا۔ آج پوری دنیا میں غیر رسمی تعلیم کے تقریباً ۵۶۷ ادارے کام کر رہے ہیں جن میں دو کروڑ دس لاکھ سے زیادہ طلبا کا اندراج ہے۔

بھارت میں مراسلاتی تعلیم سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں دلی یونیورسٹی میں شروع ہوئی۔ ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری کی زیر صدارت قائم کیے گئے تعلیمی کمیشن (۶۶-۱۹۶۴ء) کی سفارشات پر پنجاب، میرٹھ اور میسور میں مراسلاتی ادارے قائم کیے گئے۔

بھارت میں غیر رسمی تعلیم کے نظام میں ایک اہم پیش رفت ۱۹۸۲ء میں حیدرآباد میں آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی کے قیام کی شکل میں ہوئی۔ اس یونیورسٹی کے قیام ہی سے ۱۹۸۵ء میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نیز ۱۹۸۷ء میں کوٹہ اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء ہی میں نالندہ اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۹ء میں یشونت راؤ چوان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی اور ۱۹۹۲ء میں مدھیہ پردیش میں بھوج اوپن یونیورسٹی کے قیام کے لیے ترغیب حاصل ہوئی۔ آج ملک میں تقریباً ۵۴ یونیورسٹیاں غیر رسمی تعلیم کے پروگرام چلا رہی ہیں۔

اوپن یونیورسٹی میں وہ طلبا شامل ہوتے ہیں جو سماجی و اقتصادی حالات یا کالج میں سیٹ کی عدم موجودگی یا جغرافیائی طور پر دور دراز کے علاقوں میں رہنے یا پھر چھوٹی عمر میں پڑھائی کا شوق نہ ہونے یا پڑھائی کی طرف راغب نہ ہونے یا پھر برسرروزگار ہونے یا گھر کے کاموں میں بندھے ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے یا پھر وہ طلبا ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم اپنے پاس موجود وقت کے حساب سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کو اوپن یونیورسٹی نظام میں اور بھی زیادہ اہم کردار ادا کرنا ہے کیونکہ اس پر ایسے نظام میں تعلیم، جانچ اور تحقیق کے معیار متعین کرنے کی ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے۔ غیر رسمی تعلیم میں بہترین مرکز کے اعزاز سے نوازی جانے والی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا ایک وسیع نیٹ ورک ہے جو سولہ علاقائی مراکز، ۲۲۰ دیگر مراکز اور دس ہزار کونسلروں کے ایک بڑے گروپ پر مشتمل ہے۔

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے تعلیمی پروگراموں کی مقبولیت اور معقولیت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۴۳۸۱ طلبا کی تھوڑی تعداد کے ساتھ شروع ہونے والی اس یونیورسٹی میں اب دو لاکھ ۲۵ ہزار طلبا کا اندراج ہے۔ غیر رسمی تعلیم کے لیے اندراج کرانے والی خواتین کی تعداد رسمی تعلیم میں ان کے اندراج کے معاملے میں کہیں زیادہ ہے۔

یونیورسٹی کے جو کورسز بہت مقبول ہیں ان میں گائیڈینس، خوراک اور غذائیت اور دیہی ترقی کے سرٹیفکیٹ کورس، بی اے کی ڈگری کی تیاری سے متعلق پروگرام، مینجمنٹ اور دیہی ترقی میں ڈپلوما، اعلیٰ تعلیم، آرٹس، سائنس اور کامرس میں بی اے ڈگری پروگرام، بزنس مینجمنٹ اور غیر رسمی تعلیم میں ایم اے کی ڈگری شامل ہے۔

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے تعلیم دینے کے لیے مختلف میڈیا پر مبنی مربوط حکمت عملی اختیار کی ہے جو شائع کردہ مسودے، سماعی اور بصری آلات، تعلیمی مراکز میں کونسلر کے ذریعے رہنمائی، دوردرشن کے قومی نیٹ ورک اور آل انڈیا ریڈیو پر نشریات شامل ہیں۔ تعلیم فراہم کرنے کی ان تازہ ترین ٹکنالوجیوں کے باوجود اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں بی اے کی ڈگری حاصل کرنے پر جو لاگت آتی ہے

باقی صفحہ ۳۲ پر

پریم پال اشک

گیارہواں عالمی کتاب میلہ — ایک جائزہ

جان گالزوردی (JOHN GALSWORTHY) نے اپنے ایک مقالے "شاہی خزانے" میں لکھا ہے کہ کتب خانے ہی صحیح معنی میں شاہی خزانے ہیں۔ اور مصنفین ان کے بادشاہ اور کتابیں انسان کی تنہائی کی صحیح رفیق ہیں۔ علم کے یہی خزانے زمانہ ازل ہی سے انسان کی عقل و دانش میں روز افزوں اضافہ کرتے ہوئے اس کے ذہن منور کرتے رہے ہیں۔ کلکتہ سے شائع ہونے والی نیشنل ببلوگرافی کے مطابق ہمارے یہاں ہر سال تقریباً ۲۰ ہزار کتب شائع ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود علم کے شیدائی پھر بھی تشنہ لب رہتے ہیں۔

پوری دنیا کے مصنفین کو ایک پلیٹ فارم پر لانے، ان کے حقوق کے تحفظ کے علاوہ مختلف ناشرین اور تاجران کتب کے درمیان رابطہ قائم کرنے اور ان کے مسائل پر غور کرنے کی غرض سے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے زیر اہتمام ہر دوسرے سال عالمی سطح پر کتاب میلے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اب تک دس کتاب میلے منعقد ہو چکے ہیں۔ پہلا عالمی کتاب میلہ مارچ ۱۹۷۲ء میں لگا تھا۔ جب کہ اس میلے میں صرف دس ہزار کتابیں رکھی گئی تھیں اس کے بعد ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۲ء میں دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں عالمی کتاب میلہ منعقد ہوا۔ دسویں عالمی کتاب میلے میں ۳۴ ممالک کے ۸۴۹ ناشرین اور کتب فروش شریک ہوئے تھے۔ جب کہ گیارہویں عالمی کتاب میلے میں ۵۶ ممالک کے ۹۵۰ ناشرین اور کتب فروش شامل ہوئے۔ اس میلے میں بھارت کے علاوہ جن ممالک نے نمایاں طور پر شرکت کی ان میں پاکستان، فرانس، جرمنی، برطانیہ، ایران، افریقہ اور امریکہ کے نام فخر سے لیے جا سکتے ہیں۔

یہ کتاب میلہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے زیر اہتمام اور اکھل بھارتیہ ہندی پرکاشک سنگھ "CAPEXIL" نئی دہلی اسٹیٹ بک سیلرز اینڈ پبلشرز ایسوسی ایشن، فیڈریشن آف ایجوکیشنل پبلشرز ان انڈیا، فیڈریشن آف انڈین پبلشرز، فیڈریشن آف پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشنز ان انڈیا کے اشتراک سے منعقد ہوا۔

نو روزہ گیارہویں عالمی کتاب میلے کا افتتاح ۵ فروری کو وزارت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ارجن سنگھ نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ہندوستانی ناشروں سے عوام کو کم قیمت پر کتابیں مہیا کرانے کی اپیل کی۔ اس مرتبہ کے کتاب میلے کے موضوع افریقہ کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ براعظم افریقہ سے ہندوستان کا تعلق یوں تو قدیم ہے لیکن اس صدی کے شروع میں گاندھی جی نے اپنے ستیہ گرہ کی ابتدا، جنوبی افریقہ سے کر کے اس تعلق کو اور زیادہ پختہ کر دیا۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ نسل پرستی کا یہ آخری قلعہ مسمار ہو جانے کے بعد جنوبی افریقہ ایک نئے اور بدلتے ہوئے ملک کے طور پر ابھر رہا ہے۔

اس مرتبہ کے کتاب میلے کے پویلینوں میں ایک، ۱۴ اور ۱۹ کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن اس کے باوجود میلے کی چہل پہل قابل دید رہی۔

اس میلے کا اس مرتبہ کا موضوع افریقہ تھا۔ جس کے تحت براعظم افریقہ سے شائع ہونے والی دو ہزار سے زائد کتب اور ۶ جرائد بھی شامل کیے گئے۔ یہ کتب اور جرائد افریقہ کے ۱۳ ممالک کے شائع کردہ ہیں اس موقع پر جنوبی افریقہ کے نامور شاعر ڈینس بروٹس (DENNIS BRUTOS) افتتاحی تقریب کے اعزازی مہمان تھے ان کے علاوہ کانگو (CONGO) کے ممتاز مصنف اور مدبر مسٹر ہنری لوپس (HENRY LOPUS) بھی اعزازی مہمان کے طور پر شامل ہوئے۔

افتتاحیہ تقریب کے موقع پر غیر ممالک میں ہندوستانی کتب کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں امریکہ کی کتب تقسیم کنندہ کمپنی ساؤتھ ایشیا بکس (SOUTH ASIA BOOKS) کے سربراہ پروفیسر این جی ویریر (Prof N G WARRIER) کو پہلا نیشنل بک ٹرسٹ اعزاز عطا کیا گیا۔

گیارہویں عالمی کتاب میلے میں پچھلے دہے میں کیے جانے والے طباعتی، ترقیاتی اقدامات کی جھلک بھی دیکھنے کو ملی۔ اس میں الیکٹرانک طباعت۔ کمپیوٹر کے ذریعہ ٹائپ سیٹنگ، لے آؤٹ پلاننگ اور اردو کمپیوٹر کے ترقیاتی اقدامات شامل تھے۔

اس میلے میں ہر موضوع کی کتب فراہم کی گئی تھیں۔ بچوں، بالغوں اور خواتین یعنی سماج کے ہر طبقہ سے متعلق تمام سیاسی، غیر سیاسی، مختلف فنون لطیفہ اور کمپیوٹر سائنس کے موضوعات سے متعلق کتب کا احاطہ کیا گیا تھا۔

اس میلے میں کئی سیمینار اور ورکشاپس کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس میں نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیر اہتمام "افریقہ اور بھارت میں نئے دور کے لیے طباعت و اشاعت" اور ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام "برصغیر کے اس پار سیاہ فام تحریرات" کے موضوعات شامل تھے۔ اس میں افریقی ادب پر سیر حاصل مقالات پڑھے گئے اس کے علاوہ "بچوں کے لیے کم داموں پر کتب" کے موضوع پر ایک نصف روزہ ورکشاپ بھی لگائی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اسی نو روزہ کتاب میلے میں برٹش کونسل ڈویژن آف دی برٹش ہائی کمیشن

BRITISH COUNCIL DIVISION OF THE BRITISH HIGH COMMISION

اور انڈین بک ٹریڈ (BOOK TRADE

۳/بی۔ ۴۴/اے دلشاد گارڈن، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۵

اور یونائیٹڈ اسٹیٹس مارکیٹ (UNITED STATES MARKET) کے اشتراک سے نیشنل بک ٹرسٹ نے نابینوں کی تجارت اور کتاب کلبوں میں ایکڈ اکس مواصلات پر ورکشاپس کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا اور بھارت گیان وگیان سمتی (BHARAT GYAN VIGYAN) کے اشتراک اور تعاون سے کم پڑھے بالغوں کے لیے مطالعاتی مواد کے موضوع پر سیمینار بھی منعقد ہوا۔ تاکہ ملک میں ساڑھے پانچ کروڑ کم پڑھے بالغ مردوں اور عورتوں کی بھی پڑھنے کی ضرورت کو خوبصورت تصویری اور معلوماتی کتب شائع کر کے پوری کی جا سکیں۔

اس میلے میں دس لاکھ سے زائد کتب کے علاوہ ملک کی مختلف قومی زبانوں میں شائع ہونے والے ۱۷۰ منتخب علمی، ادبی اور تحقیقی جرائد بھی رکھے گئے تھے اور پچھلے دو برسوں میں ملک کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتب کی نمائش کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ نے کیا تھا۔ گیارہویں عالمی کتاب میلے کی اہمیت اور افادیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ اس میں ترقی ملک کے ۳۴ ممتاز اردو اشاعتی اداروں نے اپنے اسٹال لگائے تھے، ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے

(۱) ترقی اردو بورڈ (۲) انجمن ترقی اردو ہند، دہلی (۳) مکتبہ الحسنات (۴) ملی پبلی کیشنز، دہلی (۵) کتاب دار، دہلی۔ (۶) تخلیق کار پبلیشرز، دہلی (۷) ییلی کیشنز ڈویژن (۸) این سی ای آر ٹی (۹) آل انڈیا بک ڈپو، دہلی (۱۰) علم بکڈپو، دہلی (۱۱) آفاقی پبلشنگ ہاؤس دہلی (۱۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی (۱۳) نیشنل بک ٹرسٹ (۱۴) نصرت پبلیشرز لکھنؤ (۱۵) العلا پبلی کیشنز دہلی (۱۶) اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ (۱۷) مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال (۱۸) تاج پبلی کیشنز دہلی (۱۹) ساہتیہ اکادمی (۲۰) انجمن فروغ سائنس (۲۱) سیمیع پبلی کیشنز دہلی (۲۲) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی (۲۳) ادارہ فکر جدید (۲۴) مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک۔ (۲۵) اردو اکادمی دہلی (۲۶) لینگویج ڈیپارٹمنٹ پنجاب (۲۷) ہماچل پردیش لینگویج ڈیپارٹمنٹ شملہ (۲۸) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ (۲۹) دعوۃ اکادمی اسلام آباد (۳۰) شیخ مبارک علی، لاہور (۳۱) ادارۂ اشاعت دینیات دہلی۔ ان کے علاوہ ایک درجن ایسے ناشرین نے بھی اردو کتابیں فروخت کیں جو شہری اور دیگر قومی زبانوں کے علاوہ اردو کتب کی اشاعت اور فروخت کا کاروبار بھی کرتے ہیں، جن میں بی جین پبلیشرز، ڈائمنڈ بکس، اسٹار پاکٹ بکس اور راجپال اینڈ سنز بھی شامل تھے۔

اس میلے میں ایک اور مثبت اور سود مند پہلو ایک دو روزہ ہند پاکستان اردو پبلیشرز کانفرنس کے انعقاد کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ اس کانفرنس کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، انجمن ترقی اردو ہند، الفرد الیکٹرانک کونسل آل انڈیا اردو پبلیشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن ترقی اردو بیورو۔ اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے اشتراک اور تعاون سے منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے چھ اجلاس ہوئے۔ اس میں بھارت پاکستان کے درمیان اردو کتب کے لین دین، ادیبوں اور ناشروں کے مشترکہ اور انفرادی مسائل، چوری چھپے کتابوں کی اشاعت، طباعت ٹکنالوجی اور کمپیوٹر کی افادیت و نقصانات اور کتابوں کی فروخت جیسے موضوعات پر غور کیا گیا۔ اور ان موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح وزارت امور خارجہ کے وزیر مملکت جناب سلمان خورشید نے کیا۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ دونوں ملکوں کا تہذیبی ورثہ اور ثقافت یکساں ہے لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں رہ سکتے۔ البتہ تعلقات کی خلیج کو پاٹنے کے لیے بھارت، پاکستان کے تخلیق کار اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس دو روزہ کانفرنس کا ایک سود مند اور مثبت پہلو بھارت اور پاکستان کے سات سات ممبروں پر مشتمل ایک انڈو پاک اردو پبلیشرز کونسل کا قیام تھا۔ اس کے دو کنوینر ہوں گے ایک ہندوستان کا اور دوسرا پاکستان کا اور ان کے دفاتر دہلی اور کراچی میں ہوں گے۔

گیارہویں عالمی کتب میلے میں نابینا افراد کی کتابوں کی نمائش بھی لگائی گئی جنہیں نابینا حضرات چھو کر پڑھ سکتے ہیں لیکن ان کی قیمت بہت کم رکھی گئی۔ ان کے ناشر نابینا افراد کا قومی انسٹی ٹیوٹ (دہرہ دون) ہے۔ اس نمائش میں مذکورہ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والا ہفت روزہ جریدہ "بریل ٹائمز" بھی رکھا گیا اس کے علاوہ عالمی کتاب میلے میں پہلی مرتبہ آڈیو کیسٹ کی شکل میں کتابیں بھی موجود تھیں۔

چلتے چلتے ایک اہم حقیقت پر روشنی ڈالنی بہت ضروری ہے کہ دسویں عالمی کتاب میلے میں چھ کروڑ روپے کی مالیت کی کتب کا کاروبار ہوا تھا جب کہ گیارہویں عالمی کتاب میلے میں پندرہ کروڑ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ ●

بقیہ: بریل۔ نابینا افراد کے لیے امید کی ایک کرن

پر اہم قومی روزنامہ اخباروں کے اداریوں کا مختصر خلاصہ، اہم قومی اور بین الاقوامی امور، حالیہ خبریں اور واقعات ہوتے ہیں۔ یہ پریس کو ہندی، انگریزی، سنسکرت اور بنگالی رسالوں میں مواد شائع کرتا ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں تقریباً سو سے کتابیں اور ۶ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کر چکا ہے۔

پروڈکشن تکنیک میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے جس کے نتیجے میں پروڈکشن کی رفتار میں سو گنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ بنگلور میں واقع سائنس کے سرکاری ادارے نے انڈین الیکٹرونک امبوزر کی پہلی نسل تیار کی ہے۔ بریل پروڈکشن میں کمپیوٹروں کا بھی بڑے پیمانے پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ بریل کوڈ کو کمپیوٹر کے لیے موزوں بنانے کی غرض سے اس میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں۔ نابینا بچے آنے والے برسوں میں اپنے لیے زیادہ نصابی کتابوں اور دیگر مواد کی توقع کر سکتے ہیں

دہرہ دون کا یہ ادارہ لکھنے کے لیے کمپیوٹر کے استعمال کے لیے، چلنے پھرنے کے لیے اور تفریحی سرگرمیوں کے لیے ایک ورکشاپ میں تیار کردہ مختلف قسم کا ساز و سامان اور آلات فراہم کرتا ہے، ان میں بریل سلیٹیں، اسٹائلس، ریاضی سلیٹیں، ابا کس، پاکٹ فریم اور فولڈنگ اسٹکس شامل ہیں۔ آلات اور ساز و سامان کی خریداری اور فٹنگ کے لیے امداد کی اسکیم کے تحت تعلیمی کٹ رعایتی شرحوں پر فراہم کی جاتی ہے۔ جن افراد کی ماہانہ آمدنی ۱۲۰۰ روپے تک ہے انہیں یہ مفت فراہم کی جاتی ہے اور جن افراد کی آمدنی ۱۲۰۱ روپے سے لے کر ۲۵۰۰ روپے تک ہے انہیں ۵۰ فیصد قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس اسکیم پر ملک بھر میں پھیلے ہوئے اداروں کے ذریعہ عمل درآمد کیا جاتا ہے۔

بریل نے نابینا افراد کے لیے واقعتاً روشنی حاصل کرنے کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ ایک اچھے اور مہذب سماج میں معذور افراد کی بازآبادکاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں پوری محنت اور لگن کے ساتھ کمیونٹی اور اداروں پر مبنی مختلف پروگرام چلائیں۔ ●

ایس. اے. حیات

خلائی تحقیق اور ہندوستان

"سب سے قبل برطانوی محقق جناب آرتھر سی کلارکس نے ۱۹۴۵ء میں اپنے تحقیق کے ذریعہ دنیائے سائنس کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ زمین پر دور دراز علاقوں کے بیچ ریڈیو مواصلات (Radio Communication) کے لیے سیارچوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان کی دریافت کے مطابق ایسے سیارچوں کو خط استوا (Equator) کے اوپر کسی بھی مقام پر متعین کیا جاسکتا ہے اور اس طرح کے متعدد سیارچوں سے پورے خطہ ارض کو ڈھکا جاسکتا ہے جس کے تعاون سے مواصلاتی نظام اور دوسرے دیگر امور کو بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

اس تحقیق سے استفادہ کر کے ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سوویت یونین روس نے ایک سیارچہ خلا میں داغا جو "Sputnik" کے نام سے موسوم ہے۔ اس سے خلائی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس زمینی سیارچہ Earth Satellite کا وزن ۱۸۴ پونڈ تھا اور وہ روزانہ ۱۵ مرتبہ زمین کی گردش کرتا تھا۔ یہ زمین سے ۵۶ میل اوپر ۱۸ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے متحرک تھا۔ ایسے خلائی سفر کے بعد یہ سیارچہ ۴ جنوری ۱۹۵۸ء کو زمین پر واپس آگیا۔ اس کے بعد روس نے یکے بعد دیگرے متعدد سیارچے خلا میں داغے ہیں اور اس کا مشن ابھی بھی جاری ہے۔

امریکہ کا پہلا سیارچہ جنوری ۱۹۵۸ء میں چھوڑا گیا جس کا نام "Explorer" تھا۔ اس کا وزن ۳۰۰۸ پونڈ تھا۔ دراصل مواصلاتی سیارچوں کی شروعات امریکہ کے "Score" (Signal Communication by Orbiting Relay Equipment) سے ہوئی۔ زمین کے گرد و نواح دو طرح کے مواصلاتی سیارچے نصب ہیں، جن میں سے ایک اپنی سطح سے آئینہ کی مانند ریڈیو کے اشارات (Signals) کو منعکس (Reflect) کرتے ہیں۔ انہیں غیر متحرک (Passive) کہتے ہیں اور دوسری قسم کے سیارچوں میں الیکٹرونک آلات نصب ہوتے ہیں جو اشارات (Signals) حاصل کرتے ہیں، انہیں پھیلاتے (Amplify) ہیں اور پھر دوبارہ ارسال یعنی "Retransmit" کرتے ہیں، انہیں متحرک (Active) کہتے ہیں۔ امریکہ کے محققین کثیر المقاصد سیارچوں کے حق میں ہیں تاکہ پوری دنیا میں ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی گراف اور ڈاٹا یکجا کرنے کے لیے خط استوا (Equator) سے ۲۲۳ میل اوپر خلا میں ایسے سیارچوں کو متعین کر کے صرف دو یا تین "Relay-Stations" کے ذریعہ انہیں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں محض ۲۴ گھنٹے میں سیارچہ ایک چکر پورا کر لیتا ہے اور اسی وقفہ میں زمین بھی اپنے معمول کے مطابق ایک گردش پوری کر لیتی ہے۔ ایسی حالت میں زمین پر کوئی فرد سیارچہ کو ایک متعین مقام پر ٹکا ہوا پاتا ہے۔ اس نظام کو Geostationary یا Synchromous کہتے ہیں۔ اس نظام میں بحر اٹلانٹک کے اوپر دو، بحر الکاہل کے اوپر ایک اور بحر ہند کے اوپر ایک سیارچہ کو نصب کر کے زمین پر ہر جگہ مہیا کیا جاسکتا ہے۔ "IntelSat" (International Telecommunications Satellite Organisation) ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس کے ممبروں کی تعداد بشمول بھارت فی الحال ۱۱۵ ہے۔ یہ ادارہ مواصلاتی سیارچے کو حاصل کرتا ہے اور انہیں خلا میں داغتا ہے۔ ابھی اس کے متعدد سیارچے خلا میں ہیں۔ مواصلاتی سیارچوں کی ان کامیابیوں کے پیش نظر اس خطہ ارض پر فاصلے سمٹتے نظر آ رہے ہیں اور عنقریب انسان ان کے تعاون سے پاکٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعہ پیغامات کی ترسیل کر سکے گا۔

ہمارا آزاد ہندوستان بھی اس خلائی دوڑ میں متواتر راہ ترقی پر گامزن ہے۔ خلائی سائنس کے حلقہ میں تحقیق کے لیے ۱۹۶۳ء میں T.E.R.L.S (Thumba Equatorial Rocket Launching Station) کی سنگ بنیاد ترویندرم میں رکھی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں "I.S.R.O." (Indian Space Research Organisation) کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۷۲ء میں محکمہ خلا اور خلائی کمیشن کا وجود عمل میں آیا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کا پہلا سیارچہ "آریہ بھٹ" سوویت یونین روس سے داغا گیا۔ ۷ جون ۱۹۷۹ء کو بھارت کا دوسرا سیارچہ "بھاسکر-۱" بھی روس سے ہی داغا گیا۔ ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو سیارچہ داغنے کی سواری "SLV-3" (Satellite Launching Vehicle) کے ذریعہ ۳۵ کلوگرام وزن والے "روہنی" نامی سیارچہ کو مدار میں سری ہری کوٹا سے چھوڑا گیا۔ پھر اسی سواری سے ۳۱ مئی ۱۹۸۱ء کو دوسرا روہنی داغا گیا۔ ۱۹ جون ۱۹۸۱ء ہندوستان کا پہلا "APPLE" (Experimental Geostationary Communication) سیارچہ فرینچ گویانا سے ایرین راکٹ (Ariane

سکریٹری، اسسٹنٹ سیکرٹ، گیا

(Rocket کے ذریعہ خلا میں نصب کیا گیا ۲۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو سوویت یونین روس سے "بھاسکر-۲" (Satellite On Earth Observation) داغا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں امریکہ کے کیپ کینا ویرل (Cape Canaveral) سے Insat-1A داغا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں سری ہری کوٹا سے "سارد بھی" داغا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں امریکہ کے کیپ کیناویرل سے Insat-1-B خلا میں چھوڑا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں IRS-1A داغا گیا اس سے ہندوستان وہ پانچواں ملک بن گیا جس کا اپنا (Remote Sensing Satellite) خلا میں مقرر ہے اس کے تعاون سے کاشتکاری، ماحولیاتی، موسم کے حالات اور تیل کی کھدائی وغیرہ کے لیے مفید اشارات حاصل ہوتے۔ بعد ازاں بھی مدد دیگر سے Insat کے دو اور سیارچے خلا میں چھوڑے گئے ہیں وہ سبھی امریکہ میں تیار کیے گئے تھے۔ اس طرح Insat-1 سلسلہ کے چار سیارچے مل ہیں داغے گئے ہیں۔

۱۵ اگست ۱۹۸۳ء سے Insat ٹیلی ویژن کے لیے نشریات (...) دینے لگا جس سے ٹی وی کے نشریہ کے سبھی مراکز اپنا پروگرام اور دیگر مقامات کے پروگرام کو حاصل کر کے نشر کرنے لگے ہیں اس طرح Insat سروس بہت حد تک کامیاب رہا ہے ہندوستان کے خلائی تحقیق کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے یہ وقت کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے میں سنگ میل ثابت ہوا ہے۔

گذشتہ ۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء کو ہندوستان کے سائنسدانوں نے خلائی ریسرچ میں ایک بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس دن ہندوستان میں مکمل طور پر تیار کردہ کثیر المقاصد ٹیلی مواصلاتی سیارچہ (Telecommunication) "Insat-2A Satellite" نہایت کامیابی کے ساتھ فرینچ گویانا سے ایرین-۴ (Ariane-4) راکٹ کے ذریعہ خلا میں بھیجا گیا ہے۔ مستقل طور پر خلا میں اسے متعینہ مقام پر ۱۵ دنوں کے اندر مقرر کر دیا گیا۔ یہ ہندوستان کا دوسرا "Generation Satellite" ہے۔ اس کا وزن ۱۹۰۶ کلوگرام ہے یعنی اب تک ہندوستان سے داغے گئے تمام ۱۴ سیارچوں (Sattelite) میں سب سے بھاری ہے۔

اس کی کارکردگی اب تک اطمینان بخش ہے۔

اس کی کامیابی نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پورے عالم کے لیے ضروری ہے کیونکہ بحر ہند کے علاقوں کے موسم سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنے کا یہ واحد وسیلہ ہے۔ بنگلور کے پاس خلائی مرکز نے اس کی نگرانی کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس پر آسٹریلیا، امریکہ اور جرمنی سے مراکز سے بھی نگرانی رکھی جا رہی ہے اس سیارچہ (Satellite) کے ۹ برس تک کام کرنے کی توقع ہے۔ سبھی نظام کی جانچ کے بعد اس کی گوناگوں خدمات فراہم ہو سکیں گی۔

اس کا استعمال موسم کی جانکاری، تحقیقاتی کام اور قدرتی آفات کی قبل از وقت اطلاع دینے میں کیا جا سکتا ہے ہندوستان خلائی سائنس کے میدان میں روز بروز ترقی کے مدارج طے کرتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہماری تحقیقات دوسروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔ ●

نو گھنی آبادی والے ممالک میں خواندگی

بنیادی تعلیم عالمی برادری کے لیے ایک ترجیحی پروگرام کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کے تحت ابتدائی سطح کی ہدایات، عہد طفولیت و پرائمری تعلیم یہ بالغان کی خواندگی سبھی پہلو شامل ہیں۔ بنیادی تعلیم کی طاقت اطلاعاتی، ثقافتی ترقی کے لحاظ سے زرعی پیداوار کے لحاظ سے پیداواری [illegible] کم کرنے اور تجارتی اضافے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ گھنی آبادی والے ۹ ممالک - بنگلہ دیش، برازیل، چین، مصر، بھارت، انڈونیشیا، میکسیکو، نائجیریا اور پاکستان نے پہلی مرتبہ اس پہلو پر ایک عام ہموار کرنے کی غرض سے میٹنگ کا اہتمام کیا۔ یہ ممالک کچھ ایسے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کر رہے ہیں جو اگرچہ بڑی جرأت اور حوصلے کے متقاضی ہیں مگر حقیقت اور ممکنات پر ہی مبنی ہیں۔ یہ منصوبے آئندہ سات برسوں میں تمام لوگوں کو خواندہ بنانے کے ہیں۔

۹ سب سے زیادہ گھنی آبادی والے ممالک کی سب کے لیے تعلیم کی چوٹی کانفرنس سے تھائی لینڈ میں جومٹین میں تعلیم کے موضوع پر منعقدہ عالمی کانفرنس میں لیے گئے فیصلوں اور کیے گئے اقدامات کو مزید تقویت ملے گی۔ تھائی لینڈ کی کانفرنس ۱۹۹۰ء کے خواندگی برس میں منعقد ہوئی تھی۔

مذکورہ سب سے زیادہ آبادی والے ممالک دنیا کی آدھی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مذکورہ نو ممالک مجموعی طور پر اندراجات کے تناسب کے معاملے میں بڑی دلچسپ صورت حال پیش کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ملک میں پرائمری تعلیم کے معاملے میں ترقی ہوئی ہے۔ مجموعی خواندگی کی شرح خواندہ بالغان پندرہ برس اور اس سے زائد عمر والوں کی فیصد-ناتی ہے۔ یہ ترقی ماضی میں تعلیم فراہم کرانے کے لیے کی گئی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

۹ سب سے زیادہ گھنی آبادی والے ممالک کو تعلیم اور خواندگی کے معاملے میں جو مسائل درپیش ہیں ان میں جنس کے لحاظ سے تفریق وسائل کا فقدان اساتذہ کی تربیت اور کام کاج کی جگہ اور صورت حال سے حالات، عہد طفولیت کی نگہداشت اور تعلیم کے لیے مطالبہ اور اس کے تئیں بیداری وغیرہ شامل ہیں۔ لہذا یہ چوٹی کانفرنس ایک ایسا ڈھانچہ وضع کرنے کا موقع فراہم کرے گی جس کے ذریعے ان مخصوص طریقوں کا تعین ہو سکے جو یہ ممالک سب کے لیے تعلیم کے تحت مقررہ نشانوں کے حصول کے لیے اختیار کریں۔

بھارت دیگر آٹھ سب سے گھنی آبادی والے ممالک کے ساتھ لڑکیوں و خواتین کی تعلیم کو بہت زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ اس کے تحت نہ صرف زندگی کے معیار کو بہتر بنانا لازمی ہے بلکہ اس کے لیے سماج میں ڈھانچہ جاتی تبدیلیاں لانا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں نصب العین کے حصول کے لیے متعدد طریقہ کار وضع کیے جا رہے ہیں۔ ●

عادل صدیقی

ڈاکٹر انصاری ـــ مثالی رہنما

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب برابر کے شریک تھے۔ ایک طرف ممتاز و معروف دانشور تھے تو دوسری طرف سادہ دل عوام۔ اس تحریک میں مشہور وکیل، ڈاکٹر، طبیب، شاعر، سبھی قومی خدمت کے جذبے سے شریک تھے۔ گاندھی جی کے زیر اثر تمام صاحب دل دانشور کشاں کشاں ہندوستان کی تحریک آزادی سے جڑتے چلے گئے، اسی طرح کی ایک شخصیت کا نام تھا ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ انھوں نے ساری عمر حب الوطنی اور قومی اتحاد کے جذبے سے سرشار ہو کر گذاری۔ وہ ایک ایسے ہندوستان کے نقیب بنے جہاں محبت، رواداری، امن و انصاف اور اخلاق و انسانیت کو قوم کا قیمتی ورثہ تصور کیا جاتا ہو۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو یوسف پور میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ ایک بچہ جو آگے چل کر ایک عظیم طبیب اور ڈاکٹر بننے والا تھا، عین اسی روز اس دنیا میں آیا جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا دن ہے اور جو مسیحا بن کر آئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کو بھی خدا نے یہ صفت دی تھی کہ ان کے علاج سے پیچیدہ سے پیچیدہ مرض کا علاج ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے والد عبدالرحمٰن ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ضلع بلیا میں صدر امین تھے۔

ان کے کنبے کے افراد خاص کر ان کے بیٹے دیوبند کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ دیوبند کی تحریک نے ایسے ہزارہا علماء پیدا کیے جنہوں نے انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان سے ختم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ چنانچہ دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے نہ صرف انگریزی سامراجیت کے خلاف تحریک چلائی بلکہ ایک ایسا طائفہ بھی تیار کیا جس نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کے دو بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب انصاری اور حکیم عبدالرزاق انصاری نے دیوبند کے مدرسے میں تعلیم حاصل کر کے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ حکیم عبدالرزاق سیاسی معاملات میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے دست راست تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو اس وقت کے دستور کے مطابق پہلے مکتب میں داخل کیا گیا۔ تاہم بعد میں انھیں مغربی طرز کی تعلیم دی گئی۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نظام حیدرآباد سے وظیفہ حاصل کیا۔ اس خرچے پر وہ انگلستان میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ اس یونیورسٹی سے انھوں نے ماسٹر آف میڈیسن (ایم۔ڈی) اور ماسٹر آف سرجری (ایم ایس) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنی نمایاں کامیابی کے باعث وہ لندن کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن بنا دیے گئے۔ یہ اعزاز پہلی بار ایک ہندوستانی کے نصیب میں آیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت میں ڈاکٹر انصاری سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

تحریک خلافت نے کانگریس کو بہت سے قوم پرست رہنما فراہم کیے۔ ان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، شیروانی، آصف علی اور سید محمد جیسے رہنما شامل تھے۔ یہ لوگ علی برادران کی قیادت میں قوم پرستی کے نظریات اور سیکولرازم کے اصولوں کے حامی یہ لوگ کانگریس کے پکے حامی تھے اور گاندھی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے پیرو کار بنے۔

ڈاکٹر انصاری قوم پرست مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو دو مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا۔ ایک ہندو، مسلمانوں کو ملک کی آزادی کے لیے کندھے سے کندھا ملانے کی ترغیب دینا اور دوسرے مسلمانوں کو کانگریس کے قریب لانا۔ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر انصاری نے سری نواس شاستری، موتی لال نہرو، اجمل خاں، سروجنی نائیڈو اور راجا محمود آباد کے ساتھ مل کر جو منشور جاری کیا تھا، اس میں کہا گیا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ مذہبی و سیاسی مسائل کو بلا امتیاز ختم کرنے کا نتیجہ ہے اور فرقہ وارانہ اختلافات اور کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے قومی ماحول اور قومی شعور پیدا کرنا ہی اس مرض کا علاج ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے ہندو مسلم تعلقات کو بہتر بنانے، نیز قومی میثاق تیار کرنے کے سلسلے میں لالہ لاجپت رائے سے تعاون کیا۔ یہ مسودہ جنوری ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے فرقہ وارانہ دوستی کے لیے رضاکارانہ کوششوں پر زور دیا۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد بے حد ضروری ہے۔ مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر عمل درآمد سے ہندوستانی عوام بددل ہو گئے۔ انگریزوں نے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی پالیسی اپنائی۔ ڈاکٹر انصاری اپنی سادہ دلی اور نیک نیتی کے باعث انگریزوں کی چالوں کو سمجھ نہیں سکے اور مسلمانوں کو قومی تحریک میں شامل کرنے کے لیے بالادستی اقتدار کے زیر اثر اقتصادی اور سماجی عوامل کو سمجھنے میں ناکام رہے جن کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری نے کانگریس میں اپنا یقین قائم رکھا، اور اس کے لیڈروں کے ساتھ وفاداری برقرار رکھی، کانگریس چونکہ ہندو اور مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دے رہی تھی چنانچہ اس کے لیے ڈاکٹر انصاری نے پوری دلچسپی سے کام کیا۔ انھوں نے جولائی ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی جس کے اہم رہنماؤں میں عبدالمجید خواجہ، مولانا ابوالکلام آزاد، تصدق احمد خاں شیروانی، چودھری خلیق الزماں، رفیع احمد قدوائی،

سید محمد، آصف علی اور خان عبدالغفار خاں شامل تھے۔

تحریک آزادی کے بیشتر رہنماؤں کی طرح ڈاکٹر انصاری کا شمار ان چند تاریخ ساز افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا اور ملک کے عوام کو نہ صرف حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات سے آشنا کیا بلکہ ان میں علمی اور سائنسی انداز فکر پیدا کیا۔ انھوں نے طبابت کے عظیم پیشہ کے ذریعے خدمت انسانیت کی راہ اپنائی۔ مدراس میں ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں خطبہ صدارت کے دوران آپ نے فرمایا کہ :۔

> "جس سوراج کے لیے ہم برسر پیکار ہیں وہ نہ تو ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلمان راج، یہ ایک مشترکہ راج ہوگا۔ ہم ہندوستان کو ایک قوم میں ڈھال سکتے ہیں جو ایسے پختہ عزم اور مضبوط ارادوں کی مالک ہو کر اپنے عظیم نصب العین کے راستہ میں پڑی رکاوٹ کو دور کر سکے اور دنیا کی اقوام میں اپنے مناسب جگہ حاصل کرنے کے قابل ہو۔"

ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے سلسلہ میں ان کا ذہن کشادہ اور وسیع تھا وہ لکھتے ہیں :۔

> "ہمارا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ ایک سچا وطن پرست ہوگا۔"

ڈاکٹر انصاری کے ترقی پسند نظریات اور خیالات بین الاقوامی سیاست سے باخبری اور سیاسی حکمت عملی پر دلالت کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :

> "آج بتدریج اس بات کا احساس کیا جا رہا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں سیاسی مسائل کا ایک گہرا رشتہ قائم ہے اور یہ کہ ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی غلامی سے انسانیت کی پرامن ترقی اور بالخصوص برطانیہ عظمیٰ کے مزدوروں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ آج جب کہ شہنشاہی اور سرمایہ دارانہ مفادات کی طرف سے ہندوستان کے خلاف اتہام سازی اور غلط ترجمانی کی ایک مہم جاری ہے ہمیں جگہ ہمارے سمندر پار ممتاز ڈیلیگیٹوں کی موجودگی نے اس بات کی امید دلادی ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں ہماری طرح شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لوٹ کا شکار ہونے والے ہمارے بھائی بندوں نے اس بات کا احساس کر لیا ہے کہ مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد اور متحدہ اقوام کی ضرورت ہے۔"

(خطبہ صدارت)

ڈاکٹر انصاری کی سرگرمیاں صرف سیاست تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ وہ مختلف سماجی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چھوت چھات کے مسائل، مزدوروں کی زبوں حالی، کسانوں کی پسماندگی، نیم متوسط اور متوسط طبقہ کی خستہ حالی، معاشرتی زندگی کی کمزوریاں، عورتوں کے ساتھ ناانصافی، اموات بچگان، جرائم میں اضافہ اور قومی تعلیم کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔

تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر انصاری کا نقطہ نظر رجعت پسندانہ نہیں تھا۔ وہ تعلیم کو انسانی شخصیت اور اعتماد کی افزائش کا ذریعہ مانتے تھے جامعہ ملیہ سے شائع ہونے والے رسالے "پیام تعلیم" کے یوم تاسیس ۱۹۲۷ء کے موقع پر انھوں نے اپنے پیغام میں کہا کہ :۔

> "سالہا سال سے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں اور مجھے بھی یقین ہے کہ تم اس پر کاربند ہوئے تو تمہارا ذہن پوری طرح نشو ونما پائے گا اور تم بڑے ہو کر اچھے آدمی ہو گے۔ تمہاری سیرت پر ایسے پردے نہیں پڑیں گے جو اس کی اصلیت کو چھپائیں اور وہ نصیحت یہ ہے کہ تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ، اپنے کمرے میں ہو یا مدرسہ میں، یا کھیل کے میدان میں ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ سچ تمہارا من چاہتا ہے۔ اپنی اصلی دلی خواہشوں کو دبا ؤ مت۔ دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقالی نہ کرو۔ خود اپنی اپج سے کام لو ایسا کرو گے تو تمہارا ذہن، تمہاری سیرت، تمہارا جسم سب کے سب وہ اچھی سے اچھی شکل اختیار کریں گے جس کے حاصل کرنے کی صلاحیت وقدرت ان میں رکھی گئی ہے۔"

ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ روشن خیال اور وسیع النظری کو گلے لگاتے تھے ان کے مداحوں، عقیدتمندوں اور دوستوں میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ شامل تھے۔ انھوں نے جمہوریت، سیکولرزم اور قومی یک جہتی پر صرف تقریریں ہی نہیں کیں بلکہ ان اصولوں پر خود بھی عمل کیا۔ ان کا عمل ہی جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی تعریف متعین کرتا رہا۔ ان کی سادگی، درد مندی، انسان دوستی، نیکی اور شرافت نے ان کو اپنے زمانے کا قد آور شخصیت بنا دیا۔ ان کا جذبہ قومیت، انسانیت، رواداری اور مستحکم نظریات آنے والی نسلوں کے مشعل راہ بنے رہیں گے۔ ان کی تعلیمات، نظریات اور خیالات ہمارے لیے سرچشمہ تحریک عمل بن سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے ڈاکٹر انصاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا :۔

> "مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر انصاری کسی مسئلے سے اتنی گہری وابستگی، دلچسپی اور مشغولیت رکھتے ہیں جیسی فرقہ وارانہ مسئلے سے رکھتے آئے ہیں۔ انھیں اپنے پیشے سے محبت ہے اور اسی کے ہو رہنے پر قانع ہیں۔ اگر ہم انھیں سیاسی میدان میں حتیٰ کہ صدر کانگریس کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، تو اس لیے کہ دوستوں نے گھیر گھار کر انھیں اس منصب کے لیے آمادہ کیا ہے۔ ایسے شریف النفس محب وطن ہیں کہ اپنے دوستوں کی خواہش کو مسترد نہیں کر سکے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ان کی اولین خواہش ہے۔ خدا کرے یہ کوششیں بارآور ہوں۔ بڑی سے بڑی خوبیاں بھی رونما ہونے سے پہلے ضرور ہے کہ انسانی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔۔۔"

مسز اندرا گاندھی نے ۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو

باقی صـ۹ پر

بھارت میں کھیل کود۔ ایک جائزہ

بھارت کی آرادی کے بعد سے لے کر اب تک کھیل کود کے سلسلے میں ملک میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ اس شعبے میں ملک کی کارکردگی بہت زیادہ حراب نہیں رہی ہے۔ حالانکہ انفرادی اولمپک طلائی تمغہ جس کا بھارت ۱۹۴۸ء میں لندن میں طلب گار تھا۔ ہیری ریبیلو کے ہاتھ سے افسوسناک حالات میں نکل گیا لیکن دیگر شعبوں میں بہت سی دیگر قابل تعریف کارگذاریاں رہی ہیں۔

خاص طور پر کرکٹ کے شعبے میں بھارت کی کارکردگی اتنی اچھی کبھی نہیں رہی ہے جتنی کہ گذشتہ برس رہی ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ آج کرکٹ بھارت میں سب سے زیادہ مقبول عام کھیل ہے جو ہاکی سے بھی زیادہ مقبول ہو گیا ہے لیکن فٹ بال کے شعبے میں جو ایک عوامی کھیل ہے بھارت کی کارگذاری تشویشناک حد تک خراب ہو گئی ہے۔

بھارتی کرکٹ کا شعبہ جس نے انگلینڈ اور آسٹریلیا میں ذلت آمیز شکست کھائی تھی نیز جس نے نیوزی لینڈ میں ذرا سی بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، تاریک ترین دور میں داخل ہو گیا تھا لیکن بھارتی کرکٹ ٹیم نے ملک میں انگلینڈ اور زمبابوے کے خلاف نیز ملک سے باہر سری لنکا کے خلاف لگاتار تین سیریز میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ کسی دوسرے ملک میں بھارت کو یہ کامیابی کافی برسوں بعد نصیب ہوئی تھی۔ بھارت کو کلکتہ میں منعقد ہونے والے ہیرو کپ میں سنسنی خیز کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

یہ برس محمد اظہرالدین کے لیے بہت شاندار رہا، جنھوں نے زمین سے اٹھ کر بلندیوں کو چھوا اور اعلیٰ درجے کی شہرت حاصل کی۔ حیدرآباد کے اس پھرتیلے نوجوان نے اپنا کیریئر لگاتار تین ٹیسٹ سنچریوں کے ساتھ شروع کیا تھا اور کھیل کی تاریخ میں نہایت شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس بہترین کھلاڑی نے فیلڈنگ کے شعبے میں ہمالیہ کی بلندیوں کو چھو لیا۔ اظہرالدین کا شمار جنوبی افریقہ کے جونٹی رہوڈز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جنھیں دنیا کا سب سے بہترین فیلڈر کہا جاتا ہے۔ اظہرالدین نے میدان میں رہ کر بلے بازی اور گیند بازی دونوں شعبوں میں رہنمائی کی اور کبھی بھی گھٹیا قیادت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

بھارت کے کپل دیو ۴۳۲ وکٹ لے کر دنیا میں ٹیسٹ میچوں میں سب سے زیادہ وکٹ لینے والے رچرڈ ہیڈلی سے آگے پہنچ گئے ہیں۔ بھارتی کرکٹ کی تاریخ میں یہ ایک شاندار کامیابی ہے۔

یہ برس ایک اور خوش خلق کھلاڑی ظفر اقبال کے لیے بھی کامیابی کا برس ہو سکتا تھا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ظفر اقبال کے چیف کوچ کا عہدہ سنبھالنے سے قبل بھارتی ہاکی انتہائی زوال کے دور میں پہنچ گئی تھی لیکن اس شاندار آؤٹ سائڈ لیفٹ نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ یہ ذمہ داری اٹھائی اور ملک کو اولمپکس کے لیے کوالیفائینگ ٹورنامنٹ میں ناکامی کی صورت میں ہونے والی شرمندگی سے بچایا۔ بھارت ۳۶ برس تک اس کھیل کا غیر متنازعہ شہنشاہ رہا ہے۔

اس برس کے ختم ہونے سے قبل ہیروشیما میں فائنل میں جنوبی کوریا سے ہار کر ایشیا میں بھی کامیابی حاصل کرنے سے محروم رہ سکتا تھا لیکن پاکستان کو بھی جسے اس علاقے میں چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں دہے میں بالادستی حاصل تھی، سبھی فائنل کی سطح پر شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس طرح کے اطمینان سے بھارتی ہاکی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن جاپان کے اس شہر میں، جو آخری جنگ عظیم مشہور ایٹمی دھماکے کے بعد ایک مثالی شہر کی طرح سامنے آیا، ایشیائی کھیلوں کے موقع پر بلا شبہ یہ امر باعث تشویش رہے۔

یہ کوئی بہت پہلے کی بات نہیں ہے جب بھارتی ایتھلیٹ جاپان کے ذریعے اس شعبے میں کی جانے والی جدوجہد کے باوجود ایشیائی علاقے میں عروج پر تھے لیکن بھارتی معیارات میں نمایاں گراوٹ آئی جب کہ چین ایک عالمی طاقت بن کر ابھرا اور جنوبی کوریا جیسے دیگر ممالک بھی بہت بہتر ثابت ہوئے۔ بھارتی ایتھلیٹ واضح طور پر ایک ایسے چوراہے پر ہیں جہاں سے بحالی کے اچھے امکانات ہیں۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بھارت عالمی نظام میں کچھ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکا ہے لیکن بھارتی ایتھلیٹ کی اس وقت بامعنی واپسی ہوئی جب بھارت کو لمبی دوڑ والا ایک شاندار ایتھلیٹ بہادر پرساد کی شکل میں ملا۔ اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا نے بہادر پرساد کی ابتدائی سطح پر حوصلہ افزائی کی اور بہادر پرساد کو تربیت دینے کی غرض سے مشہور برطانوی کوچ، ہیری ولسن کو بھارت بلایا گیا۔

حال ہی میں منیلا میں منعقد ہوئے ایشیائی ٹریک اینڈ فیلڈ مقابلے میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ بہادر پرساد نے ۱۵۰۰ میٹر لمبی دوڑ قومی ریکارڈ سے بھی کم وقت میں نیز ۵ ہزار میٹر لمبی دوڑ ایک بہت مقابلہ جاتی میدان میں جیت کر دوہری کامیابی حاصل کی۔ ان کی شاندار کوششوں کے نتیجے میں بھارت نے کافی تمغے حاصل کئے نیز وہ پاکستان، سری لنکا اور میزبان ملک بنگلہ دیش سے تمغوں کی فہرست میں کافی آگے نکل گیا۔

۱۹۹۳ء میں کرکٹ کی طرح ٹینس بھی بھارت کے لیے بہت اچھا رہا۔ ڈیوس کپ میں بہت شاندار کارگذاری رہی ہے۔ رواں برسوں میں شاید سب سے

باقی صفحے پر

آپ سب کے لیے

بہترین سائنس و ٹکنالوجی صنعت کاروں کو قومی ایوارڈ

سائنس و ٹکنالوجی کے محکمے نے شریمتی مہ کتا ایاولا اور شری وائی ۔ ایچ دلوکر کو سائنس و ٹکنالوجی صنعت کار اور سائنس و ٹکنالوجی صنعت کار تربیت دہندہ کے طور پر قومی ایوارڈ دیا ہے۔ اس ایوارڈ کا قیام محکمے کے قومی سائنس و ٹکنالوجی صنعت کار ترقیات بورڈ کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ مذکورہ ایوارڈ، سائنس و ٹکنالوجی کے وزیر مملکت شری بھونیش چترویدی نے تقسیم کیے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ہمیں اپنے طرز کے صنعت کاروں کو تربیت دینے کا اہل ہونا چاہیے۔ ایسی تربیت سے صنعت کاروں کا ایک ایسا حلقہ قائم ہو جائے گا جو دنیا کے کسی بھی حصے میں بڑے پیمانے پر کام شروع کر سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ سچے صنعت کار جو دھیرے دھیرے تجارتی بنیاد والی سرگرمیوں کو چھوڑ کر پیداوار پر مبنی سرگرمیوں کو اختیار کر رہے ہیں، انھیں اپنی مصنوعات کے ضمن میں اعلی کوالٹی پر بہت زور دینا چاہیے۔ اس سے قبل سائنس و ٹکنالوجی کے محکمے کے سکریٹری ڈاکٹر پی راما راؤ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔●

اندرا گاندھی میموریل ہسپتال

شہری ترقیات کی وزارت کے تحت قومی بلڈنگ تعمیرات کارپوریشن (این بی سی سی) کے ذریعہ تعمیر کردہ اندرا گاندھی میموریل ہسپتال ۲ فروری ۱۹۹۴ء کو عوامی جمہوریہ مالدیپ کی حکومت اور عوام کو سونپا گیا۔

ہسپتال کو سونپنے کی رسم شہری ترقیات کے وزیر شریمتی شیلا کول نے ادا کی تھی جس میں صحت و خاندانی بہبود کے وزیر مسٹر احمد عبداللہ بھی شریک تھے۔

دو سو بستروں والا مذکورہ ہسپتال ۴ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے اور جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔

مذکورہ ہسپتال ولنگلی جزیرے سے نظر آتا ہے اور دو ایکڑ زمین پر واقع ہے۔ چار بلاکوں یعنی وارڈ بلاک، آپریشن تھیٹر بلاک، ایمولیٹری کیئر بلاک اور ہاؤسنگ بلاک کمپلیکس پر مبنی یہ ہسپتال کافی وسیع ہے۔●

شہروں کی ماحولیاتی حالت

بنیادی ڈھانچہ خدمات کی مانگ اور تکمیل کے مابین لگاتار پیمانے پر بڑھتی ہوئی خلیج کی وجہ سے بڑے شہروں میں ماحولیاتی انحطاط روز افزوں پیمانے پر رونما ہو رہا ہے۔ آبادی کا بڑھتا دباؤ اور شہری خدمات فراہم کرانے کی بڑھتی ہوئی لاگت بنیادی ڈھانچہ سہولیات اور آسائشوں میں انحطاط کی وجوہات ہیں۔

شہر میونسپل فضلہ انتظام سے متعلق ایک دہلی گروپ نے تخمینہ لگایا ہے کہ اول اور دوئم زمرے کے شہروں میں صرف مستعمل گندے پانی کو جمع کرنے اور اس کی نکاسی پر ۱۰ کروڑ روپے کے اخراجات آتے ہیں۔

ماحولیات و جنگلات کی وزارت کے ذریعہ تیار کردہ ماحولیاتی منصوبہ عمل میں نشاندہی کی گئی ہے کہ صنعتی یا زرعی مقاصد کے لیے مستعمل پانی کا از سر نو استعمال ضروری ہوتا جا رہا ہے کیونکہ شہروں کی توسیع کے ساتھ ایسے پانی کی مقدار بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

ماحولیاتی منصوبہ عمل میں ماحولیات اور اس کے انحطاط سے متعلق بہت سے پہلوؤں کو احاطہ کیا گیا ہے۔●

مرکزی پول سے جاری ہونے والے گیہوں اور چاول کی قیمتوں پر نظر ثانی

وزارت خوراک سے جاری ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مرکزی حکومت نے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں سے سرکاری نظام تقسیم کے لیے جاری ہونے والے گیہوں و چاول کی مرکزی اجرا قیمتوں پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گیہوں کی قیمت اب بڑھا کر ۵۳۷/- روپے کوئنٹل (عام قسم کے گیہوں کے لیے) اور نفیس قسم کے گیہوں کے لیے ۶۱۷ روپے فی کوئنٹل اور سپر فائن قسم کے لیے ۶۴۸/- روپے کر دی گئی ہے۔ ان اقسام کے لیے اس سے قبل کی شرحیں بالترتیب ۴۳۷/- روپے فی کوئنٹل، ۴۹۷/- روپے فی کوئنٹل اور ۵۱۸/- روپے فی کوئنٹل تھیں۔

مربوط قبائلی ترقیات پروجیکٹوں/ قبائلی اکثریت والے علاقوں کے لیے گیہوں اور چاول کی قیمت اور نظر ثانی شدہ سرکاری نظام تقسیم کے لیے مذکورہ قیمتیں سرکاری نظام تقسیم کے لیے مقررہ اجرا قیمتوں سے ۵۰ روپے کم ہوں گی۔

مذکورہ قیمتیں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں کی قیمتوں کے علاوہ ہیں اور اس میں متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذریعہ مقررہ تقسیم وغیرہ کی گنجائش جو سرکاری نظام تقسیم کے لیے رکھی جاتی ہے، شامل نہیں ہے۔

مذکورہ اضافہ اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ گیہوں اور دھان کی امدادی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔●

اینٹی ٹینک "نیگ" میزائل کا کامیاب تجربہ

دفاعی تحقیق و ترقی ادارے (ڈی آر ڈی او) نے گزشتہ دنوں "نیگ" نام کے جدید ٹینک شکن میزائلوں کی پرواز کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ "نیگ" میزائل تیسری جنریشن کی میزائل ہے جس کا رینج ۴ کلو میٹر کا ہے۔ حالیہ تجربے ایک میزائل کیریئر ٹریک گاڑی کے ساتھ کیا گیا جسے ڈی آر ڈی او نے بھارتی صنعت کے اشتراک سے بنایا تھا۔

باقی صفحہ ۳۲ پر

آپ سب کے لیے

Regd. No. D(DN) 204
R.N. 27032/81
Vol. 13 No. 23-24

YOJANA (URDU)

Licensed U (DN) 65 to post without prepayment at NDPSO, New Delhi
1 -31 March, 1994

بریل ـ نابینا افراد کے لیے امید کی ایک کرن

معذور افراد اور بالخصوص آنکھوں جیسی انمول نعمت سے محروم افراد کے لیے کیے جانے والے کسی بھی بامقصد اقدام میں تعلیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۸۱ء میں سندبرگ میں تعلیم، روک تھام اور مربوط کرنے سے متعلق اقدامات اور حکمت عملیوں کے بارے میں منعقدہ عالمی کانفرنس میں منظور کیے گئے اعلامیہ میں معذور افراد میں تعلیم کو فروغ دینے، ان کی ثقافتی ترقی و فروغ اور انہیں روزگار فراہم کرنے کے لیے ان کی ضروریات کے مطابق جدید طریقہ کار اپنانے کو کہا گیا تھا۔ بین الاقوامی محنت تنظیم سے منظور شدہ نابینا اور بینائی سے معذور افراد سے متعلق بین الاقوامی دستاویزی سروس (ڈی ایل آئی این، ڈی سی) اور سی ایم کے پاس بھی نابینا افراد کو پیشہ ورانہ رہنمائی، تربیت اور روزگار فراہم کرنے کے لیے تکنیک موجود ہے۔ یہ ان معذور افراد کے حقوق کے عین مطابق ہے جنھیں اپنی دنیا سے باہر آنے کی ضرورت ہے، جو اپنی انفرادی پہچان قائم کرنا چاہتے ہیں، جو سماجی و ثقافتی زندگی میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور پیداواری سرگرمیوں میں بامعنی حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔

یہ ایک مشکل کام ہے۔ معذوریت کی نوعیت سے ہی یہ متعین ہوتا ہے کہ اسے کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ اسے کس موزوں طریقے سے خصوصی ہدایات کے ذریعے دی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے تحریر اور مطالعے کا ایک نیا نظام تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ نابینا افراد کو لمسی میڈیا کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے جب کہ کمزور بینائی والے بچے پڑھنے کے لیے ایسے آلات استعمال کرتے ہیں جس سے حروف بڑے نظر آتے ہیں۔ گذشتہ ایک سو پچاس برس سے نابینا افراد کے لیے تحریر کا کوئی مناسب میڈیم (ذریعہ) تلاش کرنے کی باقاعدہ کوشش کی جارہی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے پہلے چوتھائی حصے تک نابینا افراد کے پڑھنے کے لیے ابھری ہوئی تحریر کے مختلف نظام تیار کیے جاچکے تھے۔ لیکن یہ تمام طریقے ابھرے ہوئے رومن رسم الخط کی ترمیم شدہ شکلیں تھیں یا پھر یہ دیگر رسم الخط کی شکلیں تھیں جن میں حروف کو شکل دینے کے لیے سطروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد نابینا افراد کا مشہور مسیحا لوئیس بریل منظر عام پر آیا۔ چونکہ وہ خود بھی نابینا تھا اور حساب کا ٹیچر تھا، اس لیے اس نے ۱۸۲۹ء میں یہ پتہ لگایا کہ لائن کو چھو کر پڑھنے کا طریقہ غیر موزوں ہے کیونکہ نقطوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔

فرانسیسی فوج نے رات میں مواصلات کے لیے ۱۲ نقطوں کا نظام اپنایا۔ بریل نے بھی اسی قسم کا نظام پیش کیا جو چھ نقطوں ریاضی ترتیب اور اجتماعات پر مبنی تھا۔ ان کو تین تین نقطوں کی دو متوازی لائنوں اور موزونیت کے ساتھ ترتیب دیے گئے مختلف اجتماعات میں مرتب کیا جاتا تھا۔ یہ نظام انگلی سے چھو کر سمجھنا آسان تھا۔ لوئیس بریل ایک ایسی اہم شخصیت تھی جس نے علم کی روشنی اور طاقت نابینا افراد کے ہاتھوں کی انگلیوں میں پہنچادی۔ چھونے کے احساس کو سمجھنے کی ان کی پراسرار صلاحیت سائنس اور فہم انسانی میں یقیناً ایک اہم کامیابی ہے۔

گذشتہ سو برس میں اس ٹکنالوجی میں نمایاں ترقی رونما ہوئی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر، ریڈنگ مشینیں، کمپیوٹر، بریل بولنے والے کیلکولیٹر نے نابینا افراد کی رسائی حدود میں توسیع کردی ہے۔ لیکن بریل کو اب بھی پوری دنیا میں نابینا افراد کے لیے پڑھنے اور لکھنے کے ایک مقبول نظام کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

بھارت میں بریل نظام ۱۸۸۷ء میں عیسائی مشنریوں کے ذریعے اس وقت آیا جب امرتسر میں نابینا افراد کے لیے پہلا اسکول قائم کیا گیا تھا۔ لیکن ہر اسکول نے اپنا اپنا ضابطہ تیار کرلیا۔ نتیجتاً پنجاب میں بریل میں لکھی گئی کتاب ممبئی میں نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔ اسی طرح ممبئی میں تیار کردہ بریل کی کتاب کلکتہ میں نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔

آزادی کے بعد حکومت نے معذور افراد کی تعلیم، تربیت، روزگار، مکمل سماجی ربط اور تحفظ پر مبنی ایک قومی پالیسی تیار کی۔ حکومت نے یونیسکو کی مدد سے ایک یکساں نظام — بھارتی بریل تیار کیا۔ جن مشہور ماہرین نے یہ مشکل کام انجام دیا وہ تھے ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور شری لال اڈوانی۔ یہ کوڈ اب ملک بھر میں استعمال کیا جاتا ہے اور ہر بھارتی زبان اس کوڈ میں پڑھی یا لکھی جاسکتی ہے۔

اس وقت ملک میں بریل کی طباعت کے تقریباً ۱۲ پریس ہیں۔ بینائی سے معذور افراد کے قومی ادارے، جو دہرہ دون میں واقع ہے، کا سنٹرل بریل پریس ملک کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا بریل پریس ہے۔ یہ نابینا افراد کے لیے نصابی کتابیں، حوالہ جاتی کتابیں اور عام مطالعہ کا مواد شائع کرتا ہے۔ یہ پریس ستمبر ۱۹۹۳ء سے بریل میں اپنی نوعیت کا پہلا ہفتہ وار بریل ٹائمز شائع کررہا ہے۔ اس ہفتہ وار میں اہم قومی اور بین الاقوامی امور، تازہ ترین خبریں اور واقعات

باقی صفحہ ۲۶ پر

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed at Hindustan Offset Press, N.I.A. phase II, New Delhi-110 028.